اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔

کتاب مستطاب

سیرۃ النبی

یعنی

سوانحِ اقدس حضرت سیدِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

مجلد چہارم

مشتمل بر منصبِ نبوت

اوّلاً

مقدمہ میں منصبِ نبوت کی حقیقت اور اس کے لوازم و خصائص پر بحث ہے پھر قبل از اسلام دنیا کے متمدن ممالک اور خصوصاً ملک عرب کی مذہبی و اخلاقی حالت کی تفصیل ہے اور اسکے بعد نبوت محمدی نے دنیا اور عرب کیلئے جس عظیم الشان اصلاح کا فرض انجام دیا اس کا اجمالی ذکر ہے پھر اسلامی عقائد کا تفصیلی بیان ہے۔

تالیف

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ

باہتمام مولوی مسعود علی ندوی

در مطبع معارف شہر اعظم گڈھ مطبوع گردید

۱۳۷۸ھ طبع چہارم ۱۹۵۹ء

فہرست مضامین سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد چہارم

فرشتوں پر ایمان

۵۵۴ - ۵۷۶

رسولوں پر ایمان

۵۷۷ - ۵۳۹

کتبِ الٰہی پر ایمان
۶۳۱ - ۵۹۴

پچھلے دن اور پچھلی زندگی پر ایمان

۶۳۲ - ۷۱۳

۱- برزخ

۶۳۷ - ۶۷۷

دوزخ

۸۱۱ - ۷۶۹

جنت

۸۱۲ - ۸۵۹

قضا و قدر

۸۶۰ - ۸۸۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

اے باز کنِ درِ معانی ‏ بر ما بکلید آسمانی
ہر چہ از تو گماں برم بجز نی ‏ آں من بوم و تو زآں برونی

شاہِ رسل و شفیعِ مرسل ‏ خورشید یسین و نورِ اوّل
سلطانِ ممالکِ رسالت ‏ طغرائے صحیفۂ جلالت (خسرو)

پیشِ نظر کتاب، سیرۃ النبیؐ کے سلسلہ کی چوتھی جلد ہے، اس کا موضوع منصبِ نبوت ہے، اس تقریب سے سب سے پہلے اس میں ایک مقدمہ ہے، جس میں نبوت کی حقیقت اور اس کے لوازم وخصوصیات کی تشریح ہے، اس کے بعد دیباچہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت و ظہورِ اسلام کے وقت دنیا کی مذہبی و اخلاقی و روحانی حالت کا مرقع دکھایا گیا ہے، بالخصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ملکِ عرب کی جو مذہبی و اخلاقی حالت تھی اور اس کی اصلاح میں جو دقتیں درپیش تھیں شرح و بسط کے ساتھ اُن کی تفصیل کی گئی ہے، اس کے بعد آپ کے تعلیمات و ارشادات کی تفصیل سے اصل کتاب کا آغاز ہوا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بارگاہِ باری سے جو شریعتِ کاملہ اور قانونِ ابدی عطا ہوا، وہ درحقیقت چار
عنوانوں پر منقسم ہے، عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات، خیال تھا کہ عقائد و عبادات کی ایک جلد
ہو اور اخلاق و معاملات دوسری جلد میں ہوں، مگر جوں جوں مسافرِ قلم اس دشوار گذار مرحلہ میں آگے بڑھتا
گیا، راستہ اسی قدر وسیع اور مسافت اتنی ہی بعید نظر آنے لگی، ناچار اس جلد کو صرف عقائد کے بیان پر محدود
رکھا گیا، دوسری جلد میں عبادات اور ان کی حقیقت اور فرائض چہارگانہ کے حقائق و فوائد سے بحث ہوگی،
اور تیسری جلد کا عنوان اخلاق و معاملات ہوگا، جس میں ہم انشاء اللہ بتفصیل بتائیں گے کہ تمدن و معاشرت
بالخصوص قوانینِ نکاح، طلاق، وراثت، حقوقِ نساء، غلامی، جہاد، اصولِ حکومت اور اقتصادیات وغیرہ
کے متعلق تمام دنیا کے مذاہب کے کیا اصول اور تمام سلطنتوں اور قوموں کے کیا قوانین تھے، اور آج
مغرب نے اس انتہائی تہذیب تک پہنچکر کس حد تک ان امور میں ترقی کی ہے، پھر موازنہ کرکے ہم دکھائینگے
کہ شریعتِ اسلام کے مقابلہ میں مغرب کی معراجِ ترقی، شریعتِ اسلام کا پایۂ اولین ہے،

حضرت الاستاذ مرحوم نے اس جلد کا کام شروع ہی کیا تھا، اور مذکورہ بالا مباحث میں سے صرف
عرب جاہلیت کے مذہبی و اخلاقی حالات کے چھبیس ۲۶ صفحے لکھنے پائے تھے کہ وفات پائی، یہ صفحے بھی
ان اوراق میں شامل ہیں، مگر چونکہ ان میں بکثرت اضافہ و ترمیم کی ضرورت ہوئی ہے اس لئے ان
صفحات کو ان کے اسمِ گرامی کی طرف منسوب کرنے میں احتیاط کرتا ہوں، بقیہ پوری کتاب کی
ذمہ داری خاکسار ہی کے خطا کار قلم پر ہے، وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ،

کوشش کی ہے کہ ان اوراق میں پیغمبرِ اسلام علیہ السلام کے پیغام و تعلیم کو پوری تشریح، استناد،
استدلال اور دلچسپی کیساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جائے، قرآن پاک کے استناد کو ہر موقع پر سب سے

آگے رکھا گیا ہے اور اُسی کے پرتو میں احادیث صحیحہ سے فائدہ اٹھایا گیا ہے، مناظرانہ پہلو سے بجگہ ہر پیش نظر مسئلہ میں اسلام کا دوسرے مذاہب سے اس غرض سے موازنہ کیا گیا ہے تاکہ اسلام کی تکمیلی شان نمایاں ہو جائے ؛

ان اوراق کے لکھنے والے کے نزدیک نسخ شریعت کے معنی کسی حکم کو اس کے غلط یا غیر مفید ہونے کے سبب سے سرے سے مٹا کر کسی دوسرے حکم کو نافذ کرنے کے نہیں ہیں، بلکہ محرف احکام کی جگہ پر اصل احکام کے دوبارہ نازل ہونے اور دنیا کے حسب حال ناقص کی جگہ کامل اور کامل کے بدلہ کامل تر تعلیمات دیئے جانے کے ہیں اس لئے قرآن پاک کے ناسخ کتب اور اسلام کے ناسخ ادیان ہونے کے معنی اُن کے مٹا دینے والے کے نہیں بلکہ اُن کی تکمیل کرنے والے کے ہیں، مذاہب کی تاریخ جب سے شروع ہوتی ہے ہر مذہب اور اسکی کتاب انسانی عروج و ترقی کی ایک ایک منزل ہے اور اسلام اس عروج و ترقی کی وہ انتہائی منزلِ مقصود ہے جس کے بعد تکمیلِ دین کی سرحد ختم ہو جاتی ہے، جیسا کہ خود اس کا دعویٰ ہے اور اس دعویٰ میں کوئی اور دین اُس کا شریک نہیں ہے کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ

ان تکمیلی مباحث میں سے یہ جلد صرف عقائد پر مشتمل ہے، اور کون نہیں جانتا کہ مذاہب میں اعتقادات کی حیثیت کتنی اہم اور ان کی بحث کتنی نازک ہے اسلئے اس خارزار سے کسی آبلہ پا کا بسلامت گذر جانا کس قدر مشکل ہے تاہم میں نے جدوجہد اسی کی کی ہے کہ کسی آبلہ کو ٹھیس لگے بغیر اس راستہ کو طے کر لوں جتنے والا تو تھک کر چور ہے اب یہ دیکھنے والوں کو فیصلہ کرنا ہے کہ اس نے ہر ہی کی یہ شرط کہاں تک پوری کی

ارباب بصیرت جانتے ہیں کہ اسلامی فرقوں میں سے کسی فرقہ کے مطابق بھی اگر عقائد کی کتاب لکھی جاتی تو یہ منزل نہایت آسان تھی کہ اُن میں سے ہر ایک کی مدون و مرتب کتابیں سامنے ہیں لیکن مجھے اس جلد

میں کسی خاص فرقہ کے نہیں اسلام کے وہ عقائد لکھنے تھے جن پر ایمان لانے کا قرآن نے ہم سے مطالبہ کیا ہے اور جن کی تعلیم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو دی تھی چنانچہ ان اوراق میں ان ہی چند عقائد کی تشریح ہے اور یہ ہی ہیں جو اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَلٰئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی میں مذکور ہیں یعنی خدا، اُس کے فرشتوں، اُس کی کتابوں، اسکے رسولوں پر اور آخری دن اور قضا و قدر پر ایمان، چنانچہ اس جلد میں مقدمہ و دیباچہ کے بعد ان ہی چھ باتوں کی تفصیل و تشریح ہے۔

میں نے اپنے جانتے اسکی پوری احتیاط کی ہے کہ کسی مسئلہ کی تشریح میں قلم، صراطِ مستقیم سے تجاوز نہ کرے، لیکن عالم الغیب جانتا ہے کہ قدم نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے، اس لئے اسکی بارگاہ میں نہایت عجز سے دعا ہے کہ خداوندا میری لغزش کو دوسروں کی لغزش کا سبب بنانا، اور ہم سب کو سیدھی راہ دکھانا،

مَنْ یَّھْدِ اللّٰہُ فَھُوَ الْمُھْتَدِیْ (اعراف ۲۲)	جس کو خدا راہ دکھائے وہ راہ پایا ہوا ہے،
وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ مُّضِلٍّ (زمر)	اور جسکو خدا راہ دکھائے اسکو کوئی گمراہ کرنیوالا نہیں،
رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا	ہمارے پروردگار، ہمارے بھول چوک کی
(بقرہ ۲۸)	بازپرس ہم سے نہ فرمایا،

این نامہ کہ خامہ کرد بنیاد — توقیعِ قبول، زوزیش باد

طالبِ رحمت

سید سلیمان ندوی

۲۵ ربیع الاول سنہ ۱۳۵۱ھ

دار المصنفین اعظم گڈھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

منصبِ نبوّت

کتاب کا موضوع آپکے پیغبرانہ کارنامے

سیرت کی عام کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعاتِ زندگی کے اندر جو چیز سب سے زیادہ ممتاز ہو کر نظر آتی ہے، وہ غزوات اور لڑائیاں ہیں، لیکن یہ غزوات اور لڑائیاں ظاہر ہے کہ مقصود بالذات نہ تھیں، بلکہ وہ سلسلۂ دعوت میں اتفاقاً پیش آگئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی، انھوں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا، اور نہ صرف انکار کیا بلکہ اس کے مٹانے کی پرزور کوشش کی، اُس کے قبول کرنے والوں کو ستایا اور اُن کو اُن کے گھروں سے نکال دیا، وہ اپنی جان بچا کر دوسرے شہر کو چلے گئے، وہاں اُنکی دعوت نے فروغ پایا، اور بہت بڑی تعداد نے اُس کی سچائی کو قبول کیا، یہ دیکھکر مخالفوں نے ہر طرف سے یورش کی، اور

چاہا کہ اس جماعت کو بزورِ شمشیر مٹا دیں، اُس نے اپنی جان کے بچاؤ کی تدبیریں کیں، اور اُن کی پُر زور سازشوں اور کوششوں کے سیلاب کو پہاڑ بن کر روکا، اس کشمکش نے خونریز لڑائیوں کا ایک سلسلہ چھیڑ دیا جو متصل دس سال تک قائم رہا، رفتہ رفتہ اعجازِ نبوت حسنِ تدبیر، لطفِ اخلاق سے تمام معرکے سر ہوئے اور پھر ایک پُرامن نظام قائم ہوگیا، بے شبہہ یہ کارنامہ بھی کچھ کم مستوجبِ منقبت نہیں لیکن ناظرین اس نکتہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوں گے کہ ہم کس (ذاتِ اقدس) کے سوانح لکھ رہے ہیں،

یہ جو کچھ ہوا اور پیش آیا وہ گو نہایت عجیب، حیرت انگیز اور کرشمۂ ربانی کا پورا مظہر ہے تاہم وہ درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی، براہِ راست اور مقصود بالذات کارنامہ نہیں، وہ اتفاقی حوادث ہیں، جو اسلام کی دعوت و اشاعت کی راہ میں دشمنوں کی مخالفت سے پیش آگئے، آپؐ کے اصلی پیغمبرانہ کارنامے وہ ہیں، جو اگر یہ اتفاقی واقعات رونما نہ ہوئے ہوتے، تب بھی ظاہر ہی ہوتے، اور وہی آپ کی سیرۃ مبارکہ کے اصلی وقائع اور سوانح ہیں یعنی عرب میں سرتاپا روحانی و اخلاقی انقلاب پیدا کر دینا، تمام عالم کے سامنے کامل ترین اور آخر شریعت کو پیش کرنا، دنیا کا گوشہ گوشہ کو ترانۂ توحید اور سرور محبت سے معمور کرنا ظلمت کدۂ عالم کو سراجِ منیر بن کر بقعۂ نور بنا دینا گمراہوں کو راستہ بتانا بھولوں کو یاد دلانا، بندوں کا رشتہ خدا سے جوڑنا، غلط اوہام کو مٹانا، اخلاقِ فاضلہ سکھانا، گناہوں کے دفتر کو دھونا، انسانوں کو شیطانوں کے دامِ فریب سے نکال کر فرشتوں کی صف میں کھڑا کرنا، دنیا کو رفق و محبت، لطف و شفقت اور برادرانہ مساوات کی تعلیم دینا، حکمت و دانائی، پند و موعظت، اور تہذیب و تمدن کے رموز سکھانا، روحانیت کی برباد شدہ دنیا کی دوبارہ تعمیر، اور قلوب و ارواح کے ویران گھروں کی از سرِ نو آبادی، الغرض خاتم النبیینؐ کا اصلی کام ایک شریعتِ ابدی کی تاسیس، مذاہبِ عالم

کی اصلاح، فنِ اخلاق کی علمی و عملی تکمیل، قانونِ الٰہی کا اظہار و عرض، اور تہذیبِ نفوس کی معراجِ آخر تھی، اور یہ سب اُسی پُرآشوب زمانہ میں ہوتا رہا جس کے لیل و نہار بظاہر صرف حملوں کے تیر باران کے روکنے میں صرف ہوگئے، پیشِ نظر جلد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ کے ان ہی واقعات اور کارناموں پر مشتمل ہے،

نبی، اور مصلح اور حکیم

بظاہر نظر آتا ہے کہ اس قسم کے کچھ کام ایسے لوگوں سے انجام پاتے ہیں، جو نبوت اور رسالت کے منصب پر فائز نہیں ہوتے، وہ اپنی قوم و ملک کے سامنے اپنی اصلاح کی دعوت پیش کرتے ہیں، اور سعی و محنت اور متواتر جد و جہد سے ان میں کوئی سیاسی، اجتماعی، تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی انقلاب پیدا کرتے ہیں، اور اُن کو قعرِ ذلت سے نکال کر ترقی کی سطحِ مرتفع تک پہنچا دیتے ہیں، ایسے لوگوں کو مصلح اور ریفارمر کہتے ہیں، اور ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے منہ سے اخلاق و حکمت اور پند و موعظت کے موتی جھڑتے ہیں جن کو حکیم کہتے ہیں، اس حالت میں ایک پیغمبر اور ایک مصلح اور ایک حکیم میں کیا فرق ہوگا ؟ اس التباس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے کوتہ نظر ایک پیغمبر اور ایک مصلح اور ایک حکیم میں کوئی امتیاز نہیں کرتے، اور اس بنا پر اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں، اس فرق و امتیاز کو نمایاں کر دینا ضروری سمجھتے ہیں،

نبوت کی حقیقت اور خصوصیات

اس فرق کو پوری طرح واضح کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے نبوت کی حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لی جائے، نبوت کی فلسفیانہ حقیقت کی بہترین تشریح امام غزالی نے معارج القدس[1] اور شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں کی ہے، یہ دونوں بزرگ

[1] معارج القدس کا یہ حصہ حضرت الاستاذ مرحوم نے الکلام کے آخر میں بطور ضمیمہ شائع کر دیا ہے،

تصوّف، فلسفہ، اور نقلیات تینوں کوچون سے باخبر ہیں، اس لئے یہ جو کچھ بتائیں گے، اس میں کچھ کچھ ذاتی ذوق ومشاہدہ کا حصّہ بھی شامل ہوگا،

امام صاحب فرماتے ہیں :-

"نبوت انسانیت کے رتبہ سے بالاتر ہے جس طرح انسانیت حیوانیت سے بالاتر ہے،........ وہ عطیۂ الٰہی اور موہبتِ ربّانی ہے سعی ومحنت اور کسب وتلاش سے نہیں ملتی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسٰلَتَہٗ (انعام۔ ۱۵)	اللہ بہتر جانتا ہے کہ جہاں وہ اپنی پیغمبری کا منصب بنائے،
وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ رُوْحًا[1] مِّنْ اَمْرِنَا، مَاکُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰکِنْ جَعَلْنٰہُ نُوْرًا نَّھْدِیْ بِہٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا، (شوریٰ - ۵)	اور اسی طرح ہم نے تیرے پاس اپنے حکم سے ایک روح بھیجی تو پہلے نہیں جانتا تھا، کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا؟ لیکن اُس کو ہم نے ایک نور بنایا ہے جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں

اس موقع کے لئے صریح آیت یہ ہے،

ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ، (جمعہ ا)	یہ (نبوّت) خدا کا فضل ہے جس کو وہ چاہے دے،

---

[1] امام صاحب نے آیت پوری نہیں لکھی ہے، میں نے اپنی طرف سے آیت پوری لکھ دی ہے،

گو یہ صحیح ہے کہ وہ عبادات وریاضات جو فکر و مراقبہ پر مشتمل ، اور ریا اور شہرت طلبی سے پاک ہوں نفس میں آثار وحی کے قبول کرنے کی استعداد پیدا کر دیتے ہیں تاہم نبوت کا منصب خاص محض اتفاقی نہیں ، جو محنت اور کوشش سے کسی کو حاصل ہو جائے ، بلکہ جس طرح نوعِ انسان کا انسان اور فرشتوں کا فرشتہ بن جانا ، اُن کے افراد کی سعی و محنت کا مرہونِ منت نہیں ، اسی طرح نوعِ انبیاء کا نبی بن جانا ، اُن کے افراد کی کوشش اور محنت سے ممکن نہیں ، ہر انسان کا بچہ اپنی ذاتی محنت سے نہیں ، بلکہ فیاضِ عالم کی بخشش سے انسانیت کا مرتبہ حاصل کرتا ہے ، مگر انسانیت کے ممکن کمالات کو بالفعل حاصل ہو جانے کے لئے اس کو یقیناً کچھ نہ کچھ جد و جہد کرنی پڑتی ہے ، اسی طرح نبوت نوعِ انبیاء کے لئے اکتسابی چیز نہیں لیکن منشائے نبوت کے مطابق ریاضت اور عمل ، قبولِ وحی کی استعداد اور تیاری کے لئے البتہ ضروری ہیں ،

چنانچہ اسی اصول کے مطابق اکثر پیغمبروں کے آغاز وحی کے حالات میں آپ کو ملیگا ، کہ انھوں نے ایک زمانہ تک عبادت و مراقبہ میں عمر بسر کی ، ایک ایک مہینہ ، ایک ایک چلہ اس طرح گذارا کہ وہ مادی دنیا کی آلایشوں سے یکسر الگ ہو گئے تورات میں حضرت موسیٰؑ کی نسبت ہے کہ کتاب ملنے سے پہلے وہ چالیس روز تک کوہِ طور پر روزہ کی حالت میں رہے ، اسی طرح انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے کہ وہ ایک سنسان جنگل میں چالیس روز تک روزہ رکھکر عبادتوں میں مصروف رہے ، اور وحی سے پہلے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا غار حرا میں مہینوں عزلت گزین رہنا ، اور فکر و مراقبہ اور عبادت اور ریاضت میں مصروف رہنا سب کو معلوم ہے ،

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نبوت سے پہلے حرا میں جا کر جب عبادت میں مشغول ہوئے تو

چاہا کہ اس جماعت کو بزورِ شمشیر مٹا دیں، اُس نے اپنی جان کے بچاؤ کی تدبیریں کیں، اور اُن کی پر زور سازشوں اور کوششوں کے سیلاب کو پہاڑ بن کر روکا، اس کشمکش نے خونریز لڑائیوں کا ایک سلسلہ چھیڑ دیا جو متصل دس سال تک قائم رہا، رفتہ رفتہ اعجازِ نبوت حسنِ تدبیر، لطفِ اخلاق سے تمام معرکے سر ہوئے اور پھر ایک پُر امن نظام قائم ہوگیا، بے شبہ یہ کارنامہ بھی کچھ کم مستوجبِ منقبت نہیں لیکن ناظرین اس نکتہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوں گے کہ ہم کس (ذاتِ اقدسؐ) کے سوانح لکھ رہے ہیں،

یہ جو کچھ ہوا اور پیش آیا وہ گو نہایت عجیب، حیرت انگیز اور کرشمۂ ربانی کا پیدا مظہر ہے تاہم وہ درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی، براہِ راست اور مقصود بالذات کارنامہ نہیں، وہ اتفاقی حوادث ہیں، جو اسلام کی دعوت و اشاعت کی راہ میں دشمنوں کی مخالفت سے پیش آگئے، آپؐ کے اصلی پیغمبرانہ کارنامے وہ ہیں، جو اگر یہ اتفاقی واقعات رونما نہ ہوئے ہوتے، تب بھی ظاہر ہی ہوتے، اور وہی آپؐ کی سیرۃ مبارکہ کے اصلی وقائع اور سوانح ہیں یعنی عرب میں سرتا پا روحانی و اخلاقی انقلاب پیدا کر دینا، تمام عالم کے سامنے کامل ترین اور اخیر شریعت کو پیش کرنا، دنیا کا گوشہ گوشہ کو ترانۂ توحید اور سرود محبت سے معمور کرنا ظلمت کدۂ عالم کو سراجِ منیر بن کر بقعۂ نور بنا دینا گمراہوں کو راستہ بتانا بھولوں کو یاد دلانا، بندوں کا رشتہ خدا سے جوڑنا غلط اوہام کو مٹانا، اخلاقِ فاضلہ سکھانا، گناہوں کے دفتر کو دھونا، انسانوں کو شیطانوں کے دامِ فریب سے نکال کر فرشتوں کی صف میں کھڑا کرنا، دنیا کو رفق و محبت، لطف و شفقت اور برادرانہ مساوات کی تعلیم دینا حکمت و دانائی، پند و موعظت، اور تہذیب و تمدن کے رموز سکھانا، روحانیت کی برباد شدہ دنیا کی دوبارہ تعمیر، اور قلوب و ارواح کے ویران گھروں کی از سر نو آبادی، الغرض خاتم النبیینؐ کا اصلی کام ایک شریعتِ ابدی کی تاسیس، مذاہبِ عالم

تمام دنیا کی قوتیں اُس کی قوت کے سامنے بالآخر طوعاً و کرہاً سرنگوں ہو جاتی ہیں باایں ہمہ وہ مغرور جابر، جفا پیشہ، بدخو، اور درشت مزاج نہیں ہوتا، وہ پیغمبری اور رسالت کے بارِ عظیم کو اُٹھاتا ہی اور اس کا پورا حق ادا کرتا ہے، اور تمام عالم میں اپنی رحمت کا فیض جاری کرتا ہے،

نبوت و رسالت کے ثبوت کا اجمالی طریقہ

نبوت کے ثبوت کے دو طریقے ہیں، ایک اجمالی، اور دوسرا تفصیلی، اجمالی طریقہ یہ ہے کہ جس طرح انسان کو حیوان پر نفسِ ناطقہ کی بنا پر فضیلت حاصل ہی کہ یہ عقلی و دماغی خصوصیت حیوان میں نہیں پائی جاتی جس کے بل پر انسان حیوان پر حکمرانی کرتا ہے اور اس کا مالک بنا ہوا ہے اور اُس کو اپنے کام میں لگائے ہوئے ہے، اسی طرح انبیاء علیہم السلام اپنے نفوسِ قدسیہ کی بنا پر تمام انسانوں پر برتری حاصل ہے، وہ اپنے ان قدسی نفوس اور پیغمبرانہ قوت سے دوسروں کو راہِ راست سوجھاتے اور خود راہِ راست پر قائم رہتے ہیں، اُن کی پیغمبرانہ عقل دنیم تمام انسانی عقلوں سے بالاتر ہوتی ہے، اور اُن کو وہ ربانی خصوصیت حاصل ہوتی ہے، جس کی بنا پر وہ تمام انسانی نفوس کی تدبیر کا فرض انجام دیتے، اور اُن پر قابو پاتے، اور اُن کو کام میں لگاتے ہیں، اور جس طرح انسانوں کے عجیب و غریب کام حیوانوں کو حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں اسی طرح پیغمبروں کے عجیب غریب کام انسانوں کو معجزہ نظر آتے ہیں،

اور اگرچہ نبی عام انسانوں کے ساتھ بشریت اور انسانیت میں برابر کا شریک ہوتا ہے، مگر عقلیت و معنویت میں وہ اُن سے بالکل الگ ہوتا ہے، کیونکہ اس میں وحی کے قبول کرنے کی جو صلاحیت ہوتی ہے، وہ دوسرے انسانوں میں نہیں ہوتی، اسی مفہوم کو قرآن نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے،

اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ — میں تمھاری ہی طرح بشر ہوں مجھ پر وحی
(کہف ۱۲) کی جاتی ہے،

دیکھو کہ بشریت میں گو پیغمبر کو دوسرے انسانوں کے مثل کہا ہے، مگر ساتھ ہی وحی کے فرق و
امتیاز کو دونوں میں حدِ فاصل قرار دیدیا ہے،

نبوّت کے تفصیلی ثبوت کے تین طریقے ہیں،

پہلا طریقہ — انسان میں تین قسم کے اختیاری حرکات پائے جاتے ہیں، فکری، قولی، عملی ان
تینوں سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں، وہ اچھے بھی ہوتے ہیں، اور بُرے بھی، فکر یعنی راے صحیح بھی
ہوتی ہے اور غلط بھی، قول سچ بھی ہوتا ہے اور جھوٹ بھی، عمل اچھا بھی ہوتا ہے اور بُرا بھی،
اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحیح اور غلط، سچ اور جھوٹ اور اچھے اور بُرے میں تمیز کیونکر ہو؟
پھر کیا یہ تمیز ہر شخص کرسکتا ہے یا کوئی نہیں کرسکتا، یا بعض کرسکتے ہیں، اور بعض نہیں، پہلے دو احتمال بد ہتہ
غلط ہیں اب رہ گیا تیسرا احتمال، یعنی بعضے انسان ایسے ہوتے ہیں، جو ان حدود کو متعین کرسکتے ہیں کہ
فلاں راے و عقیدہ صحیح اور فلاں غلط ہے، فلاں قول سچ، فلاں جھوٹ ہے، اور فلاں فعل اچھا اور
فلاں برا ہے، جس شخص کو خالقِ فطرت اپنے فضل و کرم سے یہ قوت عطا فرماتا ہے، وہی پیغمبر اور
صاحبِ شریعت ہوتا ہے،

دوسرا طریقہ — نوعِ انسان کو اپنے اختیاری اعمال و حرکات اور مصلحتی معاملات میں باہمی اجتماع اور
تعاون کی ضرورت ہے، اگر انسانوں میں باہم یہ اجتماع اور تعاون نہ ہوتو نہ تو انسان کا کوئی فرد زندہ
رہے، نہ جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت ہوسکے، اسی بقاے نفس اور جان و مال و آبرو

کے تحفظ کے اصول و آئین کا نام شریعت ہی، انسان کو اس کے لئے دو قسم کے کاموں کی ضرورت ہی، ایک یہ کہ اچھے کاموں میں سب مل کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں، اس کو تعاون کہتے ہیں، اور دوسرے یہ کہ بُرے کاموں سے ایک دوسرے کو باز رکھنے کی کوشش کریں، اسکو تمانع کہتے ہیں، اسی تعاون کے ذریعہ سے انسان، کھانے، پہننے اور رہنے کے سامان و اسباب فراہم کرتا ہے، تعاون کے ذریعہ نکاح و قرابت، اولاد و اعزہ اور احباب و دوست کے حقوق و تعلقات پیدا ہوتے ہیں، اور تمانع کے ذریعہ سے نوعِ انسانی، اور افراد انسانی کی زندگی، اور اُن کی دولت و جائداد، اور عزت و آبرو کے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے، اس تعاون اور تمانع کے اصول ضرور ہے کہ مرتب، محدود اور معلوم ہوں اور وہ اس طرح بنائے جائیں جن میں کسی شخص، خاندان، قبیلہ، قوم، اور ملک کے فوائد کی ترجیح نہ ہو، بلکہ اُن میں سب کا برابر فائدہ ہو، یہ ظاہر ہے کہ ایسا قانون انسانوں کے ذریعہ نہیں بلکہ وحی ربانی، اور تعلیم الٰہی سے بن سکتا ہے، مطلب یہ ہے کہ محض کسی انسان کی عقل سے جو بہر حال کوئی خاص شخص یا کسی خاص خاندان، قبیلہ، قوم اور ملک کا ہوگا، ایسا غیر جانبدارانہ قانون جس میں تمام مخلوقات کی حیثیت یکساں ہو اور کسی طرف پلہ جھکنے نہ پائے، اور تمام عالم کے لئے یکساں واجب العمل ہو، محال ہے، اس لئے ضرور ہے کہ یہ اصول اس کی طرف سے وحی ہوں جس کے ہاتھ میں نظامِ عالم کی باگ ہے، اور جو پورے نوعِ انسانی کے اندرونی و بیرونی احوال و کیفیات کے رموز سے باخبر ہے، یہ اصول خلاقِ عالم کی طرف سے جس شخص پر وحی ہوتے ہیں، وہی پیغمبر اور رسول ہوتا ہے،

تیسرا طریقہ یہ وہ طریقہ ہے کہ جس نے اس کو نہیں جانا، اس نے نبوت کی حقیقت نہیں پہچانی،

پہلے یہ جاننا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کے دو کام ہیں، خلق (پیدا کرنا نیست سے ہست کرنا) اور اَمر (جو موجود و ہست ہے، اُس کو اپنی مصلحت کے مطابق حکم دینا) کائنات ان ہی دو چیزوں سے عبارت ہے، تو جس طرح فرشتے خالق اور مخلوق کے درمیان خلق و ایجاد و پیدایش اور پیغام رسانی میں واسطہ ہیں اسی طرح پیغمبر خدا اور بندہ کے درمیان احکام پہنچانے میں واسطہ ہیں ،، اور جس طرح خدا پر بحیثیت خالق اور آمر (پیدا کرنے والے اور حکم دینے والے) کے ایمان لانا واجب ہے، اسی طرح فرشتوں پر اس حیثیت سے کہ وہ خالق و مخلوق کے درمیان ایجاد و پیدایش اور پیغام رسانی کے واسطہ ہیں ایمان لانا ضروری ہے ،، اور اسی طرح پیغمبروں پر اس حیثیت سے ایمان لانا فرض ہے کہ وہ خدا اور بندہ کے درمیان حکم کے پہنچانے میں واسطہ ہیں ،

اس کے بعد حسب ذیل مقدمات ذہن نشین رکھنے چاہئیں ،

۱۔ چونکہ ممکن کا وجود اور عدم برابر ہے، اس لیے ممکن ہے کہ وجود میں آنے کے لئے ایک مرجح کا ہونا ضروری ہے جس کی وجہ سے وجود کو عدم پر ترجیح ہو، اور وہ شے عدم سے وجود میں آسکے یہی امر مرجح ممکن کی علت ہوتا ہے ،

۲۔ ہر قسم کے حرکات کے لیے ایک محرک کی ضرورت ہوتی ہے، جو مبدءِ حرکت کی تجدید کرتا رہے، حرکات کی بھی دو قسمیں ہیں، طبعی اور ارادی ،، ارادی حرکت کے لئے ضرور ہے کہ اس کے محرک میں ارادہ اور اختیار پایا جائے، اسی طرح طبعی حرکت کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ اس کا محرک عقل اور تدبیر والا ہو، آفتاب و ماہتاب اور دوسری آسمانی مخلوقات کی حرکات گو طبعی ہیں تاہم اُن کو حرکت دینے کے لئے کسی عاقل و مدبر کی ضرورت ہے اسی لئے قرآن نے انکے لئے کہا

وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَھَا (حم سجدہ) خدانے ہر آسمان میں اُسکا فرض ادرکام وحی کیا

۳۔ اب جس طرح انسانی حرکات کو ارادہ اور اختیار کی حاجت ہے یعنی ارادہ اور اختیار کے بغیر وہ وقوع میں نہیں آسکتیں، اسی طرح ان حرکات کو ایک ایسے رہنما کی ضرورت ہے، جو ان اعمال وحرکات کا ٹھیک راستہ اور صحیح طریقہ بتائے، اور حق کو باطل سے، سچ کو جھوٹ سے، اور خیر کو شر سے ممتاز کردے

۴۔ خدا کے حکم دو قسم کے ہیں **تدبیری** اور **تکلیفی**، پہلا حکم تمام نظامِ عالم میں جاری ہے جس کی بنا پر تمام عالم میں تدبیر اور انتظام کا سلسلہ نظر آتا ہے، قرآن مجید میں ہے،

وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ — اور سورج اور چاند اور ستارے اس کے
مُسَخَّرَاتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ — حکم کے تابعدار ہیں، اسی کا کام ہے بنانا
وَالْاَمْرُ، (اعراف) — اور حکم فرمانا،

تکلیفی حکم صرف انسانوں کے لئے ہے، چنانچہ قرآن میں ہے،

یَاۤ اَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ — اے انسانو! اپنے اس رب کی عبادت
الَّذِیْ خَلَقَكُمْ، (بقرہ ۔ ۳) — کرو جس نے تم کو پیدا کیا،

مقدماتِ مذکورہ بالا سے ثابت ہوا، کہ انسان کے تمام حرکات ممکن ہیں، اس لئے مرجح کی ضرورت ہے، اختیاری ہیں، اس لئے عقل کی ضرورت ہے خیر وشر کے محتمل ہیں، اس لئے رہنما کی ضرورت ہے اسی رہنما کا نام پیغمبر ہے،

نظامِ عالم میں خدا کا جو تدبیری حکم نافذ ہے، وہ ملائکہ کے ذریعہ سے ہے اسی قیاس پر انسانوں

میں خدا کا جو تکلیفی حکم نافذ ہے، وہ بھی ایسے ہی نفوسِ قدسیہ کے ذریعہ سے ہوگا، اور اُن ہی کا نام پیغمبر ہے،

شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کے چھٹے مبحث کے دو ابتدائی بابوں میں اس پر بحث کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ کمال نکتہ سنجی سے کی ہے، شاہ صاحب کی تقریر کو ہم اپنے الفاظ میں لکھتے ہیں :-

نبی کی ضرورت

انسان میں دو قسم کی قوتیں ہیں، بہیمی اور ملکوتی، کھانا، پینا، شہوت، حرص وطمع، استیلا، وجبر وغیرہ افعال، بہیمی قوت کے آثار ہیں، اور غور وفکر، علم ومعرفت حسن اخلاق صبر وشکر، عبادت وطاعت وغیرہ ملکوتیت کے نتائج ہیں، انسان کی روحانی کامیابی کیلئے ضروری ہے کہ اس کی بہیمی قوت اُس کی ملکوتی قوت کے تابع ہو، اگرچہ عقل سلیم اُن اصول اور طریقوں کو معلوم کرسکتی ہے جن کے ذریعہ سے بہیمیت کے تابع ملکوتیت ہونے کے فائدے اور گناہ وعصیاں کے نقصانات ظاہر ہوں، عقل سلیم کے اس علم سے انسان فائدہ اٹھا کر اپنی اصلاح کرسکتا ہے، مگر یہ تو امکانِ عقلی ہے، عملی کیفیت یہ ہے، کہ انسان کی آنکھوں پر موجودہ دنیاوی لذائذ حرص وطمع اور بیجا خواہشوں اور غفلتوں کے اتنے تو بر تو پردے پڑ جاتے ہیں کہ اس کے اصلی اور فطری وجدان اور قوتِ احساس کا مادہ فاسد ہو جاتا ہے، جیسے بیماری میں انسان کی زبان کا ذائقہ جب بدل جاتا ہے، تو میٹھی سی میٹھی چیز اس کو کڑوی معلوم ہوتی ہے، اسی طرح اندرونی وجدان واحساس کے فاسد ہو جانے سے بھی وہ حق وباطل، خیر وشر اور نیک وبد کی تمیز کو بھول جاتا ہے اس لئے نوعِ انسان کو ایسے صحیح رہنماؤں، اور روحانی معلموں کی ضرورت ہے، جن کے

احساس و وجدان کا آئینہ گرد آلود نہ ہو،

اگر افراد، جماعات اور اہل ملک کو ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اپنی سیاست کے زور سے ان میں صلح و آشتی اور امن و امان پیدا کر دے، تو ایک قوم کی قوم بلکہ کل دنیا کے لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت کیوں نہ ہو، جو ہر گروہ کی استعداد کو پیش نظر رکھکر اُس کے مطابق، اُس کے حقوق و فرائض کی تعیین کرے، ایسے لوگ جو ایسے اہم فریضہ کو انجام دیسکیں، اُسی طرح کم ہیں، جس طرح دوسرے اصناف کے اہل کمال، انسانوں کے معمولی پیشیوں، نجاری اور لوہاری کو دیکھو کہ کس قدر معمولی ہیں، مگر اُن کو کرنا بھی ہر شخص کا کام نہیں، یہ پیشے بھی ایسے لوگوں کے بغیر وجود میں نہیں آئے، جن کو ان کاموں کا خاص ذوق و وجدان تھا، اور اُن کو ان کاموں کی خاص فطری استعداد ملی تھی، جس کے ذریعہ سے انھوں نے اس فن کو تکمیل تک پہنچایا، اور اس کے کس اصول و قواعد وضع کئے، اور بعد کے آنے والوں نے اُن کی تقلید کی، اور اس تقلید سے مدارج علیا تک پہنچے، پھر اخلاق اور روحانیات اور ملک و ملّت کے مصالح و فوائد عامہ کا فن جس قدر اہم اور نازک ہے، کیا اس کو سمجھنا اور وضع کرنا ہر کس و ناکس کا کام ہو سکتا ہے،

نبی کی عصمت

پھر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے، کہ جو شخص اس رہنمائی کے منصب کا مدعی ہو، وہ اپنی نسبت یہ بھی ثابت کرے، کہ وہ ان اصول و قواعد سے بخوبی واقف ہے، اور وہ اپنے علم اور تعلیم میں غلطی اور گمراہی سے محفوظ ہے، اور یہ اُس وقت تک ممکن نہیں جبتک اس کے علم اور تعلیم کا ماخذ اور سرچشمہ غلطیوں سے پاک اور محفوظ نہ ہو، اُس کو ان امور کا علم اسی طرح وجدانی ہو، جس طرح انسان کو بھوک اور پیاس کا وجدان ہوتا ہے، کیکسی کو اس علم میں کہ اس کو بھوک یا پیاس

معلوم ہوتی ہے کوئی غلطی ہو سکتی ہے، اسی طرح اس کو حق و باطل، خیر و شر، اور نیک و بد امور کے درمیان فیصلہ اسی طرح قطعی معلوم ہوتا ہے، جس میں نہ دلیل کی حاجت ہوتی ہے اور نہ عقلِ معاش کی ضرورت ہوتی ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر بھوک اور پیاس ہونے کا علم اس طرح رکھدیا ہے کہ ہمارے سامنے کوئی معاند کتنی ہی دلیلیں پیش کرے کہ ہم کو بھوک یا پیاس نہیں ہے ہم کبھی اپنے اس وجدانی یقین سے جس کو خدا نے ہمارے اندر پیدا کر دیا ہے، اس معاند کے ان عقلی دلائل سے متأثر ہو کر دست بردار نہیں ہو سکتے، اور اپنے یقین کو غلط نہیں کہہ سکتے، بعینہ اسی طرح ان نفوسِ قدسیہ کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے خاص قسم کا وجدان و ذوقِ سلیم رکھدیا ہے جس کا عمل ہمیشہ صحیح، اور جس کا احساس ہمیشہ درست، اور جس کا فیصلہ ہمیشہ ناطق ہوتا ہے،

نبی کی محبوبیت | ایسا شخص جب لوگوں کے سامنے آتا ہے، اور لوگوں کو بار بار کے تجربے سے اسکی صداقت، سچائی اور راست بازی کا یقین ہو جاتا ہے، اور اس کے ہاتھ سے جو تصرفات صادر ہوتے ہیں، اُن سے اُس کا مقربِ بارگاہِ الٰہی ہونا بھی ظاہر ہو جاتا ہے، تو ہر طرف سے لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں اور اسکی محبت کی راہ میں جان و مال اور اہل و عیال سب کو قربان کر دیتے ہیں،

شاہ صاحب اس کے بعد دوسری فصل میں اسی "بحثِ نبوت" کو ایک اور انداز سے لکھتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے،

مصلحین | فضل و کمال، اور علم و عمل کے لحاظ سے انسانوں کے مختلف درجے ہیں اُن میں سب سے بڑا درجہ مفہّمین کا ہے، اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی قوتِ ملکیہ نہایت بلند ہے اور جن میں یہ قدرت ہوتی ہے کہ سچے اور صحیح جذبہ سے ایک خاص نظام کو دنیا میں قائم کر دیں، اور اُن پر بارگاہِ الٰہی سے ایسے

علوم اور احوال کا ترشح ہوتا ہے جن میں ربانی آثار نظر آتے ہیں، ایسے لوگ معتدل مزاج اور اپنی
صورت و سیرت میں درست، اور عقل و ذکاوت میں متوسط ہوتے ہیں، نہ اس قدر بلید کہ جزئیات
سے کلیات تک اُن کا پہنچنا مشکل ہو، نہ اس قدر تیز کہ جزئیات اور محسوسات سے قطع نظر کر کے ہمیشہ
ذہنیات اور تخیلات میں مبتلا رہیں، صحیح فطرت پر وہ قائم رہتے ہیں طور و طریق اُن کے پسندیدہ
ہوتے ہیں، خدا کے ساتھ اُن کا تعلق عبادت و طاعت سے اور بندوں کے ساتھ عدل و انصاف
سے قائم رہتا ہے، وہ اپنے فیصلوں میں شخصی اور جزئی بھلائی اور منفعت کا لحاظ نہیں کرتے، بلکہ
منفعت عامہ اور تدبیر کلی کا لحاظ کرتے ہیں، وہ براہ راست کسی کو تکلیف نہیں دیتے الّا یہ کہ
منفعتِ عامہ کا حصول اور بڑی تعداد کا فائدہ چھوٹے سے نقصان سے حاصل ہو تو وہ اس جزئی
تکلیف اور شخصی نقصان کو گوارا کر لیتے ہیں، وہ ہمیشہ اپنے کاروبار میں عالمِ غیب کی طرف مائل
رہتے ہیں جس کا اثر اُن کی بات چیت، کام، کاج، اور معاملات میں نمایاں ہوتا ہے، کارکنانِ عالم
اُن کی تائید و نصرت میں رہتے ہیں معمولی ریاضت سے اُن کے لئے قربِ سکینت کے وہ دروازے
کھلجاتے ہیں، جو دوسروں کے لئے نہیں کھلتے،

مفہمین کے اقسام | مُفَهَّمِین کے درجہ بدرجہ مختلف اصناف ہیں، اور اُن کی مختلف استعدادیں ہیں، اور
اس بنا پر اُن میں سے ہر ایک کے الگ الگ اصطلاحی نام ہیں، جو زیادہ تر عبادات کے ذریعہ سے
تہذیبِ نفس کے علوم پاتا ہے، وہ کامل ہے، اور جو اخلاقِ فاضلہ اور تدبیر منزل کے اصول حاصل
کرتا ہے، وہ حکیم ہے، جو عمومی تدبیر و سیاست کے علوم کا فیض پاتا ہے، اور اُن کے مطابق اسکو
لوگوں میں عدل کے قیام اور ظلم کے دور کرنے کی توفیق ملتی ہے وہ خلیفہ ہے، اور جس پر ملاءِ اعلیٰ کا

نزول ہو، اور وہ اس سے تعلیم پائے، اور اس کو مخاطب کرے، اور مختلف قسم کے تصرفات اس سے صادر ہوں، وہ مؤید بروح القدس کہلاتا ہے، اور وہ جس کی زبان اور دل میں نور ہو کہ لوگ اس کی صحبت اور پند و موعظت سے نفع اٹھائیں، اور وہ نور اس سے منتقل ہو کر اس کے رفقائے خاص میں منتقل ہو جس سے وہ بھی کمال کے درجہ تک پہنچ جائیں، اس کا نام ہادی اور مزکی (پاک کرنیوالا) ہے اور جس کے علم کا بڑا حصہ ملت کے اصول و قواعد اور اسکی مصلحتوں کی واقفیت ہو اور ملت کے منہدم ارکان کو دوبارہ قائم کرنے کی طاقت ہو، وہ امام کہا جائے گا، اور جس کے قلب میں یہ ڈالا جائے کہ وہ لوگوں کو اُن کی اس مصیبتِ عظمیٰ سے خبردار کرے، جو اس دنیا میں اُن کے لئے اُن کے اعمال کے نتیجے کے طور پر مقدر ہے، اور اُن کی بداعمالی کے سبب سے اُن سے حق تعالیٰ کی رحمت کو جو دوری ہے، یا قبر اور حشر میں اُن پر جو مصیبتیں آنے والی ہیں، اس کا نام **منذر** (ڈرانے والا، ہشیار کرنے والا) ہے،

اور جب حکمتِ الٰہی کا یہ اقتضا ہوتا ہے کہ مخلوق کی ہدایت و اصلاح کے لئے ان مفہمین میں سے کسی کو بھیجے، تو اس کی آمد مخلوق کے تاریکی سے نکل کر، روشنی میں آنے کا سبب ہو جاتی ہے اور وہ بندوں پر یہ فرض قرار دیتا ہے، کہ وہ دل و جان سے اُس کی اطاعت کریں، اور بارگاہِ الٰہی میں تاکید ہوتی ہے، کہ جو اس کی اطاعت کرے، اس سے خوشنودی، اور جو اُس سے مخالفت کرے اس سے ناخوشی ظاہر کی جائے یہی شخص **نبی** ہوتا ہے،

نبی کی دو بعثتیں نبیوں میں بڑا درجہ اس کا ہوتا ہے جس کو اس پیغمبرانہ بعثت کیساتھ ایک اور بعثت ملتی ہے، اور وہ یہ کہ مرادِ الٰہی یہ ہوتی ہے کہ اس نبی کے ذریعہ سے اس کی قوم، اور اس کی قوم کے

ذریعہ سے دوسری قومیں ظلمت سے نکل کر نور میں آئیں تو اس نبی کی ذاتی بعثت کا نام بعثتِ اولیٰ اور اُس کی قوم کی دوسری قوموں کی ہدایت کے لئے نامزدگی بعثتِ ثانیہ ہی،

نبیؐ کی پہلی بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے،

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ	وہی خدا جس نے اَن پڑھوں میں اُن ہی
رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ	میں سے ایک رسول بھیجا، جو اُن کو اُسکی آیتیں
آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ	سُناتا اور اُن کو پاک بناتا، اور اُن کو کتاب
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ، (جمعہ-۱)	اور دانائی سکھاتا ہی،

اور دوسری بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے،

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں کے لئے وجود
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ	میں لائی گئی، نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی
عَنِ الْمُنْكَرِ، (آلِ عمران-۱۲)	سے باز رکھتے ہو،

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ بعثت انکی اُمت کے لئے ہوئی، ویسی ہی اُن کی امت کی بعثت دوسری قوموں کی طرف ہوئی۔ اور اسی معنی میں قرآن پاک کی یہ آیت بھی ہے،

لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ	تاکہ رسول تم پر گواہ ہو، اور تم، لوگوں
وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ، (حج-۱۰)	پر گواہ ہو،

اسی لئے احادیث میں ہے کہ آپ نے صحابہ سے فرمایا، فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَلَمْ

بُعِثْتُمْ مُیَسِّرِیْنَ" تم آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو سختی کرنے والے بنا کر نہیں"، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاء علیہم السلام آئے، وہ ان مختلف مذکورۂ بالا مناصب میں سے ایک دو منصب کے ساتھ مبعوث ہوئے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام منصبوں پر ایک ساتھ سرفراز ہوئے اور یہ تمام فنون آپ کی واحد ذات پر جمع کر دیئے گئے، اور آپ کو یہ دونوں بعثتیں بھی بکمالِ استحقاق عطا ہوئیں،

بعثت کے لئے کسی قوم کا انتخاب

یہ بھی واضح ہو کہ رسول کی بعثت کے لئے حکمتِ الٰہی کا اقتضا، اسلئے ہوتا ہے کہ عالم کی عمومی تدبیر و نظم و نسق میں جو اضافی خیر معتبر ہے، وہ ان دونوں اسی رسول کی بعثت میں منحصر ہوتا ہے، اور اس بعثت کے حقیقی سبب کا علم اُسی دانائے غیب کو ہے مگر اتنی بات ہم قطعاً جانتے ہیں کہ کچھ اسباب ایسے ہیں جو بعثت کے ساتھ ضرور پائے جاتے ہیں اور امت پر اُس رسول کی اطاعت اسی لئے فرض ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کی تمام قوموں سے جس قوم کی نسبت یہ جانتا ہے کہ اس میں خدا کی اطاعت و پرستش کی استعداد اور اُس میں اللہ تعالیٰ کے فیضان اُٹھانے کی صلاحیت زیادہ ہے، اس میں وہ رسول مبعوث ہوتا ہے، اور چونکہ اس قوم کی اصلاح اسی پیغمبر کی پیروی اور اتباع میں منحصر ہوتی ہے، اس لئے بارگاہِ الٰہی کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت سب پر واجب کی جائے،

بعثت کا زمانہ

اس موقع پر چند باتیں اور قابلِ لحاظ ہیں، اگر یہ وقت وہ وقت ہوتا ہے کہ کوئی نئی حکومت اس لئے قائم کیجائے تاکہ اس کے ذریعہ سے ان دوسری حکومتوں کو جو دنیا میں فساد اور شر کا موجب بنی ہوئی ہیں، مٹا دیا جائے، تو ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ اُس شخص کو بھیجتا ہے

جو پہلے اس قائم ہونے والی سلطنت کی قوم کی اصلاح کرے، اور اس دین کو درست کرے تاکہ اس کے ذریعہ سے دوسری قوموں کی اصلاح ہو، جس طرح سے ہمارے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی زندگی کی بقا، اور اس کو اپنا برگزیدہ بنانا چاہتا ہے، تو اس میں وہ ایک ایسے شخص کو بھیجتا ہے جو اس کی کجی کو دور کر دے، اور اسکو کتاب الہٰی کی تعلیم دے کر اس کو اس کا مستحق بنا دے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بنی اسرائیل میں بعثت ہوئی، یا کسی قوم کے متعلق قضائے الٰہی کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو مزید زندگی ملتی رہے، اور اس کا دین و سلطنت برقرار رہے، تو مجددین نبوت پیدا ہوتے ہیں، جیسے بنی اسرائیل کے مختلف زمانوں میں حضرت داؤدؑ حضرت سلیمانؑ اور پیغمبروں کے ایک گروہ کی بعثت ہوتی رہی،

نبی کی یقینی کامیابی ہر نبی کی بعثت کے دور میں اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کو اور اس کے دوستوں کو کامیابی اور اس کے دشمنوں کو پے درپے ناکامی ہو، یہاں تک کہ حق استوار اور دعوت مکمل ہو جائے،

قرآن پاک میں ہے،

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا	اور ہماری بات، اپنے پیغمبر بندوں کے متعلق
الْمُرْسَلِينَ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ	پہلے ہی طے ہو چکی ہے، کہ انہی کی مدد کیجائیگی، "
وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ (الصّٰفّٰت - ٥)	ہمارا ہی لشکر غالب ہوگا،

ان دونوں بزرگوں (امام غزالی، اور شاہ ولی اللہ صاحب) نے اپنے اپنے الفاظ میں جو کچھ کہا ہے، وہ حرف بحرف صحیح ہے،" انبیائے کرام علیہم السلام کے احوال مبارکہ اور سوانح مقدسہ پر جس کی نظر عمیق و وسیع ہوگی، اس کو ان اصول کے تسلیم کرنے میں ذرہ بھر شک نہیں ہو سکتا،"

اُن پر استدلال، واقعات اور حوادث سے اسی طرح کیا جا سکتا ہے، جس طرح نفسیاتِ اجتماع (سائیکالوجی آف پیپل) یا نفسیاتِ رہنمائی (سائیکالوجی آف لیڈرشپ) پر واقعات کے تسلسل اور تواتر سے کرتے ہیں، اس طرح امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب نے اوپر کے صفحات میں جو کچھ کہا ہے، ہم مجازاً کہہ سکتے ہیں کہ وہ "نفسیاتِ نبوت" کے گویا ابواب ہیں،

موجودہ زمانہ میں خیالات، طرز گفتار، اسلوبِ تحریر اور طریقۂ استدلال، غرض ہر چیز میں فرق ہوگیا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اہلِ زمانہ سے اُن کی اصطلاح میں گفتگو کی جائے، اور جو اصول قائم کیا جائے، اس پر قرآن مجید سے بھی ساتھ ساتھ استدلال کیا جائے، کہ عقل و نقل دونوں دربار دن میں کہنے والے کی بات کا اعتبار ہو،

غور کرنے سے یہ معلوم ہوگا کہ دنیا کا ذرہ ذرہ جس غرض و مقصد کے لئے پیدا ہوا ہے، وہ اپنے ذاتی ارادہ اور قصد کے بغیر خود بخود اس کو پورا کر رہا ہے، اور اس کے خالق نے اس کے روز پیدائش سے اس کو جو حکم دیدیا ہے، اس کی تعمیل سے وہ سرِمو انحراف نہیں کرتا، آسمان سے لیکر زمین تک ہر چیز اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی ہے، آفتاب دنیا کو گرمی اور روشنی دینے پر مامور ہے، اور وہ ہر آن اور ہر لحظہ اس میں مصروف ہے، زمین کو سرسبزی اور شادابی کا کام سپرد ہے، اور وہ اس کو انجام دے رہی ہے، ابر کو سیرابی اور گوہر باری کا حکم ہے، اور وہ اس کی تعمیل کر رہا ہے، درخت پھل دینے پر مقرر ہیں اور وہ اس کام میں لگے ہوئے ہیں، حیوانات جن کاموں پر مامور ہیں وہ بخوشی ان کو کر رہے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا انسان بھی اس دنیا میں کسی کام پر اسی طرح مقرر ہو کر آیا ہے، یا نہیں؟ اگر آیا ہے، تو کیا اس کو انجام دے رہا ہے؟

آؤ انسان کو غور سے دیکھیں، بظاہر وہ بھی کھاتا پیتا چلتا پھرتا، اٹھتا بیٹھتا زندگی گذارتا ہے اور پھر مرجاتا ہے، کیا اس کی زندگی کا بس اسی قدر مقصد ہے اگر یہی ہے تو پھر انسان اور حیوان میں کیا پہچان؟ اور ذی ارادہ اور غیر ذی ارادہ میں کیا امتیاز؟ اور صاحب عقل اور بے عقل میں کیا فرق؟ چنانچہ قرآن پاک اسی لئے انسانوں سے سوال کرتا ہے، اور یہی سوال کرتا ہے،

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا (مومنون) کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا،

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَكَ سُدًى (قیامہ) کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ دیا جائیگا،

اس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی کسی غرض و مقصد کیلئے پیدا ہوا ہے لیکن وہ غرض و مقصد کیا ہے؟

انسان کی پوری ہستی اگر کائنات کے صفحہ سے مٹ جائے، تو بھی آفتاب اسی طرح چمکتا رہیگا سمندر اسی طرح ابلتے رہیں گے، ہوائیں اسی طرح چلتی رہیں گی، پانی اسی طرح برستا رہیگا، سبزے اسی طرح اگتے رہیں گے، اور درخت اسی طرح پھلتے رہیں گے لیکن اگر درخت نہ پھلیں تو انسان کی ہستی معرض خطر میں پڑ جائے، سبزیاں نہ اگیں تو انسان بھوکا مرجائے، پانی نہ برسے تو انسان پیاسا تڑپ جائے، اگر ہوا نہ چلے تو انسان گھٹ کر مرجائے، اگر زمین نہ ہو تو انسان کو کھڑے ہونے کی جگہ نہ ملے، اگر آفتاب نہ چمکے تو انسان کی ہستی کا چراغ فوراً بجھ جائے، سمندر نہ ہو تو نہ پانی برسے، نہ سبزیاں اگیں، نہ انسانی غذا میسر آئے، نہ پانی برس کر پھر زمین کو خشک ہونا نصیب ہو، الغرض دنیا کی کوئی ہستی اپنے وجود کے لئے انسان کی محتاج نہیں، لیکن انسان اپنے وجود کے لئے کارخانہ ہستی کے ایک ایک پرزہ کا حاجت مند ہے، تو پھر کیا یہ نتیجہ صحیح نہیں کہ اس کارخانہ کا ہر پرزہ کی غرض و غایت انسان کا وجود اور اس کی بقا ہے لیکن خود انسان کے وجود کی غرض کوئی دوسری تو

جو دیگر موجودات کے وجود کی غرض سے زیادہ اہم ہے،

قرآن پاک دوسرے موجودات ومخلوقات کی نسبت تو یہ کہتا ہے،

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ	اسی نے تمھارے لئے (اے انسانو!)
جَمِيعًا، (بقرہ ۳-۳)	وہ سب پیدا کیا، جو زمین میں ہے،

پھر یہ بھی بتایا،

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا	(اے انسان!) کیا تو غور نہیں کرتا کہ زمین
فِي الْأَرْضِ، (حج - ۹)	میں جو کچھ ہے اسکو تمھارے کام میں اُسنے لگا رکھا ہے

زمین کے بعد آسمان کی نسبت بھی اس نے اعلان کیا،

وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَ	اور (اے انسانو!) اُس نے رات اور دن
الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ	کو اور سورج اور چاند کو تمھاری کام میں لگایا
بِأَمْرِهِ، (نحل - ۲)	ہے اور ستارے بھی اس کے حکم سے کام میں لگے ہوئے ہیں

ہستیاں وہی ہیں خالق کی اور اس کی مخلوقات کی، مخلوقات کے حالات پر غور کرنے سے نظر آتا ہے کہ اُن میں ہر ادنیٰ چیز اپنے سے اعلیٰ چیز کے کام آرہی ہے، جمادات، نباتات کے، نباتات، حیوانات کے اور جمادات اور نباتات اور حیوانات تینوں انسان کے کام آرہے ہیں، آخر انسان کو بھی اپنے سے کسی اعلیٰ ہستی کے کام آنا چاہیئے، مخلوقات میں تو اب اس سے کوئی اعلیٰ ہستی نہیں، تو لا محالہ اس کی تخلیق خود خالق کے لئے ہوئی ہے،

الغرض دنیا کی ساری چیزوں کی غرض وغایت بواسطہ یا بلا واسطہ انسانوں کی بقاء زندگی

آسایش ہے لیکن خود انسان کی اس کے لئے نہیں، بلکہ خدا کے لئے ہے، جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ (ذاریات ۳) — اور میں نے جن اور انسان کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری طاعت کریں،

عقل و فہم اور ارادہ و اختیار کے لحاظ سے مخلوقات کی تین قسمیں ہیں،

۱۔ ایک وہ جو ان صفات سے یکسر محروم ہیں، آفتاب، ماہتاب، زمین، مٹی، پتھر، پھل، پھول، درخت،

۲۔ دوسری وہ جو صرف ابتدائی احساس اور علم و فہم رکھتی ہیں، لیکن قیاس و استقراء و تمثیل، اور حاضر پر غائب کو قیاس کرکے کسی نئے علم کا استخراج کرنا اُن کی قدرت سے باہر ہے، اُن کا ارادہ و اختیار بھی صرف ظاہری محسوس اشیاء تک محدود ہے، جیسے حیوانات،

۳۔ تیسری وہ مخلوق ہے جو عقل و ادراک رکھتی ہے، قیاس آرائی کرتی ہے، استقراء و تمثیل کے ذریعہ سے استنباط کرتی ہے، جزئیات سے کلیات بناتی، اور کلیات سے جزئیات پر حکم لگاتی ہے، بدیہیات سے نظریات تک پہنچتی، اور غائب کو حاضر پر قیاس کرتی ہے،

پہلی قسم کی مخلوقات سے جو حرکات اور آثار پیدا ہوتے ہیں، وہ اضطراری اور غیر ارادی ہوتے ہیں، اور کبھی اُن میں تخلف نہیں ہوتا، اسی لئے اُن کو فطری آثار اور طبعی خصائص کہتے ہیں جن کا صدور ان مخلوقات سے ہمیشہ یکساں اور بلا ارادہ ہوتا رہتا ہے، دوسری قسم کی مخلوقات سے جو آثار و حرکات پیدا ہوتے رہتے ہیں، وہ گو ارادہ اور احساس اور ابتدائی فہم کے ماتحت صادر ہوتے ہیں، لیکن اُن کے ہر فرد سے صرف ایک ہی قسم کے افعال، حرکات اور آثار یکساں طور سے ظاہر

ہوتے ہیں، اُن کے خلاف نہیں ہوسکتا، اور نہ ایک دوسرے سے کم و بیش ہوسکتا ہے، اُن کے ان افعال حرکات، اور آثار کو جبلت، فطرت، اور طبیعت کہتے ہیں، اُن کے صدور میں بھی وہ مخلوقات اپنی فطرت اور طبیعت کے تقاضے سے مجبور ہیں، جیسے حیوانات کے افعال، اور اُن کے مختلف انواع کے الگ الگ نوعی کام کہ وہ ازل سے قیامت تک یکساں ایک ہی طرح، اور وہ بھی کسی غایت، اور انجام و مآل کے پہلے سوچے بغیر ان سے صادر ہوتے ہیں،

تیسری مخلوق کے بعض افعال گو طبیعت و جبلت کے مطابق ہوتے ہیں، جو دیگر مخلوقات کی طرح ویسے ہی بے ارادہ اور اضطراراً سرزد ہوتے ہیں، مگر اس کے اور دوسرے افعال و حرکات تمامتر اُس کے ارادہ، اختیار اور فہم سے صادر ہوتے ہیں، صرف یہی آخری قسم کے افعال وہ ہیں جن پر خیر و شر اور نیک و بد کا حکم جاری ہوتا ہے، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اُس کے تمام عاقلانہ کام عاقبت بینی، انجام، اور مآلِ کار کو خیال کر کے اس کے ارادہ سے صادر ہوتے ہیں، اور یہیں سے اس کی ذمہ داری کا سوال پیدا ہوجاتا ہے،

جن و انس کے علاوہ تمام دوسری مخلوقات، خیر و شر کی ذمہ داری سے بری ہیں، جمادات و نباتات تو اس لئے کہ ان کے افعال و حرکات تمامتر مجبورانہ، بے ارادہ، اور فکرِ انجام کے بغیر صادر ہوتے ہیں، یا یوں کہو کہ اُن احکام کے بموجب ہمیشہ ہوتے ہیں، جو خدا نے اُن کو اوّل ہی دن دیدیئے ہیں، حیوانات بھی اس لئے اس ذمہ داری سے بری ہیں کہ اُن کے افعال و حرکات بھی تمامتر جبلی و طبعی ہیں، اور وہ جبلت و طبیعت پر مجبورانہ، بے ارادہ اور انجام کے خیال کے بغیر

عامل ہیں، یا یوں کہو کہ وہ اپنے خالق کے احکام پر ہمیشہ اضطراراً عمل پیرا ہیں، اسی طرح فرشتے بھی اس تکلیف سے سبکدوش ہیں، کیونکہ وہ بھی اپنی خلقت اور جبلت سے اطاعت پر مجبور ہیں، اور اسی لئے اُن سے عصیان نہیں سرزد ہوتا، صرف ایک انسان ایسی مخلوق ہے، جو بہت سی باتوں میں ارادہ، اختیار اور علم رکھتا ہے، نیکی، بدی، اور خیر و شر ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک کے اختیار پر قطعی مجبور نہیں ہے، بلکہ وہ عقل و فہم سے سوچ سمجھکر، مآلِ کار، اور انجام پر غور کر کے یا اپنے جذبات کے ماتحت کوئی کام کرتا ہے، اس لئے وہی خیر و شر کے امتیاز اور حق و باطل کے فرق کے لئے پیغامِ الٰہی کا محتاج قرار پایا،

جمادات ونباتات، اور دیگر مخلوقات سے احکامِ الٰہی کی مجبورانہ اطاعت یعنی جبلت یا فطرت یا خاصیت کو، قرآن پاک یوں ادا کرتا ہے،

وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا	اور خدا ہی کے آگے سر جھکاتے ہیں جو آسمانوں میں
فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّۃٍ وَّالْمَلٰٓئِکَۃُ	ہے اور جو زمین میں ہے جانداروں میں سے اور فرشتے
وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ یَخَافُوْنَ رَبَّھُمْ	وہ سرکشی نہیں کرتے اپنے پروردگار کا اپنے اوپر
مِّنْ فَوْقِھِمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (نحل ۶)	ڈر رکھتے ہیں، اور کرتے ہیں جو حکم پاتے ہیں

اسی فطری اطاعتِ الٰہی کا دوسرا نام فطری وحی بھی رکھ لو، جیسا کہ قرآن میں ہے،

وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ	اور تیرے پروردگار نے شہد کی مکھیوں پر وحی
مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا	بھیجی کہ پہاڑوں میں، درختوں میں اور جہاں
یَعْرِشُوْنَ ثُمَّ کُلِیْ مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ	چھت ڈالتے ہیں اپنے گھر بنائے پھر ہر پھل میں سے

فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا،	کھا پھر اپنے پروردگار کی راہوں پر (مقررہ احکام
(نحل - ۹)	پر) چل، مطیع ہو کر،

دیکھو اس آیتِ پاک میں طبعی الہام کی مجبورانہ پیروی کو اطاعتِ الٰہی کہا گیا ہے اور دوسری جگہ اُن کی اپنے خالق اور پیدا کرنے والے کے حکم کی اسی طبعی اطاعت اور فطری تعمیل کو اُن کی زبانِ حال کی نماز اور تسبیح فرمایا گیا ہے،

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ	کیا تو نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور جو کوئی ہے
وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ۭ كُلٌّ قَدْ	اور اڑتے جانور پر کھولے اُس کی یاد کرتے ہیں
عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ	ہر ایک نے جان رکھی ہے اپنی طرح کی نماز اور
بِمَا يَفْعَلُوْنَ - (نور - ۶)	اسکی پاکی کی یاد اور خدا کو معلوم ہے جو وہ کیتے ہیں

لیکن انسان کو دوسرے موجودات و مخلوقات کی طرح مجبورِ محض نہیں پیدا کیا گیا ہے، بلکہ جیسا کہ بتایا جا چکا، وہ احساس اور ارادہ جو جمادات میں معدوم، نباتات میں محلِ بحث، اور حیوانات میں متحرک ہے، وہ انسان میں پوری طرح بیدار اور کارفرما ہے، اسی طرح وہ ارادی قدرت و اختیار جو جمادات میں معدوم، نباتات میں مفقود اور حیوانات میں محدود ہے وہ انسان میں ایک حد تک وسیع ہے، علاوہ ازیں ہر کام میں عاقبت بینی، اور مآل اندیشی صرف انسان کا خاصہ ہے اسی لئے تمام مخلوقات میں وہی ارادی "تکلیف" کا مستحق قرار پایا، اور غیر ذی ارادہ مخلوقات کی طرح بالاضطرار اور مجبورانہ اطاعتِ الٰہی کے لئے نہیں بلکہ بالارادہ اطاعت کیلئے اسکی تخلیق ہوئی، فرمایا:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ	ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور

وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا — پہاڑوں پر پیش کی تو انھوں نے انکار کیا اور
وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ (احزاب ۹) — اس سے ڈرے اور انسان نے اسکو اٹھالیا

یہ امانت اُس کی نیکی و بدی کی تمیز اور خیر و شر کا فرق ہے جس کے نتیجہ کے طور پر شریعت الٰہی کا نزول ہوا ہے، انسان کو اپنی اس امانت سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بالارادہ اور با اختیار افعال میں بھی بے ارادہ اور بے اختیارانہ افعال کی طرح احکام الٰہی کی اطاعت کرنا ضروری ہے، یعنی جس طرح بے اختیارانہ افعال میں فطرت وجبلت کی مجبورانہ اطاعت کر کے حکم الٰہی کی تعمیل کی جاتی ہے، اسی طرح بارادہ اور اختیاری افعال میں بھی شریعت کی بالارادہ اطاعت کر کے حکم الٰہی کی تعمیل ضروری ہے،

اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں ادا کر سکتے ہیں، کہ غیر ارادی افعال وحرکات میں جس طرح ہم اپنے فطری الہام و وحی کی مجبورانہ پیروی کرتے ہیں، اسی طرح ارادی افعال میں بھی شرعی الہام و وحی کی بالارادہ پیروی کریں،

لیکن کسی کی اطاعت اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے احکام و اوامر سے ہم کو واقفیت نہ ہو، انبیاؑ اور رسولؑ وہی ہیں، جن پر اللہ تعالیٰ اپنے ان احکام اور اوامر کی شریعت کو وحی کرتا ہے، اور وہ ان ذی ارادہ بندوں کو اس سے آگاہ و باخبر کرتے، اور اُسکی اطاعت کی دعوت دیتے ہیں،

یہ نکتہ کہ انسان کے علاوہ تمام دیگر بے ارادہ مخلوقات خدا کی اطاعت پر مجبور اور مجبول ہیں اور کسی قدر با اختیار انسان کے افراد اپنے اُسی تھوڑے سے اختیار اور ارادہ کے بل پر اپنے خالق سے سرکشی کرنے پر آمادہ ہیں، خود قرآن پاک کے الفاظ میں موجود ہے فرمایا،

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي	کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ ہی کے آگے سر جھکاتا
السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَ	ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور سورج
الْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَ	اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت، اور
الدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَ	جانور اور بہت سے انسان، اور بہت انسان
كَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ (حج-۲)	ہیں جن پر عذاب ٹھہر چکا،

دیکھو کہ انسان کے علاوہ تمام دوسری بے ارادہ اور بے عقل مخلوقات کی کلی اطاعت، اور سرافگندگی کا اعلان ہے، لیکن خاص با ارادہ اور باعقل اور انجام بین انسانوں کی دو قسمیں کردی گئیں، مطیع اور سرکش،

کائنات کے صحیفہ کا تدریجی مطالعہ کرو، تو معلوم ہوگا کہ جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان میں سے جس صنفِ مخلوقات میں احساس، ارادہ اور اختیار کی جتنی کمی ہے، اسی قدر فطرت اُس کی دایہ گری کی خدمات زیادہ انجام دیتی ہے، اور جس حد تک احساس اور اختیار کا دائرہ اصنافِ ہستی میں بڑھتا جاتا ہے، اسی قدر معلمِ فطرت اپنے فرائض سے کنارہ کش ہوتا جاتا ہے، اور وہ صنفِ کائنات اپنی ذمہ داری آپ قبول کرتی جاتی ہے، جمادات اپنی نشو و نما کے لئے بیرونی غذا کے محتاج نہیں، نباتات جن میں ان اوصاف کی ہستی صرف اپنی آنکھیں کھولتی ہے، اُن کی غذا خود اُن کے پانوں کے نیچے ہوتی ہے، اور وہ خود اڑ کر اور چل کر اُن تک پہنچ جاتی ہے، حیوانات جن میں یہ اوصاف جاگ کر کروٹیں بدلتے ہیں، ان کی غذا بے جوتے بوئے، بے چھنے نکھارے بن بے پکائے، ہر قدم پہ سر وقت تیار ملتی ہے، لیکن انسان جس میں یہ تینوں اوصاف ٹھیک کر حکمران اور کارفرما

ہوتے ہیں، اس کے منھ تک غذا کا ایک دانہ بھی اس وقت نہیں پہنچ سکتا، جب تک اس کی جد وجہد محنت اور جانفشانی کے پسینہ کا گرم قطرہ پیشانی سے چل کر اس کے پاؤں تک نہیں پہنچتا،

جہاں احساس، ارادہ اور اختیار جیسے جیسے کم ہے، اسی قدر طبیعت، فطرت، اور جبلت کی اضطراری حکومت زیادہ قائم ہے لیکن جیسے جیسے ان تینوں اوصاف کی ترقی وتکمیل ہوتی جاتی ہے، طبیعت، فطرت اور جبلت کی حکومت کا دائرہ تنگ ہوکر احساس، ارادہ اور اختیار کی شہنشاہی قائم ہوتی جاتی ہے، اور حرکات واعمال کی باگ فطرت وجبلت کے مضبوط، اور ناممکن التغیر ہاتھوں سے نکل کر اختیار وارادہ کے کمزور اور ہر آن بدل جانے والے ہاتھوں میں آجاتی ہے، جمادات ہمیشہ وہی کریں گے جو اُن کو کرنا چاہیئے، نباتات عموماً وہی بنیں گے، جو اُن کو بننا چاہیئے؟ حیوانات وہی کام انجام دیں گے، جو اُن کے سپرد کردیا گیا ہے لیکن انسان کسی قدر اختیار وارادہ پاکر اکثر اپنی راہ سے ہٹ جاتا ہے، اور حدود اعتدال سے قدم باہر نکال دیتا ہے، اور اپنے اس اختیار وارادہ کی ذمہ داری کی امانت کو بھول جاتا ہے، انبیاءؑ اور رسولؑ وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس ذی ارادہ اور با اختیار مخلوق کو اس کی اس ذمہ داری کے فرائض سمجھانے کیلئے آتے ہیں،

اس اختیار اور ارادہ کے مرکز کا نام مذاہب کی زبان میں "دل" ہے، جو انسان کے سر سے لیکر پاؤں تک کی رگ رگ، اور ریشہ ریشہ کی ایک ایک جنبش وحرکت پر حکمران ہے، اور اسی کے حکم سے اس جسم کے اندرونی عالم میں سب کچھ ہوتا اور سرانجام پاتا ہے، انبیاءؑ اسی دل کے نظام کو درست کرنے کے لئے آتے ہیں،

انسان کو اپنے وجود، بقا، ترقی اور تکمیل کی ہر منزل میں قدم قدم پر ہزاروں چیزوں کی احتیاج

ہوتی ہے، ان چیزوں کے مہیا اور تیار کرنے کے لئے ہر انسان میں استعداد و قوت الگ الگ ہوتی ہے، اور یہ استعداد و قوت فیاض قدرت کی طرف سے پیدائش بلکہ پیدائش سے پہلے ہی آب وگل کے عالم میں اس میں ودیعت رکھی جاتی ہے، یہی سبب ہے کہ ہر انسان میں جس قسم کا میلان ہوتا ہے اسی کی استعداد اُس میں پائی جاتی ہے، اور پھر بعد کو خاص خاص فنی الہامات کے ذریعہ سے جن کو تم ایجادات اور اختراعات کہتے ہو، ہر پیشہ ور اپنے متعلقہ کام کو بڑھاتا اور ترقی دیتا ہے، اور تمھاری ضرورت کے مطابق تمھارے لئے سامان فراہم کرتا ہے،

ان مادی ضروریات کے بنانے والوں کے حسب استعداد اور حسب حیثیت مختلف درجے اور مرتبے ہیں بعض ان میں سے محض مقلد ہوتے ہیں، جو وہی بنا سکتے ہیں، جو بنانا سیکھا ہے بعض چابکدست اور ذہین ہوتے ہیں، جو اچھے کاریگروں کے صرف نمونوں کو دیکھ کر اچھی چیزیں تیار کرسکتے ہیں بعض ایسے ذہین اور فطین ہوتے ہیں کہ وہ نئی نئی چیزیں بناتے، دریافت کرتے، اور ایجاد کرتے ہیں، اور بعد کے آنے والے مدت تک ان ہی کی تقلید کرتے رہتے ہیں، کاشتکاری کے اصول ازالۂ مرض کی تدبیریں، کھانے پکانے کے طریقے، سواری کے ضروریات، رہنے سہنے کے سامان، پہننے کے کپڑے، لڑنے کے آلات، اُن میں سے ہر شے کی ضرورت ہے، اور اُن میں ہر ضرورت کے لئے تعالیٰ فطرت نے ایک ایک گروہ کو پیدا کردیا ہے، اور وہ اپنے اپنے کام انجام دیتا رہتا ہے، ان ضرورتوں کے فراہم ہوجانے سے انسان کی مادی زندگی کی تکمیل ہوجاتی ہے، اب اس کے بعد اس کی روحانی اور اخلاقی زندگی کے ضروریات کا جن کو تم اصول تمدن، طریقۂ معاشرت، آئین عدل و انصاف، اخلاق حسنہ اور دین و تقوی کے نام سے موسوم کرتے ہو دور شروع ہوتا ہے،

اگر یہ اصول اور تعلیمات انسانوں کے سامنے نہ ہوں تو آدم کے بیٹوں کی یہ جنت دوزخ ہو جائے، اور اشرف المخلوقات کی یہ جماعت جانوروں کا گلہ اور درندوں کا غول بنجائے،

جو تمہارے لئے غلہ پیدا کرتا ہے وہ کاشتکار ہے، اور جو اوزار بناتا ہے وہ لوہار ہے، جو زیور گھڑتا ہے، وہ سونار ہے، جو تمہارے لئے کپڑے بنتا ہے، وہ بُنکر ہے، جو تمہارے مکان بناتا ہے، وہ معمار ہے، جو تمہاری حفاظت کرتا ہے، وہ سپاہی ہے، جو تمہاری نگہبانی کرتا ہے، وہ حاکم ہے، جو تمہارے آپس کے جھگڑے چکاتا ہے، وہ قاضی ہے، جو تمہارے ملک کے اندر امن و امان کا ضامن ہے وہ بادشاہ ہے، جو تمہاری جسمانی بیماریوں کا معالج ہے، وہ طبیب ہے، جو اپنی صناعیوں سے تمہاری ضرورتوں کے لئے کاریگری کی چیزیں بناتا ہے، وہ صناع ہے، اور جو تمہارے لئے مادی کائنات کے چہرے سے اسرار کا پردہ ہٹا کر تم کو ہر چیز سے باخبر کرتا ہے وہ حکیم ہے،

اسی طرح جو برگزیدہ افراد تمہارے روحانی و اخلاقی و اجتماعی حالات کے معلم و نگران ہیں اُن کی بھی ایک جماعت ہے لیکن جس طرح تمہارے مادی ضروریات کے بنانے والوں کے حسب استعداد . . . . . . اور حسب حیثیت درجے ہیں، اسی طرح ان روحانی ضروریات کے فراہم کرنے والوں میں بھی مرتبے اور درجے ہیں، بعض وہ ہیں جو صرف اگلے روحانی معلمین کی نقل و تقلید کرتے ہیں، یہ عام علماء ہیں، بعض وہ ہیں جو اچھے روحانی نمونوں کو دیکھ کر خود بھی اُن کی عمدہ نقل اُتارتے ہیں، اور دوسروں کو بھی بتاتے ہیں، یہ مجددین ہیں، بعض ایسے ہیں جو الہام ربانی سے فیض پا کر روحانیت کے نئے نئے اصول وضع کرتے اور دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں، یہ انبیاء ہیں اُن کے مقدس ہاتھ تمہارے لئے غلہ پیدا کرنے، مکان بنانے، کپڑا بننے، اوزار بنانے اور صناعی کرنے

کے لئے نہیں، بلکہ اُن سے بدرجہا بلند تر اور بہتر کام کیلئے ہیں اُن کی مبارک انگلیاں تمہارے اُن تارون پر پڑتی ہیں جن سے یہ صدہا قسم کے نغمے نکل رہے ہیں یعنی تمہارے دل کی رگوں پر، غور کرو کہ یہ اصل مرکز جس پر تمہارے تمام اعمال وافعال اور ہر قسم کے حرکات وسکنات اور ہر طرح کی جد وجہد کا مدار ہے یعنی "دل" کیا انبیاء اور اُن کے متبعین کے سوا کوئی طبقہ اس کی نشو ونما حفاظت، ترقی، تکمیل، اور اصلاح کے لئے بھی کام کر رہا ہے، اور کیا خالقِ فطرت کا یہ فرض نہ تھا کہ وہ تمہاری مادی ترقی اور اصلاح کی طرح تمہاری روحانی ترقی واصلاح کی بھی فکر کرتا، اور ایسا سمجھنا کہ اُس نے اُس کی ترقی و تکمیل واصلاح کی خدمت، نوعِ انسانی کے کسی کارکن طبقہ سے متعلق نہین کی ہے، کیا اُس کی شان ربوبیت کیساتھ سوء ظن نہین ہے،

یہی وہ طبقہ ہے جو تمام متفرق اور مختلف انسانی طبقون کو باہم جوڑ کر ایک عام انسانی تمدنی سطح پر لایا ہے، وہ ان سب کو جو تمہارے لئے روٹی تیار کرتے ہین، کپڑے بنتے ہیں، جھوپڑے بناتے ہین، اور سامان اور اوزار درست کرتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ مشارکت اور معاونت اور نیکی پر آمادہ کرکے اُن میں روحانی برادری پیدا کرتے ہیں، اور مٹی سے پیدا ہونے والے ایک آدم کے بیٹون کو جن کو دولت وغربت، سوسائٹی، اور مجلس، حکومت اور اقلیم، اور جغرافی و قومی تقسیم نے پارہ پارہ کر رکھا ہے، باہم جوڑ دیتے ہیں، اور ان تمام مصنوعی امتیازات کو مٹا کر پوری زمین کو ایک ملک، تمام اقوامِ عالم کو اولادِ آدم اور کل بلند وپست طبقون کو ایک انسانی طبقہ قرار دیتے ہیں، اور اُن کے اخلاقی روحانی عالم مین اصلاح وترقی اور امن وامان پیدا کرتے ہیں، اُن کے دلون سے بغض وکینہ کو نکال کر اخوت ومحبت کا نور بھرتے ہین، اُن کے احساس، ارادہ اور

اختیار کی باگ پر اُن کے دل کو قابو حاصل کرنے کی تدبیر بتاتے ہیں، اور اُن کو اعتدال کی حد بتاکر صحیح و غلط کی تمیز عطا کرتے ہیں،

یہی وہ انسانی طبقہ ہے جس کو ہم نبی، رسول، اور پیغمبر کہتے ہیں، اُن کو گو براہ راست جسم وجسمانیات سے تعلق نہیں ہوتا، بلکہ صرف دل اور قلب و روح کے عالم سے سروکار ہوتا ہے تاہم اس دل اور قلب و روح کی اصلاح کے لئے جسم وجسمانیات کی کسی قدر اصلاح بھی اس حد تک اُن کے فرائض میں داخل ہے، جہاں تک اُن کو دل اور قلب و روح کے کاموں کی اصلاح میں اس کی ضرورت معلوم ہوتی ہے،

ایک شبہہ اور اس کا جواب | اس مقام پر ایک شبہہ یہ ہوتا ہے کہ افرادِ انسانی کے درمیان امن وامان اور اطمینان پیدا کرنے کا کام تو بادشاہ بھی کرتے ہیں، اخلاق کا ایک معلّم بھی کرتا ہے، ایک فلسفی اور اجتماعیات کا ایک حکیم بھی کرتا ہے، مگر اُن کے کاموں کے درمیان جو عظیم الشان فرق ہے اس کو سمجھ لینا ہی اس شبہہ کا ازالہ ہے، علمی اصطلاح میں یوں سمجھو کہ مختلف فنون کے ماہر ایک ہی چیز پر مختلف حیثیتوں سے نظر ڈالتے ہیں، اور اسی اختلافِ نظر سے ان کا فن بھی علیحدہ علیحدہ ہوجاتا ہے، کسی جسم کے اجزائے ترکیبی سے اگر بحث کیجائے، تو کیمسٹری ہے، اگر اسکی زندگی اور اسبابِ زندگی پر غور کیا جائے تو بیالوجی (علم الحیات) ہے، اگر اس کے دماغی قوٰی اور اُن کے آثار کی تحقیق کیجائے تو سائیکالوجی (علم النفس) ہے، اگر اس کے جذبات اور جذبات کے مطابق اُس کے شخصی افعال و اعمال کے حدود اور ان کے اسباب و علل اور غرض و غایت پر نظر ڈالی جائے تو یہ اتھکس (فلسفہ اخلاق) ہے، اگر اس کے جماعتی خصائص اور لوازم کی تفتیش کیجائے تو یہ سوشیالوجی (علم اجتماع و معاشرت) ہے، اگر جسم کی صحت و مرض کے اسباب

کی جستجو کی جائے تو یہ طب ہے، دیکھو کہ ایک ہی جسم یا متعلق جسم پر کتنی حیثیتوں سے بحثیں کی گئی ہیں، اور ان سے کتنے مختلف علوم پیدا ہو گئے ہیں تاہم وہ سب کے سب جسم اور جسمانیات ہی سے متعلق اور وابستہ ہیں، اور باانیہمہ اُن میں سے ہر ایک علم و فن علٰحدہ اور ہر ایک علم و فن کے جاننے والے علٰحدہ ہیں،

اسی طرح ایک نبی اور ایک رسول کا کام بھی بادشاہوں، فلاسفروں، اور حکیموں کی طرح انسانوں ہی کی اصلاح ہے، مگر اُن میں سے کسی ایک کا کام بھی دوسرے سے ملتا جلتا نہیں ہے بادشاہ صرف اس کا ذمہ دار ہے کہ وہ اپنے زور و قوت سے بازاروں، گلیوں، آبادیوں اور میدانوں میں امن و امان اور انصاف کو قائم رکھے، فلاسفر انسانوں کے تمام اعمال و خیالات کے اسباب و علل کی تفتیش اور اُن میں نظم و تسلسل اور علت و معلول کا ربط پیدا کرنے کا کفیل ہے، فلسفہٗ اخلاق کے معلّم تمہارے اخلاق و عادات کے اسباب و علل تم کو بتاتے اور ناقابلِ فہم جذبات کی تشریح کرتے ہیں، اس سے آگے اُن کا کوئی کام نہیں، حکیم اور واعظ تمہارے اعمال و اخلاق کی اصلاح کے لئے نہایت شیریں، خوشگوار اور ڈھلے ہوئے فقرے سُناتے ہیں، مگر اُن میں سے کوئی نہیں جو تمہارے دلوں کا ہمنا ہو، جو تمہارے احساس، ارادہ اور اختیار کے قدم کو غلط روی سے روک سکے، وہ نہ صرف تمہارے اخلاق و عادات اور جذبات کے اسباب و علل بتائے، بلکہ تمہارے اخلاق و عادات اور جذبات میں خیر و شر کی تمیز کرے، اور خیر کے حصول اور شر سے حفاظت کی تدبیر بتائے، بلکہ اس کے ہاتھ اور زبان میں یہ قوت ہو کہ اپنی تعلیم و تلقین و فیضِ صحبت سے تمہارے اخلاق و عادات و جذبات بلکہ احساس، ارادہ اور اختیار کی غرض و غایت بلکہ پورے دل کی قوتوں میں انقلاب پیدا کر دے، اور شر کے تخم کو دلوں کی سرزمین سے نکال کر خیر کا برگ و بار پیدا کر دے البتہ نبی یہ تمام کام سرانجام دیتا ہے؛

وہ انسانون کوان کے احساس، ارادہ اور اختیار کی بھولی ہوئی ذمہ داری یاد دلاتا ہے، اوران کے قویٰ کے مرکز یعنی دل کو خدا کے حکم سے درست کر دیتا ہے،

وہ بادشاہون کی طرح صرف بازارون مجمعوں، آبادیون کا امن واطمینان نہیں چاہتا، بلکہ وہ لوگون کے دلون کے اندر کا امن واطمینان چاہتا ہے، وہ معلّمین اخلاق کی طرح اسباب وعلل کی تلاش وجستجو وتشریح کی پروا نہیں کرتا، بلکہ اخلاق سیئہ خواہ کسی سبب سے ہوں وہ اُن کی بیخ کنی کرتا ہے اور اخلاق حسنہ خواہ وہ کسی علت کے معلول ہوں، وہ اُن کو انسانوں کے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور انسانی اوہام کے طلسم کو توڑ دیتا ہے، اور غلط رسم ورواج کی بندشون کو کھولتا ہے اور انسانون کو انسانون کی غلامی سے آزاد کر کے صرف خدا کی غلامی میں دیتا ہے،

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ	وہ انکو بھلائی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے
الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ	اور اچھائیوں کو ان کیلئے حلال اور خبیث چیزون
عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ	کو حرام ٹھراتا ہے اور اُن کے اس بندھن اور زنجیرون
وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (اعراف - ۱۹)	کو جو اُن پر ہوتی ہین اُن سے اتارتا ہے،
رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ لِئَلَّا	ایسے رسول بھیجے جو نیکوں کو خوشخبری دیتا اور بدوں کا
يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ	کو ہشیار کرتے ہیں تاکہ رسولون کے اس عذر و تذکیر کے
الرُّسُلِ، (نساء - ۲۳)	بعد پھر انسانون کو خدا پر الزام دینے کا موقع نہ ملے
لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا	ہم نے رسولوں کو کھلی ہدایتیں دیکر بھیجا اور اُن کے ساتھ
مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ	کتاب اتاری اور (عدل کی) ترازو تاکہ لوگ عدل و انصاف

بِالْقِسْطِ ج (حدید - ۳) پر قائم رہیں (اور دنیا امن اطمینان کی زندگی بسر کرے)

نوعِ انسانی کے دوسرے تمام خدام اور کارکن اپنے فرائض کو جن اغراض سے انجام دیتے ہیں، اُن کا دائرہ موجودہ زندگی کی بھلائی اور بُرائی سے آگے نہیں بڑھتا، مگر انبیا اور رسول نوعِ انسانی کی خدمت کے یہ کام بھی اس کی موجودہ زندگی کی بھلائی اور بُرائی کو اس لحاظ سے سامنے رکھکر کرتے ہیں کہ ان کا اثر اس کی دوسری دائمی و پائدار زندگی پر کیا پڑے گا، وہ جسم کی خدمت جسم کے لئے نہین، بلکہ روح کے لئے کرتے ہیں، اور مخلوق کی خدمت خالق کے منشا کے مطابق بجالاتے ہین، وہ صرف ایک مخلوق کو دوسرے مخلوق ہی سے نہین بلکہ مخلوق کو خالق سے اور خالق ہی کے لئے ایک مخلوق کو دوسرے مخلوق سے جوڑتے ہین،

وہ صرف اچھی اچھی اور میٹھی میٹھی باتین لوگون کو نہین سُناتے، بلکہ خود بہتر سے بہتر عمل کرتے ہین، اور دوسرون کو اس کا عامل بناتے ہیں، وہ خیال آرا شاعرون اور جھوٹے حکیمون کی طرح نہیں ہوتے، جو کہتے ہین اور کرتے نہیں، دماغ ہوتے ہیں، مگر دل نہیں ہوتے، زبانین ہوتی ہین مگر ہاتھ نہیں ہوتے،

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُنَ اَلَمْ	اور شاعرون کے پیرو کار گم کردہ راہ ہوتے ہیں
تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ وَ	تم دیکھتے نہیں کہ وہ ہر میدان میں سر مارتے پھرتے
اِنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ، (شعراء-۱۱)	ہیں، اور وہ وہ کہتے ہیں، جو کرتے نہین؛

وہ اس دعوی کے ساتھ انسانون میں آتے ہیں کہ اُن کے خالق نے جس نے ان کے ذرہ ذرہ کا سامانِ راحت فراہم کیا ہے، اور جو اُن کے قالبِ روح کا سامانِ راحت بھی بہم پہنچا تا ہے اُن کو

اس لیۓ بھیجا ہے کہ انسانون کے قلب و روح کو اس سامان کا برتنا سکھائین، اور اُن کے رب کا پیغام اُن کو سُنائین، اور بتائین کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے اپنے احساس، اپنے ارادہ اور اپنے اختیار کو اس طرح اس عالم مین صرف کرین کہ وہ پریشانی و بے اطمینانی کی تاریکی سے نکل کر سکون و اطمینان اور امن و سعادت کی روشنی مین داخل ہون،

هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍ	وہی خدا ہے جو اپنے (رسول) بندہ پر کھلی آیتین
بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ	اُتارتا ہے کہ تم کو (اے انسانو!) وہ تاریکی سے
اِلَى النُّوْرِ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ	نکال کر روشنی مین لاۓ، (اور اللہ نے ایسا
رَّحِيْمٌ ۝ (حدید - ۱)	اسلئے کیا) کہ تم پر شفقت کرنے والا مہربان ہے،

انبیاؑ بھی ایک بادشاہ کی طرح جماعتون کا انتظام کرتے ہین، مگر ملک کے خراج اور زمین کی آبادی کے لیۓ نہین، بلکہ خدا کے لیۓ، وہ بھی جان و مال کی حفاظت کے لیۓ مقنن کی طرح قانون بناتے ہین، اور قاضی کی طرح سزا و جزا کا حکم سُناتے ہین، مگر انعام شاہی اور تنخواہ ماہانہ پا کر کسی دنیاوی بادشاہ کے فرمان کی تعمیل کے لیۓ نہین بلکہ جسم و جان کے شہنشاہ اور کائنات کے مالک کے فرمان کی تعمیل مین، وہ بھی فلاسفر کی طرح رموز و اسرار کا پردہ فاش کرتے ہین، مگر تجربہ، استقرا اور قیاس سے نہین، بلکہ عالم اسرار کے مبدء علم سے فیض پا کر، وہ بھی حکیم و واعظ کی طرح پُر تاثیر کلام کرتے ہین، مگر اُن کے مانند اپنے دل سے جوڑ کر نہین، بلکہ خدا سے سنکر، اور وہ صرف کہتے نہین، بلکہ جو کہتے ہین وہ کرتے ہین، اور جو کرتے ہین وہ دوسرون سے کراتے ہین، وہ خدا سے ہین، خدا سے پاتے ہین، اور اسی سے سنتے ہین، اور وہی اورون کو سُناتے ہین، غرض اوپر آسمان سے اُن کو جو کچھ ملتا ہے وہی

نیچے زمین پر سب کو بانٹتے ہیں،

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی، مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی، وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی، اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی، ذُوْمِرَّةٍ فَاسْتَوٰی وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی .... فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰی، مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی .... مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی، لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی (وَالنجم-۱)

قسم ہے اس ستارہ کی جب وہ نیچے گرے کہ تمہارا ساتھی (پیغمبر) نہ بھولا نہ بھٹکا اور نہ وہ نفس کی خواہش ہی سے بات کرتا ہے وہ تو وہی ہے جو اسکو وحی کے ذریعہ کہا جاتا ہے اسکو بڑی بڑی قوتوں والے نے سکھایا طاقت والا، تو وہ سیدھا ہوا دراں حالیکہ وہ آسمان کے سب کے اوپر کنارہ میں تھا.... تو اس نے اپنے بندہ پر وحی کی جو وحی کی نہ اسکے دل نے جو اس نے دیکھا، اسکو جھوٹ کہا کیا وہ جو دیکھتا ہے تم اس پر اس سے جھگڑتے ہو.... نہ بینائی نے

قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّکُمْ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ

(اعراف-۲۴)

کہدے (اے پیغمبر) کہ میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے وحی کی جاتی ہے یہ (اے انسانو!) تمہارے رب کی طرف سے بصیرتیں ہیں اور ان کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِکَ لِتَکُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ

(شعراء-۱۱)

یہ تو عالم کے پرورش کرنیوالے کی طرف سے اتارا گیا ہے اس کو امانت والی روح نے تیرے دل پر اتارا تاکہ تو ہشیار کرنیوالوں میں سے ایک ہو فصیح

[illegible]

نکتہ، یہ بالکل ممکن، بلکہ واقعہ ہے کہ ایک ہی قسم کا کام مختلف لوگ مختلف غرض و نیت سے کرتے ہیں کسی قوم کی اصلاح ہی کا کام ہے کہ اس کو مختلف لوگ مختلف غرض و نیت سے کرتے ہیں، خود غرضی کے غیر مخلصانہ اغراض سے قطع نظر کرکے صرف مخلصانہ اغراض کو لو، کوئی یہ سمجھتا ہے کہ قوم کی مالی حالت کی درستی سے قوم بن سکتی ہے، کوئی اصلاح کی جڑ تعلیم کو قرار دیتا ہے، کوئی رسم و رواج و معاشرت پر زور دیتا ہے، کوئی ظاہری تمدن پر مدار رکھتا ہے، کوئی جسمانی قوت پر بھروسہ رکھتا ہے، کوئی سیاسی کامیابی کو قومی اصلاح کا مرکز ٹھہراتا ہے، لیکن انبیاءؑ کے نزدیک یہ سب ثانوی درجہ کی باتیں ہیں، وہ اپنی بنیاد صرف قلب کی اصلاح پر رکھتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ یہی اصلی چیز ہے، اور اسی کے بدلنے سے سب کچھ بدل سکتا ہے، اُن کی غرض خدا کی اطاعت، خدا کی محبت اور خدا کی معرفت ہوتی ہے، اور تمام دوسری ترقیوں اور اصلاحوں کو وہ یکسر اسی ایک اصل کی فروع اور اسی ایک جڑ کی شاخیں جانتے ہیں،

یہی سبب ہے کہ اُن کی دعوت کی کامیابی سے قوموں کو سلطنت بھی ملتی ہے، دولت بھی ہاتھ آتی ہے، علم بھی حاصل ہوتا ہے، زور اور قوت بھی پیدا ہوتی ہے، اور دنیاوی عظمت و جلال ہر منظر خادمانہ اس کے استقبال کے لئے آگے بڑھتا ہے مگر یہ خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ سیاسی مصلحین کی طرح سلطنت، مالی مصلحین کی طرح دولت، تعلیمی مصلحین کی طرح تعلیم علم و فن جسمانی مصلحین کی طرح قوت و طاقت اُن کا مطمح نظر نہیں ہوتی، بلکہ جو کچھ ان کے سامنے ہوتا ہے، وہ صرف خدا کی اطاعت، خدا کی محبت، خدا کی خوشنودی ہوتی ہے، اور باقی تمام چیزیں اُن کی نگاہ میں فرعی ثانوی اور ضمنی ہوتی ہیں،

نبی اور غیر نبی کے امتیازات | سطور بالا سے ہویدا ہے کہ انبیاءؑ اور اُن کے مشابہ اشخاص میں کتنا عظیم الشان

فرق ہے، یہ فرق چار حیثیتون سے نمایان ہے، مبدء اور منبع کا فرق، غرض و غایت کا فرق، طریق
دعوت کا فرق، اور علم و عمل کا فرق، نبی کے علم کا مبدء منبع، ماخذ اور سرچشمہ جو کچھ کہو وہ تعلیم ربانی،
شرح صدر اور وحی و الہام ہوتا ہے، اور حکیم کے علم کا ماخذ و منبع تعلیم انسانی، گذشتہ تجربہ استقراء اور
قیاس ہوتا ہی یعنی حکیم عقل سے جانتا ہے، اور نبی خالق عقل سے، اسی طرح ایک حکیم کے تمام اقوال
اور جد و جہد کا منشا، اپنی شہرت طلبی، علم کا اظہار، قوم یا ملک کی محبت کی خاطر اسکی اصلاح ہوتا ہی
مگر ایک نبی کا مقصد خدا کے حکم کا اعلان اور خالق کی رضامندی کے لئے مخلوق کی بھلائی ہوتا ہی
طریق دعوت کا فرق یہ ہوتا ہے، کہ حکیم اپنی دعوت کی عمارت کو تمام تر حکمتون مصلحتون، اور علل
و اسباب کے ستونون پر کھڑا کرتا ہے مگر نبی اپنی دعوت کو زیادہ تر خالق کی اطاعت، محبت اور
رضاجوئی پر قائم کرتا ہے، حکیم کہتا ہے لیکن اس کا کرنا اُس کے لئے ضروری نہیں، نبی جو کہتا ہی
وہ کرتا ہے اور اس کا کرکے دکھانا اس کے لئے ضروری ہے، وہ صرف جلوت کے منبر پر آراستہ
نہیں ہوتا، بلکہ وہ جلوت و خلوت اور ظاہر و باطن میں یکسان حسنات سے آراستہ اور برائیون سے
پاک ہوتا ہے، دنیا مین سقراط، افلاطون، ارسطو، دیو جانیس وغیرہ ایک طرف اور ابراہیم، موسیٰ اور
محمد دوسری طرف ہیں، اور دونون کے سوانح اور سیرتین اور کارنامے بالکل نمایان اور ایک دوسرے
سے اس طرح ممتاز ہین کہ ان میں ذرا التباس نہیں،

بادشاہ اپنی تلوار کے زور اور اپنی فوج و لشکر کی قوت سے رعایا کو اپنے قانون کا پابند بناتے
ہین تاکہ فتنہ و فساد رک جائے، فلاسفر اپنے دعوون کو صرف استدلال کی قوت اور عقل کے خطاب
سے ثابت کرنا چاہتے ہیں تاکہ اُن کی بات لوگ تسلیم کرین لیکن پیغمبر اپنے پیرؤن کے قلب کو اس طرح

بدل دینا چاہتے ہیں کہ وہ ازخود برائی کو چھوڑکر نیکی اختیار کرلیں، وہ اگر کبھی قانون وحدود سزا کو اختیار
کرتے ہیں، یا ساتھ ساتھ عقل کو بھی مخاطب کرتے ہیں تو اُن کا یہ ضمنی یا ثانوی کام ہوتا ہے، اولین نہین
اُن کی اولین غرض یہ ہوتی ہے کہ اُن کے پیروون کو خدا کی قدرت اور اس کے حاضر و ناظر ہونے کا اتنا محکم اور
پختہ یقین ہوجائے کہ وہ اسکے حکمون اور نصیحتون کو جو اُن کے ذریعہ آتی ہین، بے چون و چرا تسلیم کرلین،

دنیا کے بادشاہ اور فاتح اور کشورکشا اپنے زورِ بازو اور تلوار کی قوت سے دنیا کے طبقے الٹ
دیتے ہین، انھوں نے کبھی کبھی چاردانگِ عالم پر حکمرانی کی، قومون کی جان و مال پر اپنا قبضہ اقتدار
جمایا، اُن کی تلوارون کی دھاک نے آبادیوں اور مجمعون کے مجرمون کو روپوش کردیا، اور بازارون
اور رستون میں امن وامان پیدا کردیا لیکن کیا انھون نے دلون کے طبقے بھی الٹے؟ اپنی سلطنت
کے دائرہ سے باہر کسی کمزور سے کمزور انسان سے اپنے حکم کو منوا سکے؟ وہ لوگوں کے دلون کو بھی اپنے
قبضہ اقتدار مین لاسکے؟ وہ آبادیون اور مجمعون کے روپوش مجرمون کو بھی فنا کرسکے؟ وہ دلون
کی بستیون میں بھی امن وامان پیدا کرسکے؟ وہ روحون کی مملکتون کا بھی نظم ونسق قائم کرسکے؟

حکما، اور فلاسفر جو اپنی عقلِ رسا کے ذریعہ سے عجائباتِ عالم کی طلسم کشائی اور کائنات کے
مخفی اسرار کے فاش کرنے کے مدعی ہیں، کیا وہ قلب وروح کے عجائبات کو بھی دریافت کرسکے
وہ ماوراے مادہ اسرار ورموز کو بھی حل کرسکے:؟ وہ انسانون کی اصلاح وہدایت کا بھی کوئی
سامان اپنی تحقیق وتفتیش سے فراہم کرسکے؟ ان کی دقیق نکتہ سنجیوں اور خیال آرائیون کے پیچھے ان
کے ذاتی حُسنِ عمل کا بھی کوئی نمونہ ہے،؟ ارسطو نے فلسفۂ اخلاق کی بنیاد ڈالی دوسرے حکما نے
اخلاق کے اسباب علل کے حدود، ظہور، اثر، اور نتیجہ کے ایک ایک حرف کی تحقیق کی مگر کیا اس سے

کسی انسان کے دل سے برائی کا تخم دور ہوا؟ اچھائی کے بیج نے نشو و نما پائی؟ اُن کے اخلاق
وتعلیمات کے فلسفیانہ رموز و اسرار کا دائرہ اُن کی درسگاہوں کی چہار دیواریوں سے کبھی آگے بڑھ سکا
کیونکہ وہ اپنے درس کے کمروں سے نکل کر جب انسانی صحبتوں میں داخل ہوتے ہیں تو اُن کی اخلاقی
زندگی اور قلبی صفائی عام انسانی افراد سے ایک انچ بھی بلند نہیں ہوتی، حکماے یونان میں سقراط
سے بڑھکر کوئی نہیں، مگر کیا یہ وہی نہیں ہے جو بازار کی فاحشہ عورتوں سے ارتباط رکھتا تھا، اور
اُن میں ایک پیشہ ور کے فروغ اور کامیابی کے لئے کوشاں رہتا تھا، یہی یونان کے دوسرے حکما
کا حال تھا، اور توحید اور خداپرستی کا درجہ تو اس سے بدرجہا بلند ہے جس کی ان کو ہوا بھی نہیں لگی تھی،
ان سطروں سے اندازہ ہوا ہوگا، کہ ہر شیریں نوا واعظ، ہر مؤثر البیان خطیب، ہر دقیقہ رس
مقنن، ہر کشورکشا فاتح، اور ہر نکتہ دان حکیم اس لائق نہیں کہ نبوت و رسالت کا اہم اور بلند اور مقدس
منصب اس سے منسوب کیا جائے اس منصب کے ساتھ کچھ ایسے شروط، لوازم اور خصوصیات بھی ہیں
جو اس کے ضروری اجزا اور عناصر ہیں،

۱- سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس کا تعلق پر اسرار عالم غیب سے ہو، وہ غیب کی آوازیں سنتا
ہو، غیب کی چیزیں دیکھتا ہو، غیب سے علم پاتا ہو، عالم ملکوت کی تائید اس کے ساتھ ہو،
روح القدس اس کا ہمصفیر و ہمنوا ہو،

۲- اللہ تعالیٰ نے اس کو تمام بندوں میں سے اس کے لئے چنا ہو کہ وہ اس بلند منصب پر
سرفراز ہو،

۳- اس سے خدا کے حکم سے عجیب غریب اور حیرت انگیز تصرفات صادر ہوں جن سے

اس کا مقبول بارگاہ ہونا ثابت ہو،

۴۔ فضائلِ اخلاق کے پھولون سے اس کا دامن بھرا ہو، اور ہر قسم کے گناہ کے خس خاشاک سے پاک وصاف ہو کہ گندے ہاتھون سے میلے کپڑے پاک وصاف نہیں ہو سکتے،

۵۔ وہ لوگون کو خدا اور عالمِ غیب پر یقین کی دعوت اور فضائل واخلاق کی تعلیم دے اور روزِ الست کا بھولا ہوا عہد اُن کو یاد دلائے،

۶۔ نہ صرف تعلیم، بلکہ اُس مین یہ قوت ہو کہ وہ شریرون کو نیک اور گمراہون کو راست رو بنا دے اور جو خدا سے بھاگتے ہون اُن کو پھیر کر پھر اس کے آستانہ پر لے آئے:

۷۔ اپنے سے پہلے خدا کی طرف سے آئے ہوئے صحیح اصول کو انسانی تصرفات سے پاک وصاف کر کے پیش کرے،

۸۔ اس کی دس دعوت، جد وجہد اور تعلیم وتلقین سے مقصود کوئی دنیاوی معاوضہ شہرت، جاہ طلبی، دولتمندی، قیام سلطنت وغیرہ نہ ہو بلکہ صرف خدا کے حکم کی بجاآوری اور خلق خدا کی ہدایت،

یہ نبوت ورسالت کے وہ اوصاف ولوازم ہین، جو دنیا کے تمام پیغمبرون مین یکسان پائے جاتے ہیں، مذاہبِ عالم کے صحیفوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف اور آشکارا ہو جاتی ہے، خصوصًا قرآن پاک نے جو دنیا کی نبوت کا سب سے آخری اور سب سے مکمل صحیفہ ہے اور جس نے نبوت ورسالت کی حقیقت اور شرائط ولوازم کی سب سے بہتر تشریح کی ہے، سورۂ انعام مین اکثر پیغمبرون کا ذکر کر کے یہ حقائق ان الفاظ مین بیان کئے ہین،

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ آتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ، — اور یہ تھی ہماری دلیل جو ہم نے ابراہیم کو اسکی قوم کے

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ
حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ
كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ
وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ
وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ
نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى
وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاِسْمٰعِيْلَ
وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا
فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ
وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ
وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝
ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ
يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ
عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَ
النُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ
وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ

مقابلہ میں دی ہم جس کو چاہتے ہیں کئی درجے بلند
کرتے ہیں، بیشبہ تیرا پروردگار تدبیر والا خبردار ہی اور
ہم نے ابراہیم کو اسحق اور یعقوب بخشے اور ہر ایک کو ہدایت
دی اور نوح کو اس سے پہلے ہدایت دی تھی اور اسکی
اولاد میں داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور
موسیٰ اور ہارون کو اور اسی طرح ہم نیکوکاروں کو بدلہ
دیتے ہیں اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو ہر ایک
نیکوکاروں میں سے ہی اور اسمٰعیل اور الیسع اور یونس
اور لوط کو ہر ایک کو بزرگی بخشی دنیا والوں پر اور انکے
باپ دادوں اور بھائیوں میں سے اور ہم نے انکو چنکر پسند
کیا اور انکو سیدھی راہ پر چلایا، یہ اللہ کی ہدایت ہی
اس پر جسکو چاہے چلاتا ہی اگر وہ شرک کرتے تو ان کا
سارا کیا برباد ہوجاتا یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب
اور حق و باطل میں فیصلہ کرنا (حکم) اور نبوت دی تو اگر
کوئی ان باتوں کا انکار کرے تو ہم نے ان باتوں پر ایسے
دوسرے لوگوں کو مقرر کیا ہی جو اُن کا انکار نہیں کرتے ہیں
یہی وہ لوگ ہیں جنکو ہم نے ہدایت دی، اے محمد تو بھی

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ قُل لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْعَالَمِينَ (انعام-۱۰)

اُن ہی کی رہنمائی کی پیروی کر اور کہہ میں اپنے کام کی تم سے مزدوری نہیں چاہتا یہ قرآن تو دنیا والوں کو یاد دہانی ہے،

ان آیتوں میں اکثر پیغمبرون کے نام لیکران کے پیغمبرانہ اوصاف گنائے ہین، اگر ہم اُن کو یکجا کردین تو نبوت ورسالت کے عام اوصاف خصوصیات اور لوازم واضح ہو جائین،

۱- فرمایا ہم نے ابراہیم کو دلیل دی" اور "ہم نے اُن کو ہدایت بخشی" جس سے معلوم ہوا کہ ان کے علم اور ہدایت کا سرچشمہ عالم ملکوت سے ہوتا ہے،

۲- ارشاد ہوا کہ ہم نے اُن کو سیدھی راہ پر چلایا" اور "یہ سب نیکو کار تھے" اس سے ثابت ہوا کہ وہ معصوم اور گناہون سے بے داغ ہوتے ہیں،

۳- یہ بھی کہا کہ "ہم نے اُن کو چُنکر پسند کیا" اور اپنے بندوں میں سے جس کو چاہین یہ ہدایت عطا کرین" جس سے یہ مقصود ہی کہ یہ منصب سعی و محنت سے نہین بلکہ خدا کی مرضی اور انتخاب ہی ملتا ہی،

۴- فرمایا کہ "ہم نے ان کو کتاب، حق و باطل کے فیصلہ کی طاقت (حکم) اور احکام غیب کی تعلیم (نبوت) دی" اس سے معلوم ہوا کہ اس منصب والون کو کیا کیا چیزین عطا ہوتی ہین،

۵- حکم ہوا کہ "اُن کی رہنمائی کی پیروی کر" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگون کی رہنمائی اور دعوت پر مامور ہوتے ہین، اور لوگ اُن کی پیروی سے نیکو کار اور صالح بنتے ہین،

۶- فرمایا کہ "اے پیغمبر! یہ کہدے کہ میں اپنے کام کا کوئی معاوضہ یا بدلہ تم سے نہیں چاہتا تو اہل دنیا کے لئے نصیحت اور یاد دلانا ہے" اس سے ثابت ہوا کہ خالق کی خوشنودی، اور اس کے

ذریعہ سے مخلوق کی خیرخواہی کے علاوہ اُن کا کوئی دوسرا مقصد اور مطمح نظر نہیں ہوتا،

دوسرے انبیاے کرام علیہم السلام کے علاوہ خاص محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے تعلق ونسبت سے ان حقیقتوں کو قرآن پاک نے کئی دفعہ بتصریح بیان کیا ہے، جن میں سے چار باتیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں،

۱- اشیائے غیب، امور خیر اور فلاح وسعادت کے اسباب پر اس کا علم خدا کی تعلیم سے کامل ہو،

۲- وہ اپنے علم کے مطابق اپنے عمل مین کامل اور راستباز ہو،

۳- وہ دوسروں کو ان امور کی تعلیم دیتا ہو،

۴- اور اُن کو بھی اپنی تعلیم اور صحبت کے فیض سے حسب استعداد کامل بناتا ہو،

قرآن پاک میں متعدد موقعون پر آپؐ کی نسبت یہ فرمایا گیا،

یَتْلُوا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ	وہ رسول ان پڑھون کو خدا کی باتین سنا
وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ	اور اُن کو پاک وصاف بناتا، اور اُن کو
(بقرۃ وجمعہ-۱)	کتاب وحکمۃ سکھاتا ہے،

اس مختصر سی آیت میں ان چارون مذکورۂ بالا امور کا یکجا ذکر کیا ہے، جاہلون کو آیات الٰہی پڑھانے اور کتاب و حکمت سکھانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ خود اُس کو آیات الٰہی پڑھائی اور کتاب وحکمت سکھائی گئی ہون اور دوسرون کو پاک وصاف بنانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود پاک صاف ہو کہ ایک جاہل اپنے ہی جیسے دوسرے جاہل کو عالم، اور ایک ناپاک اپنے ہی جیسے دوسرے ناپاک کو پاک نہین بنا سکتا، ایک دوسری آیت میں ہے،

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰیٓ اِلَّا مَا شَاءَ	ہم تجھے پڑھائیں گے تو تو نہیں بھولیگا مگر جو
اللّٰهُ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى وَ	اللہ چاہے وہ جانتا ہے پکارا اور چھپا، اور ہم تجھے
نُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى فَذَكِّرْ اِنْ	آہستہ آہستہ آسانی تک پہنچائیں گے اور تو سمجھا
نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى	اگر تیرا سمجھانا فائدہ دے، جس کو خدا کا لحاظ
وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقٰى (اعلیٰ)	ہوگا، وہ سمجھے گا اور جو بدبخت ہوگا وہ اس

ایسا پڑھانا جس میں بھول نہ ہو" پیغمبر کی روحانی تعلیم ہے" اور آسانی کی منزل کی طرف اس کو آہستہ آہستہ لے چلنا، اور اس کے لئے اس کٹھن منزل کو آسان کر دینا" اس کے ذاتی عمل کو کمال کے درجہ تک اس طرح پہنچا دینا ہے کہ تمام امور خیر اس سے بسہولت از خود صادر ہونے لگیں پھر اس کو دنیا کے "سمجھانے" پر مامور کرنا، اس رمز کو آشکارا کرنا ہے کہ دوسرے دن کی تعلیم و تذکیر کا منصب اس کو ملا ہے، اس کے بعد یہ فرمانا کہ متقی اس نصیحت سے فیض پائیں گے، اور بدبخت محروم رہیں گے اس کی تشریح یہ ہے کہ ناقصوں کی تکمیل اور ذی استعداد لوگوں کو اُن کی استعداد کے مطابق پہنچانا بھی اس کا فرض ہے[1]،

نبوت کے لوازم اور خصوصیات

نبوت کی شرح حقیقت اور اس کے لوازم اور خصوصیات کے اجمالی بیان کے بعد ضرورت ہے کہ نبوت کے چند اہم خصوصیات پر تفصیل سے گفتگو کی جائے تاکہ وقت کی بہت سی غلط فہمیوں کا سدباب ہو، لیکن ان خصوصیات کے ذکر سے پہلے خود ہم کو خصوصیت کو سمجھنا ہے کہ اس سے مقصود کیا ہے،

[1] یہ تشریح اور طریقہ استدلال امام رازی نے اپنی تفسیر اور بعض کتب کلامیہ میں اختیار کیا ہے،

دنیا میں ہر نوع اور ہر نوع کے ماتحت ہر صنف میں کچھ نہ کچھ مخصوص صفات ہوتی ہیں، یہ مخصوص صفات اس نوع اور صنف کے ہر فرد میں یکساں پائی جاتی ہیں، ان ہی کو ہم لوازم اور خصوصیات کہتے ہیں، پھل، پھول، چوپائے، پرندے، انسان، تمام انواع میں کچھ نہ کچھ ایسی خصوصیات ہیں جو دوسروں میں نہیں پائی جاتیں، اور ان ہی خصوصیات کی بنا پر ہر نوع دوسری نوع سے ممتاز اور ہر صنف دوسری صنف سے علیحدہ ہے، گلاب میں خاص قسم کا رنگ، خاص قسم کی خوشبو، اور خاص قسم کے پتے ہوتے ہیں، یہ ناممکن ہے، کہ کوئی گلاب ہو اور اس میں یہ چیزیں نہ پائی جائیں لیکن گلاب کی بھی مختلف صنفیں ہیں، اور ان میں سے ہر ایک میں کچھ ایسی لازمی صفات ہوتی ہیں جن سے گلاب کی ہر صنف (قسم) دوسری صنف (قسم) سے علانیہ الگ نظر آتی ہے،

اسی طرح انسانیت کے کچھ خاص لوازم ہیں، دو ہاتھ، دو پاؤں، سیدھا قد، بولنے کی طاقت، سمجھ بوجھ اور غور و فکر کی اہلیت، ایجاد و اختراع کی قوت، انجام بینی، اور مآل اندیشی کی صلاحیت وغیرہ اس کے خواص ہیں، اور جس طرح شہد میں مٹھاس حنظل میں کڑواپن، آگ میں گرمی اور برف میں ٹھنڈک، نوعی خواص کی حیثیت سے خود بخود پیدا ہوگئی ہیں، اسی طرح انسان میں انسانیت کی مذکورہ بالا خاصیتیں فطرۃً ودیعت ہیں لیکن اس وصفِ انسانیت میں اشتراک کے ساتھ گلاب کے اصناف کی طرح نوع انسانی کی بھی مختلف اصناف ہیں، .... جیسے ہندی، چینی، حبشی، رومی ایشیائی یورپین، دیکھو کہ ان میں سے ہر ایک صنف میں انسانیت کے اشتراک کے باوجود قد و قامت، چہرہ مہرہ، رنگ و روغن، صورت و شکل، اخلاق و عادات وغیرہ بیسیوں چیزوں کا نمایاں امتیاز ہوتا ہے، اور یہ تمام انسانی اصناف جو مختلف آب و ہوا، مختلف مرز و بوم، مختلف

نسل اور مختلف ماحول سے تعلق رکھتے ہیں، انسان ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے صریحاً ممتاز ہیں،

اسی طرح ہر صنفِ انسانی کے اندر مختلف افراد ہیں، خلاق فطرت نے اُن میں سے ہر ایک کو مختلف قابلیتیں عطا کی ہیں، شاعری، زباندانی، فلسفہ، ریاضی صناعی، باغبانی معماری پہلوانی، سیکڑوں مختلف قسم کی انسانی استعدادیں اور قابلیتیں ہیں، اُن میں سے ہر صنف کی اور ہر صنف میں سے ہر ایک فرد کی قابلیت و استعداد کی خصوصیتیں دوسری سے الگ ہیں، ایک تخیل پسند شاعر، اور ایک حقیقت شناس ریاضی دان میں عظیم الشان فرق ہوتا ہے، ادب و انشاء کے خیالی بلند پرواز، عموماً ریاضیات جیسے ٹھوس اور واقعی علوم سے کورے ہوتے ہیں، اور واقعات سے ببر نزریاضیات کے جاننے والے، ادب شاعری سے بیگانہ، پہلوانی کے جوہر باغبانی سے الگ ہیں، اور ایک صناع کی طبیعت ایک فلسفی سے متضاد ہوتی ہے،

اسی کے ساتھ صنفِ شعراء میں خاص دماغی قابلیت کا اتحاد ہوتا ہے، نظم کی قوت تخیل کی بلندی، محاکات کی قدرت، الفاظ کا زور، معانی کا جوش، یہ تمام شعراء کی مخصوص صفات ہیں، اسی طرح تمام فلسفیوں کی ایک خاص دماغی کیفیت ہوتی ہے، خاموشی، غور و فکر، دقت نظر خارجی عالم سے بے پروائی، تصور میں انہماک، خلوت گزینی، اخلاق کی خشکی، الغرض مرز و بوم اور آب و ہوا کے اختلاف کی بناء پر جو اصنافِ انسانی پیدا ہوتے ہیں، اور اُن میں جو اختلاف و امتیاز ہوتا ہے اسی طرح دماغی و ذہنی و روحانی اختلافِ استعداد کی بناء پر جو اصنافِ انسانی پیدا ہوتے ہیں اُن میں بھی یہ اختلاف و امتیاز نظر آتا ہے، ہنیبال و نپولین، تیمور، چنگیز، دم کے دم میں آبادی کو

ویرانہ، اوہ ویرانہ کو آبادی، پہاڑ کو میدان اور میدان کو پہاڑ بنا سکتے تھے، مگر وہ بیٹھکر فلسفۂ اخلاق پر چند صفحے نہیں لکھ سکتے تھے، افلاطون تنہائی میں بیٹھکر جمہوریت کا فلسفیانہ خاکہ تیار کرسکتا تھا مگر ایتھنز کے تخت پر بیٹھکر ایک لحہ حکمرانی کا فرض انجام نہیں دے سکتا تھا سلطان محمود کے دربار کی شاعر فردوسی نے اپنی طبیعت کے زور سے سینکڑون خیالی سومنات کے معرکے فتح کیے، لیکن بیقر کی ایک چٹان پر بھی کلہاڑی نہ مار سکا، اس کے برخلاف سلطان محمود فوجون کے دل بادل کے ساتھ پہاڑون کو چیرتا دریاؤن کو پھاڑتا، اور ریگستانون میں پانی بہاتا ہوا غزنی سے چل کر گجرات کے کنارے تک پہنچ گیا، اور سومنات کے سنگی قلعہ اور مجسمہ کو چکناچور کرڈالا، مگر فردوسی کی طرح تنہا بیٹھکر وہ خیالی شاہنامہ کا ایک معرکہ بھی فتح نہیں کرسکتا تھا،

ان مثالون سے یہ ثابت ہے کہ نوعِ انسانی مین اشتراک ہونے کے باوجود اصنافِ انسانی کی ہزارون قسمین ہیں، اور ان میں سے ہر قسم و صنف کے الگ الگ خصوصیات، صفات اور لوازم ہین، ان ہی مختلف اصنافِ انسانی مین انبیاء علیہم السلام کی بھی ایک صنف ہے، اور نوعِ انسانی کی اس مقدس صنف کے بھی چند خاص اوصاف خصوصیات اور لوازم ہیں، جو اُن کو دوسرے اصنافِ انسانی سے علانیہ ممتاز بناتے ہیں،

اس تمہید کے بعد اب ہم کو اس مسئلہ کی طرف توجہ کرنی چاہیئے کہ نبوت و رسالت کے اہم لوازم اور خصوصیات کیا ہیں،

وہبی استعداد | ان میں سے سب سے پہلی چیز وہبی استعداد ہے، اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ مختلف انسانون میں مختلف قسم کی فطری استعدادین پائی جاتی ہین، اور اُن ہی کی طرف اُن کا طبعی

میلان ہوتا ہے، اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں، اُن کی استعداد اور میلان طبع کا جوہر برگ و بار پیدا کرنے لگتا ہے، یہاں تک کہ ایک خاص مقررہ مدت میں جاکر وہ پوری طرح ظاہر ہوجاتا ہے جس طرح ہر درخت سے آم کا پھل پیدا نہیں ہوسکتا، بلکہ اسی سے ہوگا جس کو خدا نے آم کا درخت بنایا ہے، پھر آم کے درخت کے آثار، خواص، پھل، اُس کا مزہ، اُس کا رنگ و بو غرض جملہ خصوصیات خود اس درخت میں اُسی وقت موجود ہوتے ہیں، جب وہ ہنوز تخم کی صورت میں ہوتا ہے، وہی تخم پودا بنتا ہے، پودا بڑھتا ہے کونپل اور شاخیں پیدا کرتا ہے، اور چند سال میں پھل دینے لگتا ہے لیکن اپنی ترقی کے ہر دور میں وہ اپنے مخفی خصوصیات وہی رکھتا ہے، جو ایک دن اس سے آخر میں ظاہر ہونے والے ہیں، اور اس پھل کی صفت ہمیشہ اُس میں بالقوۃ موجود تھی،

اسی تمثیل کے مطابق یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر انسان کوشش سے نبی نہیں ہوسکتا، بلکہ وہی ہوسکتا ہے جس کو خدا نے نبی بنایا ہے، اور نبوت کے یہ آثار، خواص، اور کیفیات اس میں بالقوۃ اور استعداد کی صورت میں اسی وقت سے موجود رہتے ہیں، جب وہ ہنوز آب و گل کے عالم میں ہوتا ہے، شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا کہ میں اُسی وقت نبی تھا، جب آدم ہنوز آب و گل میں تھے[۱] اسی قسم کا مطلب ہوگا؛

انبیاے کرام علیہم السلام کی سیرتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جب سے عرصۂ وجود میں قدم رکھتے ہیں، اسی زمانہ سے آنے والے وقت اور ملنے والے منصب کے آثار اُن سے ظاہر ہونے لگتے ہیں، وہ حسب نسب اور سیرت و صورت میں ممتاز ہوتے ہیں، شرک و کفر کے

---

[۱] جامع ترمذی مناقب نبوی و مستدرک حاکم مناقب محمدی ج دوم ص ۶۰۰، حیدرآباد،

ماحول میں ہونے کے باوجود اُس کی گندگی سے بچائے جاتے ہیں، اخلاق حسنہ سے آراستہ ہوتے ہیں، اُن کی دیانت، امانت، سچائی، راست گفتاری مسلّم ہوتی ہے، اور یہ تمہیدیں اس لئے ہوتی ہیں تاکہ منصب ملنے کے بعد اُن کے دعوائے نبوّت کی تصدیق، اور لوگوں کے میلان خاطر کا سامان پہلے ہی سے موجود رہے، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت یحییٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، اور حضرت محمد رسول اللہ صلوٰت اللہ علیہم کے حالات وواقعات قبل نبوّت پڑھو، تو ہمارے اس دعویٰ کی سچائی تم کو نظر آئیگی حضرت ابراہیمؑ کا نبوّت پانے کے پہلے ہی سے آسمان وزمین کے خالق کی تلاش، سورج، چاند، اور ستاروں پر متفکرانہ نظر اور بت پرستی کے خلاف نفرت کا شدید جذبہ کس بات کی شہادت ہے؟ حضرت اسمٰعیلؑ کا بے آب وگیاہ میدان میں پرورش پانا، چاہِ زمزم کا ظہور آنے جانے والے قافلوں کا اسکی آبادی کی طرف میلان چلنے پھرنے کے قابل ہوئے، تو مقدس باپ کے ساتھ مقدس سفر کے لئے تیاری، اور اس کمسنی میں باپ کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پوری آمادگی، اور صبر وشکر اور تسلیم ورضا کا اظہار کس مستقبل کی خبر دیتا ہے؟ حضرت اسحٰقؑ کا فرشتوں کی بشارت سے پیدا ہونا اور پیدائش سے پہلے ہی غُلٰمٍ عَلِیْمٍ (حجر-۴) کا خطاب پانا، پھر مقدس باپ کی جانشینی اور اورشلیم کی مسجد کی پاسبانی کے لئے انتخاب کس مقصود کا دیباچہ ہے ؟

حضرت یوسفؑ کا بچپن میں رویائے صادقہ، اور صبر وشکر، اور پاکدامنی کس بات کی گواہی دیتی ہے؟ حضرت موسیٰؑ کی عین خطرہ میں پیدائش، حفاظت، پرورش، اور نبوت سے پہلے ہی فرعونیوں سے تن تنہا، مجاہدانہ آویزش کس مبتدا کی خبر ہے؟ حضرت سلیمانؑ کا آغاز عمر میں علم وفہم

فضلِ مقدمات کی قوت کس نتیجہ کے آثار ہیں ؟ حضرت یحییٰ کی دعائیہ پیدائش بچپن ہی میں انکی
انکی سعادتمندی، نرم خوئی، پاکی، کس مقصد کی تمہید ہی ؟ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش اور بچپن ہی میں
انکی اسلامت روی، توراۃ کی حقیقت رسی کس روزِ روشن کی صبح ہے، اور خود محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دعائے خلیل، نوید مسیحا، رویائے آمنہ، اور احوال ولادت و تربیت،
مراسمِ شرک سے اجتناب، اخلاقِ حسنہ، دیانت، امانت، آثارِ خیر و برکت، نبوت سے پہلے
ہی تنہائی پسندی، خلوت گزینی، حقیقت کی تلاش، اور غور و فکر کس خورشیدِ جہانتاب کا مطلعِ انوار ہی۔

حضرت اسماعیلؑ کا یہ حال ہی،

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ فَلَمَّا بَلَغَ
مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي
الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى
قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ
اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (صٰفّٰت)

تو ہم نے ابراہیم کو ایک بردبار لڑکے کی خوشخبری
دی تو جب وہ اس کے ساتھ دوڑنے کی عمر کو پہنچا،
تو اُس نے کہا کہ اے میری بیٹے! میں خواب میں
دیکھتا ہوں کہ تجھکو میں ذبح کر رہا ہوں اس نے
جواب دیا اے میری باپ کر ڈال جو تجھے کہا گیا،

حضرت موسیٰ کو یہ خطاب ہے،

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى
اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى
(طٰہٰ - ۲)

اور ہم نے تجھ پر دوسری دفعہ احسان کیا، جب
(تیری حفاظت اور پرورش کے متعلق) تیری
ماں کے دل میں وہ بات ڈالدی جو ڈالی گئی

حضرت یحییٰ کی نسبت یہ ارشاد ہے،

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَ	اے یحییٰ کتاب (توراۃ) کو مضبوطی سے پکڑ، اور
اٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۙ وَّحَنَانًا مِّنْ	ہم نے اسکو فیصلہ کرنیکی قوت بچپن ہی میں دیدی
لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ؕ وَكَانَ تَقِيًّا ۙ وَّبَرًّا	اور اپنے پاس سے رحم دلی اور ستھرائی اور تھا پرہیزگار
بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا	اور اپنے ماں باپ کا فرمانبردار تھا، زبردستی
وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ ، (مریم-۱)	کرنیوالا، نافرمان نہ تھا سلامتی ہو اس پر جس دن

نیز حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے،

كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ	ہم کیسے اس سے بات کریں جو ہنوز گہوارہ میں
صَبِيًّا، قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ	بچہ ہی، عیسیٰؑ نے کہا میں خدا کا بندہ ہوں، مُسنے
وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا	مجھے کتاب الٰہی دی، اور مجھے نبی ٹھہرایا،
اَيْنَمَا كُنْتُ ، (مریم-۲)	اور مبارک بنایا، میں جہاں ہوں،

اور مکہ کا الامینؑ نبوت کے پہلے کی اپنی پوری زندگی، موقع شہادت میں بے خطر پیش کردیتا ہے.

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ	تو اس (پیغمبری کے دعویٰ) سے پہلے میں
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ، (یونس-۲)	تم میں ایک عمر گذار چکا ہوں، کیا تم نہیں سمجھتے

انبیاء علیہم السّلام کے احوالِ مبارکہ کے یہ جزئیات، باہم مل کر اپنی نسبت خود کلیہ بنا کر پیش کرتے ہیں.

غیبی علم | نبوت کا دوسرا سب سے اہم خاصہ اُس کا غیبی علم ہے یعنی وہ علم جو عام انسانوں کی طرح

وجدان احساس یا عقل و قیاس سے نہین بلکہ براہ راست صدائے غیب، یا رویائے صادقہ یا فرشتون
کے ذریعہ سے خدائے پاک سے حاصل ہوتا ہے، اسی کے آغاز سے نبوت کی استعداد بالقوة کا
عملی ظہور شروع ہو جاتا ہے، اس مسئلہ کو پوری طرح سمجھنے کے لئے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہی،

علم انسانی کے ماخذ | علم انسانی کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو بلا واسطہ ہوتا ہے، اور دوسرا وہ جو کسی
واسطہ سے حاصل ہوتا ہے، بے واسطہ علم کی بھی تین قسمین ہین،

۱۔ **وجدان**، انسان کو اپنے جسمانی وجود اور اس جسمانی وجود کے اندرونی کیفیات
کا علم سب سے زیادہ یقینی طور سے ہوتا ہے، ہر شخص کو اپنے وجود کا یقین ہے، اور اس کے
اندر بھوک، پیاس، بیماری، صحت، غم، خوشی، خوف وغیرہ اندرونی تغیرات کا علم اس کو بلا واسطہ
از خود ہو جاتا ہے،

۲۔ **فطرت** اس میں کوئی شک و شبہ نہین ہے کہ ہر نوعِ مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف
سے کچھ ایسی نوعی خصوصیتیں عطا ہوتی ہیں، جو دوسری نوعون مین نہیں پائی جاتین، اور انہی سے باہم
نوعون کا اختلاف اور امتیاز ظاہر ہوتا ہے، ان نوعی خصوصیتوں کا علم ہر نوع کے افراد کو بلا کسی
ذریعہ اور واسطہ کے از خود ہوتا ہے، اور اسی کو بعض علمار کی اصطلاح میں فطری یا نوعی الہام اور اہل
فلسفہ کی اصطلاح میں "جبلت" کہتے ہین، حیوانات کو اپنے متعلق بہت سی باتون کا علم از خود فطرةً ہوتا
ہے، پرندون کے بچوں کو دانہ چگنا، اور اڑنا کون سکھاتا ہے، آبی جانورون کو تیرنے کی تعلیم کون دیتا
ہے، شیر کے بچّہ کو درندگی کا سبق کس معلّم نے پڑھایا، انسان کے بچّہ کو پیدا ہوتے ہی رونا، سونا، دودھ
پینا، کون سکھا دیتا ہے،

۳۔ بداہتِ اوّلیہ انسان کو کچھ ہوش وتمیز آنے کے بعد بلا دلیل بعض ایسی باتین از
خود یا بادنی تامل اس طرح معلوم ہو جاتی ہیں کہ اُن میں پھر کسی قسم کا شک وشبہ راہ نہیں پاتا، دو
اور دو چار ہوتے ہیں، برابر کا برابر برابر ہوتا ہے، ایک ہی وقت میں ایک ہی چیز سیاہ وسپید دونون
نہیں ہو سکتی، ہر بنی ہوئی چیز کا کوئی بنانے والا ہوتا ہے، وغیرہ بہت سے ایسے ضروری مقدمات
اور کلیات جن پر انسان کے استدلال کا تمامتر مدار ہے، اُس کو بداہۃً معلوم ہو جاتے ہیں؛

یہ تو بلا واسطہ علم کی تین قسمیں تھیں، اس کے بعد علم انسانی کی وہ قسمیں ہیں جن کا علم اس کو
کسی واسطہ سے ہوتا ہے، انسان کے پاس اس قسم کے دو واسطے ہیں، ایک احساس اور دوسرا
عقل، پہلے سے وہ گرد وپیش کی مادی چیزون کا، اور دوسرے سے ان مادی چیزون کا جو سامنے
موجود نہین، یا سرے سے خارج میں موجود نہیں، بلکہ عالمِ غیب میں ہین، یا صرف ذہن مین ہین،
علم حاصل کرتا ہے،

۴۔ انسان کے جسم کے اندر پانچ قسم کی جسمانی قوتیں ہیں، باصرہ، سامعہ، شامہ، ذائقہ،
لامسہ، باصرہ دیکھتی، سامعہ سنتی، شامہ سونگھتی، ذائقہ چکھتی، اور لامسہ چھوتی ہے، ان ہی کا نام
حواسِ خمسہ ہے، انسان کے پاس یہی پانچ آلات ہیں، جن کے ذریعہ سے وہ اُن مادی چیزون کے
متعلق علم حاصل کرتا ہے، جو اس کے ان آلات سے آکر ٹکراتی ہیں، اسی کا نام احساس ہے، ہم چکھ کر
مزہ پاتے، سُن کر آواز پہچانتے، دیکھ کر صورت جانتے، چھو کر سختی ونرمی دریافت کرتے، اور سونگھ کر
بُو معلوم کرتے ہیں، ان حواس کے ذریعہ سے بھی جو علم ہم کو ہوتا ہے، وہ اکثر یقینی اور شاذ ونادر
غلط بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ کبھی کبھی کسی سبب سے دھوکا بھی کھاتے ہیں، اور دریافت مین غلطی بھی کرتے ہین،

اور دلائل سے ان کا یہ دھوکا اور اُن کی غلطی ثابت ہوتی ہے، بیماری میں قوت ذائقہ بدل گئی ہے اور اُس نے میٹھے کو کڑوا بتایا ہے، تیز حرکت میں قوتِ باصرہ نے ہم کو دھوکا دیا ہے، ریل میں ہم کو ساکن اور ٹھہری ہوئی چیز چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، چلتے ہوئے جہاز میں جہاز ہم کو ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا ہے متحرک چنگاری کا نقطہ تیز سیدھی حرکت میں ہم کو آتشیں خط اور گول حرکت میں آتشیں دائرہ معلوم ہوتا ہے آسمان کے چمکتے ہوئے بڑے بڑے ستارے کتنے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں لیکن کیا درحقیقت وہ ایسے ہی چھوٹے ہیں،

۵۔ علم بالواسطہ کی دوسری قسم وہ ہے جس کو ہم اپنی عقل وقیاس، غور وفکر اور استدلال کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہیں، اس کی بنیاد درحقیقت اُن ہی معلومات پر ہوتی ہے، جن کا علم ہم کو اپنے وجدان، الہام فطری (یا جبلت) بداہتِ اولیہ اور احساس سے پہلے ہو چکا ہے، اور ان ہی معلوم شدہ ....

امور پر غیر معلوم امور کو تمثیل یا استقرار کے ذریعہ سے قیاس کر کے اُن معلوم شدہ امور کے خصوصیات اور آثار کا حکم ان غیر معلوم لیکن مشابہ ومماثل امور پر لگا کر نیا نتیجہ حاصل کرتے ہیں، وہ غیر معلوم امر جس پر معلوم امور کے ذریعہ ہم کوئی حکم لگاتے ہیں، اگر مادی ہوتا ہے، تو نتیجہ چنداں غیر مشکوک نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ جزئیات کا استقرا، پورا نہ کیا گیا ہو، یا تمثیل تام نہ ہو، یا تجربۂ مشاہدہ نے دھوکا دیا ہو، یا کوئی اور اصولی غلطی ہو گئی ہو، طبعیات اور سائنس کے مسائل اکثر اسی طرح معلوم کئے گئے ہیں، لیکن اگر وہ امر مجہول غیر مادی ہو، تو مادی امور پر اُس غیر مادی کو قیاس کر کے اس کی نسبت جو کچھ کہا جائے گا، اس کا مرتبہ ظن وتخمین سے آگے نہیں بڑھتا، مگر یہ کہ وہ تمام تر

فطریات وبدیہیات ومحسوسات پر علانیہ منتہی ہو، مابعد الطبیعہ اور فلسفۂ الٰہیات کے مسائل اسی طریقۂ استدلال سے حاصل ہوتے ہیں، اور اسی لئے اُن میں اختلافات کی بڑی گنجایش نکلتی ہو کہ اُن کے آخری نتیجہ اور ابتدائی بنیادی وجدانی یا بدیہی یا حسّی مقدمات کے درمیان قیاسات کی کئی منزلیں ہیں، اور اُن میں سے ہر منزل خطروں سے لبریز ہے، مشابہت و مماثلت میں دھوکا ہو سکتا ہی عقلی اور وجدانی اور حسّی اشیاء کے خواص کے درمیان اختلاف اور فرق ہو سکتا ہے، غور و فکر بحث و نظر تحقیق و جستجو اور ترتیبِ مقدمات جو اس قیاس عقلی کے کارکن اور فاعل ہیں، وہ اپنے کام میں دھوکا کھا سکتے ہیں، اسی لئے یہ علوم شکوک وشبہات سے لبریز ہیں،

ذرائعِ علم کے حصول کے زمانے اور اُن کے مراتب

سطورِ بالا سے ہویدا ہے کہ ہمارے سب سے زیادہ یقینی علوم ہمارے **وجدانیات** اور **فطریات** ہیں، جو ہم کو قدرت کی طرف سے سب سے پہلے عنایت ہوتے ہیں کہ ہمارے وجود کی بقا اس علم پر موقوف ہی، جیسے بھوک اور پیاس کا احساس، اور اس علم کا یقینی ہونا بھی ضروری ہے، ورنہ ہم اپنا وجود قائم نہ رکھ سکیں گے، ہم کو جو بھوک یا پیاس لگتی ہی کیا اس کے یقینی اور قطعی علم میں ہم سے غلطی ہو سکتی ہی، اور کیا کسی کے شک دلانے سے ممکن ہی کہ تم کو بھوک نہ ہو ممکن ہی کہ تم کو پیاس نہ ہو کبھی بھوکے یا پیاسے کو اپنی بھوک اور پیاس کے متعلق شک ہو سکتا ہی اور یہ احساس اور علم وجود کے ساتھ ساتھ انسان کو ملتا ہی یہاں تک کہ آج کا پیدا شدہ بچہ بھی اس کا احساس کرتا اور علم رکھتا ہے، ورنہ وہ اپنے وجود کو قائم نہ رکھ سکے،

وجدانیات وفطریات کے بعد محسوسات کا علم انسان کو ملتا ہی دیکھنا، سننا، چکھنا، سونگھنا، چھونا، یہ ہمارے پانچ حواس ہیں، جو ہمارے مادی علم کے آلات ہیں، اور جن کے بغیر کوئی باہر کا علم

ہمارے اندر نہیں آسکتا، یہ احساسات بھی ایک ہی دفعہ نہیں کمال پا جاتے، بلکہ ضرورت کے مطابق حسب استعداد بڑھتے اور ترقی پاتے ہیں، اور پیدایش کے چند ماہ بعد یہ تکمیل کو پہنچتے ہیں، کیونکہ وجود کی بقا اور ضروریات کی تکمیل ابھی سے اُن پر رفتہ رفتہ موقوف ہوتی جاتی ہے،

محسوسات کے بعد بدیہیات اوّلیہ کا درجہ آتا ہے، انسان کو اپنے اس علم میں بھی وہی اذعان وقطعیت ہوتی ہے، دو دو چار ہوتے ہیں، دس پانچ کا دونا ہے، ایک چیز ایک ہی وقت میں دو جگہ نہیں ہوسکتی، ایک چیز ایک ہی وقت میں سیاہ وسپید نہیں ہوسکتی، ان بدیہی علوم کو ہر شخص مانتا اور تسلیم کرتا ہے، مگر اس کا علم انسان کو بچپن میں نہیں ہوتا، بلکہ تمیز ورشد کے بعد ہوتا ہے، کیونکہ اُسی وقت اس کی ضرورت پیش آتی ہے، اگر یہ علوم اس سن میں اس کو عطا نہ ہوں تو وہ دنیا کے ضروری کاروبار چلانے کے لائق نہ ہو، اور نہ دوسرے علوم کی دریافت کی اس میں استعداد پیدا ہو، فطری احمق اور بیوقوف ان ہی کو کہتے ہیں، جن میں ان بدیہیات کا علم کم یا بالکل نہیں ہوتا،

سب سے اخیر میں اُس علم کا درجہ آتا ہے، جو وجدانیات، فطریات، بدیہیات اور محسوسات پر قیاس کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے، اور جس کو علم معقولات کہتے ہیں، اسی علم، اور اسی کی قوت کی کمی بیشی کا نتیجہ ہے کہ انسانی عقلیں درجہ اور مرتبہ میں متفاوت ہوتی ہیں، ایک طرف تو (کمی کی سمت میں) وہ حماقت تک پہنچ جاتی ہیں، اور دوسری طرف (سمتِ کمال میں) عاقل، عاقل تر، اور عاقل ترین طبقہ تک اونچی ہو جاتی ہیں، یہانتک کہ وہ درجہ بھی آتا ہے کہ کسی کی عقل اس مرتبہ تک جا پہونچتی ہے جہاں کوئی اس کا دوسرا حریف اور ہمسر نہیں ہوتا، ایک جاہل حبشی سے لے کر ارسطو اور

بو علی سینا تک سب ہی عقلی مدارج کے مختلف انسانی نظائر ہیں، بااین ہمہ یہ ظاہر ہو کہ اس علم کا طریقہ نہایت پُر خطر اور منزلِ مقصود ہمیشہ مشکوک رہتی ہے،

عام طور سے انسانی علم کے یہ پانچ ذریعے اور طریقے سمجھے جاتے ہیں لیکن درحقیقت ایک اور ذریعہ بھی ہے، جس کا تعلق تمامتر ماورائے مادہ سے ہی، غور کیجئے کہ آپ کا سب سے پہلا علم یعنی وجدانیات آپ کے اندرونی حواس کا نتیجہ ہے، دوسرا یعنی فطریات کا علم خالقِ فطرت خود آپکے اندر ودیعت رکھتا ہے، تیسرا علم یعنی محسوسات کا علم آپ کے اُن ظاہری حواس کا نتیجہ ہے، جو گو باہر ہیں مگر آپکے جسم کے اندر ہیں، آپ کا چوتھا ذریعۂ علم یعنی بدیہیاتِ اوّلیہ آپ کے حواس اور ذہن کا ایک مشترک فیصلہ ہیں، پانچواں ذریعۂ علم جو آپ کی عقل و ذہن کی قیاس آرائی ہی، وہ آپ ہی کے اندر کے دماغی قویٰ کا عمل ہے، تھوڑے تامل سے معلوم ہوگا کہ آپ کا علم وجدان سے لیکر ذہن تک بتدریج مادیت سے ترقی کرکے ماورائے مادہ کے قریب تک پہنچتا ہے، وجدان تمامتر ہماری اندرونی جسمانی مادیات ہی، جس میں کوئی شک نہیں، محسوسات بھی ہمارے ہی جسم کے مادی آلاتِ علم کے نتائج ہیں، بدیہیات ہمارے حواس سے جو مادی ہیں، اور ہمارے ذہن سے جو غیر مادی ہی، مشترک تعلق رکھتے ہیں، یعنی بدیہیات، مادی، اور غیر مادی ذرائع علم کے بین بین ہیں، اور معقولات تمامتر ذہنی اور غیر مادی ہیں، تاہم اس غیر مادی قوت کا مرکز ہمارا مادی جسم ہی ہے، اور اس حد تک اس غیر مادی قوت کا مادہ سے تعلق بہرحال ہوتا ہے،

غیر مادی علم | اب اس کے بعد اُس علم کا درجہ آتا ہے جس کی سرحد اُس کے بعد آتی ہے، اور جس کا تعلق مادہ سے اتنا بھی نہیں ہوتا جتنا معقولات اور ذہنیات کا ہی، وہ تمامتر مادہ اور مادیات سے پاک

ہوتا ہے، اُس کو مادہ سے اسی قدر لگاؤ ہوتا ہے کہ وہ علم مادی دل و دماغ کے آئینہ پر ادپر سے آکر اپنا عکس ڈالتا ہے،

اس غیر مادی علم کے بھی بہ ترتیب مختلف درجے ہین جن کو فراست، حدس، کشف، الہام اور وحی کہتے ہین، اور جس طرح انسانی علم کے مذکورۂ بالا پانچون ذریعے انسان کے جسمانی قوی سے متعلق تھے، اسی طرح یہ غیر مادی ذرائع، انسان کے روحانی قوی سے وابستگی رکھتے ہیں، اور جس طرح اپنے دیکھا ہے کہ وجدانیات سے لیکر عقلیات تک بہ ترتیب ہمارا ذریعۂ علم خالص مادی، کامل مادی، کم مادی، اور برائے نام مادی تک ترقی کرتا چلا گیا ہے، اسی طرح فراست، حدس، کشف، الہام اور وحی بھی برائے نام مادی ورروحانی سے لیکر پھر روحانی، کامل روحانی، اور خالص روحانی کے ذریعہ تک ترقی کرتے چلے گئے ہین،

فراست کے لفظی معنی تاڑ جانے کے ہیں تاڑ لینے کی قوت ہر شخص میں نمایان نہین ہوتی، مگر جس مین نمایان ہوتی ہے، اُس کی یہ کیفیت ایک ملکہ کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے، جو تجربہ کی کثرت اور عمل کی مہارت اور کمال کے بعد انسان کو حاصل ہوجاتا ہے، اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کے دیکھنے، سننے، چکھنے، سونگھنے، یا چھونے کے ساتھ ہی صرف بعض علامتون کے جان لینے سے دوسری متعدد ضروری علامتون پر تفصیلی نظر ڈالے بغیر اتنی جلدی انسان صحیح نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ کہ دیکھنے والون کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ غیب کی بات بیان کررہا ہے، حالانکہ اس کا علم تمامتر ظاہری علامتون اور نشانون پر مبنی ہوتا ہے جن کو ہر شخص دیکھ سکتا تھا، مگر دیکھتا نہ تھا، ایسے ماہر فن اور ذی فراست اشخاص برابر ہر شخص کے مشاہدہ مین آتے رہتے ہیں جس کو جس چیز یا فن میں ملکہ پیدا ہوجاتا ہے، اُسکی فراست

اس کو حاصل ہو جاتی ہے، جرائم کے پتہ لگانے والے ماہرین اور جاسوس اپنے فن کی فراست میں یہاں
تک پہنچ رکھتے ہین کہ صورت دیکھی اور تاڑ گئے، اسی طرح ہر علم و فن کے ماہرون کو اپنے اپنے فن کے اندر یہ
ملکہ حاصل ہو جاتا ہے، اخیار اور نیکو کارون کو اپنی جماعت کے افراد کے پہچان لینے اور جان لینے
کی طاقت بھی اسی طرح حاصل ہوتی ہے، اور اسی کو ایک حدیث میں ان الفاظ مین ادا کیا گیا ہے

اتقوا فراسة المومن فانه ینظر — مومن کے تاڑ لینے سے ڈرو کہ وہ خدا کی

بنور اللہ، (ترمذی) — روشنی سے دیکھتا ہے،

۲- فراست کے بعد حدس کا درجہ ہے، فراست کے ابتدائی مقدمات حواس پر مبنی
ہوتے ہین لیکن حدس کے ابتدائی مقدمات ذہنی اور عقلی ہوتے ہین، اور ان ہی ذہنی اور عقلی مقدمات
کے غور و فکر، تلاش اور ترتیب سے نتیجہ حاصل ہوتا ہے، مگر فطری کمال یا فن کی حاصل کردہ مہارت
کے سبب سے غور و نظر، فکر و تلاش اور ترتیب مقدمات کے منطقیانہ مرحلون کو ذہن رسا اس
تیزی اور سرعت کے ساتھ طے کر کے آخری نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے، کہ خود اس کو بھی اس کا احساس
نہیں ہوتا کہ اس نتیجہ کے حاصل کرنے مین اس نے کوئی دماغی عمل بھی کیا ہے، یہ چیز بھی اکثر کامل العقل
اور صائب الرائے انسانون کو فطرةً عطا ہوتی ہے، اور دنیا کے مشہور عقلا، اور دانایان روزگار
کے واقعات مین اس کی کثرت سے مثالیں ملتی ہیں،

۳- کشف کے لفظی معنی تو کھولنے اور پردہ اٹھانے کے ہیں، مگر اس سے مقصود یہ ہے
کہ مادیت کے ظلمانی پردہ کو چاک کر کے مادی چیز روحانی عالم مین مشاہدہ کے سامنے آجاتی ہے
وہ کبھی اصلی صورت مین اور کبھی اپنی مثالی صورت مین نظر آتی ہے، عام لوگون کے سمجھنے کے لئے

اس کی بہترین مثال خواب کی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ خواب عالمِ خواب کی بات ہے، اور کشف عالمِ بیداری کی، جس طرح عام لوگوں کو خواب میں جب ظاہری حواس بیکار ہو جاتے ہیں ایسی خبریں معلوم ہوتی ہیں، جو کبھی کبھی عین واقعہ ثابت ہوتی ہیں، اسی طرح خاص لوگوں پر بیداری ہی میں ظاہری حواس کے تعطل سے ایسا سماں پیش آتا ہے، ہر شخص کے تجربے میں ایسے متعدد حیرت انگیز واقعات گذرتے رہتے ہیں،

۴۔ الہام کے لغوی معنی "دل میں ڈالنے کے" ہیں، اور اس سے مراد وہ علم ہے، جو محنت، تلاش، تحقیق، غور اور ترتیب مقدمات کے بغیر دل میں آجاتا ہے، اور ممکن ہے کہ اس کی صحت بعد کو حسی تجربوں اور عقلی دلیلوں سے بھی ثابت ہو جائے، مگر خود وہ علم پہلے پہل ذہن میں کسی حسی تجربہ یا عقلی دلیل کے نتیجہ کے طور پر نہیں آتا، بلکہ خود بخود دل میں آجاتا ہے، کیوں آتا ہے؟ اور کہاں سے آتا ہے؟ اس کے جوابات مختلف ہو سکتے ہیں، مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ آتا ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، اس کی ابتدائی اور معمولی مثالیں وہ خیالات ہیں جو محققین، علماء، شعراء، اور موجدین کے ذہن میں پردۂ عدم سے پہلے پہل آتے ہیں، اور وہ اُن کو دنیا کے سامنے اپنی ایجادات کی صورت میں پیش کرتے ہیں

۵۔ وحی کے لغوی معنی کسی کا اپنے دلی منشاء کو لبوں کو جنبش دیئے بغیر اخفاء اور آہستگی کے ساتھ دوسرے پر ظاہر کر دینا ہیں، اور اصطلاحاً اس کے معنی خدا کا اپنے دلی منشا سے اپنے خاص بندوں کو کسی غیبی ذریعہ سے مطلع کرنا ہیں، یہ علم و اطلاع کے روحانی ذریعوں کی آخری سرحد ہے،

جس طرح علم کی تین جسمانی قسمیں یعنی وجدانیات، حسیات اور بدیہیات عام انسانوں کے لئے یقینی ہیں، اسی طرح روحانی ذرائعِ علم کے یہ تین ذریعے کشف، الہام اور وحی انبیاء علیہم السلام

کے لئے یقینی ہیں، اور جس طرح علم کے مادّی ذریعوں میں سے یقین کا سب سے پہلا ذریعہ وہ ہے، جو تمامتر مادّی ہو یعنی وجدان، پھر حسِ ظاہر، اور پھر بدیہیات اسی طرح علم کے روحانی واسطوں میں سب سے زیادہ یقینی وہ ہو جو تمامتر روحانی ہے، یعنی وحی، پھر الہام، پھر کشف،

ہم نے علم کے روحانی ذرائع کی جو تین قسمیں کی ہیں یعنی وحی، الہام اور کشف، یہ قرآن پاک کی اصطلاحیں نہیں ہیں، اسکی اصطلاح میں روحانی ذریعۂ علم کا نام مکالمۂ الٰہی (خدا سے بات کرنا) اور اس کی حسبِ ذیل تین قسمیں بیان کی ہیں،

۱۔ وحی (اشارہ) سے بات کرنا یعنی دل میں کسی معنی کا بغیر آواز اور الفاظ کے آجانا، یہ اگر حالت بیداری میں ہو، تو کشف ہو، اور اگر خواب میں ہو، تو رویا ہے،

۲۔ خدا کا پردہ کے پیچھے سے بات کرنا یعنی متکلم نظر نہیں آتا، مگر غیب سے آواز آتی ہو اور الفاظ سنائی دیتے ہیں، اس کو الہام کہہ لو،

۳۔ فرشتے کے ذریعہ سے بات کرنا یعنی فرشتہ خدا کا پیغام لیکر سامنے نظر آتا ہو اور اس کے منھ سے وہ الفاظ ادا ہوتے ہیں جن کو نبی سنکر محفوظ کر لیتا ہے، اسی کو عام طور سے وحی کہتے ہیں، کیونکہ قرآن پاک کا نزول اسی آخری طریقہ سے ہوا ہے، لیکن اس شہرتِ عام کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دو اور دوسرے طریقے وحی کی قسمیں نہیں ہیں، وحی کی ان اقسام کا ذکر سورۂ شوریٰ میں ہے،

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ، (شوریٰ ۔ ۵)

اور کسی آدمی کی یہ تاب نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے، لیکن وحی (اشارہ) سے، یا پردہ کے پیچھے سے، یا کسی قاصد (فرشتہ) کو بھیجدے، تو وہ خدا کے حکم سے خدا جو چاہے اسکو وحی کر دیتا ہے، بیشک وہ بلند مرتبہ حکمت والا ہے،

مکالمۂ الٰہی کے یہ تینوں طریقے یعنی وحی (اشارہ) سے بات کرنا، پردہ کے پیچھے سے بات کرنا اور فرشتہ کے ذریعہ سے بات کرنا وحی کی یہ تین مختلف قسمیں بھی ہیں، اور پھران تینوں کا اجمالاً مشترک نام بھی وحی ہے یعنی یہ مقسم بھی ہے، اور اپنی تین قسموں میں سے بھی ایک پر اُس کا اطلاق ہوتا ہے، اسی آیت میں دیکھو کہ فرشتہ کے ذریعہ سے کلام کو بھی وحی فرمایا گیا، اور تینوں مذکورۂ بالا طریقوں میں جس طریقے سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غیبی تعلیم واطلاع دی گئی ہے، اس کو بھی وحی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، یعنی وہ عام مکالمۂ الٰہی کے مرادف بھی مستعمل ہوا ہے،

مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ۝ اِنْ هُوَ	نبی خواہش نفس سے کلام نہیں کرتا بلکہ
اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ، (نجم-۱)	وہ وحی ہوتی ہے جو اس کو کیجاتی ہے،

الغرض اسی امتیاز کے لئے علمی اصطلاحات میں ان تینوں طریقوں کے لئے کشف، الہام اور وحی کے تین علٰحدہ علٰحدہ الفاظ وضع کردیئے گئے ہیں، تاکہ بول چال میں ہر روحانی طریقۂ گفتگو دوسرے سے ممتاز ہو جائے، بیداری میں اشارہ سے بات کرنا کشف ہے، اور خواب کے عالم میں رویا ہے، پردہ کے پیچھے سے آواز کا آنا، الہام ہے، اور فرشتہ کی درمیانگی[1] بات کرنا وحی ہے،

نکتہ اوپر کی آیت میں جہاں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ کسی بندہ کی یہ تاب نہیں کہ خدا اس سے بات کرے، لیکن ان تین طریقوں سے اُس کے آخر میں فرمایا ہے کہ وہ سب سے بلند اور حکیم ہے،

---

[1] ان اصطلاحات کی بحث کے لئے اصول فقہ کی اہم کتابوں کی طرف توجہ کرنی چاہئے، کم از کم اس موقع پر تحریر ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ کی شرح التقریر والتحبیر لابن امیر الحاج المتوفی ۸۷۹ھ ہجری جلد سوم صفحہ ۲۹۵ مطبوعہ امیریہ بولاق مصر ۱۳۱۶ھ دیکھنی چاہئے،

یعنی اس کی بلندی و برتری کا اقتضا تو یہ ہے کہ وہ کسی کو اپنے مکالمہ کے شرف کا مستحق نہ سمجھے، مگر اس کی حکمت کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اپنے بندگان خاص سے عام بندون کی ہدایت و رہنمائی کے لئے ان تین غیر معمولی طریقون مین سے کسی طریقہ سے گفتگو فرمائے،

بہرحال غیبی ذریعۂ اطلاع کی یہ سب سے بلند قسم جس کو اصطلاح میں وحی کہتے ہیں، اس کا تجربہ عام لوگون کو نہین لیکن اس سے نیچے درجہ کے غیبی ذرائع اطلاع کا تجربہ ہر شخص کو تھوڑا بہت ہے اور ہر انسان کی زندگی میں جو بعض پُراسرار اور ناقابلِ فہم واقعات پیش آتے ہین، اُن پر غور کرنے سے غیب کے اس اعلیٰ ترین ذریعۂ علم کا دھندلا سا خاکہ ذہن میں آسکتا ہے، جس سے غیر جسمانی اور غیر حسی مادی ذرائع علم کے سمجھنے اور باور کرنے مین جو استبعاد معلوم ہوتا ہے، وہ دور ہوسکتا ہے، خصوصاً اس عہد میں جب سائیکالوجی کی تحقیقات سے نفس کی بہت سی نامعلوم طاقتون کا پتہ چل رہا ہے، اور اسپرچولزم کے ذریعہ ارواح سے خطاب و کلام کی سلسلہ جنبانی ہو رہی ہے، اور جدید روحانیات کا فن ایک مستقل سائنس کی صورت اختیار کر رہا ہے،

انبیاء علیہم السلام کو اپنے کشف، الہام، اور وحی پر اتنا ہی یقین ہوتا ہے جس قدر عام انسانون کو اپنے وجدانیات، محسوسات، فطریات، اور بدیہیات پر، انبیاء کا یہ روحانی علم ایسا ہی اندرونی ہوتا ہے، جیسا عام انسانون میں وجدانیات، فطریات اور بدیہیات و محسوسات کا علم ہوتا ہے، جس طرح کسی شخص کو اس علم مین دھوکا نہیں ہو سکتا کہ اس کو بھوک یا پیاس معلوم ہو رہی ہے، یا اس کو غم یا خوشی ہے، اسی طرح نبی کو بھی اپنے روحانی وجدانیات میں دھوکا نہیں ہوتا، اور جس طرح تم کو اپنے فطریات میں یہ مغالطہ نہیں ہوتا کہ دو اور دو چار نہیں ہوتے، اسی طرح اس کو بھی پیغمبرانہ

فطریات میں مغالطہ واقع نہیں ہوتا، اور جس طرح تم کو اپنے محسوسات میں اگر کسی کو سامنے دیکھ رہے ہو، یا کسی کی آواز سُن رہے ہو شبہہ نہیں ہوا کرتا، اُس کو بھی اپنی روحانی محسوسات میں شبہہ نہیں ہوا کرتا، غرض وہ اپنے ان جملہ غیبی اور روحانی ذرائعِ علم میں ہر لغزش، فریب، خطا اور غلطی سے اسی طرح پاک ہوتا ہے جس طرح تم اپنی وجدانیات، فطریات، محسوسات اور بدیہیات میں غلطی اور خطا سے پاک ہوتے ہو،

علم غیب | اسلام کے عقیدہ میں غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں، قرآن میں بار بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو اس اعلان کی ہدایت ہوئی ہے،

فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ (یونس ۲) — تو کہہ دے اے پیغمبر کہ غیب خدا کے لئے ہے،

قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ (نمل ۵) — کہدو کہ آسمانوں میں اور زمین میں خدا کے سوا کوئی نہیں جس کو غیب کا علم ہو،

رسول کہتے ہیں،

وَلَا اَعْلَمُ الْغَيْبَ، (انعام ۵) — اور میں غیب نہیں جانتا،

لیکن اسی کے ساتھ دو موقعوں پر یہ بھی کہا گیا ہے کہ با ایں ہمہ خدا اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی اطلاع دیتا ہے،

سورۂ جن میں ہے،

فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (جن ۲) — تو اللہ اپنے غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا لیکن اس پیغمبر پر جس کو پسند کرے،

دوسری جگہ سورۂ آل عمران میں ہے،

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ، (ص - ۱۰۰)

اور نہ تھا اللہ کہ غیب کی باتوں پر تم کو مطلع کرتا، لیکن یہ کہ اللہ اپنے پیغمبروں میں سے جس کو چاہے چن لیتا ہے،

ان دو آیتوں سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی باتوں کی اطلاع دیتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں غیب دانی کی کلیتہً اور قطعاً نفی کی گئی ہے، اُن سے مراد ذاتی اور حقیقی علم ہے یعنی خدا کے سوا بالذات کسی کو غیب کا علم نہیں، البتہ خدا کے واسطہ اور ذریعہ سے اور اس کی تعلیم و اطلاع سے پیغمبروں کو اس کا علم حاصل ہوتا ہے، ساتھ ہی آیت الکرسی میں فرمادیا گیا،

وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ج (بقرہ - ۳۴)

اور وہ خدا کے ایک ذرہ علم کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے، لیکن اتنے کا جتنے کا وہ چاہے،

یعنی اپنے علوم غیب سے جتنا اور جس قدر وہ پسند کرتا ہے، اور مصلحت سمجھتا ہے، وہ اُن کو بذریعہ وحی اُن سے واقف کرتا رہتا ہے، بایں ہمہ بعض باتوں کی نسبت جیسا کہ سورۂ ہود اور لقمان میں اللہ تعالیٰ نے قطعی طور سے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ان کا علم کسی کو نہیں، مثلاً قیامت، بارش، موت، شکم مادر میں لڑکا ہے یا لڑکی، کل کیا ہوگا، ان باتوں کو خدائے تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اسی طرح بعض آیتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ اس کا تم کو علم نہ تھا، جیسا کہ غزوۂ تبوک میں عدم شرکت کے بعض عذر خواہ لوگوں کے متعلق سورۂ توبہ میں ہے کہ انھوں نے جھوٹی قسمیں کھا کر اجازت حاصل کرلی، خدا نے فرمایا،

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ج لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ	خدا نے تجھ سے درگذر کیا، کیون تو نے انکو
حَتّٰی يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ	اجازت دی؟ تا آنکہ تجھے معلوم ہوجاتے جو
تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ، (توبہ - ۷)	سچ بولے، اور جھوٹون کو جان لیتا،
لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا	انھون نے پہلے فتنہ پیدا کرنا چاہا، اور تیرے
لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰی جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ	سامنے واقعات الٹ دیے، یہانتک کہ حق
اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ (توبہ ۷)	بات آگئی، اور خدا کی بات کھل گئی اور وہ

آگے چل کر ہے،

مَرَدُوْا عَلَی النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ	یہ نفاق پر اڑے ہیں، تو اُن کو نہیں
نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ط (توبہ - ۱۲)	جانتا، ہم جانتے ہیں،

ان آیتون سے یہ واضح ہے کہ پیغمبرون کو غیب کا کلی علم نہیں ملتا، بلکہ اُن کو غیب کی اطلاع دیئے جانے کے موقع کی دونون آیتوں میں رسول ہی کا لفظ استعمال کرنا اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جن امورِ غیب کی اطلاع پیغمبرون کو دیجاتی ہے، ان کا تعلق فریضۂ رسالت اور اس کی مصلحتوں اور ضرورتون سے ہے،

غیب کی حقیقت علم غیب کے اس نادیدہ راستہ میں اتنی منزل طے کر لینے کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں غیب کس کو کہتے ہیں؟ قرآن مجید کے اس لفظ کے استعمال کے تمام مواقع پر غور کرنے سے اس کے اجمالی اور تفصیلی دونون معنی واضح ہوتے ہیں، اجمالاً اس کا اطلاق اُن امور پر ہوتا ہے، جن کا علم انسان اپنے علم کے عام اور طبعی و فطری ذریعوں سے حاصل

نہیں کرسکتا، گذرچکا ہے کہ انسانی علم کے طبعی ذریعے، وجدان، حواس، اور عقل و استدلال وغیرہ ہیں، ان طبعی ذریعوں سے جو ہر انسان کو ملے ہیں، جو علم حاصل نہیں ہوتا، اس کو "علم غیب" کہتے ہیں، یعنی اُس شے یا اُن اشیاء کا علم جو انسان کے ظاہری و باطنی حواس اور دماغی قویٰ کی نگاہوں کے سامنے سے غائب ہیں، اور اس کا مقابل لفظ "شہادت" ہے، جس کے معنی حاضر ہونے کے ہیں، یعنی وہ اشیاء جو ہر انسان کے حواس اور قوائے دماغی کے سامنے ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے کو بار بار عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ کہا ہے، (انعام، رعد، حشر، تغابن) یعنی انسانوں کے طبعی ذرائع علم کے سامنے جو حاضر ہے، اور جو غائب ہے، اُن سب کا عالم اور واقف کل وہی ہے

الغرض اجمالاً علم غیب اس غیبی طریقۂ علم کا نام ہے، جو عام انسانوں کو نہیں ملتا ہے،

تفصیلی حیثیت سے قرآن پاک میں غیب کا اطلاق چار چیزوں پر ہوا ہے،

۱۔ زمانۂ ماضی کے واقعات جن کا علم بعد کو نہ تو حواس کے ذریعہ ہو سکتا ہے کہ حواس سے صرف شاہد (سامنے موجود) کا علم ہوتا ہے، اور نہ عقل و فکر کے ذریعہ ہو سکتا ہے، اگر ہو سکتا ہے تو تحریر و روایت کے ذریعہ، لیکن جس کے لئے تحریر و روایت کا ذریعہ یقینی طور سے مسدود ہو، اس کے لئے اُن کا علم اگر ہو سکتا ہے تو غیبی ہی ذریعہ سے ہو سکتا ہے،

حضرت نوح کے مختصر قصہ کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ؕ (ہود)	یہ غیب کی بعض خبریں ہیں ہم ان کو وحی کرتے ہیں، تیری طرف تو تو اُن کو پہلے سے جانتا ہی نہ تھا، اور نہ تیری قوم جانتی تھی

حضرت مریمؑ کے قصہ میں ارشاد ہوتا ہے،

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ، (اٰل عمران - ۵)	یہ غیب کی خبروں میں سے ہے اس کو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں، اور نہ تو ان کے پاس جو تھا، جب وہ اپنے قلم (قرعہ کے طور پر) ڈال رہے تھے کہ کون مریم کو پالے اور نہ تو ان کے پاس اس وقت تھا جب وہ جھگڑ رہے تھے

دیکھو کہ محسوس واقعات کے علم کا طبعی طریقہ اُس وقت موجود رہ کر دیکھنا، اور سننا تھا، اسکی آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سے نفی کی گئی کہ آپ وہاں یقیناً اس وقت موجود نہ تھے، اب رہ گیا کسی دوسرے انسانی ذریعہ سے سننا اسکی بھی نفی پہلے ہی سے ہے کہ تیری قوم میں سے بھی کسی کو معلوم نہ تھا، اور نہ دوسروں سے معلوم کیا، اب اس کا علم جس غیر طبعی طریقہ سے رسول کو دیا گیا، وہ وحی کا ذریعہ ہے،

اسی طرح حضرت یوسفؑ کے پورے واقعہ کے ذکر کے بعد فرمایا،

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ یَمْكُرُوْنَ، (یوسف)	یہ غیب کی خبروں میں سے ہے ہم اس کو تیری طرف وحی کرتے ہیں، اور تو اس وقت اُن کے پاس نہ تھا جب وہ اپنا کام طے کرنے لگے اور داؤ

اس میں بھی علم شاہد کی نفی کرکے علم غائب کو ثابت کیا گیا، بہرحال ان آیتوں سے واضح ہے کہ ماضی کے واقعات کے غیر طبعی طریقۂ علم کو بھی علم غیب کہا گیا ہے،

۲- اسی طرح آیندہ مستقبل میں جو واقعات ہونے والے ہیں، ان کو بھی غیب کہا گیا ہے، ان کا علم دلائل و قیاس کے طبعی ذرائع کے علاوہ غیر طبعی ذریعہ سے ہوا ہو، تو اس کو بھی علمِ غیب کہیں گے، قرآن پاک میں ایک موقع پر اُن کفار کے جواب میں جو نشانیوں کے طالب تھے، یہ کہا گیا:

فَقُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰہِ فَانْتَظِرُوْآ	تو کہہ دو کہ غیب کا علم خدا ہی کو ہے، انتظار کرو
اِنِّیْ مَعَکُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ (یونس ۲)	میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنیوالوں میں ہوں

مستقبل کے منتظرہ واقعات کو اس آیت میں "غیب" کہا گیا ہے، اسی طرح قیامت کو بار بار غیب کہکر غیر خدا سے اس کے علم کی نفی کی گئی ہے،

اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ (لقمان)	خدا ہی کے پاس قیامت کا علم ہے،
یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَۃِ اَیَّانَ مُرْسٰھَا	وہ قیامت کو پوچھتے ہیں، کہدو کہ اس کا
قُلْ اِنَّمَا عِلْمُھَا عِنْدَ رَبِّیْ (اعراف ۲۳)	علم میرے پروردگار کے پاس ہے،

اسی طرح مستقبل کے دوسرے واقعات کے علم کی بھی انسانوں سے نفی کی گئی ہے،

وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا	کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا،
وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ	نہ کوئی یہ جانتا ہے کہ وہ کس سرزمین
تَمُوْتُ ، (لقمان - ۴)	میں مرے گا،

۳- اُن چیزوں پر بھی غیب کا اطلاق کیا گیا ہے جو گو ماضی اور مستقبل نہیں بلکہ زمانہ حال میں موجود ہیں تاہم انسان کے حواس خمسہ اور عقل کی محدود طاقت سے ان کا علم نہیں ہو سکتا،

ہم کو دیکھنے اور سننے کی طاقت دی گئی ہے، مگر اُس کے لئے کسی نہ کسی مسافت، عدم حجاب اور دیگر چند شرائط کی قید لگا دی گئی ہے جن کے بغیر ہماری یہ طاقت بالکل بے کار ہے، ہم دلی میں بیٹھکر بمبئی کے پیش نظر مناظر کو نہیں دیکھ سکتے، اور نہ بغیر آلات کے ہم یہاں سے وہاں کی آواز آج بھی سُن سکتے ہین، اس لئے زمانۂ حال کے علم کے لئے بھی جو طبعی شرائط اور قیود ہین، اُن کے بغیر جو علم حاصل ہو گا، وہ غیب ہو گا

حاملہ عورت سامنے موجود ہے، مگر اُس کے بطن کے پے درپے حجابات کے اندر جن کو آنکھین چاک نہیں کر سکتین، کیا ہے ؟ کس کو معلوم ہے،

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ (لقمان ۴) اور اللہ جانتا ہو رحموں کے اندر جو ہے،

آسمان و زمین میں اس وقت جو کچھ ہے، وہ سب زمانۂ حال میں سب کے سامنے موجود ہے، تاہم اُس کا علم ہمارے حواس اور عقل کی محدود دسترس سے اُس وقت تک باہر ہے، جب تک ہمارے دیکھنے اور سننے اور جاننے کے لئے خدا نے جو طبعی شرائط بنا دیئے ہیں، وہ پورے نہ ہوں،

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ، (ھود-۱۰) اور خدا ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کا غیب

إِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (حجرات) بیشک خدا جانتا ہے آسمانوں اور زمین کا غیب

۴- عالم غیب کی آخری چیز وہ امور ہیں جو غیر مادی ہونے کی وجہ سے ہمارے حواس اور عقل کے تنگ دائرۂ عمل سے قطعاً باہر ہین، ہم فرشتوں کو نہیں دیکھتے، خدا کی رویت کی صلاحیت نہیں رکھتے، جنت و دوزخ ہم کو یہان نظر نہیں آسکتی، یہ تمام امور بھی غیب ہین،

الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ (انبیاء-۴) وہ لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں غیب میں

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ (بقرہ-۱) — وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں غیب میں،

الَّتِیْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَہٗ بِالْغَیْبِ، (مریم-۴) — وہ جنت جس کا وعدہ اس مہربان خدا نے اپنے بندوں سے کیا ہے غیب میں،

"غیب میں" کے معنی ہیں، بے جانے، بن دیکھے، حواس سے علم حاصل کئے بغیر، اور باوجود اس کے کہ وہ چیزیں اس عالم میں دیکھی نہیں جا سکتی ہیں،

پیغمبر کو اللہ تعالیٰ غیب کی جن باتوں سے آگاہ کرتا ہے، وہ ان چاروں قسم کے امور غیب ہوتے ہیں بعض گذشتہ قوموں اور پیغمبروں کے عبرت انگیز اور نصیحت آمیز حالات سے بھی روایت اور تحریر کے ذریعہ کے بغیر وحی کے واسطہ سے اُن کو مطلع کرتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید کے حوالوں سے اوپر گذر چکا۔ آیندہ مستقبل میں دنیا کے فتنوں، امتِ محمدیہ کے انقلابات قیامت کے مناظر اور اس کے بعد کے پیش آنے والے واقعات کا علم آپ کو دیا گیا، جیسا کہ ان دنیاوی پیشینگوئیوں اور قیامت و محشر کے اُن احوال و مناظر سے ظاہر ہے جو قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں بتصریح مذکور ہیں، اسی طرح حال کے اُن احوال و مناظر کا علم بھی ثابت ہے، جو باوجود سامنے موجود ہونے کے احساس و تعقل کے طبعی شرائط نہ پائے جانے کے سبب سے عام انسانوں کو نظر نہیں آتے، قبروں کا انکشاف، پس پردہ رویت، اور دوسروں کے موجودہ احوال سے واقفیت وغیرہ اس علم غیب میں سے بھی پیغمبر کو عطا ہوتا ہے، اور سب سے آخر میں وہ غیبیات ہیں جن کا احساس و تصور ہمارے مادی ذرائع علم سے قطعاً خارج ہے، تاہم وہ بھی اس کو دکھائے اور بتلائے جاتے ہیں، خود خدا کا دیدار، فرشتوں کی رویت، جنت و دوزخ کا مشاہدہ وغیرہ ان تمام امور غیب میں سے اللہ تعالیٰ

جس رسول کے لئے جس قدر مناسب اور سزاوار سمجھتا ہے، اس کا علم وحی کے مختلف اقسام کے ذریعہ سے اُس کو عطا فرماتا ہے،

وحی اور ملکۂ نبوّت | حکمائے اسلام نے وحی کی حقیقت "ملکۂ نبوّت" کے لفظ سے ظاہر کی ہے، اس کی تشریح یہ ہے کہ ترتیبِ کائنات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں علم اور تعقل نے پستی سے بلندی کی طرف رفتہ رفتہ ترقی کی ہے، جمادات بے حس ہیں، اُن کے اوپر نباتات ہیں جن میں صرف محدود احساس ہوتا ہے اور دماغی قوی، حافظہ، تذکر اور غور و فکر کی قوت سے وہ محروم ہیں، اُن سے اونچے حیوانات ہیں جن میں یہ تمام قوی ناقص طریقے سے نمودار ہوتے ہیں، اور آخر میں اُن سے بالاتر ہستی یعنی انسان میں جاکر یہ قوے پورے کمال میں ظاہر ہوتے ہیں، ان قوی کی ترقی یہیں تک محدود نہیں ہے، بلکہ جس طرح نباتات میں قوتِ احساس ہے جس سے جمادات محروم ہیں، اور حیوانات میں حافظہ، تصوّر، تعقل وغیرہ کی وہ قوتیں ہیں جو نباتات میں نہیں، انسان میں وہ دماغی و ذہنی قوی ہیں، جو حیوانات میں نہیں، اسی طرح انبیاء میں علم و تعقل کی ایک ایسی قوت موجود ہوتی ہے جو عام انسانوں میں نہیں ہوتی اور اسی کا نام ملکۂ نبوت ہے،

حواس صرف مادیات کو دریافت کرتے ہیں، دماغی قوی مادیات سے بلند ذہنیات اور عقلیات کو، اور ملکۂ نبوّت اس سے بھی اونچا جاتا ہے، وہ ذہنیات و عقلیات سے بلند تر حقائق یعنی غیبیات کو دریافت کرتا ہے، اس ذریعۂ علم میں غور و بحث اور منطقیانہ فکر و نظر، اور ترتیبِ مقدمات کی ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ حقائق اس طرح سامنے آتے ہیں جس طرح وجدانیات

فطریات، بدیہیات اور محسوسات سامنے آتے ہیں، اور ان ہی کی طرح وہ یقینی بھی ہوتے ہیں اور چونکہ اس ذریعہ مین علم انسانی کے عام ذریعے اور طریقے یعنی وجدان، فطرت نوعی، بداہت دلیل احساس اور غور و فکر سے معلومات حاصل نہیں کیے جاتے، بلکہ خود علام الغیوب، وہ علم ان انسانی وسائط کے بغیر اُن کو عطا کرتا ہے، شرع کی زبان مین اسی کو وحی والہام کہتے ہیں، علم کلام کی اصطلاح میں ملکۂ نبوت اور عام محاورہ میں اُس کو غیبی علم کہہ لیجئے،

لیکن اہل نقل کی اصطلاح میں وحی کی یہ صورت نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ پیغمبرون کو وقتاً فوقتاً احکام اور ارادون سے براہِ راست فرشتوں کے ذریعہ سے مطلع کرتا رہتا ہے، یہی وحی ہے،

امعان نظر سے معلوم ہوگا کہ اہل عقل ونقل کے اختلاف کا منشاء یہ ہے کہ آیا یہ وحی خود پیغمبر کے مافوق اور غیر معمولی وہبی علم وفہم کا نتیجہ ہوتی ہے یا خود براہ راست وقتاً فوقتاً تعلیم ربانی کا، دوسرے لفظون مین یہ کہو کہ جس طرح عام انسانوں میں علم وفہم کی قوت آغاز پیدایش ہی میں فطرۃً ودیعت کردیجاتی ہے، اسی طرح انبیاء مین منشاے الٰہی جاننے کی قوت بھی شروع ہی میں فطرۃً ودیعت کردی جاتی ہے، یا یہ کہ وہ فطرۃً تو ویسے ہی عام انسانی طریقہ کا طبعی علم وفہم رکھتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نبوت کے بعد اپنے منشاے الٰہی سے اُن کو کسی غیبی ذریعہ سے وقتاً فوقتاً آگاہ کرتا رہتا ہے،

لیکن واقعہ یہ ہے کہ حقیقت عقل کی نقل سے، اور نقل کی عقل سے علٰحدگی میں نہین، بلکہ اتحاد میں ہے، وہ لوگ جو عقل ونقل دونون کے جامع ہیں، وہ ان دونوں کو مجتمع کرتے ہیں،

یار ما این دارد و آن نیز ہم

انبیاء علیہم السلام میں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بدرِ فطرت اور آغازِ پیدایش سے ان ہر

کے متعلق جن کا اُن کی رسالت و نبوت سے تعلق ہے، اور جن کو دین کہتے ہیں، وہ کلی استعداد اور عمومی فہم ہوتی ہے جس سے غیر انبیاء محروم ہیں، اور اس پوشیدہ قوت کا عملی ظہور اُس وقت سے شروع ہوتا ہے، جب وہ نبوت کے منصب پر عملاً سرفراز ہوتے ہیں، اسی کا نام "ملکۂ نبوت" رہا اور اہم امور دین کے متعلق اُن کو وقتاً فوقتاً جو غیبی اطلاع ملتی رہتی ہے، اس کا نام "وحی" ہے،

آج کل قرآن فہمی اور عقل کے مدعیوں اور نقل کے لفظی پابندوں میں جو اختلاف ہے وہ درحقیقت ان ہی دو قوتوں کے درمیان تمیز نہ کرنے کا نتیجہ ہے، نقل کے لفظی پابند یہ سمجھتے ہیں کہ ہر لفظ جو نبی کے منہ سے نکلتا ہے، وہ اسی معنی میں وحی ہے جس معنی میں قرآن ہے کہ وہ براہِ راست خدا کی غیب کی اطلاع ہے، اور عقل کے مدعی یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن بیشک خدا کی براہِ راست وحی ہے، مگر اُس کے ماسوا رسول جو کچھ کہتا ہے، وہ اس کے پیغمبرانہ نہیں، بلکہ انسانی و بشری علم و فہم کا نتیجہ ہے لیکن حقیقت ان دونوں کے ماوراء ہے، جیسے وحی قرآنی وحی براہِ راست ہے اسی طرح نبی کے دوسرے احکام اُس کے عام انسانی و بشری علم و فہم کا نہیں، بلکہ اس کی پیغمبرانہ وہبی قوتِ علم و فہم کا نتیجہ ہیں، جو وحی کی ایک دوسری قسم اس لئے کہی جاسکتی ہے کہ اُس کا منشا "ملکۂ نبوت" کے ذریعہ وحی ربانی کی ترجمانی ہے، اس لئے پیغمبر کی وحی اور ملکۂ نبوت دونوں کے احکام واجب الاتباع ہیں،

کتاب و سنت | اس تقریر کا منشا یہ ہے کہ پیغمبر کو جو علم حاصل ہوتا ہے، اس کی دو قسمیں ہیں، ایک وحی حقیقی یعنی وہ علم جس کو اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً اپنے خاص الفاظ میں پیغمبر پر نازل کرتا رہتا ہے، اور جس کے مجموعہ کو کتاب الٰہی صحیفۂ ربانی، توراۃ، انجیل، زبور اور قرآن کا نام دیا گیا ہے دوسرا

وہ علم جو پیغمبر کے ملکۂ نبوت یا نورِ نبوت، یا فہمِ نبوت کا نتیجہ ہوتا ہے، پہلا علم اصلی اور دوسرا ضمنی ہے، یا یوں کہو کہ پہلا اصولی، اور دوسرا فروعی ہے یعنی علم اول، پیغمبر پر شریعت کے غیر متبدل اور ازلی احکامِ کلیہ اور مہمات کو واضح کرتا ہے، اور دوسرا علم پہلے علم کے غیر متبدل کلی اصول کے ماتحت اس کے مقصود کی صحیح تشریح اور اس کے جزئیات کی ضروری تفصیل کرتا ہے، اور غیر اہم اور متبدل امور کے متعلق ہنگامی اوقات میں مصلحتی احکام بتاتا ہے، اور اسی دوسری قسم کا علم ہے، جو روایات اور احادیث کی صورت میں ہے، اور جس کو اہلِ اصول اصطلاحاً سنت کہتے ہیں، کتاب اصولی احکام ہیں، اور سنت اِن اصولی احکام کی عملی تشریح اور بیان ہے، کتاب براہِ راست وحیِ الٰہی کا نتیجہ ہے اور سنت ملکۂ نبوت اور فہمِ نبوی کا، کتاب بلفظہٖ وحی ہے، اور سنت بالمعنی،

وحی متلو اور غیر متلو | بعض علماے اصول نے کتاب اور سنت دونوں کو وحی مانا ہے، اور ان دونوں کے درمیان تفریق یہ کی ہے کہ کتاب اس وحی کا نام ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے اور سنت اُس وحی کو کہتے ہیں جس کی تلاوت نہیں کی جاتی، اس تشریح کا مقصود حقیقۃً تلاوت و عدمِ تلاوت کا فرق نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ کتاب میں معنی کے ساتھ الفاظ بھی وحی کیے گئے ہیں اور وہ الفاظ بھی محفوظ ہیں، اُن کا حرف حرف اور نقطہ نقطہ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ کی پیشینگوئی میں داخل ہے، اور اس لئے اس میں الفاظ کی کمی بیشی اور حذف و اضافہ محال ہے، اور سنت میں الفاظ کی نہیں، صرف معانی کی حفاظت ہے، اسی لئے کتاب کی وحی مدون، مکتوب اور محفوظ کی گئی، اور نماز میں اس کی قرأت کا حکم ہے اور یوں بھی عام طور سے اس کی تلاوت مسنون ہے اور سنت کی وحی بالفاظہا مقصود نہیں، اس لئے اس کی لفظی حفاظت کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی

اور نہ نماز میں اُس کے الفاظ قرأت کئے جاسکتے ہیں، اور نہ اُن کی تلاوت کی جاتی ہے، اور نہ اُن کو کتابِ الٰہی کہا جاسکتا ہے، مگر معنیً اصولی حیثیت سے اُن کی حفاظت خود قرآن نے اپنے اندر کرلی ہے اور جزئیات کی حیثیت سے گو الفاظ میں نہیں، مگر عمل میں خود رسول اور اس کے پیروؤں اور پھر اُن کے پیروؤں کے مسلسل تعامل سے یہاں تک کہ آج بھی تمام مسلمانوں کے عمل درآمد سے عملی تواتر کی صورت میں محفوظ ہے، اور بعد کے اماموں نے اچھی طرح تحقیق کرکے الفاظ اُن کتبِ حدیث کے اوراق میں بھی اُن کو محفوظ کردیا ہے،

سنّت کو وحی کہنا اس لحاظ سے ہے کہ جزئیات اصولاً وحی حقیقی یعنی کتاب کے اندر داخل ہیں، اور اُس کی کلیت میں سنّت کے تمام احکام مندرج ہیں، بنابریں چونکہ سنّت وحی کے کلّی منشا کے اندر داخل ہے، وہ بھی ضمنی حیثیت سے وحی کی جاسکتی ہے، لیکن چونکہ اس میں الفاظ کی تعیین خدا کی طرف سے نہیں، اس لئے وہ غیر متلو ہے،

اس فرق کا راز یہ ہے کہ کتاب کی حیثیت کلّی قانون کی ہے، قانون کے اصل منشا کی حفاظت اور وضاحت کے لئے نہ صرف اُس کے ایک ایک لفظ کے محفوظ رہنے کی ضرورت ہوتی ہے، بلکہ اُس کے ایک ایک نقطہ، شوشہ، وقف، وصل، فصل، عطف، قطع، تقدم، تاخر، یعنی آج کل کی اصطلاح میں ایک ایک ڈیش اور کومے کی بعینہٖ حفاظت کی ضرورت ہے، ورنہ ذرا سے تغیر میں قانون کا مطلب کچھ کا کچھ ہوجاسکتا ہے، اور سنّت کی یہ کلّی قانونی حیثیت نہیں ہے بلکہ وہ اس کلّی قانون کی تشریحات، تفصیلات اور جزئیات ہیں، جو درحقیقت اس کلّی قانون کے اندر مندرج تھے، مگر چونکہ عام لوگوں کی فہم میں نہیں آتے تھے، یا عام لوگ اُن کو

نہیں سمجھتے تھے، اس لئے صحابہ کے دریافت پر، یا خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ضرورت محسوس فرما کر اُس کو کھول کر بیان فرما دیا کہ پھر اشتباہ نہ رہ جائے،

اسی مقام پر ایک اور نکتہ بھی ہے کہ کتاب الٰہی میں جو حکم جن الفاظ میں ادا ہوا ہے، وہ اگر بعض کم فہم لوگون کی سمجھ مین نہیں آیا، اور انھون نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تشریح چاہی، یا انھیں نہیں معلوم ہوا کہ اس خاص جزئی واقعہ کا کیا حکم ہے، اور قرآن پاک کی کس اصل سے ماخوذ و مستنبط ہوگا، اور اس لئے انھون نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو اس کے جواب میں اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پاک کے بعینہٖ ان ہی الفاظ کو بے کم و بیش دہرا دیتے تو یہ بیکار ہوتا کہ ان ہی الفاظ کے نہ سمجھ سکنے کے سبب سے تو سوال کی نوبت آئی، اس لئے ضرور تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم الفاظ کو بدل کر اور طریقۂ تعبیر کو تغیر دے کر ان الفاظ کی تشریح فرمائیں اور یہی احادیث ہین،

درحقیقت احادیث میں قانون الٰہی اور کتاب ربانی ہی کے مفہوم و منشا، کو رسول اللہ صلی اللہ نے سمجھنے والون کی سہولت، گمراہون کی تکمیل ہدایت اور اصل منشاے الٰہی کی پوری توضیح اور کہیں پوری تاکید کی خاطر مختلف لفظون، مختلف عبارتون اور مختلف تعبیرون سے ادا فرمایا ہے، اس لئے اصل مفہوم و منشاء کے لحاظ سے احادیث کے معانی ضمناً وحی ہین، لیکن الفاظ عبارت، اور تعبیر کی حیثیت سے یعنی لفظاً وحی نہیں ہین، بلکہ فہم نبوی، اجتہاد نبوی، اور ملکۂ نبوت کے غیر خطا پذیر نتائج ہین اسی لئے اُن کو اصطلاح مین "وحی غیر متلو" کہتے ہین،

ہم اس فرق کی ایک مثال دیکر اپنے مطالب کو زیادہ واضح کر دینا چاہتے ہین، قرآن پاک

مین والدین کی خدمت اور اطاعت کا حکم ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی اشارہ ہے کہ والدین کی رضامندی گنا ہون کی مغفرت کا سبب ہے، یہ وحی الہٰی کا حقیقی منشا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس منشاء الہٰی کو ان الفاظ اور مختلف تعبیرون سے ادا فرمایا، "مان کے پاؤن کے نیچے جنت ہے" کبھی ارشاد ہوا "رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی مین ہے"۔ ایک صحابی نے دریافت کیا کہ "یا رسول اللہ میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے" فرمایا "تیری مان، تیری مان، تیری مان" ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، صحابہ حضوری کے شرف سے ممتاز تھے کہ زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے، "وہ ذلیل ہوا وہ ذلیل ہوا وہ ذلیل ہوا" حاضرین نے عرض کی یا رسول اللہ کون؟ ارشاد ہوا وہ جس نے اپنی مان یا باپ کی ضعیفی پائی، اور پھر انکی خدمت گزاری کرکے جنت نہ حاصل کرلی"۔ ایک اور مجلس میں صحابہؓ نے پوچھا کہ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیکی کے کامون مین خدا کو سب سے زیادہ کون کام پسند ہے" فرمایا "وقت پر نماز ادا کرنا" دریافت کیا اس کے بعد فرمایا "مان باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا"

ان تمام احادیث پر معمولی سی غور و فکر کی نظر بھی یہ راز ظاہر کر دے گی کہ یہ کل حدیثیں ذیل کی آیتون کی تشریح و بیان ہیں،

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (بقرہ ۱۰ و نساء ۶)	مان باپ کے ساتھ نیکی کرو،
وَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ (اسرائیل ۳)	وہ بوڑھے ہوجائین، تو اُن کو اُف نہ کہو
وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ (احقاف ۲)	یہ (مان باپ کے خدمتگذار) وہ ہیں جن کی بدیون سے ہم درگذر کرتے ہین،

ؔلہ سورہ احقاف - ۲،

یہی حال دوسرے قرآنی احکام کے بیانات و تشریحات کا ہے،

احادیث قرآن کا بیان ہیں

قرآن پاک اور احادیث دونوں پر جن کی عمیق و وسیع نظر ہے اُن کو یہ برملا معلوم ہوتا ہے کہ احادیث صحیحہ کے تمام فرعی اور ثانوی احکام قرآن پاک کے عمومی اور کلی احکام کے تحت میں مندرج ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ میں صرف اُن کی تشریح فرمائی ہے، اس قسم کی حدیثوں کی عموماً تین شکلیں ہیں، ایک وہ جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نے اپنے الفاظ میں حکم بیان فرمانے کے بعد خود قرآن پاک کی کوئی آیت اُس کے ساتھ پڑھ دی، اس قسم کی حدیثوں کے بیان ہونے میں کس کو شبہہ ہو سکتا ہے؟ دوسری شکل یہ ہے کہ آپ نے آیت نہیں پڑھی، مگر خود اس حکم میں ایک دو لفظ ایسے فرما دیئے ہیں، جو کسی آیت کا جزء ہیں، جس سے یہ اشارہ ہوتا ہے کہ یہ حکم فلاں آیت کی تشریح ہے، اس صورت میں بھی اصل و فرع کی تمیز اہل علم کے لئے آسان ہے، تیسری شکل یہ ہے کہ آپ نے کسی آیت یا اشارہ کے بغیر صرف .... حکم بیان فرما دیا، اس قسم کی حدیثوں کے ماخذ کی تلاش دقتِ نظر کا کام ہے، ان کا پتہ زبان نبوت اور فہم رسالت کے طرز و اسلوب کے سمجھنے والے راسخین فی العلم ہی پا سکتے ہیں،

الہام و اجتہاد و حکمت

امام شافعی نے کتاب الرسالہ میں احادیث و سنن کی تین قسمیں بیان کی ہیں،

---

۱ مجھے پہلے شبہہ تھا کہ میں اس رائے میں منفرد ہوں مگر بحمد اللہ کہ تلاش و تفحص سے ثابت ہوا کہ دیگر متقدمین علمائے اصول کا یہی مسلک ہے چنانچہ یہ خیال اجمالاً سب سے پہلے امام شافعی کی کتاب الرسالہ (ص ۲۰ و ۲۹ و ۲۲۲) مطبوعہ علمیہ مصر ۱۳۱۲ھ میں اور یہ نظریہ سب سے زیادہ مفصل امام شاطبی اندلسی المتوفی ۷۹۰ھ کی اہم تصنیف الموافقات فی اصول الاحکام (جلد ۴ ص ۱۵ تا ۲۲۱) مطبوعہ سلفیہ مصر ۱۳۴۱ھ میں موجود ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ میں بھی اس کا ایک باب ہے،

ایک[1] وہ جو بعینہٖ قرآن پاک میں مذکور ہیں، دوسری[2] وہ جو قرآن پاک کے مجمل حکم کی تشریح ہیں، تیسری[3] وہ جن کا ذکر (بظاہر) قرآن پاک میں نہ تفصیلاً ہے، نہ اجمالاً یہی تیسری قسم قابلِ بحث ہے، امام صاحب نے اس کے متعلق ائمۂ سلف کے چار نظریے نقل کئے ہیں[1]۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کی کلّی اطاعت فرض کی ہے، اور اس کے علم میں پہلے ہی سے یہ ہے کہ رسول جو کچھ کہے اور کرے گا، اس میں رضاے الٰہی کی توفیق اس کے ساتھ شامل ہوگی، (حاصل یہ ہے کہ پہلے ہی سے رسول کو یہ توفیق ربانی عنایت کی گئی ہے، کہ وہ رضاے الٰہی کو دریافت کرلے)

۲۔ رسول نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا ہے جس کی اصل کتاب اللہ میں نہ ہو، (مقصود یہ ہوا کہ اس قسم کے احکام بھی دراصل کتاب اللہ ہی سے ماخوذ ہیں، گو بظاہر کم بینوں کو ایسا نظر نہ آئے)

۳۔ تمام احادیثِ نبوی، القا فی الروع ہیں، (یعنی رسول کے دل میں خدا نے ڈال دیے ہیں) اور یہ اس حکمت کا نتیجہ ہیں، جو آپ کے دل میں ڈالی گئی،

۴۔ اس قسم کے تمام امور جو احادیث میں ہیں، کتابِ الٰہی سے جداگانہ مستقل پیغامِ ربانی کے ذریعہ رسول کو معلوم ہوئے ہیں،

چوتھے نظریہ کو چھوڑ کر بقیہ تین رائیں میرے خیال میں تقریباً ایک ہی ہیں، پہلے نظریہ کا منشا یہ ہے، کہ صریح وحی کے علاوہ جو وقتاً فوقتاً نبی پر آتی رہتی ہے، اس کو ابتدا ہی سے ایک توفیقِ ازلی بھی عنایت ہوتی ہے، جس سے وہ پیش آمدہ امور میں رضاے الٰہی کو دریافت کرکے فیصلہ کرتا ہے، تیسرے نظریہ میں اسی "توفیقِ علم" کو الہام، القا فی الروع اور دل میں ڈال دینے سے تعبیر

[1] کتاب الرسالۂ امام شافعی ص ۲۰،

کیا گیا ہے، اور دوسرے نظریہ کا منشا یہ ہے کہ رسول کے جو احکام بظاہر کتاب اللہ میں نہ ہوں اُن کی اصل بھی درحقیقت کتاب اللہ میں ہے، اور رسول اُسی اصل سے اپنے احکام کو مستنبط کرتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ یہ استنباط، عام انسانی و بشری فہم سے نہیں ہوتا، ورنہ اس کا غلطی سے پاک ہونا مشتبہ رہے گا، بلکہ وہ "پیغمبرانہ قوتِ فہم" کا نتیجہ ہوگا، اور جب ایسا ہی تو اس "پیغمبرانہ قوتِ فہم" کی تعبیر خواہ الہام سے کرو، القار سے کرو، یا اس کو حکمتِ نبوی کا نتیجہ کہو یا توفیقِ الٰہی کہو، بات ایک ہی ہوئی،

میرے نزدیک صحیح مسلک یہ ہے کہ رسول کے تمام صحیح زبانی احکام بھی عموماً اس کے صحیفۂ ربانی سے ماخوذ و مستنبط ہیں، اور اُن کے جزئیات کتابِ الٰہی کے کلیات کے تحت میں مندرج ہیں، اور رسول کا یہ اخذ، استنباط، اور فہم اس کی اس پیغمبرانہ قوتِ علم کا نتیجہ ہیں جس کو حکما، ملکۂ نبوت اور اہلِ شرع حکمت، الہام اور شرحِ صدر وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، اور جو خطا اور غلطی سے یکسر پاک ہے،

اجتہادِ نبوت اس موقع پر علمائے اصول کی ایک اور اصطلاح "اجتہادِ نبوی" کی تشریح ضروری ہے، علمائے اصول لکھتے ہیں کہ جب کوئی نیا واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش آتا، اور وحی نازل نہ ہوتی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد فرماتے یعنی گذشتہ وحی شدہ احکام کے مطابق سے آپ حکم دیدیتے تھے، (یہ فقہار کا طریقۂ تعبیر ہے، ورنہ یوں کہنا چاہئے کہ رسول اپنی اس حکمتِ ربانی کے فیض سے مدد لیکر جو خدا نے اُن کے سینہ میں ودیعت رکھی تھی، گذشتہ وحی کے کلیات کی روشنی میں اُس کا فیصلہ فرماتے تھے،) بہرحال خواہ فقہار کے طریق پر اجتہادِ نبوی کو نصوصِ قرآنی سے مستنبط سمجھئے، یا شاہ ولی اللہ صاحب کے نظریہ کے مطابق رسول کے علمِ سینہ اور وحی شدہ

اصولِ کلی کے جزئیات تسلیم کیجئے، ہر حال میں وہ نتیجہ اُمّت کے لئے واجبُ العمل اور خطا سے پاک ہوگا کیونکہ یہ مقدمہ اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ انبیاء گناہوں سے معصوم، ضلالت و گمراہی سے پاک اور ہوائے نفسانی سے مُبرّا ہوتے ہیں، اس لئے امورِ رسالت اور امورِ دین میں اُن کی کوئی رائے غلط نہیں ہو سکتی کہ اُن کی غلطی سے پوری اُمّت کا غلطی پر قائم ہو جانا مُسلّم ہے، حالانکہ اُن کی بعثت کی غرض ہدایت ہے، ضلالت نہیں، ان وجوہ سے اُن کا اجتہاد اگر کبھی کسی ایسے نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے، جو مصلحتِ الٰہی کے مطابق نہیں ہوتا، تو ہمیشہ اللہ تعالیٰ اس پر تنبیہ فرما کر اُن کو اپنی مرضی سے مطلع فرما دیتا ہے (اس کی مثالیں آئندہ آئیں گی) الغرض بعض امور میں خیر کے کسی خاص پہلو کو پیشِ نظر رکھ کر اس سے بہتر پہلو سے تغافل ہونے یا غیب اور مستقبل سے عدم واقفیت کے سبب سے نبی کا اجتہادی خطا کرنا ممکن ہے، مگر اس خطا پر نبی کا قائم رکھا جانا ناممکن ہے، ایسی صورت میں نبی کا ہر ایسا اجتہادی حکم جس پر وحیِ الٰہی نے فوراً کوئی تنبیہ نہیں کی، یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ حکم علمِ الٰہی کے منشا کے مطابق اور خطا و غلطی سے مبرّا ہے، اور اس کے دوسرے معنی وحیِ خفی یا باطنی وحی کے ہیں[1]،

میری رائے میں یہ اصطلاح بھی معنیً گذشتہ اصطلاحوں کے قریب قریب ہے، اس لئے اس اجتہادِ نبوی کے معنی "الہامِ حکمت، ملکۂ نبوت، فہمِ نبوی، وغیرہ گذشتہ اصطلاحات سے عملاً الگ نہیں کہ اس کی حیثیت بھی وحیِ ثانوی کی قرار پا جاتی ہے،

اس بحث پر شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں جو خیال ظاہر فرمایا ہے اس کا ترجمہ ذیل میں درج کرتے ہیں،

---

[1] سطورِ بالا میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کے حوالے کے لئے دیکھو شرح تحریر ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ مسمی بالتقریر والتحبیر لعلامہ ابن امیر الحاج المتوفی ۸۷۹ھ جلد ۳ صفحہ ۲۹۴، ۲۹۹، مطبعہ امیریہ مصر ۱۳۱۷ھ اور التلویح فی کشف حقائق التنقیح والتوضیح فی حل غوامض التنقیح جلد ۲ صفحہ ۴۵۷ مطبع مکتب صنائع قسطنطنیہ ۱۳۱۰ھ بحث الرکن الثانی فی السنۃ،

ساتواں مبحث

احادیث نبویؐ سے شریعت کے اخذ کرنے میں

علوم نبویؐ کے اقسام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو روایتیں حدیث کی کتابوں میں جمع کی گئی ہیں انکی دو قسمیں ہیں

۱۔ ایک وہ جن کا تعلق تبلیغ رسالت سے ہے، اور یہ آیت

مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا	پیغمبر تم کو جو کچھ دے اس کو لے لو، اور جب
نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (حشر)	چیز سے منع کرے، اس سے باز آؤ،

اسی قسم کے متعلق نازل ہوئی ہے،

علوم معاد یعنی قیامت اور آخرت کے احوال، جزا و سزا اور عجائب الملکوت (یعنی دوسرے عالم کے احوال وکیفیات) اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں، اور ان سب کا دار و مدار صرف وحی پر ہے اور ان اصول کے مطابق جن کا ذکر اوپر گذر چکا، قوانین شریعت، اور عبادات و معاملات کی جزئیات کا ضبط بھی اسی قسم میں داخل ہے لیکن ان میں سے بعض چیزوں کا دار و مدار وحی پر اور بعض کا اجتہاد پر ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد بھی وحی کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ خداوند تعالی نے آپ کو غلط رائے قائم کرنے سے محفوظ رکھا ہے، اور یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کا ہر اجتہاد کسی خاص نص و آیت سے استنباط کا نتیجہ ہو، جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے، بلکہ آپ کے اجتہاد کی زیادہ تر صورت یہ

کہ خداوند تعالیٰ نے شریعت اور وضعِ قانون کے مقاصد، انسانون کی آسانی اور بھلائی اور امور کلی مقاصد کا قانون آپ کو تعلیم کر دیا تھا، وہ مقاصد جن کا ماخذ وحی تھا، آپ اسی کلی وصولی قانون کے ذریعہ سے جو آپ کو سکھایا گیا تھا، اُن کی تشریح فرمادیا کرتے تھے حکمت کی متفرق باتین اور عام مصلحتیں جن کے لئے آپ نے نہ کوئی وقت مقرر کیا، نہ اُن کے حدود بتائے مثلاً اخلاقِ صالحہ اور اخلاق غیر صالحہ کا بیان بھی تبلیغ رسالت سے تعلق رکھتا ہے لیکن اُن مین اکثر کا دار و مدار اجتہاد پر ہے جسکے معنی یہ ہین کہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو باہمی معاملات و اجتماع کا کلی قانون تعلیم کر دیا تھا اور آپ نے حکمت کی باتین اسی کلی قانون سے جو آپ کو تعلیم کر دیا گیا تھا مستنبط کین، اور اُن کے متعلق ایک کلیہ بنا لیا فضائل اعمال، اور اُن پر عمل کرنے والون کے مناقب بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہین، در میرے خیال مین ان مین بعض کا دار و مدار وحی پر اور بعض کا اجتہاد پر ہے، ان قوانین کا بیان اوپر گذر چکا ہے اور ہم اسی قسم کی شرح کرنا اور اُن کے معانی کو بیان کرنا چاہتے ہیں،،

۲- دوسری وہ روایتیں ہین، جو تبلیغ رسالت سے تعلق نہیں رکھتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "مین صرف ایک آدمی ہون جب مین تمھارے دین کے متعلق تم کو کوئی حکم دون تو اس پر عمل کرو، اور جب میں تم کو اپنی رائے سے کوئی حکم دون تو یہ سمجھو کہ مین صرف ایک آدمی ہون" اور چھوہارون کے جوڑ لگانے کے واقعہ میں آپ کا یہ فرمانا کہ "میں نے ایک خیال قائم کیا تھا، میرے خیال پر تم لوگ عمل نہ کرو، البتہ جب خدا کی کوئی بات بیان کرون تو اس پر عمل کرو، کیونکہ مین خدا پر جھوٹ نہیں باندھتا" اسی قسم سے تعلق رکھتا ہے، طب کے متعلق حدیثیں اور آپ کا یہ ارشاد کہ تم سیاہ رنگ، اور ایسے گھوڑے پر سوار ہو جسکی پیشانی مین تھوڑی سی سفیدی ہو اسی قسم مین

داخل ہیں، اور اس کا دار و مدار تجربہ پر ہے،

آپنے جو کچھ عادۃً کیا، عبادۃً نہیں، اتفاقاً کیا، قصداً نہیں، وہ بھی اسی قسم میں داخل ہے،
آپنے جو واقعات ایسے بیان کئے جن کا تمام قوم میں چرچا تھا، مثلاً ام زرع اور خرافہ کے قصے وہ
بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں، اور اسی بات کو حضرت زید بن ثابتؓ نے جب ان سے چند
لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کرنے کی درخواست کی اس طرح بیان کیا
ہے کہ میں آپ کا پڑوسی تھا، اور جب آپ پر وحی نازل ہوتی تھی، تو آپ مجھ کو بلا بھیجتے تھے، اور
میں آپ کے حکم سے اس کو لکھا کرتا تھا لیکن جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تھے، تو آپ بھی ہمارے ساتھ
اس کا ذکر فرماتے تھے، اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تھے، تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا
ذکر کرتے تھے، اور جب ہم کھانے کا ذکر کرتے تھے، تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے
تھے، تو کیا میں اُن تمام چیزوں کو بطور حدیث بیان کروں"؟

اسی میں وہ چیزیں بھی داخل ہیں جن کو آپ نے اپنے زمانہ کی جزئی و عارضی مصلحت کے
طور پر کیا ہے، اور وہ تمام اُمت کے لئے ضروری نہیں ہیں، مثلاً فوجوں کی آراستگی اور جنگی علامت
کی تعیین کے وہ احکام جن کو خلیفہ دیتا ہے، اور حضرت عمرؓ کے اس قول کے کہ "اب ہم کو حج میں اکڑ کر
چلنے کی کیا ضرورت ؟ ہم ایک قوم (کفار قریش) کے سامنے اس کی نمایش کرتے تھے لیکن اب
خدا نے اس کو ہلاک کر دیا" بھی یہی معنی ہیں کہ وہ اس کو ایک جزئی و عارضی مصلحت سمجھتے تھے، لیکن
چونکہ آپ نے اس اجتہاد پر پورا اطمینان نہ تھا، اس لئے اُن کو یہ خوف ہوا کہ شاید اس کا کوئی
اور سبب ہو، اس لئے اس میں دست اندازی نہیں کی، اسی طرح دوسرے احکام بھی اسی پر محمول

کیے گئے ہین مثلاً آپ کا یہ ارشاد کہ "جو شخص جس کو قتل کرے اس کا ہتھیار اسی کا حق ہے" نیز آپکے مخصوص فیصلے بھی اسی قسم میں داخل ہیں کہ آپ مقدمات کے ان فیصلون میں گواہون اور قسموں کے مطابق فیصلے کرتے تھے آپنے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جو یہ فرمایا تھا کہ واقعہ مین حاضر جو کچھ دیکھتا ہے اس کو غائب نہیں دیکھتا" اس کے معنی بھی یہی ہین" (انتہی کلامہ)

شاہ صاحب کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی دو قسمیں ہیں:

ایک وہ جن کا تعلق پیغمبرانہ فرائض، تبلیغ رسالت اور مہمات امور دین سے ہو، یہ تمام باتین براہ راست وحی و تعلیم سے ماخوذ ہیں، دوسری وہ جو عام انسانی باتین ہین، اُن کی متعدد صورتیں ہیں،

۱- کسی جزئی عارضی مصلحت کی بنا پر کوئی حکم، جیسے حج مین آپنے مسلمانوں کو حکم دیا کہ قریش کے سامنے اکڑ کر سعی کریں تاکہ قریش یہ نہ سمجھیں کہ مدینہ کی آب وہوا نے ان کو کمزور کردیا ہے

۲- وہ امور جن کو دین و رسالت سے براہ راست کوئی نہیں، بلکہ زمانہ کے حالات کے ساتھ وہ بدلتے رہتے ہیں، مثلاً جنگ کا طریق، ہتھیار کے اقسام حکومت کے صیغون کی ترتیب وغیرہ،

۳- وہ امور جن کو آپ اپنی شخصی، قومی، یا ملکی عادت کے مطابق کرتے تھے جن کو دین و رسالت سے کوئی واسطہ نہیں، مثلاً وضع ولباس، فرش پر نشست، کمل اوڑھنا، دسترخوان اور بچھون کا عدم استعمال، عمامہ باندھنا، تہبند پہننا، اونٹ پر سوار ہونا وغیرہ،

۴- وہ امور جو عرب مین بطور قصہ کے مشہور تھے، اور آپنے بھی اُن کو اسی طرح تفنن طبع کے لئے یا کسی اخلاقی نتیجہ کی خاطر بیان فرمایا، مثلاً ام زرع اور اس کی نو سہیلیون کی کہانی، خرافہ کی داستان، بنی اسرائیل کی بعض حکایتیں،

۵ - عربوں کے بعض تجربی مسلمات اور علاج و معالجہ کی بعض باتیں،

۶ - زراعت وغیرہ کے متعلق بعض ذاتی رائیں، مثلاً مدینہ میں قاعدہ تھا کہ فصل کے موقع پر نر چھوہاروں کے پھول مادہ چھوہارون کے درختوں میں ڈالے جاتے تھے، آپنے یہ طریقہ دیکھا تو اُس کو محض رسمی بات سمجھ کر فرمایا کہ "اگر ایسا نہ کیا کرو تو کیا ہو" مدینہ والوں نے آپکے اس لگے سے اشارہ کو حکم کے طور پر مانا اور اس سال یہ ترکیب چھوڑ دی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال پیداوار کم ہوگئی، لوگون نے آکر عرض کی، فرمایا میں نے ایسا خیال کیا تھا، اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنیاکُمْ تم اپنے دنیاوی کاروبار اور معاملات سے زیادہ واقف ہو" یہ امور تغیر اور رد و بدل کے قابل ہوسکتے ہیں

الغرض یہ وہ امور ہیں، جن میں رسول کے ارشادات کی حیثیت، انسانی باتون کی ہی ہے لیکن ان کے علاوہ دوسرے امور جن کا تعلق دین ورسالت و نبوت سے ہے، مثلاً عقائد، عبادات، اخلاق اور اخبارِ معاد اور معاملات کے بعض ضروری حصے، یہ سب کے سب وحی اور تعلیم ربانی سے ہیں، جو دائمی اور ناقابلِ تغیر ہین،

ان ناقابلِ تغیر امور کی تعلیم و اطلاع کی دو صورتین ہیں، ایک براہ راست وحیِ الٰہی جو وقتاً فوقتاً پیغمبر کی تعلیم و اطلاع کے لئے خدا کی طرف سے آیا کرتی تھی، اور دوسری اجتہادِ نبوی، یہاں بحث اسی دوسری چیز سے ہے، شاہ صاحب اس کے متعلق دو باتین فرماتے ہین،

۱ - ایک یہ کہ اجتہاد نبوی کی صورت و حقیقت مجتہدین کے اجتہاد کی طرح نہین ہے، مجتہدین کا اجتہاد کسی خاص نص سے استنباط کا نام ہے، اور پیغمبروں کے اجتہاد کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اجمالی طور سے شریعت کے کُلی اصول و قواعد کا علم، منصب نبوت کے ساتھ ساتھ عطا

فرما دیا ہے، اسی علم کے مطابق آپ وحی کی توضیح، احکامِ منصوصہ کی تفصیل، کسی کلی کے جزئیات مسائل کی تشریح، اپنے الفاظ مین فرما دیا کرتے تھے،

۲۔ پیغمبرون کا یہ اجتہاد، دوسرے عام انسان مجتہدین کے اجتہادات کے برخلاف خطا وغلطی سے یکسر پاک ومنزہ ہوتا ہے، کیونکہ اُن کی راے خطا وغلطی پر باقی رکھے جانے سے محفوظ بنائی گئی ہی، اسی لئے اُن کا پیغمبرانہ اجتہاد بھی بمنزلۂ وحی کے ہے"،

"پیغمبرانہ اجتہاد" کی جو تشریح شاہ صاحب نے فرمائی ہے، اس کو پیشِ نظر رکھ کر یہ فیصلہ نہایت آسان ہے کہ دوسرے لوگ ملکۂ نبوت، الہام، القاء، حکمتِ ربانی، فہمِ نبوی سے جو کچھ مراد لیتے ہین اس مین اور "اجتہادِ نبوی" میں عملاً کوئی فرق نہیں ہے کہ اس اجتہاد سے مقصود وہ قوتِ علمیہ یا الہامیہ یا نبویہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ خاص پیغمبر کے سینہ میں ودیعت رکھتا ہے، اس لئے مجتہدانہ اجتہاد اور پیغمبرانہ اجتہاد کے درمیان صرف لفظ کی مشارکت ہے معنی کی نہیں، مزید بحث آگے آے گی،

ایک نکتہ کی طرف یہاں اور اشارہ کر دینا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور جتنے صاحبِ کتاب انبیا آئے اُن کی وحی کتاب اور نتائجِ حکمتِ نبوی مین فرق وامتیاز باقی نہین رہا، چنانچہ توراۃ وانجیل وزبور مین یہ سب باتین ملی جلی ہیں، جیسا کہ اُن کے پڑھنے سے ہر شخص کو نظر آسکتا ہے، مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ آخری اور غیر منسوخ کتاب لیکر آئے تھے، اس لئے آپ کی کتاب کی ہر طرح حفاظت کی گئی، اور ہر تغلیط اور آمیزش سے محفوظ رکھی گئی، بلکہ اسی لئے آغازِ اسلام مین آپ نے نتائجِ حکمتِ نبوی کی تحریر سے لوگون کو باز رکھا تاکہ کتاب کے ساتھ انکی آمیزش نہ ہو

بعد کو جب یہ خطرہ باقی نہیں رہا تو اکثروں کے نزدیک یہ ہے کہ آپ نے اُن کی تحریر کی اجازت دیدی، اور بعض متشدد صحابہ اور علماء کے نزدیک یہ اجازت مخصوص لوگوں کے لئے تھی، عام نہیں لیکن یہ اختلاف تحریر و کتابت میں ہے اُن کی صحیح طور سے حفاظت و روایت و تبلیغ میں نہیں، اس لئے اس خدمت کو تمام صحابہ تابعین اور تبع تابعین اور علمائے صالحین نے ہمیشہ ادا کیا،

عصمت و بے گناہی | نبیؐ کی تیسری اہم خصوصیت اس کی معصومی اور بے گناہی ہے، یہود میں چونکہ پیشینگو ہونے کے علاوہ نبی کا کوئی صحیح تخیل نہیں، اس لئے اُن کی کتابوں میں انبیائے کرام علیہم السلام کی طرف ایسی باتیں منسوب کی گئی ہیں، جو اُن کی شانِ نبوت کے سراسر منافی ہیں، عیسائیوں میں صرف ایک مسیحؑ کی ذات معصوم مانی جاتی ہے لیکن اسلام میں یہ عقیدہ ہر نبی اور رسول کی نسبت عام ہے، اس کے نزدیک تمام انبیاء اور رسول گناہوں سے پاک اور معصوم تھے، اُن سے بتقاضائے بشریت بھول چوک ہو سکتی ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنی وحی سے اُن کی ان غلطیوں کی بھی اصلاح کرتا رہتا ہے، نبوت کے متعلق عقلی حیثیت سے بھی جبتک عصمت کا اصول مان نہ لیا جائے، نبی اور عام حکیم و مصلح میں فرق نمایاں نہیں ہو سکتا اور نبیوں اور رسولوں کی کامل صداقت اور صحت پر اعتبار کیا جاسکتا، اسی لئے اسلام نے اس عقیدہ کا بھی بڑا اہتمام کیا ہے، ایک ایک کرکے تمام پیغمبروں کے مقدس احوال کا تذکرہ کیا ہے، اور ان واقعات کی تردید کی ہے، جو شانِ عصمت کے خلاف ہیں، اور جن کو لوگوں نے انکے سوانح میں شامل کر دیا ہے،

عرب کے مشرکوں کا یہ عقیدہ تھا کہ کاہن جو غیب کا حال بتاتے ہیں اور شاعر جو پرجوش اور پرتاثیر کلام نظم کرتے ہیں، یہ شیطانوں سے سیکھ کر بتاتے اور کرتے ہیں، اور یہی بات وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بھی (نعوذ باللہ) کہتے تھے، قرآن نے اُن کے جواب میں کہا درخت

پھل سے اور شے اپنے آثار سے پہچانی جاتی ہے،

اِنَّہٗ لَیْسَ لَہٗ سُلْطَانٌ عَلَی الَّذِیْنَ	شیطان کا زور ایمان والوں پر نہیں چلتا،
آمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ اِنَّمَا	اور نہ اُن پر جو اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں
سُلْطَانُہٗ عَلَی الَّذِیْنَ یَتَوَلَّوْنَہٗ وَالَّذِیْنَ	اس کا زور ان ہی پر چلتا ہے جو اس سے دوستی
ھُمْ بِہٖ مُشْرِکُوْنَ، (نحل - ۱۳)	کرتے ہیں، اور اپنے رب کا شریک ٹھہراتے ہیں

اس کے بعد آخر تک اس خیال کی تردید کی ہے، اور پھر خاتمہ اس پر ہے،

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُکَ اِلَّا بِاللّٰہِ وَلَا	اور صبر کر اور تیرا صبر کرنا بھی خدا ہی کی مدد سے ہے
تَحْزَنْ عَلَیْھِمْ وَلَا تَکُ فِیْ ضَیْقٍ	اور نہ تو ان پر غمگیں ہو، اور نہ اُن کے فریب سے
مِّمَّا یَمْکُرُوْنَ، اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ	تنگدل ہو، بیشک خدا اُن کے ساتھ ہے جو
اتَّقَوْا وَالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ (نحل - ۱۶)	پرہیزگار ہیں، اور جو نیکوکار ہیں،

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ انبیاے کرام شیطانوں کے فریب سے آزاد، متقی، پرہیزگار اور نیکوکار ہوتے ہیں،

سورۂ شعراء میں اسی شبہہ کا جواب تمام پیغمبروں کے حالات کو سُنا کر آخر میں کہکر دیا ہے،

ھَلْ اُنَبِّئُکُمْ عَلٰی مَنْ تَنَزَّلُ	کیا میں تمھیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں،
الشَّیٰطِیْنُ، تَنَزَّلُ عَلٰی کُلِّ اَفَّاکٍ	اُن پر اترتے ہیں جو جھوٹ گھڑنے والے گنہگار ہوتے ہیں
اَثِیْمٍ، یُلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَکْثَرُھُمْ	(لوگوں کو یقین دلانے کیلئے کہ وہ غیب کی باتیں سن کر آئے ہیں)

کَذِبُوْنَ ، (شعراء - ۱۱) کان ڈالتے ہیں اور وہ اکثر جھوٹے ہوتے ہیں

سورۂ جاثیہ میں مخالفین کے جواب میں کہا گیا ہے،

وَیْلٌ لِّکُلِّ اَفَّاکٍ اَثِیْمٍ یَّسْمَعُ اٰیٰتِ	پھٹکار ہو اُس پر جو جھوٹ گھڑنے والا گنہگار
اللّٰہِ تُتْلٰی عَلَیْہِ ثُمَّ یُصِرُّ مُسْتَکْبِرًا	ہے خدا کی آیتوں کو جو اسکو پڑھکر سنائی جاتی
کَاَنْ لَّمْ یَسْمَعْھَا ج فَبَشِّرْہُ بِعَذَابٍ	ہیں، وہ سنتا ہے اور پھر اپنی غرور پر اڑا رہتا ہے
اَلِیْمٍ ، (جاثیہ - ۱۱)	گویا اس نے سنا نہین تو اسکو دردناک عذاب کی

اس کے معنی یہ ہوئے کہ انبیاء علیہم السلام جھوٹ گھڑنے والے اور گنہگار نہیں ہوتے کہ اگر ایسے ہوں تو فرشتوں کے بجاے وہ شیطانوں کے قرین ورفیق ثابت ہوں اور ان کی سچائی اور صداقت مشتبہ ہوجاے ، اور نیز یہ کہ نبوت کی حقیقت کذب وگنہگاری کے صریح منافی ہے

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا ،

مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَہُ اللّٰہُ الْکِتٰبَ	اس آدمی کے جس کو اللہ کتاب اور فیصلہ اور
وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّۃَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ	نبوت دی، یہ شایاں نہیں، کہ وہ لوگوں سے
کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ (آل عمران)	کہے کہ خدا کو چھوڑکر میرے بندے ہوجاؤ ،

یعنی پیغمبروں کی دعوت کا منشا خدا کی بندگی کا اعلان ہے ، نہ کہ لوگوں کو اپنا بندہ اور پرستار بنانا ، اور یہ گناہ اُن سے سرزد نہین ہوتا ؛

اور ایک آیت میں فرمایا :-

وَمَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّغُلَّ ط وَ	کسی پیغمبر کا یہ کام نہیں کہ وہ جو کچھ چوری سے

مَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ج ثُمَّ	چھپالے اور جو کوئی چھپالیگا قیامت کے دن لیکر
تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ	اسکو حاضر ہوگا، پھراُس وقت ہر شخص کو اُس کے
لَا يُظْلَمُوْنَ، اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ	کام کا پورا بدلہ ملیگا، اور اُن پر ظلم نہ ہوگا کیا
اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ	جو خدا کی خوشنودی کی پیروی کرے وہ اس
جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ، هُمْ دَرَجٰتٌ	جیسا ہو سکتا ہی جو خدا کا غضب کما لاوے اور اسکا
عِنْدَ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ	ٹھکانا جہنم ہی، اور وہ برا ٹھکانا ہی، انسانوں
لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ	کے خدا کے نزدیک کئی درجے ہیں، اور خدا اُن کے
فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا	کام سے خبردار ہے، بے شبہ اللہ نے ایمان والوں
عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ	پر احسان کیا کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ج وَاِنْ كَانُوْا مِنْ	کو بھیجا جو اُن کو اس کی آیتیں پڑھکر سناتا ہی اُنکو
قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ،	پاک صاف بناتا، اور کتاب و حکمت سکھاتا ہی اُ
(اٰلِ عمران - ۱۷)	بے شبہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے،

ان آیتوں میں گو ہر نبی سے غلول (مال چھپانے) کی نفی کی ہے، اور فرمایا ہے کہ نبی جو خدا کی خوشنودی کی ہمیشہ پیروی کرتے ہیں، وہ ان کے مانند نہیں ہوسکتے، جو خدا کی خفگی کماتے ہیں، مگر خصوصیت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہی اور بتایا گیا ہے کہ نبی کی یہ شان نہیں کہ اس سے ایسا جرم سرزد ہوسکے، کیونکہ اللہ کی رضامندی کا طالب، اس کی ناخوشی کے کام کا مرتکب نہیں ہوسکتا، اور جو دوسروں کو احکام الٰہی سنائے، خود اس سے اُن احکام کی خلاف ورزی ممکن

نہین اور جو دوسرون کو پاک و صاف کرنے پر مامور ہے وہ خود گنہگار و ناپاک نہیں ہو سکتا،
انبیا علیہم السلام کے لئے بار بار قرآن نے "چنکر پسند کرنے" کا لفظ استعمال کیا ہے جو سرتاسر
اُن کی عصمت اور گناہون سے محفوظ و پاک رہنے پر دلالت کرتا ہے، عام پیغمبرون کے متعلق
یہ آیت ہے،

اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ — خدا فرشتون مین سے اپنے پیغمبر چن کر پسند کرتا ہے
رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ، (حج - ۱۰) — اور آدمیون مین سے،

چند مخصوص پیغمبروں کی شان میں ہے،

اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ — اللہ نے آدم نوح آلِ ابراہیم اور آلِ عمران
اِبْرٰھِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ، (آلِ عمران) کو تمام اہل دنیا سے چُن کر پسند کیا،

خاص حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ارشاد ہوا،

وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰہُ فِی الدُّنْیَاج (بقرہ ۱۶) ہم نے اُس کو دنیا مین چُنکر پسند کیا،

حضرت موسیٰؑ کی نسبت فرمایا،

اِنِّی اصْطَفَیْتُکَ عَلَی النَّاسِ — مین نے تجھ کو اپنے کلام اور پیغامون کیلیے
بِرِسٰلٰتِیْ وَبِکَلَامِیْ (اعراف ۱۷) — لوگوں میں سے چنکر پسند کیا،

ایک آیت میں پیغمبرون کیلیے اصطفار کیساتھ خیر (بہتر اور نیکوکار) کی صفت ظاہر کیگئی ہے،

وَاذْکُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰھِیْمَ وَاِسْحٰقَ — ہمارے خاص بندون ابراہیم اور اسحٰق اور
وَیَعْقُوْبَ اُولِی الْاَیْدِیْ وَالْاَبْصَارِ — یعقوب کو یاد کرو جو ہاتھون (قوت عمل) والے اور آنکھوں

اِنَّا اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى	(قوتِ علم) والے تھے ہم نے اُن کو آخرت کی
الدَّارِ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ	خالص نصیحت کے لئے خالص کیا، اور وہ ہمارے
الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ (ص - ۴)	بارگاہ میں چنے ہوئے نکوکاروں میں تھے،

سورۂ انبیاء میں اکثر پیغمبروں کے تذکرہ کے بعد فرمایا،

وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ وَجَعَلْنٰهُمْ	اُن میں سے ہر ایک کو ہم نے صالح بنایا اور
اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَا	ہم نے اُن کو وہ پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں
اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَاِقَامَ	کو راہ دکھاتے تھے اور ہم نے اُن کو نیک کاموں
الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءَ الزَّكٰوةِ وَ	کے کرنے کی اور نماز کھڑی کرنے اور زکوٰۃ دینے
كَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ (انبیاء - ۵)	کی وحی کی، اور وہ ہمارے پرستار تھے،

کیا اس سے زیادہ اُن کی عصمت اور بیگناہی کی شہادت ہوسکتی ہے کہ وہ امام و پیشوا اور صالح اور خدا کے پرستار بنائے گئے،

سورۂ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گنا کر سب کو صالح فرمایا گیا،

كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (انعام - ۱۰)	یہ سب صالحوں میں تھے

پھر آگے چل کر فرمایا، كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (انعام - ۱۰) ہر ایک کو دنیا والوں پر فضیلت دی" پھر اُن کا ذکر کر کے فرمایا، وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ، اور ہم نے اُن کو برگزیدہ کیا، اور اُن کو سیدھی راہ چلایا، صالح ہونا، برگزیدہ ہونا اور راہِ راست پر ہونا، سراسر عصمت اور بے گناہی ہے،

شقی وسعید اور گنہگار و نیکو کار، دونوں کی سیرتوں اور زندگیوں کا فرق اتنا نمایاں ہے کہ ان میں التباس اور اشتباہ ممکن نہیں، تاریخ وسیر کی خاموش اور خلق کی گویا زبانیں چیخ چیخ کر اس فرق وامتیاز کی منادی کرتی رہتی ہیں، اس اصول کو قرآن پاک نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے،

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ	کیا وہ جو گناہوں کے مرتکب ہیں یہ گمان کرتے ہیں
أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا	کہ ہم اُن کو اُن کی طرح جو ایمان لائے اور اچھے
الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ	کام کئے بنائیں گے، اُن دونوں کی زندگی اور موت
سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ، (جاثیہ ۲)	موت یکساں، یہ اُنکا فیصلہ کتنا بُرا ہے،

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کی زندگی، اور موت دونوں ممتاز ہوتی ہیں،

انبیاءؑ کے وصف میں فرمایا،

الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهُ	جو اللہ کے پیاموں کو پہنچاتے ہیں اور اس کو ڈرتے
وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللّٰهَ (احزاب ۵)	ہیں، اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت اور بیویوں کو جو عزت اور شرف حاصل ہے وہ نبوت ورسالت ہی کی نسبت سے ہے، ازواج مطہرات کی شان میں ہے،

يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِنَ	اے پیغمبر کی بیویو! تم عام عورتوں میں سے کسی
النِّسَاءِ إِنِ اتَّقَيْتُنَّ، (احزاب ۴)	ایک کی طرح نہیں، ہو اگر تم متقی ہو،

پھر اہل بیت نبویؐ کو خطاب کر کے فرمایا کہ ارادۂ ربانی یہ ہے کہ تم کو برائی سے پاک اور صاف اور ستھرا بنائے:

إِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ	اللہ یہی چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دور کردے اے
أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا (احزاب-۴)	نبی کے گھروالو! اور تم کو بالکل صاف ستھرا بنا دے

ظاہر ہے کہ اگر انبیاء علیہم السلام کے ازواج و اولاد کی شرافت کے لئے گناہ اور بدی کی نسبت مخل ہے، تو خود انبیاء علیہم السلام کا کیا ذکر ہے، ایک دوسری آیت میں حضرت عائشہؓ کو تہمت سے بری کرکے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا!

اَلْخَبِيثٰتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ	گندیاں، گندوں کے واسطے اور گندے
لِلْخَبِيثٰتِ ج وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِينَ	گندیوں کے لئے اور ستھریاں ستھروں کے
وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبٰتِ ج اُولٰٓئِكَ	واسطے، اور ستھرے ستھریوں کے واسطے
مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ (نور-۳)	یہ اُن کی تہمت سے پاک ہیں،

یہاں طیب، پاک، اور ستھرے سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہوا، اسی ستھرے پن، پاکی، اور طہارت سے ازواج مطہرات کے اخلاق ستھرے پن، پاکی، اور طہارت پر استدلال کیا گیا ہے،

انبیاء درحقیقت مقتدا اور پیشوا اور نمونہ بن کر اس دنیا میں بھیجے جاتے ہیں، اسی لئے فرمایا

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ	تمہارے لئے خدا کے رسول میں اچھی پیروی
اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ، (احزاب-۳)	ہے،

نیز اُن کی اطاعت واجب ہے،

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ	ہم نے کوئی نبی نہیں بھیجا لیکن اس لئے کہ خدا کے

بِاِذْنِ اللّٰہ (نساء-۹) حکم سے اُس کی اطاعت کی جائے،

اور خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت تصریح ہی کہ آپ کی پیروی، خدا کا محبوب بننے کا مستحق ٹھہراتی ہی،

اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ اگر تم خدا کو چاہتے ہو تو میری پیروی کرو

یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ (اٰلِ عمران-۳) خدا تم کو چاہے گا،

کیا کسی گنہگار اور عصیان کار کی زندگی، پیروی، اتباع اور نمونہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہی تاریکی سے روشنی کبھی نکلی، اور گندگی سے پاکی کبھی پیدا ہوئی، اور گنہگاروں کی دعوت سے کبھی نیکو کاری پھیلی ہے؟ برائیوں اور گنہگاریوں کا اصلی سرچشمہ اور منبع شیطان، یا انسان کی خود قوت شری لیکن خدا کے خاص بندے اُس کے دام فریب سے آزاد ہیں،

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ یقیناً میرے بندوں پر تیرا (ای شیطان) کوئی زور

وَکَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیْلًا (اسرائیل) نہیں، تیرا پروردگار (اپنے بندوں کی طرف سے) سب کچھ

کیا انبیاے کرام علیہم السلام سے بڑھ کر کوئی بندۂ رب ہو سکتا ہی،

انسانوں کی گمراہی اور عصیاں کاری وسوسۂ شیطانی کا نتیجہ ہوتی ہی خواہ یہ شیطان خود اپنے دل کے اندر (خناس) چھپا ہو، یا انسان اور جن کی صورت میں ہو ہر ایک کے فتنہ سے انکی ذات پاک اور بلند ہی!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض خود غرض لوگوں نے بعض مشوروں میں پھسلانا چاہا، مگر خدا نے پھسلنے نہ دیا اور فرمایا کہ میری جو رحمت اور مہربانی تجھ پر مبذول ہی، وہ ہر وقت تیری دستگیری اور گمراہی سے تیری نگہبان ہی، اور کتاب الٰہی اور حکمت و دانائی جو تجھے عطا ہوئی وہ تیری پاسبان ہی؛

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (نساء)

اور اگر تجھ پر اللہ کا فضل اور مہربانی نہ ہوتی تو ایک گروہ نے تیری گمراہ کرنے کا ارادہ کیا تھا، اور وہ گمراہ نہیں کریں گے لیکن خود اپنے آپ کو، اور تجھے کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گے، اور خدا نے تجھ پر کتاب اور حکمت اُتاری ہے، اور اس نے وہ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور تجھ پر خدا کا بڑا فضل ہے،

اور یقیناً موقع و محل کی شہادت سے اس سب سے بڑے فضل سے یہاں مراد عصمت ہے، خود نفس انسانی بھی اپنی جھوٹی تمناؤں، خود غرضانہ آرزوؤں اور خوشنما خیالوں سے لوگوں کو دھوکا دیتا ہے، لیکن انبیاء علیہم السلام اس فریب تمنا سے بھی پاک ہیں، بشریت کے اقتضا سے یہ تو ممکن نہیں کہ خود اپنے مشن اور جس دعوتِ حق کو لیکر وہ آئے ہیں، اس کی جلد از جلد کامیابی اور لوگوں کے بسرعت قبولِ ایمان کے متعلق اُن کے دل میں تمنائیں اور آرزوئیں نہ پیدا ہوتی ہوں لیکن وہ مصلحتِ الٰہی کے مطابق نہیں ہوتیں، اس لئے اللہ تعالیٰ اُن خیالات اور تمناؤں کو اُن کے دلوں سے نکال دیتا ہے، اور اپنے فیصلہ کو برجا رکھتا ہے، فرمایا،

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ج فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ

اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی نبی یا رسول نہیں بھیجا، لیکن یہ کہ جب وہ خیال باندھتا ہے تو شیطان اسکے خیال میں کچھ ملا دیتا ہے تو خدا شیطان کی ملاوٹ کو مٹا دیتا ہے اور اپنے حکموں کو مضبوط کر دیتا ہے اور خدا

عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ (حج-۰) دانا اور حکمت والا ہے،

اس سے معلوم ہوا کہ انبیاے کرام غلط خیال آرائی کے گناہ سے بھی محفوظ رکھے جاتے ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا گیا،

مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی (نجم-۱) (اے مسلمانو!) تمھارا صاحب گمراہ ہوا نہ بھٹکا،

اس عدم گمراہی اور عدم ضلالت کا تعلق کسی خاص عہد اور وقت سے نہیں ہے، بلکہ اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر عہدِ سابق اور زمانۂ ماضی سے ضلالت اور غوایت کی پوری نفی کی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ آپ کا دامن سدا ان کانٹوں سے پاک رہا،

بعض شبہات کا ازالہ | قرآن پاک میں بعض ایسے الفاظ ہیں جن سے ایک ظاہر بین کو یہ دھوکا ہوسکتا ہے کہ بعض پیغمبروں کے دامن پر عدم معصومیت کے بھی داغ ہیں، مگر علماے محققین نے ان میں سے ہر ایک شبہہ کا تشفی بخش جواب دیدیا ہے، اور خصوصیت کے ساتھ علامہ ابن حزم اندلسی نے الفصل فی الملل والنحل (جلد چہارم) میں اور قاضی عیاض مالکی نے شفاء (قسم ثالث باب اول) میں خفاجی نے شرح شفاء (جلد چہارم) میں اور متاخرین میں ملا دوست محمد کابلی نے تحفۃ الاخیار فی عصمۃ الانبیاء میں ایک ایک شبہہ کو پوری طرح رد کیا ہے جس سے ظاہر بینی کا پردہ آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے، اور اصل حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے، اُن میں سے ہر شبہہ کا ذکر کرنا، اور اس کا رد کرنا ایک طولِ عمل ہے، مختصراً اصولی طور سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس مسئلہ میں جو غلط فہمیاں کسی کو پیش آتی ہیں اُن کے دو اسباب ہیں، اور اُن اسباب کی تشریح کردینا ہی ان غلط فہمیوں کو دور کردینا ہے،

۱۔ سب سے پہلی بات یہ ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ انبیاء علیہم السلام کا پایہ بندوں میں بلکہ تمام مخلوقات میں خواہ کسی قدر بلند ہو اور اُن کا دامن گناہ و عصیان کے گرد و غبار سے کتنا ہی پاک ہو، تاہم اُس ذوالجلال والاکرام کے سامنے اُن کی حیثیت ایک عبد، ایک بندہ اور ایک عاجز مخلوق ہی کی ہے، ایک عبد و غلام خواہ کسی قدر اطاعت کیش، کتنا ہی وفاشعار، اور مطیع و فرمانبردار ہو، تاہم اپنے آقا کے سامنے اُس کو اپنے قصور کا معترف، اپنی تقصیر کا مقر، اپنی کوتاہیوں پر خجل اور اپنی فردگذاشتوں پر نادم ہی ہونا چاہئے، اسی لئے حضرت ابراہیمؑ جن کی نیکی اور پاکی کی شہادت سے قرآن بھرا ہوا ہے، وہ خدا کی عظمت و جلال اور اُس کی رحمت و شفقت کے ذکر میں فرماتے ہیں،

وَالَّذِیۡۤ اَطۡمَعُ اَنۡ یَّغۡفِرَ لِیۡ خَطِیۡٓـئَتِیۡ	اور وہ خدا جس سے جزا کے دن اپنی بھول
یَوۡمَ الدِّیۡنِ، (شعراء - ۵)	چوک کی معافی کی پوری امید رکھتا ہو،

یہی یہ اعتراف و اقرار اور خجالت و ندامت، اُس کا نقص نہیں، بلکہ اس کی بندگی اور عبودیت کا کمال ہی اور آقا کو حق پہنچتا ہے کہ اس کے غلام، اطاعت و فرمانبرداری کے جس حیرت انگیز رتبہ تک بھی پہنچے ہیں، وہ اُن سے اطاعت کیشی اور وفاشعاری کے اس سے بھی بلند رتبہ کا مطالبہ کرے کہ اس کے دربار میں اُن کے عروج و ترقی کی کرسی اور بھی اونچی ہوتی جائے، بعض آیتوں میں اگر کسی پیغمبر کو خدا سے مغفرت مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے، تو اس کا سبب گناہ کا وجود نہیں، بلکہ ہر قدم پر گذشتہ رتبۂ اطاعت پر قناعت کر لینے پر تنبیہ اور مزید اطاعت کا مطالبہ ہے تاکہ وہ اُس کے مزید تقرب کا ذریعہ بن سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوتا ہو،

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَالۡفَتۡحُ وَرَاَیۡتَ النَّاسَ	جب اللہ کی مدد آچکی اور (مکہ) فتح ہوچکا اور

يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ	اللہ کے دین میں گروہ درگروہ جاتے دیکھ چکا
فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ	تو اپنے پروردگار کی پاکی بیان کر اور اُس سے معافی
اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝ (نصر)	چاہ کہ وہ بندہ کے حال پر رجوع ہونیوالا ہے،

غور کرو کہ خدائی مدد آنا، مکہ فتح ہونا، بت پرستی کی بیخ کنی، اور لوگوں کا مسلمان ہو جانا کونی جرم ہے، جس سے کوئی معافی چاہے، اسی طرح سورۂ فتح مین فرمایا،

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا لِيَغْفِرَ لَكَ	ہم نے تجھ کو کھلی فتح دی تاکہ اللہ تیری
اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا	اگلی پچھلی خطا کو معاف کرے اور اپنا احسان
تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ	تجھ پر پورا کرے، اور تجھ کو سیدھی راہ چلائے
صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝ وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ	اور تجھ کو مضبوط مدد دے،
نَصْرًا عَزِيْزًا (فتح - ۱)	

دوبارہ غور کرو کہ مکہ کی فتح کامل نصیب ہونے کو حضور کی معافی سے بجز اس کے کیا تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کے حُسنِ خدمت کو قبول فرما کر اپنی خوشنودی کا اظہار فرماتا ہے، اس استغفار سے مقصود نعوذ باللہ پیغمبر کی گنہگاری کا ثبوت نہین، بلکہ اس کی عبدیت کاملہ کا اظہار ہے،

حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام، جن کے خدا کے بیٹے ہونے کے عیسائی اور فرشتے جن کے خدا کی بیٹیاں ہونے کے اہلِ عرب قائل تھے، اور اُن کو خدا کا درجہ دیتے تھے، اُن کے متعلق قرآن نے کہا،

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ	مسیحؑ کو ہرگز اس سے عار نہ آئے گا کہ وہ خدا
عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰۤئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ	کا بندہ ہو اور نہ مقرب فرشتوں کو اور جو اس کی
وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ	بندگی سے عار کریگا اور بڑائی چاہے گا تو خدا
فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا (نساء-۲۴)	ان سب کو اپنے پاس اکٹھا کرے گا،

اس سے مقصود نعوذ باللہ حضرت عیسیٰؑ کی توہین نہیں، بلکہ ان کی عبدیت اور بندگی کا اعلان ہے،

الغرض انبیاءؑ کا خدا کے حضور میں اپنی کوتاہی کا اعتراف، اُن کی گنہگاری کا ثبوت نہیں بلکہ اُن کی عبدیتِ کاملہ کا اظہار ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا کسی پیغمبر کی نسبت یہ فرمانا کہ میں نے تجھے معاف کیا، اس کی گنہگاری کا اعلان نہیں، بلکہ اپنی پسندیدگی، رضا، اور قبولِ تام کی بشارت ہی، سورہ فتح کی جو آیتیں اوپر گذریں، اُن کو پڑھو تو ظاہر ہوگا کہ چونکہ بت پرستی کی آلائش سے مکہ کی تطہیر، اور کل جزیرہ عرب میں حق و باطل کی تمیز، مکہ کی فیصلہ کن فتح پر موقوف تھی، اس لئے جب وہ پیغمبر علیہ السلام اور مسلمانوں کی مسلسل کوششوں اور جانفروشیوں سے حاصل ہوئی تو خدا نے اعلان فرمایا کہ آج اس فتح سے نبوت کے فرض کی اور تجھ پر میرے سلسلہ احسانات کی تکمیل ہوئی، پھر خدا آپ سے صراط مستقیم کی طرف ہدایت کا اور اپنی زبردست مدد کا وعدہ کرتا ہی حالانکہ ان میں سے ہر چیز آپ کو پہلے ہی عنایت ہو چکی تھی، کیا فتحِ مکہ سے پہلے آپ صراط مستقیم یعنی اسلام پر نہ تھے، یا آپؐ کو زبردست مدد نہیں مل چکی تھی، یہ سب مرتبے حاصل تھے، مگر ان باتوں کے یہاں ذکر سے اللہ تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ اس موقع پر اس طرح اپنی مزید رضامندی کا اظہار فرمائے

اور رسول کی اگلی پچھلی تمام فروگذاشتوں پر (اگر ہوں) خطِ عفو پھیرنے کا اعلان کر کے اُن کو نیا خلعتِ فاخرہ عطا، اور نئے مراتبِ جلیلہ عنایت کرے،

عبدیتِ کاملہ کا یہی رازو نیاز ہے جو حضرت مسیحؑ کے اس فقرہ میں نمایاں ہے، ایک سرداراُن کو "اے نیک استاد" کہکر خطاب کرتا ہے، اُس کے جواب میں وہ فرماتے ہیں،

"تو کیوں مجھ کو نیک کہتا ہے؟ کوئی نیک نہیں، مگر ایک یعنی خدا" (لوقا ۱۸-۱۹)

حضرت مسیحؑ کے اس فقرہ سے کسی کا یہ قیاس کرنا کہ وہ نیک نہ تھے، کس قدر غلط ہوگا،

اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کا اپنی مشہور دعا میں یہ کہنا کہ

"اور جس طرح ہم اپنے قرضداروں کو بخشتے ہیں، تو اپنے دین ہم کو بخش دے، (متی ۶-۱۲)

اُن کی گنہگاری کی دلیل نہیں، بلکہ عبدیتِ کاملہ کے اظہار کا ثبوت ہے،

نکتہ - عربی زبان میں گناہ کے لئے مختلف الفاظ ہیں، مثلاً ذنب، اثم، حنث، جرم وغیرہ، ان میں سے ذنب کے سوا دوسرے الفاظ کا اطلاق اس حقیقی گناہ پر کیا جاتا ہے، جو بالقصد اور جان بوجھ کر کیا جائے، لیکن ذنب کا اطلاق ہر غلط فعل پر ہوتا ہے، خواہ وہ جان بوجھکر کیا جائے یا بن جانے غلط فہمی سے ہو، یا سوچ سمجھکر، بھول چوک سے ہو، یا قصداً، اور ان کاموں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، جو درحقیقت عام اُمت کے لئے گناہ نہیں، لیکن انبیاء کے حق میں اتنی غفلت بھی مواخذہ کے قابل ہو، اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ حسنات الابرار سیئات المقربین، (نیکوں کی نیکیاں، مقربین کی برائیاں ہیں) ع

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے،

انبیاء علیہم السلام کے استغفار کے موقع پر ہمیشہ "ذنب" کا لفظ استعمال ہوا ہے جرم، اثم یا حنث کا نہیں ذنب کا لفظ بھول چوک اور غفلت سے لیکر عصیان تک کو شامل ہے[1]، اس لئے کسی نبی کو اگر خدا کی طرف سے استغفارِ ذنب کی ہدایت کی گئی تو اس کے معنی صریحاً عصیان و گناہ کے نہیں، بلکہ یہی انسانی بھول چوک اور فروگذاشت ہے جس کی اصلاح و تنبیہ اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم اور لطف و عنایت سے فرماتا رہتا ہے، اور اسی کے لئے استغفار کا حکم اُن کو ہوتا رہتا ہے،

اسی سے ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ بھول چوک، اور بلا ارادہ غفلت، گو اُمت کے حق میں قابلِ مواخذہ نہیں، مگر انبیاء علیہم السلام کے بلند مرتبہ کے لحاظ سے یہ چیزیں بھی گرفت میں آتی ہیں، کیونکہ اُن کا قول و فعل شریعت بن جاتا ہے، اس لئے شریعت کی حفاظت کے لئے اُن کے ہر قول و فعل کی حفاظت بھی ضروری ہے، اس بناپر اگر اُن سے احیاناً کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے تو فوراً اس پر تنبیہ کی جاتی ہے، اور اُن کو ہشیار کر دیا جاتا ہے، اور اسی کے ساتھ اُن کی یہ چیز معاف کر کے اُن کو بشارت سُنا دی جاتی ہے، اور اس طرح ہر چھوٹے بڑے، دانستہ و نادانستہ تمام گناہوں سے اُن کا دامن پاک و صاف رکھا جاتا ہے،

---

[1] اس فرق کو عام لغت نویسوں نے ملحوظ نہیں رکھا ہے، مگر جن علماء لغت نے ان الفاظ کے فروق پر کتابیں لکھی ہیں، انھوں نے اسکی تصریح کی ہے، ہم یہاں پر بیروت کے مشہور عیسائی لغت نویس و ادیب اب ہنرکمیں لامنس کی کتاب فرائد اللغۃ فی الفروق کی عبارت نقل کرتے ہیں، الاثم والذنب الذی یستحق العقوبۃ علیہ ولا یوصف بہ الا المجرم، وبین الاثم والذنب فرق من حیث ان الذنب مطلق الجرم عمداً کان او سہواً، بخلاف الاثم فانہ مایستحق فاعلہ العقاب فیختص بمایکون عمداً؛ والحنث ابلغ من الذنب لان الذنب یطلق علی الصغیرۃ والحنث علی الکبیرۃ والجرم لا یطلق الا علی الذنب الغلیظ (ص ۹۶-۹۷) (مطبع کاثولیکیہ ۱۸۸۹ء)

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ، (بقرہ-۴)	تو آدم نے اپنے رب سے چند باتیں سیکھ لیں تو وہ اس کی طرف رجوع ہوا،
ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ (طٰہٰ-۷)	پھر خدا نے اس (آدم) کو برگزیدہ کیا پھر اسکی طرف رجوع ہوا
لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ (توبہ-۱۴)	یقیناً اللہ نبی کی طرف رجوع ہوا،
فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ (انبیاء)	پھر ہم نے اس (یونس) کی دعا قبول کی اور اسکو غم سے رہائی دی

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ (فتح-۱) تاکہ اللہ تیری گلی پچھلی فروگذاشت معاف کرے،

کامل اور عام عفو و مغفرت کا یہ مرتبۂ بلند خود بندہ کی زندگی میں انبیاء کے سوا کسی دوسرے کو نصیب نہیں،

۲- انبیا کی معصومیت کے مسئلہ میں غلط فہمی کا دوسرا سبب یہ ہو کہ انبیا کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں، قوت اور عمل کا جو فرق ہی، اُس کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا علم اور جہل، ضلالت اور ہدایت، اضافی الفاظ میں سے ہیں، علم کی ہر حد کو علم کے مافوق درجہ کے لحاظ سے جہل اور ہدایت کے بلند سے بلند رتبہ کو اُس سے بھی اوپر کے مرتبہ کے لحاظ سے ضلالت کہہ سکتے ہیں،

انبیاء علیہم السلام کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں قوت اور فعلیت کا فرق ہی جس طرح تخم میں تمام برگ و بار پوشیدہ ہوتا ہے لیکن وہ اُس وقت درخت نہیں ہوتا اور نہ اُس میں تنہ، شاخیں، پتے، پھول اور پھل ہوتے ہیں، اور نہ اُس کا عالم نیا وہ سایہ ہوتا ہی لیکن ایک وقت آتا ہی جب وہی تخم بڑھ کر ایک نیا درخت بن جاتا ہے، اس کے پتے آنکھوں میں ہریالی پیدا کرتے ہیں اُس کے پھول مشامِ جان کو معطر کرتے ہیں اُس کے پھل کام و دہن میں شہد ٹپکاتے ہیں،

اُس کے سایہ میں تھکے ماندے مسافر آرام پاتے ہیں، اسی طرح نبوت کی سابقہ اور لاحقہ زندگیون میں عظیم الشان فرق ہو اور اسی فرق کی بنا پر اُس کی قبل از نبوت زندگی، ظہور نبوت کے بعد تاریکی اور ضلالت، اور بعد کی زندگی نور اور ہدایت معلوم ہوتی ہے، جس طرح عام افراد کی زندگی اسلام و ایمان کے بغیر ضلالت اور اسلام و ایمان کے بعد ہدایت بن جاتی ہے، اسی طرح انبیاء کی زندگی اُن کی نظر میں نبوت کے بغیر ضلالت اور نبوت کے بعد ہدایت ہوتی ہے، غرض یہ ہو کہ ظہور نبوت سے پہلے کا زمانہ اُن کی ضلالت کا اور بعد کا زمانہ اُن کی ہدایت کا عہد کہلاتا ہے، لیکن ضلالت اور ہدایت کا یہ مفہوم اس مفہوم سے بالکل مختلف ہے، جو غیر انبیا کے حق میں مستعمل ہے، اللہ تعالیٰ جہان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے احسانات گنا تا ہے، فرماتا ہے،

اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ص وَوَجَدَكَ	کیا اللہ نے تجھ کو یتیم نہ پایا، پھر پناہ دی
ضَآلًّا فَهَدٰی ص وَوَجَدَكَ عَآئِلًا	اور اُس نے تجھ کو بھولا پایا، تو رہنمائی کی
فَاَغْنٰی، (ضحیٰ - ۱)	اور تجھ کو محتاج پایا، تو بے نیاز کیا،

سطور بالا سے ظاہر ہے کہ یہان ہدایت سے نبوت، اور ضلالت سے قبل نبوت کی زندگی مراد ہے، جو نبوت کے بعد کی زندگی کے مقابلہ مین نسبتہً ضلالت ہی ہے،

"ضلالت" کے معنی عربی میں صرف صریح گمراہی ہی کے نہیں ہیں، بلکہ نادانستہ بھولنے بھٹکنے اور غفلت کرنے کے بھی ہین، عورتون کی شہادت کے موقع پر ہے،

اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ	کہ بھول جاوے ایک عورت تو یاد
اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰی (بقرہ ۳۹)	دلادے اس کو دوسری،

ایک اور آیت مین علم الٰہی کی تعریف میں ہی،

لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسیٰ (طہٰ ۲) وہ چوکتا ہے میرا رب نہ بھولتا ہے،

ان آیتوں میں لفظ ضلالت کا استعمال بتاتا ہی کہ ضال کے معنی عربی زبان اور محاورۂ قرآن میں صرف گمراہ کے نہیں، بلکہ بھول چوک کے بھی ہیں، اسی طرح اس حالت کے بھی ہین، جس میں گمراہی کو گمراہی معلوم ہوتی ہے لیکن ہنوز ہدایت الٰہی کا نور اس کے سامنے نہیں چمکا، غلطی کا احساس ہوتا ہے، مگر اس غلطی کی جگہ ہنوز صحت نظر نہیں آئی ہے، جہل کی برائی تو معلوم ہوگئی ہے، مگر ہنوز علم کا دروازہ نہیں کھلا ہے، اور یہی قبل نبوت کی کیفیت ہوتی ہے، حضرت موسیٰؑ نے اپنی نبوت سے پہلے ایک ستم شعار قبطی کو گھونسا مارا تھا جس کے صدمہ سے وہ اتفاقیہ مرگیا تھا، نبوت پاکر جب وہ لوٹے تو فرعون نے اُن کو طعنہ دیا کہ تم تو میرے فراری مجرم ہو حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا،

فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ میں نے اس حالت مین کیا تھا کہ مین

(شعراء ۲) چوکنے والوں میں سے تھا،

اس چوک اور ضلالت سے مقصد صرف یہی ہے کہ اس وقت میں نبوت کی عزت سے سرفراز نہ تھا، ورنہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے نبوت سے پہلے کوئی گمراہی کی بات نہین کی تھی، نہ بُت کو پوجا تھا، نہ فرعون کو سجدہ کیا تھا، نہ کوئی اور شرک کیا تھا کسی کے طمانچہ مارنے سے اتفاقیہ کسی کمزور کا مرجانا: مارنے والے کا کوئی بامقصد گناہ نہیں جس کو ضلالت کہیں، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہی کہ حضرت موسیٰؑ کا اپنے کو اس وقت ضال کہنے سے مراد نبوت سے سابقہ زندگی ہی

اس قبلِ نبوّت کی زندگی کو بعد نبوّت کی زندگی کے لحاظ سے جسے یہاں "ضلالت" کہا گیا ہے، دوسری جگہ اس کو "غفلت" (بیخبری) سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، حضرت یوسفؑ کے قصہ میں آپ کو خطاب ہے؛

نحن نقص علیک احسن القصص	ہم تجھے بہترین قصہ سناتے ہیں، کیونکہ ہم نے
بما اوحینا الیک ھذا القرآن وان	تیری طرف یہ قرآن اتارا، اگرچہ اس قرآن کی
کنت من قبلہ لمن الغافلین (یوسف)	وحی سے پہلے تو بیخبروں میں تھا،

اس "بیخبری" کے عالم کی تفسیر دوسری آیت میں ہے، جس پیغمبر کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت کی زندگی کا فرق ظاہر فرمادیا ہے،

وکذلک اوحینا الیک روحا من	اور اسی طرح ہم نے اپنے (خلوت خانہ) راز سے
امرنا ما کنت تدری ما الکتب	ایک روح تیری طرف وحی کی، تو نہیں جانتا
ولا الایمان ولکن جعلنہ نورا نھدی	تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان، لیکن ہم نے
بہ من نشاء من عبادنا وانک	نور بنادیا جس سے جس کی چاہتے ہیں اپنے بندوں
لتھدی الی صراط مستقیم	میں سے رہنمائی کرتے ہیں، اور بیشک تو بھی سیدھی
(شوری - ۵)	راہ دکھاتا ہے،

"کتاب وایمان" کے نور و ہدایت ملنے سے پہلے کی یہی وہ کیفیت وحالت ہے، جس کو کہیں ضلالت اور کہیں غفلت کہا گیا، اس سے مقصود حقیقی گنہگاری، عصیان کاری، اور باطنی گمراہی نہیں ہے، بلکہ طلب حق، تلاش معرفت اور انتظار حقیقت ہے کہ وہی اُن کے

حق میں ضلالت اور غفلت کا حکم رکھتا ہے، آخر وہ وقت آتا ہے جب روشنی چمکتی ہے، روحانی سکون کا چشمہ بہتا ہے، اور منزل رسی کے بعد دوسروں کی رہنمائی کا منصب عطا ہوتا ہے، یہ ہدایت کا دور ہے، چنانچہ ایک موقع پر انبیاءؑ کے نبوت ملنے کو ہدایت کے لفظ سے ادا فرمایا گیا ہے،

وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ،	(انعام)	اور ہم نے ابراہیم کو اسحٰق اور یعقوب بخشے؛ اور ان میں ہر ایک کو ہدایت دی اور اُن سے پہلے نوح کو ہدایت دی،

اس ہدایت دینے سے اگر نبوت عطا کرنا مراد ہے تو ظاہر ہے کہ عدمِ نبوت کا عہد "ضلالت" ہی کہلائے گا، مگر اس سے مقصد صرف وہ حالت ہوئی جس میں اُن کو ہنوز نبوت نہیں ملی تھی اور اس مرتبۂ بلند کا انتظار تھا،

اس تشریح سے یہ واضح ہوگیا کہ انبیاءؑ کے حق میں ضلالت سے مقصود گنہگاری، عصیان کاری، اور گمراہی نہیں، بلکہ عدمِ نبوت کا دور اور رسالت کی زندگی سے پہلے کا عہد ہے، جو نبوت و رسالت کی ہدایت کے مقابلہ میں نسبتہً ضلالت ہے،

نبی کی بشریت | نبیؐ کی معصومیت اور اُس کے دوسرے مقدس خصوصیات کے باوجود اسلام کی تعلیم یہی ہے کہ نبی، خدا کا مخلوق، خدا کا بندہ اور آدمی ہی ہوتا ہے، وہ خدا، خدا کا اوتار، یا فرشتہ نہیں ہوتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ بھی اُن مسائل میں ہے، جن کی اصل حقیقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے افراط و تفریط کی تاریکی میں گم تھی، اور آپ کے فیضِ تعلیم سے وہ روشن ہوئی، اسلام سے پہلے یہودیوں کی طرح ایسے اہلِ مذہب بھی تھے جو پیغمبروں کو ایک پیشینگوئی کی صفت کے علاوہ ہر حیثیت سے معمولی انسان سمجھتے تھے، وہ ہر قسم کے گناہ بھی کرتے تھے،

وہ بداخلاقیوں کے بھی مرتکب ہوتے تھے، وہ کفر بھی کرتے تھے تاہم پیغمبر سمجھے جاتے تھے، دوسری طرف عیسائی بھی تھے، جو اپنے "نجات دہندہ" کو انسانیت سے پاک، خود خدا یا خدا کا جز یا ناسوت ولاہوت" کا ایک مجموعہ سمجھتے تھے، اور ہندو بھی تھے، جو اپنے رہنماؤں کو دیوتا، اور اوتار یعنی مجسم خدا یا انسان کے بھیس میں خدا سمجھتے تھے، اور جن کو ہر قسم کی خدائی طاقتیں حاصل تھیں،

اسلام نے اپنی تعلیم ان دونوں کے وسط میں پیش کی، وہ ایک طرف رسولوں کو مخلوق محض، صرف انسان اور پورا بندہ اور خدا کے حکم کے سامنے عاجز و درماندہ تسلیم کرتا ہی لیکن دوسری طرف وہ اُن کو خدا کا برگزیدہ معصوم، نیک اور خدا کی قدرت سے فیض پاکر برکتوں، سعادتوں اور ہدایتوں کا مرکز، اور اس کی اجازت سے عجیب و غریب اُمور صادر کرنے والا بتاتا ہی، اور بے اعتدالی کے اُن دونوں خیالات کی جو غلط فہمی پر مبنی ہین، علانیہ تردید کرتا ہی، اہلِ عرب بھی ہندوؤں یونانیوں اور عیسائیوں کی طرح یہ سمجھتے تھے کہ انسان کی رہنمائی کے لئے خود انسان نہیں بلکہ انسان سے مافوق ہستی ہونی چاہیئے، اور وہ ہستی صرف فرشتوں کی ہے، قرآن نے اُن کے اس خیال کی بار بار تکذیب کی ہی، اور کہا ہی کہ اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے، تو فرشتہ کو اُن کے پاس رسول بنا کر بھیجا جاتا، اور انسانوں میں فرشتہ آتا بھی تو انسانوں ہی کے پیکر میں آتا، تو ایسی حالت میں تم اس فرشتہ کو فرشتہ کب مانتے،

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبروں کے دو رُخ ہوتے ہیں، ایک طرف تو وہ بشریت کے جامہ میں ہوتے ہیں، اور انسانوں ہی کی طرح کھاتے پیتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، شادی بیاہ کرتے اور پیدا ہوتے، اور مرتے ہیں، دوسری طرف وہ اپنی روحانیت، بے گناہی، پاکدامنی، اور اختصاص

نبوت میں انسانوں سے بلند تر ہیں، یہودیوں کی طرح جن کی نظر اُن کے انسانی رُخ پر پڑتی ہے وُہ اُن کو ہر طرح معمولی انسان سمجھتے ہیں، اور عیسائیوں کی طرح جن کی نظر اُن کے مافوق انسانی خصائص پر پڑتی ہے، وہ اُن میں الوہیت کے اوصاف ثابت کرنے لگتے ہیں، حالانکہ حق اُن دونوں کے بیچ میں ہے، وہ اپنے بشری اوصاف کے لحاظ سے بلاشبہ انسان ہوتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے مافوق بشری خصوصیات کی بنا پر فوق البشر ہوتے ہیں یہی مغالطہ اپنے اپنے پیغمبروں کے متعلق کفار کو ہوتا تھا پیغمبر اُن کے سامنے جب اپنی نبوت اور خدا کی طرف سے آنے کا دعویٰ پیش کرتے تھے، تو وہ اُن کی بشری خصوصیتوں کو دیکھکر کہتے تھے کہ تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو تم خدا کے قاصد اور پیامبر کیسے ہو سکتے ہو چنانچہ کفار نے بار بار پیغمبروں سے کہا،

اَبَعَثَ اللّٰہُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (اسرائیل) کیا خدا نے بشر کو قاصد (رسول) بناکر بھیجا،

وہ بشریت کو رسالت کے منافی سمجھتے تھے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا،

ھَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (اسرائیل ۱۰) میں تو نہیں ہوں مگر انسان رسول،

اُن کو شبہہ تھا کہ کیا گمراہ انسانوں کی رہنمائی انسان ہی کر سکتا ہے،

اَبَشَرٌ یَّھْدُوْنَنَا (تغابن ۔۱) کیا انسان ہماری رہنمائی کریں گے،

یہ وہی شبہہ تھا جس میں پھنسکر عیسائی حضرت عیسیٰؑ کی انسانیت سے منکر ہوئے کہ موروثی گنہگار انسان کو انسان کا بیٹا کیونکہ نجات دے سکتا ہے، اور یہ نہیں سمجھے کہ انسان موروثی گنہگار نہیں بلکہ وہ گنہگار بھی ہو سکتا ہے، اور بے گناہ بھی، بے گناہی اور معصومیت کیلئے انسانیت سے

پاک ہونا ضرور نہیں یہی بات اور کفّار کی سمجھ میں بھی نہیں آتی تھی، اور انبیاء کو ظاہری اور جسمانی طور سے اپنی ہی طرح انسان سمجھکر، اُن کو نبوت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے، اور کہتے تھے،

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (ابراهیم ۲) — تم تو نہیں ہو لیکن ہماری ہی طرح ایک بشر

دوسرون کو نبی کے انکار کرنے پر اس طرح آمادہ کرتے تھے کہ

هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (انبیاء) — نہیں ہو یہ لیکن تمھاری ہی طرح بشر،

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (مومنین ۲) — نہین ہو یہ لیکن تمھاری ہی طرح بشر،

انبیاء کے سامنے وہ یہی دلیل پیش کرتے تھے،

مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (شعراء ۸) — تم تو ہماری ہی طرح بشر ہو،

مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا، (یٰسین ۲) — تم لوگ تو ہماری ہی طرح بشر ہو،

اور وہ اپنے اس دعوی کی صداقت کو بداہت اور مشاہدہ سے ثابت کرتے تھے،

مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا (هود ۳) — ہم تو تم کو اپنی ہی طرح بشر دیکھتے ہیں،

انبیاء علیہم السلام نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ ہان تمھاری ہی طرح ہم بشر ہیں لیکن خدا کے فضل وکرم سے سرفراز ہین، اور یہی تم میں اور ہم میں فرق ہے، فرمایا،

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ — اُن کے رسولون نے جواب دیا کہ ہم تمھاری

اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ — ہی طرح بشر ہیں لیکن خدا نے اپنے بندون

عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (ابراهیم ۲) — میں سے جس پر چاہتا ہو احسان کرتا ہو،

ان کفّار کی نظر صرف اُن کے ایک رُخ یعنی عام انسانی پہلو پر پڑتی تھی، انبیاء نے جو بات

اس پہلو کے ساتھ اپنے دوسرے رُخ کو بھی اُن کے سامنے پیش کر دیا، اور کہا کہ ہاں ہم انسان ہیں لیکن ایسے انسان جن پر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی بارش ہے یعنی نبوت سے سرفراز اور اسکی خصوصیتوں سے ممتاز ہین،

دوسرے نبیوں کی طرح ختم المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ بار بار ارشاد فرمایا بلکہ وحیِ الٰہی نے آپ کی زبان سے یہ اعلان کر دیا کہ کہدو کہ میں تمھاری ہی طرح ایک آدمی، اور بشر ہوں' اس اعلان نے جو درحقیقت اُس غلط عقیدہ کے مٹانے کے لئے تھا، جو انبیاءؑ کی شانِ الوہیت کے متعلق عیسائیون کے اثر سے لوگون میں پھیل گیا تھا، اور افسوس ہے کہ اس قسم کا غلط خیال اُسی نبی کی اُمت کے ایک گروہ میں بھی پایا جاتا ہے، جو دنیا میں خدا کی توحیدِ کامل کا مبلغ بنکر آیا تھا، دوسری طرف اس علان سے ایک تفریط پسند گروہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ پیغمبر اور عام انسانون میں کوئی فرق اور امتیاز نہیں اور نہ پیغمبرون کو عام انسانون پر کوئی بلندی و برتری حاصل ہے الا یہ کہ پیغمبرون پر وحی آتی رہتی ہے اور عام انسان اس سے محروم ہین گویا اس کا منشا یہ ہے کہ پیغمبر صرف اُس لمحہ اور آن میں منصبِ نبوت کا امتیاز پاتا ہے جب اس قسم کی وحی نازل ہوتی ہے، اور اس کے پہلے اور اس کے بعد وہ عام انسان ہوتا ہے، اس سے آگے بڑھ کر اسی لئے ایک اور مختصر سے فرقہ نے یہ دعویٰ کیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغمبرانہ حکم صرف وہی ہے جو وحیِ قرآنی کی صورت مین آیا، اس کے علاوہ آپکے تمام احکام جو قرآن سے باہر ہین، وہ صرف حاکمانہ اور انتظامی امور ہیں، جن کی پیروی نہ کرنا اسلامی شریعت ہے، نہ اسلام کا جزء ہے، یہ خیالات حقیقت مین دوسرے مفرطانہ فرقہ کے مقابلہ مین تفریطانہ ہے، اور یہ دونون اعتدال کی حد سے باہر اور حقیقت اُن کے بیچ میں ہے،

قرآن پاک میں تین جگہ وہ آیتیں ہیں جن میں خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کا اعلان ہے، مگر ہر جگہ توحید کامل کے بیان اور خدا کے مقابلہ میں رسولوں کی عبدیت کی تشریح اور اس عقیدۂ باطل کی تردید میں ہیں کہ رسولوں کے ہاتھوں میں یہ قوت ہونی چاہئے کہ وہ خدا سے زبردستی کسی بات کو منوالیں، اور سعی وسفارش کرکے قصور معاف کرادیں، قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ اُن کو جو کچھ حاصل ہے وہ خدائے تعالیٰ کی اجازت، اذن اور عطا سے ہے،

سورۂ کہف میں ان مشرکوں کا ذکر ہے جو خدا کے بندوں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں،

أَفَحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَن يَتَّخِذُوا عِبَادِي مِن دُونِي أَوْلِيَاءَ ۚ إِنَّا أَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ نُزُلًا (کہف ۱۲)	کیا وہ جنہوں نے کفر کیا یہ سمجھیں ہیں کہ وہ میرے بندوں (رسول اور فرشتوں) کو میرے سوا اپنا حامی بنائیں گے ہم نے ان [illegible]

قرآن اس خیال کو کفر قرار دیتا ہے، یہ رکوع کا شروع ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے غیر محدود اوصاف وکمالات کا ذکر ہے، پھر ارشاد ہے،

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ (کہف ۱۲)	کہدے کہ میں تو تمہاری ہی طرح ایک بشر ہوں مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک [illegible]

دوسری جگہ یہی تعلیم بعینہٖ سورۂ حٰمٓ السجدہ (فصلت) میں ہے،

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَاسْتَقِيمُوا إِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوهُ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِينَ، (حم السجدہ ۱)	کہدے کہ میں تو تمہاری طرح بشر ہوں مجھ پر وحی کیجاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے اسکی طرف سیدھے رہو اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو [illegible]

اس آیت کا منشا بھی یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں رسول اسی طرح ایک بندہ ہے، جس طرح خدا کے دوسرے بندے، دعائیں خدا ہی سے مانگنی چاہئیں، اور اسی سے اپنے گناہون کی معافی کی درخواست کرنی چاہیئے، یہ اختیارات خاص خدا کے ہیں، بندون کے نہیں، اس تعلیم سے مقصود حقیقت میں عیسائیون کے مسئلہ کفارہ اور اُن کے اس عقیدہ کی تردید ہے کہ گناہون کا معاف کرنا حضرت عیسیٰؑ کے اختیار میں ہوگا، اور مسلمانون کو اپنے رسول کی نسبت اس قسم کی باطل عقیدتمندیوں سے بچانا ہے، چنانچہ تیسری جگہ قرآن پاک میں جہان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار کا یہ مطالبہ مذکور ہے کہ تم خدا کے پیغمبر ہو تو ہمارے لئے سونے کی چھت بنادو، جہان نہرین نہیں، وہان نہریں جاری کردو، ہمارے سنسان جنگلون کو باغ و بہار بنادو، اپنے ساتھ جلو مین فرشتون کے پرے لے کر چلو، ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ جاؤ اور وہان سے ہاتھ مین کتاب لے کر سامنے اترو،

وَقَالُوا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا	اور انھون نے کہا کہ ہم تم پرایمان اُسوقت تک
مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا ، اَوْ تَكُوْنَ	نہیں لائین گے، جبتک تم ہمارے لئے زمین سے
لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ	ایک چشمہ نہ بہادو، یا تمھارے لئے کھجورون اور انگورون
الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ، اَوْ تُسْقِطَ	کا ایک باغ نہ ہوجائے، یا جیسا تم کہتے ہو
السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا	آسمان کے ٹکڑے کرکے ہم پر نہ گراؤ، یا خدا کو
اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ،	فرشتون کو ضامن بنا کر نہ لے آؤ، یا تمھارے
اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ	لئے سونے کا ایک گھر نہ ہوجائے، یا تم آسمان

تَرْقٰی فِی السَّمَآءِ ۚ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِیِّکَ	پر نہ چڑھ جاؤ، اور ہاں تمھاری آسمان پر چڑھنے
حَتّٰی تُنَزِّلَ عَلَیْنَا کِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ	کا ہم کو اُس وقت تک یقین نہ آئیگا جبتک تم وہان
(بنی اسرائیل - ۱۰)	سے ایک نوشتہ نہ ہم پر اُتار لاؤ جس کو ہم پڑھین

یہ اُمور مشکل و محال نہ تھے لیکن نبوت کے اوصاف کو ان بازیگرانہ تماشون سے تعلق نہ تھا، اور اس سے زیادہ یہ کہ اس غلط عقیدہ کا ابطال کرنا تھا کہ پیغمبر میں براہ راست کچھ خدائی اختیارات ہوتے ہین، اس لئے آپ کو یہ جواب سکھایا گیا کہ آپ فرمائین،

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا	کہدے اے پیغمبر! سبحان اللہ مین تو ایک بشر
رَّسُوْلًا ۚ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا	ہون رسول اور لوگون کو جب انکے پاس ہدایت
اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓی اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا	آئی ایمان لانے سے باز نہین کھا مگر اس خیال نے
اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۚ قُلْ لَّوْ کَانَ	کہ کیا خدا نے بشر کو رسول بناکر بھیجا ہے کہدے کہ
فِی الْاَرْضِ مَلٰٓئِکَةٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّیْنَ	اگر زمین مین فرشتے ہوتے تو ہم آسمان سے فرشتہ
لَنَزَّلْنَا عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَکًا رَّسُوْلًا (اسراء - ۱۱)	کو رسول بناکر اُن پر اُتارتے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بحکم خدا معجزات بھی صادر ہوئے، اور اُن کی حیرت انگیزی کو انھون نے تسلیم بھی کیا، پھر بھی یہ خیال کہ ایک بشر رسول کیونکر ہوسکتا ہے قائم رہا،

کفار نے معجزات دیکھنے کے بعد بھی یہی کہا،

هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ	یہ تو تمھاری ہی طرح بشر ہے کیا تم دیکھ بھال کر
السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ (انبیاء - ۱)	بھی جادو کے پاس آتے ہو،

معجزات کی حیرت انگیزی کو جادو کہکر تسلیم کیا، مگر پھر بھی اُن کو بشریت رسالت کے منافی ہی معلوم ہوئی، اُن سے کہا گیا کہ نبوت و رسالت کے اوصاف و خصائص تم سے زیادہ اُن کو معلوم ہیں جن کو تم سے پہلے آسمانی کتابیں عطا ہوئیں، یعنی یہود، اُن سے پوچھ لو کہ رسول اور نبی بشر ہی ہوتے آئے ہیں،

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ، (انبیاء - ۱)

اور ہم نے نہیں بھیجا رسول بنا کر تم سے پہلے لیکن انسانوں ہی کو جن کو ہم وحی کرتے تھے، جاننے والوں سے پوچھو اگر تم نہیں جانتے،

یہی جواب سورۂ یوسف میں دیا گیا،

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى (یوسف ۱۲)

اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھیجے وہ بشر ہی تھے، آبادیوں کے رہنے والے ہم اُن پر وحی کرتے تھے،

اس سے زیادہ تفصیل سورۂ نحل میں ہے،

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ، بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ، وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (نحل - ۶)

اور ہم نے نہیں بھیجا تم سے پہلے لیکن انسانوں کو جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے تو پوچھ لو کتاب والوں سے اگر تم نہیں جانتے کھلی نشانیاں اور کتابیں دیکر، اور ہم نے تم پر کتاب (ذکر) اتاری تاکہ تم کھول کر لوگوں سے بیان کرو جو ان کی طرف اُتارا گیا اور تاکہ وہ سوچیں،

ہر شخص جو مثلیت اور بشریت کی ان آیتوں پر ایک نگاہ ڈالے گا، وہ یہی سمجھے گا کہ ان آیتوں میں جس قسم کی مثلیت اور بشریت کا ذکر ہے، اس کا تعلق ظاہری جسمانیت اور جسمانی قوی اور مخلوقیت سے ہے، ورنہ اخلاقی، روحانی، دماغی، قلبی، علمی، اور عملی حیثیت سے ایک پیغمبر انسان رہ کر بھی غیر نبی انسانون سے بلند تر اور علانیہ ممتاز ہوتا ہے، نبی اور غیر نبی میں صرف وحی کے امر فارق ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نبی القاے ربانی سے متصف ہونے کے علاوہ بقیہ تمام اوصاف وکمالات یا عیوب ونقائص میں عام انسانون کے برابر ہوتا ہے، یہ کہنا ایسا ہی ہے، جیسے کوئی یہ کہے کہ عالم وجاہل میں صرف علم کا فرق ہے، ورنہ دونون برابر کے انسان ہین، تو اس کے معنی یہ نہیں کہ علم وجہل کے علانیہ ممتاز ومتضاد اوصاف میں بھی وہ دونون برابر ہیں، اور اُن مین عقل، اخلاق، تہذیب، سلیقہ، رائے اور حکمت ودانائی کا کوئی فرق نہین حالانکہ اُن مین علم وجہل کا فرق کہکر، درحقیقت ان دون کے درمیان علم اور جہل کے سینکڑون اوصاف لوازم اور خصائص کا فرق وامتیاز تسلیم کرنا ہے،

اسی طرح نبی اور غیر نبی مین وحی کا فرق مان کر وحی والے اور بے وحی والے انسانون میں خود وحی اور عدم وحی کے سینکڑون لوازم، خصائص اور اوصاف کا فرق تسلیم کرنا پڑے گا وحی ورسالت کو چھوڑ دو، دوسرے انسانی کمالات کو مثلاً لو تو بھی یہی ماننا پڑے گا انسان کیلیے جتنے اوصاف وکمالات ممکن ہین، اُن سب کی اعلیٰ سے اعلیٰ جانب کمال تک پہنچنا ممکن ہے، اور وہان تک یہ پہنچ جاتے ہیں، وہ اپنے جسمانی اوصاف وخصائص کے لحاظ سے انسان ہونے کے باوجود اپنے دوسرے قوی میں عام انسانون سے یقیناً بلند اور ممتاز ہوتے ہین کوئی کہہ سکتا ہے

کہ جسمانی قوت کا ایرانی ہیرو رستم انسان نہ تھا علم و عقل کا یونانی مجسمہ ارسطو انسانیت سے پاک تھا اور موجودہ دنیا کی بہت سی حیرت انگیز ایجادون کا مخترع اڈیسن بشر نہیں لیکن اس انسانیت اور بشریت کے اشتراک کے باوجود، اپنے اپنے دائرہ میں، وہ عام انسانون سے بلند تر اور ممتاز تر ہین، اور بااینہمہ وہ اپنے جسمانی خصائص، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، دیکھنے بھالنے، صورت شکل، ہاتھ پاؤن، ہر ایک چیز مین وہ ویسے ہی انسان ہین، اور مخلوق انسان، بلکہ مجبور انسان ہین، جیسے دوسرے کمزور، جاہل اور بلید الذہن انسان، یہی مثال ایک معنی مین انبیاے کرام علیہم السلام کی بھی ہے کہ وہ غیر نبی انسانون کے ساتھ بہت سے انسانی اوصاف مین شریک ہونے کے باوجود وحی اور اس کے خصائص اور لوازم مین اُن سے صریحاً الگ بلند، اور اعلیٰ بلکہ بعض جسمانی خصائص میں بھی اُن سے ممتاز ہین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم وصال رکھتے دیکھکر جب صحابہؓ بھی آپ کی پیروی مین کئی کئی دن تک متصل روزہ رکھتے ہین، تو آپ اُن کو منع کرتے ہین، اور اپنی نسبت فرماتے ہیں "اَیُّکُمْ مِثْلِی اَبِیتُ یُطْعِمُنِی رَبِّی وَیَسْقِینِی" تم میں کون میرے مثل ہے، میں رات گذارتا ہون، تو میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے[1] کیا عام انسانون کو بھی یہ روحانی غذا اور روحانی سیرابی میسر آتی ہے، اور وحی کے علاوہ بعض دوسری حیثیتوں سے بھی مثلیت کی اس میں نفی نہیں ہے؟

اسی طرح نیند کی حالت میں بھی نبی کے قلب اور اس کے احساسات کا غافل ہونا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے آپ نے فرمایا "میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن دل نہیں سوتا وَکَذٰلِکَ الْاَنْبِیَاءُ

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصوم،

تنامُ اَعینھم وَلا تنامُ قلوبھم، اور اسی طرح سب انبیا ہیں کہ اُن کی آنکھیں سوتی ہین مگر اُن کے دل نہیں سوتے" کیا یہی کیفیت عام انسانون کی نیند کی بھی ہے ؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگون کو نماز مین صفون کو درست رکھنے کی تاکید کرتے ہیں، تو فرماتے ہیں کہ "مین تم کو اپنی پیٹھ کے پیچھے سے بھی ویسے ہی دیکھتا ہون جیسے سامنے سے" کیا عام انسانون کی قوتِ بصارت کا یہی عالم ہوتا ہے ؟
قرآن پاک مین ہے، اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی "کیا پیغمبر جو دیکھتا ہے تم اُس مین اُس سے جھگڑتے ہو"، وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ "اور اُس نے اس (فرشتہ) کو آسمان کے کنارون مین دیکھا" کیا عام انسان بھی یہ مشاہدہ کرتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتساب سے اُمّہات المومنین کو جو شرف حاصل ہوا، اس کا اقتضا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اُمّہات المومنین کو خطاب کرکے فرمایا یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ (احزاب) "اے پیغمبر کی بیویو! تم ایسی نہیں ہو جیسی ہر عورت اگر خدا کا ڈر رکھو" تو اگر پیغمبر کی بیویان تقویٰ کے بعد عام عورتون کے مثل نہیں ہیں، تو خود پیغمبر تو بدرجہا اس کا سزاوار ہے کہ وہ کَاَحَدٍ مِّنَ الرِّجَالِ نہ ہو اور اپنے خصائص میں عام انسانون سے بدرجہا بلند تر اور ممتاز ہو،

الغرض نبی اور غیر نبی مین صرف وحی و نبوت کا جو فرق ہے، اُس کے یہی معنی ہین کہ اُن دونون مین وحی و رسالت کے تمام لوازم، خصوصیات اور ضروری اوصاف مین فرق اور امتیاز ہے اسی لئے کسی انسان کو صاحبِ وحی ماننے کے ساتھ ہی اس کو ان تمام اوصاف و لوازم اور خصوصیات کا مالک بھی ضروری ماننا پڑے گا،

سلہ صحیح بخاری باب الاسرار،

اجتہادِ نبوی میں خطا

شبہہ کا ایک اور سبب یہ ہے کہ قرآن مجید میں بعض جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی چند فروگذاشتوں پر تنبیہ کیا گیا ہو، جس سے ثابت ہوتا ہو کہ خاص وحیِ الٰہی کے علاوہ آپ اپنی عقل و مصلحت سے جو حکم دیتے تھے وہ غلطیوں سے پاک نہیں ہوتا تھا، اس سلسلہ میں یہ بات تمام مسلمانوں کو تسلیم ہو کہ جن بعض امور میں آپ پر وحیِ قرآن نازل نہیں ہوتی تھی، اُن میں آپ اپنے پیغمبرانہ علم و حکم اور فہم نبوی سے فیصلہ فرماتے تھے لیکن غور کے قابل یہ بات ہو کہ اگر آپ کو آپکے اس فیصلہ پر خدائے تعالیٰ کی طرف سے کبھی کوئی تنبیہ نہ ہوئی ہوتی تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ آپ کے تمام فیصلے صحیح اور منشائے الٰہی کے مطابق ہوتے تھے، مگر یہ بھی کہنے والا کہہ سکتا تھا کہ اجتہادِ نبوی کے فیصلوں کی صحت و خطا کی ذمہ داری خدا نے نہیں لی تھی، اسلئے تنبیہ نہ فرمائی گئی، مگر واقعہ ان دونوں کے خلاف ہی صورت یہ ہے کہ بعض فیصلوں پر تنبیہ کی گئی ہے، اور بعض پر نہیں، اس سے بداہتہً ثابت ہوتا ہے کہ اجتہادِ نبوی میں غلطی ہو جانا ممکن ہی، مگر اس غلطی پر چند لمحوں کا قرار بھی ممکن نہیں، ادھر لغزش ہوئی، اور ادھر علام الغیوب کی بے خطا وحی نے اس کی تنبیہ اور اصلاح کی، اس واقعہ سے دوسرا نتیجہ یہ ثابت ہوتا ہو کہ وہ تمام امور و احکام جن کو آپ نے اپنے پیغمبرانہ اجتہاد و علم و حکمت سے ارشاد فرمایا، یا اُن پر عمل کیا، اور وحیِ الٰہی نے اُن پر خاموشی برتی، تو منشائے الٰہی نے گویا اُن کی صحت و صداقت پر اپنی خاموشی سے مہر کر دی، اور اُن کی حیثیت بمنزلۂ وحی کے ہو گئی،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی عمر ۲۳ سال ہے، ان پورے ۲۳ سالوں میں ہزاروں واقعات اور امور پیش آئے جن پر آپنے اپنے اجتہاد اور شرح صدر سے فیصلے صادر کئے مگر اُن میں سے کل

پانچ باتیں ایسی ہیں جن پر وحیِ الٰہی نے تنبیہ کی، اور عجیب تر یہ ہے کہ اُن میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جس کا تعلق حکمِ دینی، شریعتِ ابدی اعتقاد، عباوات یا شرعی معاملات سے ہو، بلکہ وہ کل کے کل ایسے امور ہیں جن کی حیثیت تمامتر شخصی یا جنگی ہے، اس سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ دین اور شریعت میں آپکے یہ پیغمبرانہ اجتہادی فیصلے خطا و غلطی سے تمامتر پاک تھے،

اس خطا کے معنی | عام انسانوں کے اجتہادات میں جن اسباب سے غلطیاں واقع ہوتی ہیں، وہ یہ ہیں، کہ جن مقدمات پر اُن کا اجتہاد مبنی ہوتا ہے، وہ غلط ہوتے ہیں، یا اُن کا علم اُن کو قطعی طور سے نہیں ہوتا، یا استقرار تام نہیں ہوتا تمثیل پوری نہیں ہوتی، علتِ مشترکہ صحیح نہیں معلوم ہوتی، مگر یہ تمام صورتیں اجتہادِ نبوی میں منتفی ہیں، کیونکہ اجتہادِ نبوی، نہ ان طریقوں پر مبنی ہوتا، نہ وہ غور و فکر، نظر و استدلال اور استقرار و تمثیل کے منطقی و اصولی ذرائع پر قائم ہوتا ہے، بلکہ وہ نورِ رسالت، فہمِ نبوت، حکمتِ ربانی، اور شرحِ صدر پر مبنی و قائم ہوتا ہے، جن میں یہ بیچ کی منزلیں سرے سے نہیں ہوتی ہیں، اسی لئے لفظ "اجتہاد" جو عام طور پر پہلے معنی میں مستعمل اور مشہور ہے، اس مقام پر التباس سے بچنے کی خاطر احتراز کرنا بہتر ہے،

ایک اور نکتہ بھی پیشِ نظر رہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ اجتہاد میں اگر غلطی ہوئی ہے، تو اس غلطی کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ آپنے جو پہلو اختیار فرمایا، وہ کوئی گناہ یا بدی یا بداخلاقی کا پہلو تھا، بلکہ یہ ہے کہ دو بہتر راستوں میں سے آپ نے بہترین راستے کو چھوڑ کر بہتر راستے کو اختیار کیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی، اور بہتر کی جگہ بہترین کی تعیین کی،

اس قسم کے جو چند واقعات پیش آئے ہیں، اُن پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف

ہو جاتی ہی کہ بہترین کو چھوڑ کر جس بہتر کو آپ نے اختیار فرمایا، اس کا منشا ہمیشہ امت پر رحم و کرم اور شفقت کی نگاہ تھی، اللہ تعالیٰ نے اس ظاہری یا عارضی رحم و کرم و شفقت کی جگہ اُن احکام کی تلقین فرمائی جن مین گو بظاہر سختی معلوم ہوتی ہے، مگر علام الغیوب کی دائمی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ وہی سخت پہلو اختیار کیا جائے،

ذیل مین ہم ان اجتہادی امور کی تشریح کرتے ہین جن پر وحی الہٰی نے تنبیہ کی ہے،

پانچ اجتہادی امور پر تنبیہ الہٰی | جن اجتہادی امور پر وحیِ الہٰی نے تنبیہ کی ہے، اُن مین

۱- پہلا واقعہ یہ ہی کہ ہجرت کے قبل مکہ معظمہ مین جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت کی تبلیغ فرما رہے تھے، تو ایک دن قریش کے بڑے بڑے رؤسا آپ کی مجلس مین آکر بیٹھے آپ اُن کو سمجھا بجھا رہے تھے، بت پرستی کی برائیان اور توحید کی خوبیان، اُن پر ظاہر فرما رہے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ وہ اس دعوت کو قبول کرلین کہ اتنے مین ایک مخلص لیکن غریب اور نابینا مسلمان عبد اللہ رضؓ بن ام مکتوم بھی آکر بیٹھ گئے، اور کچھ دریافت کرنا چاہا، قریش کے یہ رؤسا بیحد مغرور اور خود پسند تھے، وہ آپؐ کے جلسون مین صرف اس لئے آنا پسند نہین کرتے تھے کہ آپ کی مجلس مین بدحال، بے حیثیت اور ادنیٰ درجہ کے لوگ آیا کرتے ہین، اسلئے اس موقع پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن رئیسون کی اثر پذیری کے کچھ امکانات نظر آرہے تھے عبد اللہ رضؓ ابن ام مکتوم کا آجانا اور پوچھنا ناگوار ہوا کہ اُن کے آنے سے اُن رئیسون کی خود پسندی اور بڑائی کے جذبہ کو اشتعال ہوا، اور راستہ سے بدک گئے،

عبد اللہ ابن ام مکتوم کی آمد اور دریافت پر یہ ناگواری جو بالکل نیک نیتی سے تھی یعنی اسلئے

تھی کہ آپ جانتے تھے کہ عبداللہ بن ام مکتوم تو مسلمان ہی ہیں، اس وقت ان کی بات کا جواب نہ دینے میں چنداں ہرج نہیں لیکن ان رئیسوں کی ناگواری پورے باشندگانِ مکہ پر اثر انداز ہوگی، اگر یہ مسلمان ہو گئے تو مکہ میں اسلام کی اشاعت کی راہ میں پھر کوئی روک باقی نہیں رہے گی، یہ سمجھکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ بن اُمّ مکتوم کی طرف سے بے التفات ہو کر، ان رئیسوں کی تبلیغ و موعظت کی طرف سراپا متوجہ رہے، اس پر وحیِ الٰہی نے حسبِ ذیل الفاظ میں تنبیہ کی۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰی اَنْ جَاءَہُ الْاَعْمٰی	تیوری چڑھائی، اور منہ پھیرا کہ وہ اندھا آیا، اور
وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّہٗ یَزَّكّٰی، اَوْ یَذَّكَّرُ	تجھے کیا خبر کہ شاید وہ سنورتا یا سوچتا تو (تیرا) سمجھانا
فَتَنْفَعَہُ الذِّكْرٰی، اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی	کام آتا، وہ جو پروا نہیں کرتا، سو تو اسکی فکر میں ہے، اور
فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی. وَمَا عَلَیْكَ	اُس کے نہ سنورنے کا تجھ پر کوئی الزام نہیں اور
اَلَّا یَزَّكّٰی. وَاَمَّا مَنْ جَاءَكَ یَسْعٰی وَ	جو تیرے پاس دوڑا آیا، اور وہ (خدا سے) ڈرتا ہے،
ھُوَ یَخْشٰی. فَاَنْتَ عَنْہُ تَلَہّٰی. كَلَّا	تو اس سے تغافل کرتا ہے، یوں نہیں، یہ تو نصیحت
اِنَّھَا تَذْكِرَۃٌ. فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَہٗ (عبس)	ہے جو چاہے اس کو یاد کرے،

ان آیتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اجتہاد پر کہ ایک پرانے لیکن غریب مسلمان کی مزید ہدایت سے قریش کے رئیسوں کا سمجھانا زیادہ بہتر ہے تنبیہ کی گئی، اور اس نکتہ کو ذہن نشین کیا گیا کہ اسلام کی اصولی بنیادوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے نزدیک امیر غریب آقا اور غلام، اونچے اور نیچے کی کوئی تمیز نہیں، اس کی نگاہ میں بینا، اور نابینا دونوں برابر ہیں، یہ نکتہ تو اس وقت کے فیصلے میں آپ کے پیش نظر رہا کہ ایک مسلمان اندھے کی دلجوئی سے ان رئیسوں کی

جائز دلجوئی کرکے ان کو اسلام کی طرف مائل کرنا زیادہ بہتر ہے، مگر یہ نکتہ نظرانداز ہوگیا کہ اس طرزِ عمل سے خود اسلام کی بنیادی تعلیم پر کیا اثر پڑے گا، اس لئے وحی الٰہی نے تنبیہ کی کہ اسلام کا یہ پیغام دنیا کے لئے صلائے عام ہے، جو چاہے قبول کرے، اس میں کوئی تمیز و تخصیص نہیں، علاوہ ازیں اس کا بھی اشارہ کیا کہ یہ رؤسائے قریش جن کے مسلمان ہونے کی آپ اس قدر کوشش فرما رہے ہیں، وہ ایمان سے محروم ہی رہیں گے، اس لئے کہ اُن کی طرف مزید توجہ بے سود ہے، اور ظاہر ہے کہ آپ اُن کے حق میں دانائے غیب کے اس فیصلہ سے پہلے آگاہ نہ تھے، اس لئے آپ اپنے موجودہ علم کے مطابق اپنے فعل کو صحیح سمجھ رہے تھے،

دوسرا واقعہ | سب سے پہلی لڑائی میں مسلمانوں کے مالِ غنیمت حاصل کرنے اور بدر کے قیدیوں سے زرِ فدیہ قبول کرنے کا ہے، اس وقت تک ظاہر ہے کہ مالِ غنیمت اور فدیہ کا قانون نازل نہیں ہوا تھا کہ ابھی اس کا موقع ہی نہیں آیا تھا، مسلمانوں کو مدینہ منورہ آکر سب سے پہلے سریۂ نخلہ میں مالِ غنیمت ہاتھ آیا، اس کے بعد ہی بدر کے معرکہ میں پھر مالِ غنیمت ملا، اور ساتھ ہی قریش کے ستر قیدی بھی ہاتھ آئے، جن میں اکثر مکہ کے دولتمند اور شرفا تھے، ان قیدیوں کی نسبت مسلمانوں کی مختلف رائیں تھیں، بعضے اُن کو آگ میں زندہ جلا دینا چاہتے تھے، کچھ لوگ فدیہ لیکر ان کو چھوڑ دینا چاہتے تھے، جس سے اُن کو چالیس ہزار درہم ملنے والے تھے، نفسیات کے ماہر جانتے ہیں کہ جو قوم مدت سے ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف اٹھاتی رہتی ہے، وہ بیکسی، مظلومیت، مغلوبیت، اور غربت کے دور سے نکل کر جب پہلے پہل غالب اور دولت مند ہوتی ہے اور اس کو ملکی اور مالی قوت پر دسترس حاصل ہوتی ہے، تو وہ لمحہ اُس کی زندگی میں اخلاقی

حیثیت سے بڑا ہی نازک ہوتا ہے، غلبہ، قوت، اور دولت پاکر بھی اُس کے نشہ میں وہ سرشار نہ ہو، اور اپنے دل و دماغ پر قابو رکھے، یہ بڑا ہی مشکل کام ہے، جو مظلوم تھا وہ غالب ہو جائے اور جو ظالم تھا، وہ مغلوب ہو جائے، اور اس وقت ردِ عمل اپنا کام کر کے مظلوم غالب میں اپنے ظالم مغلوب سے شدید انتقام لینے کا جذبہ نہ پیدا کرے، یہ کوئی آسان کام نہین، سیاسی، و مذہبی تاریخون میں اس کی متعدد مثالین موجود ہین کہ ایسا نہ ہوسکا، خود عیسائی قوم کو دیکھئے جس نے یہودیوں اور بت پرست رومیون کے ہاتھون سے تین صدیون تک برابر سخت سے سخت تکلیفیں اٹھائین لیکن قسطنطین کے زمانہ میں جب دفعۃً جو مظلوم تھے، وہ غالب، اور جو ظالم تھے، وہ مغلوب ہوگئے، تو عیسوی قوم کا پچھلا جو ہر ایک ایک کر کے رخصت ہوگیا، اور اُن لوگون نے جو پہلے مظلوم تھے اس نشہ مین چور ہو کر یہودیوں اور رومی بت پرستون کے ساتھ وہ کچھ کیا جس سے اخلاقِ انسانی کی تاریخ آج بھی شرماتی ہے،

غزوۂ بدر کی غیر متوقع فتح نے مظلوم و بیکس مسلمانون کے لئے تاریخی دور کا وہی نازک موقع پیدا کر دیا، غریب تنگدست مسلمانون کو جو سالہا سال سے کسبِ معاش سے محروم اور معمولی ضروریات کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے، اُن کو غنیمت اور فدیہ کی دولت ہاتھ آئی، اور وہی قریش جن کے ظلم و ستم سے اُن کے بدن زخمی اور اُن کے سینے داغدار تھے، وہ دفعۃً مغلوب ہوگئے اُن کے بڑے بڑے سردار اُن کے ہاتھون سے لڑائی میں مارے گئے، اور ان کے ہاتھون مین قید ہو کر ستر سردار قریش، ان کے رحم و کرم پر زندہ تھے،

اب تک مسلمان نہایت یکدلی، یک جہتی، اور خلوص سے اپنی راہ طے کر رہے تھے اور یہ اخلاقی

جوہر مظلومون کی برادری میں اکثر پیدا ہوجاتے ہیں، لیکن دولت اگر، اُن کے بجائے ان میں اختلاف، تفرق اور حرص وطمع اور ذاتی اغراض کے جذبات پیدا کردیتی ہے، اس اتفاقی دولت، اور غیر متوقع فتح وغلبہ نے صحابۂ کرام کے لئے امتحان کا وہی نازک موقع پیش کردیا، اور دنیا کے سب سے بڑے رہنما کی قوتِ رہنمائی کے اظہار کا بھی یہی موقع تھا، چنانچہ اس وقت مالِ غنیمت زرِ فدیہ اور قیدیون کے ساتھ برتاؤ کے متعلق غالبؒ نا تحہ مسلمانون مین اختلاف رائے رونما ہوگیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس وقت اہم ترین کام تھا، آپنے امرِ اوّل کی طرف توجہ فرمائی کہ مظلوم فاتح قوت پاکر اپنا جوہر نہ کھو بیٹھیں، چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے ان قیدیون کے قتل کی جو تجویز پیش کی تھی، آپنے رد فرمائی، اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تجویز کہ فدیہ لے کر اُن کو رہا کردیا جائے قبول فرمائی، اور اُن سے فرمایا کہ اے ابوبکر تمھاری مثال ابراہیمؑ اور عیسیٰؑ کی ہے، اور اے عمر تمھاری مثال نوحؑ اور موسیٰؑ کی ہے[1]، آپنے حضرت ابراہیمؑ کی نیک دلی، اور حضرت عیسیٰؑ کی رحم دلی کی مثال کی پیروی کی، اور بدر کے اُن قیدیون کی جان بخشی فرمائی، اور قتل کے بجائے زرِ فدیہ ادا کردینے پر رہائی کا حکم دیدیا، اور جو اُن مین نادار تھے، اُن کو چند مسلمان بچّون کو لکھنا پڑھنا سکھا دینے پر آزادی کا فرمان عطا کردیا، اور صحابہ کو تاکید کی کہ اُن کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کرین، چنانچہ بعضون کا یہ حال تھا کہ وہ خود کھجور پر قناعت کرتے تھے، اور اپنے قیدیون کو روٹی کھلاتے تھے،

لیکن وحیِ الٰہی کی نگاہ مین اس سے زیادہ اہم پہلو ان غریبون کا دفعۃً مالِ دولت کی حرص وطمع میں مبتلا ہوجانا تھا، چنانچہ یہی صورت پیش آئی، مالِ غنیمت کے فراہم کرنیوالون نے دعوی

---

[1] مستدرک حاکم ج ۲ ص ۲۱، کتاب المغازی حیدرآباد دکن ؛

کیا کہ اس پر ہم نے لڑائی میں قبضہ کیا ہے اس لئے ہمارا ہے، لڑنے والے نوجوانوں نے دعویٰ کیا کہ ہماری تلواروں سے فتح حاصل ہوئی ہے، اس لئے اس کے اصلی حقدار ہم ہیں، جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کر رہے تھے، وہ کہتے تھے کہ سب سے نازک اور خطرناک فرض ہمارا تھا، اس لئے ہم کو ملنا چاہیے[۱] یہی اختلاف زرِ فدیہ کی ملکیت کی نسبت بھی ہوا ہوگا، جیسا کہ سورۂ انفال کی ابتدائی آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے،

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ	(اے پیغمبر!) تجھ سے (تیرے ساتھی) غنیمت کا حکم
الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ	پوچھتے ہیں، تو کہدے کہ مالِ غنیمت اللہ کا ہے اور
اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ	رسول کا ہے تو اللہ سے ڈرو، اور آپس میں صلح کرو
رَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (انفال-۱)	اور اللہ اور اسکے رسول کے حکم کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو،

حضرت عبادہ بن صامتؓ سے پوچھا گیا کہ سورۂ انفال کے نزول کی کیا وجہ ہے تو کہا:

فِينَا اَصْحَابَ بَدْرٍ نَزَلَتْ حِينَ اخْتَلَفْنَا	یہ سورۂ ہم بدر والوں کے متعلق نازل ہوئی
فِي النَّفْلِ وَسَاءَتْ فِيهِ اَخْلَاقُنَا	جب مالِ غنیمت میں ہم نے باہم اختلاف کیا اور
فَنَزَعَهُ اللّٰهُ مِنْ اَيْدِينَا فَجَعَلَهُ	اس میں ہماری اخلاق برے ہوگئے، تو خدا نے اسکو
اللّٰهُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا، اور رسول اللہ صلی اللہ
فَقَسَمَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	علیہ وسلم کے اختیار میں دیدیا، تو آپ نے تمام مسلمانوں
بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ عَنْ سَوَاءٍ،[۲]	کے مابین برابر برابر تقسیم فرما دیا،

---

[۱] سیرت ابن ہشام، ذکر الفئ ببدر والاساریٰ ج ۱ ص ۳۹۱ مطبوعہ محمد علی، مصر، [۲] ایضاً،

یہی وہ تنبیہ ہے جو وحی الٰہی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فیصلہ پر کی اور آیت اتری،

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ	کسی پیغمبر کو زیبا نہین کہ اُس کے پاس قیدی
حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ۚ تُرِيدُونَ	ہون تاکہ زمین میں فساد کرے تم لوگ دنیا کا
عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۗ	سامان چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے
وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۚ لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ	اللہ غالب اور دانا ہے اگر خدا کی طرف سے یوں
اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ	ہونا مقدر نہ ہو چکا ہوتا تو تمہاری اس لینے
عَذَابٌ عَظِيمٌ ۚ فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ	پر تم کو بڑی سزا ملتی تو اب جو تم نے لوٹ میں
حَلَالًا طَيِّبًا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ	پایا، حلال و پاک کر کے کھاؤ اور اللہ کا
اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (انفال ۹)	ادب کرو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے

اسی قدر نہیں بلکہ اُن قیدیون کو جن سے زر فدیہ وصول ہوا یا وصول کیا جا رہا تھا، اس کے بعد ہی یہ تسلی دی گئی،

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِمَنْ فِي أَيْدِيكُمْ	اے پیغمبر! تمہارے ہاتھون میں جو قیدی
مِنَ الْأَسْرَىٰ إِنْ يَعْلَمِ اللَّهُ فِي	ہیں اُن سے کہدو کہ اگر اللہ تمہارے دلون
قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِمَّا	میں نیکی جانیگا تو تم کو اس سے بہتر چیز دیگا،
أُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ	جو تم سے لی گئی، اور تم کو معاف کریگا، اور
رَحِيمٌ۔ (انفال - ۱۰)	اور اللہ معاف کرنیوالا اور رحم کرنیوالا ہے

۱؎ سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۳۵۹،

بعضون کو یہ شبہہ ہوا ہے کہ یہ تنبیہ قیدیون کے زرِ فدیہ لے کر رہا کرنے اور قتل نہ کئے جانے پر ہوئی[1]
حالانکہ ظاہر ہے کہ جن قیدیوں سے زرِ فدیہ لئے جانے پر اللہ تعالیٰ نے اُن سے ہمدردی فرمائی اور
اگر وہ حسنِ نیت سے ظاہر کرین تو اُن کی مغفرت کا وعدہ اور اس دنیاوی خزف ریزہ سے جو
اُن سے بطور فدیہ لیا گیا، اُن کو بہتر دولت دیئے جانے کی امید دلائی، کیا اُن کا قتل زرِ فدیہ لینے سے
کم سزا ہوتی؟ اور جن سے فدیہ لیا گیا، اُن کے قتل کئے جانے پر اُن کے قاتلون پر اس سے زیادہ سرزنش
اور ان مقتولون سے اس سے زیادہ ہمدردی نہ کیجاتی،

بہرحال وہی مالِ غنیمت اور زرِ فدیہ جس کو اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف
صریح وحی آنے سے پیشتر قبول فرمالیا تھا، اور جس پر تنبیہ ہوئی، وہ آخر کار "اجتہادِ نبوی" کے مطابق
مناسب موقع پر جائز اور حلال وطیب ہی ٹھہرایا گیا، اور غلطی غلطی باقی نہین رہی، مالِ غنیمت لینے
کے متعلق كُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ کا حکم اسی وقت آگیا، اور فدیہ لینے کی اجازت اِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً
کے الفاظ میں بعد کو مناسب زمانہ مین آگئی، اور اس مال و دولت کی حرص وطمع سے اُس وقت جو
بداخلاقی پیدا ہونے والی تھی، اس کا ازالہ ہمیشہ کے لئے اس طرح کر دیا کہ اس کی تقسیم کا ابدی قانون
بنا دیا گیا، اور اس مین تمام ضروری مستحقین کے حصے لگا دیئے گئے،

تیسرا واقعہ تیسرا واقعہ یہ ہے کہ آپ غزوہ تبوک کے لئے جا رہے تھے جس مین بکثرت مسلمانون
کی شرکت کی ضرورت تھی کہ مقابلہ رومیون کی دل بادل فوج سے تھا، اور کسی منظم سلطنت سے ٹکر
کھانے کا یہ پہلا موقع مسلمانون کو پیش آیا تھا، اور موسم بھی نہایت گرم اور سخت تھا تیس ہزار

---

[1] مزید تفصیل کے لئے دیکھو سیرۃ النبی جلد اول میں غزوہ بدر کا بیان،

مسلمانون کی جمعیت روانہ ہو گئی، مگر کچھ مخلص مسلمان مجبوراً چھوٹ گئے، اور اکثر منافقین نے جان بوجھ کر اس کی شرکت سے جی چرایا، آپ واپس آئے، تو عدم شرکت کے قصوروار منافقین آآ کر جھوٹی جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنے عذرات بیان کرنے لگے، آپنے ان کا اعتبار کر کے رحم فرما کر اُن کے قصور سے درگذر کیا، اس پر تنبیہ ہوئی،

سَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُونَ أَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ أَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَتَعْلَمَ الْكَاذِبِينَ (توبہ - ۷)	وہ خدا کی قسمیں کھائین گے کہ اگر ہم مقدور رکھتے تو ضرور تمہاری ساتھ نکلتے، وہ اپنی جانون کو برباد کرتے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں، اللہ تجھکو بخشے تو نے اُن کو رخصت کیون دی، جبتک تجھ پر وہ کھُل نہ جاتے، جو اُن میں سچ بولے، اور

ظاہر ہے کہ آپ علم غیب سے آگاہ نہ تھے، اور اُن کے واقعی حالات سے بے خبر تھے اس لئے بظاہر اُن کے قول پر اعتبار ہی کرنا تھا، اور وہی آپنے کیا، مگر علام الغیوب نے حقیقت حال سے باخبر فرما کر اُن کے جھوٹ کا پردہ چاک کیا، بہرحال یہان بھی منشاے خطا اگر خطا سمجھی جاے تو وہی ترحم کی شان تھی،

چوتھا واقعہ | منافقین کی نسبت آپ کو اطلاع دیدی گئی تھی کہ اُن کے حق میں آپ کی دعاے مغفرت قبول نہ ہوگی، اور فرمادیا گیا تھا کہ

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ	تو اُن کی مغفرت کی دعا مانگے یا نہ مانگے اگر ستر دفعہ بھی اُن کی مغفرت کی دعا مانگے تو ہرگز اُن کو

لَهُمْ، ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ کَفَرُوْا بِاللّٰہِ وَ	خدا نہ بخشے گا، یہ اس لئے کہ انھوں نے خدا
رَسُوْلِہٖ، (توبہ - ۱۰)	کا اور اس کے رسول کا انکار کیا،

اس حکم کے آنے کے بعد عبد اللہ بن ابی بن سلول کا انتقال ہوا، یہ منافقوں کا سردار تھا اس کا لڑکا مخلص مسلمان تھا، اس نے آکر آپ سے نمازِ جنازہ پڑھانے کی درخواست کی جس کو آپ نے بطرِ کرم سے رد نہ فرما سکے، حضرت عمرؓ نے عرض بھی کی کہ یا رسول اللہ! اس کے عدم مغفرت کے متعلق تو حکم ہو چکا ہے، فرمایا میں ستر دفعہ سے بھی زیادہ اس کی مغفرت کی دعا مانگوں گا، بہرحال آیت میں گو آپ کے مغفرت مانگنے اور نہ مانگنے دونوں کو بیکار و بے سود بتایا گیا تھا، مگر اُن کے حق میں دعائے مغفرت مانگنے کی کوئی ممانعت نہ تھی، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت شفقت سے اس بیکار فرض کو انجام دیا تاکہ اس کے مخلص مسلمان فرزند کی دل شکنی نہ ہو، اور اس سے تغافل فرمایا کہ ایک مسلمان کی دلجوئی تو ہوگی، مگر بیسیوں منافقین کو اپنے چھپانے میں کامیابی ہو جائیگی، اور وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر فتنوں کا باعث بنیں گے، اس لئے حکم ہوا،

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ	اور نہ کبھی اُن میں سے کسی کے جنازہ کی نماز
اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِہٖ اِنَّهُمْ	پڑھ، اور نہ اس کی قبر پر کھڑا ہو، بیشک
کَفَرُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ	انھوں نے خدا اور اس کے رسول کا انکار
فٰسِقُوْنَ، (توبہ - ۱۱)	کیا اور اسی گنہگاری کی حالت میں مرے،

پانچواں واقعہ اس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعض بیویوں کی خوشنودی اور رضامندی کے لئے کسی مباح چیز کو، جو آپ کو بہت مرغوب تھی، اپنے اوپر حرام کر لیا تھا، یعنی

اس کے کبھی نہ استعمال کرنے کا عہد فرا لیا تھا، ظاہر ہے کہ ہر شخص پر مُباح چیز کا کھانا فرض نہین،
اس کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی خوشی سے یا کسی دوسرے کی رضامندی کے لئے اُس کے نہ کھانے
کا عہد کرلے، اس لئے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض بیویون کی خاطر جن کو وہ شے پسند نہ تھی،
اس کو اپنے اوپر حرام کرلیا، تو ظاہر ہے کہ آپ کا اپنی بعض بیویوں کی خاطرداری کے لئے ایسا کرنا
الزام کے قابل نہین کہ آپ نے بحثیت شوہر کے اُن کی اتنی دلجوئی کو بھی عورتون کے ساتھ عدل
و انصاف کے مناسب سمجھا، مگر اس مسئلہ کی ایک دوسری حیثیت بھی تھی، اور وہ یہ کہ بحثیت
ایک پیغمبر کے ایک حلال و جائز چیز کو اپنے اوپر حرام کرلیا اور اُس کے نہ کھانے کا عہد کرنے سے
آپ کی اقتدا میں اُمت کے عام افراد بھی اس کو نا جائز نہیں تو ناپسند ضرور ہی کرتے، اور یہ ایک
طرح سے شریعتِ الٰہی میں تبدیل و تحریف کا مرادف ہو جاتا، اس لئے حکم آیا کہ ان امور میں
پیغمبر کو کسی کی دلجوئی اور خاطرداری کی پروا نہ چاہئے، فرمایا،

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ	اے پیغمبر! جس کو اللہ نے تیرے لئے حلال کیا ہے
اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ	اُس کو حرام کیون کرتا ہے؟ اپنی بیویون کی
وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (تحریم-۱)	مرضی چاہتا ہے؟ اور خدا بخشنے والا مہربان ہے،

اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا آپ کو نبی کہکر خطاب کرنا یہ واضح کرتا ہے کہ بحثیت ایک
انسان اور شوہر ہونے کے آپ ایسا کر سکتے تھے، مگر پیغمبر کی حیثیت سے آپ کو یہ اختیار نہیں
الغرض یہی وہ پانچ واقعے ہیں جن میں آپ کی اجتہادی خطا ثابت کی گئی ہے، مگر تفصیلات
سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اُن کو خطا کہنا درحقیقت مجاز ہے کہ پیغمبر کی بلندی اور معصومی کو پیش نظر رکھکر

اُس کو اُس مجازی خطا کی بھی اجازت نہین. اور اسی وحی الٰہی نے اُن میں سے ہر موقع پر تنبیہ کی، اور اپنے صحیح فیصلہ سے رہنمائی فرمائی، اب کیا کسی کا شبہہ یہ بھی ہے کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معمولی مسامحات پیش آئے جن کی تنبیہ و اصلاح ہر وقت وحی الٰہی نے کی، ایسے ہی ممکن ہے کہ آپ کو اور بھی ایسے مسامحات پیش آئے ہون، جن کی تنبیہ و تصحیح کی حکمتِ الٰہی نے پروا نہ کی، اور خاموشی برتی، اگر کسی کو یہ شبہہ ہے تو درحقیقت رسالت و نبوّت کی مرتبہ شناسی اور دینِ الٰہی و شریعتِ ربانی کی حقانیت اور اللہ تعالیٰ کے طرقِ رشد و ہدایت کی معرفت سے کوسون دور ہے رسولون کی بعثت اس لئے ہے کہ وہ غلط کار انسانون کو اُن کی غلطی سے نکال کر حق و صواب کی تعلیم دین، نہ اس لئے کہ اُن کے ذریعہ اُلٹے ہدایت کے بجائے مزید ضلالت کا اضافہ ہو استغفر اللہ ثم استغفر اللہ، اس لئے ناممکن ہے کہ رسولون کے ہاتھون اور زبانون سے کوئی ایسا کام صادر ہو، جو حکمتِ الٰہی کے مطابق نہ ہو، اور پھر وہ اس کی تصحیح اور رہنمائی سے تغافل برتے، اور انسانون کو اپنے رسولون کے ذریعہ گمراہ ہونے دے۔

پیغمبرانہ اجتہاد ورائے علم کا وہ کوثر ہے جس کی دھارین دماغ سے نہیں، بلکہ دل کے سرچشمہ سے بہتی ہیں، جو انسانی رائے و تجربہ سے نہیں، بلکہ الہامِ الٰہی، القاءِ ربانی، حکمتِ یزدانی فہم رسالت ملکۂ نبوت سے ماخوذ ہے، اور جس کی نسبت محرم اسرار شریعت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ برسرِ منبر فرماتے ہین،

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ الرَّأْيَ إِنَّمَا كَانَ	اے لوگو! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے غلطی سے
مِنْ رَسُولِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُصِيبًا لِأَنَّ	پاک تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو وہ رائے دکھاتا تھا

اللّٰہ کان یریہ وانما ھو منّا	اور ہماری راے ہمارا گمان، اور
الظن والتکلف (ابوداؤد کتاب الاقضیہ)	از خود کرنا ہے،

وہ راے نبویؐ، جو خدا کے بتانے اور دکھانے سے قائم ہوئی ہو، ظاہر ہے کہ بمنزلہ وحی کے ہے، اور اس کا نام بشری اجتہاد اور انسانی راے نہیں، بلکہ نبوی اجتہاد اور پیغمبرانہ راے ہے جو عملاً وحیِ الٰہی کی ہم مرتبہ اور کلامِ ربانی کی ہم پایہ ہے حضرت عمرؓ نے اس خطبہ میں جو کچھ کہا ہے درحقیقت وہ خود کلام پاک سے مستنبط ہے، قرآنِ پاک میں ہے،

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ		ہم نے تجھ پر کتاب سچائی کے ساتھ اتاری،
لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰکَ اللّٰہُ		تاکہ لوگون کے درمیان جو اللہ تجھکو سوجھائے،
وَلَا تَکُنْ لِّلْخَآئِنِیْنَ خَصِیْمًا (نساء ۱۶)		فیصلہ کرے اور تو نہ ہو دغابازوں کی طرف

اس سے ظاہر ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو دکھایا، سوجھایا، اور راے پیدا کرائی جاتی تھی وہ خدا کی طرف سے ہوتی تھی، یہی پیغمبرانہ راے ہے جس کی نسبت خود آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا،

انا اقضی بینکم برائی فیما لم		مین تم لوگون کے درمیان اس مسئلہ میں
ینزل علیّ (ابوداؤد، اقضیہ)		جس کی نسبت مجھ پر وحی نہیں ہوئی ہے،

یہ فیصلہ اگر غلط ہوتا، تو فوراً وحیِ الٰہی دست گیری کرتی، اور صحیح راستہ پر لے آتی، جیسا کہ گذشتہ پانچون واقعات سے ظاہر ہے،

ایک غلط استدلال اس آیتِ پاک سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مقدمات کے فیصلون میں آپ کو ارادتِ الٰہی ہوتی تھی یعنی خدا کی طرف سے آپ کو راے سوجھائی جاتی تھی، اور ظاہر ہے کہ

ارادتِ الٰہی (خدا کی طرف سے سمجھایا جاتا) تاکہ آپ کتابِ الٰہی کے مطابق فیصلہ کریں غلط نہیں ہو سکتی لیکن ابوداؤد وغیرہ میں ایک حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ مقدمہ کو فرمایا:

"میں ایک بشر ہوں، تم لوگ میرے پاس اپنے جھگڑے لے کر آتے ہو اور شاید تم میں سے بعض زیادہ زبان آور ہوں جو اپنی دلیل کو خوبی سے بیان کر سکتے ہوں، تو میں جیسا سنتا ہوں ویسا فیصلہ کر دیتا ہوں، تو میں اگر کسی کو وہ حق دلا دوں جو اس کا نہیں، بلکہ اس کے بھائی کا ہے تو وہ نہ لے کہ میں اس کو آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔ (کتاب الاقضیہ)

اس سے ایک غلط فہم یہ استدلال کر سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے ہمیشہ غلطی سے پاک نہیں ہوتے تھے، اس لئے اُمت آپ کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی پر مجبور نہیں لیکن ایسا خیال کرنا سراسر مغالطہ ہے، اصل یہ ہے کہ مقدمات میں دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک واقعہ کی اصلی روداد جس کو ہر مدعی اور مدعا علیہ اپنے دعوٰی کے مطابق بنا کر اپنے اپنے رنگ میں بیان کرتا ہے اس کے بعد دوسری چیز اس بیان کردہ روداد کے مطابق صحیح اور عادلانہ حکم اور فیصلہ کی جہت تمام تر مقدمہ کی اُس روداد پر مبنی ہوتا ہے، جو حاکم و قاضی کے سامنے بیانات اور شہادتوں کے ساتھ پیش ہوتی ہے، یہ بات کہ واقعہ کی اصلی روداد کیا ہے، اور اُن میں سے کون صحیح کہہ رہا ہے علمِ غیب سے تعلق رکھتی ہے جس کا دعوٰی کسی نبی کو نہیں، اور اگر ہو بھی تو یہ دعوٰی بجائے خود مسلّم ہے کہ قاضی کا ذاتی علم دو انسانوں کے درمیان فیصلہ کا مبنٰی نہیں قرار پا سکتا، اس کے لئے فریقین کے بیانات شہادتیں، اور دلائل ہی بکار آمد ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امرِ اوّل کے متعلق عموماً آپ کو غیب کا علم عطا نہیں ہوا، لیکن دوسری چیز یعنی جس روداد کو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح باور کیا، اُس کے مطابق آپ کا فیصلہ کبھی کبھی صحیح وصواب اور عادلانہ نہیں ہوتا تھا، یہ کہنا رسول ونبی کی شان کی توہین وتحقیر ہے، اور اُس ارادت الٰہی کے خلاف ہے جس کا شرف مقدمات کے فیصلہ مین آپ کو بخشا جاتا تھا، اس لئے جو غلطی فیصلون میں آپ سے ہوسکتی تھی، وہ فریقین مین سے کسی ایک کی دلیل وشہادت کو سُن کر اُس کے صحیح یا غلط مطابق واقعہ یا مخالف واقعہ سمجھنے مین لیکن جس کو آپ نے صحیح باور فرمالیا اس کے مطابق مناسب وصحیح حکم وفیصلہ کرنے مین آپ سے کبھی غلطی نہ ہوئی، اور نہ ہوسکتی تھی، اور اُمت آپ کی پیروی آپ کے اُن قضایا وفیصلون میں کرتی ہے، نہ کہ نزاعِ مذکور کے گذشتہ واقعات اور گذشتہ مقدمات کے صحیح یا غلط باور کرنے میں فَتَّتَانِ بَیْنَہُمَا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعلان مین یہ نکتہ ہے کہ شاید فریقین میں سے کوئی غلط بیان یا برسرِ باطل جو اپنے مقدمہ کی روداد زیادہ خوبی سے بنا کر آپ کی عدالت سے موافق فیصلہ حاصل کرلے، یہ سمجھے کہ گو حقیقت میں میرا حق نہ تھا لیکن جب عدالتِ نبوی نے میرے حق مین فیصلہ کردیا تو میری ملکیت ثابت ہوگئی، اور غصبِ حق کے گناہ سے برأت ہوگئی تو اُس کا ایسا سمجھنا صحیح نہ ہوگا، گو قانوناً حکم نافذ ہو جائے گا، مگر عنداللہ جو برسرِ حق تھا وہ حق ہی پہ رہے گا، اور جو برسرِ باطل تھا، باطل ہی رہے گا، اور جو اصل مالک تھا، وہی مالک رہیگا، اور جو غاصب ہے وہ غاصب ہی ٹھہریگا

اسی اعلان کا اثر تھا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقدمہ میں فریقین کو اس حقیقت سے مطلع فرمایا تو دونون رو پڑے اور دونون ایک دوسرے کے حق مین دست بردار ہونے پر آمادہ ہوگئے[۱]

---

[۱] ابوداؤد کتاب الاقضیہ،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روداد مقدمہ کو سامنے رکھ کر جو فیصلے فرماتے تھے، وہ تمام تر حق، منصفانہ اور صحیح ہوتے تھے، اور اُن کی اطاعت سے انحراف، کفر و نفاق تھا، اسی لئے ارشاد ہوا کہ

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى	سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہونگے
يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا	جب تک وہ تجھ کو حکم نہ مانیں، پھر اپنے دل
يَجِدُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا	میں تیرے فیصلہ سے تنگی نہ پاویں، اور مانکر
قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (نساء)	قبول کریں،
وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ	اور کسی ایماندار مرد یا عورت کا یہ کام
اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ	نہیں کہ جب خدا اور اس کا رسول کسی بات
يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ	کا فیصلہ کردے تو بھی اس کو اپنے کام کا
وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ	اختیار رہے، اور جو خدا اور اس کے رسول
ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا، (احزاب)	کے بے حکم چلا وہ صریح گمراہ ہوا،

کیا اُمت کو رسول کی اطاعت اور اس کے فیصلہ کے بچون و چرا قبول کر لینے کا خدا کی طرف سے تاکیدی حکم، بر سر باطل پہلو پر ہو سکتا ہے؟ چنانچہ دوسری آیت میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ آپ کا کوئی فیصلہ کبھی ظالمانہ اور غلط نہیں ہو سکتا،

وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	اور جب وہ اللہ اور اُس کے رسول کی طرف بلائے
لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ	جائیں تاکہ رسول اُن کے درمیان فیصلہ کردے

مُعْرِضُوْنَ، وَاِنْ یَّکُنْ لَّھُمُ الْحَقُّ	تو اُن میں کا ایک گروہ منہ پھیر لیتے ہیں، اور اگر
یَاْتُوْا اِلَیْہِ مُذْعِنِیْنَ اَفِیْ قُلُوْبِھِمْ	اُن کو کوئی حق پہنچتا ہو تو قبول کر کے چلے آئیں،
مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْا اَمْ یَخَافُوْنَ اَنْ	کیا اُن کے دلوں میں روگ ہے یا وہ ڈرتے
یَّحِیْفَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ وَرَسُوْلُہٗ بَلْ	ہیں کہ خدا اور اُس کا رسول اُن کے ساتھ
اُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (نور)	بے انصافی کریگا بلکہ وہی بے انصاف ہیں،

عقل بشری | اس میں بھی شک نہیں کہ وحی اور ملکۂ نبوت کے علاوہ نبی میں نبوت و رسالت کے فرائض سے باہر کی چیزوں میں وہی عقل ہوتی ہے، جو عام انسانوں کی ہوتی ہے، اور جس میں اجتہادی غلطی کا ہر وقت امکان ہے، شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک اجتہاد کی یہی وہ دوسری قسم ہے، جس میں نبی سے بھی غلطی ہوسکتی ہے کہ اُس کا مدار وحی و الہام اور ملکۂ نبوت پر نہیں، بلکہ انسانی علم و تجربہ پر ہوتا ہے، اور یہی وہ قسم ہے جس کا اتباع پیروؤں پر واجب نہیں، اور اس کی بہترین مثال کھجور کی کاشت کا واقعہ ہے،

صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ کے بعض باغوں میں گذرے تو دیکھا کہ کچھ لوگ کھجوروں کے درختوں پر چڑھ کر کچھ کر رہے ہیں، آپنے دریافت فرمایا کہ یہ کیا کر رہے ہیں، ایک ہمراہی نے کہا کہ یہ مادہ کھجوروں میں نر کھجوروں کے پھول ڈالتے ہیں کہ پھل زیادہ آئیں فرمایا میں تو نہیں سمجھتا کہ اس سے کچھ فائدہ ہوگا؟ ایک روایت میں ہے کہ آپنے فرمایا کہ اگر ایسا نہ کرتے تو بہتر ہوتا، اُس نے جاکر باغ والوں سے آپ کا یہ فقرہ بیان کر دیا، صحابہ نے جو سرتاپا اطاعت تھے اس پر عمل کیا، اور ایسا کرنا چھوڑ دیا، پھل اس سال کم آئے، یا کم ٹھہرے، آپ کا پھر گذر ہوا تو اُن

لوگون نے صورتِ حال عرض کی، آپنے فرمایا میں نے تو یونہی ایک بات سمجھ سے کہدی تھی، اگر اُن کو اس عمل سے فائدہ ہوتا ہے تو کرین، پھر فرمایا،

انما انا بشر اذا امرتکم بشیٔ	میں تو ایک آدمی ہی ہوں جب تمہارے دین
دینکم فخذوا بہ واذا امرتکم	کا کوئی حکم دون تو اس کو قبول کرو اور جب
بشیٔ من رائی فانما انا بشر،	اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں ایک آدمی ہون،

ایک روایت مین یہ الفاظ ہین،

انتم اعلم بامر دنیاکم،	تم اپنے دنیا کے کام کو زیادہ جانتے ہو،

تیسری روایت کے یہ الفاظ ہین[۱]:

انما ظننت ظنا فلا تاخذونی	میں نے ایک گمان سا کیا تھا گمان پر
بالظن ولکن اذا حدثتکم عن اللہ	مجھکو نہ پکڑو، ہان جب خدا کی طرف سے
شیئا فخذوا بہ فانی لن اکذب علی اللہ	کوئی بات کہون تو اس کو لو کہ میں خدا

ان تینون روایتون مین آپنے اپنے اس ارشاد کو ظن (گمان) رائے، اور امر دنیا سے تعبیر فرمایا ہے، اس سے یہ کلیہ سمجھ میں آتا ہے کہ امور دین و شریعت میں آپ کا ہر حکم واجب اور منجانب اللہ ہے لیکن کھیتی باڑی، علاج و معالجہ وغیرہ خالص دنیاوی امور مین اگر آپنے کچھ کہا ہے تو اس کی حیثیت فقط مشورہ اور رائے کی ہے، یہی سبب ہے کہ صحابہ کرام جن باتون مین اپنا مشورہ

---

[۱] یہ تینون روایتین صحیح مسلم باب وجوب امتثال ما قالہ شرعًا دون ما ذکرہ صلی اللہ علیہ وسلم من معائش الدنیا علی سبیل الرای، ج ۲ صفحہ ۳۰۵ مصر میں ہیں،

آپ کو دینا چاہتے تھے، پوچھ لیتے تھے کہ یا رسول اللہ! یہ وحی سے ہے، یا رائے ہے، آپ جب فرما دیتے تھے کہ رائے سے ہے، تو وہ اپنا مشورہ پیش کرتے، اور آپ پسند فرماتے، تو قبول فرماتے، غزوۂ بدر میں آپ نے ایک مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہا، ایک صحابی نے آکر عرض کی یا رسول اللہ! اس مقام کا انتخاب وحی سے ہے یا رائے سے ہے؟ فرمایا محض رائے ہے، تو عرض کی کہ جنگی نقطہ نظر سے یہ مقام بہتر نہیں، فلاں مقام بہتر ہے، آپنے اُن کی رائے پسند کی، اور اس پر عمل فرمایا، اسی طرح صلح وجنگ اور حکومت کے دوسرے معاملات میں بھی صحابہؓ سے مشورہ لیا، اور عمل فرمایا ہے اور اسی میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (ترجمہ) یعنی امورِ حکومت یا عام امور میں صحابہ سے مشورہ لے لو، کا حکم خدا کی طرف سے ہے، چنانچہ غزوۂ احزاب میں خندق کھودنے میں سلمان فارسیؓ کی رائے پر عمل کیا، لیکن امورِ جنگ وسیاست میں بھی جس بات کا حکم عقل بشری سے نہیں، بلکہ وحی الٰہی یا فہم نبوتؐ سے ہوا تھا، اُس میں آپنے نہ کسی سے مشورہ لیا، اور نہ کسی کے مشورے کو قبول فرمایا، صلحِ حدیبیہ کے شرائط اور دفعات جو سراسر مصلحتِ الٰہی اور حکمت ربانی پر مبنی تھے اُن کے بدلنے پر حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ نے کیا کیا زور نہیں لگایا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ التفات نہ فرمایا، اور آخر مستقبل نے بتا دیا کہ فہم نبوت سراسر صحیح تھی، اسی طرح غزوۂ احد جیسے نازک موقع پر عبداللہ بن اُبی کا تین سو آدمیوں کے ساتھ پھر جانا گوارا کیا، مگر مدینہ سے باہر جا کر صف آرا ہونے سے باز نہ آئے اور پھر مستقبل نے مصلحتِ الٰہی کے راز کو فاش کیا:

ایک ادنیٰ سا تأمل عقلی حیثیت سے بھی یہ راز بتا دے گا کہ دنیا میں ہر صاحب فن کی ایک نہیں دو عقلیں ہوتی ہیں، ایک اُس فن کے متعلق جس کی استعداد اُس کے اندر رکھی جاتی ہے

اور پھر تعلیم وتربیت، مشق اور کثرتِ عمل سے وہ اتنی بلند اور پختہ ہو جاتی ہے کہ وہ اس فن کے بڑے بڑے عمیق اور مشکل دقائق کو ایک نظر میں معلوم کر لیتی ہے، اور اس کے لانخل عقدون کو اشارون مین حل کر دیتی ہے لیکن اس دائرہ کے باہر اس کی دوسری عقل عام انسانون ہی کی طرح معمولی ہوتی ہے، ایک شخص جو فنِ تعمیر کی مہارت اور ہندسہ اور انجنیرنگ کی صناعی میں غیر معمولی عقل و ذہانت رکھتا ہے، بالکل ممکن ہے کہ کھجور کی کاشت مین اس کی عقل معمولی انسانون سے بھی کم درجہ ہو، ایک فلسفی جو اپنے زورِ فکر سے افلاطون و ارسطو کی غلطیان نکالتا ہو وہ تعمیر کے فن مین ایک معمولی مزدور سے بھی زیادہ کم عقل ہو، یہ روزمرہ کی پیش آنے والی مثالین ہین، اسی طرح وہ برگزیدہ انسان، جو روحانیات کے اسرار، معرفتِ ربانی کے حقائق، تزکیۂ نفس کے رموز، اخلاق و معاشرت کے آداب اور حقوق و شریعت کے مسائل میں دقیقہ رس فہم اور نکتہ دان عقل رکھتا ہو، اس کو تعمیر و کاشتکاری کے مسائل مین محض معمولی درک ہو، بلکہ بالکل نہ ہو،

اسی طرح انبیاء علیہم السلام امورِ دین و شریعت مین وحی اور ملکۂ نبوت سے جو کچھ فرماتے ہین وہ عین مصلحت ہین حکمت، خطا اور غلطی سے سراپا مبرا اور پاک ہوتا ہے لیکن دوسرے امور مثلاً پہننے اوڑھنے، کھانے پینے رہنے سہنے، سلطنت و سیاست، نظم و نسق، صلح و جنگ، سامان و اسلحہ، مرکب و سواری، صنعت و حرفت، طب و علاج وغیرہ دنیاوی امور کی نسبت کلی مصلحتین بتا کر جزئیات کی تفصیل سے انھون نے احتراز فرمایا۔ اور کسی قطعی فیصلہ کا مسلمانون کو پابند نہین کیا، پہننے اوڑھنے کے متعلق صرف تین باتین فرمائین، پہلی یہ کہ وہ لباس، اور طرزِ لباس نہ اختیار کیا جائے جس سے سترِ عورت نہ ہو، دوسری یہ کہ مرد، وہ لباس اختیار نہ کرین، جو عورتون

کے لئے زیبا ہے نہ عورتین وہ لباس اختیار کرین جو مردون کے لئے مناسب ہی، تیسری بات یہ ہے کہ وہ لباس پسندیدہ نہین جس سے غرور و نخوت نمایان ہو، کھانے پینے میں چند حرام چیزون کے سوا کسی کی ممانعت نہیں، نظم و نسق اور نظام حکومت و سلطنت میں چند کلی اصول تعلیم فرمائے، شہنشاہانہ اور جابرانہ حکومت نہ ہو، لوگون میں مساوات ہو، اور اہم امور میں اہلِ حلّ و عقد کا باہمی مشورہ ہو، وعلیٰ ہذا القیاس،

الغرض یہی وہ امور ہیں جن مین زمانہ اور تمدّن کی ترقی کے ساتھ ساتھ تغیر و انقلاب ہوتا ہے، اس لئے اُن کو ہمیشہ کے لئے محدود کر دینا مصلحتِ الٰہی کے خلاف تھا،

ملکۂ نبوت یا عقل نبوت کا شرعی ثبوت

گذشتہ مباحث سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ نبی مین علم و فہم کے تین ذریعے ہیں، وحی ملکۂ نبوّت، اور عام عقلِ بشری، ان میں سے اول و آخر کے ثبوت کے لئے اب کسی استدلال کی ضرورت نہین کہ اول تو یہ مسلمات سے ہیں، اور دوسرے اوپر کی تشریحات مین مستقل طور سے اُن پر بحثیں ہو چکی ہین، لیکن اب تک ہم نے دوسری چیز یعنی ملکۂ نبوت کے لئے کوئی شرعی دلیل پیش نہیں کی ہے، اس سلسلہ مین سب سے پہلی بات یہ کہنی ہے کہ جن علماء نے اس کی حقیقت ظاہر کی ہے، انھون نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کے لئے الگ الگ اصطلاحین قائم کی ہین، مگر مفہوم و معنی کے لحاظ سے وہ دراصل ایک ہیں، سلف صالحین میں سے بعض نے اسکو القاء فی الروع (دل میں ڈالنا) نبی کی حکمتِ قلبیہ، توفیق ازلی، اور قوتِ تبیین سے تعبیر کیا ہے[1]، امام غزالی و امام رازی، اور دوسرے متکلمین نے اُس کو ملکۂ نبوّت سے ادا

[1] یہ تمام الفاظ امام شافعی کی کتاب الرسالہ میں مذکور ہیں،

کیا ہے، شاہ ولی اللہ صاحب اور علماے اصول نے اُس کو "پیغمبرانہ قوتِ اجتہاد" کہا ہے اور صوفیہ
کی عام پسند اصطلاح میں اُس کو علمِ لَدُنّی کہا جاتا ہے مگر ان سب کے معنی تقریبًا ایک ہی ہیں، یعنی
نبی کے اندر کی وہ پیغمبرانہ عقلی قوت جو بشری عقل سے فوق ہے، اور جس کے ذریعہ سے وہ وحی
کی تشریح، اسرارِ شریعت کا بیان، اور دقائقِ حکمت کی اپنی زبان سے توضیح کرتا ہے،

انبیاے کرام کے اُن ربّانی انعامات کی فہرست پڑھیے، جن کا تذکرہ قرآن نے جا بجا کیا ہے
تو وحی کی مخصوص نعمت کے بعد فہرست میں جو چیز نظر آئے گی، وہ "علم نبوت" ہے جس کو کہیں
ذکر (یادداشت) کہیں حکم (حق و باطل میں تمیز کا ملکہ) کہیں حکمت (دانائی) کہیں شرحِ صدر (سینہ
کا کھول دینا) کہیں تفہیم (سوجھ بوجھ دینا) کہیں تعلیم (سکھا دینا) کہیں اراءت (دکھا دینا) ہنو جھا
دینا) کہا گیا ہے، ان سب مختلف الفاظ کا مفہوم وحی سے نیچے، اور عقلِ بشری سے اوپر عقلِ
نبوی کے سوی اور کیا ہے؟ اُن سے مراد وحی نہیں اسلیے نہیں کہ اُن کا ذکر وحی سے الگ ہوتا ہے اور عقلِ بشری اسلیے نہیں کہ
عقلِ بشری خاص نبی پر کوئی انعام نہیں کہ یہ نعمت تو ہر انسان کو کچھ نہ کچھ ملی ہے، اس بنا پر اس سے مراد
عقلِ نبوی اور حکمتِ نبوی کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا،

حکمت | انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالی کی طرف سے جو نعمتیں عطا ہوتی ہیں، اُن میں ایک خاص
نعمت کا ذکر قرآن پاک میں بار بار آتا ہے، اور وہ حکمت ہے آلِ ابراہیمؑ پر اللہ تعالی نے جو احسانات
کئے اُن کا ذکر وہ ان الفاظ میں فرماتا ہے،

۱۔ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا (نساء)	تو بے شبہہ ہم نے ابراہیم کی اولاد کو کتاب اور حکمت دی، اور اُن کو بڑی سلطنت بخشی،

حضرت لقمانؑ کی نسبت ہے،

۲- وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ (لقمانؔ)

۲- اور یقیناً ہم نے لقمان کو حکمت دی،

حضرت داؤدؑ کی شان مین ہے،

۳- وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ، (ص - ۲)

۳- اور ہم نے داؤد کی سلطنت مضبوط کی، اور اس کو حکمت اور قول فیصل عطا کیا،

۴- وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ. (بقرہ - ۳۳)

۴- اور داؤد نے جالوت کو مارا، اور خدا نے داؤد کو سلطنت اور حکمت بخشی اور جو چاہا اس میں سے کچھ سکھایا،

حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہین :-

۵- قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ (زخرف - ۶)

۵- مین تمھارے پاس حکمت لیکر آیا ہون تاکہ جن باتون میں تم باہم اختلاف رکھتے ہو کچھ باتیں اُن مین سے کھول دون،

خود اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ پر اپنا احسان جتاتا ہے، تو فرماتا ہے،

۶- وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ (مائدہ - ۱۵)

۶- اور (یاد کر) جب مین نے تجھ کو کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل کی تعلیم دی،

عام انبیاء کے متعلق ہے،

۷- وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ

۷- اور جب اللہ نے نبیوں سے وعدہ لیا کہ جو

لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّ حِکْمَۃٍ (آلِ عمران ۹) یعنی تم کو کوئی کتاب اور حکمت دوں،

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی یہ دعا مانگی،

۸- رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (بقرہ ۱۵)

۸- ہمارے پروردگار! اور ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیج، جو اُن کو تیری آیتیں سنائے اور کتاب و حکمت سکھائے اور اُن کو سنوارے بیشک تو غالب اور حکمت والا ہے،

اللہ تعالیٰ نے اُن کی یہ دعا قبول فرمائی،

۹- كَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ یَتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِنَا وَ یُزَكِّیْكُمْ وَ یُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ یُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (بقرہ ۱۸)

۹- جس طرح ہم نے تم میں تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا، جو تم کو ہماری آیتیں سناتا اور تم کو سنوارتا ہے، اور تم کو کتاب و حکمت سکھاتا ہے اور وہ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے،

اس دعائے ابراہیمی کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کا احسان اللہ تعالیٰ نے سورۂ آلِ عمران میں ہم پر جتایا ہے،

۱۰- لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ

۱۰- یقیناً اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ اُن میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا، جو اُن کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور اُن کو سنوارتا ہے اور اُن کو کتاب و حکمت

وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ، (اٰلِ عمران - ١٧)

اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے،

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہی احسان ان ہی الفاظ میں سورہ جمعہ میں دہرایا ہے،

١١- هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ، (جمعہ-١)

وہی اللہ جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو اُن کو اُس کی آیتیں سناتا ہے اور ان کو پاک وصاف کرتا ہے اور کتاب وحکمت سکھاتا ہے اور وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے،

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے اپنا یہ احسان ان پر ظاہر فرمایا ہے،

١٢- وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (نساء-١٧)

١٢- اور اگر خدا کا فضل وکرم تجھ پر نہ ہوتا تو ان میں سے ایک جماعت ارادہ کرچکی تھی کہ وہ تجھے گمراہ کردے اور وہ گمراہ نہیں کرتے لیکن اپنے آپ کو، اور تجھے کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے، خدا نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھ کو وہ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا، اور تجھ پر خدا کا بڑا فضل تھا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے،

۱۳- ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ (اسرائیل ؏)	یہ وہ ہے جو خدا نے حکمت کی باتون میں سے تم پر وحی کی ہے،

عام مسلمانون سے ارشاد ہے،

۱۴- وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ، (بقرہ؏ - ۲۹)	۱۴- اور اللہ کا جو احسان تم پر ہے، اور اُس نے تم پر جو کتاب اور حکمت اتاری، اُن کو یاد کرو، خدا تم کو اس سے سمجھاتا ہے،

خاص طور پر ازواجِ مطہرات کو خطاب ہے،

۱۵- وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِىْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ (احزاب؏)	۱۵- اور تمہارے گھرون میں اللہ کی جو آیتین اور حکمت کی جو باتین سُنائی جاتی ہیں اُن کو

یہ نعمت حسب استعداد عام مسلمانون کو بھی ملا کرتی ہے،

۱۶- يُؤْتِى الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِىَ خَيْرًا كَثِيْرًا، (بقرہ ۵ - ۳۷)	اور خدا جس کو چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے، اور جس کو حکمت بخشی گئی، اس کو بڑی دولت (بھلائی) دی گئی،

اسی کے ذریعہ تبلیغ ودعوت کا حکم بھی ہوتا ہے،

۱۷- اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ، (نحل ۱۶)	۱۷- اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف تو حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ سے بلا اور اُن سے عمدہ طریقہ سے مناظرہ کر،

ایک جگہ قیامت اور عبرت کے واقعات پر حکمت کا اطلاق ہوا ہے،

۱۸- وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْأَنۢبَآءِ مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ، (قمر-۱)	۱۸- اور ان کو اتنے احوال جتنے میں ڈانٹ ہو سکتی ہے، پہونچ چکے ہیں، موثر حکمت تو ان ڈر سنانے والے فائدہ نہیں پہنچا سکے،

اوپر کی سطروں میں وہ تمام آیتیں لکھدی گئی ہیں جن میں حکمت کا لفظ آیا ہے، ان میں کہیں "حکمت" کا لفظ تنہا آیا ہے، اور کہیں "کتاب" کے بعد آیا ہے، کتاب کے دو معنی قرآن میں ہیں، "ایک صحیفۂ ربانی"، اور یہ اکثر آیا ہے، اور دوسرے نوشتۂ الٰہی، اور علم الٰہی، جیسے لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ (اگر خدا کا نوشتہ، یا علم پہلے نہ ہوتا) مذکورۂ بالا آیتوں میں تو کتاب سے تو بے شبہہ آسمانی کتاب اور صحیفۂ ربانی، یا یوں کہو کہ وحی کتابی مراد ہے، جیسے تورات و قرآن وغیرہ، لیکن حکمت کا مفہوم ان آیتوں میں کیا ہے؟

حکمت کے لغوی معنی "دانائی کی بات اور کام" کے ہیں، مگر یہاں اس سے کیا مقصود ہے، اس تحقیق کے لئے ضرورت ہے کہ مستند اہل لغت اور ماہرین قرآن کے اقوال نقل کر کے تبصرہ کیا جائے، سب سے قدیم لغت نویس ابن درید المتوفی ۳۲۱ھ اپنی کتاب "جمہرۃ اللغۃ" میں حکمت کے حسب ذیل معنی لکھتا ہے،

فَكُلُّ كَلِمَةٍ وَعَظَتْكَ اوزجرتك اودعتك الى مكرمة اونهتك من قبيح فهي حكمة وحكم،	(جمہرۃ اللغۃ جلد ۲ ص ۱۸۲)	ہر وہ بات جو تجھ کو سمجھائے یا تجھ کو تنبیہ کرے، یا کسی اچھی خصلت کی طرف بلائے یا کسی بری چیز سے روکے، وہ حکمت اور حکم ہے،

لغت کا امام جوہری، اپنی صحاح اللغۃ میں لکھتا ہے،

الحکمۃ من العلم والحکیم العالم	حکمت یعنی علم، اور حکیم یعنی عالم، اور
وصاحب الحکمۃ والحکیم المتقن	حکمت والا، اور حکیم کاموں کو بخوبی
للامور، (جلد ۲ صفحہ ۲۷۶ مصر)	سے کرنے والا،

عربی لغت کی بسوط و مستند کتاب لسان العرب میں ہے،

والحکمۃ عبارۃ عن معرفۃ	اور حکمت بہترین چیز کو بہترین علم کے ذریعہ
افضل الاشیاء بافضل العلوم (ج ۱۵ صفحہ ۳۰ مصر)	سے جاننے کو کہتے ہیں،

لغاتِ قرآن کے مشہور امام راغب اصفہانی، مفردات القرآن میں کہتے ہیں،

والحکمۃ اصابۃ الحق بالعلم و	اور حکمت، علم اور عقل کے ذریعہ سے سچی
العقل فالحکمۃ من اللہ تعالیٰ معرفۃ	اور صحیح بات کو پہنچنا ہے، تو اللہ تعالیٰ
الاشیاء وایجادھا علیٰ غایۃ	کی حکمت، چیزوں کو جاننا، اور ان کو کمال
الاحکام ومن الانسان معرفۃ	خوبی پیدا کرنا ہے، اور انسان کی حکمت
الموجودات وفعل الخیرات (ص ۱۲۶ مصر)	موجودات کو جاننا اور اچھی باتوں کا کرنا ہے،

یہ تو عربی لغت کے اماموں کی تصریحات تھیں، اب اُن بزرگوں کے اقوال پر غور کرنا ہے، جو زبان دانی کے ساتھ قرآن اور شریعت کے استدلالات اور محاوروں سے بھی کامل طور سے آگاہ تھے، ابن حیان اندلسی نے اپنی تفسیر بحر المحیط میں اُن کے اکثر اقوال کو یکجا کر دیا ہے،[1]

---

[1] زیر آیت وابعث فیھم رسولاً منھم الآیۃ (ج ۱ ص ۳۹۳، مطبوعہ سعادت مصر،

۱- قال مالک و ابورزین :- الحکمة الفقه فی الدّین والفهمُ الّذی هُوَ سجیّة وَ نور مِنَ اللّٰه تعالیٰ،

۱- امام مالک اور ابو رزین کا قول ہے حکمت دین میں سمجھ اور اُس فہم کو کہتے ہیں جو ایک فطری ملکہ اور اللّٰہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور ہے؛

۲- وقال مجاهد: الحکمة فهمُ القرآنُ

۲- مجاہد کا قول ہے : حکمت یعنی قرآن کا فہم،

۳- وَقال مقاتل : العلم والعمَل به لایکون الرّجل حکیماً حتّٰی یجمعهما،

۳- مقاتل کا قول ہے : حکمت، علم اور اس کے مطابق عمل کو کہتے ہیں، کسی شخص کو حکیم اس وقت تک نہیں کہا جاتا، جب تک وہ علم اور عمل دونوں جمع نہ کرلے

۴- وقیل : الحکمة وَالقضاء.

۴- بعضوں کا قول ہے، حکمت فیصلہ کرنا ہے

۵- وقیل : مالم یعلم الا من جهة الرّسول،

۵- کسی کا قول ہے : حکمت وہ ہے، جو رسول کے سوا کسی اور ذریعہ سے معلوم نہ ہوسکے،

۶- وقال ابوجعفر محمّد بن یعقوب: کل صواب مِنَ القول ورث فِعلاً صحیحاً فهُوَ حکمة،

۶- ابوجعفر کا قول ہے : ہر وہ صحیح بات جو صحیح عمل پیدا کرے، حکمت ہے

۷- وقیل: وضع الاشیاء مواضعها

۷ کسی کا قول ہے کہ چیزوں کو اپنی اپنی جگہ پر رکھنا حکمت ہے؛

۸- وقیل : کل قول وجب فعله ،

۸- ایک اور شخص کا قول ہے : ہر وہ بات جس کا کرنا ضروری ہو حکمت ہے،

امام ابنِ جریر طبری نے اپنی تفسیر میں حسب ذیل اقوال لکھے ہیں :-

١- قَالَ (مالک): المعرفة بالدِّين والفقه في الدِّين والاتِّباع لَهُ،

٢- قَال ابن زيد: الحكمة الدِّين الَّذي لا يعرفونه إلّا به صلّى الله عليه وسلّم يُعلِّمهم إيّاها، قَال والحكمة العقل في الدِّين، وقرء: "وَمَن يُؤتَ الحِكمةَ فَقَد أُوتيَ خَيراً كَثيراً"، وقال لعيسى: "وَيُعَلِّمُهُ الكِتابَ وَالحِكمةَ وَالتَّوراةَ وَالإنجيلَ"، وقرأ ابن زيد: "وَاتلُ عَلَيهِم نَبَأَ الَّذي آتَيناهُ آياتِنا فَانسَلَخَ مِنها"، قال لم ينتفع بالآيات حين لم تكن معها حكمة، قال الحكمة شيء يجعله الله في القلب ينوّر له به،

٣- عن قتادة: والحكمة أي السُّنّة

١- مالک کا قول ہے: دین کی معرفت اور دین میں سمجھ، اور اُس کی پیروی حکمت ہے،

٢- ابن زید کا قول ہے حکمت دین کا وہ حصہ ہے، جو صرف رسول سے معلوم ہوتا ہے، وہی اس کو سکھاتا ہے، نیز اُن ہی کا قول ہے کہ حکمت دینی عقل کا نام ہے اور اس پر یہ آیت پڑھی کہ جس کو حکمت دی گئی اس کو بڑی دولت دی گئی، اور خدا نے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق کہا کہ خدا اُن کو کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل سکھاتا ہے" ابن زید نے یہ آیت بھی پڑھی کہ اُن کو اس کا حال سُنا، جس کو ہم نے اپنی آیتیں دیں تو وہ اُن سے الگ ہو گیا، یعنی اِن آیتوں سے نفع نہیں اٹھایا کیونکہ اُن کے ساتھ حکمت نہ تھی، انہی کا قول ہے کہ حکمت وہ چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ بندہ کے قلب میں رکھتا ہے اور اس سے اُس کو روشن کرتا ہے،

٣- قتادہ سے مروی ہے: حکمت یعنی سنت نبوی،

آخر میں امام طبری اپنا فیصلہ سناتے ہیں،

٤- قَالَ ابن جرير الطبري: والصواب

٤- ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ حکمت اُن

مِنَ القول عند نا فی الحکمۃ انہا	احکامِ الٰہی کے علم کا نام ہے جو صرف رسول کے
العلم باحکام اللہ التی لا یدرک	بیان (تشریح) سے معلوم ہوتے ہیں اور اُن کی
علمہا الا ببیان الرسول صلعم	اور جو اُن کی مثالیں اور نظیریں ہیں اُنکی معرفت
المعرفۃ بہا وما دلّ علیہ ذٰلک	کو کہتے ہیں اور "حکمت" کا لفظ میرے نزدیک
مِن نظائرہا وھو عندی مَاخوذ	حکم سے ماخوذ ہے جس کے معنی حق و باطل
مِنَ الحکم الذی بمعنی الفصلُ	میں تمیز کرنے کے ہیں،

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف کتاب الرسالہ میں قتادہ کے مسلک کو پسند کیا ہے لکھتے ہیں،

۵- وسمعت من ارضی مِنْ اہل	۵- میں نے قرآن کے اُن اہلِ علم سے جن کو
العلم بالقرآن، یقول: الحکمۃ	پسند کرتا ہوں، یہ سُنا کہ حکمت آنحضرت صلی اللہ
سنۃ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ص۳۲)	علیہ وسلم کی سُنّت کا نام ہے،

امام شافعی اسی کتاب میں آگے چل کر بعضوں کا قول نقل کرتے ہیں،

وَسُنّتہٗ الحکمۃ التی القی فی روعہ	اور آپ کی سنت وہ حکمت ہے جو آپ کے
عن اللہ عزوجل (صفحہ ۲۸)	دل میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی،

ائمۂ لغت اور علمائے قرآن کے اُن تمام اقوال پر ایک غائر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ یہ کل کے کل ایک ہی مفہوم کی مختلف تعبیریں، اور ایک ہی حقیقت کی متعدد تفسیریں ہیں حکمت عقل وفہم کی اُس کامل ترین حقیقت کا نام ہے جس سے صحیح وغلط، صواب وخطا، حق وباطل اور خیر وشر کے درمیان تمیز وفیصلہ، بذریعہ غور وفکر، دلیل وبرہان اور تجربہ واستقراء کے یقین، بلکہ

منکشفانہ طور سے ہو جاتا ہے، اور اسی کے مطابق اُس صاحبِ حکمت کا قول بھی ہوتا ہے،

ہر فن کے واقف کار دو قسم کے ہوتے ہین، ایک وہ جو کسی فن کو باقاعدہ حاصل کرتے ہین اسکی مشق کرتے اور اُس میں مہارت اور کمال بہم پہنچاتے ہیں، دوسرے وہ جو اُس فن کی فطری استعداد اور قابلیت رکھتے ہین اور تجربۂ و دلیل کے بغیر خود اپنی فطری صلاحیت صحیح وجدان، اور سلیم ذوق سے اس فن کی کسی شئے کو دیکھنے کے ساتھ ہی اُس کے متعلق جچی تلی رائے دیتے ہین یا اور حرف حرف صحیح دیتے ہین، اسی کا نام آپ صحتِ وجدان اور سلامتِ ذوق رکھتے ہین اشاعری انشاء پردازی، اور دوسرے فنونِ لطیفہ میں اُس کی مثالین بکثرت دیکھی اور سُنی جاتی ہین، اسی طرح بعض لوگون میں اشیاء کے حق و باطل، اور افعال کے خیر و شر کی تمیز کا صحیح وجدان اور صحیح ذوق ہوتا ہے، وہ ان امور کے دقیق سے دقیق مسئلہ کے متعلق اپنے ربانی ذوق و وجدان سے ایسی صحیح رائے دیتے ہیں، جو دوسرے لوگ وسیع مطالعہ اور غور و فکر کے بعد بھی نہیں دے سکتے، یہی وہ معرفت اور نورِ الٰہی ہے جو جد و جہد اور سعی و محنت سے نہین، بلکہ عطا و بخشش سے حاصل ہوتی ہے، اور اسی کا نام حکمت ہے،

دوسری ربانی استعدادون اور فطری بخششون کی طرح حکمت کا عطیہ بھی سب کو یکسان نہیں ملتا، بلکہ حسبِ استعداد معمولی حکمت سے لیکر اعلیٰ ترین اور کامل ترین حکمت تک لوگون کو عطا ہوتی ہے، اس کے مختلف درجے اور مرتبے عام انسانون کو مل سکتے ہیں اور ملتے ہیں، لیکن اُس کا اعلیٰ ترین اور کامل ترین درجہ اور مرتبہ صرف انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوتا ہے،

مگر یہ نکتہ یاد رکھنا چاہئے کہ جس طرح اس ربانی عطیہ، آسمانی فہم، دینی عقل اور نورانی قوت پر "حکمت" کا اطلاق ہوتا ہے، اسی طرح اس قوت (حکمت) کے آثار و نتائج اور اُس کی تعلیمات پر

بھی اُس کا اطلاق ہوتا ہے چنانچہ دوسری آیت جس میں حضرت لقمانؑ کو حکمت دیئے جانے کا بیان ہے اُس کے بعد اُس حکمتِ لقمانی کی حسب ذیل تعلیمات کا ذکر بھی آگیا ہے، اللہ کا شکر ادا کرنا شرک کی ممانعت، والدین کی خدمت، اچھوں کی پیروی، خدا کا ہمہ گیر علم، نماز کا حکم، صبر، فخر و غرور کی ممانعت، میانہ روی، آہستہ بولنا، اسی طرح تیرہوین آیت میں حکمتِ محمدی کی حسب ذیل تعلیمات کی تفصیل بھی کی گئی ہے، شرک کی ممانعت، والدین کے ساتھ احسان قرابتداروں، اور مسکینوں سے نیک سلوک، اسراف کی برائی، نرمی کی بات کرنا، میانہ روی، اولاد کے قتل کی مذمت، کسی کی جان نہ لینا، مقتول کا بدلہ لینا، یتیم کے ساتھ اچھا برتاؤ، عہد پورا کرنا، ناپ تول ٹھیک رکھنا، بے جانی چیز کی پیروی نہ کرنا، فخر و غرور کی مذمت، ان تمام باتوں کو بیان فرماکر اللہ کہتا ہے،

ذَالِکَ مِمَّآ اَوْحٰی اِلَیْکَ رَبُّکَ مِنَ الْحِکْمَۃِ (اسراء-۴)

یہ ہیں حکمت کی وہ بعض باتین جو خدا نے تجھ پر وحی کی ہیں،

حکمت کی ان بعض باتون کی تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکمت کے مظاہر اور نتائج کس قسم کی باتیں ہوتی ہیں، یہ عموماً وہی باتین ہوتی ہیں جن کی عالمگیر صداقت اور سچائی کو خود فطرت انسانی اور حسِ اخلاقی تسلیم کرتی ہے، یہی سبب ہے کہ تیسری اور چوتھی آیت میں حکمت کا اطلاق زبور پر، اور پانچویں اور چھٹی آیت میں انجیل پر ہوا ہے کہ ان میں اسی قسم کی دلآویز نصیحتون، اور عالمگیر صداقتون کی تعلیم ہے، اور خود قرآنِ پاک نے بھی اپنی صفت "حکمت والا قرآن" ظاہر کی ہے، تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْحَکِیْمِ (لقمان و یونس)، وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ (یٰسین) وَالذِّکْرِ الْحَکِیْمِ (آلِ عمران) ان آیتون سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ "حکمت" کی بعض اہم تعلیمون کو وحی الٰہی خود

اپنے اندر کبھی شامل کرکے اُن کو آب مقطر بنادیتی ہے، یہ چیز انبیاء کو کتاب کی وحی کے ساتھ ساتھ عام طور پر ملتی ہے، فرمایا،

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّحِکْمَۃٍ (آل عمران۹)

اور یاد کرو جب خدا نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ البتہ جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں

بہرحال یہ حکمت کی قوت انبیاء علیہم السلام کو بدرجۂ اتم حاصل تھی، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ اُن کی ہر بات دانائی اور اُن کا ہر کام دانشمندی پر مبنی ہوتا تھا، اور چونکہ یہ قوت ان کو حاصل تھی اس لئے اُس کے آثار اور نتائج بھی اقوال و اعمال کی صورت میں ظاہر ہوئے، جن کا نہ صرف اقرار و اعتراف بلکہ اُن پر عمل بھی نبوت کی تصدیق میں داخل ہوا، پندرھویں آیت میں ہے،

وَاذْکُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِکُنَّ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ وَالْحِکْمَۃِ، (احزاب - ۴)

(اور اے محمد رسول اللہ کی بیویو!) تمہارے گھروں میں خدا کی جو آیتیں اور حکمت کی باتیں سُنائی جاتی ہیں، اُن کو یاد رکھو،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو آیاتِ الٰہی کے علاوہ کس حکمت کے یاد رکھنے کا حکم دیا گیا، ظاہر ہے کہ وہ خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت و دانائی کی باتیں تھیں، اب اگر وہ باتیں امور دین سے متعلق نہ ہوتیں، تو اُن کے لئے ان کا یاد رکھنا کیوں ضروری قرار دیا جاتا، اسی طرح آٹھویں، نویں، دسویں، اور گیارہویں آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت میں ہے:

لہ لفظ یتلیٰ سے کسی کو شبہ نہ ہو کہ وہ کتاب کے لئے خاص ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کتاب کا کوئی صفحہ پڑھکر نہیں سُناتے تھے، بلکہ الفاظ الٰہی کو زبانی ادا فرماتے تھے،

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (جمعہ ۱) وہ مسلمانوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب کے بعد کس حکمت کی تعلیم دیتے تھے، ؟ ظاہر ہے کہ خود اپنی حکمت کی، تو جس حکمت کی تعلیم وہ دیتے تھے، وہ خود اُن کے اندر بھی تھی کہ جو چیز اُن کے پاس نہ تھی دوسروں کو کیا بخش سکتے تھے، اور جب یہ قوت آپکے پاس تھی، تو اس کے آثار ونتائج بھی اقوال وافعال کی صورت مین نمایان ہون گے جن کی آپ تعلیم فرماتے تھے، اور اپنے ان امورِ حکمت کی تعلیم سے آپ کا مقصد بھی یہی ہو سکتا تھا کہ مسلمان اُن پر عمل کرین،

پانچوین آیت مین ہے کہ حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں،

قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ (زخرف - ٦) مین تمھارے پاس حکمت لیکر آیا ہون تاکہ جن باتون مین تم باہم اختلاف رکھتے ہو کچھ باتین اُن میں سے کھولدون،

اس سے معلوم ہوا کہ حکمت کا ایک فریضہ تبیین بھی ہے یعنی کسی مجمل، ذو معنیین، اور مختلف فیہ مسئلہ کی تشریح وتفصیل جس سے وہ اجمال اور اختلاف جاتا رہے، اور اصل مقصود کی تشریح ہو جائے چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تورات کے بعض احکام کی جن مین یہود مختلف الرائے تھے تفصیل فرمائی، اور اُن کی غلطی دور کی،

بارہوین آیت مین ہے،

وَلَوْلَا فَضْلُ اللهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ اگر خدا کا فضل وکرم تجھ پر نہ ہوتا، تو اُن مین سے

---

[1] قرآن پاک مین حرفِ علت سے قبل واؤ آیا کرتا ہے جیسے وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ یہ حرف عطف نہیں،

اَهَمَّتْ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ	ایک گروہ نے چاہا تھا کہ تجھکو گمراہ کردا دے
وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ	گمراہ نہین کرتے لیکن اپنے آپ کو اور تجھو ذرا سا
مِنْ شَيْءٍ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ	بھی نقصان نہیں پہنچائیں گے، اللہ نے تجھ پر
وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَ	کتاب اور حکمت اتاری، اور تجھ کو سکھایا جو تو
كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (نساء)	نہین جانتا تھا، اور اللہ کا فضل تجھ پر بڑا ہے

ان آیتون مین بیان ہے کہ منافقین کا ایک گروہ آپ کو غلط رائے دیکر بہکانا چاہتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "ان کی یہ چال کارگر نہ ہوئی، اور وہ تجھ کو بہکا نہ سکے، اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ کا تجھ پر فضل وکرم ہے، اور وہ فضل وکرم یہ ہے کہ اُس نے تجھ پر کتاب اور حکمت اُتاری، اور تجھ وہ علم بخشا، جو پہلے نہ تھا" اس سے ظاہر ہوا کہ گمراہی سے آپ کی یہ حفاظت خطا سے یہ عصمت اور علم کی یہ بخشش آپ کو کتاب اور حکمت دونون کے ملنے کے سبب سے حاصل ہوئی ہے، الغرض اس حفاظت وعصمت کے حصول مین کتاب الٰہی کے ساتھ حکمت ربانی کے انعام کو بھی دخل کامل ہے،

یہ تو وہ نبوی حکمت تھی جس کا سرچشمہ صرف سینۂ نبوت تھا، لیکن یہ فیض حسب استعداد پیغمبر کی اتباع میں دوسرون کو بھی ملتا ہے، جس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ سچی اور صحیح بات کو بہت آسانی سے سمجھ لیتے، قبول کرلیتے، اور اُس پر عمل کرتے ہیں،

تبلیغ اسلام کے تین ذریعون، حکمت، موعظت، اور خوش خلقی سے مناظرہ کرنے مین سب سے اول حکمت کو جگہ دی گئی ہے،

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ، (نحل-۱۶)	تو اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کیساتھ دعوت دے اور اُن سے مناظرہ بطریق احسن کر،

سچی، صحیح اور صاف بات دل تک پہنچ جاتی، اور بہت جلد اپنا اثر دکھاتی ہے، فرمایا،

حِکْمَۃٌ بَالِغَۃٌ، (قمر-۱)	دل تک پہنچ جانے والی حکمت،

یہ حکمت ہر نیکی کی جڑ اور ہر بھلائی کی اصل ہے، پھر اس سے بڑھ کر دنیا مین اور کیا دولت ہوسکتی ہے، اسی لئے ارشاد ہوا،

وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا، (بقرہ-۳۷)	جس کو حکمت دی گئی، اس کو بہت نیکی (دولت) دی گئی،

اس سلسلہ میں دو مشہور اور مستند حدیثون کا حوالہ بھی مناسب ہے جن سے حکمت کی حقیقت واضح ہوگی، اور کم از کم قرنِ اول میں اس لفظ کا مفہوم ظاہر ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد کے ایک خطیب کا بیان سُن کر فرمایا،

اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ الحکمۃَ وَاِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا،	بعض شعر حکمت ہوتے ہیں، اور بعض تقریریں جادو ہوتی ہین،

اس حدیث میں بعض اشعار کو حکمت اور بعض تقریرون کو جادو کہا گیا ہے، اس تقابل سے ظاہر ہے کہ حکمت کا عربی مفہوم اُس کے اُردو مفہوم سے بلند تر ہے، یعنی سحر و جادو کے مافوق انسانی تصور کی طرح "حکمت" کے عربی مفہوم میں کوئی مافوق بشری تخیل ضرور ہے، اسی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ عربی میں "حکمت" کے معنی عقل و فہم وغیرہ کے معمولی الفاظ سے کوئی بلند اور غیر معمولی

حقیقت ہی، اور اردو میں اس حقیقت کو حکمت" کے ساتھ لفظ الہامی" بڑھا کر ادا کیا جا سکتا ہے"
یعنی" الہامی حکمت"

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد
فرمایا، رشک وحسد اگر جائز ہے تو صرف دو شخصوں پر، ایک اس پر جس کو مال کی دولت ملی، تو وہ
اُس کو صحیح مصرف میں لٹاتا ہے دوسرے رجلٌ آتاہُ اللہ الحکمۃ فھو یقضی بھا و یُعلّمُھا
(صحیح بخاری کتاب العلم) اس شخص پر جس کو حکمت ملی ہے تو وہ اُس کے ذریعہ سے فیصلہ کرتا ہے، اور
دوسروں کو سکھاتا ہے، اور اس میں معلم ہونے کی شان پیدا ہوتی ہے جب عام انسانوں کا یہ
یہ درجہ ہے تو انبیاء علیہم السلام کو یہ دولت کس بہتات سے ملی ہوگی، اور وہ یقیناً آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے حصہ میں بھی آئی، اب اس حصولِ دولت یعنی عطائے حکمت کا نتیجہ بھی آپ سے ظاہر
ہونا چاہیئے، اور وہ فیصلہ اور تعلیم ہے، آپ کے یہ عالمانہ فیصلے اور حکیمانہ تعلیمات تمامتر وحی ربانی کی
عملی، اور زبانی شرح اور بیان ہیں،

کتاب حکمت کی تعلیم | اوپر کی چار آیتوں ۸-۹-۱۰-۱۱ میں خفیف سی تغیر کیساتھ حسبِ ذیل آیت ہے؛

یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَ	وہ رسول اُن (اَن پڑھوں) کو خدا کی
یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ۔	آیتیں سناتا، اور اُن کو سنوارتا، اور
(جمعہ-۱)	ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے،

ان آیتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تین کاموں کا ذکر ہے،

۱- خدا کی آیتوں کو پڑھنا، اور دوسروں کو سنانا،

۲۔ اُن کو شرک اور بداخلاقی کی نجاستوں سے پاک صاف کرنا اور سنوارنا؛

۳۔ اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دینا،

سوال یہ ہے کہ پہلی اور تیسری آیتیں ایک ہی معنی رکھتی ہیں، یا دو، اگر ایک معنی رکھتی ہیں تو اس بے سود تکرار کا فائدہ کیا؟ کیوں نہ دوسری جگہ بھی یتلوا (یعنی تلاوت کرتا ہے) ہی کا لفظ رکھ دیا گیا، اور اگر دو الگ الگ معنی رکھتی ہیں، جیسا کہ ہر صاحبِ نظر سمجھ سکتا ہے تو ان دونوں مضمون میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوگا، اگر رسول کا فرق محض وحی کی زبان سے سُنی ہوئی آیتیں پڑھکر دوسروں کو سُنا دینا ہے، اور اسی پر اُس کی تبلیغ کا فریضہ ختم ہوجاتا ہے، تو اُس کا تیسرا فرض الفاظ کی تلاوت سے آگے بڑھکر کتاب اور حکمت کے سبق کی تعلیم کیونکر قرار دیا جاسکتا ہی بالکل ظاہر ہے، کہ تعلیم کا مفہوم تلاوت سے بہت کچھ زیادہ ہے خصوصًا جب کہ "تعلیم" کا لفظ تلاوت کے بعد آیا ہو، وحی کے الفاظ سنا دینے سے تلاوت کا فرض ادا ہوجاتا ہی، مگر تعلیم کا فرض ہنوز باقی رہتا ہے، کتاب کی تعلیم کے معنی تلاوت کی طرح کتاب کے الفاظ کا سنا دینا، اور پڑھا دینا یا دوسروں کو یاد کرا دینا نہیں، بلکہ الفاظِ قرآنی کی تلاوت کے بعد جو آپ کا پہلا کام تھا، اُس کے مشکل مطالب کو حل کرنے، مجمل معانی کو سمجھانے اور اپنی زبان اور عمل سے اُن کی شرح و تفصیل کر دینے کا نام "کتاب و حکمت کی تعلیم" ہے، اور یہ آپ کا دوسرا یا تیسرا فریضہ تھا، اور یہی وہ تعلیم تھی جس کا ان آیتوں میں بار بار ذکر ہے، اب جب ان مطالب و معانی کی شرح و تفسیر بھی آپ کے فرائضِ نبوت میں داخل تھی، تو اس پیغمبرانہ شرح و تفصیل کی حیثیت بھی دینی ہوگی، اور اسکی تعمیل بھی اُمت کیلئے ضروری ہوگی، آپ کی اسی زبانی و عملی شرح و تفصیل کو صحابہؓ اور تابعین نے اپنی روایت و عمل کے ذریعہ

سے محفوظ رکھا، اور وہ احادیث و سنن کے نام سے موسوم ہے،

اس تفصیل کے بعد حکمت کے اُن معنوں پر ایک نظر دوبارہ ڈال لیجئے، جو ائمۂ لغت اور علمائے قرآن نے بیان کئے ہیں، تو آپ کو یقین آجائے گا کہ وہ کل ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی معنی کی متعدد تفسیریں ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال جن کے اصطلاحی نام احادیث و سنن ہیں، کتاب الٰہی کی عملی و زبانی تشریحات ہیں، کتاب الٰہی، وحی ربانی کا نتیجہ ہے، اور احادیث و سنن، سینۂ نبوی کی ملہمانہ حکمت کا، اس مقام پر امام شافعی کی یہ تحقیق پیش نظر رہے،

وسنته الحکمة التی القی فی روعه	اور آپ کی سنت وہ حکمت ہے جو آپ کے قلب
من اللہ عزوجل (کتاب الرسالہ شافعی)	میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی،

اور اسی مفہوم کو مجاہد اس طرح ادا کرتے ہیں کہ الحکمة فہم القرآن حکمت فہم قرآن کا نام ہے، دوسری عبارت میں یوں کہو کہ قرآن کے معانی و مطالب کی تشریح حکمت ہے، اور اس تشریح کا نام جو رسول کے قول و عمل سے ادا ہوئی، سُنّت ہے، اور اس معنی کو امام مالک، اور ابو رزین اور ابن زید وغیرہ دوسری صدی کے علمائے قرآن ان عبارتوں میں ادا کرتے ہیں کہ حکمت معرفت دین، فقہ دین، اور اس علم دین کو کہتے ہیں، جس کو رسول نے بیان کیا، اور حکمت اُس نور کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کسی قلب میں پیدا کر کے اُس کو منور کر دیتا ہے،

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اصل حکمت نبوی وہ نور نبوت اور الہامی معرفت ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب و سینہ میں ودیعت کیا تھا، اور چونکہ آپ کے سنن و اقوال آپ کی اسی ودیعت شدہ حکمت نبوی کی پیداوار اور آثار و نتائج ہیں، اسی لئے اُن پر بھی

حکمت کا اطلاق جائز ہے، اس تفصیل کے بعد ظاہر ہوگا کہ بعض اماموں اور عالموں نے حکمت کی تشریح میں اصل معنی کی طرف توجہ کی ہے، اور بعض نے ثانوی معنی کو بیان کیا ہے، اور دونوں حق پر ہیں،

علم | علم کے لغوی معنی جاننے کے ہیں، مگر ہر فن کے تعلق سے جاننے کی نوعیت اور معلومات کی حیثیت مختلف ہوگی، انبیاءؑ کے تعلق سے جب اس کا استعمال ہوگا تو اس سے طبعاً خدا کی توحید، ذات وصفات، دین و شریعت کے احکام اور اخلاقی تعلیمات مراد ہوں گی، حضرت ابراہیمؑ توحید پر استدلال کرکے اپنے باپ سے فرماتے ہیں،

يَآ اَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ	اے میرے باپ! میرے پاس علم کا وہ
مَا لَمْ يَاْتِكَ، (مریم - ۳)	حصہ آیا ہے، جو تیرے پاس نہیں آیا،

حضرت خضرؑ کے متعلق ہے،

وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (کہف)	اور ہم نے اپنے پاس سے اس کو علم سکھایا،

خدا کے پاس سے تو ہر چیز ہے، پھر اپنے پاس سے "علم سکھانے" کا مفہوم کیا ہے؟ ہر وہ شے جو انسان کی ذاتی محنت، کوشش، اور جدوجہد وغیرہ معمولی ذرائع کے بغیر حاصل ہوتی ہے تو منجانب اللہ کہی جاتی ہے، اسی طرح خدا کے پاس سے علم عطا ہونے کے معنی اس علم کے ملنے کے ہیں، جو انسان کے طبعی ذرائعِ علم واستدلال اور تلاش وتحقیق کے بغیر خود بخود عطا ہو، یہی علم خداداد ہے، اور اسی لئے صوفیہ کی اصطلاح میں اس کو علمِ لدنی (پاس والا علم) کہتے ہیں،

حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کی نسبت ہے،

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاؤدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْماً. (نمل ۲) اور بے شبہہ ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم دیا،

حضرت یوسف کے آغاز نبوت کے موقع پر ہے،

وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ	اور اسی طرح تیرا پروردگار تجھکو نوازیگا، اور
مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ وَيُتِمُّ	تجھکو باتوں کی حقیقت رسی (تاویل) سکھائیگا
نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ، (یوسف ۱)	اور تجھ پر اپنا انعام پورا کرے گا،

ان آیتوں میں اُس علم کا ذکر نہیں جس کا منشا روحی موقت ہے، کیونکہ ان میں سیاق کلام سے علم کے یکبارگی دیے جانے کا ذکر ہے، جو وحی موقت کی شان نہیں، خصوصاً آخری آیت مین تو تاویل احادیث کا علم یک دفعہ دیئے جانے کی تصریح ہے۔ اسی لئے حضرت یوسف ایک خواب کی تعبیر بیان کرکے دوسرے موقع پر کہتے ہیں،

ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي (یوسف) یہ وہ ہے جو میرے پروردگار نے مجھے سکھایا ہے

یہ کہیں بیان نہیں کیا گیا کہ خواب کی تعبیر بتلاتے وقت اُن پر وحی آکر حقیقت سے اُن کو مطلع کرتی تھی، بلکہ خود ان کے اندر یہ علمی قوت ہمیشہ کے لئے ودیعت کردی گئی تھی، اسی قسم کا وہ علم ہے جس کی نسبت سے بعض انبیاء کو بچپن ہی مین علیم (جاننے والا) کا خطاب ملا،

وَبَشَّرُوهُ بِغُلٰمٍ عَلِيمٍ،	اور فرشتون نے اُس کو ایک بڑے صاحب علم
(ذاریات ۲)	فرزند کی خوشخبری دی،
إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيمٍ،	ہم تجھے ایک بڑے صاحب علم فرزند کی
(حجر ۴)	خوشخبری دیتے ہیں،

یہاں لفظِ علیم اختیار کیا گیا ہے عالم نہیں، اور یہ لفظ عالم سے زیادہ علم پر دلالت کرتا ہے، ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ وحیِ موقت جو گاہ گاہ آتی ہے اُس کے علاوہ علم کا ایک دائمی عطیہ بھی نبی کی شان ہے،

علم و حکم | بہت سے انبیاءؑ کے متعلق علم کے ساتھ حکم کا عطا ہونا بھی بیان ہوا ہے، حکم کے معنی لغت میں فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں، جس کا ترجمہ اردو میں سمجھ اور بوجھ کا نتیجہ (یعنی فیصلہ) کرسکتے ہیں، امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں،

وَالحکم بالشی ان تقضی بالشیٔ	کسی شے پر حکم کرنا، یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ شے
بانّہٗ کذا اولیس کذا سواء الزمت	ایسی ہو یا ایسی نہیں ہو، عام اس سے کہ اس
ذلک غیرہ اولم تلزمہ (۱۲۶ مصر)	فیصلہ کا تم دوسرے کو پابند کرسکو یا نہ کر سکو،

عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں ہے،

الحکم العلم والفقہ القضاء بالعدل (ج ۱۵ ص ۳۰) حکم کے معنی علم، سمجھ، اور منصفانہ فیصلہ کرنا،

اُن انبیاء علیہم السلام کو جن پر کسی کتاب کا نازل ہونا ثابت نہیں، اس علم اور حکم کا عطا ہونا ثابت ہے اس سے یہ معلوم ہوا کہ وحیِ کتاب کے علاوہ کسی اور عطیۂ علم و حکم کی طرف اشارہ ہے، چنانچہ حضرت یوسفؑ کی شان میں ہے،

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّہٗ اٰتَیْنٰہُ حُکْمًا	اور جب یوسف جوانی کی قوت کو پہنچا
وَّعِلْمًا، (یوسف - ۳)	تو ہم نے اس کو حکم اور علم دیا،

حضرت لوطؑ کے متعلق ہے،

وَلُوطًا اٰتَیْنٰہُ حُکْمًا وَّعِلْمًا (انبیاء) | اور لوط کو ہم نے حکم اور علم دیا،

حضرت داؤد اور سلیمان کے ذکر میں ہے،

فَفَہَّمْنٰہَا سُلَیْمٰنَ وَکُلًّا اٰتَیْنَا | تو ہم نے سلیمان کو فیصلہ سمجھا دیا، اور
حُکْمًا وَّعِلْمًا (انبیاء-۶) | ہر ایک کو ہم نے حکم اور علم دیا تھا،

حضرت یحییٰؑ کی نسبت ہے،

یٰیَحْیٰی خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّةٍ وَاٰتَیْنٰہُ | اے یحییٰ کتاب (توراۃ) کو مضبوطی سے پکڑ،
الْحُکْمَ صَبِیًّا (مریم-۲) | اور ہم نے اس کو حکم بچپن میں عطا کر دیا،

ایک جگہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل پر اپنی نعمتیں ان الفاظ میں شمار کرتا ہے،

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ الْکِتٰبَ | اور بلاشک ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب
وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّةَ (جاثیة) | اور حکم اور نبوت دی،

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اور حکم اور نبوت تین چیزیں ہیں، یہاں کسی کو یہ شبہہ نہ ہو کہ ان آیتوں میں حُکْم سے مراد دنیاوی حکومت اور سلطنت ہے کہ اس معنی میں یہ لفظ خالص اور قدیم عربی میں نہیں آیا ہے، یہ اہلِ عجم کا محاورہ ہے، قرآن نے ہر جگہ اس کو فیصلہ اور قوتِ فیصلہ کے معنی میں استعمال کیا ہے، جیسے

فَاحْکُمْ بَیْنَنَا بِالْحَقِّ (ص) | ہمارے درمیان حق کیساتھ فیصلہ کر،
فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (ص) | تم لوگوں کے درمیان حق کیساتھ فیصلہ کر،
وَاِنْ حَکَمْتَ فَاحْکُمْ بَیْنَہُمْ بِالْقِسْطِ (مائدہ-۶) | اور اگر تو ان کے درمیان فیصلہ کرے تو انصاف

حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ ایک مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہیں،

وَدَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ اِذْ یَحْکُمٰنِ فِی	اور داؤدؑ اور سلیمانؑ کو جب وہ دونوں
الْحَرْثِ، (انبیاء - ۶)	کھیت کا فیصلہ کر رہے تھے،
وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِیْهِ مِنْ شَیْءٍ فَحُکْمُهٗۤ	اور جس کسی چیز میں تم نے اختلاف کیا تو
اِلَی اللّٰهِ ط (شوریٰ - ۲)	اس کا فیصلہ اللہ کی طرف ہے،

سب سے بڑھکر یہ کہ یہی تین باتین سورۂ انعام میں بہت سے پیغمبرون کے نام گنا کر کہی گئی ہین،

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ	یہ وہ لوگ تھے، جن کو ہم نے کتاب،
وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ج (انعام ۱۰)	حکم اور نبوت بخشی،

جن پیغمبرون کے نام اوپر گنائے گئے ہین، اور جن کی طرف وہ لوگ کہکر اشارہ کیا گیا ہی، یہ ہین، ابراہیم، اسحاق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسماعیل، الیسع، یونس، لوط علیہم السلام، ان اٹھارہ نامون مین حکم "بمعنی حکومت و سلطنت اگر ہو، تو اس کے مستحق صرف دو ہین، سلیمان اور داؤدؑ اور چاہے کسی طرح کسی تاویل سے یوسفؑ اور موسیٰؑ کو بھی شامل کرلیجئے، باقی چودہ نام ان پیغمبرون کے ہین جن کو اس کا کوئی حصہ نہین ملا تھا، اس لئے لامحالہ حکم کا لفظ قرآن مین عربیت کے اصلی اور صریح معنی مین مستعمل ہی اور اس لفظ سے خدا کا جو مقصود ہے وہ کتاب کے ساتھ ساتھ ان پیغمبرون کو برابر حیثیت میں ملا تھا،

غلط فہمی کا پورا پردہ چاک کرنے کے لئے ایک اور آیت کریمہ پر نظر ڈالئے،

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ	کسی بشر کے لئے یہ زیبا نہین کہ اللہ اسکو

وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ	کتاب حکم، اور نبوت دی، پھر وہ لوگوں
كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	سے کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بنو
لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ	بلکہ جو تم کتاب (توراۃ) سکھاتے تھے، اور
تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ	جو تم پڑھتے تھے، اس کے ذریعہ سے تم
تَدْرُسُوْنَ۔ (آل عمران - ۸)	خدا والے بنو،

ان آیتوں میں مخاطب اہل کتاب ہیں، اور جس مقدس بشر کا ان میں ذکر ہے بظاہر اس سے مراد حضرت عیسیٰؑ ہیں، وہ نہ ہوں تو خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اور یہ اس وقت کی بات ہے، جب یہود کی پوری قوت مدینہ کے اطراف اور حجاز میں موجود تھی اور اسلام ہنوز اُن کے مقابلہ میں کمزور و ناتوان تھا، ایسی صورت میں جس حکم کے ملنے کا ذکر ان آیتوں میں ہے وہ کتاب اور نبوت ہی کی جنس کی کوئی چیز ہو سکتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو تو حکومت و سلطنت کا ادنیٰ شائبہ بھی عطا نہیں ہوا تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک جب تک بنی اسرائیل اپنی ممتاز قوت کے ساتھ مدینہ اور حجاز میں موجود تھے، یہ رتبہ نہیں ملا تھا، آیت اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ میں بھی حکم سے مراد وہی فیصلہ اور قضائے ربانی ہے، حکومت و سلطنت نہیں، تسکین کے لئے اس آیت کے آگے پیچھے کے الفاظ پر نظر ڈالو،

قُلْ اِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ	کہدے (اے پیغمبر!) کہ میں اپنے پروردگار
كَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِيْ مَا	کی کھلی دلیل پر ہوں، اور تم اس کو جھٹلاتے
تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ	ہو، میرے پاس وہ نہیں جس کی تم جلدی

اِلَّا لِلّٰہِ ، یَقُصُّ الْحَقَّ وَھُوَ خَیْرُ	کرتے ہو، فیصلہ کسی کا نہیں لیکن اللہ کا
الْفَاصِلِیْنَ ،	وہ حق بیان کرتا ہے، اور سب فیصلہ
(انعام - ۷)	والون سے وہ بہتر ہے،

ان وجوہ سے اس مین کوئی شک نہین رہتا کہ انبیاء علیہم السلام کو منصب نبوت اور وحیِ کتاب کے ساتھ **حکم** کی سند بھی ملتی ہے جس کے صاف و صریح معنی کلام عرب، اور لغت اور قرآن کے قرینون سے علم فہم، فیصلہ، اور حق و باطل مین تمیز ہے، اور اس لئے رسول کی اس قوت و طاقت کے نتائج بھی ہمارے لئے واجب العمل ہین،

شرحِ صدر | ربانی علم و معرفت کا ایک اور مقام **شرح صدر** ہے، شرحِ صدر کے معنی سینہ کھول لینے کے ہین، عام خیال یہ ہے کہ سینہ کی تنگی، اور ضیق جہل و نادانی کی علامت ہے اور سینہ کی کشادگی اور فراخی، علم کی وسعت اور معرفت کی فراوانی پر دلالت کرتی ہے، اسی لئے شرحِ صدر کے اصطلاحی اور مجازی معنی علم کی کثرت اور آگاہی کی وسعت کے ہین، اور خاص طور سے اُس علم و معرفت اور اطلاع و آگاہی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو کسی دقیق اور مشکل مسئلہ کے متعلق دفعتہ اور یک بیک قلب مین وارد ہو جاتی ہے، اور اس حل سے اُس کی تسلی و تسکین ہو جاتی ہے، اور اُس کے شکوک و شبہات دور ہو کر اس کو یقین کی راحت و مسرت حاصل ہو جاتی ہے، جمہرہ ابن درید مین ہے،

وَالشَّرْحُ مِنْ قَوْلِهِمْ شَرَحْتُ لَكَ	شرح اہلِ عرب کے اس محاورے ہے کہ مین نے
الْاَمْرَ ...... اَیْ اَوْضَحْتُهُ وَکَشَفْتُهُ	تیرے لئے بات کی شرح کر دی یعنی اسکو واضح

وشرح اللہ صدرہ فانشرح اذا اتسع لقبول الخیر،

(۲ - ۱۳۴)

کردیا، اور کھول دیا، اور اللہ نے اس کے سینہ کو کھول دیا، تو وہ کھل گیا یعنی جب نیکی کے قبول کرنے کے لئے وسیع ہو گیا،

صحاح جوہری میں ہے،

الشرح الکشف تقول شرحت الغامض اذا فسرتہ،

شرح یعنی کشف (کھولنا) تم کہتے ہو میں نے اس پوشیدہ مسئلہ کی شرح کردی یعنی اس کی

لسان العرب میں ہے،

الشرح الکشف یقال شرح فلان امرہ ای اوضحہ وشرح مسئلۃ مشکلۃ بینھا، وشرح الشیء یشرحہ شرحا وشرحہ فتحہ وبینہ وکشفہ وکل ما فتح من الجواھر فقد شرح تقول شرحت الغامض اذا فسرتہ .... وشرح اللہ صدرہ لقبول الخیر یشرحہ شرحا فانشرح وسعہ لقبول الحق فاتسع،

شرح یعنی کشف ہے، کہا جاتا ہے کہ فلان نے اس کی بات کی شرح کردی یعنی اس کو واضح کردیا اور مشکل مسئلہ کی شرح کردی یعنی اسکو بیان کردیا، اور کسی چیز کی شرح کردی یعنی تفصیل کردی، اور کھولدیا، اور جواہر میں سے جو کھولا جاے، تو اسکی شرح کیگئی، تم بولتے ہو پوشیدہ مسئلہ کی شرح کردی یعنی تفسیر کردی .... اور خدا نے اس کے سینہ کو کھول دیا کسی نیک بات کے قبول کرنے کے لئے تو وہ کھل گیا، یعنی اسکو قبول حق کیلئے وسیع کردیا تو وہ وسیع ہو گیا،

قال ابن الاعرابی: الشرح الحفظ والشرح	ابن اعرابی نے کہا: شرح کے معنی ہیں،
الفتح والشرح البیان والشرح الفھم	یاد رکھنا، کھولنا، بیان کرنا، سمجھنا،

قرآن مجید میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نبوت کا منصب ملتے وقت دعا مانگی،

رَبِّ اشْرَحْ لِی صَدْرِی وَیَسِّرْ لِی	شرح صدر اور فصاحت بیان	اے میرے رب! میرے سینہ کو میرے لئے کھولدے
اَمْرِی وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِی		اور میرے کام کو میرے لئے آسان کردے،
یَفْقَھُوا قَوْلِی، (طٰہٰ - ۲)		میری زبان کی گرہ کھولدے تاکہ لوگ

دعا کے پہلے جملہ میں حضرت موسیٰؑ نے اپنے لئے شرح صدر کی استدعا کی ہے، اور آخر میں فصاحتِ بیان کی، یعنی اول میں صحیح معانی کے القاء اور آخر میں اُن کے لئے صحیح الفاظ کے انتخاب کی ہے تاکہ اُن کی دعوت و تبلیغ کو مخاطب سمجھ سکیں لیکن یہ دولت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بن مانگے ملی، خدا نے فرمایا،

اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ وَوَضَعْنَا	کیا ہم نے (اے محمدؐ!) تیرے لئے تیرے سینہ کو
عَنْکَ وِزْرَکَ، (انشراح - ۱)	کھول نہیں دیا، اور تیرے بوجھ کو تجھ سے اتار لیا،

شرح صدر اور سینہ کھولنے کی جو تشریح احادیث صحیحہ میں مذکور ہے، اس کے لئے عام اصطلاح شق صدر ہے، یعنی عالم رویا یا بیداری میں فرشتوں نے آکر سینۂ مبارک کو واشگاف کیا، اس کو آب زمزم سے دھویا، اور سونے کے طشت میں ایمان اور حکمت بھر کر لائے، اور اُن سے سینۂ مبارک کو معمور کر کے شگاف کو برابر کر دیا،[1] اگر یہ واقعہ اپنی ظاہری حقیقت پر محمول کیا جائے

[1] صحیح بخاری و صحیح مسلم و نسائی ابواب معراج و اسراء و فرض الصلوٰۃ و مسند احمد بروایت انس بن مالک و سنن ترمذی تفسیر سورۂ انشراح،

تو بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ سینۂ مبارک کو واقعتاً چاک کر کے اور زمزم کے پانی سے پاک وصاف کر کے ایمان اور حکمت اس میں بھری گئی، اور اگر تمثیل کے رنگ میں لیا جائے تو بھی حقیقت ماننی پڑے گی کہ سینۂ صافی ایمان وحکمت سے معمور کیا گیا، بہر حال شرحِ صدر کی حقیقت ایمان اور حکمت کی ربانی بخشش ہے،

شرحِ صدر کے اس مذکورۂ بالا معنی کو جو شقِ صدر کے واقعہ کی تفصیل سے واضح ہے اگر کوئی تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہو تو بھی بحمد اللہ کہ اس کی تسکین کا سرمایہ قرآن پاک میں موجود ہے سورۂ زمر میں ہے،

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ	بھلا جس کا سینہ اللہ نے اسلام کیلئے کھولا
فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ (زمر-۳)	تو وہ اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشنی میں ہے

اسلام کے لئے سینہ کے کھول دینے سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت مؤثر طریقہ سے اس طرح کھل گئی کہ اُس کو اسلام کی سچائی کا پوری طرح یقین آگیا، اور اس کو اپنے اُس یقین پر کامل تسکین حاصل ہو گئی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُس کو اپنی منزلِ مقصود کے ہر قدم پر اللہ کی روشنی حاصل ہے، . . . . یہی "شرحِ صدر" کی حقیقت ہے، اور اس روشنی کی کمی و بیشی درجوں، اور منصوبوں کے مطابق ہوتی ہے،

اس سلسلہ میں حدیث کے دو ایسے موقعوں کا ذکر کرنا ہے، جن سے لفظ "شرحِ صدر" کے معنی کی پوری تشریح ہو جاتی ہے، یہاں یہ نکتہ پیشِ نظر رہے کہ ان حدیثوں سے معنوی احتجاج یہاں مقصود نہیں، بلکہ صدرِ اول کے کلامِ عرب سے شرحِ صدر کے محاورہ کی تشریح مقصود ہے،

۱۔ پہلا واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد، عرب کے بعض قبیلے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کرتے ہیں، حضرت ابو بکر صدیق ؓ اُن پر فوج کشی کا ارادہ کرتے ہیں، حضرت عمر فاروق ؓ آکر عرض کرتے ہیں کہ یا خلیفہ رسول اللہ! اُن سے جہاد کیونکر ممکن ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا، اس نے اپنی جان و مال کو مجھ سے بچا لیا، حضرت صدیق ؓ جواب دیتے ہیں، خدا کی قسم! میں اس سے لڑوں گا، جو زکوٰۃ اور نماز میں فرق کرتا ہے، نماز خدا کا حق ہے؛ اور زکوٰۃ بندوں کا حق ہے؛ اگر وہ بکری کا ایک بچہ بھی جس کو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دیتے تھے، اب نہ دیں گے تو میں اُن سے لڑوں گا

اس کے بعد حضرت عمر ؓ فرماتے ہیں،

فواللہ ما ھو الا ان قد شرح	تو خدا کی قسم؛ نہ تھا یہ لیکن یہ کہ کھول دیا تھا
اللہ صدر ابی بکر فعرفت انہ	اللہ نے ابو بکر کے سینہ کو، تو میں نے جان
الحق، (بخاری۔ کتاب الزکوٰۃ)	لیا، وہی حق ہے،

۲۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جنگِ یمامہ میں قرآن کے بہت سے حافظ شہید ہوئے اُس وقت حضرت عمر ؓ نے آکر حضرت ابو بکر صدیق ؓ کو مشورہ دیا کہ قرآن پاک کو ایک ترتیب سے کاغذ پر لکھ لیا جائے، حضرت ابو بکر ؓ نے جواب دیا کہ میں وہ کام کیونکر کروں جس کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، لیکن حضرت عمر ؓ اپنے مشورہ کے بہتر ہونے پر اصرار کرتے رہے، یہاں تک کہ حضرت ابو بکر ؓ کی سمجھ میں بھی بات آگئی، اس موقع پر حضرت ابو بکر ؓ کہتے ہیں،

فلم یزل عمر یراجعنی حتی شرح اللہ	تو عمرؓ بار بار مجھ سے کہتے رہے یہانتک کہ خدا نے
صدری لذلک و رأیت فی ذلک	اس کے لئے میرے سینہ کو کھول دیا، اور میں نے
الذی رای عمرؓ (صحیح بخاری جمع القرآن)	بھی وہی دیکھا، جو عمرؓ دیکھتے تھے،

ان دونوں موقعوں پر لفظ شرحِ صدر اپنے استعمال کا محل اور اپنی حقیقت کو ظاہر کو ظاہر کر رہا ہے، یہی شرحِ صدر ہے جس کو قرآن نے جیسا کہ اوپر سورۂ زمر کے حوالہ سے گذرا نورِ ربانی یا نورِ بصیرت کہا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شرحِ صدر کی جو وسعت عطا ہوئی تھی اُس کے سمجھنے سے پہلے بلاغت کا ایک مسئلہ سمجھ لینا چاہئے، جب کوئی لفظ متعلقات کے صلہ اور مفعول کیساتھ مقید ہو کر بولا جاتا ہے، تو اس سے معنی کی تخصیص و تحدید ہو جاتی ہے لیکن وہی لفظ جب متعلقات کے صلہ اور مفعول کی قید کے بغیر بولا جائے گا، تو وہ عموم کے ساتھ فعل کے ثبوت کا فائدہ دیگا، مثلاً علم (جاننا) مفعول کو چاہتا ہے، جس چیز کا علم ہوتا ہے اسکو عبارت میں مفعول بناتے ہیں، اور اس عبارت میں اس علم سے مقصود اسی خاص شی کا علم ہوتا ہے جسکو مفعول بنایا ہے لیکن اگر مفعول کو حذف کر دیں تو اُس کا مقصد کسی خاص چیز کے علم کے بجائے مطلق اور عام علم کا ثبوت ہوگا، ایک جگہ قرآن میں ہے، یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (روم) وہ حیاتِ دُنیا کا ظاہری پہلو جانتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس علم کا تعلق صرف ایک چیز کے علم سے ہے یعنی دنیا کا ظاہری زندگی کے علم سے، عام علم سے نہیں، لیکن دوسری جگہ ہے، هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ "کیا جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے (یعنی جو علم رکھتے ہیں، اور جو علم نہیں رکھتے،

دونون برابر ہو سکتے ہیں"، یہان یہ ذکر نہین کہ کس خاص بات کو جانتے ہین، بلکہ مقصود عام علم ہے، تو یہان معنی یہ ہون گے، کہ "جو ہر طرح کے علم والے ہیں، اور جو مطلق بے علم ہین، دونون برابر نہیں ہو سکتے" بلاغت کی کتابون میں هُوَ يَا مُرُ ويعطى ويمنع هُوَا ضحك وابكى کی مثالون سے اس مفہوم کی توضیح کی گئی ہے،

اس تمہید کے بعد شرح صدر کے گذشتہ استعمالوں اور مثالوں پر نظر ڈالئے، ہر جگہ آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ جس بات کے سمجھنے کے لئے سینہ کھولا جاتا ہے، اُس پر لام آتا ہے، یا قرینہ سے سمجھا جاتا ہے کہ مثلاً اسلام کے لئے سینہ کھول دیا، جمع قرآن کے لئے سینہ کھول دیا، مانعین زکوٰۃ کے قتال کے لئے سینہ کھول دیا، مگر حضرت موسیٰؑ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے قرآن میں جس شرح صدر کا ذکر ہے، اس میں اُس بات کا ذکر نہیں ہے جس کے لئے اُن انبیا علیہم السلام کے سینے کھولے گئے، اس سے یہ مقصود ہے کہ اُن انبیاء کو امورِ دین میں مطلق اور عمومی شرح صدر عنایت ہوا، اور یہیں سے عام اُمّت اور انبیاءؑ کے فرقِ مراتب کا اظہار ہوتا ہے، کہ امت کے عام افراد کو خاص خاص امور کے سمجھنے کے لئے شرح صدر ملتا ہے، اور انبیاء کو اپنے دائرہ مین کلی، اور عمومی حیثیت سے یہ چیز عنایت ہوتی ہے،

ایک اور لطیف پہلو بھی یہاں ذکر کے قابل ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا، اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر احسان دونون موقعون پر الگ الگ ہے، حضرت موسیٰؑ کہتے ہین "میرے لئے میرے سینہ کو کھول دے" اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا مین نے تیرے لئے تیرے سینہ کو کھول نہین دیا، سوال یہ ہے کہ "میرے لئے" اور "تیرے لئے" کے

اضافہ کی ضرورت، اور اس "لام" کی حاجت کیا تھی؟ مفسرین میں امام زمخشری نے اس سوال کے جواب دینے کی کوشش کی ہے، اور لکھا ہے کہ یہ صرف تاکید کے لئے ہے، حالانکہ آیا لام تملیک کے بجائے لام افادہ ہے، جیسا کہ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا میں ہے مقصد یہ ہے کہ یہ شرح صدر کی دولت تجھکو تیرے لئے ملی ہے یعنی تیرے کشف علم کے لئے یا تائید کے لئے، یا فائدہ کے لئے اور یہ کشف علم اور شرح صدر خود تیری ذات کے لئے ہے کہ وہ کامل سے کامل تر ہو کر ظاہر ہو،

اب آخری سوال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دین کا جو یہ عمومی شرح صدر عنایت ہوا، اس کا کوئی اثر و نتیجہ بھی تو رہا ہوگا، تو در اصل اسی کے یہ آثار و نتائج ہیں جو افعال و اقوال اور "احادیث و سنن" کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں،

تبیین کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں جس شریعت کو لیکر آئے، وہ آخری اور ابدی تھی اور ایسی آخری اور ابدی شریعت کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ زیادہ تر زور شریعت کے کلی اور ابدی اصول و مبادی پر دے چنانچہ اس آخری وحی الٰہی نے اپنی کتاب کو صرف اصول و کلیات تک محدود رکھا، اور جزئیات کے لئے اپنی آیتوں میں ایسے اشارے رکھے جن کے سہارے سے وہ دل جو علم و معرفت سے پُر نور اور حکم و حکمت سے معمور اور شرح صدر اور تائید ربانی سے فیضیاب ہوں وہ علی قدر مراتب جزئیات کو صحیح طور سے جان لیں، چنانچہ یہ رتبہ سب سے پہلے خود نبیؐ کو ملا، اور چونکہ وہ خطا سے معصوم ہے، اس لئے اُس کے اس منصب کے نتائج بھی خطا سے محفوظ ہیں پھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے یہ منصب خلفائے راشدینؓ، اکابر صحابہؓ، ائمہ تابعین و تبع تابعین و مجتہدین عظام اور علمائے اعلام کو ہمیشہ ملتا رہا، اسی کا اصطلاحی نام اجتہاد ہے جس کو ہر زمانہ

فیضیاب علوم نبوت، اور حاملین اسرار شریعت، خدا کی دی ہوئی بصیرت کے مطابق اس کی وحی کی روشنی میں ہمیشہ انجام دیتے رہے ہیں، اور دیتے رہیں گے یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی توضیح وتفسیر کی ذمہ داری بھی خود اپنے اوپر لی ہے، فرمایا،

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ، ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ،

(قیامہ - ۱)

تو قرآن کی وحی کے ساتھ اپنی زبان کو اس غرض سے حرکت دیتا کہ قرآن کی (تلاوت واشاعت میں) جلدی کرے، بیشک ہم پر ہے قرآن کو جمع کرنا اور اس کا پڑھانا اور جب ہم نے اس کو پڑھا دیا تو تو اس کی پڑھائی کی پیروی کر

پھر ہمارے ذمہ ہے اس کا بیان

اس بیان اور شرح کی ذمہ داری کبھی بذریعہ وحی ادا ہوئی ہے، جو قرآن میں مذکور ہے اور کبھی رسول کی تقریر وعمل سے پوری ہوئی ہے، جو عملی تواتر سے منقول اور احادیث وسنن کے مستند دفتر میں موجود ہے،

یہ امر کہ اس بیان وشرح کی طاقت، اور اس شرح وبیان کا اختیار رسول کو خدا کی طرف سے عطا ہوا تھا حسب ذیل آیت سے ثابت ہے،

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ

(نحل - ۶)

اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت (کی کتاب) اتاری تاکہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا ہے تو اس کو کھول کر دیتا اور شاید وہ سوچیں

"بیان" اور "تبیین" کے لفظی معنی کھولنے اور واضح کرنے کے ہیں، اور ان کا استعمال دو

معنوں میں ہوتا ہے، ایک اعلان اور اظہار کے معنی میں یعنی اخفا کے مقابل دوسرے توضیح وتفسیر کے معنی میں، قرآن پاک میں یہ لفظ "تبیین" اپنے دونوں معنوں میں آیا ہے، اب یہ تمیز کہ کس آیت میں کیا معنی مراد ہیں، سیاق وسباق اور موقع ومحل سے ہوسکتی ہے، مثلاً ایک جگہ قرآن پاک میں ہے،

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا	اے کتاب والو! تمہارے پاس ہمارا رسول
يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِمَّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ	آیا کہ کتاب کی جو باتیں تم چھپاتے تھے، وہ
مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ،	اُن کو تمہارے لئے ظاہر کردے، اور بہت سی
(مائدہ - ۳)	باتوں سے درگذرے،

یہاں "تبیین" صریح طور سے اخفا کے مقابلہ میں ہے، اس لئے یہاں "تبیین" کے معنی یقینی طور پر "اظہار واعلان" کے ہیں لیکن یہی لفظ دوسری جگہ سورہ نحل میں اس طرح آیا ہے،

وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ	اور ہم نے تجھ پر کتاب نہیں اتاری لیکن اسلئے
لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ وَهُدًى	تاکہ تو واضح کردے، اُس کو جس میں انھوں
وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ،	نے اختلاف کیا، اور ایمان والوں کے لئے
(نحل - ۸)	رہنمائی اور رحمت بناکر اُس کو اُتارا،

اختلاف کے مقابلہ میں اظہار واعلان کی نہیں، بلکہ توضیح وتشریح کی ضرورت ہے کہ جس امر میں اختلاف ہے، وہ اس توضیح وتفسیر کے بعد دور ہوجائے، اب پہلی آیت پر غور کرنا چاہیئے جو اسی سورہ میں ایک اور مقام پر ہے،

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ	اور ہم نے (اے پیغمبر!) تیری طرف نصیحت

لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ،

(نحل ۔ ۶)

کی کتاب (قرآن) کو اُتارا تاکہ لوگوں کی طرف جو اُتارا گیا، تو اُس کو اُن کے لئے کھول کر بتادے شاید کہ وہ سوچیں ،

سوال یہ ہے کہ اس آیتِ پاک میں بیان کرنے کے معنی ظاہر کرنے کے ہیں، یا تشریح و تفصیل کرنے کے ؟ ہمارا دعویٰ ہے کہ ظاہر کرنے کے معنی سے یہاں غور و فکر کی مناسبت اور قرینہ کے سبب سے تشریح و تفصیل کے معنی لینا صحیح ہے، امرِ مخفی کا اظہار سننے اور ماننے کے تو مناسب ہو سکتا ہے مگر سوچنے کے نہیں، سوچنے اور غور و فکر کرنے کے لئے یہاں تشریح و تفصیل کی ضرورت ہے نہ کہ اظہار و اعلان کی، اب جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے تفصیل و تبیین کا منصب خدا کی طرف سے ثابت ہے تو اُس تفصیل و تبیین کی پیروی اور اتباع بھی خدا ہی کے احکام کی پیروی ہوگی، اور آپ کی یہ تبیین و تشریح آپ کے نورِ حکمت کا فیضان ہوگا جس کے اشارے خود کتابِ الٰہی کے اندر آپ کو موجود نظر آتے تھے،

ارادت | انسانی الفاظ میں یہ قدرت نہیں کہ اُن کے ذریعہ سے کوئی ایسا قانون وضع کیا جاسکے جو ایک طرف اختلافِ فہم سے محفوظ رہے، اور دوسری طرف اُس میں یہ وسعت ہو کہ تمام آئندہ پیش آنے والے واقعات جن کے جزئیات کی کوئی حد نہیں پوری طرح حاوی ہو سکے، لیکن فہمِ انسانی کے اختلاف کے جو نقائص قانون میں ہوتے ہیں گو اُن کو تمامتر دور نہیں کیا جا سکتا تاہم اُن کو کم کیا جاسکتا ہے، اسلام نے اپنے قانونِ الٰہی سے جو بہرحال انسانی بول چال کے الفاظ میں ہے، اس اختلافِ فہم کے نقص کو کم کرنے کے لئے یہ کیا کہ اپنے رسول کی معرفت زبانی اور عملی طور سے اُس کی تشریح و تبیین کرا دی گو انسانی ذرائعِ حفظ و روایت کی فطری کمزوریوں

کے سبب سے اس تشریح و تبیین میں بھی اختلافِ فہم پیدا ہو گیا، مگر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر یہ تشریح و تبیین نہ ہوتی، تو اختلافات کی خلیج اس سے بھی زیادہ عمیق اور وسیع ہوتی،

روزمرہ کے پیش آتے رہنے والے جزئیات کے فیصلہ کی یہ صورت رکھی گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں روزانہ اس قسم کے واقعات اور مقدمات پیش ہوتے رہتے، اور آپ وحی کتاب کے اصول و کلیات کے ماتحت اپنے نورِ بصیرت اور فہمِ حکمت سے اُن کے فیصلے فرماتے رہتے، خلفائے راشدین نے اپنے اپنے عہد میں ان نو بنو اور تازہ بتازہ واقعات کے فیصلوں کے لئے اوّلاً وحی کتاب کو اور اُس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن قضایا اور فیصلوں کو جو فہمِ نبوت، نورِ بصیرت، اور ارادتِ الٰہی کے ذریعہ فیصل ہوئے تھے، اپنا ماخذ قرار دیا، اور یہی اصول بعد کے فقہاء اور مجتہدین نے اختیار کیا، اور ہر نئے واقعہ کو وحی کتاب، اور فیصلۂ نبوی کے معصوم و مسلّم معیار پر جانچ کر اُن میں سے کسی نہ کسی مماثل اور مشابہ فیصلہ پر قیاس کر کے اپنے فیصلے دیئے، اور جو چیزیں اُن میں نہ ملیں اُن کو معمولی عدل و انصاف، رسم و رواج، عقل و فکر و استحسان وغیرہ کے اصول پر جانچ کر اُن کا فیصلہ کیا، یہی مجموعہ آج فقہ اسلامی کہلاتا ہے،

وحیِ الٰہی قرآن پاک میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قضایا اور فیصلے احادیث و سنن کی صحیح روایتوں میں محفوظ ہیں، وحی الٰہی کی صداقت میں تو کلام نہیں ہو سکتا، اب رہ گئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی تو اُس کے متعلق بھی وحیِ الٰہی ناطق ہے،

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ	ہم نے (اے پیغمبر!) تیری طرف سچائی کی کتاب اتاری تاکہ لوگوں کے درمیان جو تجھکو
لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ	

(نساء - ۱۶) اللہ سوجھائے اُس کے ذریعہ فیصلہ کرے،

اس کتاب الٰہی کے نزول کی غرض ہی یہ بتائی گئی ہی کہ تو اے پیغمبر! اس کے احکام اور قوانین کو لیکر اُس فہم کے ذریعہ جو کچھ اللہ تعالیٰ تجھ کو سوجھائے اور دکھائے تو لوگوں کے درمیان فیصلہ اور انصاف کرے، اللہ تعالیٰ کا اپنے پیغمبر کو یہی سوجھانا اور دکھانا جو کچھ تھا، وہ آپ کے عمل اور قضایا، اور فیصلوں کی صورتوں میں محفوظ ہے، اور اسلام کے قانون کا وحیِ الٰہی کے بعد دوسرا ماخذ ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عدل و انصاف پر خود منافقین تک کو بھروسہ تھا، چنانچہ اُن کا قاعدہ تھا کہ جب اُن کا حق کسی پر ہوتا، تو وہ دوڑے ہوئے عدالتِ نبوی میں حاضر ہوتے، کیونکہ سمجھتے تھے کہ یہ حق آپ ہی کی عدالت سے ہم کو ملے گا، لیکن جب اُن پر کسی کا حق نکلتا تو وہ ٹال جاتے، اور دوسرے طریقہ سے فیصلہ چاہتے اس پر اللہ تعالیٰ نے انکی سرزنش کی،

وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	اور جب وہ اللہ تعالیٰ اور رسول کی طرف
لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ	بلائے جائیں کہ رسول اُن کے درمیان فیصلہ کردے
وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ	تو اُن میں سے کچھ لوگ منھ موڑتے ہیں اور اگر انکو
مُذْعِنِيْنَ، اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ	کچھ حق پہنچتا ہو تو فرمانبردار بن کر رسول کے
اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ	پاس چلے آئیں کیا اُن کے دل میں بیماری ہے یا
اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ط بَلْ اُولٰٓئِكَ	وہ شک میں ہیں، یا وہ ڈرتے ہیں کہ خدا اور
هُمُ الظّٰلِمُوْنَ، اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ	اُس کا رسول اُن کیساتھ بے انصافی کریگا بلکہ

إِذَا دُعُوا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ
بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا
وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَمَنْ
يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَ
يَتَّقْهِ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ،

(نور - ۷)

وہی لوگ بانصاف ہیں ایمان والوں کی بات
یہ تھی کہ جب اُن کو خدا اور رسول کی طرف بلایا
جائے تاکہ وہ اُن کے درمیان فیصلہ کردے
تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا، انہی لوگوں
کا بھلا ہے اور جو کوئی اللہ کا اور اسکے رسول کے
حکم پر چلا اور اللہ سے ڈرتا رہا اور اللہ سے بچکر چلے

اِن آیات سے معلوم ہوا کہ رسول کے تمام فیصلے منصفانہ ہوتے تھے، اور رسول کے فیصلوں کی اطاعت خود خدا کے حکم کی اطاعت ہے بلکہ ایمان کی دلیل اور نشانی ہے،

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ
فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ
حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا،

(نساء - ۹)

تو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے
جب تک وہ تجھے اپنے جھگڑوں کا منصف
بنائیں، اور پھر جو تو فیصلہ کرے اس سے اپنے دل
میں خفگی نہ پائیں اور پوری طرح تسلیم کریں

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ
إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ
يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَ
مَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ
ضَلَالًا مُبِينًا، (احزاب ۵)

اور مومن مرد، یا مومن عورت کا یہ کام
نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول فیصلہ
کردے تو اُن کو اپنے کام کا اختیار رہے، اور
جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی
کی وہ کھلا گمراہ ہوا،

یہ اطاعت اور مطلقاً سر افگندگی اور تمام فیصلون کے قطعی حق اور منصفانہ فیصلہ ہونے کی ربانی ذمہ داری ہر حاکم وقت اور سلطان زمانہ کے لئے نہیں، یہ انبیاءؑ کے لئے خاص ہے، دو شخصوں کے باہمی جزئی وشخصی مقدمات کا فیصلہ ظاہر ہے کہ خود اللہ تعالیٰ وحیِ قرآنی کے ذریعہ نہیں کرتا تھا، بلکہ رسول کے فہم نبوت، نور نبوت، فیض حکمت، شرحِ صدر، تبیینِ حقیقت اور ارائت (دکھانا اور سوجھانا) کے ذریعہ فرماتا تھا، لیکن کلیات کی حیثیت سے وہ یقیناً وحی قرآنی کے مطابق ہوتا تھا، اور اُن کلیات کے مطابق ان جزئیات کا فیصلہ خود اللہ تعالیٰ آپکو سوجھاتا تھا

آپ کے ان قضایا اور فیصلون کی رضامندانہ اطاعت ہر مسلمان پر قیامت تک ضروری ہے، آپ کی زندگی کے بعد ان فیصلون کی اطاعت یہ ہے کہ اُس قسم کے مقدمات اور معاملات مین ہم بھی فیصلے جاری کرین جو آپنے اپنی زندگی میں اُن کے متعلق کئے کہ آپکے فیصلے بحکم خدا غلطی سے پاک، ظلم سے بری، اور بے انصافی سے منزّہ تھے، اور دنیا میں رسول کے سوا کسی انسان کو اس بے گناہی اور عصمت کا درجہ اور رتبہ حاصل نہیں،

رسول کا وجود مستقل ہدایت ہے | اللہ تعالیٰ نے پیغمبرون کو امام و پیشوا اور ہادی و رہنما فرمایا ہے، یعنی نبوت اور وحی سے سرفراز ہونے کے بعد اُن کی ذات مجسّم ہدایت و رہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لئے خاص ہو جاتی ہے، اُن کی بعثت اسی لئے ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی فرمائیں اور اُن کو ضلالت وگمراہی سے بچائین جس اُمت مین مبعوث ہوتے ہین اُس کے سامنے ہدایت و رہنمائی کے دو چراغ روشن ہوتے ہیں، ان دونوں کی روشنی مل کر ایک ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ مسلمانون کو جنھین یہود اپنی شرارت اور سازش سے گمراہ بنانا چاہتے تھے خطاب کر کے فرماتا ہے،

یَآاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْآ اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ یَرُدُّوْکُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ کٰفِرِیْنَ وَکَیْفَ تَکْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰی عَلَیْکُمْ اٰیٰتُ اللّٰہِ وَفِیْکُمْ رَسُوْلُہٗ ، (آل عمران ۱۰)	اے مومنو! اگر تم اہلِ کتاب کے کسی گروہ کا کہا مانو گے تو وہ ایمان لاچکنے کے بعد تمھیں مرتد کرکے کافر بنا دیں گے اور تم کو کیونکہ کفر کرنا چاہیے درانحالیکہ تم کو اللہ کی آیتیں سُنائی جاتی ہیں، اور تم میں اللہ کا رسول

آیت کے آخری ٹکڑے سے ثابت ہوا کہ کفر سے بچانے والی دو مستقل چیزیں مسلمانوں کے پاس تھیں ایک تو آیاتِ الٰہی جو اُن کو سُنائی جاتی تھیں، اور دوسری خود رسول کا مستقل وجود جو اپنی تعلیم و تلقین، فیضِ صحبت اور اثر سے اُن کو بہکنے نہ دیتا، اور ضلالت سے مانع آتا تھا اگر صرف کتابِ الٰہی اس کام کو انجام دے سکتی، تو رسول کے ذکر کی حاجت بلکہ خود بعثت کی ضرورت کیا تھی، اِس سے یہ واضح ہوا کہ اللہ کی کتاب صامت (قرآن) اُس کی کتابِ ناطق (رسول) سے مل کر اپنے فریضہ کو انجام دیتی ہے اور غالبًا اس حدیث صحیح کے بھی یہی معنی ہیں، جس کا اعلان آپ نے حجۃ الوداع سے واپسی میں اپنی وفات سے کچھ مہینوں پہلے فرمایا،

انی تارک فیکما الثقلین کتاب اللہ وسُنّتی ،	مسلمانو! میں تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑ جاتا ہوں اللہ کی کتاب اور اپنی سنت (یعنی

ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کا ظاہری وجود مٹ گیا، مگر آپ کی عملی زندگی جس کو سنّت کہتے ہیں، قائم و باقی ہے، اور وہ بھی قرآن کے بعد ہماری ہدایت کا دوسرا سرچشمہ ہے،

تزکیہ انبیاء علیہم السلام کا عموماً اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصاً ایک اور امتیازی وصف تزکیہ ہے، تزکیہ کے معنی پاک وصاف کرنے کے ہیں، نبوتِ محمدیہ کے اس وصف کا ذکر ان آیتوں میں ہے جن میں آپ کی یہ توصیف کی گئی ہے "ایک رسول جو لوگوں پر خدا کی آیتیں تلاوت کرتا ہے، اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور ان کو پاک وصاف کرتا ہے" ظاہر ہے کہ آپ کا یہ تیسرا وصف دو پہلے اوصاف سے الگ ہے، یہ پاک صاف کرنا، آیاتِ الٰہی کی تلاوت، اور کتاب وحکمت کی تعلیم کے بعد نبی کی عملی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے، کہ آپ کی تعلیم وتربیت فیضانِ صحبت، حسنِ اخلاق پند وموعظت اور تبلیغ ودعوت کی تاثیر سے بُرے اچھے، بد نیک اور اشرار اخیار بن جاتے ہیں،

انبیاء علیہم السلام کی ہر تاریخ اس واقعہ کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ گمراہ اور بدکار قوموں میں مبعوث ہوئے، ہر طرح کی اذیتیں اٹھائیں، تکلیفیں سہیں مصیبتیں جھیلیں، اور آخر تاریکی کو روشنی سے، جہالت کو علم سے اور کفر کو توحید سے، بدل کر رہے اور مدت تک ان کی تاثیر کا فیض جاری رہا، ان کا یہ وصف تزکیہ وحی والہام کے علاوہ ان کے جسم وجان اور زبان ودل کی کیمیا اثری کا نام ہے، خواہ ان کی زبان اس وقت وحی الٰہی سے مترنم ہو، یا خاموش، ہر آن آفتابِ حق کی کرنیں مطلعِ نبوت سے نکل نکل کر دلوں کی سرزمین کو روشن کرتی رہتی تھیں،

نور اسی لئے نبوت کا سینہ صدق وصفا کا آئینہ ہوتا ہے، نبی کا مجسم ہیکل ظلمت کدۂ عالم کا چراغ اور علم وہدایت کا مطلع النور ہوتا ہے، جس طرح اس کا صحیفۂ الہامی اور وحی ربانی نور ہوتی ہے، وہ خود بھی سراپا نور ہوتا ہے، جس سے اندھے دیکھتے، گمراہ راہ پاتے، اور حق کے طالب روشنی حاصل کرتے ہیں، خود آپ کو مخاطب کرکے فرمایا گیا،

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا	اے نبی! ہم تجھ کو بتانے والا خوشخبری سنانے والا،
وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ	چوکنا کرنے والا، خدا کی طرف اس کے حکم سے
بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا (احزاب ۶)	بلانیوالا، اور روشن کرنے والا چراغ بناکر بھیجا

یہ آس پاس کی چیزوں کو روشن کرنے والا چراغ خود رسول کی ذات ہے، سوال یہ ہے کہ اگر آپ کے جسم و جان زبان و دل خلق و عمل، علم و فہم میں روشنی نہیں، تو آپ کی ذات جوان ہی چیزوں کا مجموعہ ہے، روشن چراغ کیونکر ثابت ہو گی، اور جب آپ کی ذاتِ مبارک کی یہ تمام چیزیں انوارِ الٰہی ہیں، تو ان انوار میں سے ہر نور کی روشنی میں چلنا ہدایت ہے اور ان میں سے کسی سے قطع نظر کرنا بھی ظلمت کے ایک گوشہ میں قدم دھرنا ہے،

آیات ملکوت کی رویت | جس طرح انبیاء علیہم السلام اپنی قوتِ سامعہ سے ندائے غیب کو سنتے اور صدائے وحی کی سماعت کرتے ہیں، اسی طرح اُن کی آنکھیں بہت کچھ دیکھتی ہیں، جو عام انسان نہیں دیکھتے، حضرت ابراہیمؑ کے ذکر میں ہے،

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ	اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ	زمین کی مملکت دکھاتے تھے، تاکہ وہ
مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ؕ (انعام - ۹)	یقین کرنے والوں میں ہو،

استعدادِ نبوت کی تربیت اور نشو و نما کے لئے یہ رویت و بصیرت کی مافوق قوت اُن کو عطا ہوئی،

حضرت موسیٰؑ کو طور پر جو کچھ نظر آیا وہ جلوہ گریِ حسن و عشق کی مشہور کہانی ہے، آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہداتِ روحانی کا تذکرہ معراج کے تعلق سے ان الفاظ میں کیا گیا ہے،

لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا (اسرائیل-۱) تاکہ ہم اس (رسول بندہ) کو اپنی نشانیاں دکھائیں

دوسری جگہ ہے،

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى، وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى (نجم-۱) دل جھوٹا نہیں بولا جو اس نے دیکھا کیا اس پر اس سے جھگڑتے ہو؟ اور دوسری بار اس کو اترتے دیکھا،

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى، (نجم-۱) نگاہ نہ بہکی اور نہ سرکش ہوئی، اس نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں دیکھیں،

ایک اور مقام پر ہے،

وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ (تکویر) اور اس نے یقیناً اسکو آسمان کے کھلے کنارے میں دیکھا،

یہ مشاہدہ وحی والہام کے علاوہ نبوت کے دوسرے حاسۂ بصارت کے امتیاز کو ظاہر کرتا ہے،

سماعِ غیب جس طرح آیات وملکوت کا مشاہدہ انبیاء کے حاسۂ بصارت کا امتیازی وصف ہے، اُسی طرح غیب کی آواز اور وحی کی صدا کو سننا بھی اُن کے حاسۂ سماعت کا خصوصی امتیاز ہے قرآن پاک میں اُس کی تصریحات موجود ہیں کہ انبیاء خدا سے ہم کلام ہوتے تھے، اور وحی کو پاتے تھے، وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (نساء-۲۳) اور خدا نے موسیٰ سے بات کی،

حضور کو حکم ہوا،

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ (طٰہٰ-۶) اور اس سے پہلے کہ قرآن کی وحی تجھ پر پوری ہو قرآن کے پڑھنے میں جلدی نہ کر،

خدا نے پیغمبروں کو پکارا، اور انھوں نے اُس کی آواز سنی نَادَیۡنَا ہم نے پکارا، بار بار یہ الفاظ قرآن میں پیغمبروں کے متعلق آئے ہیں،

تبلیغ و دعوت

نبی کا سب سے پہلا اور اہم فرض تبلیغ اور دعوت ہے یعنی جو سچائی اس کو خدا سے ملی ہے، اس کو دوسروں تک پہنچا دینا، اور جو علم اُس کو عطا ہوا ہے، اس سے اوروں کو بہرہ ور کرنا، خدا کا جو پیغام اس تک پہنچا ہے، وہ لوگوں کو سنا دیا، اس نے اُس کو جس صداقت سے آگاہ کیا ہے، اُس سے اپنے ہم جنسوں کو باخبر کرنا، جو مالی، جانی، زبانی، دماغی، روحانی، اور اخلاقی طاقتیں اُس کو بخشی گئی ہیں، اُن کو اس راہ میں صرف کرنا، اور اس سمجھانے بجھانے اور راہ راست پہ لانے میں صداقت کی ہر تاثیر سے کام لینا اس اعلان اور دعوت میں جو تکلیف بھی پیش آئے، اُس کو راحت جاننا جو مصیبت بھی درپیش ہو، اُس کو آرام سمجھنا جو کانٹے بھی اس وادی میں اس کے تلووں میں چبھیں، اُن کو رگ گل سمجھنا، اس حق کی آواز کو دبانے کیلئے جو قوت بھی سر اُٹھائے اُس کو کچل دینا، اور مال و منال، اہل و عیال، غرض جو چیز بھی اس سفر میں سنگ راہ ہو کر سامنے آئے، اُس کو ہٹا دینا، اور اُس کی اس ساری کوشش و کاوش کا مقصد خدا کی رضا مندی، مخلوق کی خیر خواہی اور اپنے فرضِ رسالت کی ادائگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا،

یہ ہے انبیاؑ کی تبلیغ و دعوت کا مفہوم، دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے انھوں نے اپنے فرض کو اسی ایثار اور قربانی کے ساتھ انجام دیا، اور ایک لمحہ بھی اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی، اور آج دنیا میں جو کچھ خدا کی محبت، بھائیوں کا پیار، انسانوں کی ہمدردی، بیکسوں کی مدد، غریبوں کی اعانت، اور دوسری نیکیوں کا اس سطحِ زمین پر وجود ہے وہ سب بواسطہ یا بلا واسطہ

دانستہ یا نادانستہ انہی کی دعوت وتبلیغ اور جد وجہد کا اثر اور نتیجہ ہے،

دنیا کے بڑے بڑے سے بڑے مفکر، بڑے سے بڑے شاعر، بڑے سے بڑے حکیم اپنا فرض خود سمجھ لینا یا زیادہ سے زیادہ دوسروں کو سمجھا دینا سمجھتے ہیں لیکن انبیاء علیہم السلام جس صداقت کو پاتے ہیں، اُس کو دوسروں کے سمجھانے اور ہر ممکن طریق سے اُس کے پھیلانے اور اہلِ دنیا کو اس کے باور کرانے میں اپنی پوری قوت صرف کر دیتے ہیں، وہ ہر مشکل کو جھیل کر نا فہموں کو حقیقت سمجھاتے اور اندھوں کو راہِ راست دکھاتے ہیں،

انبیاء علیہم السلام کی تعریف میں خدا فرماتا ہے،

اِلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰہِ	جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں، اور
وَیَخْشَوْنَہٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا	اُسی سے ڈرتے ہیں، اور اُس کے سوا کسی
اِلَّا اللّٰہَ وَکَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیْبًا،	سے نہیں ڈرتے، اور اللہ بس ہے حساب
(احزاب - ۵)	(اعمال) کے لئے،

حضرت موسیٰ کو حکم ہوتا ہے،

اِذْھَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی (طٰہٰ) فرعون کے پاس جا کہ اُس نے سرکشی کی.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ پیغامِ ربانی کی بے محابا تبلیغ کریں، اور دشمنوں سے نہ ڈریں کہ اُن کی حفاظت کا خود شہنشاہِ عالم ذمہ دار ہے،

یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ	اے پیغمبر! تیرے رب کے پاس سے جو تیری طرف
مِنْ رَّبِّکَ ط وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ	اترا ہے اُس کو پہنچا دے! اور اگر تو نے نہ کیا تو

رِسٰلَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ	اس کے پیغام کے پہنچانے کا فرض ادا نہین
(مائدہ - ۱۰)	کیا، اور اللہ تجھکو لوگون سے بچائے گا۔

انبیاء کی تبلیغ و دعوت مین تبشیر اور انذار دونون ہوتے ہین، تبشیر یعنی بشارت دینا، اور خوشخبری سنانا، اور انذار یعنی خدا کے جلال سے ڈرانا، عذاب الٰہی کا خوف دلانا، اور لوگون کو انکے انجام بد سے آگاہ کرنا، اور انبیاء کی آمد اس شان سے اس لئے ہوتی ہے کہ خدا کی حجت بندون پر تمام ہوجائے،

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا	یہ سب پیغمبر خوشخبری سناتے اور ہشیار و
يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ	بیدار کرتے ہوئے آئے تاکہ پیغمبرون کے
الرُّسُلِ، (نساء - ۲۳)	آنے کے بعد لوگون کے لئے خدا پر کوئی حجت (باقی نہ رہے)

ان سب نے پیغام الٰہی پہنچانے کے ساتھ اپنی خیر خواہی، دلسوزی و اخلاص مندی کا اعلان کیا،

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ	مین تم کو اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہون، اور
نَاصِحٌ اَمِيْنٌ، (اعراف - ۹)	مین تمہارا امانت دار خیر خواہ ہون،
يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ	اے میرے لوگو! مین نے اپنے رب کا پیام
وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ	تم کو پہنچا دیا، اور تمہاری خیر خواہی کرچکا
النّٰصِحِيْنَ، (اعراف - ۹)	لیکن تم خیر خواہون کو پیار نہیں کرتے،
يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ	اے میرے لوگو! مین نے اپنے رب کے پیام
رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ فَكَيْفَ اٰسٰى	تم کو پہنچا دیئے اور تمہاری خیر خواہی کرچکا
عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ (اعراف - ۱۱)	تو پھر کیسے نہ ماننے والے لوگون پر مین غم کھاؤن

یہ بھی فرمایا گیئے،

لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِنْ اَجْرِیَ	مین اپنی نصیحت کی تم سے مزدوری نہیں مانگتا
اِلَّا عَلَی الَّذِیْ فَطَرَنِیْ (ھُوْد - ۵)	میری مزدوری تو اس پر ہی جس نے مجھے پیدا کیا'
لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مَالًا اِنْ اَجْرِیَ	میں اپنی تبلیغ کے بدلہ تم سے مال و دولت کا
اِلَّا عَلَی اللّٰہِ، (ھُوْد - ۳)	خواہان نہین ہوں میری مزدوری تو خدا پر ہی'

ایک شبہہ کا ازالہ

اس سلسلہ مین ہم کو ایک اور غلط فہمی کو دور کرنا ہے، جو بعضوں کو حضورؐ کی صفتِ تبلیغ کے سمجھنے میں پیش آئی ہے، قرآن مجید مین متعدد آیتیں اس معنی کی آئی ہیں کہ رسول کا فرض صرف پیغام پہنچا دینا (البلاغ) ہے، اس سے آج کل کے بعض کوتاہ بینون کو یہ دھوکا ہوا کہ رسول کا فرض صرف وحیِ الٰہی کی تبلیغ ہے، یعنی قرآن پاک کے الفاظ کو انسانون تک بعینہٖ پہنچا دینا، اُس کا کام ہے، اُس کے معانی کی تشریح اور مطالب کی توضیح نہ اس کا منصب ہے، نہ اس کا اُس کو حق ہی، اُن کے نزدیک مبلغِ رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد اور نامہ بر کی ہے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ خط تو پہنچا دیتا ہے، مگر اُس خط کے مفہوم و معنی کی تشریح کا اس کو حق نہیں ہوتا، بلکہ اس کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس بند لفافہ میں کیا ہے،

شاید اُن کو یہ دھوکا اس آیت کے علاوہ لفظ "رسول" سے بھی ہوا ہے، جس کے لفظی معنی پیغامبر اور قاصد کے ہیں، لیکن وہ لوگ یہ خیال نہیں کرتے کہ جہان اُس کو رسول کہا گیا ہے "نبی (خبر پانے والا) بھی تو کہا گیا ہے، مُبشر (خوشخبری سنانے والا) نذیر (ڈرانے والا) سراج منیر (روشن کرنے والا چراغ) صاحب حکمت، صاحبِ خلقِ عظیم، صاحبِ مقامِ محمود، مجتبیٰ

(مقبول) مصطفےٰ (برگزیدہ) مبیّن (بیان اور شرح کرنے والا) معلّم (سکھانے والا) مزکّی (پاک و صاف کرنے والا)، داعی الی اللہ (اللہ کی طرف بلانے والا) حاکم (فیصلہ کرنے والا) مُطاع (واجب الاطاعہ) آمر (حکم دینے والا) اور ناہی (روکنے والا) بھی تو کہا گیا ہے (کیا یہ اوصاف و القاب اس کی اسی حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ صرف ایک پیغام پہنچانے والا قاصد ہے جس کو اصل پیغام کے مفہوم و معنی سے ایک معمولی قاصد اور نامہ بر کی طرح کوئی سروکار نہیں؟ اس کے پیغام کے مفہوم و معنی کی تشریح و تفسیر کا آج تو ہر عربی دان کو حق حاصل ہے، اور اس کی اصل حقیقت تک پہنچ جانے کا ہر مُدعی کو دعویٰ ہے، مگر خود صاحب پیغام کو اپنی پیغامبری کے وقت نہ مفہوم و معنی کا علم تھا، اور نہ اسکی تشریح کا اس کو حق تھا، اِنَّ هٰذَا الشَّيْءٌ عُجَابٌ ہم نے پچھلے صفحات میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے اس غلط خیال کی پوری تردید ہو جاتی ہے،

اُن کے اشتباہ کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اسلام میں شرع اور وضع قانون کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لئے تسلیم کیا گیا ہے کہ وہی اصلی شارع ہے، اب اگر رسول کے لئے بھی وحی کتابی سے الگ شرع بنانے کا حق تسلیم کیا جائے تو خدا کے سوا ایک اور شارع تسلیم کرنا ہوگا، اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ ہم رسول کو شارع نہیں شارح قرار دیتے ہیں کیا عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر جج جب حکومت کے قانون کی توضیح و تشریح کرتا ہے، تو وہ اپنے اس عمل سے سلطانِ وقت بن کر واضعِ قانون کا منصب حاصل کرتا ہے، یا صرف قانون کے مفہوم کا شارح ہوتا ہے؟ یہی حیثیت آسمانی عدالت کے اس قاضی کی ہے، جس کو ہم نبی اور رسول، اور معلّم اور مبیّن کہتے ہیں،

دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہر پیام اور مقصد، اور مفہوم اور فیصلے صرف وحی کے اُسی طریقۂ خاص کے ذریعہ اپنے پیغمبر کو مطلع نہیں فرماتا جس طریق خاص سے قرآن مجید نازل ہوا ہے، بلکہ وہ اپنی تینوں قسموں کے ذریعہ سے اپنے اغراض اس رسول پر واضح کرتا ہے، اور اُن تمام ہر طریق کی وحی کی اطاعت تمام اُمت پر فرض ہے، خواہ وہ وحی ہو، جو الفاظِ الٰہی کی قید کے ساتھ آئی ہو جس کو قرآن کہتے ہیں یا ربانی مفہوم ومعنی رسول کے الفاظ میں ادا ہوں جس کو حدیث وسنت کہتے ہیں، الغرض خواہ وہ کتابِ الٰہی کے ذریعہ سے ہو، یا حکمتِ ربانی کے فیض سے ہو،

قرآن مجید کی وہ آیتیں جن کے معنی یہ ہیں کہ "ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچانا ہے" اُن کا یہ منشا نہیں کہ وہ صرف پیغام پہنچانے والا ہے، خوشخبری سُنانے والا نہیں، ہشیار وبیدار کرنے والا نہیں، پیغام الٰہی کے الفاظ سُنانے کے بعد اُن کی تعلیم دینے والا نہیں، آیاتِ الٰہی کی تبیین وتشریح کرنے والا نہیں، رہنما اور ہادی نہیں، نجاستوں سے پاک وصاف کرنے والا نہیں، ایسا کہنا قرآن کا انکار، اور عقل وفہم کا ماتم ہے، قرآن میں کئی جگہ ہے،

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ (رعد، نازعات) — تو تو صرف ڈر سنانے والا ہے،

ایک جگہ ہے،

اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ. (ص۔ ۵) — میں تو صرف ڈر سنانے والا ہوں،

کیا ان آیتوں کا مفہوم یہی ہے کہ ڈر سُنانے کے سوا، رسول کا کام بشارت اور خوشخبری سُنانا نہیں، اور وہ صرف منذر ہے، مبشر نہیں، اصل یہ ہے کہ اس قسم کی آیتوں

اِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ (مائدہ ۱۲) — ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچا دینا ہے،

کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ وہ صرف پیغام رساں اور قاصد ہے نہیں اور شارح نہیں، بلکہ یہ ہے کہ اس کا
کام صرف خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے، زبردستی لوگوں کے دلوں میں اس پیغام کا اتار دینا نہیں زبردستی
لوگوں کو مسلمان بنا دینا نہیں، جبراً منوالینا نہیں، اور نہ پیغام پہنچا دینے کے بعد لوگوں کے کفر
وانکار اور عدم ایمان کی ذمہ داری اس پر ہے، قرآن میں جہاں جہاں اس معنی کی آیتیں آئی ہیں
اُن کا منشا یہی اور صرف یہی ہے قرآن پاک کی تیرہ مختلف آیتوں میں یہ بات کہی گئی ہے اور ہر جگہ
یہی ایک مفہوم ہے،

۱- وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ	کتاب والوں اور اَن پڑھوں سے کہدے
الْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ	کیا تم نے اسلام قبول کیا، اگر کیا تو ہدایت
اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ	پائی، اور اگر منھ پھیرا تو تجھ پر (اے رسول)
تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ	صرف پیغام پہنچانا ہے، اور اللہ بندوں
اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ (آل عمران ۲)	کا دیکھنے والا ہے،

مفہوم بالکل ظاہر ہے کہ اسلام کی ہدایت قبول کرنے میں کوئی زبردستی نہیں، اگر لوگ
قبول کریں تو انھوں نے حق کی راہ پائی، اور اگر انکار کریں تو رسول کا کام صرف پیغام پہنچا دینا تھا
وہ اُس نے پہنچا دیا، اُس کا فرض ادا ہو چکا، اب خدا جانے اور اُس کے بندے جانیں،

فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ	تو تیرا فرض صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور
(رعد - ۶)	ہمارا فرض اُن سے حساب لینا ہے،

اس کی مزید تفصیل سورہ غاشیہ میں ہے،

فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ، فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ، ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ (غاشیہ-۱)

تو (اے پیغمبر) تو نصیحت کر، تو تو صرف نصیحت کرنے والا ہے، اُن پر داروغہ نہیں لیکن جس نے منہ پھیرا اور انکار کیا تو خدا اس کو بڑی سزا دیگا، بیشک پھر ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے اور ہمیں پر ان کا حساب لینا ہے،

یہی مفہوم سورۂ شوریٰ مین ہے کہ رسول کا کام صرف سمجھانا اور تبلیغ کرنا ہے، وہ سلطان کارفرما، داروغہ اور فرمانروا بناکر نہین بھیجا گیا کہ لوگون سے بزور اپنی بات منوالے،

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا، اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ (شوریٰ ۵)

تو اگر وہ انکار کرین تو ہم نے تجھ کو اُن پر نگہبان بناکر نہیں بھیجا تیرا کام صرف پہنچا دینا ہے

کافرون نے جب کبھی رسولون کو جھٹلایا، انھون نے یہی کہا کہ ہمارا کام پہنچا دینا ہے، ماننے نہ ماننے کا تمھیں اختیار ہے،

قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ، قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ، وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ. (یٰسین ۲)

کافرون نے کہا تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو خدا نے کچھ نہیں اُتارا تم جھوٹ کہتے ہو، رسولون نے جواب دیا، ہمارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ ہم بے شبہ تمھاری طرف بھیجے گئے ہیں، اور ہمارا فرض صرف کھول کر پہنچا دینا ہے،

خود اللہ تعالیٰ نے بھی رسولون کو تسلی دی ہے کہ ان منکرون کے انکار سے دل شکستہ

نہ مون، اگلے پیغمبرون کے منکرون نے بھی یہی کیا تھا، پیغمبرون کا فرض لوگون سے منوانا نہین، بلکہ اُن تک خدا کا پیام پہنچانا ہے،

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ	اور مشرکون نے کہا اگر خدا چاہتا تو ہم اُس کے
اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ	سوا کسی اور کو نہ پوجتے، نہ ہم اور نہ ہمارے
نَحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ	باپ دادا، اور نہ اُس کے حکم کے بغیر کسی چیز
دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ كَذٰلِكَ فَعَلَ	کو حرام کرتے، (خدا کہتا ہی کہ) ایسا ہی کیا
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَهَلْ عَلَى	تھا اُن کے پہلون نے تو کیا ہمارے پیغمبرون
الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (نحل ۵)	پر کھول کر پہنچا دینے کے سوا کچھ ہی،
وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ	اگر تم جھٹلاؤ تو (کیا ہی) تم سے پہلے
مِّنْ قَبْلِكُمْ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا	بھی قومین جھٹلا چکی ہین، اور رسول پر
الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۔ (عنکبوت ۲۰)	نہین لیکن کھول کر پہنچا دینا،

رسول کا کام پہنچا دینا ہے، باقی علام الغیوب جو چاہے سو کرے،

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ وَاللّٰهُ	رسول پر نہیں ہی لیکن پہنچا دینا، اور اللہ
يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ۝ (مائدہ ۱۳)	جانتا ہی جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو

بقیہ آیتین حسب ذیل ہیں، جو ایک ہی مفہوم کو ادا کرتی ہیں،

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ	اور اللہ کا فرمان اور رسول کی بات مانو اور
احْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْا اَنَّمَا	بچو، اور اگر تم نے منھ پھیرا تو جان لو کہ ہمارے

عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ (مائدہ ۱۲)	رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے،
قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ	کہدے اے پیغمبر! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول
فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْهِ مَا حُمِّلَ	کی اطاعت کرو، پھر اگر وہ منہ پھیریں تو رسول
وَعَلَیْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ وَاِنْ تُطِیْعُوْهُ	پر وہ ہے جس کا بوجھ اس پر ہے اور تم پر وہ ہے جس کا
تَهْتَدُوْا وَمَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا	بوجھ تم پر ہے اور اگر اس کی اطاعت کروگے تو
الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ۔ (نور - ۷)	ہدایت پاؤگے اور رسول پر نہیں لیکن کھول کر
كَذٰلِكَ یُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكُمْ	اسی طرح اللہ تم پر اپنا احسان پورا کریگا تاکہ
لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ، فَاِنْ تَوَلَّوْا	تم مسلمان ہو جاؤ، اور اگر انھوں نے منہ پھیرا تو
فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ (نحل)	تجھ پر کچھ نہیں ہی مگر کھول کر پہنچا دینا،
وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ	اور خدا کا کہا مانو، اور رسول کی فرمانبرداری
فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا	کرو، اگر تم نے منہ پھیرا تو ہماری رسول پر
الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ۔ (تغابن - ۲)	صرف کھول کر پہنچا دینا ہے،

پیغمبر کا قول ہے،

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّا	تو اگر تم منہ پھیرو تو میں جو پیام دیکر تمھارے پاس
اُرْسِلْتُ بِهٖ اِلَیْكُمْ (هود ۵)	بھیجا گیا تھا، وہ میں نے تم کو پہنچا دیا، (یعنی

ان تمام آیتوں کا تعلق نبوت کے منکروں سے ہے یہاں پر یہ نکتہ بھی لحاظ کے قابل ہے کہ جو لوگ ہنوز نبوت کے منکر ہوں، اُن سے رسول کا تعلق صرف تبلیغ و نصیحت، پند و موعظت اور

سمجھانے کا ہے، لیکن جو خوش قسمت اقرارِ نبوت کی سعادت حاصل کرلیں، تو پھر ان کا تعلق رسول سے اتباع و پیروی اور اطاعت کا ہو جاتا ہے، اور اس کے بعد رسول ان کو تبلیغ ہی نہیں، بلکہ امر و نہی بھی کرتا ہے، کوئی حکومت دوسرے ملک کے کسی باشندے کو زبردستی اپنی رعایا نہیں بناتی لیکن اگر کوئی شخص از خود اس حکومت کی رعایا بنجائے، تو پھر اس کو اس کے قانون کی پیروی پر بزور مجبور کیا جائے گا کہ رعایا بننے کے معنی ہی اس کے قانون کے قبول کرنے کے ہیں،

انبیا کی تعلیم کا رتیازی عقیدہ

دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے وہ ایک ہی دین اور ایک ہی عقیدہ لیکر آئے وہی توحید وہی نبوت، وہی عبادت، وہی اخلاق، وہی جزار و سزا، اور عمل کی پرسش اس لحاظ سے انبیار کی تعلیم میں کوئی اصولی فرق نہیں، اس لئے فرمایا کہ "شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا الآیۃ" یعنی خدا نے تمھارے لئے وہی دین مشروع کیا، جو نوح وغیرہ دوسرے پیغمبروں کو دیا تھا، اور اسی کا نام اسلام ہے لیکن انبیار کی تعلیم کا اہم الاصول اُم سب سے ضروری جزر توحید ہے اور وہی نبوت کے ساز کا اصلی اور ازلی ترانہ ہے،

ممکن ہے کہ دنیا میں اسلام سے پہلے بہت سے اچھے لوگ گذرے ہوں اور ان کی دعوت بھی مفید ہو، اُن کے اخلاقی وعظ بھی دلپسند ہوں، وہ یونان کے حکیم ہوں یا ہندوستان کے ادبا لیکن اُن کی تعلیم میں اگر توحید کی دعوت شامل نہیں، تو وہ نبوت کے رُتبہ کے قابل نہیں کہ پیغمبرانہ تعلیم کی پہچان ہی توحید کی دعوت ہے، اگر یہ نہیں تو نبوت بھی نہیں، فرمایا:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ	اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا
إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا	لیکن اُس کو یہ وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں

فَاعْبُدُوْنَ، (انبیاء-۲) میری ہی پرستش کرو،

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِی کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ، (نحل-۵) اور ہر قوم میں ہم نے ایک رسول بھیجا کہ خدا کی عبادت کرو، اور بتوں سے پرہیز کرو،

اس سے معلوم ہوا کہ تعلیمی حیثیت سے نبوت کی شناخت اسی سے ہو سکتی ہے، اسلام سے پہلے جس مدعی نبوت کی تبلیغ کا اہم ترین جزو توحید نہیں، اس کو دعوائے نبوت کا کوئی حق نہیں،

نبوت کی غرض و غایت انبیاء (علیہم السلام) کی آمد کی غرض و غایت کو شاعرانہ زبان اور خطیبانہ جوش بیان میں بہت کچھ بتایا جا سکتا ہے لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ ان اغراض کو گنایا جائے، جو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وحی مبارک کی زبان سے ادا ہوئے ہیں اصل دعوی وہی ہے جس کو مدعی ظاہر کرتا ہو نہ کہ گواہ،

انبیاء کی بعثت کی سب سے پہلی غرض اس روز الست کے بھولے ہوئے ازلی عہد پیمان بندگی کی یاددہانی ہے،

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰی شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ (اعراف-۲۲) اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی نسلوں سے عہد لیا اور ان کو خود اپنے اوپر آپ گواہ کیا کہ کیا میں تیرا پروردگار نہیں ہوں، انھوں نے کہا کیوں نہیں تو ہم نے گواہی دی کہ قیامت کے دن یہ کہو کہ ہم اس کو (سے غافل تھے)

اس لئے ضرور ہوا کہ ان کو موقع بموقع اُن کا یہ وعدہ یاد دلایا جائے،

یہی وجہ ہے کہ رسول کی بعثت کی ایک غرض یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اس کا وجود بنی آدم پر اتمامِ حجت ہے، ممکن ہے کہ آدم کے فرزند یہ بجا عذر کریں کہ ہمارے پاس کوئی یاد دلانے والا نہیں آیا، اس لئے فرمایا،

رُسُلاً مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا	رسول خوشخبری سُنانے اور ڈرانے والے
یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌ بَعْدَ	تاکہ رسولوں کی آمد کے بعد لوگوں کے لئے
الرُّسُلِ، (نساء - ۲۳)	خدا پر کوئی حجت باقی نہیں رہے،

تذکیر کے بعد نبی کا فرضِ اولین ہدایت اور رہنمائی ہے کہ وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفتِ ہادی کا مظہر اور مورد ہے، اسی لئے ایک آیت میں نبی اور رسول کیلئے ہادی کا لفظ آیا ہے فرمایا،

وَلِکُلِّ قَوْمٍ ھَادٍ، (رعد-۱)	اور ہر قوم کے لئے ایک راہ دکھانے والا آیا

سورۂ شوریٰ میں فرمایا،

وَاِنَّکَ لَتَھْدِیْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (شوریٰ) اور تو اے پیغمبر سیدھی راہ دکھاتا ہے،

سورۂ انبیاء میں بہت سے پیغمبروں کے ذکر کے بعد ہے،

وَجَعَلْنٰھُمْ اَئِمَّۃً یَّھْدُوْنَ بِاَمْرِنَا	اور ہم نے اُن پیغمبروں کو ایسا پیشوا بنایا
(انبیاء - ۵)	جو ہمارے حکم سے راہ دکھاتے تھے،

اسی طرح اُن آسمانی کتابوں کو جو اُن کو دی گئی تھیں، بار بار ھدیٰ (ہدایت) کہا گیا ہے اور کہیں اُن کو ضیاء اور نور (روشنی) کے الفاظ سے ادا کیا گیا ہے۔

اس ہدایت اور رہنمائی کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ بندگانِ الٰہی کو باطل کے اندھیرے

سے نکال کر حق کی روشنی میں لاتے ہیں، لوگ جب فاسد خیالات، بیہودہ افکار، بے سود اعمال کی تاریکیوں میں پھنس کر فطری بصیرت اور روحانی معرفت کے نور سے محروم ہو جاتے ہین، انبیاء ان اندھون کے ہاتھ پکڑ کر ان کو ظلمات سے انوار میں لاتے ہین ان کو شک کی جگہ یقین جہل کی جگہ علم باطل کی جگہ حق، اور ظلمت کے بجائے نور عطا کرتے ہین،

هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ عَلَى عَبْدِهِ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ — وہی اللہ جو اپنے بندہ پر کھلی آیتیں اتارتا ہے

لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (حدید-۱) تاکہ وہ تم کو تاریکیون سے نور مین لائے

اس دنیا کی نجات صرف اعتدال مین ہے جب کبھی مزاجِ انسانی کی طرح اس کے ان عناصر میں جن سے اس کی ترکیب ہوئی ہے، افراط وتفریط پیدا ہوگی، روے زمین پر فساد رونما ہوگا، انسانی جماعتون اور قوموں میں بھی یہ ترازو جب اعتدال کے معیار پر پوری نہ ہوگی، کبھی دونون پلے برابر نہ ہون گے، آسمان سے زمین تک ایک ایک ذرہ اعتدال کی ترازو مین تُلا ہوا ہے، کیمسٹری اور علم الفلک کا واقف کار اس ترازو کو اپنی آنکھون سے دیکھتا ہے اور حیرت کرتا ہے کہ کہین ایک ذرہ کی کمی بیشی نہین ہے، جس طرح اس مادی دنیا مین یہ حیرت انگیز توازن ہے ٹھیک اسی طرح روحانی اور اخلاقی دنیا مین بھی اس توازن کی ضرورت ہے، عقائد ہون کہ عبادات، اخلاق ہون کہ معاملات، اسی توازن کا نام حق اور عدل ہے، فرمایا،

وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ أَلَّا — اور آسمان کو اونچا کیا اور ترازو رکھی کہ اس

تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ — ترازو میں کمی بیشی نہ کرو اور تول کو ٹھیک رکھو،

بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ (رحمٰن) — اور ترازو کو گھٹاؤ نہین،

یہ توازن اور برابر تول جو بے ارادہ اور بے اختیار دنیا کے ذرہ ذرہ اور اس کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک کام میں خالقِ فطرت کے اندازہ اور تقدیر سے قائم ہے، یہی توازن اور برابر کی تول رسولوں کے ذریعہ آئی ہوئی میزانِ شریعت کے مطابق ذی ارادہ اور خود اختیار انسانوں کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک جنبش میں ہونی چاہئے، بے ارادہ دنیا کی میزان کا نام قانونِ فطرت ہے، اور با ارادہ دنیا کی میزان کا نام قانونِ شریعت ہے بے ارادہ دنیا کا نام نظامِ عدل اسی خدائی میزانِ فطرت سے چل رہا ہے، اگر اس میزان میں ایک ذرہ بھی کمی بیشی ہو جائے، تو عالم کا نظام درہم برہم ہو جائے، اسی طرح انسانی دنیا کی سکینت، طمانیت، اور امن وامان کا نظام اسی میزانِ شریعت کے ذریعہ قائم ہو سکتا ہے، اگر یہ نہ ہو تو اس کے نظام کا درہم برہم ہونا بھی لازمی ہے، فرمایا،

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ	ہم نے بے شبہ اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں
اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ	دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور
لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (حدید-۳)	میزان اتاری تاکہ لوگ عدل کو قائم کریں،

انبیاءؑ کی بعثت کی یہ غرض وغایت کہ لوگ شریعت کی میزان کے مطابق عدل اور توازن کو قائم رکھیں اس موجودہ دنیا ہی کے نظام کی امن وسلامتی کے لئے ہے، آج یورپ کے الحاد کی گونج نے دنیا کے گوشہ گوشہ کو پرشور بنا دیا ہے، آج رسولوں کی اہمیت اور ان کی تعلیمات کی ضرورت پر شکوک وشبہات کی ژالہ باری ہو رہی ہے، لیکن وہمی وخیالی مباحث سے قطع نظر کر کے عملی حیثیت سے دنیا کی ایک ایک اقلیم اور ایک ایک آبادی کا جائزہ تو آج جہاں کہیں بھی سچائی کی کوئی

روشنی اور حقیقت کی کوئی کرن چمکتی ہے، وہ اسی مطلعِ خورشید سے چھن کر نکلی ہے، کوئی دیندار ہو، یا ملحد، خوش عقیدہ ہو یا بے عقیدہ، یونان کا حکیم ہو یا افریقہ کا جاہل، یورپ کا متمدن ہو یا صحاری کا وحشی، رومی ہو یا زنگی، عیسوی ہو یا موسوی، بت پرست ہو یا موحد مجوسی ہو یا ہندو مسلم ہو یا غیر مسلم، شہری ہو یا دیہاتی، ہمالیہ کی چوٹی پر آباد ہو یا زمین کی گہرائی میں، کہیں بھی تو کوئی بھی ہو، اگر وہ اللہ کے نام کی عظمت سے واقف ہے اور نیکی اور بدی کی تمیز سے آشنا ہے، تو وہ خدائی رسولوں اور ربانی پیغمبروں کے علاوہ کس معلم کی کوششوں کا ممنون ہے، آج جہاں بھی عدل و میزان کا وجود ہے، وہ کسی یونانی حکیم یا یورپین فلاسفر کی تعلیم و تصنیف اور تقریر و خطبہ کا اثر نہیں ہے بلکہ انبیاء ہی کی بے واسطہ یا بواسطہ تعلیمات کا نتیجہ ہے، آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں کیسے ہی بدترین مبلغ سہی، مگر نیکی، عدل، احسان، ہمدردی، نکوکاری حُسنِ خلق کی تعلیم تبلیغ اور دعوت ان ہی کی زبانوں سے ہو رہی ہے، جو رسولوں کے پیرو اور پیغمبروں کے تابع ہیں، جو عقیدہ کے ملحدین ان کی بھی نکوکاری ان ہی پیغمبروں کے نادانستہ فیضانِ تعلیم کا نتیجہ ہے، اس بنا پر جو لوگ ذہنی طور سے پیغمبروں کے منکر ہیں، وہ بھی عملی طور سے اُن کی تعلیم کے مقر اور معترف ہیں، اس لئے انبیاء کا وجود تمام دنیا کے لئے رحمت بن کر ظاہر ہوا ہے، اور قرآن نے آسمانی کتابوں کو بار بار رَحْمَةً وَّ هُدًى رحمت اور رہنمائی کی غرض سے بھیجنے کا جو اعلان کیا ہے، وہ تمام تر اسی غرض و غایت کی تشریح ہے، اور اسی لئے خاتمِ نبوت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ والا صفات تمام عالم کے لئے رحمت بن کر آئی، خدا نے فرمایا،

وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ — اور ہم نے تجھکو (اے محمد) تمام دنیا کیلئے

(انبیاء - ۷) رحمت بنا کر بھیجا ہی

تائید و نصرت | انبیاء علیہم السلام جو مقصد لے کر آتے ہیں، خواہ کسی قدر مشکلات پیش آئیں کتنی ہی رکاوٹیں ہوں کتنی ہی تکلیفوں اور زحمتوں کا سامنا ہو، بالآخر وہ مقصد کامیاب ہی ہوتا ہے پیغمبروں کی سیرت اور اُن کی دعوت کی تاریخ خود اس دعوی پر گواہ صادق ہو قرآن نے کہا،

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا	اور ہماری بات اپنے رسول بندوں کیلئے
الْمُرْسَلِينَ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ	پہلی ہی طے ہو چکی ہے کہ یقیناً انہی کی مدد
وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ (الصّٰفّٰت)	ہوتی ہے اور ہمارا ہی لشکر غالب ہوتا ہی

نہ صرف اس دنیا میں بلکہ حشر کے دن بھی اُنہی کو اور اُن کے ذریعہ اہل ایمان کو کامیابی ہوگی،

إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا	بے شبہہ ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں
فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ	کی مدد اس دنیا میں کرتے ہیں، اور اس
الْأَشْهَادُ ۙ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِينَ	دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے جس دن
مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ	گنہگاروں کو اُن کے بہانے کام نہ دیں گے
سُوْٓءُ الدَّارِ (مومن - ۶)	ان پر پھٹکار ہوگی اور اُن کیلئے بُرا گھر ہوگا،

پیغمبروں پر ایسے بھی سخت وقت آتے ہیں، جب اُن کو اپنی قوم کے قبول ہدایت کی طرف سے پوری مایوسی ہوجاتی ہے، اور امید کی روشنی کسی طرف سے دکھائی نہیں دیتی، اور عذاب میں دیر ہونے کے سبب سے اُن کے منکر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اُن کو عذاب کی دھمکی جھوٹ دی گئی، تو دفعتہً امید کا دروازہ کھلتا ہے، اور خدا کی تائید و نصرت کے پرے اس طرح

آتے دکھائی دیتے ہیں کہ صالح لوگوں کے دل قبول کے لئے کھول دیئے جاتے ہیں، اور معاندوں پر کسی نہ کسی طرح عذاب آکر اُن کا استیصال ہو جاتا ہے، فرمایا،

حَتّٰٓى اِذَا اسْتَايْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا (یوسف - ۱۲)

یہانتک کہ جب پیغمبروں کو (اپنی قوم کے ایمان سے) مایوسی ہونے لگی، اور اُن کے منکروں کو خیال ہونے لگا کہ اُن سے جھوٹ کہا گیا تو ہماری مدد پہنچی

اللہ تعالیٰ کی اسی تائید و نصرت اور حفاظتِ دعوت کا یقین اُن کو ہوتا ہے کہ وہ ہر مشکل کو اس راہ میں جھیل لیتے ہیں، اور اپنے سروں کو ہتھیلیوں پر لئے پھرتے ہیں، مخالفوں کی فوج و لشکر، تیغ و خنجر اور خوف و خطر کے باوجود، اپنی دعوت و تبلیغ کے فریضہ سے باز نہیں آتے۔ اور کسی دام پر بھی مخالفوں سے صلح پر آمادہ نہیں ہوتے، منکروں کو شروع شروع میں اُن کی ظاہری بیچارگی اور تنہائی کو دیکھ کر، اُن کی ناکامی کا گمان ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اُن کے سوءظن کی تردید کرکے فرماتا ہے،

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ، (ابراھیم - ۷)

سو مت خیال کر کہ اللہ اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرے گا،

ازل کے دن ہی یہ قانون بن چکا ہے کہ سچائی کے اُن پکارنے والوں ہی کی آخر جیت ہوگی،

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ (مجادلہ)

اللہ لکھ چکا کہ میں ہی غالب ہونگا اور میرے رسول

خاتمہ اس تفصیل اور تشریح سے مقصود ناظرین کو نبوت کے اصلی کمالات کا ایک جلوہ دکھانا تھا،

نسخئی راز نہ بیمیر واشناس | آئینہ راز گو ہر واشناس

آبگینہ را نہ پنداری بدست جز دمے کہ گوہرے آری بدست

چون گہر آمد بدستت شب چراغ آبگینہ شد سیہ چون پرِ زاغ

فلسفی اندر بنِ چاہِ تژند نردبان دارد بخورشید بلند

نردبانش می برد تا چند راش پس بچاہ افتد نگون گشتہ سرش

وان پیمبر خود ز بامِ آسمان رشتہ را افگندہ سوے خاکیان

رشتۂ جان را بدین رشتہ بتاب پس برآ تا بارگاہِ آفتاب

ز آسمان پیغمبر آوازت دہد فلسفی از خاک پروازت دہد

این ز دورت رہ نماید سوے جان

وان بخواند خود ترا از کوے جان[1]

---

[1] از دیوانِ فارسی مولینا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۹ رجمادی الثانیہ ۱۳۴۹ھ ۱۹۳۰ء

شبِ ظلمت

پیغمبرِ اسلام کی بعثت کے وقت دنیا کی مذہبی اور اخلاقی حالت

اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کی ہر شے اپنے ضد سے پہچانی جاتی ہے، بارش کی خنکی سخت امس کے بعد ہی زیادہ خوشگوار معلوم ہوتی ہے، روشنی کی پوری قدر شبِ تاریک میں ہوتی ہے اور فضا جس قدر تاریک ہو، بجلی کی چمک اتنی ہی زیادہ درخشاں نظر آتی ہے تو اس میں شبہہ نہیں کہ ہر اصلاحی تحریک کی وقعت اور عظمت کے جانچنے میں یہ لحاظ رکھنا چاہئے کہ دنیا اس وقت کتنی گمراہی میں مبتلا اور اصلاح کی محتاج تھی، اور ایسی اصلاح کی محتاج تھی جس کے لئے پیغمبرانہ دست و بازو کی حاجت تھی اور وہ بھی ایک ایسے پیغمبر کے دست و بازو کی جس کے متعلق خود خدا یہ فرما سکے،

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ، (فتح - ۱)	جو تیرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں، وہ خدا کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں، اور اُن کے ہاتھوں کے اوپر خدا کا ہاتھ ہے،

اسلام یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام اور تعلیم کے متعلق ہمارا دعویٰ ہے کہ وہ دنیا کی ایک عظیم الشان روحانی و اخلاقی و معاشرتی دعوت تھی، اس بنا پر ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ظہورِ اسلام کے وقت دنیا کی کیا حالت تھی؟ اس وقت کی دنیا کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ وہ ایک ایسا کرۂ ارضی تھا

جس پر آفتاب نہیں چمکتا تھا، تو بالکل سچ ہوگا، تمام دنیا میں سچے اور صحیح عقیدہ کا کہیں وجود نہ تھا، توحید کی روشنی سے دنیا کا ذرہ ذرہ محروم تھا، مصر و یونان و روم میں سورج چاند اور مختلف ستاروں اور ستاروں کی خدائی تھی، ان ہی کے معبد تھے، اور انہی کے ناموں پر بے گناہ انسانوں اور جانوروں کی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں، ہر جگہ پتھر کی مورتوں، اور مٹی کی صورتوں اور سونے چاندی اور جواہرات کے بتوں کی پوجا کی جاتی تھی،

اس وقت کی دنیا میں اخلاق کے تین معلم تھے، رواقی، عیسائی اور بودھ مت کے پیرو، اور یہ تینوں کے تینوں تجرد، رہبانیت اور جوگی پن میں مبتلا ہو کر اس طرح عضو معطل ہو گئے تھے کہ دنیا کا دستِ ترقی شل ہو کر رہ گیا تھا، اور ایسی سخت سنگدلانہ ریاضتوں کو نیکی اور عبادت کا مرادف سمجھ رکھا تھا کہ آج اُن کی تفصیلات سننے سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں،

یہ سچ ہے کہ مسیحؑ نے چھ صدی قبل تزکیۂ نفس کے کچھ درس دیے تھے، لیکن مدت ہوئی دنیا اس سبق کو بھلا چکی تھی، یہ بھی سچ ہے کہ موسیٰؑ نے اس سے بھی پیشتر ہدایت و نجات کی ایک شمع جلائی تھی لیکن فتنوں اور ہنگاموں کی آندھی میں یہ چراغِ طور بھی جل کر گل ہو گیا تھا، اور پھر یہ بھی سچ ہے کہ مدتِ مدید ہوئی کہ زرتشت نے روحانیت کی آگ سلگائی تھی لیکن یہ شعلہ بھی انسانی خون کے چھینٹوں سے سرد ہو چکا تھا، یہ بھی سچ ہے کہ اس سے بھی پہلے بودھ نے آریہ ورت کے پہاڑوں اور غاروں میں روح کا دار الامن ڈھونڈ نکالا تھا، مگر حوادث کے طوفان نے ان پہاڑوں کو بے نام و نشان صحرا، اور ان غاروں کو درندوں کا بھٹ بنا دیا تھا، ہر قوم دوسری قوم سے برسرِ پیکار، اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے خون کا پیاسا تھا، حرص و طمع اور کشت و خون

کی گرم بازاری تھی نفسِ انسانی کی ملکوتی طاقت جذباتِ خبیثہ کے دیوتا کے سامنے پامال ہو چکی تھی، عدل و راستی، اور پاکبازی و پارسائی کے عطرِ معنبر کی خوشبو، انسان کے جامۂ خاکی سے اڑ چکی تھی، توحید اور خدا پرستی کا نور دیوتاؤں، وسیلوں، ستاروں، شہیدوں، دلیوں اور مجسموں کی پرستش کی عالمگیر تاریکی میں چھپ گیا تھا، غرض دنیا کے حالات ہر طرح سے اس ضرورت کے متقاضی تھے کہ کوئی عالم کا مصلح، اخلاق کا معلم، حق کا داعی، بنی نوع کا نجات دہندہ آخری بار وجود میں آئے اور انسانیت کے شیرازہ میں جو عرصۂ دراز سے پراگندہ و منتشر ہو رہا تھا، پھر نظم و انتظام پیدا کر دی، اور روحانیت و خدا پرستی کے خزاں رسیدہ باغ کو از سرِ نو رشکِ بہار، بلکہ سدا بہار، اور دنیا کے ظلمت کدہ کو پھر مطلعِ انوار بنا دے،

یہ اس عہد کی دنیا کی حالت کا ایک اجمالی خاکہ تھا تفصیل کے لئے ہمیں مختلف قوموں اور اُن کے مذہبوں کی تاریخ پر ایک ایک کر کے نظر کرنی چاہیئے،

ظہورِ اسلام کے وقت دنیا کی تمدنی اور مذہبی حالت کیا تھی؟

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت مصر، یونان، کلدانیا، اسیریا اور بابل کی عظمت افسانۂ پارینہ بن چکی تھی، خود عرب، مضافاتِ عرب میں جو نامور حکومتیں کبھی تھیں، مثلاً نابتی، حمیری، سبائی وغیرہ مدت گذری کہ ان کا خاتمہ ہو چکا تھا،

اس موقع پر صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ صبحِ سعادت کے طلوع کے وقت کون کون قومیں دنیا میں حکمران تھیں اور اُن کی مذہبی و اخلاقی حالت کیا تھی، اور دنیا کے مذاہب اس وقت کی روحانی حالت کے سنبھالنے کی کہاں تک استطاعت رکھتے تھے، اس وقت روئے زمین کی اہم طاقتیں دو ہی تھیں، فارس اور روم، فارس کا مذہب مجوسیت تھا جس کا دائرہ عراق سے لیکر ہندوستان کی سرحد تک محیط تھا، اور روم کا مذہب عیسوی تھا، جو یورپ، ایشیا و افریقہ کے تینوں برِّاعظموں

کو گھیرے تھا لیکن مذہبی حیثیت سے دو اور قومیں بھی ذکر کے قابل ہیں جن میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ قدامت کا دعویٰ ہے، اور وہ یہود اور ہنود ہیں،

مجوس فارس | عرب کی پہلی ہمسایہ سلطنت فارس تھی، جس کے تمدن کا ستارہ ایک زمانہ میں اوجِ کمال پر تھا، مگر عہدِ بعثت سے سو ڈیڑھ سو برس پہلے سے ساسانی شان و شوکت اور کیانی جاہ و جلال مٹتے مٹتے سایہ سا رہ گیا تھا، مسلسل بغاوتوں، سفاکانہ خونریزیوں اور سیاسی بدنظمیوں نے اس کو تہ و بالا کر دیا تھا، بادشاہوں کے ظلم و ستم اور امرا کی عیاشیوں اور خود غرضیوں نے صداقت، خلاص اور ہر قسم کے اخلاقی جوہر کو جس کے خمیر سے قوم کی زندگی تعمیر ہوتی ہے، فنا کر دیا تھا،

ایران میں بابل کے اثر سے ستارہ پرستی بہت عام تھی، اُسی کا اثر ہے کہ فارسی لٹریچر میں افلاک اور ستاروں کی کارفرمائی آج تک نمایاں ہے، زردشت نے اس تاریکی میں اپنی آگ روشن کی، اور نور و ظلمت یا خیر و شر کے دو خالق یزدان و اہرمن اُس کے دو خدا اور آگ اُسکی مسجود بنی، اسلام سے کچھ صدیاں پیشتر مانی نے مسیحیت اور مجوسیت کی آمیزش سے مذہب کا ایک مُرقع تیار کیا تھا جس میں نور و ظلمت کے فلسفہ کا ایسا گورکھ دھندا بنایا تھا جس کا اخیر تک آپ قوم کو سلجھانا نصیب نہ ہوا، اُس کی تعلیم یہ تھی کہ دنیا سے گوشہ گیری کر کے اُس کو ویران و برباد اور ترکِ ازدواج سے نسلِ انسانی کو منقطع کر دیا جائے، تاکہ بدی کا خاتمہ ہو جائے[1] اخلاقی حیثیت سے محرمات کا وجود ہمیشہ اُن کے اِن مختلف فیہ رہا باپ کی بیٹی کو اور بھائی کا بہن کو اپنی زوجیت

[1] کتاب الفہرست ابن ندیم ذکر مانی و کتاب البدء [2] تاریخ مقدسی فرقہ مانویہ [3] تاریخ غرر اخبار الفرس ثعالبی مطبوعہ پیرس ص ۵۰۲،

کوئی غیر معمولی بات نہ تھی[1] یہ سُن کر کس قدر حیرت ہوگی کہ یزدگرد ثانی جو پانچویں صدی عیسوی
کے وسط مین وہان کا بادشاہ تھا، اُس نے اپنی بیٹی سے اپنا عقد کیا، اور پھر اُس کو قتل کر ڈالا[2]
عورتون کو اس قوم اور اس مذہب مین جو حیثیت حاصل تھی، وہ اُن افسانون اور مقولون سے
ظاہر ہے، جو ایرانی ادبیات کا اب بھی جزء ہیں، اور جو شاہنامہ کے اوراق مین اب بھی ہر شخص کو
نظر آسکتی ہے، عورتون کی بیوفائی، بداخلاقی اور اُن پر عدم اعتماد پرانے ایرانی تمدن کا سب سے بڑا جزء تھا

سلاطین اور امراء درجہ بدرجہ رعایا کے خدا اور دیوتا تھے، جن کو سجدے کیے جاتے تھے[3] اُنکی
الوہیت کے گیت گائے جاتے تھے، اُن کے دربار مین کوئی بیٹھ نہین سکتا تھا، اُن کے خلاف
کوئی لب کشائی کی جرأت نہین کرسکتا تھا، اُن کے جرائم پر اُن کو سزا نہیں دیجاسکتی تھی رعایا اُن کے
مظالم کے سامنے دم نہیں مار سکتی تھی

ملک کا بڑا حصہ رومی عیسائیون کی دائمی جنگ سے پریشان حال تھا، اور گرجاؤن اور
آتشکدون کی باہمی آویزش کا غیر مختتم سلسلہ قائم تھا، جب رومی فاتح ہوتے، تو آتش خانے ٹوٹ کر
کلیسے بن جاتے، اور جب ایرانی غالب آتے تو کلیسے ٹوٹ کر آفتاب دیوتا کے معبد اور آتش خانے تعمیر
ہوجاتے، یہودیون پر جو مظالم توڑے جاتے تھے، اُس کا ایک مختصر سا نقشہ توراۃ کے قصۂ ایسترین
نظر آتا ہے، اور بعد کو مفتوح عیسائیون پر وہ جس جس طرح ظلم کرتے تھے، اسکی تفصیل گبن کے اوراق

---

[1] تاریخ غرر اخبار الفرس ثعالبی، مطبوعہ پیرس صفحہ ۲۰، ابوداؤد میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ مین حکم دیا کہ
مجوسیون کو اس فعل شنیع سے باز رکھا جائے، (کتاب الخراج والامارۃ) واقعی جلد دوم ص ۲۶ [2] مورخون کی تاریخ
عالم ج ۳ ص ۸۴، [3] غرر اخبار الفرس ثعالبی ص ۵۰۰، پیرس،

مین منتشر طور پر ملے گی،

بعثت سے پہلے جہانبانی کا قرعہ قباد اوّل بن فیروز کے نام پڑا، بیرونی حملوں اور اندرونی بدنظمیون کا سلسلہ روز بروز بڑھتا گیا، آخر رعایا نے قباد کو قید کردیا[۱]، قباد نے قیدخانہ سے بھاگ کر تاتاریون کے پاس پناہ لی، اور اُن کی اعانت سے دوبارہ تاج حاصل کیا، لیکن ملک پر اس سے بھی زیادہ مصیبت یہ نازل ہوئی کہ اُس کے عہد مین مزدک نام ایک شخص پیدا ہوا، جو اس امر کی تعلیم دیتا تھا کہ دولت اور عورت کسی خاص شخص کی ملک نہین، بلکہ اُن کو تمام جماعت مین مشترک ہونا چاہئے، چنانچہ ایک شخص کی بیوی مزدک کے عقائد کی رو سے، ہر شخص کے ساتھ ہم بستر ہوسکتی تھی، عیش پرست اور ہوس ران امرا اور عوام دونون نے اسکو خوشی خوشی[۲] قبول کیا، اس مذہب نے بہت جلد شاہی سایہ مین ترقی حاصل کی، اور خود قباد نے اس دین کی ترویج واشاعت مین نمایان حصہ لیا، قوم کی اخلاقی حالت پر اس تعلیم کا جو اثر پڑ سکتا ہے، وہ ظاہر ہے نتیجہ یہ ہوا کہ سارا ملک عیش پرستی، اور ہوس رانی کے نشہ مین سرشار ہوگیا،

۵۳۱ء مین قباد کی جگہ خسرو نوشیروان نے لی، ایرانیون مین اس کی عدل پروری آج تک مشہور ہے، مگر اس کو یہ مبارک لقب اپنے عزیزون اور افسرون اور ہزارون بےگناہون کے قتل کے بدولت ملا، مزدکی فتنہ کو اُس نے تلوار کے زور سے دبانا اور دوبارہ کیش زردشتی کو فروغ دینا چاہا، مگر خود اس کا بیٹا نوشزاد تثلیث پرستی کی طرف مائل تھا، اُس کے باپ نے اُس کو قید کیا، وہ قید سے بھاگ کر ایک عیسائی فوج لیکر زردشتیون سے صف آرا ہوا، اور مارا گیا،

---

[۱] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم جلد ۲۱، ص ۲۲۳، [۲] غرراخبار الفرس ثعالبی ص ۵۹۰، پیرس،

۵۷۹ء میں نوشیروان نے وفات پائی، اور ایران کا پایۂ تخت، ہرمز چہارم کے حصہ میں آیا، اغیار کی دست اندازیوں کے ساتھ اندرونی بدنظمی، اور باہمی خانہ جنگی، بادشاہوں کی تن آسانی شعاری، امرا کی عیش پرستی اور عوام کے اخلاقی انحطاط میں برابر ترقی ہی ہوتی گئی، یہاں تک کہ ۶۳۲ء میں مجاہدین اسلام کی فتحمندی کے طوفانی صرصر کے سامنے ملک فارس کی ٹمٹماتی ہوئی شمع ہمیشہ کے لئے بجھ گئی،

اوپر کے بیانات سے معلوم ہوا ہوگا کہ ایران کی سرزمین نغمۂ توحید سے کبھی گوش آشنا نہیں ہوئی اخلاق کے متعدد ابواب ہیں، جو اُن کے آئین میں کبھی داخل نہیں ہوئے، یزدان واہرمن، نور وظلمت اور خیر وشر کی بھول بھلیوں نے اُن کو ہمیشہ سرگردان رکھا، حکومت اور شاہی کے متعلق اُن کا تخیل خدائی کا مرتبہ تھا، اسلام و فارس کی جنگ میں مغیرہ بن شعبہؓ مسلمانوں کی طرف سے سفیر بن کر جب سپہ سالار ایران کی بارگاہ میں گئے، اور آزادی کے ساتھ جاکر اس کے برابر بیٹھ گئے، تو ایرانی امیروں کو اس میں اپنے نائب السلطنت کی توہین نظر آئی، اور مغیرہؓ کو سامنے سے ذلت کے ساتھ اٹھا دیا، انھوں نے جواب میں کہا ہم عربوں کا یہ دستور نہیں کہ ایک خدا بن کر بیٹھے، اور دوسرے اُس کے سامنے غلامی اور بندگی کریں[1]،"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے تقریباً ڈیڑھ صدی پیشتر سے ایران میں جس قسم کا سیاسی انحطاط شروع ہوگیا تھا، وہ روز بروز بڑھتا ہی گیا، اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ فارس کے روحانی آتشکدہ میں اب زندگی کی کوئی چنگاری باقی نہیں رہ گئی تھی، اسی لئے جب اسلام کا نور طلوع ہوا، تو اس کے شیوع کے لئے کوئی دوسرا پردہ بیچ میں حائل نہ ہوا، سرجان ملکم جن کا مسیحی تعصب

---

[1] تاریخ طبری واقعات ۱۴ھ ص ۲۲۷۰، مطبع بریل۔

عساکر اسلامی کو اُن کی زبان سے "قزاقانِ عرب" کا لقب دلواتا ہو۔ فتحِ فارس کے متعلق حسبِ ذیل رائے دیتے ہیں،

"یزدجرد ثالث کا عہدِ حکومت اسلئے یادگار ہو کہ اسی زمانہ میں فارس کی قدیم شہنشاہی کا تختہ برہنہ تن "سوسمار خواروں" کے ایک ستہ نے الٹ دیا کہ اسی تحقیر آمیز لقب کیساتھ عرب قبائل کے یہ معدودہ ہمسایہ اُن کا ذکر کرتے تھے، اس انقلاب عظیم کی علت کوئی معمولی سبب نہیں ہوسکتا (مسلمان) فارسی مورخین کچھ تو اپنے حبِ وطن اور کچھ اپنی وہم پرستی کی بنا پر اس واقعہ کو ایک معجزۂ عظیم خیال کرتے ہیں، جس کے ذریعہ سے خدا نے محمد کی صداقت کو ظاہر کر دیا، لیکن جو لوگ دنیاوی حیثیت سے اس واقعہ پر غور کرتے ہیں، انھیں فوراً نظر آجاتا ہے کہ فارس کی ایسی سلطنت جو عیش پرستی کے ہاتھوں لاغر و نحیف ہو چکی ہو جس میں اندرونی مناقشات کے باعث بدنظمیاں پھیلی ہوئی ہوں، جو بیرونی محاربات سے یکسر خستہ و ناتوان ہو، اور جو اپنی کہنہ سنی اور نقاہت سے تنزدال کی جانب خمیدہ پشت ہو، اس کے لئے پرجوش "قزاقانِ عرب" کی مدافعت کرنا سخت دشوار تھا"[1]

مگر سوال یہ ہے کہ پاک نژاد ساسانیوں کی خستگی و ناتوانی، نقاہت و کمزوری "قزاقانِ عرب" ہی کی ترقی کی کیوں تمہید بنی؟ کیا نعوذباللہ عربوں کے پاس اس سے زیادہ سامانِ جنگ اور سپاہی تھے جو عراق و ایران کے اخیر اخیر معرکوں میں بھی ایرانی عربوں کے مقابلہ میں لاتے رہے، واقعہ یہ ہے کہ زرتشت کی آگ میں اب گرمی نہیں باقی رہی تھی، نور و ظلمت، خیر و شر، نیکی و بدی کے فلسفہ نے ایران کی ہر قسم کی عملی طاقت فنا کر دی تھی، "یزدان اور اہرمن" کی دو عملی حکومت نے روحانی امن و امان کی سلطنت برباد کر دی تھی، بیسیوں چھوٹے بڑے فلسفیانہ مذہبی فرقے

[1] علامہ صاحب کی تاریخ ایران جلد اول ص ۱۳۲

پیدا ہوگئے تھے جن میں سب سے اہم مانوی فرقہ تھا، جو عیسائیت اور مجوسیت کا معجون مرکب تھا،
آخر میں مزدک کی فرقہ کی بہیمانہ تعلیم نے ایران کی اخلاقی روح کو اور بھی موت کے قریب کردیا، نوشیروان
نے تلوار کی نوک سے اس فتنہ کو دبایا، اور اس کے صلہ میں "بادشاہ عادل و دادگر" کا خطاب بھی
پایا، تاہم ایران کی روحانی زندگی ان خون کے چھینٹوں کے بعد بھی اسی طرح تشنہ لب رہی جس طرح
پہلے تھی، اور منتظر تھی کہ دنیا کے خشک صحرائے عرب سے چشمہ ابل کر ادھر آئے، تو وہ اپنی پیاس بجھائے

عیسائی روم | آغازِ اسلام کے وقت جس قدر ایران کے جسمانی و روحانی شہنشاہی کے اوراق منتشر
و پراگندہ تھے، روم کی قبائے سلطنت اس سے کچھ کم کرم خوردہ نہ تھی، حالانکہ یہ وہی روم الکبریٰ ہے
جو یونان کے زوال کے بعد دنیا کی سب سے بڑی سلطنت سمجھی جاتی تھی، اور جس کے ایک تاجدار جولیس
سیزر کا نام ہمیشہ کے لئے قیصر کی صورت میں بادشاہ و شہنشاہ کے مرادف بن گیا حضرت عیسیٰ
علیہ الصلوٰۃ والسلام اسی سلطنت میں مبعوث ہو کر دنیا کو امن و سلامتی کا پیام سنا کر رخصت ہوئے
اُن کے رفع و صعود کے بعد ہی اُن کے شاگردوں میں فرقہ آرائیاں شروع ہوئیں، اور بالآخر پال
نے جو ایک نو عیسائی یہودی تھا، اس طرح عیسائیوں پر غلبہ پایا کہ اس کے بدعات کی خاک
میں اصلی عیسویت ہمیشہ کے لئے دفن ہوگئی، اور باپ بیٹے روح القدس کا مشرکانہ عقیدہ اس میں داخل
ہوگیا اور توراۃ جس کا کوئی نقطہ خود حضرت عیسیٰؑ بھی مٹا نہیں سکتے تھے[۲] وہ اُن کی روحانی شاگردی کے
مدعی (پال) کے ہاتھوں ہمیشہ کے لئے لعنت[۳] قرار پائی، ۳۲۵ء میں رومی سلطنت کے مشرقی و مغربی

[۱] تفصیل کے لئے فہرست ابن ندیم دیکھو صفحہ ۴۴۲ مصر [۲] انجیل متی ۵ - ۱۷ - ۱۸ [۳] یہ خیال میں عیسائیوں کی
انجیل کے حصہ اعمال، اور خطوط میں جا بجا بتصریح مذکور ہے،

دو حصے ہو گئے، مشرقی حصہ کے تاجدار قسطنطین اعظم نے عیسائی مذہب اختیار کیا، اور رفتہ رفتہ پوری رومی حکومت میں یہ مذہب پھیل گیا، مگر درحقیقت اس مشرقی تاجدار روم کے اس قبول مذہب کا جذبہ اخلاص و صداقت سے زیادہ سیاست اور سلطنت کی مصلحت پر مبنی تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اب باپ بیٹے اور روح القدس کی تثلیثی الوہیت میں ہر نیا ملک جو فتح ہوتا اس کا دیوتا کسی نہ کسی نام اور رسم سے اس مذہب میں شامل ہو جاتا، تخت سلطنت کے غیر متوقع حصول نے مذہبی خاکساروں میں یہ حوصلہ پیدا کر دیا کہ کلیساؤں نے مذہبی شہنشاہی کا خواب دیکھنا شروع کر دیا، اس کے نئے عقائد کی وہ لڑائیاں کھڑی کی گئیں کہ شاہانہ سایہ میں بیٹھکر کونسلوں نے خدا کے دین کا خاکہ تیار کیا، اتحاد اور اجتماع کی ہر نئی کوشش نئی مذہبی تفریق کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، اور ایک عیسوی مذہب کے ایک صدی کے اندر اندر بیسیوں فرقوں میں تقسیم ہو گیا،

۳۳۷ء میں قسطنطین کی وفات پر مذہبی خانہ جنگیوں کے ساتھ ساتھ رومیوں کی سیاسی خانہ جنگیوں کی زیر خاکستر آگ بھی زور شور سے شعلہ زن ہوئی، اعیان سلطنت میں مختلف گروہ بن گئیں، اور باہمی نفاق اور فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو گیا، بالآخر سلطنت روم مختلف صوبوں میں تقسیم ہو کر مختلف دعویداروں حکومت کے حصہ[1] میں آئی، ناقابل فرمانرواؤں کی کمزوری دیکھکر ایک طرف گوتھ، ونڈال وغیرہ بعض وحشی قوموں نے حملے شروع کئے، اور دوسری طرف خود دور افتادہ صوبوں کی رعایا بغاوت پر آمادہ ہو گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں سلطنت روم کا مغربی بازو جو برطانیہ، فرانس وغیرہ پر مشتمل تھا، بالکل کٹ گیا، اور خود روم کا

---

[1] گبن کی تاریخ زوال و انحطاط سلطنت روم" جلد اول ص ۴۸۸، ۴۹۱،

دارالحکومت دشمنون کے حملون سے محفوظ نہ رہ سکا[1]، اس وقت یعنی پانچوین صدی کے بیچ مین لوگون کو صاف نظر آرہا تھا کہ اُن کے مورث اعلیٰ نے جو بارہ کرگسون کو خواب مین دیکھا تھا اور جس کی بنا پر اس زمانہ کے کاہنون نے پیشگوئی کی تھی کہ یہ سلطنت بارہ صدیون تک قائم رہے گی، اب اس پیشگوئی کے پورا ہونے کا وقت آگیا، مورخ گبن اس زمانہ کی تصویر ان لفظون مین کھینچتا ہے :-

"اس پیشگوئی نے جس پر اس قوم نے اپنے عروج واقبال کے زمانہ مین کبھی اعتنا بھی نہ کی تھی، اب بارہ صدیون کے خاتمہ پر جب کہ ہر طرف سے ذلت اور بدقسمتی کا سامنا تھا، اہلِ روم کو یاس آمیز جذبات سے پُر کردیا... لیکن اُن کے زوال کی علامتین کرگسون کے خواب سے زیادہ واضح و نمایان موجود تھین، رومن حکومت مخالفین کی نظرون مین روز بروز زیادہ کمزور اور خود اپنی رعایا کی نظر مین زیادہ ظالمانہ اور ناقابلِ برداشت ہوتی جاتی تھی، کفایت شعاری جتنی زیادہ ضروری ہوتی جاتی تھی، اُسی نسبت سے اُسکی جانب سے بے اعتنائی بڑھتی جاتی تھی، اور جس نسبت سے رعایا کے مصائب روز افزون تھے، اسی نسبت سے ٹکس مین اضافہ ہوتا جاتا تھا[2]"

امرا نے اپنے مصارف کا بار بھی عام رعایا پر ڈالنا شروع کیا جس کے باعث وہ اپنی قلیل آمدنی سے بھی محروم ہوگئی، محصول کی عدم ادائگی کی صورت مین، رعایا پر اس قدر جبر کیا جاتا تھا کہ اس کے دل مین حکومت کی طرف سے نفرت عداوت پیدا ہوگئی یہان تک کہ وہی رومن قوم جو کبھی اپنے اس لقب پر فخر کرتی تھی، اب اپنے کو اس قوم کی طرف منسوب کرتے شرمانے لگی اور رومن حکومت پر بربر وحشی سے وحشی سلطنت کی محکومیت کو ترجیح دینے لگی، امرا، وزرا، اور سلاطین خود

---

[1] گبن کی تاریخ زوال وانحطاط سلطنتِ روم" جلد دوم باب ۳۶ و باب ۳۸ [2] ایضاً ۲۰۴،

اپنی ناعاقبت اندیشیوں سے رعایا کو اپنا دشمن بناتے، اور جب بغاوت ہوتی تو فوج کشی کرتے، اور
ناکام رہتے، غرض اندرونی بدنظمیوں سے ملک کی یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ گبن کے الفاظ میں

"اگر اس وقت روم کے تمام بیرونی وحشی مخالفین فنا بھی ہو جاتے، تو ان کی مجموعی معدومیت
بھی سلطنت کے مغربی بازو کو زوال و بربادی سے نہیں بچا سکتی تھی"[1]

پانچویں صدی کے خاتمہ پر مغربی حصہ کے نکل جانے کے بعد مشرقی صوبوں تک یعنی ڈینوب
سے لیکر دجلہ و نیل تک کی سرزمین روم کے ماتحت رہ گئی تھی لیکن اس کی حالت بھی روز بروز
نازک سے نازک تر ہوتی جاتی تھی، مورخین کا بیان ہے کہ رومن فوج کی مجموعی تعداد، جو ایک زمانہ میں
۶۴۵۰۰۰ تھی، اب شاہ جسٹینین کے زمانہ میں (یعنی ۶ ص۵ء) گھٹکر ایک چوتھائی سے بھی کم یعنی
کل ۱۵۰۰۰۰ رہ گئی تھی، اور وہ بھی نہایت متفرق و ابتر حالت میں، رعایا کی جیبیں خالی تھیں فوج
کی تنخواہیں چڑھی ہوئی تھیں، اور امرار و اعیان سلطنت اپنے ذاتی مصارف کے لئے ہر طرح
کے جعل و فریب، رشوت ستانی، اور لوٹ مار کو جائز رکھتے تھے، فوج میں یوں تو بہت
سے سپاہیوں کے نام لکھے ہوئے تھے لیکن میدان جنگ میں جانے کے وقت بہت تھوڑے سے
لوگ تیار ہوتے، فوجی افسر فن جنگ کے بجائے اپنا وقت باہمی حسد و رقابت میں صرف کرتے
اور ہر افسر کی یہ کوشش رہتی کہ دوسرے افسر کی بدنامی و ذلت سے فائدہ اٹھا کر خود ترقی و
منصب حاصل کرتے"[2]

اندرونی بدنظمیوں پر مستزاد یہ تھا کہ بیرونی غنیم اہل روم کو ایک دم کے لئے چین سے بیٹھنے

[1] گبن کی تاریخ زوال و انحطاط سلطنت روم، جلد دوم ص ۱۶۴، [2] حوالۂ مذکور جلد ۲ ص ۱۱۳

نہیں دیتے تھے، روم و فارس کے درمیان مدت سے لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا، پھر لومبارڈس، گوتھس، ونڈالس وغیرہ کے پیہم حملے، روم کی رہی سہی قوت کو اور بھی پامال کر رہے تھے،

الغرض چھٹی صدی عیسوی کے خاتمہ پر یعنی خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے دو چار سال بعد، روم بقول گبن کے، اپنے زوال کے پست ترین نقطہ تک پہنچ گیا تھا، اور (گبن کی زبان میں) اس کی مثال بعینہٖ اس عظیم الشان درخت کی ہو گئی تھی، جس کے سایہ میں ایک وقت تمام اقوامِ عالم آباد تھیں، مگر اس پر ایسی خزان آئی، کہ برگ و بار کے ساتھ اسکی شاخیں اور ٹہنیاں بھی رخصت ہو گئی تھیں، اور اب خالی تنہ خشک ہو رہا تھا خود پایہ تخت کے اندر غنیم کے گھس آنے کا ایسا خوف تمام آبادی پر چھایا ہوا تھا کہ تقریباً کل کاروبار بند ہو گئے تھے، وہ بازار اور تماشا گاہیں جہاں دن رات چہل پہل رہتی تھی، اب ویران اور سنسان پڑی تھیں، عیش پرستی کا یہ عالم تھا کہ لوگ ایک عرصہ سے تاہل کے بجائے تجرد کی زندگی زیادہ پسند کرتے تھے، تاکہ زیادہ آسانی اور آزادی کیساتھ اپنے شہوانی جذبات کی تشفی کر سکیں،

ملک کی عام سیاسی و اخلاقی حالت سے قطع نظر کر کے جب ہم مذہبی پہلو پر نظر کرتے ہیں تو اس سے بھی زیادہ دلخراش تصویر نظر آتی ہے، بُت پرست رعایا کو چھوڑ کر جو ستاروں، دیوتاؤں اور بتوں کی پوجا میں بدستور مصروف تھی، وہ لوگ جنھوں نے عیسائیت قبول بھی کر لی تھی، وہ بھی باپ، بیٹا، روح القدس، اور مریم کی خدائی کے معتقد تھے، حضرت عیسیٰؑ اور مریمؑ اور روح القدس کی شخصیت اور مرتبہ کی تعیین نے بیسیوں فرقے پیدا کر دیئے تھے، جن میں زبانی مناظروں سے گذر کر

گبن جلد ۴، ص ۲۲۲،

جنگ وجدل کی نوبت آگئی تھی، یہانتک کہ ۴۲۵ء میں خود عیسائیون کے دو گروہون کے درمیان
ایک عظیم الشان مذہبی جنگ چھڑی جس میں ۵۰۰۰ عیسائیون کو خارج البلد ہونا پڑا [۱] اس جنگ عظیم
کے علاوہ ہمہ وقت ہر فریق دوسرے فریق کے خون کا پیاسا رہا کرتا، اور بارہا چھوٹی چھوٹی باتون
پر کشت وخون کی نوبت آجاتی، پادریون نے اپنے منصب مذہبی کو حصول جاہ کا ایک ذریعہ قرار
دے لیا تھا، اس بنا پر محض حُبّ جاہ کی خاطر وہ ہر طرح کی ناجائز کوششون میں مصروف رہتے،
پادریون کے ایک اسقف اعظم، سینٹ سرل نے جو جو سفاکیان کی ہیں، اُن کی تفصیل کیلئے
ایک پوری کتاب درکار ہے، [۲] ایک مرتبہ اُس نے اپنے مریدون کو ہمراہ لیکر غیر مسلح یہودیون
پر دھاوا کیا، اوران سب کو جلا وطن کر دیا، ان کا مال اسباب سرل کے مریدون کے ہاتھ لگا
اوراُن کے معابد زمین کے برابر کر دیئے گئے، [۳] سرل کا حریف ارسٹس نامی پادری تھا، ایک
روز جب ارسٹس راستہ سے گذر رہا تھا، تو ۵۰۰ راہبون کی جماعت اس پر ٹوٹ پڑی اور اپنی
سنگ باری سے اس کو خون میں نہلا دیا [۴]، سرل کی ایک خاتون دوست ہپیشیا نامی تھی، ایک
روز وہ اپنی درسگاہ سے واپس آرہی تھی کہ راہبون کے ایک بہت بڑے گروہ نے اس پر حملہ کر دیا،
گاڑی سے اُتار کر برہنہ کی گئی، اوراس حالت مین تمام شہر کی سڑکون پر گھسیٹتے ہوئے اُسے کلیسا
میں لائے، جہان پہنچکر پادری پیٹر کے گروہ نے اس کا خاتمہ کر دیا گیا، قتل کے بعد اس کا گوشت
ہڈیون سے جدا کیا گیا، نعش کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے، اور آلایش جسم کو آگ مین ڈال دیا گیا [۵] یہ افعال
ایسے ہیں جن کے ذکر سے آج قلم لرزتا ہے، مگر عیسائی مذہب کے علمبردارون کا سب سے روشن کارنامہ ہے،

---

[۱] گبن جلد ۳ صفحہ ۴۴۴، [۲] ایضاً صفحہ ۳۲۷، [۳] ایضاً، [۴] ایضاً، [۵] ڈریپر تاریخ معرکہ آرائی مذہب سائنس صفحہ ۵۵،

یہی حالت اُن تمام ملکون کی تھی، جہان رومیون کے زیر سایہ عیسوی مذہب پھیلا ہوا تھا، یعقوبی
نسطوری، اور دوسرے فرقے جو سرکاری عیسوی مذہب سے الگ تھے، وہ دور دراز صوبون
ملکون مین اپنی پناہ ڈھونڈھتے تھے، نائیس کی کونسل کے بعد آریوس اور اُس کے حریفون مین جو
معرکہ آرائیان ہوئین، انھون نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ "شہزادہ امن" کا مذہب ان جنگجویون
کے ہاتھون تباہ و برباد ہونے سے بچ نہیں سکتا،

مسٹر مارس، جو پیغمبر اسلام کو نعوذ باللہ، بہت بڑا مکار قرار دیتے ہیں، اپنی تاریخ ہندستان
میں ضمناً ایک موقع پر تحریر کرتے ہین :-

"اس نازک موقع پر (یعنی ظہور اسلام کے وقت) ان بے باکانہ بدعات کے درمیان جو
چرچ کو نجس کر رہے تھے، اور اختلافات کے اس غیر منقطع سلسلے کے درمیان جو چرچ مین ایک تجلی
ڈالے ہوئے تھی، اگرچہ مشرق مین اصلی مسیحیت کی شعاع نظر آتی تھی لیکن بہت ہی مدھم، روم
کے قیصرون کی قوت کچھ تو اندرونی نزاعون اور کچھ بیرونی حملون کے باعث اپنی بنیاد سے
اکھڑ اکھڑ کر فنا کی طرف تیز رفتاری کے ساتھ جا رہی تھی، یہود بے صبری کے ساتھ تکمیل کر رہے اس
حقیر شخص کے مذہب پر نظر کر رہے تھے جس کے دین کو اب شاہ قسطنطین کے مسیحی ہو جانے کے
بعد پوری شان و شوکت اور شاہی عظمت حاصل ہو گئی تھی، اور پھر اس تحریک کی مدد کیلئے
تیار تھے، جو ایسے قابل نفرت مذہب کا خاتمہ کرنا چاہے.... اہل فارس نہایت غیظ و غضب
کیساتھ ان پرجوش و نادار فتحمند عیسائیون کو دیکھ رہے تھے جنھون نے انکے معبود آتش شمسی کی
بے حرمتی کی تھی، اور شرک کی ساری دنیا اپنے برباد شدہ معبودون اور ڈھئے ہوئے معبدون کی

ماتم کر رہی تھی، اُن کے انتقام کے لئے آمادہ اور مستعد تھی۔[۱]"

مارس صاحب واقعات کی نقشہ کشی مین خواہ کتنا ہی سیحی رنگ بھرین لیکن نفس واقعات کی صحت اُن کو شاید ہم سے بھی زیادہ مسلّم ہے،

بہرحال مورخین کا بیان ہے کہ تیسری صدی سے لے کر ساتوین صدی تک مسیحیت کی جو حالت رہی ہے، وہ اس کے لئے باعثِ ننگ ہے، مشرکانہ رسوم نے مذہب کی جگہ لے لی تھی، اہل رومی بُت پرستانہ عقیدون نے مسیحی مذہب کا روپ بھر لیا تھا حضرت مسیح کے ناسوتی اور لاہوتی دو عنصروں کی تحلیل، مصر کو قابو مین لاکرنے کے لئے کی گئی جس سے حضرت مسیح "کی نہی ایک ہی" کی تعلیم ہمیشہ کے لئے اُن کے مذہب سے مٹ گئی، ضعیف الاعتقادی اس اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ قبر پرستی عام ہو گئی تھی، اور ہر بڑے پادری سے اس کی وفات کے بعد دعا مانگی جاتی تھی، ملک شام میں جو بڑے پادری اور بطریق تھے، اُن کے معتقد اُن کو سجدے کرتے تھے،[۲] مسیح و مریم، روح القدس اور حوارین اور مسیحیت کے دیگر اساطین کے مجسمے بنا کر اُن کی پرستش اس کثرت سے ہونے لگی کہ اُس کی نظیر زمانۂ مابعد کے رومن کیتھولک فرقہ کی بت پرستی میں بھی نہیں ملتی،[۳]

سیل صاحب ترجمۂ قرآن کے دیباچہ مین لکھتے ہین:-

گرجا کے پادریون (CLERG) نے مذہب کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے اور امن، محبت اور نیکی کو مفقود کر دیا تھا اصل مذہب کو بھول گئے تھے اور اُس کے متعلق اپنی خیال آرائیون

---

[۱] مارس کی تاریخ ہندوستان، جلد اول ص ۱۸۳ [۲] سنن ابن ماجہ باب حق الزوج علی المرأۃ [۳] سیل صاحب کا انگریزی ترجمۂ قرآن، مقدمہ ص ۲۵ و ۲۶)

پر جھگڑتے تھے، اسی تاریک زمانہ میں اکثر وہ توہمات جو رومن چرچ کے لئے باعث ننگ ہیں، مذہبی صورت میں قائم کئے گئے، خصوصاً ولیوں اور مجسموں کی پرستش نہایت بے شرمی سے ہونے لگی"

نیس کی کاونسل کے بعد شرقی چرچ روزانہ کے مناظرات میں مشغول ہوگیا۔ اور ایرینس سلبنس، نسطورنیس، اور یوٹیکینیس کے جھگڑوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا، انصاف علانیہ فروخت کیا جاتا تھا، اور ہر طرح کی بدعنوانیاں ہوتی تھیں۔

مغربی چرچ میں ڈیمیسس اور اسیسی نس نے بشپ کی جگہ حاصل کرنے کیلئے قتل تک نوبت پہنچا دی، اور آخر ڈیمیسس کی فتح ہوئی، اس موقع پر کہا جاتا ہے کہ سسی نینس (Siciminus.) کے گرجا میں ... ... ایک روز میں ۱۳۷ آدمی قتل کئے ہوئے پائے گئے، اور کوئی حیرت نہیں کہ یہ لوگ ان جگہوں کے اس قدر خواہاں ہوتے تھے، کیونکہ اس ذریعہ سے اُن کو گران بہا تحفے ملتے تھے، اپنی گاڑیوں پر نہایت تزک و احتشام سے نکلتے تھے، اور اُن کے دستہ خوان پر بادشاہوں سے زیادہ شان و شوکت ہوتی تھی"۔

ان مناقشات کا سبب زیادہ تر شہنشاہ ہوا کرتے تھے، جسٹنین کے وقت میں حالت اور زیادہ خراب ہوگئی، اُس کے نزدیک اپنے عقیدہ کے مخالفوں کو مار ڈالنا کوئی جرم ہی نہ تھا۔

بادشاہوں اور پادریوں میں عقائد اور اخلاق کی جو خرابیاں پھیلی ہوئی تھیں، اُس کا لازمی نتیجہ تھا کہ عوام کی حالت بھی مبتذل ہوگئی، اُن کا مقصد صرف روپیہ پیدا کرنا رہ گیا، خواہ کسی ذریعہ سے ہو اور اس روپیہ کو وہ نفاست اور عیاشی میں اُڑاتے تھے"

عقائد کی خرابی کے علاوہ روم اور فارس کی سلطنتیں بھی کمزور ہو گئی تھیں، شہنشاہ قسطنطین کے بعد روم کی سلطنت روز بروز کمزور ہوتی گئی، عام طور سے اُس کے جانشین بزدلی اور ظالم کیلئے مشہور تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت تک ملک کا مغربی حصہ گاتھ لوگون نے ۵۴۶ء میں انھیں روند ڈالا تھا،...... یونانیون کی عیش پسندی اور اخلاقی خرابیون نے اُن کی قوت کو زائل کر دیا تھا، رومیون نے عیسوی مذہب کو جس صورت میں قبول کیا تھی، اس کی تصویر ڈریپر کے الفاظ مین حسب ذیل ہے،

"دونون (عیسائیت اور بت پرستی) کی باہمی کشمکش کا یہ نتیجہ ہوا کہ دونون کے اصول شیر و شکر ہو گئے، اور ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا جس مین بُت پرستی و عیسائیت دونون کی شانین پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھین[۱]،...... جون جون زمانہ گذرتا گیا، وہ مذہبی عقائد جن کی تفصیل ٹرٹیلین نے بیان کی ہے متغیر ہو کر ایک عام پسند مگر پایۂ اخلاق سے گرے ہوئے مذہب کی شکل اختیار کرتے گئے، اُن عقائد مین قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر مخلوط ہو گیا،... عقیدۂ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچہ مین ڈھال لیا گیا،... مریم عذرا کو تو خدا کی مان کا لقب دیا گیا[۲]،

اُسی زمانہ مین ایک گروہ "مریمی" کے نام سے پیدا ہوا، جو حضرت مریمؑ کو بھی شریک الوہیت کر کے بجائے اقانیم ثلاثہ کے اقانیم اربعہ کا اعتقاد رکھتا تھا، جس کی تردید قرآن پاک نے سورۂ آل عمران مین فرمائی ہے، اسی کے ساتھ اور بہت سے معتقدات رومی بت پرستون سے لیکر عیسائیت مین داخل کیے گئے، اور نام بدل بدل کر رومی بت پرستون کے دیوتاؤن کے رسوم

---

[۱] معرکۂ مذہب و سائنس، ڈریپر، ص ۶۲، [۲] ایضاً ص ۶۵، ۶۶،

مقدس عیسائی کلیساؤں میں جگہ پانے لگے، اور ان مسائل میں گروہوں کے اختلافات باہمی نہایت شد و مد سے پیدا ہوئے، یہاں تک کہ ان مذہبی مناقشات کے تصفیہ کے لئے حکومت کو بار بار دست اندازی کرنا پڑتی تھی، رفتہ رفتہ رشوت ستانی کا بازار گرم ہوگیا، اور یہ حالت ہوگئی کہ جو شخص کسی بڑے دنیاوی عہدہ دار کے پاس جتنا رسوخ و تقرب حاصل کرسکتا، اسی نسبت سے اس کو بڑی دینی خدمت مل جاتی[۱]۔

یہ تو مسیحی دنیا کے مشرقی حصہ کا حال تھا، مغربی حصہ کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی، یہاں رومن امپائر کی ماتحتی میں مذہبی مناصب کے لئے کشت و خون ایک عام و معمولی واقعہ تھا، یہاں تک کہ بعض دفعہ مقتولین کی تعداد کسی سخت خونریز جنگ کے مقتولوں کے مساوی پہنچ جاتی، چنانچہ ایک مرتبہ جب ایک اعلیٰ مذہبی عہدہ کے لئے دو پادریوں کے درمیان مقاتلہ ہوا، تو صرف ایک دن میں ۱۳۷ آدمی کام آئے[۲] اس سفاکانہ جد و جہد کا باعث صرف یہ تھا کہ اس زمانہ کے مذہبی عہدے، اکتساب زر، حصول لذائذ اور کسب جاہ کے بہت بڑے ذرائع تھے، چنانچہ نفیس غذائیں پادریوں کے دسترخوان پر رہتی تھیں، اتنی بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی تھیں[۳]۔

سلاطین اور مذہب کے حاملین کے اخلاق کا پرتو عام رعایا اور پیروؤں پر لازمی طور پر پڑا، نتیجہ یہ ہوا کہ بداخلاقی، اسراف اور ہوس پرستی، مسیحی دنیا کی آب ہوا میں سرایت کرگئی، لوگ ہر طرح کے ناجائز وسائل سے روپیہ کماتے اور کمال بیدردی کیساتھ اپنے مسرفانہ لہو ولعب اور عیاشی میں اڑا دیتے[۴]۔

---

[۱] سیل صاحب کا انگریزی ترجمۂ قرآن مقدمہ ص ۲۶، [۲] ایضاً ص ۲۶، [۳] ایضاً، [۴] ایضاً صفحہ ۲۶، ۳۸،

پوپون نے اوراُن کے بعد درجہ بدرجہ مذہبی عہدہ دارون نے اپنی اپنی جگہ پر شہنشاہانہ بلکہ خدائی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے جو وہ زمین پر کھولتے تھے، وہ آسمان پر کھولا جاتا تھا اور جو یہان بند کرتے تھے، وہ وہان بھی بند ہو جاتا تھا، قرآن مجید نے اُن کی اسی حالت کا ذکر اس آیت مین کیا ہے کہ اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ انھون نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالمون اور درویشون کو اپنا خدا بنا لیا تھا،

دینداری کا سب سے اہم جزء تجرد کی زندگی، اور رہبانیت تھی، ہر قسم کے آرام و آسائش سے جسم کو محروم کرکے ہر قسم کی تکلیف و عذاب مین اپنے کو تمام عمر مبتلا رکھنا بہترین عبادت تھی، کسی نے تمام عمر غسل نہ کرنے کی قسم کھا لی تھی، کسی نے اپنے کو دلدل میں ڈال دیا تھا، کوئی اپنے کو بوجھل زنجیرون مین جکڑے ہوئے تھا، کسی نے سایہ میں بیٹھنے کو اپنے اوپر حرام کرلیا تھا، کسی نے اپنے کو اندھیری کوٹھری میں بند کرلیا تھا، ماں باپ، عزیز و قریب، اہل و عیال دینداری و تقوی شعاری کی راہ کے کانٹے تھے، اُن سے پرہیز، بلکہ اُن سے نفرت کمال تقوی سمجھا جاتا تھا[1] اُتنی فخر کیا جاتا تھا

دنیا کے اُن متمدن ملکون میں جہان کوئی با اثر مذہب قائم تھا، ایک ہندوستان	ہندوستان

بھی ہے، ہندوستان کے تمدن کے پانچ مختلف دور گذرے ہین، ایک اصلی ہندو، ویدک عہد جو دو ہزار سال ق م سے لیکر تقریبًا چودہ سو سال ق م تک رہا، دوسرا دورِ جنگ یعنی جس مین کورون اور پانڈون وغیرہ کے مناقشات رہے، اور جو چودہ سو ق م سے لیکر تقریبًا ایک ہزار قبل مسیح تک رہا، تیسرا دورِ عقلیت جس میں حکماء و عقلیین کا دور دورہ تھا، اور جو ایک ہزار قبل

[1] تاریخ اخلاق یورپ لیکی کی دوسری جلد میں یہ واقعات مفصل لکھے ہین۔

مسیح سے لیکر تقریبًا تیسری قبل مسیح کے نصف تک رہا، چوتھا دور بودھ جس میں اس مذہب کا عروج تقریبًا دو سو پچاس قبل مسیح سے لیکر پانچویں صدی عیسوی کے خاتمہ تک رہا، پانچواں دور پرانک جس میں بجائے وید یا گوتم بدھ کی تعلیمات کے پرانوں کی تلقین پر عمل درآمد تھا اور یہ عہد تقریبًا پانچویں صدی عیسوی کے آواخر سے لیکر مسلمانوں کے داخلۂ ہند تک قائم رہا،

مورخین کا اجماع ہے کہ قدیم ہندوستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ تاریک اور نقائص سے معمور آخری دور ہے، جو تقریبًا ۵۰۰ء سے شروع ہوتا ہے اس دور کے نمایاں خصوصیات حسب ذیل تھے

۱۔ شرک جو ابتدا ہی سے ہندوستان کے خمیر میں داخل تھا، اب وہ حد اعتدال سے باہر ہو گیا چنانچہ وید میں جو ۳۳ دیوتاؤں کی تعداد تھی، وہ اب بڑھتے بڑھتے ۳۳ کروڑ دیوتاؤں تک پہنچ گئی،[1]

۲۔ ویدک عہد میں اصنام کی پرستش کا رواج نہ تھا لیکن اس زمانہ مین مندروں کے اندر بت پرستی علی العموم رائج ہو گئی،[2]

۳۔ مندروں کے محافظین، بداخلاقی کے سرچشمے تھے، جو لاکھوں کروروں ناواقف پرستش کرنے والوں کو مذہب کے نام سے خوب لوٹتے تھے،[3]

۴۔ ویدک عہد میں ساری ہندو قوم مین یگانگی تھی لیکن اب ذات پاک کی تفریق شروع ہوگئی جو نظام معاشرت کی تباہ کن تھی،[4]

۵۔ عورتوں کو محکومیت و غلامی کا درجہ دیا گیا،[5]

۶۔ قوانین اس قدر غیر معقول و نامنصفانہ وضع کئے گئے جن سے علانیہ بعض ذاتوں کی پاسداری

---

[1] آر سی دت کی ہندوستان قدیم جلد ۲ صفحہ ۲۷۶ [2] ایضًا صفحہ ۲۸۱ [3] ایضًا صفحہ ۲۸۳ [4] ایضًا صفحہ ۳۰۶، [5] ایضًا صفحہ ۳۳۰

وحمایت اور بعض پر جبر و ستم مقصود تھا، مثال کے لئے چند قوانین درج ذیل ہیں،

(الف) برہمن کو کسی حالت میں خواہ وہ کتنے ہی سنگین جرم کا مرتکب رہ چکا ہو، سزائے موت نہیں دی جا سکتی،

(ب) کسی اونچی ذات کے مرد کا کسی نیچی ذات کی عورت کیساتھ زنا کرنا کوئی جرم نہیں،

(ج) کسی بودھ راہبہ کے ساتھ کسی عصمت دری کی سزا میں کچھ جرمانہ کافی تھا،

(د) اگر کوئی اچھوت ذات کا شخص کسی اعلیٰ ذات والے کو چھولے تو اسکی سزا موت ہے،

(ہ) اگر کوئی نیچی ذات والا اپنے سے اونچی ذات والے کو مارے تو اسکے اعضا قطع کر ڈالنا چاہئے، اگر اُسے گالی دے تو اُس کی زبان کاٹ ڈالنی چاہئے اور اگر اُسے تعلیم دینے کا دعوی کرے تو گرم تیل اُس کے منہ میں ڈالنا چاہئے[1]،

۷- راجاؤں کے محل میں بادہ نوشی کثرت سے رائج تھی، اور رانیاں اسی حالت خمار میں جامۂ عصمت اتار ڈالتی تھیں[2]،

۸- شاہراہوں پر آوارہ گرد و جرائم پیشہ افراد کا مجمع لگا رہتا تھا[3]،

۹- خدا کی تلاش آبادیوں اور بازاروں میں کرنے کے بجائے جنگلوں اور پہاڑوں میں کیجاتی تھی، جسم کو سخت سے سخت ایذا اور تکلیف اُن کی بہترین عبادت تھی،

۱۰- اوہام و خیالات فاسدہ، بھوتوں، پیتوں، اور سینکڑوں قسم کے طلسموں اور وہام اُنکا مذہب تھا، اور آسمان سے لیکر زمین تک ہر چیز اُن کا خدا تھی اور ہر ایک کے سامنے سر بسجود ہونا

---

[1] آر سی دت، کی ہندوستان قدیم صفحہ ۲۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴ [2] ۳۵۲ [3] ایضاً ص ۲۶۹،

اُن کا وھرم تھا، بتون، دیوتاؤن، دیبیون کا شمار اندازہ وقیاس سے باہر تھا، اور اُن کے افسانو نکا گیت، اُن کا ترانہ حمد تھا، ظہورِ اسلام کے بعد بھی جو عرب سیاح یہان آتے رہے، انھون نے پیشیا کرنے والے جوگیون کے وہ دردناک حالات لکھے ہیں، جن کو پڑھ کر اُن کی حالت پر رحم وافسوس آتا ہے[۱]، اور اسی طرح وہ عرب سیاح جو سندھ اور دکن کے شہرون اور ساحلون سے گذرے ہین، انھون نے معبدون مین پجاری عورتون اور دیوداسیون کی جو اخلاقی کیفیتیں لکھی ہیں[۲]، وہ حد درجہ شرمناک ہیں، اور اس سے زیادہ شرمناک یہ ہے، کہ یہ سب خدا کی خوشنودی، اور مذہبی عقیدہ کے روسے انجام دیا جاتا تھا،

عورتین جوؤن مین ہاری جاتی تھین ایک عورت کے کئی شوہر ہوتے تھے[۳]، بیوہ ہو کر زندگی کی ہر لذت سے عمر بھر کے لئے قانوناً محروم کردیجاتی تھیں، اور اسی لئے شوہر کے مرنے پر بعض عورتین زندہ درآتش ہونا پسند کرتی تھین، لڑائی میں شکست کے خوف کی صورت مین اُن کو خود اُن کے باپ بھائی اپنے ہاتھون سے قتل کرڈالتے تھے، یہان کے بعض فرقون میں عورتین مرد کو، اور مرد عورتون کو ننگا کرکے اُن کی پوجا کرتے تھے[۴]، اور مذہبی تہواروں میں شراب پی پیکر ایسے بدمست ہوتے تھے کہ پھر انھیں ماں بہن، بیٹی اور اپنی پرائی کی تمیز باقی نہیں رہتی تھی، اور اس کو وہ نیکی کا کام سمجھتے تھے، شودرون کے نام سے ایک پوری قوم کی قوم ایسی غلامی مین مبتلا تھی کہ تعلیم وتربیت، تہذیب واخلاق اور دین وایمان ہر چیز سے محروم رہنا اس کا فرض تھا،

---

[۱] دیکھو ابوزید سیرافی کا سفرنامہ ص۱۱۵ و ۲۸۳ پیرس و آثار البلاد قزوینی ص۸۰ [۲] سفرنامہ ابوزید ص۱۳۲ و احسن التقاسیم مقدسی ص۴۸۳ [۳] مہابھارت کے قصہ کا آغاز پڑھو [۴] ستیارتھ پرکاش سمولاس گیارہ صفحہ ۳۰۹، ۳۰۲، مطبوعہ سیوک سٹیم پریس لاہور ۱۹۱۲ء،

وید کی آواز بھی اس کے کان میں پڑ جائے تو اُس میں سیسہ پگھلا کر ڈال دینے کا حکم تھا،
راجاؤن کی بیویوں کی کوئی تعداد قانوناً مقرر نہ تھی، قانون کی بنیاد مساواتِ انسانی
پر نہین بلکہ ذاتون پر تھی، عورتین فروخت کی جاتی تھین،

اس مختصر خاکہ سے معلوم ہوا ہوگا کہ بدءِ اسلام سے ایک صدی پیشتر سے دیوتاؤن
کی یہ جنم بھومی بھی شیطانون کے اُس جال میں گرفتار تھی، جس کے شکار فارس و روم ہوئے تھے،

یہود | دنیا کی آبادی اور اصلاح کی سب سے زیادہ اُمید اس قوم سے ہو سکتی ہے، جو سام کی اولاد
مین سب سے پہلے وحی الٰہی کی امانت دار بنی، اسی لئے قرآن نے اُن سے کہا، وَلَا تَکُوْنُوْا اَوَّلَ
کَافِرٍ بِہٖ (بقرہ - ۵) اور سب سے پہلے تم ہی پیغامِ الٰہی کے منکر نہ بنو" مگر یہ قوم سخت جانی کے
ساتھ سنگدل بھی ثابت ہوئی، اُس نے پتھرون کے سینون کو پھٹتے اور اُن کی چھاتیون سے
میٹھے پانی کا دودھ بہتے دیکھا اور پیا، مگر پھر بھی اُسکے سینہ کا دل پتھر ہی رہا، قرآن نے انھین زمانہ مین سکوطعنہ دیا،

فَھِیَ کَالْحِجَارَۃِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَۃً (بقرہ - ۹)	اُن کے دل پتھرون کے مانند بلکہ اُن سے بھی بڑھ کر سخت ہین،

اُس نے مختلف زمانون میں اپنے پیغمبرون کو جھٹلایا، اُن کو تکلیفین دین، بلکہ اُن کو قتل تک
کر ڈالا، حضرت موسیٰؑ اور اُن کے بعد کوئی پیغمبر اُن مین ایسا نہ آیا جس نے اُن کی سنگدلی کا ماتم
نہ کیا ہو، اور اُن کی سرکشی پر اُن کے حق میں بددعا نہ کی ہو، چنانچہ قرآن مجید نے کہا،

لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ بَنِیْ	بنی اسرائیل میں سے جنھون نے کفر کیا اُن
اِسْرَآئِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِیْسَی	پر داؤد اور مریم کے بیٹے عیسیٰ کی زبان سے لعنت

ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (مائدہ ع - ۱۱)

کی گئی، یہ اس لئے کہ انھوں نے نافرمانی کی، اور حد سے آگے بڑھتے تھے، اور ایک دوسرے کو اس بُرائی سے جو وہ کرتے تھے منع نہیں کرتے، اُن کا کام کتنا بُرا ہے؛

حضرت داؤدؑ نے زبور میں کئی دفعہ بنی اسرائیل کی سرکشی اور نافرمانی کا ماتم اپنے سوز دگداز کی لے میں کیا ہے زبور ۷۸ میں ہے،

"اے میرے گروہ! میری تعلیم پر کان رکھ، میرے منھ کی باتیں کان دھر کے سُنو...

.... تاکہ آنے والی پشت سے وہ فرزند پیدا ہوں جو سکھیں، اور وہ خدا پر توکل کریں، اور خدا کے کاموں کو بھلا نہ دیں، بلکہ اس کے حکموں کو حفظ کریں، اور اپنے باپ دادوں کی طرح ایک شریر اور سرکش نسل نہ ہوں، نہ ایسی نسل کہ جس نے اپنا دل مستعد نہ کیا اور اُن کے جی خدا سے لگے نہ رہے .... باوجود اس سب کے پھر انھوں نے گناہ کئے، اور اُس کے عجائب قدرتوں کے سبب اعتقاد نہ کیا ...... لیکن انھوں نے اپنے منھ سے اُس کے (خدا کے) ساتھ ریاکاری کی، اور اپنی زبانوں سے اس سے جھوٹ بولے، اور وہ اُس کے عہد میں وفادار نہ رہے کیونکہ ان کے دل ان کے ساتھ قائم نہ رہے..

کتنی بار انھوں نے بیابان میں اس (خدا) سے بغاوت کی اور وہ ویرانہ میں اُسے بیزار کیا....

تس پر بھی انھوں نے خدا تعالیٰ کو آزمایا، اور اُسے بیزار کیا، اور اُس کی شہادتوں کو حفظ نہ کیا بلکہ برگشتہ ہوئے اور اپنے باپ دادوں کے مانند بیوفائی کی وہ ٹیڑھی کمان کے مانند ایک طرف پھر گئے"

زبور ۸۱ میں ہے،

"اے میرے لوگو! سنو کہ میں تجھ پر گواہی دوں گا، اے اسرائیل اگر تو میری سنے گا تو تیرے درمیان کوئی دوسرا معبود نہ ہو تو کسی اجنبی معبود کو سجدہ نہ کرنا، خداوند تیرا خدا میں ہوں جو تجھے مصر کی سرزمین سے باہر لایا، اپنا منھ کھول کہ اسے بھر دوں گا، پر میرے لوگوں نے میری آواز پر کان نہ دھرا، اور اسرائیل نے مجھے نہ چاہا تب میں نے اُن کے دلوں کی سرکشی کے بس میں چھوڑ دیا"

بہت سے بنی اسرائیل جو حضرت داؤدؑ سے باغی ہو کر لڑنے پر آمادہ تھے حضرت داؤدؑ نے اُن کے متعلق یہ بددعا کی کہ

"تو وہ خدا نہیں جو شرارت سے خوش ہو شریر تیرے ساتھ رہ نہیں سکتا، وہ شیخی باز ہیں، تیری آنکھوں کے سامنے کھڑے نہیں رہ سکتے تو سب بدکرداروں سے عداوت رکھتا ہے تو اُن کو جو جھوٹ بولتے ہیں نابود کرے گا.......... اے خداوند اپنی صداقت میں میرا راہبر ہو، میرے دشمنوں کے سبب سے میرے سامنے اپنی راہ کو سیدھا کر، .... اُن کے باطن میں سراسر کھوٹا پن ہے،......... اے خدا تو انھیں ملزم جان کر ایسا ہو کہ وہ اپنی مشورتوں سے آپ ہی گر جائیں، اُن کو اُن کے گناہوں کی کثرت کے سبب نکال پھینک کہ انھوں نے تجھ سے سرکشی کی ہے" (زبور - ۵)

حضرت عیسیٰؑ نے بھی انجیل میں بنی اسرائیل کو لعنت کی اور فرمایا،

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کے مانند ہو جو باہر سے بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں، پر بھیتر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی ناپاکی سے بھری ہیں،

اسی طرح تم بھی ظاہر میں لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو پر باطن میں ریاکاری اور شرارت سے بھرے ہو"
اے ریاکار فقیہو! اور فریسیو! تم پر افسوس کیونکہ نبیوں کی قبریں بناتے، اور راست بازوں
کی گوریں سنوارتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ داووں کے دنوں میں ہوتے تو نبیوں کے
خون میں اُن کے شریک نہ ہوتے اسی طرح تم اپنے اوپر گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے
فرزند ہو پس اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھرو، اے سانپو! اور اے سانپوں کے بچو! تم
جہنم کے عذاب سے کیونکر بچا گو گے،" (متی ۲۳ - ۲۷ - ۳۳)

بعینہٖ یہی الزام قرآن نے بھی اُن کو دیا ہے،

وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيِّيْنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ	اور وہ ناحق پیغمبروں کو مار ڈالتے ہیں
بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (بقرہ)	اسلئے کہ وہ نافرمان اور حد سے بڑھنے والے ہیں،
قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ	کہہ کہ پھر کیوں اللہ کے نبیوں کو پہلے
قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (بقرہ ۱۱)	تم قتل کرتے رہے، اگر تم مومن تھے،

آلِ عمران میں اس سے بھی بڑھ کر ہر حق کے داعی اور خیر کے مُبلغ کے قتل کر دینے کا اُن
پر بجا الزام ہے،

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ	بیشک وہ لوگ جو اللہ کی آیتوں کا انکار
وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّيَقْتُلُوْنَ	کرتے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے، اور
الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ	ہر اس شخص کی زندگی کے دشمن بنجاتے ہیں
فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (آلِ عمران ۳)	جو اُن کو عدل و نیکی کی بات سمجھائے تو ان کو

[illegible]

سورۂ بقرہ وآلِ عمران مین یہودیون کے ایک ایک عیب کو کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے،
جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے دین وملت کا قوام کتنا بگڑ گیا تھا، اُن کی مذہبی سنگدلی اور
اور تعصب کا سب سے دردناک سانحہ وہ ہے، جو اسلام سے ۵۰، ۶۰ برس پہلے یمن میں پیش آیا کہ
یہودی حمیریوں نے نجران کے عیسائیوں کو گڈھوں میں آگ جلا کر اُن میں جھونک دیا اور وہ کنارے بیٹھے
اس حسرتناک منظر کا تماشا دیکھتے رہے، چنانچہ قرآن مجید نے اس پردرد داستان کو ان لفظوں میں اعنیں یاد دلایا

قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ النَّارِ ذَاتِ	گڈھے والے لوگ مارے گئے، بھڑکتی آگ کے
الۡوَقُوۡدِ اِذۡ هُمۡ عَلَيۡهَا قُعُوۡدٌ وَّهُمۡ	گڈھے، جب وہ ظالم اُن کے کنارے بیٹھے ایمان
عَلٰى مَا يَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ شُهُوۡدٌ	والون کیساتھ جو کر رہے تھے، اسکو دیکھ رہے تھے
وَمَا نَقَمُوۡا مِنۡهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡا	ان کا گناہ یہی تھا کہ وہ غالب اور خوبیون
بِاللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِ، (بروج - ۱)	والے خدا پر ایمان رکھتے تھے،

جزئیات کو چھوڑ کر کلی طریقہ سے اُن میں حسب ذیل نقائص تھے،

۱- اُن کو اپنے محبوبِ خدا، اور خاص خدا کے کنبہ ہونے پر بے انتہا غرور تھا، وہ سمجھتے تھے
کہ ہم کچھ کریں ہم سے قیامت میں مواخذہ نہ ہوگا،

نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (مائدہ)	ہم اللہ کے بیٹے اور اُس کے پیارے ہیں
وَقَالُوۡا لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا	اور کہا کہ ہم کو دوزخ کی آگ ہرگز نہیں
مَّعۡدُوۡدَةً، (بقرہ - ۹)	چھوئے گی لیکن چند روز،

وہ سمجھتے تھے کہ جنت کی نعمتیں صرف اُنہی کے لئے خاص ہیں، قرآن نے کہا،

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ	کہدے کہ اگر آخرت کا گھر تمام لوگوں کو چھوڑ کر
عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ	صرف تمہارے ہی لئے ہے، تو موت کی آرزو
فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ، (بقرہ ۱۱)	کیوں نہیں کرتے، اگر تم سچے ہو،

وہ سمجھتے تھے کہ نبوت اور رسالت صرف اُن کے گھر کی چیز ہے، کسی دوسرے کا اس میں حق نہیں، قرآن نے اُن کے جواب میں کہا،

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (جمعہ-۱) یہ خدا کی مہربانی ہے وہ جس کو چاہے دے

جو اُن میں پڑھے لکھے عالم تھے، وہ خدا کے احکام کو اپنے منشا اور دولتمندوں کی خوشنودی کے لئے اپنی باطل تاویلوں سے ادلتے بدلتے رہتے تھے اور اپنی تصنیفات اور اجتہادات کو کتاب الٰہی کا درجہ دیتے تھے،

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (مائدہ ۲)	وہ لفظوں کو اپنی مناسب جگہ سے ہٹا دیتے ہیں
فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ	تو پھٹکار ہو اُن پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب
ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ	لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں، یہ خدا کی طرف سے
لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا، فَوَيْلٌ لَّهُمْ	ہے تاکہ وہ اس سے دنیا کا معمولی فائدہ
مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ	اٹھائیں تو پھٹکار ہے ان پر جو وہ لکھتے ہیں
مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ، (بقرہ ۹)	اور پھٹکار ہو اُن پر جو وہ کماتے ہیں،

جو اُن میں ان پڑھ تھے، جاہل تھے، وہ اپنے سنے سنائے قصوں پر ایمان رکھتے تھے

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ	اور اُن میں بعض ان پڑھ ہیں جن کو تورات کا

اِلَّا اَمَانِیَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ	علم نہیں لیکن بناوٹی باتیں معلوم ہیں
(بقرہ - ۹)	صرف اُن کے خیالات ہیں

احکام الٰہی میں سے جو آسان اور ضرورت کے مطابق ہوتا، اس کو قبول کرتے اور دوسرے حکموں کو پس پشت ڈالتے؛

نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ	جن کو خدا کی کتاب دی گئی تھی، ان میں
کِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ کَاَنَّهُمْ	سے ایک فریق اللہ کی کتاب پس پشت
لَا یَعْلَمُوْنَ، (بقرہ - ۱۲)	ڈالتا ہے، گویا کہ وہ جانتا ہی نہیں،
اَفَکُلَّمَا جَآءَکُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا	کیا جب جب کوئی رسول تمہارے پاس
تَهْوٰٓی اَنْفُسُکُمُ اسْتَکْبَرْتُمْ	وہ لیکر آیا جو تمہاری نفسانی خواہش
فَفَرِیْقًا کَذَّبْتُمْ وَفَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ	کے موافق نہ ہوا تم نے غرور کیا تو کچھ
(بقرہ - ۱۱)	کو جھٹلایا، اور کچھ کو مار ڈالتے ہو،

ایک دفعہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لاچکے تھے، اور یہود نے بھی آپ کی ملکی سرداری کو کم گونہ قبول کر لیا تھا، تو ایک زنا کا مقدمہ آپ کی عدالت میں لائے، آپنے پوچھا کہ تمہارے مذہب میں اس جرم کی سزا کیا ہے، بولے ہم مجرم کو کوڑے مارتے ہیں، اور اس کی تشہیر کرتے ہیں، آپنے اُن سے توراۃ طلب فرمائی جب وہ لائے اور اس جرم کے متعلقہ حکم کی آیتوں کو پڑھ کر سنانے لگے تو بیچ سے سنگ ساری کا حکم چھپا دیا، مگر ایک نومسلم یہودی عالم نے اس کو پڑھکر بتا دیا، آپنے فرمایا، خداوندا میں پہلا شخص ہونگا جو تیری مردہ حکم کو زندہ کریگا،

(صحیح بخاری و مسلم کتاب الحدود، و ابو داؤد، باب رجم الیہودیین)

آپس میں قتل و خونریزی کا بازار اُن میں گرم تھا، ایک طاقتور قبیلہ دوسرے کمزور قبیلہ کو گھر سے بے گھر کر دیتا تھا، اور پھر کوئی گرفتار ہو جاتا تو فدیہ دیکر اسکو چھڑا بھی لیتے تھے قرآن نے کہا،

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ	پھر تم ہی لوگ آپس میں ایک دوسرے کو قتل
وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ	کرتے، اور ایک گروہ کو اُن کے گھروں سے
تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ	نکالتے ہو اُن کے برخلاف گناہ اور ظلم سے
وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ	مدد کرتے ہو، اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی
وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ	بنکر آتے تو تم فدیہ دیکر چھڑاتے ہو حالانکہ اُن
بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ،	کا نکالنا تم پر حرام تھا، کیا تم کتاب کے کچھ حکموں
(بقرہ - ۱۰)	کو مانتے اور کچھ کا انکار کرتے ہو،

۲- دوسری چیز مال و دولت کی حرص و طمع تھی، اُس کی وجہ سے اُن میں ہر قسم کا لالچ اور اخلاقی کمزوری پیدا ہو گئی تھی، کسی بڑے کام کی خاطر وہ اپنی راحت و آرام اور جسم و جان کو قربان نہیں کر سکتے تھے،

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى	اُن کو سب لوگوں سے زیادہ زندگی کا لالچی
حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ	پاؤگے، مشرکوں سے بھی زیادہ اُن میں ایک
اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ (بقرہ-۱۱)	ایک چاہتا ہے کہ اسکو ہزار برس کی زندگی ملے

عربوں کے ساتھ اُن کے لین دین کے تجارتی تعلقات قائم تھے، مگر وہ سخت نادہند

تھے، اور سمجھتے کہ عربوں کے ساتھ جس قدر سختی اور بددیانتی کا برتاؤ کیا جائے وہ مذہبا منع نہیں قرآن نے اس معاملہ میں عیسائی اہل کتاب کی تعریف کے بعد اسرائیلی اہل کتاب کی نسبت فرمایا،

وَمِنْهُمْ مَّنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لَّا يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا ۗ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ، (آل عمران - ۸)	بعض اہل کتاب الون میں بعض ایسے ہیں، کہ اگر اُن کو ایک دینار بھی امانت رکھنے کیلیے دو، وہ تم کو اسوقت تک واپس نہ دیں جبتک تم اُن کے سر پر کھڑے نہ رہو، یہ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان جاہل عربوں کا ہم پر حق نہیں اور وہ جان بوجھکر

توراۃ میں "اپنے بھائی" کے علاوہ "اجنبی" سے سود لینے کی اجازت کا مطلب وہ یہ لیتے تھے کہ یہود یہود سے نہ لیں، اور اہل عرب جو یہود نہ تھے، اُن سے بھاری بھاری شرح سود وصول کرنا جائز سمجھتے تھے، اور تعجب پر تعجب یہ تھا کہ اُن کے علما اُن کو اُس سے باز نہیں رکھتے تھے، اس حرام خوری اور اُن کے علمار کی اس خاموشی پر اُن کو قرآن نے بار بار ٹوکا،

وَتَرَىٰ كَثِيرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَن قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ، (مائدہ - ۹)	اور اُن میں سے بہتوں کو تو دیکھے گا کہ وہ گناہ اور ظلم کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ جانیکی کوشش کرتے ہیں، اُن کے کرتوت کتنے بُرے ہیں، اُنکے درویش اور عالم گناہ کی بات بولنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں باز رکھتے، اُن کے کام درحقیقت کتنے خراب ہیں،

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (مائدہ) | جھوٹ کو سننے والے اور حرام کھانے والے ہین،

وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَ | اور اُن کے سود لینے کے سبب، حالانکہ وہ

اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ، | اس سے روکے گئے تھے اور لوگون کا مال ناجائز

(نساء - ۲۲) | طریقون سے کھا جانے کی وجہ سے،

اسی لئے وہ توراۃ کی آیتون مین تحریف، اور اُن کے معنون مین تاویل کرکے ایسے فقہی حیلے تراشتے تھے کہ اُن سے ہر حکم کو اپنے مطلب کے مطابق بنا لیتے تھے، خدا نے فرمایا،

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ | ہم نے توراۃ اُتاری جس میں ہدایت اور روشنی ہے

يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا | اسی کے مطابق نبی، جو تابعدار تھے، یہودیون کا فیصلہ

لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ | کرتے تھے، اور اُن کے درویش و عالم بھی خدا کی

بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ، | کتاب کے جن حصون کو انھون نے بچا رکھا تھا

(مائدہ - ۷) | ان میں سے فیصلہ کرتے،

اس کے بعد اس کے احکام کے اجرا اور خاص کر قصاص کا ذکر کیا، اور فرمایا،

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ | اور جو خدا کے اُتارے ہوے حکم کے مطابق فیصلہ

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ، (مائدہ - ۷) | نہ کرے، وہی لوگ کافر ہین،

اُن میں مشرکانہ بت پرستی کے بعض اثرات پیدا ہو گئے وہ جبت اور طاغوت کی پرستش میں مبتلا تھے، قرآن ان کو خطاب کرکے کہتا ہے،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا | اے کتاب والو ہم نے جو اُتارا جو تمھاری کتاب

بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ..... کی تصدیق کرتا ہی، اس پر ایمان لاؤ،.....

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَ خدا شرک کو معاف نہین کرتا، اور اس کے

یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ، (نسا-۷) سوا جس کو چاہے معاف کردے،

.... اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا .... کیا تونے اُن کو نہین دیکھا جن کو

نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ کتاب کا ایک حصہ دیا گیا، وہ بتون، اور

وَالطَّاغُوْتِ وَیَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا شیطانون پر ایمان رکھتے ہیں، اور کہتے ہین

ھٰٓؤُلَآءِ اَھْدٰی مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَبِیْلًا (نسا-۸) کہ یہ کافر مسلمانون سے زیادہ صحیح راستہ پر ہین

اوہام و خرافات پر اُن کا ایمان تھا، تعویذ، گنڈا، جادو، اور عملیات پر فریفتہ تھے، اور سمجھتے تھے کہ یہ حضرت سلیمانؑ کی تعلیم ہی، (بقرہ-۱۲) لبید اعصم وغیرہ مدینہ میں بہت سی عامل تھے، جو کنگھیون اور بالون مین منتر پڑھ کر پھونکتے تھے[1]،

عرب سے باہر یہودی، یونانی اور رومیون کی حکومتون مین یورپ، افریقہ اور ایشیا کے مختلف ملکون اور شہرون مین اس طرح پراگندہ اور منتشر تھے کہ عرب سے باہر دنیا کی قومون میں اُن کا کوئی شمار نہ تھا، عرب کے اندر جو یہود زمانۂ دراز سے آباد تھے، اُن کا بڑا شغل زراعت اور تجارت تھا، سودی کاروبار کرتے تھے، غریب عربون کو اپنے گران شرح سود اور قرضون کے بار میں اس طرح دبائے تھے کہ اُن کی حالت اُن کے سامنے غلامون کی سی تھی، اس سلسلہ میں صرف ایک واقعہ کا ذکر پوری حالت کے اندازہ کے لئے کافی ہوگا،

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الطب باب السحر ص ۵۰۸،

محمدؓ بن مسلمہ انصاری اور اُن کے رفقا، جو مدینہ کے یہودی سردار کعب بن اشرف کے قتل پر مامور ہوئے تھے، وہ اس سے ملنے اور بات چیت کرنے گئے، انھوں نے اس سے کہا، اے کعب! اس شخص (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے تو صدقہ وصول کر کر کے ہم کو دق کر ڈالا، اب مین تم سے کچھ قرض لینے آیا ہون، اُس نے کہا خدا کی قسم مجھے معلوم تھا کہ تم اس سے آخر بیزار ہو جاؤ گے، انھون نے کہا ہم نے اسکی پیروی اختیار کی ہے لیکن ہم اس کو چھوڑنا نہیں چاہتا، انتظار ہے کہ معاملہ کی صورت کس رُخ پلٹتی ہی؟ مین تم سے کچھ غلہ قرض لینے آیا ہون، اُس نے کہا تم کفالت میں کیا چیز رہن رکھو گے، انھوں نے کہا تم بتاؤ کہ کیا چاہتے ہو، اس نے کہا اپنی بیویان گرو رکھو، انھون نے جواب دیا ہم اپنی بیویان کیسے گرو رکھ سکتے ہیں کہ تمام عرب مین تمہارے حسن کا جواب نہین، بولا اچھا تو اپنے لڑکون کو گرو رکھو، کہا ہم اپنے لڑکون کو کیسے گرو رکھیں تا کہ کوئی بے عزتی نہ کرے، یہ ہماری لئے بڑی شرم کی بات ہی، ہان ہم اپنے ہتھیار گرو رکھ سکتے ہین[۱]،

اس سوال وجواب سے اندازہ ہو گا کہ یہود کی اخلاقی حالت کتنی پست اور ذلیل ہو چکی تھی، کوئی غیر عورت اگر اُن کے بازار کی طرف جا نکلتی تو اس کی عزت بچنی مشکل ہو جاتی[۲]، کسی بچہ کو ذرا سے زیور کی لالچ میں موقع پاتے تو بیدردی سے قتل کر کے زیور اُتار لیتے[۳]، علما اور پیشوایان دین کی وہی کیفیت تھی جس کا ماتم اس وقت سے چھ سو برس پیشتر حضرت عیسیٰؑ نے کیا تھا، یقینًا موشگافیون اور ظاہری دینداری کے سوا روح واخلاق کا جوہر اُن سے کھو گیا تھا، اسلام جو ابراہیم حنیف کے

[۱] صحیح بخاری جلد دوم قتل کعب بن اشرف صفحہ ۵۷۰، [۲] دیکھو کتب سیر میں غزوۂ بنی نضیر کے اسباب،

[۳] صحیح بخاری جلد دوم باب من اقاد بحجر صفحہ ۱۰۱۶،

ترانہ توحید، اور موسیٰ کی صداے طور کی آواز بازگشت تھا، وہ اُن کے نزدیک عرب کے بت پرستون کے جاہلانہ مذہب سے زیادہ برا تھا، وہ کہتے تھے کہ "ان مسلمانون سے یہ مشرک زیادہ راہ راست پر ہین"

اسلام کی اس مصالحانہ دعوت،

یٰٓاَھۡلَ الۡکِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰی کَلِمَۃٍ	اے کتاب والو! آؤ اس ایک بات پر ہم سب
سَوَآءٍۢ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکُمۡ اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا	متحد ہو جائین، جو ہم مین تم مین مشترک ہے کہ ہم
اللّٰہَ وَ لَا نُشۡرِکَ بِہٖ شَیۡئًا وَّ لَا یَتَّخِذَ	خدا کے سوا کسی کو اپنا معبود نہ بنائین، اور اسکے
بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ	ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائین، اور نہ ہم
(اٰل عمران - ۷)	خدا کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو اپنا رب بنائین،

مین بھی عداوت اور دشمنی ہی کی جھلک دکھائی دیتی تھی، اسی لئے مدینہ مین اسلام کی صلح کی ہر کوشش کو وہ ٹھکراتے رہے، کیونکہ روحانی عظمت کے مقابلہ میں اس دعوت کے قبول میں اُن کو اپنی قومی و مالی و تجارتی عظمت کی بربادی نظر آتی تھی،

عیسائیون کی نقل مین وہ بھی عزیز (عزرا) کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، وَقَالَتِ الۡیَھُوۡدُ عُزَیۡرُ ۨ ابۡنُ اللّٰہِ (توبہ - ۵) اپنی دولت و ثروت کے غرور مین وہ کہتے تھے، یَدُ اللّٰہِ مَغۡلُوۡلَۃٌ (مائدہ - ۹) خدا کے ہاتھ بندھے ہوے ہین، قرآن کی دعوت کے جواب مین کہتے تھے کہ ہم پر اس دعوت کا اثر نہین ہو سکتا کہ ہمارے دل ناخون ہیں، وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ (بقرہ - ۱۱) ان فقرون سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اب دنیا مین نیابت الٰہی کے منصب کے قابل نہین رہے تھے،

عرب کے باہر یہودیون کی پراگندہ ٹولیان مختلف سلطنتون کے سایہ مین پناہ گزین تھیں انکا مذہبی

مرکز اُن کے ہاتھ سے نکل چکا تھا، سیاسی اہمیت وہ مدت ہوئی کہ کھو چکے تھے، ابراہیمؑ و یعقوبؑ کے خدا کے بجائے، ہر جگہ وہ سونے چاندی کے ڈھیر ہی کو خدا بناتے تھے، اُن کے مذہبی فرقون کی تعداد بڑھتی جاتی تھی جن مین باہم عداوت قائم تھی، اور اس وقت سے چھ سو برس پیشتر بنی اسرائیل اب پھر ایک نبی اعظم کی بعثت کا بیتابانہ انتظار کر رہے تھے، (بقرہ - ۱۱) خود عرب مین یہود اس وقت اس نبی کے جلد پیدا ہونے کی بشارت کا اپنی مجلسون مین تذکرہ کرتے جس کی پیشینگوئیون سے توراۃ کے صحیفے بھرے تھے، اور اُن ہی سے سُن سُن کر یثرب کے اوس و خزرج ایک نبی کی آمد کی پیشین گوئی سے[۱] باخبر تھے،

دنیا کی ان مختلف قومون کے حالات پر ایک اجمالی نظر ڈالنے کے بعد ضرورت ہے کہ اس قوم کے حالات پر ایک تفصیلی نظر ڈالی جائے جس کے افقِ نبوت سے صبح سعادت طلوع ہونے والی تھی،

ظہور اسلام کے وقت عرب کی مذہبی و اخلاقی حالت،

یمن مین جب وہ مشہور سیلاب آیا جس کی بلندی سطح زمین سے ایک سو بیس[۲] فیٹ تھی، تو پائے تخت یعنی مارب اور اس کے اضلاع دفعۃً برباد ہو گئے، یہ دوسری صدی عیسوی کا واقعہ ہے[۱]، قرآن مجید نے اسی سیلاب کو سَیْلَ عَرِم کہا ہے، اس سیلاب کا ایک یہ نتیجہ ہوا کہ آٹھ بڑے بڑے

---

[۱] سیرۃ ابن ہشام ذکر بیعتِ عقبہ [۲] اس بند کے انہدام کی تاریخ کی تعیین مشکل ہے اور اسی لئے اس کی تعیین مین کئی نظریے ہیں، ایک اس کو دوسری صدی عیسوی کا واقعہ بتاتا ہے تو دوسرا پانچوین صدی عیسوی کا، اصلیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس بند کے مختلف حصے مختلف زمانون مین منہدم ہوتے رہے، اور بنتے رہے، آخری دفعہ یا پانچوین صدی عیسوی میں بالکل برباد ہو گیا، (سلیمان)

خاندان جلا وطن ہوکر ادھر ادھر نکل گئے جس سے نظامِ سلطنت میں ضعف آگیا، چھٹی صدی عیسوی میں یہاں کے فرمانروا ذونواس سے جو مذہبًا یہودی تھا، رعایا نے بغاوت کی اور شاہِ حبش سے اعانت چاہی، اس نے ۵۲۹ءمیں ایک فوج بھیجی جس نے ذونواس کو معزول کر دیا، اور اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا، ۶۰۳ئہ میں قبیلہ حمیر کے ایک باحوصلہ شخص ذویزن نے فارس کی مدد سے اپنا ملک واپس لیا، لیکن چند روز کے بعد وہ قتل کر دیا گیا، اور یمن شاہنشاہیِ فارس کا ایک معمولی صوبہ رہ گیا،

جو قبیلے یمن سے نکلے، ان میں سے ایک نے دوسری صدی عیسوی میں حیرہ میں جہاں اب کوفہ آباد ہے، ایک سلطنت قائم کی لیکن وہ فارس کے زیرِ اثر اور مذہبی خیالات میں مجوس سے متاثر تھی، دوسرا قبیلہ شام میں جاکر آباد ہوا جو غسانی خاندان کہلاتا ہے[1] چونکہ یہ خاندان رومیوں کے زیرِ اثر تھا اس لئے رفتہ رفتہ عیسائی ہوگیا، اور اسلام کے زمانہ تک عیسائی رہا،

غرض عرب کے اصلی تمدن پر بیرونی اثر جو کچھ پڑا تھا، وہ مجوسیت یا نصرانیت کا تھا، یہودی معتقدات اور خیالات کا اثر بھی بہت کچھ تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ عرب کا ایک بڑا حصہ یعنی وادی القریٰ اور خیبر و فدک تمامتر یہودی آبادی تھی، اور خود مدینہ میں یہودی ہی صاحبِ اقتدار اور حکومت تھے، باقی تمام ملک میں مشرکانہ رسوم جاری اور جاہلانہ مذاہب پھیلے تھے، لوگ بتوں، پتھروں، درختوں، ستاروں، فرشتوں اور جنوں کی پرستش کرتے تھے،

خدا کا اعتقاد | تاہم اس میں شبہہ نہیں کہ عرب زمانۂ دراز سے ایک خدائے برتر کا اعتقاد رکھتے تھے،

---

[1] اکثر علمائے انساب کا بیان ہے کہ یہ قبائل یمن سے آئے تھے لیکن میں نے ارض القرآن میں بدلائل اس سے اختلاف کیا ہے، (سلیمان)

آج کل عرب کے جو قدیم کتبات دستیاب ہوئے ہیں، ان پر اللہ کا لفظ خدا کے معنی میں لکھا ہوا ہے البتہ اس کا املا اللہ نہیں بلکہ ھلہ ہے، عرب شمال کے عرب جو نابتی کہلاتے ہیں، انکے ناموں کے ساتھ اللہ کا لفظ بھی شامل ہوتا تھا، مثلاً زید اللہی، عبد اللہی، خود قرآن مجید میں خدا کفار کی نسبت کہتا ہے

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ — اور جو تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے

وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ (لقمٰن ۳) — پیدا کیا ہے تو بول اٹھیں گے کہ خدا نے تم کہو کہ خدا کا شکر ہے

یہ اصل میں حضرت ابراہیمؑ کی تعلیم تھی لیکن رفتہ رفتہ شرک کا اعتقاد پیدا ہوا یعنی یہ کہ خدا اعظم کے سوا اور بھی چھوٹے چھوٹے خدا ہیں، گو اللہ ان سب میں بڑا ہے، یہ اعتقاد اس قدر راسخ ہو گیا کہ اور معبودوں کے انکار سے اُن کو اسی قدر رنج ہوتا تھا، جس قدر خود خدا کے انکار سے ہو سکتا تھا، بلکہ چونکہ ان کے نزدیک دنیا کا کاروبار، اور روزمرہ کی ضرورتیں انہی چھوٹے چھوٹے خداؤں سے انجام پاتی تھیں، اور کام اکثر انہی خداؤں سے پڑتا تھا؛ اس لئے اللہ کا خیال کچھ یونہی سا رہ گیا تھا، ان ہی خداؤں کی پرستش کرتے تھے، ان ہی پر قربانی چڑھاتے تھے، انہی سے حاجتیں مانگتے تھے، اللہ تو زمین آسمان بنا کر بے کار سا ہو چکا تھا، جو کچھ کرتے تھے یہی خدا ان اصغر کرتے تھے، یہی سبب تھا کہ کوئی شخص اللہ کا خالی نام لیتا تھا تو لوگ بہت کبیدہ ہوتے تھے

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ — اور جب خالی اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو یہ لوگ

قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ — جو کہ قیامت کے معتقد نہیں ناک بھوں

وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ — چڑھاتے ہیں لیکن خدا کے سوا اوروں (معبودوں)

---

[1] مذاہب و اخلاق کی انسائیکلوپیڈیا، جلد اول صفحہ ۲۴۶ بحوالۂ پروفیسر نولدکی۔

يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ (سورۂ زمر-۵) کا بھی ذکر کیا جاتا ہو تو دفعۃً وہ کھل جاتے ہیں،

اور سمجھتے تھے کہ ان چھوٹے معبودوں کی نذر و نیاز و قربانی سے خدا خوش ہوگا، اور وہ اُس کے دربار میں سفارش کریں گے، چنانچہ وہ کہتے تھے،

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى، (زمر-۱) — اور ہم ان بتوں کو اس لئے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کے قریب کر دیں،

ملائکہ کی الوہیت

شرک کے علاوہ خدائے اعظم کی نسبت یہ مانتے تھے کہ اُس کے بال بچے بھی ہیں، چنانچہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے،

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى، (سورۂ نجم) — جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں لاتے وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہیں،

اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۝ (سورۂ نجم) — تمہارے تو لڑکے ہوں اور خدا کے لڑکیاں یہ تو کچھ اچھی تقسیم نہیں۔

اس لئے جس طرح بعض یہود عزیر کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ کو خدائی کا مستحق سمجھتے تھے، وہ فرشتوں کو خدا کی اولاد سمجھکر ان کی الوہیت کے بھی قائل تھے،

وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ (آل عمران-۸) — اور نہ خدا تم کو اس کا حکم دیتا ہو کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا ٹھہراؤ،

وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ؕ — اور ان مشرکوں نے خدا کے بندوں میں سے خدا کا ایک حصہ بنا لیا، بیشک انسان کھلا ناشکر ہے،

أَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰكُمْ بِالْبَنِيْنَ .... وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْئَلُوْنَ وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ

(زخرف - ۱-۲)

کیا خدا جو پیدا کرتا ہے، وہ اپنے لئے لڑکیاں لے اور تم کو لڑکے دیکر عزت دی...... اور ان مشرکوں نے فرشتوں کو جو رحمت والے خدا کے بندے ہیں لڑکیاں قرار دیا، کیا وہ اُن کی پیدائش کے وقت موجود تھے، اُن کی گواہی لکھی اور باز پرس کیجائیگی، اور کہتے ہیں کہ اگر خدا نہ چاہتا تو ہم اُن کی پرستش نہ کرتے،

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنٰتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ، اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ، اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ وَلَدَ اللّٰهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ

(صفّٰت - ۵)

تو اُن سے پوچھ کہ کیا تیرے رب کی لڑکیاں ہوں اور اُن کے لڑکے ہوں کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیاں پیدا کیا اور وہ حاضر تھے، ہاں یہ ان مشرکوں کی بناوٹ ہے، وہ کہتے ہیں کہ خدا کے اولاد ہوئی، اور وہ جھوٹے ہیں،

اُن کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ یہ فرشتے خدا کے ہاں اپنے پرستاروں کے سفارشی بنیں گے خدا نے اس کی تردید میں کہا،

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا الآیہ (نجم ۲)

اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں کہ اُن کی سفارش خدا کی اجازت کے بغیر کچھ فائدہ نہیں

قیامت میں فرشتوں سے پرسش ہوگی کہ یہ مشرک تمہاری پوجا کرتے تھے،

ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ

پھر خدا فرشتوں سے کہے گا کہ کیا یہ انسان تمھیں کو

كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ (سبا - ۵) پوجتے تھے،

جنات کی الوہیت | فرشتوں کی طرح وہ جنات کو بھی خدا کا عزیز و قریب سمجھتے تھے۔ اور خدا کے اُن سے رشتے لگاتے تھے،

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَ بَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (صفٰت - ۵) اور مشرکوں نے خدا اور جنوں کے درمیان رشتہ داری بنائی،

اسی لئے وہ جنات کو خدا کی خدائی میں شریک کرتے تھے،

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَ خَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ (انعام - ۱۲) انھوں نے جنوں کو خدا کا شریک بنایا اور وہ خدا کی مخلوق ہیں اور بن جانے خدا کے لئے بیٹے اور بیٹیاں گھڑیں،

اور جب وہ خدا کے رشتہ دار اور خدائی کے شریک ٹھہرے، تو اُن کی، عبادت اور پرستش بھی ضروری ہوئی، چنانچہ جاہلیت میں اہلِ عرب ان جنوں کی بھی پوجا کرتے تھے، بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ج اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ (سبا) بلکہ یہ جن کو پوجتے تھے، اور ان میں سے اکثر ان ہی پر ایمان رکھتے تھے" مسافر جب راستہ میں کہیں قیام کرتے تھے" تو پہلے وہاں کے جنوں کی دہائی پکار لیتے تھے[1] قرآن میں ہے، وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا (جن ۱) اور بات یہ تھی کہ کچھ انسان بعض کی دہائی پکارا کرتے تھے، اور انھوں نے اُن کو اور مغرور بنا دیا، چنانچہ بعض خوفناک مقامات میں خاص طور سے ان کے نام کی قربانی کی جاتی تھی، اُن میں سے ایک

---

[1] صحیح مسلم کتاب التفسیر،

مشہور مقام دراہم تھا، جہاں کے رہنے والے جنوں (سکان الدراہم) پر جانور ذبح کرکے چڑھائے جاتے تھے تاکہ قربانی کرنے والے اُن کی شرارت سے محفوظ رہیں[1] قبیلۂ خزاعہ کی شاخ بنو ملیح خاص طور سے جنوں کی پوجا کرتی تھی، اور کلبی کا بیان ہے کہ ان ہی کے متعلق یہ آیت اُتری ہے[2]

اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ	خدا کو چھوڑ کر تم جن کو پکارتے ہو وہ تمہاری
عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ، (اعراف ۲۴)	ہی طرح بندے ہیں،

بُت پرستی

جن خداؤں کو یہ لوگ مانتے تھے، اُن کے بُت بنالئے تھے اور جابجا عظیم الشان بتکدے قائم ہوگئے تھے، یہ رواج اس قدر عام ہوگیا تھا کہ جہاں کوئی خوبصورت پتھر مل گیا اٹھالیا، اور اُسکی پرستش شروع کردی، اس سے زیادہ خوبصورت مل گیا، تو اسکو پھینک دیا، اور اسکی پرستش کرنے لگے، جہاں کوئی پتھر نہ ہاتھ آیا، خاک کا ایک تودہ بنالیا، ایک بکری لاکر اس کا دودھ اس پر دوہا، پھر اُس کے گرد طواف کیا، اور اب وہ ایک معبود بنجاتا تھا، چنانچہ صحیح بخاری کتاب المغازی باب وفد بنی حنیفہ میں یہ پوری تفصیل مذکور ہے،

اس بت پرستی کی ابتدا یوں ہوئی کہ قبیلۂ خزاعہ کا ایک شخص جس کا نام عمرو بن لحی تھا، اور جو قبیلۂ جرہم کو شکست دیکر کعبہ کا متولی بن گیا تھا، ایک دفعہ بلقار گیا، وہاں لوگوں کو بُت پرست دیکھکر بُت پرستی کی طرف مائل ہوا، اور وہیں سے ایک بت لاکر کعبہ میں نصب کیا، چونکہ اس کا اثر تمام عرب پر تھا، اس لئے تمام عرب نے بت پرستی قبول کرلی، اور گھر گھر بتخانے بن گئے، اُن میں ہبل سب سے بڑا تھا اس سے اُتر کر منات، لات اور عُزّیٰ تھے،

[1] لسان العرب لفظ سکن [2] کتاب الاصنام ہشام الکلبی مطبوعہ مصر ص ۳۴،

منات مدینہ منورہ سے سات میل پر تھا، انصار کے قبیلے یعنی اوس و خزرج، اور آس پاس کے قبائل اسی کا حج کرتے تھے، کعبہ کا حج بھی جب یہ لوگ کرتے تھے تو احرام یہیں آکر اُتارتے تھے، حلفیہ معاہدے بھی یہیں ہوتے تھے، عبد العزیٰ مزنی کہتا ہے[1]

اِنّی حلفت یمین صدق برۃ	میں نے منات کی سچی قسم کھائی
بمنات عند محل آل الخزرج	اہلِ خزرج کے احرام اتارنے کی جگہ کے پاس

لات قبیلۂ ثقیف کا معبود تھا، جو مقام طائف میں نصب تھا، اہلِ طائف اُس کو کعبہ کے برابر تسلیم کرتے تھے،

عُزیٰ ایک درخت تھا اُس کے پاس ایک بت تھا، یہ قبیلۂ غطفان کا بت تھا، لیکن قریش بھی اُس کی نہایت عزت کرتے تھے، اور اُس کی زیارت کو جاتے تھے، قریش جب کعبہ کا طواف کرتے تھے، تو یہ پڑھتے تھے[2]

وَاللَّاتِ والعزّیٰ ومَناۃ الثالثۃ	لات، عزیٰ، اور تیسرا مناۃ، یہ بڑے برگزیدہ
الاُخریٰ، اِنّھُنّ الغرانیق العُلیٰ	ہیں، اور اُن کی سفارش کی خدا کے
وَاِنّ شفاعتھُنّ لَتُرتجیٰ،	ہاں، امید ہے،

بُت پرستی نے رفتہ رفتہ اور بہت سی بُرائیاں پیدا کر دیں، جانوروں سے گذر کر انسانی قربانیاں اُن پر چڑھائی جانے لگیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد عبد المطلب نے جو اپنے صاحبزادہ (عبد اللہ) کی قربانی کرنی چاہی تھی، اسی رسم کی تقلید تھی،

---

[1] یہ پوری تفصیل معجم البلدان لفظ مناۃ میں ہے، [2] معجم البلدان لفظ لات و کتاب الاصنام کلبی مطبوعہ دار الکتب المصریہ ۱۳۴۳ھ ص ۹

بحیرۃ، سائبۃ، حام کے نام سے بتون کے نام پر سانڈ چھوڑتے تھے، کعبہ کے سامنے جو قربانی کرتے تھے، اس کا خون، کعبہ کی دیوارون پر ملتے تھے[1]، بتون کے سامنے شگون کے تیر رہتے تھے، ان میں سے ایک پر "ہان" ایک پر "نہان" لکھا رہتا تھا، جو کام کرنا چاہتے پجاری سے کہتے کہ فال نکالے، ہان کا تیر نکلتا تو اس کام کو کرتے، ورنہ باز رہتے،

جاہلیت مین جن چیزون کی پرستش کی جاتی تھی، وہ مختلف قسمون کی تھیں، اصنام اوثان انصاب اور بیوت، اصنام و اوثان جن کا واحد صنم اور وثن ہے، یہ انسانی شکل و صورت کے بت تھے اگر وہ لکڑی کے ہوتے، تو نعیم کہلاتے، اور اگر رنگ اور مسالہ سے بنتے تو ان کو دُمیہ کہتے انصاب نصب بن گھڑے پتھر ہوتے تھے جن کو کھڑا کر کے ان پر چڑھاوے چڑھاتے، اور جانور ذبح کرتے تھے، بیوت جس کا واحد بیت ہے، چند گھر تھے، جیسے رضا، رئام قلیس وغیرہ جن مین بت پرستانہ رسوم ادا کئے جاتے تھے، جن بتون کے اردگرد چکر لگاتے تھے، ان کو دوار کہتے تھے، اور اُن پر جو قربانی کی جاتی تھی اس کو عتیرہ کہتے تھے، پتھرون کا ڈھیر لگا کر اس کے چارون طرف چکر لگاتے تھے، اس ڈھیر کو رجبہ کہتے تھے، جاہلی شاعر کہتا ہے،

کما طاف بالرجبۃ المرجّوٗ	جیسے پتھرون کے ڈھیر کا طواف کرنیوالا طواف کرتے[2]

جن بتون کی پرستش کی جاتی تھی، اُن کی کوئی انتہا نہ تھی، ع

"قبیلہ قبیلہ کا اک بت جدا تھا"

خاص خانہ کعبہ اور اس کے اطراف مین تین سو ساٹھ بت تھے[3]، ان مین سے قرآن پاک میں جن کے

---

[1] نیل المرام فی تفسیر آیات الاحکام صفحہ ۱۱۱، [2] ان الفاظ کے لئے دیکھو لسان العرب [3] صحیح بخاری باب فتح مکہ

نام بتائے گئے ہیں، وہ یہ ہیں، لات، عزّیٰ، مناۃ، یغوث، یعوق، نسر، ودّ، سواع، بعل، لیکن جاہلیت کے پرانے مورخین اور لغت نویسوں نے جاہلیت کے شخصی ناموں اور شعراء کے اشعار سے بہت سے نام ذکر کئے ہیں، ہشام کلبی کی کتاب الاصنام میں جو اس موضوع پر پہلی کتاب ہے اور جو اب مصر میں چھپ بھی گئی ہے تقریباً تیس بتوں کے نام ہیں، علامہ زکی پاشا جنھوں نے کلبی کی اس کتاب کو ۱۳۴۳ھ ۱۹۲۴ء میں تحشیہ اور تکملہ کے بعد شائع کیا ہے، اپنے تکملہ میں چھیالیس نام اور بڑھائے ہیں، یمن اور حجاز میں آثار قدیمہ کے محققوں نے عہد جاہلیت کے جو کتبے پڑھے ہیں، ان میں المقہ عشتار، نکرہ، قینان وغیرہ بہت سے اور ناموں کا پتہ لگایا ہے، میں نے ارض القرآن کی دوسری جلدیں جو ۱۳۳۶ھ ۱۹۱۸ء میں چھپی ہے، ان معلومات کو یکجا کردیا ہے،

ذیل میں ہم ان بتوں کی فہرست درج کرتے ہیں، جن کے نام اب تک معلوم ہو چکے ہیں :-

بتوں کے نام	قبیلوں کے نام جو ان کو خاص طور سے پوجتے تھے،
لات	ثقیف
عزّیٰ	قریش، وبنو شیبان بن جابر
مناۃ	اوس وخزرج اور اور عام عرب،
یغوث	بنو مذحج، واہل جرش
یعوق	بنو ہمدان واہل خیوان،
نسر	حمیر،
ودّ	بنو کلب،

سواع	بنولحیان
اساف	بُت جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی،
نائلہ	بُت جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی،
اُقیصر	قضاعہ و لخم و جذام، و عاملہ و غطفان،
باجر	ازد و طی و قضاعہ،
ذوالخلصہ،	بنوامامہ، خثعم، بجالہ، ازد السراۃ،
رُضا، یا رُضیٰ،	بنو ربیعہ کا بتخانہ
رئام	حمیر کا بتخانہ
سبحہ	
سعد	بنی ملکان بن کنانہ،
شعیر	عنزہ
ذوالشریٰ	بنو حارث
عائم	ازد السراۃ
عم انس (یا) عمیانس	خولان
فلس	طی
ذوالکفین،	بنو دوس
مناف	قریش،

نُہم	مزینہ
ہُبَل	قریش
بَعْل	قبائل بنی عدنان
یعبوب	جدیلہ (بنی طی)
اشہل	بنو عبد الاشہل
اوال	بکر و تغلب
بس	غطفان کا بُت خانہ
بعیم	ایک لکڑی کا بُت
بلج	ایک بُت
جبہ	
جُرَیش یا جَرِیش	ایک بُت جس کی طرف عبد جریش کی نسبت ہے،
جلسد	ایک بُت کا نام
جہار،	ہوازن کا معبود،
دار	بنو عبد الدار
دوار	ایک بُت کا نام،
ذو الرجل	حجاز کا ایک بُت
شارق	ایک بت کا نام جس کی طرف عبد شارق کی نسبت ہے

شمس	بنو عبد شمس
صدا	عاد کا بت
صمودا	〃
ضمار	عباس بن مرداس سلمی کا قبیلہ،
ضیزن	منذر اکبر
عبعب	قضاعہ
عوض	بکر بن وائل،
عوف	ایک بت کا نام
غبغب	اس پر جانور ذبح کئے جاتے تھے،
فراض	سعد العشیرہ
کثری	جدیس و طسم
کسعہ	ایک بت کا نام
محرق	بکر بن وائل،
مدان	عبد المدان
مرحب	حضرموت
منہب	ایک بت کا نام
ہیا	عاد

ایک بت کا نام	ذات الودع
عبد یالیل	یالیل

ستارہ پرستی عرب میں ستارہ پرستوں کا بھی ایک گروہ تھا، مختلف قبیلے مختلف ستارون کی پوجا کرتے تھے، اُن مین سب سے اہم سورج اور چاند تھے، اسی لئے قرآن پاک نے خصوصیت کیساتھ کہا

لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ (حم سجدہ ۵) نہ سورج کو سجدہ کرو، نہ چاند کو،

یمن مین سبا کی قوم سورج ہی کو دیبی مانتی تھی، (نمل-۳) یمن کے بادشاہ شمر یرعش نے سورج دیبی کا مندر بنوایا تھا[۱]سورج اور چاند کے بعد ستارون مین شعریٰ کی بڑی قدرومنزلت تھی، اسی لئے قرآن پاک نے کہا:

وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى (نجم-۳) اور وہی خدا شعریٰ کا مالک ہے،

صاعد اندلسی المتوفی سنہ ۴۶۲ھ نے اپنی کتاب طبقات الامم مین عرب کے حسب ذیل قبیلون کو مختلف ستارون کا پرستار بتایا ہے،

قبیلۂ حمیر سورج کو پوجتا تھا، کنانہ چاند کو، تمیم دبران کو، لخم اور جذام مشتری کو، طی سہیل کو قیس شعری العبور کو، اور اسد عطارد کو[۲]

جن اور شیاطین اور بھوت پلیت جن اور شیطان کی نسبت عرب کے عجیب عجیب اعتقاد تھے، وہ جن شیطان، اور بھوت پلیت، سب کو ایک ہی جنس سمجھتے تھے، گو اختلاف صورت اور اشغال کی وجہ سے اُن کے الگ الگ نام پڑ گئے تھے، جو اجنہ جنگلون اور میدانون میں رہتے تھے

---

[۱] تاریخ الملوک الارض حمزہ اصفہانی ص۱۱۰ کلکتہ [۲] طبقات الامم قاضی صاعد اندلسی ص۴۳، بیروت،

اور مسافروں کو اپنی صورتین یا لباس، بدل بدل کر دھوکا دیتے تھے، اُن کا نام غول تھا یہ مذکر بھی ہوتے تھے، اور مؤنث بھی،

عبید بن ایوب العنبری،

وَغولاً قفرۃ ذکرو انثے	اور بیابان کے دو غول مرد بھی اور عورت بھی
کان عَلَیهِمَا قطع البجاد	گویا کہ اُن دونون پر کمل کے ٹکڑے پڑے ہین

مؤنث کو سعلاۃ کہتے تھے،

اذلّ وَسَعلاۃ وغول بقفرۃ	مین بھسلتا ہون اور چڑیل اور غول بیابان
اذا اللیل وادی الجنّ فیہا دنت	مین جب رات پردہ پوش ہوتی تھی، تو اُسمین آواز

عمرو بن یربوع ایک ممتاز شخص تھا، اس نے سعلاۃ سے نکاح بھی کیا تھا، اور اس سے اولاد بھی ہوتی تھی، راجز کہتا ہے،

یا قاتل اللہ بنی السعلاۃ	خدا سعلاۃ کے فرزندوں کو مارے،

بلقیس، ملکۂ یمن (اُن کے زعم مین) سعلاۃ ہی کے پیٹ سے تھی،

یہ اکثر گاتے بجاتے تھے، اور اہل عرب اُن کے نغمون سے محفوظ ہوتے تھے،

کو جبت دُونلث مِن بھماء مظلمۃ	کتنی اندھیری گھپ راتون مین مین نے صحرا کو
تیہ اذا ماء مغنی حبنہ سمرا	قطع کیا، جب اُن کے جنات کا مغنی افسانہ گوئی

یہ صحرانشین بدوون کی صحبتون مین شریک ہوتے تھے، جاڑون مین جب بدو آگ جلا کر بیٹھتے تھے تو یہ بھی آگ تاپنے کو آجاتے تھے لیکن جب اُن کو کھانے پر بلاتے تھے، تو وہ عذر کرتے تھے کہ

ہم آدمیون کی غذا نہیں کھا سکتے،

اتوا ناری فقلت منون انتم	وہ لوگ رات کو میری پاس آئے تو میں نے کہا تم کون ہو
فقالوا الجن قلت عموا ظلاما	انھون نے کہا ہم جن ہیں، میں نے کہا اس تاریکی میں تم خوش ہو،
دعوتہا الی الطعام فقال منھم	میں نے انکو کھانے کیلئے بلایا، تو اُن میں سے ایک سردار نے کہا
زعیم نحسد الانس الطعاما	ہم انسانوں کے کھانے پر حسد کرتے ہیں،

یہ زیادہ تر جان آباد تھے ان موضعوں کے نام بدی، بقار، اور عبقر تھے،

ع: جن البدی رداسیا اقدامھا	بدی کے جن، جن کے قدم جمے تھے،
ع: تحت السنور جنۃ البقار	زرہوں کے نیچے بقار کے بھوت تھے،
ع علیھن فتیان لجنۃ عبقر	اور اُن پر شہسوار جوان عبقر کے بھوت علوم ہوتے تھے

اُن کے اقسام حسب ذیل تھے،

جو آدمیون کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے، اُن کو عامر کہتے تھے،

جو بچون کو ستاتے تھے، اُن کا نام روح تھا،

جو زیادہ شریر تھے اُن کو شیطان کہتے تھے،

اس درجہ سے بڑھ کے جو شریر ہوتا تھا اُس کو عفریت کہتے تھے،

یہ اکثر بچون اور جوانون کو اٹھا لیجاتے تھے، حضرت علیؓ کے ایک بھائی طالب تھے، انکو یہ اٹھا لے گئے اور پھر اُن کا پتہ نہ لگا، عمرو بن عدی لخمی جو عرب کا بادشاہ تھا اس کو بھی اٹھا لے گئے تھے لیکن کئی برس کے بعد جذیمہ ابرش کو لا کر دے گئے،

اسی طرح خرافہ کا قصہ ہے جس کو جن اٹھا لے گئے تھے، مدت کے بعد وہ واپس آیا، تو عجیب عجیب باتین بیان کرتا تھا،

ان اجنہ یا شیاطین سے جن لوگون کے تعلقات زیادہ بڑھ گئے تھے، ان میں سے تابط شرًّا اور ابو البلاد طہوی زیادہ مشہور ہین طہوی نے ایک دفعہ ایک بھوت کو مار ڈالا تھا اس کے واقعات ایک نظم مین لکھے ہین،

لقیت الغول تسری فی ظلام	مین غول بیابانی سے ملا جو رات کو اندھیرے مین چلتی ہے،
....	....
نصدت وانتحیت لھا بعضب	کو اس نے روکا اور مین یمن کی بنی ہوئی اصیل تلوار
حسام غیر مؤتشب یمانی	لے کر اسکی طرف بڑھا،
فقد سراتھا والبرد منھا	تو اُس نے اس کے سر کو اور اسکی اندھون کو کاٹ ڈالا،
فخرت للیدین وللجران	اور وہ دونون ہاتھوں اور سینہ کے بل مین گر پڑا،

ان ہی اجنہ اور شیاطین کا زور توڑنے کے لئے قرآن نے قیامت کے اس سوال وجواب کا انداز اختیار کیا کہ ان کے دوست انسان وہان بھی اُن کی دوستی کا دم بھرتے جائین گے، اس سے اندازہ ہوگا کہ جاہل عربوں پر ان کا کس قدر استیلاء تھا،

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُم مِّنَ الْإِنسِ	اے جنوں کے گروہ! تم نے انسانون سے بہت کچھ

---

[۱] شمائل ترمذی باب المزاح [۲] یہ تمام تفصیل کتاب الحیوان جاحظ سے ماخوذ ہے اُس نے کئی ورق مین نہایت تفصیل سے یہ واقعات لکھے ہین، دیکھو کتاب مذکور از ص ۴۸ تا صفحہ ۶۰ جزء ششم مطبوعہ مطبع سعادت، مصر،

وَقَالَ اَوْلِیٰٓئُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ (انعام - ۱۵)

وصول کیا، اور اُن کے دوست ار انسان بولے ہمارے رب! ہم میں ایک نے دوسرے کلام کا مزہ اٹھایا

کہانت

کہانت ایک سخت بلا تھی جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی، ہر جگہ ایک یا کئی کاہن ہوتے تھے، جو آیندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کرتے، اور آسمانی خبریں بتاتے تھے، اہل عرب کا اعتقاد اور خود کاہنوں کا دعوی تھا کہ اُن کے ساتھ یک ایک جن[۱] رہتا ہے، اور وہی اُن کو القا کرتا ہے، وہ اپنی شکل وصورت ایسی بناتے تھے کہ پہچان لئے جاتے تھے، چنانچہ ایک بار حضرت عمرؓ کے پاس سے ایک آدمی گزرا، انھوں نے قیافہ سے پہچان لیا کہ وہ کاہن ہے، اس کو بلا کر پوچھا کہ تیرے جن نے تجھ سے سب سے عجیب تر بات کیا بیان کی"، اس نے کہا میں ایک روز بازار میں پھر رہا تھا کہ میرا جن گھبرایا ہوا آیا اور کہا،

اَلم ترالی الجن وَابلا سہا، وَ	کیا تم جنوں کی سراسیگی، اُن کی ناامیدی
یاسہا من بعد انکاسہا ولحوقہا	اور اُن کے کاروبار کی ابتری نہیں
بالقلاص واحلاسہا،	دیکھتے،

حضرت عمرؓ نے فرمایا سچ کہتا ہے میں ایک روز زمانۂ جاہلیت میں بتوں کے پاس سویا ہوا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی نے ایک گوسالہ لاکر ذبح کیا، اس کے بعد ایک شخص زور سے چلایا،

یا جلیح، امر نجیح رجل فصیح یقول	اے جلیح، کامیاب امر ایک فصیح شخص

[۱] کتاب البیان والتبیین للجاحظ جلد اول ص ۱۱۳ مطبوعہ مطبع علمیہ مصر،

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ، لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے ،

اس کے چند ہی دنوں کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی[1] صحیح بخاری (تفسیر سورۂ والضحیٰ میں روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کچھ علیل ہو گئے، اور دو تین دن رات کو عبادت کے لئے نہیں اٹھے، اس پر ایک عورت (یہ ابولہب کی زوجہ تھی) نے آکر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کہا

انی لارجوان یکون شیطانک	میرا خیال ہے کہ تیرے شیطان نے مجھکو
قد ترکک ،	چھوڑ دیا

یہ وہی خیال تھا چونکہ کفار آپ کو کاہن خیال کرتے تھے، اس لئے اُن کا خیال تھا کہ آپکے ساتھ کوئی جن یا شیطان رہتا ہے، قرآن پاک نے اسی کی تردید اس آیت میں کی ہے:

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ	کیا میں تمھیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے
الشَّيٰطِيْنُ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ	ہیں، ؟ شیطان ہر جھوٹے گنہگار پر اُترتے
اَثِيْمٍ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ	ہیں، وہ سنی سنائی بات القا کرتے
كٰذِبُوْنَ ؕ (شعراء-۱۱)	ہیں، اور اکثر وہ جھوٹے ہوتے ہیں،

یہ کاہن تمام مقدمات اور نزاعات کا فیصلہ بھی کرتے تھے، اور اس بنا پر تمام ملک پر ان کا اثر چھایا ہوا تھا، ان میں سے حازی، شق، سطیح، عزی، بہت مشہور تھے، جاحظ نے انکے کاہنانہ فقرے کتاب البیان میں نقل کئے ہیں،

---

[1] صحیح بخاری جلد اول ص ۶۹۶ ،

وَالْاَرْضِ وَالسَّمَاءِ ، وَالعقاب	قسم ہے زمین اور آسمان کی اور عقاب اور
وَالصّقعاءِ ، وَاقعة ببقاء ، لقد	آفتاب کی ، ایک واقعہ میدان میں واقع
نفر المجد بنی العشراء ، للمجد و	ہوا کہ بزرگی بنو عشرا پر غالب آگئی بوجہ
السناء ،	بڑائی اور بلندی کے ،

یہ کاہن جو خبریں بتاتے یا تلقین کرتے وہ بڑے تکلف کے مقفٰی اور مسجع فقرے ہوتے اس لئے جب ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک ساقط الحمل بچہ کا مقدمہ پیش اور آپ نے اسکی دیت کا فیصلہ کیا تو ایک شخص نے عرب کے دستور کے مطابق اعتراضاً کہا :

ارأیت من لا شرب ولا اکل ولا	غور فرمائیے کہ جس بچہ نے نہ کھایا نہ پیا نہ
صَاحَ فاستهل الیس دمه یطل ،	چیخا ، نہ رویا ، کیا اُس کا خون معاف نہ ہوگا ،

آپ نے فرمایا یہ کاہنوں کے بھائیوں میں سے ہے (صحیح مسلم دیۃ الجنین وصحیح بخاری باب الکہانۃ)

یہ کاہن بتخانوں میں رہتے تھے ، اور کسی خاص بت کے پجاری ہوتے تھے ، جب لوگ اُن سے غیب کی بات پوچھتے ، یا وہ خود آئندہ کے متعلق پیشین گوئی کرنے لگتے ، تو ایک خاص کیفیت اپنے اوپر طاری کرتے ، مرد بھی کاہن ہوتے تھے ، اور بعض عورتیں بھی ہوتی تھیں جو کاہنہ کہلاتی تھیں ، یہ مصیبتوں اور بلاؤں کے دور کرنے کے لئے بُت پرستانہ علاج اور تدبیر بتاتے تھے ، یہ اپنی کہانت کی اجرت میں بڑی بڑی رقمیں اور نذرانے وصول کرتے تھے ، اسلام کے بعد ان میں جو مسلمان ہو گئے تھے وہ علانیہ اپنے خدع و فریب کا اعتراف کرتے تھے[۱] اُن کو نذر و نیاز اور

---

[۱] بخاری جلد اول ص ۲۴۵ ۔ کتاب الطب باب الکہانۃ ،

اجرت کی جو رقم یا تحفہ ملتا، اس کا نام حلوان الکاہن کے منہ میٹھا کرنے کے لئے تحفہ، اسلام نے آکر اس کو روک دیا،[1]

غرض ان کاہنون نے عوام فریبی کا بڑا جال پھیلا رکھا تھا، اور یہ ان ہی کا اثر تھا کہ ملک کا ملک سیکڑون قسم کی وہم پرستیوں میں مبتلا ہوگیا تھا،

شعرا کی نسبت بھی عرب کا خیال تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک شیطان رہتا ہے اور وہی اس کو اشعار القار کرتا ہے، چنانچہ مخبل شاعر کی شیطانہ، عمرو کی بیٹی تھی، اور اعشی جو عرب کا مشہور شاعر تھا، اس کے شیطان کا نام مسحل تھا، اعشی خود کہتا ہے،

دعوت خلیلی مسحلا ودعوا له	میں نے اپنے دوست مسحل کو پکارا اور انہون نے اس کیلئے
بجهنام بعدی للهجین المذمم	جہنام کو پکارا، اور یہ کمینہ بداطوار کیلئے بلایا جاتا ہے
حبانی اخی الجنی نفسی فداءہ	مجھکو میری جن دوست نے میری جان اسی پر فدا ہے
بافیح جیاش العشیات مرجم[2]	شاعرون کے وقت سب سے بڑی جوش مارنیوالے اور

جو اعلی درجہ کا شاعر ہوتا تھا، اس کا نام شیطان یا جن مذکور ہوتا تھا، ابو النجم کہتا ہے،

انی وکل شاعر من البشر	ہر شاعر کا شیطان تو مونث ہے
شیطانه انثی وشیطانی ذکر	مگر میرا شیطان مذکر ہے،

شنقنان اور شیصبان، رؤسائے شیاطین تھے، جو شاعری سکھلاتے تھے ایک شاعر کو

---

[1] صحیح بخاری جلد اول ص ۲۲ ۵ کتاب الطب باب الکہانۃ، [2] اعشی کے دیوان مطبوعہ ویانا ص ۹۵ میں صرف پہلا شعر ہے اور اس کا بھی دوسرا مصرعہ اس طرح ہے، بجهنام حیی عا الالهجین المذمم

اس پر فخر تھا کہ اس کا متکلم اسی شیصبان کی اولاد سے ہے،

ولی صاحب من بنی الشیصبان	میرا ساتھی شیصبان کی اولاد ہے،
فطوراً اقول وطوراً ھُوَہ	تو کبھی میں شعر کہتا ہوں کبھی وہ

اوہام پرستی | سانپ کو قتل نہین کرتے تھے، یہ اعتقاد تھا کہ سانپ مارا جائے تو اُس کا جوڑا اگر بدلہ لیتا ہے[۱]، یہ اعتقاد تھا کہ مرنے کے بعد روح ایک پرندین کر اُڑتی رہتی ہے، اس کو ہامہ کہتے تھے، یہ اعتقاد تھا کہ پیٹ میں ایک سانپ رہتا ہے، جو بھوک کے وقت کاٹتا ہے جو کام کرنا چاہتے تھے، پہلے شگون لے لیتے تھے، مثلاً اس وقت کوئی پرندہ داہنی جانب سے اڑا تو مبارک سمجھتے تھے، اور بائین جانب سے اڑا تو اس وقت اُس کام سے باز رہتے تھے، بکری کے جب بچہ پیدا ہوتا تو اگر نر ہوتا تو بت پر چڑھا دیتے، اونٹنی جب دس بچے جن لیتی اس کو چھوڑ دیتے، وہ سانڈ کی طرح چھوٹی پھرتی،

کسی شخص کے پاس جب اونٹون کی تعداد ہزار تک پہنچ جاتی تو ایک اونٹ کی ایک آنکھ پھوڑ دیتے کہ نظر نہ لگ جائے، جب کبھی قحط پڑتا تو بیل یا دنبہ کی دم مین گھانس پھونس باندھ کر آگ لگا دیتے، اور سمجھتے کہ اس سے پانی برسیگا، سفر میں جاتے تو کسی درخت میں ڈورا وغیرہ باندھکر گرہ لگا دیتے، واپس آکر دیکھتے اگر گرہ کھل گئی ہو تو سمجھتے کہ اُن کی بیوی نے بدکاری کی، سفر مین راستہ بھول جاتے، تو کپڑے الٹ کر پہن لیتے، اور سمجھتے کہ اس سے راستہ مل جاتا ہے[۲]، یہ خیال تھا کہ جو شخص لات و عزی کو گالی دیتا ہے، اس کو برص یا جذام ہو جاتا ہے[۳]، ہاتھوں میں پیتل کی انگوٹھی پہنتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ اس سے ضعف جاتا رہتا ہے[۴]،

۱ه ابوداؤد مطبوعہ مجتبائی جلد ۲ ص ۳۴۶ ۲ه یہ باتیں بلوغ الارب اور اطوار العرب وغیرہ کتابوں میں مذکور ہیں، ۳ه مسند دارمی ص ۹ ۴ه ابن ماجہ ص ۲۵۰ تعلیق التمائم، ابواب الطب

اس قسم کے سیکڑون اوہام پھیلے ہوئے تھے، جن کا شمار نہین ہوسکتا،

یہ تو اُن کے مذہبی حالات وخیالات تھے، ان کی اخلاقی کیفیت بھی ویسی ہی پست تھی، اُن کے اخلاقی معائب مین سب سے نمایان چیز اُن کی جنگجوئی تھی جس نے اُن کو حد درجہ خونخوار، سنگدل اور سفاک بنادیا تھا،

جنگجوئی ذرا ذراسی بات پر لڑمرنا، اور ایک دوسرے کا سر کاٹ لینا اُنکے نزدیک کوئی بات ہی نہ تھی، ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے، اور ہر خاندان دوسری خاندان سے برسرپیکار رہتا تھا، ہر بچہ اپنے باپ اور عزیزون کے قاتل سے انتقام لینے کے جذبہ مین پرورش پاتا تھا اور جوان ہوکر اس مقدس فرض کو انجام دیتا تھا، اور اس طرح ایک ایک لڑائی کا سلسلہ برسون تک قائم رہتا تھا، ان ہی لڑائیون کو مورخین اور اہل ادب ایام العرب کہتے ہین جن کی تعداد سیکڑون سے متجاوز ہے، میدانی نیشاپوری، المتوفی ۵۱۸ھ نے کتاب الامثال مین ان مین سے ۱۳۲ لڑائیون کے نام بتانے کے بعد یہ لکھا ہے،

ھذا الفن لا یتقصاہ الاحصا	یہ فن شمار کا استقصا نہیں کرسکتا،
فاقتصرت علی ما ذکرت،	اس لئے جو کچھ میں نے بیان کیا ہے
(جلد ۲ ص ۳۳۷ خیریہ مصر)	اسی پر میں نے قناعت کی،

یہ تمام لڑائیان وہ ہین جو اسلام سے چالیس پچاس برس پیشتر سے اسلام تک ہوئین، ان مین سب سے مشہور لڑائی عبس وذبیان کی ہے، جس کا واقعہ یہ ہے کہ ان دو قبیلون کے دو گھوڑے داحس اور غبراء کا باہمی مقابلہ تھا، ان میں سے ایک فریق نے گھوڑ دوڑ کے قواعد کی خلاف ورزی

کی، اور لڑائی ہو پڑی، یہ لڑائی ان دونون قبیلون میں پورے چالیس برس تک قائم رہی، دوسری مشہور لڑائی حرب بسوس ہے، اس کا واقعہ یہ ہے کہ بسوس نامی ایک قبیلہ کی عورت کی اونٹنی کلیب بن وائل کے چراگاہ میں جا پڑی، کلیب نے اپنے تیر سے اس کے تھن کو زخمی کیا، اس بات نے قبیلہ مین آگ لگادی، کلیب جان سے مارا گیا، اور بکر و تغلب میں خونریز جنگ ہوئی، عکاظ کے میلہ مین سلیم اور غطفان کے سردارون مین کچھ مناقشہ ہوا، چند روز کے بعد موقع پاکر ایک قتل کر دیا گیا، اُس کے انتقام میں خون کی ندیان بہ گئیں، بکر و تمیم مین ایک چراگاہ کے معاملہ مین خونریز لڑائی ہوئی، اوس و خزرج مدینہ کے دونون قبیلون مین جو ہولناک لڑائیان ہوتی رہیں، اُن مین سب سے مشہور یوم بُعاث ہے جس مین دونون قبیلون کے اکثر سردار کام آئے اس لڑائی کا انصار مدینہ کی بیعت پر ہوا، قریش کی مشہور لڑائیوں کا نام ایام فجار ہے، ایک اور مشہور لڑائی کا نام ذی قار ہے

الغرض معمولی سے اشتعال سے قتل تک نوبت پہنچتی تھی قتل سے انتقام کا جذبہ پیدا ہوتا تھا، اور لڑائیون کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہو جاتا تھا، ان مین لڑنا، اور مرنا، اور مارنا جاہلیت کا شرف اور قبیلہ کی آن سمجھی جاتی تھی، اور اس خون آشامی کا ذوق اُن کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی، ان لڑائیون مین سفاکی، بیرحمی، اور قتل و غارت کی بدترین مثالین پیش آتی رہتی تھین[1]

شراب خواری | شراب جو ہر قسم کے فسق و فجور اور مظالم اور بدکاری کا سرچشمہ ہے عربون میں اس کا اس قدر رواج تھا کہ ہر گھر ایک میکدہ بنگیا تھا، اس کا نہ پینا اسقدر نامانوس بات تھی کہ جن چند

[1] ان لڑائیون کے مفصل حالات کے لئے دیکھو عقد الفرید ابن عبدربہ جلد ۳، اور امثال میدانی لفظ یوم"

آدمیون نے اسلام سے پہلے اس کے پینے سے پرہیز کیا تھا اُن کے نام یادر کھے گئے ہین، دوست واحباب کسی گھر مین جمع ہوتے، شراب کا دور چلتا، ساتھ ہی جوا کھیلتے اُس مین اونٹون کی ہار جیت ہوتی، جو جیتیا وہ جیتے ہوئے اونٹون کو اُسی وقت ذبح کر کے لوگون کو کھلا دیتا کبھی نشہ مین سرشار ہو کر خود صاحب خانہ اُٹھ کھڑا ہوتا، اور اپنے اونٹون کو کاٹ کاٹ کر ڈھیر کر دیتا لوگ گوشت بھونتے، کباب لگاتے اور کھاتے کھلاتے، اور اپنی اسی بیجا فیاضی پر فخر کرتے رہتے فاحشہ مغنیہ عورتین گاتی بجاتین، اور وہ اُسی مخموری کے عالم مین بے شرمی کی باتین کرتے جاہلیت کا مشہور شاعر طرفہ کہتا ہے،

فان تبغنی فی حلقة القوم تلقنی   وان تقتنصنی فی الحوانیت تصطد

پس اگر تو مجھے لوگون کے حلقہ مین ڈھونڈے تو پائیگا   اور اگر شرابخانون مین مجھے شکار کرنا چاہے تو کر سکتا ہے

متی تاتنی اصبحک کاسا رویة   وان کنت عنھا غانیا فاغن وازدد

جب بھی تو میرے پاس آئے مین تجھ شراب کا سیراب پیالہ پلاؤنگا   اور اگر تو اس سے بے نیاز ہو کر آئے تو جا اور بے نیازی کر

ندامای بیض کالنجوم وقینة   تروح الینا بین برد و مجسد

میری محفل شراب کے ہمنشین ستارون کی طرح گورے چٹے ہین اور ایک مغنیہ ہے جو شام کو ہمارے پاس پہنچ جاتا اور زعفرانی کپڑون مین آتی ہے،

رحیب قطاب الجیب منھا رفیقة   بجس الندامی بضة المتجرد

اس کے گریبان کا شگاف بڑا ہے، شرابی رفیقوں کی دست درازی سے مانوس اور اس کے بدن کے برہنہ حصے لطیف ہین،

اذا نحن قلنا اسمعینا انبرت لنا   علی رسلھا مطروقة لم تشدد

جب ہم کہتے ہین کہ ہمیں سناؤ تو آہستہ آہستہ ...... نزاکت کے ساتھ آگے بڑھتی ہے،

وَمَا زَالَ تَشْرَابِي الْخُمُورَ وَلَذَّتِي   وَبَيْعِي وَإِنْفَاقِي طَرِيفِي وَمُتْلَدِي

اور میری شراب نوشی، اور لذت اندوزی، اور اپنی حاصل کردہ اور موروثی دولت کو خرچ کرنا میرا شعار رہا

فَلَوْلَا ثَلٰثٌ هُنَّ مِنْ لَذَّةِ الْفَتٰى   وَجَدِّكَ لَمْ أَحْفِلْ مَتٰى قَامَ عُوَّدِي

اور اگر تین باتیں نہ ہوتیں جو ایک شریف کا لطف و ذوق ہیں، تو تیری قسم میں اپنی موت کی پروا نہ کرتا

فَمِنْهُنَّ سَبْقِي الْعَاذِلَاتِ بِشَرْبَةٍ   كُمَيْتٍ مَتٰى مَا تُعْلَ بِالْمَاءِ تُزْبِدِ

ان میں سے ایک تو نصیحت کرنیوالیوں کی بات کا خیال کئے بغیر سرخ سیاہ رنگ کا پیالہ پی لینا جس میں پانی پلانے سے جوش آتا ہے

وَتَقْصِيرُ يَوْمِ الدَّجْنِ وَالدَّجْنُ مُعْجِبٌ   بِبَهْكَنَةٍ تَحْتَ الْخِبَاءِ الْمُعَمَّدِ

اور دوسری بات گھنگھور گھٹا کے دن کو اور وہ کیسا پر لطف دن ہوتا ہے کسی بلند خیمہ کے نیچے حسین معشوقہ سے لطف اندوزی میں کم کرنا ہے

كَرِيمٌ يُرَوِّي نَفْسَهُ فِي حَيَاتِهِ   سَتَعْلَمُ إِنْ مِتْنَا غَدًا أَيُّنَا الصَّدِي

میں وہ فیاض ہوں جو اپنی زندگی میں اپنے آپ کو شراب پلا کر سیراب کرتا ہے موت کے بعد معلوم ہوگا کہ ہم میں پیاسا کون ہے

وَبَرْكٍ هُجُودٍ قَدْ أَثَارَتْ مَخَافَتِي   بَوَادِيَهَا أَمْشِي بِعَضْبٍ مُجَرَّدِ

اور کتنے بیٹھے ہوئے سوتے اونٹ تھے کہ میرے خوف نے ان کے اگلوں کو بھڑکا دیا جن میں ننگی تلوار لیکر چلا

فَمَرَّتْ كَهَاةٌ ذَاتُ خَيْفٍ جُلَالَةٌ   عَقِيلَةُ شَيْخٍ كَالْوَبِيلِ يَلَنْدَدِ

تو ایک موٹی اونٹنی جو ایک بڈھے کی، جو ایک لٹھ کی طرح جھگڑالو تھا قیمتی چیز تھی، سامنے آگئی

وَقَالَ أَلَا مَاذَا تَرَوْنَ بِشَارِبٍ   شَدِيدٍ عَلَيْنَا بَغْيُهُ مُتَعَمِّدِ

(جب میں نے تلوار سے کونچیں کاٹ کر اونٹنی کو گرا دیا) تو اس بڈھے نے کہا کہ اس بدمست کو دیکھو جو جان بوجھ کر ہم پر ظلم کر رہا ہے

فَظَلَّ الْإِمَاءُ يَمْتَلِلْنَ حُوَارَهَا   وَيُسْعٰى عَلَيْنَا بِالسَّدِيفِ الْمُسَرْهَدِ

تو لونڈیاں اونٹنی کے بچہ کو (جو اُس کے پیٹ سے نکلا تھا) بھوننے لگیں اور چربی دار کوہان کا گوشت لیکر ہمارے پاس دوڑا جاتا تھا

لبید بن ربیعہ جو عرب کا مشہور شاعر، اور سبعہ معلقہ کی محفل کا چوتھا ممبر ہے، کہتا ہی،

بل انت لا تدرین کم من لیلۃٍ　　طلقٍ لذیذٍ لھوھا وندامھا

بلکہ تو نہیں جانتی کہ کتنی کھلی ہوئی راتیں، جن کی دلچسپی اور ہم نوشی پرلطف تھی،

قد بت سامرھا وغایۃ تاجر　　وافیت اذ رفعت وعز مدامھا

میں اُن کا قصہ گو تھا، اور شراب فروش کی منزل میں آتا جاتا رہا جب اس کا جھنڈا بلند ہوا اور اُسکی شراب گران ہو گئی،

اغلی السباء بکل ادکن عاتقٍ　　او جونۃ قدحت وفض ختامھا

میں اُس کی قیمت کو اور گران کر رہا تھا، پرانی خاکی رنگ کی مشک یا خم کو خرید کر جو پیالوں میں بھری جاتی اور اُسکی مہر توڑی جاتی،

وصبوح صافیۃٍ وجذب کرینۃٍ　　بموترٍ تأتالہ ابھامھا

اور کتنی صبح کی صاف شراب، اور مغنیہ کا عود کھینچکر اپنے انگوٹھے سے دبانا،

بادرت حاجتھا الدجاج بسحرۃٍ　　لأعل منھا حین ھب نیامھا

میں نے شراب کی ضرورت مرغِ سحر کی آواز سے پہلے پوری کی، تاکہ میں اس کے سونیوالوں کے جاگنے سے پہلے دہرالوں،

تغلب اُن قبیلوں میں تھا جنھوں نے عیسائی مذہب قبول کرلیا تھا لیکن اس مذہب نے بھی عربوں کو اس بری عادت سے باز نہیں رکھا تھا بلکہ شراب کی درآمد زیادہ تر ان ہی عیسائیوں کے ملک شام سے ہوتی تھی، تغلب کا سب سے بڑا شاعر اپنے فخریہ میں کہتا ہے،

الا ھبی بصحنک فاصبحینا　　ولا تبقی خمور الاندرینا

ہاں اپنا پیالہ لیکر اٹھ جا، اور مجھے صبح کی شراب پلا، اور اندرین (شامی گانوں) کی کوئی شراب چھوٹنے نہ پائے،

مشعشعة کان الحص فیھا اذا ما الماء خالطھا سخینا

پانی میں ملی ہوئی گویا اس میں کسم کے پھول پڑے ہیں، جب گرم پانی اس میں ملاؤ

تجور بذی اللبانة عن ھواہ اذا ما ذاقھا حتی یلینا

غرضمند کو اس کی غرض بھلادے اگر اس کو چکھ لے، یہاں تک کہ اس کو نرم کردے

تری اللحز الشحیح اذا اُمرّت علیه لماله فیھا مھینا

تنگ دل بخیل پر بھی اگر اس کا ایک دور گذار دیا جائے تو وہ اپنی دولت کو لٹا دے

صبنت الکاس عنا امّ عمرو وکان الکاس مجراھا الیمینا

اے عمرو کی ماں! تو نے ہم سے پیالہ ہٹالیا حالانکہ پیالہ کا دورہ داہنی طرف تھا

وما شر الثلثة ام عمرو بصاحبک الذی لا تصبحینا

حالانکہ تیرا وہ ہم نشیں جس کو تو نہیں پلاتی، تین میں سب سے بدتر نہین

وکاس قد شربت ببعلبک واخری فی دمشق وقاصرینا

اور کتنے پیالے بعلبک میں پیئے، اور کتنے دمشق اور قاصرین میں

ان اشعار سے اندازہ ہوگا کہ جاہلیت میں شراب نوشی کا کیا عالم تھا، شراب فروشوں کی دوکانیں کسی ممتاز مقام پر ہمیشہ کھلی رہتی تھین، اور نشان کے لئے وہاں جھنڈا اُڑا کرتا تھا جس کو غایة کہتے تھے، (دیکھو اوپر لبید کا دوسرا شعر) انتہا یہ ہے کہ تجارت کا لفظ "شراب فروشی" کا مرادف بن گیا تھا، ایک جاہلی شاعر عمرو بن قمئة کہتا ہے،

اذا سحب الریط والمروط الی ادنی تجاری وانفض اللمما
(حماسہ)

یاد ہے وہ دن جب میں اپنی چادر گھسیٹتا ہوا قریب ترین شرابخانہ میں جاتا تھا، اور اپنے گیسوؤں کو جھاڑتا تھا

بدر میں قریش کے دولتمند رؤسا، مارے گئے تھے، اُن کے مرثیہ میں قریش کا ایک شاعر خاص طور سے ان کی بزمِ شراب، اور مجلسِ رقص و سرود کی بربادی کا ماتم کرتا ہے،

وماذا بالقلیب قلیب بدرٍ   من القینات والشرب الکرام[۱]

بدر کے گڈھے میں (جس میں مقتولین کی لاشیں ڈالی گئی تھیں) ناچنے والیوں اور فیاض شرابیوں کا ماتم ہے

شراب کے رواجِ عام کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ عربی زبان میں شراب کے ڈھائی سو نام ہیں، اور علامہ مجدالدین فیروز آبادی نے خاص ان ناموں پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے تمام گھروں میں شراب کی مجلسیں قائم ہوتیں، گھر کی عورتیں اور چھوٹے بچے ساقی بنتے تھے، شعر اوپر گذر چکا ہے جس میں شاعر اپنی بیوی سے کہتا ہے،

صبنت الکاس عنا ام عمروٍ   اے ام عمرو! تو نے شراب کا پیالہ ہم سے ہٹالیا

وکان الکاس مجراھا الیمینا   حالانکہ پیالہ کی گردش داہنی طرف سے تھی

حضرت ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ اسلام لانے سے پہلے میں اپنے باپ (عباس) کی زبان سے کمسنی میں یہ سُنا کرتا تھا، اسقنا کاسًا دھاقًا شراب کا ایک لبریز پیالہ ہم کو پلا[۲]،

صحیح بخاری کتاب الاشربۃ میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب شراب حرام ہوئی تو اس وقت ایک مجلس قائم تھی جس میں حضرت ابودجانہؓ، ابوطلحہ، سہیل بن بیضا شریک تھے، اور میں جو کہ سب سے کمسن تھا، ساقی گری کی خدمت انجام دے رہا تھا،

---

[۱] صحیح بخاری باب الہجرۃ، جلد اول ص ۵۵۰ [۲] صحیح بخاری باب ایام الجاہلیۃ جلد اول ۵۴۱،

شراب کس بے تکلفی سے پی جاتی تھی، کس درجہ کے لوگ پیتے تھے، کس قسم کے افعال اُ
حالت مین سرزد ہوتے تھے، اس کا اندازہ صحیح بخاری کی ایک روایت[1] سے ہو گا، جو حرمتِ
شراب سے قبل کا واقعہ ہے،

غزوۂ بدر مین حضرت علیؓ کو مالِ غنیمت مین سے ایک اونٹنی ملی تھی خمس مین سے ایک
اور اونٹنی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عطا فرمائی، حضرت علیؓ کا نکاح حضرت فاطمہ رضؓ سے
ہوچکا تھا، اور وہ دعوتِ ولیمہ کی تیاری کر رہے تھے، ارادہ تھا کہ جنگل مین جا کر اذخر (ایک گھانس
کا نام ہے) لائین، اور زرگرون کے ہاتھ فروخت کرین، اس ارادہ سے باہر نکلے، تو دیکھا کہ انکی
اونٹنیون کے کوہان کسی نے کاٹ لئے ہین، اور پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکال لیا ہی لوگون سے
پوچھا کہ یہ کس کا کام ہے؟ معلوم ہوا کہ پاس ہی ایک گھر مین حضرت حمزہؓ چند انصاری کے
ساتھ شراب پی رہے تھے، ایک مغنیہ نے گاتے گاتے یہ مصرع لگایا،

الا یا حمز للشرف النواء، اے حمزہؓ! موٹی اونٹنیون کے لئے،

حضرت حمزہؓ تلوار لے کر اٹھے، اور اونٹنیوں کے پیٹ چاک کر کے اُن کے کلیجے نکال لیے
حضرت علیؓ نے جا کر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خبر کی، اور یہ ماجرا بیان کیا، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم)
نے چادر اوڑھی، اور حضرت علیؓ اور زیدؓ کو لیکر، حضرت حمزہؓ کے پاس گئے، حضرت حمزہؓ
مخمور تھے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا، اور کہا "تم سب میرے باپ کے
غلام ہو" آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ حالت دیکھ کر چلے آئے،

---

[1] صحیح بخاری کتاب المغازی، غزوۂ بدر ص ۵۷۱،

حضرت حمزہؓ نے ۳ھ میں شہادت پائی ہو اسوقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی،
شراب کی حرمت جس تدریج سے نازل ہوئی ہو،اس سے اندازہ ہوگا کہ تمام ملک کس
طرح اسمیں مبتلا تھا کس طرح وہ مقبول عام ہوچکی تھی کہ اسکی حرمت کی طرف ذہن منتقل نہین ہوتا تھا، اور کنایہ
اور اشارہ سے گذر کر جب تک صاف صاف ممانعت نہین کردی گئی، لوگ سمجھ نہیں سکے،
ابوداؤد، کتاب الاشربہ مین روایت ہو کہ جب شراب کی ممانعت نازل ہوئی، تو حضرت
عمرؓ نے کہا اے خدا! شراب کے بارہ میں ہم کو صاف صاف بتا دے" ان کے اصلی الفاظ یہ ہین،

اللّٰھُمَّ بَیِّنۡ لنا فی الخمر بیاناً	اے خدا! شراب کے بارہ میں ہمارے لئے
شفاء،	شافی بیان کردے،

اس پر سورۂ بقرہ کی یہ آیت اُتری،

یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡخَمۡرِ وَالۡمَیۡسِرِ	لوگ تم سے شراب اور قمار بازی کی
قُلۡ فِیۡہِمَاۤ اِثۡمٌ کَبِیۡرٌ وَّمَنَافِعُ	نسبت سوال کرتے ہین، تو کہدو کہ ان
لِلنَّاسِ وَاِثۡمُہُمَاۤ اَکۡبَرُ مِنۡ	دونوں میں بڑا گناہ ہی اور لوگون کے لئے فائدے
نَّفۡعِہِمَا، (بقرہ ۲۷-۲۷)	بھی ہیں لیکن فائدے سے گناہ بڑھکر ہی!

اس آیت کے اُترنے کے بعد بھی لوگ شراب پیتے پلاتے رہے، یہان تک کہ ایک
انصاری نے حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ وغیرہ کی دعوت کی، شراب کا دور
چل رہا تھا کہ مغرب کی نماز کا وقت آگیا، ایک[۱] صاحب نے امامت کی، مگر نشہ کے خمار میں قُل

[۱] شراب کی حرمت کی یہ تدریجی صورت حضرت عمرؓ (ترمذی تفسیر مائدہ و ابوداؤد وکتاب الاشربہ) حضرت

یَاَیُّھَاالکَافِرُوْنَ کے سورہ کو کچھ کا کچھ پڑھ گئے، اس پر یہ آیت اتری،

لَاتَقْرَبُوْاالصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی	نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو، یہاں تک کہ
حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (نساء-۷)	تم جو کہو اس کو سمجھ بھی سکو،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۶) ابوہریرہؓ (مسند احمد جلد ۲ صفحہ ۳۵۱) اور حضرت علیؓ (ابوداؤد کتاب الاشربہ) سے مروی ہے یہ بات کہ وہ کون صحابی تھے جنھوں نے نشہ کی حالت میں غلط سلط سورہ پڑھ دی تھی، روایات سے صاف طور سے ظاہر نہیں ہوتی ایک روایت میں حضرت علیؓ کا نام ہے اور دوسری میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا نام اور تیسری میں کوئی مہاجر مذکور ہے حضرت الاستاذ نے سیرت جلد دوم (تاریخ احکام ذکر حرمت شراب) میں ابوداؤد کتاب الاشربہ کے حوالہ سے حضرت علیؓ کا نام لکھدیا تھا، مگر مزید تحقیق سے یہ نسبت مشکوک معلوم ہوتی ہے، اس خاص روایت کا مرکزی راوی عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمٰن السلمی ہے ابوعبدالرحمٰن سلمی حضرت علیؓ سے روایت کرتا ہے اس سے یہ روایت مختلف طریقوں سے آتی ہے اور ہر ایک میں شراب پینے والوں اور حالتِ نشہ میں نماز پڑھانیوالے کے نام کا اختلاف ہے چنانچہ ہر روایت کے اصل الفاظ یہ ہیں،

وہ روایتیں جن میں حضرت علیؓ کا نام ہے،

۱۔ عَنْ ابی جعفر الرازی عَنْ عَطاء بن السائب عَنْ ابی عبد الرحمٰن السلمی عَنْ علی بن ابی طالب قال صنع لنا عبد الرحمٰن بن عوف طعاماً فدعانا وسقانا من الخمر فاخذت الخمر منا وحضرت الصلوٰۃ فقدموني فقرأت قُلْ یا ایھا الکافرون لا اعبد ما تعبدون ونحن نعبد ما تعبدون فانزل اللہ یا ایھا الذین آمنوا لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ، (ترمذی تفسیر نساء)	ابوجعفر رازی نے عطاء بن سائب سے، عطا نے ابوعبدالرحمٰن سلمی سے، ابوعبدالرحمٰن سلمی نے حضرت علیؓ بن ابی طالب سے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے ہمارے لئے کھانا تیار کرایا اور ہم کو مدعو کیا، اور شراب پلائی جب ہم شراب کے نشہ میں چور ہو گئے، اور نماز کا وقت آیا تو لوگوں نے مجھ کو امام بنایا، اور میں نے قُلْ یَاَیُّھَا الکَافِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَنَحْنُ نَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ پڑھی اس پر خدا نے یہ آیت اتاری یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَاتَقْرَبُوْا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی یعنی مسلمانو! نشہ کی حالت میں

اس کے بعد جب نماز کا وقت آتا تو منادی اعلان کرتا کہ کوئی مخمور نماز میں شامل نہ ہونے پائے لیکن چونکہ اب بھی ممانعت کا کوئی عام حکم نہ تھا اس لئے نماز کے علاوہ اور اوقات میں لوگ پیتے پلاتے رہتے تھے حضرت عمرؓ نے پھر دعا کی، اتفاق سے اسی زمانہ میں بعض انصار نے حضرت سعدؓ

(بقیہ حاشیہ ص ۲۷۷) ۲- عن سفیان حدثنا عطاء بن السائب عن ابی عبد الرحمٰن السلمی عن علی علیہ السلام ان رجلا من الانصار دعاہ وعبد الرحمٰن بن عوف فسقاھما قبل ان تحرم الخمر فامھم علی فی المغرب فقرء قل یا ایھا الکافرون فخلط فیھا فنزلت لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ حتیٰ حتیٰ تعلموا،

(ابوداؤد کتاب الاشربہ)

۲- سفیان نے عطاء بن سائب سے، عطاء نے ابو عبد الرحمٰن سلمی سے ابو عبد الرحمٰن سلمی نے حضرت علی علیہ السلام سے یہ روایت کی ہے کہ انصار کے ایک شخص نے اُن کو اور عبد الرحمٰن بن عوفؓ کو مدعو کیا، اور تحریم شراب سے پہلے ان دونوں کو شراب پلائی، پھر علیؓ نے نماز مغرب کی امامت کی، اور قل یا ایھا الکافرون پڑھی لیکن اُس میں گڈمڈ کر دیا، اس پر یہ آیت اتری لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ حتیٰ تعلموا ما تقولون" (نشے کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ یہانتک کہ جو کچھ کہتے ہو اسکو جان لو)

وہ روایتیں جن میں عبد الرحمٰن بن عوفؓ کا نام ہے

۳- عن سفیان عن عطاء بن السائب عن ابی عبد الرحمٰن السلمی عن علی رضی اللہ عنہ قال دعانا رجل من الانصار قبل ان تحرم الخمر فتقدم عبد الرحمٰن بن عوف وصلی بھم المغرب فقرء قل یا ایھا الکافرون فالتبس علیہ فنزلت لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ

(مستدرک حاکم کتاب الاشربہ)

۳- سفیان نے عطاء بن سائب سے، عطاء نے ابو عبد الرحمٰن سلمی سے ابو عبد الرحمٰن سلمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ تحریم شراب سے پہلے انصار کے ایک شخص نے ہم کو مدعو کیا تو عبد الرحمٰن بن عوفؓ نے امامت کی اور اُن کو مغرب کی نماز پڑھائی، اور قل یا ایھا الکافرون پڑھی لیکن اس میں خلط ہو گیا، اس پر یہ آیت اُتری لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ الآیۃ (نشے کی حالت میں نماز نہ پڑھو)

وقاص کی دعوت کی، اس میں شراب کا دور بھی چلا، یہ پی کر بدمستی میں کہنے لگے کہ مہاجر انصار سے بہتر ہیں، اس پر بات بڑھی اور مار پیٹ تک نوبت پہنچی اس پر یہ حکم آیا (صحیح مسلم فضائل سعد وقاص رضؓ)

(بقیہ حاشیہ ص ۲۷۸) ۴۔ سفیان عن عطاء بن السائب عن بن (؟) عبد الرحمن عن علی رضی اللہ عنہ انہ کان ہو و عبد الرحمن و رجل اخر یشربون الخمر فصلّی بہم عبد الرحمن بن عوف فقرء قل یا ایہا الکافرون فخلط فیہا فنزلت لا تقربوا الصلوٰۃ (مستدرک حاکم کتاب الاشربہ)

۴۔ سفیان نے عطاء بن السائب سے عطاء نے ابن عبد الرحمن سے ابن عبد الرحمن نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ وہ اور عبد الرحمن بن عوفؓ اور ایک دوسرے آدمی شراب پی رہے تھے، اور ان کو عبد الرحمن بن عوف نے نماز پڑھائی، اور قل یا ایہا الکافرون پڑھی جس میں خلط ملط کر دیا، اس پر یہ آیت اتری (لا تقربوا الصلوٰۃ)

۵۔ خالد بن عبد اللہ عن عطاء بن السائب عن ابی عبد الرحمن ان عبد الرحمن صنع طعاماً ندعا ناساً من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیہم علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ فقرء قل یا ایہا الکافرون لا اعبد ما تعبدون و نحن عابدون ما عبد تم فنزلت لا تقربوا الصلوٰۃ الآیہ (مستدرک حاکم کتاب الاشربہ)

۵۔ خالد بن عبد اللہ، عطاء بن سائب سے، عطاء ابی عبد الرحمن سے روایت کرتے ہیں کہ عبد الرحمنؓ نے کھانا تیار کرایا، اور صحابہ میں سے چند لوگوں کو جن میں علی بن ابی طالبؓ بھی تھے، بلایا پھر انہوں نے قل یا ایہا الکافرون لا اعبد ما تعبدون و نحن عابدون ما عبدتم پڑھی، اس پر یہ آیت اتری کہ لا تقربوا الصلوٰۃ الآیہ)

وہ روایت جس میں نام کی تعیین نہیں،

۶۔ سفیان عن عطاء بن السائب عن ابی عبد الرحمن عن علی رضی اللہ عنہ

۶۔ سفیان عطاء بن سائب سے، عطاء ابو عبد الرحمن سے وہ حضرت علی رضی سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ	اے ایمان والو! بیشک شراب، جوا،
الْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ	بت اور پانسے ناپاک اور شیطان
رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ	کے کام ہیں، تو اُن سے بچو، تاکہ
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ، (مائدہ - ۱)	فلاح پاؤ،

اس کے بعد شراب قطعاً حرام ہو گئی، حرمت شراب کی یہ آخری آیت جس وقت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۹) قال دعا ناداً جل من الانصار قبل تحریم الخمر فحضرت صلوٰۃ المغرب فتقدم رجل فقرأ قُلْ يَآيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ فالتبس علیہ فنزلت لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ الآیۃ (مستدرک حاکم تفسیر نساء)

فرمایا تحریم شراب سے پہلے ہم کو انصار کے ایک شخص نے مدعو کیا، نماز مغرب کا وقت آیا تو ایک آدمی نے امامت کی اور قُلْ يَآيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ پڑھی لیکن اس میں خلط ملط کر دیا، اس پر یہ آیت اتری لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ، الآیۃ)

ان چھ روایتوں میں مختلف قسم کے اختلافات ہیں،

۱- پہلی اور پانچویں روایت میں ہے کہ داعی عبدالرحمٰن بن عوف تھے دوسری تیسری، اور چھٹی میں ہے کہ داعی کوئی انصاری تھے، چوتھی میں دعوت کے بغیر مجلس شراب کا ذکر ہے،

۲- پہلی اور دوسری میں ہے کہ امام حضرت علیؓ تھے جنھوں نے نشہ میں کچھ کا کچھ پڑھ دیا، تیسری، چوتھی اور پانچویں میں ہے کہ وہ امام عبدالرحمٰن بن عوف تھے، اور چھٹی میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ کوئی آدمی امام تھا،

۳- اور روایتوں میں ہے کہ اس دعوت کی مجلس میں شراب تھی، چھٹی میں شراب کا مطلق ذکر نہیں ہے بلکہ وہ شخص جو امام بنا تھا، وہی شاید کہیں سے پی کر آیا ہو، اگرچہ کہ حرمت شراب سے پہلے پینا کوئی شرعی جرم نہیں تاہم حضرت علی رضی اللہ کا پینا جو بچپن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و تربیت میں پل کر جوان ہوئے قیاس کے خلاف ہے خصوصاً اس آیت کے بعد قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ، (کہدے کہ شراب اور جوے میں بڑا گناہ ہے) حضرت علیؓ کا پینا اور بھی زیادہ واقعہ کی صحت میں شک پیدا کرتا ہے، پھر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس روایت میں مختلف قسم کے ایسے اختلافات ہیں، جو ناقابل تطبیق ہیں،

اُتری ہے حضرت ابوعبیدۃ امینؓ، اور ابی بن کعبؓ جو سیدالقرار تھے، ابوطلحہؓ کے گھر مین مہمان تھے اور شراب کا دور چل رہا تھا، ساقی گری کی خدمت حضرت انسؓ سے متعلق تھی، چنانچہ صحیح بخاری کتاب لاشربہ میں خود حضرت انسؓ کی زبانی روایت ہے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۰) ان اختلافات کا راز اس وقت کھل جاتا ہے جب اُن کے راویون پر نظر ڈالی جاتی ہے، سب سے پہلا راوی ابوعبدالرحمن سلمی جس کا نام عبداللہ بن حبیب ہے، وہ پہلے حضرت علیؓ کا طرفدار و حامی (شیعہ) تھا، بعد کو عثمانی (بنی امیہ کا طرفدار) اور حضرت علیؓ کا مخالف ہوگیا، پھر اس کا یہ دعویٰ کہ اُس نے حضرت علیؓ سے سنا ہے محدثین مین مسلم نہیں بخاری نے اس کو مانا ہے، لیکن ابن ابی حاتم نے اس سے انکار کیا ہے، روایت کے دوسرے راوی عطار بن سائب کا حافظہ خراب ہوگیا تھا، اس لئے لوگوں نے اس کو چھوڑ دیا تھا، گو سفیان کی اس سے روایتیں حافظہ کی خرابی سے پہلے کی سمجھی جاتی تھیں، مگر اوپر کی روایتون مین دیکھو کہ خود سفیان کی روایتون مین بھی وہی ناقابل تطبیق اختلاف موجود ہے، ان وجوہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف فیہ جزئیات غیر مسلم ہیں، اور واقعہ کی اصلی صورت وہی ہے، جو چھٹی روایت میں ہے کہ وہ مجلس محض دعوت کی تھی، جس میں حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہ موجود تھے، کہ نماز کا وقت آگیا، اور ایک صاحب جو مخمور تھے نماز پڑھانے کھڑے ہوگئے، اور آیتیں غلط سلط پڑھ دین چونکہ اس واقعہ کے راوی حضرت علیؓ تھے، اور وہ دعوت میں بھی شریک تھے، اس لئے یا تو ابوعبدالرحمن سلمی عثمانی نے فرقہ داری کے جذبہ مین یا عطا نے ذراسی بھول میں واقعہ کی نسبت ادھر سے اُدھر کردی،

اس آخری چھٹی روایت کی تائید مین حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے ہوتی ہے جسکی سند اس پورے سلسلہ سے الگ اور مستقل ہے

۷۔ عن ابی ھریرۃ قال حرمت الخمر ثلاث مرات قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المدینۃ وھم یشربون الخمر ویاکلون المیسر فسئلوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عنھما فانزل اللہ علی نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم، یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر	حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ شراب تین بار میں حرام کی گئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے، تو لوگ شراب پیتے تھے اور جوئے کا مال کھاتے تھے، لوگوں نے آپ سے ان دونوں کے متعلق سوال کیا تو خدا نے آپ پر یہ آیت نازل فرمائی یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر

كنت اسقى اباعبيدة وابا طلحة
وأبيّ بن كعب فجاء هم آتٍ
فقال ان الخمر حرمت

میں، ابو عبیدہ اور ابی بن کعب اور
اور ابو طلحہ کو شراب پلا رہا تھا کہ ایک
شخص نے آکر کہا کہ شراب حرام ہوگئی،

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی شرح میں صحیح مسلم اور دیگر حدیث کی کتابوں کے حوالہ سے

(بقیہ حاشیہ ص ۲۸۱) وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ اِثْمُهُمَا
اَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا الآية فقال النَّاس ما
حرّم علينا انّما قال فيهما اثمٌ كبيرٌ
وكانوا يشربون الخمر حتى اذا كان يومٌ
من الايام صلّى رجل من المهاجرين
امّ صحابه في المغرب خلط في قرأته
فانزل الله فيهما آية اغلظ منها
يا ايها الذين آمنوا لا تقربوا الصلوٰة
وانتم سكارى حتّى تعلموا ما تقولون
وكان الناس يشربون حتّى ياتي احدهم
الصلوٰة وهو مفيق ثمّ انزلت آية
اغلظ من ذالك يا ايها الذين آمنوا انّما
الخمرُ والميسرُ والانصاب والازلامُ
رجسٌ من عمل الشيطان فاجتنبوه لعلّكم
تفلحون فقالوا انتهينا ربّنا (مسند احمد جلد ۲ ص ۳۵۱)

وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا
الآية لیکن لوگوں نے کہا خدا نے ہم پر حرام نہیں کی
صرف یہ کہا کہ ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے اب
بھی لوگ شراب پیتے رہے یہاں تک کہ ایک دن
ایک مہاجر نے نماز مغرب پڑھائی، اور اپنی قرأت
میں خلط کردیا، اس لئے خدا نے شراب کے متعلق اس سے
زیادہ سخت آیت اتاری یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا
لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی حَتّٰی
تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ اب بھی لوگ شراب پیتے رہے
البتہ جب کوئی نماز پڑھنے جاتا تھا تو ہوش کی حالت
میں جاتا تھا، پھر اس سے زیادہ سخت آیت نازل
ہوئی، یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ
الْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ
مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّکُمْ
تُفْلِحُوْنَ، اب لوگوں نے کہا کہ خدا وندا ہم باز آئے

اس میں حضرت علیؓ کا کہیں ذکر بھی نہیں، حضرت علیؓ جیسے صاحب فہم قرآن کے صاحب فہم کی نسبت یہ خیال کرنا کہ پہلی آیت
کے اشارے سے وہ شراب کی حرمت کو نہ سمجھ سکے تھے، قبول کے قابل نہیں، محدثین میں حاکم نے مستدرک میں جس روایت کو لکھ کر

کہ اس جلسہ میں گیارہ بزرگ شریک تھے جن میں حضرت معاذ بن جبلؓ بھی تھے، اس موقع پر لحاظ کے قابل یہ بات ہے کہ اگرچہ یہ مدتوں کی عادت تھی، اور اس وقت بھی سب خمار میں جھوم رہے تھے تاہم جوں ہی یہ آواز آئی کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے شراب کی ممانعت کر دی ہے کسی نے پوچھا گچھا تک نہیں، اور دفعۃً جام و سبو توڑ ڈالے، یہ صرف ابو طلحہؓ کے گھر کا حال نہ تھا، بلکہ تمام مدینہ کے گلی کوچوں میں شراب کی ندیاں بہ گئیں، بخاری باب المظالم میں ہے:۔

فجرت فی سکک المدینۃ	مدینہ کی گلیوں میں شراب بہتی پھرتی تھی،

ان ندیوں کی روانی سے اندازہ ہوگا کہ عرب میں شراب نوشی کی کثرت کا کیا عالم تھا،

قمار بازی | شراب خوری کے ساتھ ساتھ ان میں قمار بازی کا بھی عام رواج ہو گیا تھا، عرب کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۲) بیان کیا ہے کہ اس واقعہ میں حضرت علیؓ کا نام شامل کرنا خارج کی کارستانی ہے جس کی تردید اس روایت سے ہو جاتی ہے جس کو خود حضرت علیؓ روایت فرماتے ہیں، حاکم کہتے ہیں،

وفی ھذا الحدیث فائدۃ کثیرۃ وھی	(مستدرک حاکم جلد ۲ ص ۳۰۷)	اور اس حدیث میں بہت بڑا نکتہ ہے اور وہ
ان الخوارج تنسب ھذا السکر وھذہ		یہ ہے کہ خوارج نے اس نشہ اور اس غلط قرأت کو
القرأۃ الی امیر المومنین علی بن ابی		امیر المومنین علیؓ بن ابی طالب ہی کی طرف
طالب دون غیرہ وقد برأہ اللہ		منسوب کیا تھا تو خدا نے اُن کو اس الزام سے
منھا فانہ راوی ھذا الحدیث		بری کر دیا کہ وہی اس حدیث کے راوی ہیں

درحقیقت وہ واقعہ کے صرف راوی تھے لیکن عثمانی اور خارجی راویوں نے خود حضرت علیؓ کو صاحب واقعہ بنا دیا،

سلہ فتح الباری جلد (۱۰) مطبوعہ مصر طبع اول صفحہ ۳۱ بحوالہ روایت ابی عاصم،

مال و دولت کا تمامتر سرمایہ اونٹون کے چند گلون تک محدود تھا، اس لئے جوا بھی ان ہی کے ذریعہ سے کھیلا جاتا تھا، چنانچہ ایک جاہلی شاعر اپنے حریف سے کہتا ہے،

أَعَيَّرتَنا ألبانَها ولحومَها　　وذلك عارٌ یا ابن ریطة ظاهرُ

کیا تو ہمپر عیب لگاتا ہی کہ ہم اونٹ کا دودھ اور گوشت کھاتے ہین، ای ابن ریطہ ہم پر یہ عیب نہیں لگ سکتا

نحابی بها أکفاءنا ونهینها　　ونشرب فی اثمانها ونقامِرُ

ہم اُن کو اپنے ہمسرون کو بطور عطیہ کے دیتے ہیں اور اُن کو مہمانی مین صرف کرتے ہین اور انکی قیمت سے شراب پیتے اور جوا کھیلتے ہین

اس غرض سے اونٹون کو ذبح کرکے ان کے گوشت کو دس ٹکڑون مین تقسیم کر دیتے تھے اور ان ہی ٹکڑون پر پانسے ڈالتے تھے، ان پانسونکی صورت یہ تھی کہ دس تیر مقرر کر لئے تھے جن کے نام یہ ہیں، فذ، توام، رقیب، حلس، مسبل، معلی، منافس، منیح، سفیح، وغد، ان میں ہر تیر کے مختلف حصے معین کر دیئے تھے، اور جب جوا کھیلتے تھے، تو ان کو ایک تھیلے میں ڈالکر ایک منصف شخص کے ہاتھ مین دیتے تھے، وہ اُن کو گڈمڈ کر کے ایک ایک تیر کو ایک ایک شخص کے نام پر نکالتا جاتا تھا، جن کے نام پر وہ تیر نکلتے تھے جن جن کے حصے مقرر تھے، وہ کامیاب ہوتے تھے، اور جن تین تیرون کا کوئی حصہ نہ تھا، وہ جن کے نام پر نکلتے، ان کو ناکامیابی ہوتی تھی، اس طرح گوشت کے جو ٹکڑے جمع ہو جاتے تھے، اُن کو فقیرون اور محتاجون اور دوستون مین تقسیم کر دیتے تھے، چونکہ یہ فیاضی کے اظہار کا ایک طریقہ تھا، اس لئے قمار بازی کی مجلسوں مین شریک نہ ہونا ایک قومی عار تھا، اور اس قسم کے لوگون کو نہایت بخیل خیال کرتے تھے، اور اُن کو "برم" کا خطاب دے رکھا تھا[1]، جو لوگ یہ خطاب حاصل

[1] یہ پوری تفصیل تفسیر کبیر جلد ۲ صفحہ ۳۲۱ میں ہے،

کر لیتے تھے، اُن سے شادی بیاہ "ہانگ و عار" خیال کیا جاتا تھا، چنانچہ ایک جاہلی شاعر اپنی بی بی کو وصیت کرتا ہے:

وَاِذَا ھلکت فلا تریدی عاجزا — عنساً ولا برماً ولا معزالا

اور اگر میں ہلاک ہو جاؤں تو عاجز، کمزور، اور جوئے میں نہ شریک ہونے والے اور سفر میں قوم سے علیحدہ رہنے والے سے نکاح کرنا،

جوئے کی ایک صورت جس کو "رہان" کہتے تھے، یہ بھی کہ کسی شرط پر بازی لگاتے تھے، اور جب وہ شرط پوری نہیں ہوتی تھی، تو جس چیز پر بازی لگائی جاتی تھی، اس کو لے لیتے تھے، چنانچہ جب رومیوں اور ایرانیوں میں جنگ ہوئی اور باوجود رومیوں کی شکست کے قرآن مجید نے پیشین گوئی کی کہ اُن کو چند سال میں ایرانیوں پر غلبہ حاصل ہو جائے گا، تو کفار نے حضرت ابوبکرؓ سے اسی قسم کی شرط لگائی، اور اس فتح کے لئے چھ برس کی مدت مقرر کی، چنانچہ جب یہ مدت گذر چکی اور رومیوں کو فتح و ظفر نصیب نہیں ہوئی، تو حضرت ابوبکرؓ کو بازی ہار جانا پڑی[۱]، رفتہ رفتہ اس قماربازی کا مذاق اُن میں اس قدر عام ہو گیا تھا کہ لوگ مال و دولت کھو چکنے کے بعد بی بی اور بال بچوں پر بازی لگا دیتے تھے،[۲] یہ قماربازی اور وہ بھی شراب کی بدمستی کے عالم میں اکثر مارپیٹ اور لڑائی پر ختم ہوتی تھی، عبس و ذبیان کی چہل سالہ جنگ گھوڑدوڑ کی قماربازی کا نتیجہ تھی حصولِ دولت اور کسبِ شہرت کے اس غلط طریقہ سے خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے تھے،

سود خواری | عرب میں سود خواری کا عام رواج تھا تمام دولتمند سود پر لین دین کرتے تھے حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب نے جو قریش کے سردار اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے تجارت کا کاروبار نہایت وسیع پیمانے پر پھیلا رکھا تھا، اور اس تعلق سے سود خواری میں نہایت شہرت رکھتے تھے چنانچہ

---

[۱] ترمذی ص۲۶ جوئے کی اس صورت کو رہان کہتے تھے، اور اب تک وہ حرام نہیں ہوئی تھی [۲] تفسیر کبیر جلد ۲ ص۲۳۱،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حجۃ الوداع مین سود کی حرمت کا اعلان کیا، تو سب سے پہلے ان ہی
کے سود کو باطل قرار دیا، حضرت عثمانؓ اور خالد بن ولیدؓ سود پر قرض دیتے تھے، مسعود ثقفی طائف
کا مشہور رئیس تھا، اور اس کے بھائی عبد یالیل، حبیب بن ربیعہ نہایت دولتمند تھے، بنو مغیرہ
ان ہی لوگون میں سود پر داد و ستد کرتے تھے، چنانچہ جب طائف فتح ہوا، اور یہ چارون بھائی
اسلام لائے، تو انھون نے مغیرہ سے سود کا تقاضا کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،[1]

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَوٰا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ، (بقرہ ۳۸)

مسلمانو! خدا سے ڈرو، اور بقیہ سود کو اگر تم مسلمان ہو تو چھوڑ دو،

ان کے علاوہ طائف ایک سرسبز اور دولتمند شہر تھا، اس لئے وہان کے لوگ عموماً
سود پر بیوپار کرتے تھے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے جن شرائط پر مصالحت کی ان
مین ایک ضروری شرط یہ بھی تھی کہ وہ لوگ سود خواری نہ کرینگے، اسی طرح یمن کے نجرانی
سوداگر بھی سودی کاروبار کرتے تھے، ان سے بھی یہی شرط کی گئی،[2][3]

سود کا عام اور متداول طریقہ تو یہ تھا کہ ایک معین شرح پر قرض دیتے تھے، اور راس المال
کے ادا کرنے کے لئے میعاد مقرر کر دیتے تھے، جب میعاد گذر جاتی تھی، تو اس کا تقاضا کرتے تھے،
اگر مدیون اس کو ادا نہین کر سکتا تھا تو میعاد مین اور اضافہ کر دیتے تھے، اور اُس کے عوض
مین شرح سود بڑھا لیتے تھے، لیکن اُس نے ترقی کر کے ایک نہایت ظالمانہ صورت اختیار کر لی
تھی، جو سود در سود سے بھی زیادہ خطرناک تھی یعنی ایک میعاد متعینہ کے لئے کسی کو مثلاً سو دینے تھے

[1] تفسیر کبیر جلد ۲ صفحہ ۳۰۸ [2] فتوح البلدان بلاذری فتح طائف [3] ابوداؤد کتاب الامارت،

گذر چکتی اور تقاضا کرنے پر مدیون اس رقم کو ادا نہین کر سکتا تھا، تو میعاد اور بڑھا دیتے تھے لیکن اُس کے معاوضہ مین راس المال مین بھی اضافہ کروا لیتے تھے، یہان تک کہ کبھی کبھی یہ اضافہ دوگنی چوگنی مقدار تک پہنچ جاتا تھا، اس طرح اضافہ ہوتے ہوتے مدیون کی کل جائداد مستغرق ہوجاتی تھی، یہ معاملہ زیادہ تر غریبون اور کاشتکارون کیساتھ پیش آتا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ غریبون اور کاشتکارون کا تمام طبقہ چند دولتمندون اور خصوصًا یہودیون کے ہاتھ مین گرو تھا، قرآن مجید کی یہ آیت اسی طریقۂ سود کو مٹانے کے لئے نازل ہوئی،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا	مسلمانو! دونا، چار گنا سود نہ کھاؤ
أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ	اور خدا سے ڈرو یقین ہے کہ تم کامیاب
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ، (آلِ عمران ۱۴)	ہوجاؤ،

سود کے علاوہ قرض کے متعلق اور بھی مختلف قسم کی ناجائز سختیاں پیدا ہوگئی تھین مثلاً اگر راہن میعاد متعینہ پر مالِ مرہونہ کو چھڑا نہ سکتا تھا، تو مرتہن اس کا مالک ہوجاتا تھا[1]، مال و دولت سے گذر کر عورتون اور بال بچون تک کو رہن رکھواتے[2]،

لوٹ مار عرب میں روز کی لوٹ مار نے اگرچہ ہر قبیلہ کو غارتگر اور راہزن بنا دیا تھا، تاہم بعض قبائل مین اس قسم کے خاص خاص جتھے قائم ہوگئے تھے، جنھون نے راہزنی کو اپنا ذریعۂ معاش اور عام مشغلہ بنالیا تھا، اس قسم کے لوگون کو "لصوص" کہتے تھے، اور قبیلۂ طے کو عرب مین عام طور پر جو شہرت حاصل تھی، وہ اسی گروہ کی بدولت تھی،

---

[1] موطا امام مالک ص ۳۰۴ [2] بخاری قتل کعب بن اشرف،

یہ گروہ شہر سے باہر میدانون مین جنگلون مین، پہاڑ کے کھوؤن مین رہتا تھا، ادرادھرسے جو مسافر یا قافلے گذرتے تھے، ان کو لوٹ لیتا تھا، اس کا استیصال صرف ایک پُرزور نظام حکومت ہی سے ہو سکتا تھا جو عرب میں مفقود تھا چنانچہ قبیلۂ طے کے عیسائی سردار عدی بن حاتم مسلمان ہو کر جب آپ سے ملنے آئے اور آپ نے اُن سے یہ پیشینگوئی کی کہ "وہ دن آئے گا جب حیرہ سے ایک پردہ نشین عورت بے خوف وخطر حضرموت کا سفر کرے گی" تو چونکہ وہ قبیلۂ طے کے ایک رئیس تھے اور اُن اس قبیلہ کے ڈاکوؤن کا حال معلوم تھا اس لئے اُن کو تعجب ہوا کہ ہین! طے کے لصوص کیا ہو جائین گے؟

ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے مال و دولت، موشی، بلکہ اہل وعیال تک پر ڈاکہ ڈالنے کیلئے تیار رہتا تھا، تاجرون اور سوداگرون کے قافلے بغیر کسی بھاری انعام کے کسی میدان سے بسلامت گذر نہین سکتے تھے، ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کی عورتون اور بچون کو پکڑ کر کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا، اور موشیون کو ہانک لیجاتا تھا، صبح کا وقت جب کہ رات بھر چلنے کے بعد مسافر آرام کرتے تھے، اس کام کے لئے مخصوص ہو گیا تھا، چنانچہ "صبح" کا لفظ عربی مین لوٹنے کے معنی مین جاہلیت مین عام طور سے بولا جاتا تھا، کامیاب ڈاکو اپنے کارنامون کو نظم کرتے تھے، اور فخریہ پڑھتے تھے، ایک قبیلہ کا شاعر حارث نامی ڈاکو کے سلامت نکل جانے پر کہتا ہے؛

یالهف زیابة للحادث　　　الصابح فالغانم فالآئب

اے زیابہ کا افسوس حارث کے لئے جو صبح کو ڈاکہ ڈالنے والا، پھر لوٹنے والا، پھر سلامت واپس جانیوالا ہے؛

حج کے تین مہینون مین البتہ وہ اس پیشہ سے باز رہتے تھے، لیکن اس سے زیادہ مدت پر وہ صبر نہیں کرتے تھے، اور چونکہ ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے مال و دولت اور موشی پر موقع پاکر اسطرح

تصرف کرتا تھا، اس لئے وہ اُس کو عیب نہین، بلکہ بہادری کا کام سمجھتے تھے، اور اس طرح ملک مین مسلسل قتل و غارت اور لوٹ مار کا طریقہ جاری تھا،

چوری | ڈاکہ کے علاوہ اقتصادی حالات کی مجبوری سے بدوُن مین چوری کا رواج بھی تھا، مختلف قبیلون کے ایسے بہادر جو قبیلہ مین کوئی نمایان حیثیت نہین رکھتے تھے، وہ خصوصیت کیساتھ اس پیشہ کو اختیار کرتے تھے، وہ تنہا بڑے بڑے خطرناک موقعون پر جا کر اس کام کو انجام دیتے تھے، اور اس پر فخر کرتے تھے، اُن مین سے سلیک بن السلکہ اور تابط شرًا شہرت عام رکھتے تھے تابطؔ شرًا کا ایک قطعہ حماسہ مین ہی جس مین اپنی چوری اور حیلہ گری کا ذکر بڑے فخر سے کیا ہی،

قریش مین تجارت کے سبب سے دولت بھی تھی اور خود خانۂ کعبہ مین تحفون اور نذرانون کا خزانہ جمع رہتا تھا، اس لئے اُن مین چوری کے مواقع بھی زیادہ تھے، چنانچہ کلبی نے متعدد ممتاز قریشیوں کے نام بتائے ہیں جنھون نے اس خزانہ سے سونے کا ہرن چرا لیا تھا[۱]، بلکہ اس کیلئے خاص طور سے ابولہب کا نام لیا جاتا ہے[۲]،

عام بدوعربون مین یہ برائی جتنی عام ہوگئی تھی، اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان مردون اور عورتون سے جو اسلام قبول کرنے آتے تھے، دوسری باتون کے ساتھ یہ معاہدہ بھی لیتے تھے کہ "وہ آیندہ چوری نہ کرین گے[۳]" بلکہ خود قرآن پاک نے آپ کو اس کا معاہدہ لینے کا حکم دیا تھا[۴]،

چوری کرنے کے عجیب عجیب طریقے ایجاد کر لیے تھے، ایک شخص نے اپنی چھڑی کے سرے

---

۱ فتح الباری جلد ۱۲ ص ، ۲ کتاب المعارف لابن قتیبہ ۳ صحیح بخاری کتاب الحدود ص ۱۰۰۳ و ۱۰۰۴ ۴ سورۂ ممتحنہ رکوع ۲

ایک ٹیڑھا لوہا (محجن) لگا رکھا تھا، حج کے زمانہ مین آتا اور جب حاجیوں کو غافل پاتا تو اس لوہے کے سہارے سے اُن کے اسباب کو کھینچ لیتا۔[۱]

جس طرح عرب میں طے کے ڈاکو لوٹ مار مین مشہور تھے، اسی طرح بعض قبائل چوری میں شہرت عام رکھتے تھے، چنانچہ اسلم، غفار، مزینہ اور جہینہ کے قبیلے تمام عرب مین اس بنا پر بدنام تھے کہ وہ خاص طور پر حاجیون کے مال واسباب کی چوری کیا کرتے تھے۔[۲]

چونکہ یہ چوری عربوں کی اقتصادی کمزوری کا نتیجہ تھی، اس لئے اس کے لئے غیر و بیگانہ کی تخصیص نہ تھی، بلکہ اس کا اثر اعزہ واقارب، ہمسایہ دوست آشنا، خاندان، غرض سب پر پڑتا تھا، چنانچہ مدینہ مین بشر، بشیر، مبشر تین آدمی تھے جن کو بنو ابیرق کہا جاتا تھا، ان مین بشر منافق تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو مین شعر کہکر دوسرون کی طرف منسوب کر دیتا تھا، یہ لوگ نہایت تنگدست اور فاقہ مست تھے، انھون نے رفاعہ نامی ایک شخص کے بالاخانہ سے جس مین ہتھیار، تلوار، اور زرہ وغیرہ بھی رکھی ہوئی تھی، نقب لگا کر چوری کی، آپ نے رفاعہ کے ہتھیار واپس دلائے، لیکن رفاعہ نے انکو خدا کی راہ مین وقف کر دیا، اور بشیر بھاگ کر مشرکین سے جا ملا۔[۳]

مردون کے علاوہ عورتین بھی اس مرض میں گرفتار تھیں، اسی لئے قرآن پاک نے عورتون سے بیعت لیتے وقت یہ عہد لینے کی بھی تاکید کی کہ وَلَا یَسْرِقْنَ (ممتحنۃ ۲) یعنی وہ چوری نہ کریں گی، شرفا اگر اس الزام مین پکڑ جاتے تو وہ چھوڑ دیئے جاتے تھے، اسلئے یہ برائی رکنے نہین پاتی تھی چنانچہ اسلام کے بعد بھی جب قبیلۂ مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی تو اُس پر قریش کو سخت تردد ہوا،

[۱] مسلم باب فی صلوٰۃ الکسوف ۲۵ [۲] مسلم و بخاری کتاب المناقب باب اسلم وغفار [۳] ترمذی ص ۴۹۲ کتاب التفسیر سورۂ ن

اور لوگوں نے کہا اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کون سفارش کریگا؟ لوگوں نے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو منتخب کیا جن کو آپ بہت پیار کرتے تھے، انھوں نے سفارش کی تو آپ نے فرمایا تم حدود اللہ کے متعلق سفارش کرتے ہو"؟ پھر کھڑے ہوکر خطبہ دیا، اور اس میں فرمایا کہ گذشتہ قومیں صرف اسی لئے ہلاک ہوگئیں کہ جب شریف آدمی چوری کرتا تھا، تو اس کو چھوڑ دیتے تھے، اور ضعیف چوری کرتا تھا، تو اس کو سزا دیتے تھے، خدا کی قسم اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ لیتا[1]

خود شہر کے اندر اس قسم کی وارداتوں کی یہ حالت تھی کہ صفوان بن امیہ ایک روز ایک بیش قیمت چادر اوڑھ کر سو رہے تھے، ایک شخص نے موقع پاکر اس کو اڑا لیا، وہ گرفتار کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا، تو آپ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، صفوان کو اس پر رحم آیا، اور آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! ایک چادر کے لئے ایک عرب کا ہاتھ کاٹا جائیگا، آپ نے فرمایا میرے پاس لانے سے پہلے ہی اس کا خیال رکھنا تھا، حاکم تک معاملہ پہنچنے کے بعد کسی کو سفارش کا حق حاصل نہیں[2]

سفاکی بیرحمی وحشت رات دن کی لوٹ مار اور کشت وخون سے ان میں درندوں کے تمام اوصاف پیدا ہوگئے تھے، زندہ اونٹ اور دنبے کے کوہان اور چکیاں کاٹ کر کباب لگاتے اور یہ انکی بڑی مرغوب غذا تھی،

زندہ جانوروں کو درخت وغیرہ سے باندھ دیتے، اور ان پر تیر اندازی کی مشق کرتے لڑائیوں میں حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر ڈالتے، مقتولوں کے ناک کان کاٹ لیتے اور عورتیں ان کے ہار بنا کر پہنتیں، منت مانتے کہ دشمن کو قتل کریں گے، تو اس کی کھوپڑی میں شراب پئیں گے،

سزا دینے کا ایک یہ طریقہ تھا کہ مجرم کو دو درختوں کی ٹہنیاں جھکا کر اسکے اعضا ان میں باندھ دیتے

---

[1] بخاری جلد ۲ ص ۱۰۰۳ کتاب الحدود [2] دار قطنی صفحہ ۳۲۴ کتاب الحدود،

اور پھر ٹہنیوں کو چھوڑ دیتے، مجرم کا بدن چر کر ٹہنیوں کے ساتھ رہ جاتا،

کبھی کبھی عورتوں کو گھوڑے کی دم سے باندھ کر گھوڑے کو سرپٹ ڈالدیتے، اُن کے بدن کے ٹکڑے اڑجاتے، اس قسم کی سزائیں اکثر عرب کے سلاطین اور رُوسا دیا کرتے تھے،

کبھی آدمی کو کسی کوٹھری میں قید کر کے اس کا کھانا پانی بند کردیتے تھے، یہاں تک کہ وہ اسی طرح بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مرجاتا تھا، اس طریقہ سزا کا نام اُن کے ہاں صبر تھا، مردوں کی قبر پر اونٹ باندھ دیتے تھے، اور اس کو کھانے کو نہیں دیتے تھے، وہ چند روز میں مرجاتا تھا، سمجھتے تھے کہ یہ مردے کی سواری بنے گا، اس اونٹ کو "بلیہ" کہتے تھے،

زنا اور فواحش | زنا اور فسق و فجور عام تھا، اور یہ واقعات فخریہ اشعار میں بیان کئے جاتے تھے، امرأالقیس عرب کا سب سے بڑا شاعر تھا، اس کے ساتھ شاہزادہ اور والی ملک بھی تھا، اُس نے اپنی پھوپھی زاد بہن عنیزہ اور اور عورتوں کے ساتھ جو افعال شنیعہ اور بیحیائیاں کیں، قصیدۂ لامیہ میں فخر کے ساتھ تفصیل سے لکھی ہیں، باوجود اسکے اس قصیدہ کے اشعار عرب میں بچہ بچہ کی زبان پر تھے،

ابن عباس رضؓ سے روایت ہے کہ اہل جاہلیت گو بالاعلان زنا کو جائز نہیں سمجھتے تھے لیکن چھپے چوری کرنے کو جائز سمجھتے تھے، اور کہتے تھے کہ کھلم کھلا کرنا تو کمینہ پن ہے لیکن چھپکر کرنے میں مضائقہ نہیں[1]، فاحشہ عورتیں، گھروں کے سامنے جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں[2]، اور صاحب الرایات کہلاتی تھیں ان کی اولاد اصلی اور حلالی اولاد کے برابر سمجھی جاتی تھی، اسلام سے پہلے ایسی عورتیں خود مکہ معظمہ میں تھیں ان میں سے ایک کا نام عناق تھا، مرثد غنوی رضؓ نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اجازت مانگی کہ

---

[1] تفسیر طبری آیت محصنٰت غیر مسافحات جلد ۵ صفحہ ۱۳ [2] صحیح بخاری کتاب النکاح جلد ۲ صفحہ ۷۶۹،

عناق سے نکاح کرلوں؟ اس پر یہ آیت اُتری[1]

وَالزَّانِيَةُ لَا يَنكِحُهَا إِلَّا زَانٍ أَوْ مُشْرِكٌ (نور-۱) اور زانیہ عورت سے زانی یا مشرک ہی نکاح کرتے ہیں

بڑے بڑے رؤسا گھر کی لونڈیوں کو یہ حکم دیتے تھے کہ بدکاری کے ذریعہ سے جاکر کچھ کما لائیں
اور اُن کی نذر کریں، عبداللہ بن اُبی مدینہ کا رئیس تھا، اور اس درجہ کا شخص تھا کہ ہجرت سے پہلے تمام انصار
نے تاج بنوالیا تھا کہ اس کو بادشاہ بنا کر پہنائیں گے، چنانچہ صحیح بخاری میں یہ واقعہ منقول ہے
عبداللہ بن ابی کی دو لونڈیاں تھیں، ایک کا نام مسیکہ اور دوسرے کا نام امیمہ تھا، وہ
ان دونوں کو زناکاری کرانے پر مجبور کرتا تھا، اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اُتری[2]

وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ (سورۂ نور) اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو،

موجودہ طریقہ کے علاوہ نکاح کی اور چند قسمیں جاری تھیں، جو حقیقت میں بدکاری ہی
کی قسمیں تھیں مثلاً ایک یہ کہ کوئی شجاع اور بہادر شخص ہوتا تو اپنی عورت کو اس کے پاس بھیجتے
کہ اس سے ہمبستر ہو، بچہ پیدا ہوتا تھا تو سمجھتے تھے کہ اس میں بھی وہی اوصاف آجائیں گے جس کا یہ نطفہ ہے
دوسرا طریقہ یہ تھا کہ چند آدمی جن کی تعداد ایک وقت میں دس سے زیادہ نہیں ہوتی تھی کسی
عورت کے پاس جاتے، اور سب اس سے ہم صحبت ہوتے، جب وہ حاملہ ہو جاتی اور بچہ جنتی تو سب
کو بلا بھیجتی اور کسی ایک سے کہتی کہ یہ بچہ تمہارا ہے، اس کو قبول کرنا پڑتا، اور پھر وہ اس کا بیٹا سمجھا جاتا
تیسرا طریقہ یہ تھا کہ فاحشہ عورتیں جو سر بازار جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں اُن کے لڑکا پیدا ہوتا
تو قیافہ شناس کو بلا بھیجتیں، وہ عورت کی شکل دیکھ کر بتاتا کہ فلاں شخص کا نطفہ ہے، عورت اس کو بلا کر کہتی کہ

---

[1] ابوداؤد کتاب النکاح [2] صحیح مسلم، باب تفسیر،

تمہارا بچہ ہی صحیح بخاری کتاب النکاح میں یہ تینوں طریقے تفصیل سے مذکور ہیں،

ایک اور قسم عارضی نکاح کی جاری تھی، اور وہ یہ تھی کہ کسی عورت سے مدت متعینہ کے لئے نکاح کر لیتے تھے اس مدت کے گذرنے کے بعد اسکی اجرت دیکر اسکو الگ کر دیتے تھے اسکو متعہ کہتے تھے اسلام نے شروع میں اس کو ضرورۃً چندے باقی رکھا، پھر ہمیشہ کے لئے اس کو حرام کر دیا،

بے شرمی و بیحیائی | شرم وحیا کا وجود نہ تھا، حج کعبہ میں ہزاروں لاکھوں آدمی جمع ہوتے لیکن (قریش کے سوا باقی) سب مادرزاد ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کرتے، عورتیں جب ننگی ہو کر طواف کرتیں تو لوگوں سے کہتیں کہ کوئی ہم کو اتنا کپڑا دیتا کہ ستر عورت ہو جاتا، پھر یہ شعر پڑھتیں،

الیوم یبدو بعضہ او کلہ	آج بدن کا کچھ حصہ کھلے گا یا سارا
فما بدا منہ فلا احلہ	اور جو کھلا ہے اس سے لطف اٹھانے کی میں اجازت نہیں دیتی

صحیح مسلم باب التفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے،

نہاتے وقت اوٹ نہیں کرتے تھے، کھلے میدان میں بے ستر ہو کر نہاتے تھے،[1] پاخانہ پیشاب کے وقت پردہ نہیں کرتے تھے،[2] جلسوں میں بیٹھتے تو بیویوں سے ہم صحبتی کے تمام واقعات بیان کرتے،[3]

سوتیلی ماؤں پر وراثۃً قبضہ کرکے ان کو بیوی بناتے،

عورتوں پر ظلم | عورتوں کی حالت نہایت خراب تھی موروث کے متروکہ سے انکو کچھ نہیں ملتا تھا،

---

[1] نسائی باب الاستتار عند الغسل [2] ابوداؤد کتاب الطہارۃ [3] ابوداؤد کتاب النکاح باب مایکرہ من ذکر الرجل مایکون من اصابتہ اہلہ،

عرب کا قول تھا کہ میراث اس کا حق ہے، جو تلوار پکڑ سکتا ہو، اسی بنا پر چھوٹے بچے بھی وراثت سے محروم رہتے تھے،

لڑائیوں میں مفتوحہ قبیلہ کی عورتیں عین میدان جنگ میں فاتحیں کے تصرف میں آجاتیں، اگر صلح ہو جاتی، اور عورتیں واپس دیدیجاتیں، تو باوجود اس کے کہ سب کے ناموس برباد ہو چکے ہوتے، بدستور گھروں میں لیجاتیں، اور یہ کوئی عیب نہیں خیال کیا جاتا تھا، فاتحین اس تصرف پر فخر کرتے، اور اس کو اشعار میں ظاہر کرتے، بنو ضبّہ نے جب بنو عامر پر فتح پائی، تو اُن کی عورتوں کو عین میدانِ جنگ میں رسوا کیا، فرزدق نے اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے،

فظلت وظلت یرکبون ھبیرھا	تو لوگ عورتوں پر متصرف ہو گئے،
ولیس لھم الا عوالیھا ستر	اور اگر کوئی پردہ بیچ میں تھا تو صرف نیزے تھے

قبیلۂ قیس اور بنو دارم میں جو معرکہ ہوا جو جرجان کے نام سے مشہور ہے، اسکی نسبت جریر کہتا ہے،

نکحت نساءھم بغیر مھور	اُن کی عورتوں سے بغیر مہر کے نکاح کیا

عمرو معدیکرب، عرب کے مشہور بہادر اور شاعر تھے، اُن کی بہن ریحانہ کی عصمت اسی طرح جب برباد ہوئی تو عمرو نے کہا،

امن ریحانۃ الداعی السمیع	کیا ریحانہ کی طرف سے کوئی پکارنیوالا سننے والا ہے
یؤرقنی واصحابی ھجوع	جس نے کو مجھے بیخواب کیا ہے لیکن میرے احباب سوتے ہیں،
اذا لم تستطع امرا فدعہ	اور اگر تم کسی کام کو نہ کر سکو تو اس کو چھوڑ کر
وجاوزہ الی ما تستطیع	وہ کرو جو کر سکتے ہو،

طلاق کے لئے کوئی مدت اور عدت نہ تھی، یعنی جب تک شوہر چاہے عورت نہ شوہر کے پاس رہ سکتی تھی نہ کسی اور سے شادی کرسکتی تھی،

نکاح کی کوئی حد نہ تھی، غیلانؓ بن سلمہ ثقفی جب اسلام لائے تو انکی دس بیویاں تھین،

وہب اسدیؓ نے اسلام قبول کیا، تو آٹھ بیویاں اُن کے عقدِ نکاح مین تھین[1]،

دو حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرتے، باپ مرجاتا تو اُس کی کل بیویاں (بجز حقیقی ماں کے) بیٹے کے تصرف میں آتین اور اس کی جائز بیویاں سمجھی جاتیں،

ایام کے زمانہ مین عورتوں کو الگ کر دیتے اور اُن کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے،

عورت جب بیوہ ہوجاتی، تو گھر سے باہر ایک نہایت تنگ کوٹھری رہنے کو، اور خراب سے خراب کپڑے پہننے کو دیئے جاتے، خوشبو وغیرہ کی قسم کی کوئی چیز استعمال نہ کرسکتی، اس حالت کے ساتھ جب پورا سال گذر جاتا تو ایک بکری یا گدہا لاتے، اس سے وہ اپنے جسم (!....) کو مس کرتی پھر کوٹھری سے باہر نکلتی اور اسکے ہاتھ میں مینگنی دیجاتی، وہ مینگنی کو پھینک دیتی، اس وقت سوگ سے نکل آتی، اور قدیمی حالت . . قائم ہوتی، عورت کا جو مہر مقرر ہوتا وہ باپ کو ملتا، عورت کو اس سے سروکار نہ ہوتا

غرض مجموعی حیثیت سے عورت، بدترین مخلوق، اور ہر قسم کی جبر و تعدی کا تختہ گاہ مشق تھی زندہ رہیاں تک نوبت پہنچی کہ جس کے گھر میں لڑکی پیدا ہوتی، اس کو سخت رنج ہوتا، اور شرم کے مارے لوگوں سے چھپا پھرتا،

وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثَىٰ   اور جب اُن میں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری

---

[1] ابو داؤد کتاب النکاح ۲۲۵ ابو داؤد کتاب النکاح، باب اجداد المتوفی عنہا زوجہا،

ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ	سنائی جاتی ہو تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہی اور غصہ
يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا	کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہی اس خوشخبری کے
بُشِّرَ بِهٖ ط اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ	رنج سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہی اور سوچتا ہی
يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ،	کہ ذلت کے ساتھ اس کو قبول کرے یا زندہ
(سورہ نحل -،)	زمین میں دفن کر دے ،

ابو حمزہ ایک رئیس تھا، اُس کے لڑکی پیدا ہوئی، تو اُس نے گھر میں رہنا چھوڑ دیا، اس پر اس کی بیوی یہ اشعار پڑھ پڑھ کر بچی کو لوریاں دیتی تھی،

مالابی حمزۃ لا یاتینا	ابو حمزہ کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے پاس نہیں آتا
یبیت فی بیت التی تلینا	اور ہمسایہ کے گھر میں رات بسر کرتا ہی،
غضبان الّا نلد البنینا	اس پر ناراض ہے کہ ہم بیٹے نہیں جنتے،
تاللہ ما ذاک بایدینا	خدا کی قسم یہ ہمارے اختیار کی بات نہیں .
ونحن کالزرع لزارعینا	ہم بطور کھیت کے ہیں ،
ننبت ما قد زرعوہ فینا	ہم میں جو بویا جائے گا وہی اُگے گا،

رفتہ رفتہ دختر کشی کی رسم جاری ہو گئی، لڑکی پیدا ہوتی تو اُس کو میدان میں لیجا کر زمین کھودتے، اور زندہ گاڑ دیتے، اس کو عربی میں واد کہتے ہیں،

ایک صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر ظاہر کیا تھا کہ انھوں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیاں زندہ دفن کیں،[1]

[1] تفسیر ابن جریر و ابن کثیر سورہ و اذا الموؤدۃ سئلت ،

عورت کو وراثت کا کوئی حصہ نہیں ملتا تھا، اُن کا قانون تھا، کہ وراثت کا حق اسی کو ہے جو تلوار چلائے[1]، عورت بیوہ ہونے کے بعد اپنے شوہر کے وارثوں کی ملک سمجھی جاتی تھی، وارث اگر بیوہ پر چادر ڈال دیتا، تو وہ اس کی جائز مدخولہ بنجاتی[2]،

وحشت وجہالت حرام حلال کی کوئی تمیز نہ تھی، ہر چیز اور ہر جانور کھا سکتے تھے، کھاتے تھے، حشرات الارض عام غذا تھی، چھپکلی تک کھا جاتے تھے، خون کو جما لیتے اور قاشیں تراش تراش کر کھاتے، مردہ جانور کھانا عام بات تھی[3]، چمڑے کو آگ میں بھون کر کھاتے، زندہ جانور کا گوشت کاٹ کر کھا لیتے تھے[4]، گردن مروڑ کر، ڈنڈے سے مار کر درندوں کا مارا ہوا سب کھا جاتے، گدھے کا گوشت بھی کھاتے تھے[5]،

عرب کا مشہور جاہلی شاعر اعشیٰ میمون جس نے آغاز اسلام کا زمانہ پایا ہے، اور اہل ادب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں اس کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے، اس میں وہ اسلام کی تائید میں اہل عرب کو جن باتوں کی طرف متوجہ کرتا ہے، وہ یہ ہیں،

وإياك والميتات لا تقربنها[6]	ولا تأخذن سهماً حديداً لتفصدا
مرداروں سے پرہیز کر اور ان کو نہ کھا	اور نہ تیز تیر سے جانور کو فصد دیکر مار کر کھا
وذا النصب المنصوب لا تنسكنه	ولا تعبد الأوثان والله فاعبدا
اور نہ کھڑے کئے ہوئے بتوں پر قربانی کر	اور نہ بتوں کی پوجا کر بلکہ اللہ کی عبادت کر

---

[1] تفسیر یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین [2] تفسیر ولا تمسکوھن [3] اسباب النزول سیوطی آیت وحرمت علیکم المیتۃ [4] تفسیر طبری سورۂ مائدہ بیان ماکولات [5] صحیح نسائی کتاب الصید والذبح [6] دیوان اعشیٰ مطبوعہ ویانا ۱۹۲۷ء ص ۱۰۲،

ولا السائل المحروم لا تتركنّه	لعاقبة ولا الاسير المقيدا
اور محروم بھیک مانگنے والے کو کسی اور انجام کیلئے مت چھوڑ	اور نہ زنجیر میں بندھے قیدی کو
ولا تسخرن من بائس ذی ضرارة	ولا تحسبنّ المرء یوماً مخلداً
اور نہ کسی مصیبت زدہ مفلس سے ٹھٹھا کر	اور نہ کبھی یہ سمجھ کہ آدمی ہمیشہ رہنے والا ہے
ولا تقربنّ جارة ان سرّها	علیك حرام فانكحن او تابدا
اور نہ اپنی ہمسایہ خاتون سے بدکاری کر	وہ تجھ پر حرام ہے تو یا نکاح کرا دیا کنوارا رہ جا

عربوں کے خصوصیات

خیر الامم بننے کی اہلیت

لیکن ان تمام مفاسد اور برائیون کے باوجود اہلِ عرب مین کچھ ایسی خصوصیات بھی تھین جو دنیا کی تمام قوموں میں ان ہی کے ساتھ مخصوص تھیں، اور ان کی ان ہی فطری اور طبعی خصوصیات و امتیازات کا اثر تھا کہ خلاقِ فطرت نے اُن کو اپنی نبوّت و رسالت اور تعلیم و شریعت کا اہل سمجھا، اور ان کو اپنے اس خلعتِ خاص سے سرفراز کیا،

صحت نسب | ان خصوصیات مین سب سے پہلی چیز اُن کی صحیح النسبی ہے، شمالی عرب کے تمام قبیلے حضرت ابراہیمؑ کی اولاد اور اُن کی نسل سے تھے، اور یہ بات ایسی مشہور و متواتر روایتون سے ثابت تھی کہ کسی نے اسکی تردید کی ہمت نہین کی، توراۃ نے حضرت ابراہیمؑ کی جن اولادون کے نام بتائے ہین اُن مین سے ایک ایک نام کا سُراغ عرب کی پرانی آبادیوں میں ملتا ہے، چنانچہ ریونڈ فارسٹر نے ۱۸۴۴ء مین عرب کا جو تاریخی جغرافیہ لکھا ہے، اس میں پوری دلیل اور تفصیل اور شہادتون کے ساتھ ان آبادیون کا پتہ لگایا ہے، اور اُن کی جگہین متعین کی ہین، قدیم یہودی مورخ یوسیفوس نے بھی یہی لکھا ہے،[۱] اور آج کل ایک یہودی فاضل ڈاکٹر اسرائیل ولفنسون نے تاریخ الیہود فی بلاد العرب

---

[۱] ترجمہ انگریزی ۱۸۶۲ء جلد اول صفحہ ۲۵،

ایک کتاب لکھی ہے اُس مین بھی اس نے اس واقعہ کو تسلیم کیا ہے اور اُس کی صحت پر دلیلین پیش کی ہین[1] اور بعض حال کے مناظر عیسائیون کے علاوہ اس واقعہ کے تواتر میں کسی نے شک نہین کیا ہے[2] اور غالباً اسی لئے سینٹ پال نے اپنے خطوط میں "عرب کی ہاجرہ" کی تمثیل استعمال کی ہے[3] اور قرآن پاک نے اہل عرب اور قریش کو خطاب کرکے صاف کہا ہے،

مِلَّةَ اَبِيكُمْ اِبْرَاهِيْمَ (حج) تمھارے باپ ابراہیم کا مذہب،

حضرت ابراہیمؑ تک نام بنام سلسلۂ نسب کے پہنچنے مین پشتون کی کمی بیشی، یا نامون کا گھٹنا بڑھنا ممکن ہے، مگر مجموعی حیثیت سے یہ دعویٰ کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد تھے کسی حیثیت سے مشکوک نہیں ہے خصوصاً جب اُس کے ساتھ خارجی قرائن پر بھی نظر کرلیجائے کہ وہی تمدن اور طرز معاشرت جو تورات مین حضرت ابراہیمؑ اور اُن کے اہل و عیال کا نظر آتا ہے، اسلام کے عہد تک بلکہ آج تک وہ اسی طرح عربوں میں قائم و باقی ہے، وہی خیمے ہیں، وہی صحرا ہین، وہی مویشی ہین، وہی بدویانہ زندگی ہے، وہی رسوم و رواج ہیں، جن کو اسلام نے آکر اور زیادہ نکھار دیا، وہی بیت اللہ، حج اور قربانی کی عادتیں ہیں، یہ ایسا کھلا قرینہ ہے، جو آج بھی یورپ کے محققوں کی نگاہون کی سامنے ہے، مشہور جرمن محقق نولڈیک کہتا ہے،

"اور نیز عربون میں قدیم سامی کیرکٹر اپنے خالص رنگ مین باقی سمجھا جاتا ہے، اور اُن کی زبان اصل زبان کے بہت قریب ہے[4]"

---

[1] تاریخ الیہود فی بلاد العرب لاسرائیل ولفنسون مطبوعہ مطبعۃ الاعتماد مصر ص ۵۰ و ۶۰، [2] سینٹ پال گلیتون کے نام باب ۴ - ۲۵ [3] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، طبع یازدہم مضمون "السنہ سامیہ" میں نے ارض القرآن جلد اول ص ۷۰ ا سے صفحہ ۱۰۶ تک اس پر مدلل بحث کی ہے، اور علماے یورپ کے حوالے یکجا کردیئے ہیں،

اہلِ عرب کو اپنے حسب و نسب کی حفاظت کا خیال و لحاظ تھا، اس کے ذکر سے عرب کی تاریخین معمور ہیں، چنانچہ نسب پر فخر کرنا اُن کی شاعری کا اور نسبی مفاخرت اُن کی تقریر کا سب سے بڑا موضوع تھا، اپنے باپ دادون کے مسلسل نامون کو یاد رکھنا ان کا خاندانی فرض سمجھا جاتا تھا، یہان تک کہ انسانون سے ہٹ کر جانورون (گھوڑون) تک کے نسب نامے وہ محفوظ رکھتے تھے، قبائل کے نسبی تعلقات کو یاد رکھنے والے خاص خاص لوگ ہر قبیلہ مین موجود رہتے تھے، اور یہی سبب ہے کہ آج بھی اُن کے اکابر اور مشاہیر کا سلسلۂ نسب آپ کو معلوم ہو سکتا ہے، اور اس پر بہت سی اہم کتابیں لکھی گئی ہین، اور یہ وہ خصوصیت ہے جو دنیا مین صرف اہل عرب کے ساتھ مخصوص ہے یہود اور بنی اسرائیل بھی گو حضرت ابراہیمؑ ہی کی نسل سے تھے مگر وہ بھی اس خصوصیت مین ان کی برابری نہین کر سکتے کہ دوسری قومون کے اختلاط اور میل جول، اور کسی خاص وطن نہ ہونے کے سبب سے انکی اکثر خاندانی خصوصیتین مٹ گئیں،

نسب بجاے خود کوئی فخر کی چیز نہیں، اسی لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کے مقابلہ مین نسبی فخر کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کی ہدایت کے لئے جو دعا کی تھی، اور اُن کو جس بیت اللہ کی پاسبانی سپرد کی تھی، اور اُن میں ایک نبی کی بعثت کی جو دعا مانگی تھی اور خدا نے اُن کی نسل کو دینی اور دنیاوی برکات کے عطا کرنے کا اُن سے جو عہد کیا تھا، ان سب کے پورا ہونے اور اُن کے حقیقی مصداق بننے کے لئے نسلِ ابراہیمؑ کی صحیح النسبی کی ضرورت تھی، اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس شرف کیساتھ مخصوص کیا،

کسی مذہب مین داخل نہ تھے	اسی طرح اُن کو اُن تمام اثرات سے محفوظ رکھا جو قومون کے عادات و اخلاق

اور استعدادات کو بدل دیتے ہیں، مثلاً وہ باوجود اس کے کہ ہر چہار طرف سے مختلف بڑے بڑے مذہبون سے ٹکرا رہے تھے، مگر کوئی مذہب اُن کو فتح نہین کرسکا تھا، مجوسیت خلیج فارس سے لیکر یمن تک حکمران تھی، یہودیت یمن اور حجاز کے تجارت گاہون پر قابض تھی، عیسائیت اپنی فوج و لشکر اور راہبون اور قسیسون کے دل بادل کیساتھ یمن سے لیکر شام کے حدود تک پھیلی تھی، اور بعض افراد اور بعض قبیلوں کو وہ برائے نام عیسائی بنا بھی چکی تھی، مگر پورا عرب بدستور اپنی خالص حالت پر باقی تھا، عرب میں جو نیک طبع اور دیندار لوگ ہوتے تھے، وہ مجوسی یا یہودی یا عیسائی ہونے کے بجائے اپنے کو دینِ ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے، اور اسی لئے اپنے مذہب کا نام دینِ حنیفی رکھتے تھے، یہ سب اس لئے ہو رہا تھا، کہ خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دینِ ابراہیمی کی دعوت و تجدید کا راستہ کھلا رہے،

محکوم نہ تھے | عرب کا ملک تخلیقِ عالم کے آغاز سے اسلام تک ہر غیر قوم کی حکومت سے ہمیشہ آزاد رہا۔ شمالی عرب نے کبھی کسی قوم کی غلامی نہیں کی، بابل کے بخت نصر نے بنی اسرائیل کو زیر و زبر کردیا، مگر عرب کی طرف آنکھ نہ اٹھا سکا، یونانیون اور رومیون نے مصر سے لیکر عراق کی سرحد تک صدیون تک حکومت کی، مگر خاص عرب کے اندر قدم نہ رکھ سکے، سکندر نے اور اُس کے بعد کے رومی سپہ سالارون نے جب ادھر نظر اٹھائی تو فطرت نے ہمیشہ اُن کو شکست دی، عرب کا ملک دنیا کی دو عظیم الشان حکومتون یعنی ایران اور روم کی سرحد پر واقع تھا، مگر وہ دونون اپنی حرص و آز کا ہاتھ اسکی طرف بڑھانے سے قاصر رہین، گستاخ عیسائی حبشیون نے یمن فتح کرنے کے بعد ہاتھیون کے ریلے کیساتھ مکہ معظمہ پر چڑھائی کی، مگر قدرتِ الٰہی نے اُن کو تباہ کردیا، یہ تمام اہتمام انتظام اسلئے تھا

کہ کوئی دوسری جابرانہ قوت اُن کے دل و دماغ کی استعداد کو برباد نہ کر سکے، اُن کی آزادی کی روح برقرار اور اُن کی فاتحانہ طاقت بدستور قائم رہے، تاکہ یہ مخفی خزانہ خدا کے آخری مذہب کی حکومت کے قیام و بقا میں کارآمد ہو،

کتابی فاسد تعلیم سے ناآشنا تھے

جس طرح وہ خارجی اثرات سے پاک تھے، اسی طرح صحیفۂ فطرت کے سوا ہر قسم کے کتابی علم سے وہ ناآشنا تھے، یعنی اس ذریعہ سے بھی وہ دوسری قوموں کے دماغی اثرات سے محفوظ تھے، اور علم کی جاہلانہ اور کج بحثانہ ذہنیت سے پاک تھے، وہ اُمّی تھے، تاکہ ایک اُمّی معلم کی ربانی تعلیم کے قبول کرنے کے لئے ہر طرح تیار رہیں،

وہ زمین کے وسط میں آباد تھے

عرب کا ملک پرانی دنیا کے وسط میں واقع ہے، ایک طرف ایشیا، دوسری طرف افریقہ اور تیسری طرف یورپ کا راستہ اس سے قریب ہے، پھر بحری جائے وقوع نے اس کو جزائر اور دور دراز ملکوں سے قریب کر دیا تھا، اس لئے عرب سے نکل کر وہ ایک طرف عراق ہو کر ایران، ترکستان، خراسان، سیستان، کابل، ہندوستان تک پہنچ گئے، اور دوسری طرف شام ہو کر مصر، افریقہ، الجزائر، ٹیونس، مراکش، اور اسپین تک جا پہنچے اور بحری راستوں سے ایک طرف تمام جزائر افریقہ، حبشہ، زنجبار، پھر اور جزائر ہند، جاوہ، سماٹرا، اور چین تک ان کا گذر ہوا، اور دوسری طرف سائپرس، کریٹ، اور سسلی تک اُن کا پرچم لہرایا، یہ تمام مواقع اس لئے میسر آئے کہ عرب کا جائے وقوع اس دعوت کے لئے مناسب مرکز تھا، فرض کرو کہ اگر اس دعوت کی جگہ ہندوستان یا چین ہوتی تو اسپین اور سسلی تک پہنچنے کے لئے کتنا عرصہ درکار ہوتا، پھر یہ کہ اس وقت تک دنیا جن دو مشرقی اور مغربی قوتوں کے زیر فرمان تھی، ان دونوں کے زور کو برابر طور سے اور ایک ساتھ توڑنے کے لئے

عرب کے سوا دنیا میں کوئی جگہ موزون نہ تھی، جہاں سے دونوں پر ایک ساتھ حملہ کرنا، اور دنیا کو اُن کے خون آشام پنجوں سے نجات دینا بآسانی ممکن ہوا،

بعض اخلاقی خوبیان

اُن کے علاوہ اہلِ عرب کو خیر الامم بننے اور عالم کے لئے شاہد، نمونہ اور مصلح ہونے کے لئے کچھ اور اخلاقی خوبیوں کی بھی ضرورت تھی، اور وہ اُن میں بدرجۂ اتم موجود تھیں، ان خوبیوں کے بغیر وہ اسلام کی عظیم الشان تحریک کے علم بردار نہیں ہو سکتے تھے، اور نہ وہ دنیا کی رہنمائی کا فرض انجام دے سکتے تھے،

شجاع وبہادر تھے

وہ حد سے زیادہ شجاع وبہادر تھے، وہ خطرات سے بے خوف تھے، وہ لڑائی کو کھیل سے زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے، یہی سبب ہے کہ وہ تمام دنیا کی قوموں اور سلطنتوں کے مقابلہ میں تنہا کھڑے ہوئے، اور کسریٰ اور قیصر کو انھوں نے ایک ساتھ چیلنج دیا، اور اس تحریک کے پھیلانے میں تھوڑی سی غیر مسلح جمعیتوں سے ہزاروں اور لاکھوں کی فوج کا بے خطر مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے،

پرجوش تھے

ساتھ ہی وہ پرجوش بھی تھے اس لئے جس دعوت اور تحریک کو لیکر اٹھے اس کو پوری کوشش، عزم اور جوش کے ساتھ دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلا دیا، اُن کے عزم اور جوش کو نہ پہاڑ روک سکا، اور نہ سمندر اس سے ٹکرا سکا، ہر جگہ وہ توحید کا علم لئے بحر و بر، دشت و جبل میں پھیل گئے، اور اپنے عزم راسخ سے ارکانِ عالم کو متزلزل کر دیا،

حق گو تھے

اُن کی جسمانی شجاعت و بہادری نے اُن کو دل کا شجاع اور بہادر بھی بنا دیا تھا، جو باتیں اُن کے دل میں ہوتی تھی، وہی اُن کی زبان پر تھی، اہل مدینہ میں جو نفاق کا عنصر پیدا ہو گیا

تھا، نہ وہ یہود کے اثر کا نتیجہ تھا، اور نہ قریش اور عام اہل عرب میں یہ بات نہ تھی، یا تو وہ کھلے دشمن تھے، یا کھلے دوست، اپنے نزدیک وہ جس کو حق سمجھتے تھے، اس کے ظاہر کرنے مین اُن کو کسی کا باک نہین ہوتا تھا

عقل و دانش والے تھے باوجود اس کے کہ وہ عموماً ظاہری نوشت و خواند سے عاری تھے مگر فطرت کے عطیۂ عقل و دانش سے وہ کافی طور پر بہرہ مند تھے، حضرت ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، خالدؓ، ابوعبیدہؓ بن جراح، وغیرہ سینکڑون، ہزارون صحابہؓ نے علم، مذہب، اخلاق، اور سیاست مین جو نکتہ سنجیان کیں، وہ خود اُن کی عقل و دانش کی گواہ ہین، روم و ایران کی متمدن قومون سے جس طرح انھون نے معاملہ، مراسلہ اور نامہ و پیام کیا، اور علم و سیاست کے الجھے سے الجھے ہوئے مسئلہ کو جس طرح سلجھایا، وہ خود اسی نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے، ان کے شعراء کے کلام، اُن کے مقررون کی تقریرین، اُن کے فصحاء کے مقولے سنیئے، تو ان کی اس فطری صلاحیت کا اندازہ ہوگا کہ ظاہری تعلیم کے بغیر کیونکر یہ لعل و گہر وہ اپنے منہ سے اگل سکے،

ذہن اور حافظہ کے تیز تھے فطرت کا قاعدہ ہے کہ اگر اس کے بعض قویٰ بیکار رہیں، تو ان کی قوت دوسرے زیر عمل قویٰ کو وہ منتقل کر دیتی ہے، اور جس عضو سے زیادہ کام لیا جاتا ہے، اسکی قوت کو وہ ترقی دیتی رہتی ہے، اسی اصول کے موافق ظاہری تعلیم اور نوشت و خواند سے محروم ہونے کے سبب جہان عرب کے بعض قویٰ بیکار ہو رہے تھے، وہان اُن کو اپنی یادداشت کے لئے تحریری اوراق اور سفینون پر بھروسہ کرنے کے بجائے خود اپنے دل و دماغ پر بھروسہ کرنے کی عادت تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ انکا ذہن اور حافظہ بہت قوی تھا، یہی سبب ہے کہ اُن کے شعراء اپنے بڑے بڑے قصیدون

کو زبانی پڑھتے تھے، اور جو کچھ کہتے تھے اس کو برزبان یاد رکھتے تھے، اور ان کی اسی قوت کا یہ فیض تھا کہ اُن مین کا بڑا طبقہ تحریر کے بغیر قرآن پاک کی بڑی بڑی سورتون کو یاد رکھتا تھا، اور بہتیرے ایسے تھے، جو پورے قرآن کو یاد رکھتے تھے، اور یہ ان ہی کی تقلید ہے کہ دنیا کے ہر حصہ مین ایسے ہزارون مسلمان پائے جاتے ہیں، جو پورے قرآن کے حافظ ہوتے ہیں، اور اہلِ عرب کی اسی خصوصیت کا مظہر یہ بھی تھا کہ احادیث و سیر اور واقعات کا بڑا سرمایہ تحریر کے علاوہ زبانی ایک دوسرے کو پوری ذمہ داری اور حفاظت کے ساتھ منتقل ہوتا رہا، اور سینکڑون اصحاب ایسے تھے، جو ہزارون لاکھون احادیث کو حرف حرف اور لفظ لفظ کی پابندی کے ساتھ یاد رکھتے تھے، اہلِ عرب کی اس خصوصیت نے اسلام کی حفاظت اور اشاعت کا نہایت اہم فرض انجام دیا،

فیاض تھے اہلِ عرب کی ایک خاص امتیازی صفت اُن کی فیاضی تھی، مہمان نوازی ان کی سب سے بڑی خصوصیت تھی، ہمسایون اور پناہ گزینون کی امداد میں وہ اپنی جان تک لڑا دیتے تھے، اپنی شہرت اور ناموری کے لئے اونٹون کو ذبح کر کے کھلا دینا، یا جوئے مین جیتی ہوئی دولت کو احباب کے جلسۂ دعوت میں اڑا دینا اور بسر کرنا انکی قومی رسم تھی، اور یہی اوصاف اُن کی شاعری کے مدح مین سب سے زیادہ نمایان نظر آتے ہین، اسلام نے اُن کی اسی صفت کو تھوڑی سی اصلاح کے بعد خدا کی راہ مین خیرات و صدقات و زکوٰۃ سے بدل دیا، اور اسلام کی مشکل کشائی مین اس نے سب سے زیادہ مدد دی،

مساوات پسند تھے چونکہ وہ کبھی کسی دوسری قوم کے محکوم نہیں ہوئے تھے، اور نہ کسی ایک مطلق العنان شخصی بادشاہ کے تابع فرمان بنے تھے، اس لئے ان کی خودداری کا جذبہ بیدار تھا، وہ غلام بننا نہیں جانتے تھے، وہ اپنے کو ذلیل کرنا پسند نہیں کرتے تھے، اور وہ بڑے سے بڑے شخص کے سامنے

برابری کے ساتھ بے باکانہ بیٹھکر باتین کرتے تھے،

عرب مین بیسیون لڑائیان صرف اسی خودداری کی حفاظت مین پیش آئی تھین جس کا ایک منظر سبعہ معلقہ کے آخری قصیدہ مین نظر آتا ہے، اہلِ عرب کے اس جذبہ نے حق گوئی، مساوات اور جمہوریت پسندی وغیرہ اسلامی تعلیمات کے پھیلانے میں بڑی مدد دی،

عملی تھے

اہلِ عرب کے فطری اخلاق وکردار کی آخری دفعہ یہ ہے کہ وہ طبعاً عملی اور عملیت پسند تھے، وہ اہلِ ایران اور اہلِ ہند کی طرح محض تخیل پسند، خیال آرا اور نظریہ باز نہ تھے، وہ مجسم عمل تھے، اور عملیت کو پسند کرتے تھے، وہ چون وچرا اور کیسے اور کیونکر کی فلسفیانہ الجھنوں سے پاک تھے، وہ دنیا کے کاروباری آدمیون اور سپاہیون کی طرح چند اچھی باتون کو قبول کرکے اُن پر فوراً عامل بنجاتے تھے یہی سبب ہے کہ عجمیانہ نکتہ آفرینی اور بال کی کھال نکال کر اسکی الجھنون کے سلجھانے میں وہ کبھی گرفتار نہین ہوئے، وہ ہمہ تن عمل اور صرف عمل تھے، اسی بنا پر شارع علیہ السلام نے اُن کے سامنے ایک عملی مذہب کو پیش کرکے ان کو سرتاپا عملی بنادیا، اور جو کچھ وہ تعلیم لائے تھے اس کا مجسم پیکر بنکر چندسال میں دنیا کے سامنے پیش کردیا، دور سے بدوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین آتے تھے اور شک وحجت اور مناظرہ وقیل وقال کے بغیر فرائض واخلاق کی عملی تعلیم حاصل کرکے اپنے قبیلہ مین واپس چلے جاتے تھے، اور بالآخر اپنی عملی دعوت سے اپنے پورے قبیلہ کو مسلمان بنالیتے تھے، وہ اگر مگر اور ممکن وناممکن کی بحث میں نہیں پڑتے تھے، وہ تعلیم کو دیکھتے تھے، اور سنتے تھے، وہ اچھی معلوم ہوتی تو اسکو قبول کرتے، اور اُس پر عمل کرکے دینی ودنیاوی فوائد اور نتائج کے حصول کا یقین کرتے تھے، اور اسی غیر متزلزل یقین اور ایمان کے بھروسہ پر وہ مشکل اور خطرناک کام کر گذرتے تھے، اہلِ عرب

کی اسی خصوصیت نے اسلام کی سادگی کو برقرار، اور عجمی فلسفیت و نظریت سے پاک و مبرا رکھا، اور سا تھ
چند ہی سال کے اندر اندر مغرب و مشرق، شمال و جنوب مین اسلام کا پھریرا آسمان پر اڑنے لگا،

ان اوصاف کی مصلحت

اہلِ عرب کے ان تمام فطری و طبعی اوصاف و اخلاق کو دیکھکر یہ یقین کیا جا تا ہی
کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری دین کی اشاعت اور حفاظت کے لیے جس قوم کا انتخاب کیا تھا، وہ
ازل سے اُس کے لئے منتخب ہو چکی تھی، باوجود اُن کی ہر قسم کی گمراہیون کے یہ چند اچھے اوصاف اسلیے
اُن میں ودیعت کئے گئے تھے، تاکہ جب خدا کی بادشاہی کا دن آئے، تو اُن کی فطری استعداد
کا یہ سرمایہ انکی امداد و اعانت کیلئے خزانۂ غیب کا کام دے یہی وہ سرمایہ تھا، جو اس وقت نہ
ہند و عجم مین تھا، نہ روم و فرنگ مین، نہ ترک مین تھا، نہ تنگ تجرِ عرب، اور صرف عرب میں تھا، اسی لئے اللہ
تعالیٰ نے اپنی آخری نبوت کے لئے اسی قوم کو برگزیدہ کر کے یہ امانت اُسکے سپرد کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا،" اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کی اولاد مین اسمٰعیل کو پسند کیا، اور اسمٰعیل کی اولاد مین
بنی کنانہ کو، اور بنی کنانہ مین سے قریش کو اور قریش میں سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم مین سے مجھکو" ایک اور
روایت مین ہے کہ آپنے فرمایا کہ مین عبدالمطلب کے بیٹے عبداللہ کا بیٹا ہون، " اللہ نے تمام لوگون کو پیدا کیا
تو مجھے اُس نے ان سب مین سب سے بہتر نسل مین رکھا، ان کو دو حصّون (عرب و عجم) میں تقسیم کیا،
تو مجھے اس حصہ مین (یعنی عرب میں) بنایا، جو سب سے بہتر تھا، اس حصّے کو بھی قبیلون مین تقسیم کیا تو مجھے
اس قبیلہ مین پیدا کیا، جو سب سے بہتر تھا، پھر اُس قبیلہ کو گھرانون میں تقسیم کیا، تو مجھے سب سے بہتر
گھرانے میں پیدا کیا، پھر اس گھرانے کو افراد پر تقسیم کیا، تو مجھے اس گھرانے کا سب سے بہتر فرد بنایا،[1]

[1] یہ دونون حدیثین ترمذی باب المناقب مین ہیں،

صبحِ سعادت

دنیا اور عرب کی سرزمین اس ظلمت میں تھی کہ صبحِ سعادت نمودار ہوئی، اور خورشیدِ نبوّت
کے طلوع کا غلغلہ برپا ہوا ظلمتِ شب کافور ہوئی، اور تھوڑی دیر میں ذرّہ ذرّہ سورج کی کرنوں
سے پُرنور ہوگیا، یہ ظاہر ہے کہ یہ سورج گو دنیا کو روشن کرنے نکلا تھا لیکن وہ نکلا عرب ہی کے افق
سے تھا اس لئے ضروری تھا، کہ اس کے نور سے پہلے اسی ملک کی سرزمین روشن ہو،

ایک قوم کا انتخاب

سرورِ کائنات ؐ کو گو خدا نے تمام عالم کی اصلاح کے لئے بھیجا تھا، اور اس بنا پر
ایک ایسی شریعت کامل عطا کی جو نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کے لئے ابد تک کافی ہی لیکن کوئی شریعت
کوئی قانون، کوئی دستور العمل، اس وقت تک مفید اور کارآمد نہیں ہوسکتا جب تک اس کے
ساتھ ایسا گروہ موجود نہ ہو، جو اس شریعت کی عملی تصویر ہو، اور جس کی ہر بات، ہر ادا، ہر جنبش،
عملی خطیب بنکر گردوپیش کو اپنا ہم زبان اور ہم عمل بنالے،

اس بنا پر خاتم انبیاءؐ کا سب سے اہم مقصد ایک خاص قوم کو تربیت دیکر اصلاحِ عالم کیلئے
تیار کرنا تھا[1]، دنیا کی اور قومیں باری باری اس منصب پر ممتاز ہوچکی تھیں، ایک زمانہ تھا جب بنی
اسرائیل جیسی قوم جو آج تمام دنیا میں خوار و ذلیل ہی، اِنِّی فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعَالَمِیْنَ (ہم نے تم کو تمام دنیا

[1] شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ جو پیغمبر تمام عالم کیلئے مبعوث ہوتا ہی وہ علاوہ ان اصول کے جو اور مذاہب میں ہیں

قومون پر فضیلت دی) کا تاج پہن چکی تھی لیکن اوپر بہ تفصیل گذر چکا کہ اب تمام قومون مین صلاحیت کا مادہ مفقود ہو چکا تھا، ایران تین ہزار برس تک ناز و نعمت مین پل کر ترقی کی روح فنا کر چکا تھا رومیوں کے تمام قوائے عمل بوسیدہ ہو چکے تھے، ہندوؤں کا دل و دماغ صرف وہم پرستی کا کام دینے کے قابل رہ گیا تھا، صرف ایک عرب تھا، جو بن جُتی زمین کی طرح مادہ ہائے نشو و نما سے لبریز تھا، اور ایک لوحِ سادہ کی طرح ہر قسم کی نقش آرائیون کے قابل تھا، مشیتِ ایزدی نے اسی کو تاکا، اور چند روز میں وہی عرب جو سرتاپا جہل، سرتاپا وحشت، اور سرتاپا درندہ پن تھا، کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ[1] کا مظہر بن گیا،

ان لوگون کا حلیہ و جمال اور خط و خال یہ تھا،

اَلَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ	ایسے لوگ کہ ہم اگر اُن کو دنیا میں اقتدار دین
أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ وَأَمَرُوا	تو وہ نماز قائم کرین، زکوٰۃ دیں، اچھی باتوں
بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (حج-۶)	کا حکم دیں اور بری باتوں سے روکیں،

اصلاح و ہدایت کی مشکلات ہر قوم کی اصلاح و ہدایت میں اوّل سخت اور متعدد مشکلات پیش آتی ہیں، لیکن اُن کی نوعیت ایک دو سے زیادہ نہیں ہوتی، لیکن عرب کی اصلاح میں ہر نوع ہر حیثیت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۰) چند اور مشہ اصول اختیار کرتا ہے جن میں سے ایک یہ ہے،

يدعوا قوما الى السنة الراشدة و يزكيهم و يصلح شانهم ثم يتخذهم بمنزلة جوارحه يجاهد بهم اهل الارض و يفرقهم في الآفاق و هو قوله تعالى كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (حجۃ اللہ البالغۃ صفحہ ۱۲۳ مطبوعہ مصر)	وہ ایک قوم کو سنت راشدہ کی طرف دعوت دیتا ہے اُن کو پاک اور درست کرتا ہے پھر اُن کو اپنا دست و بازو بناتا ہے اور اُن کو دنیا میں پھیلا دیتا ہے اور اُن کے ذریعہ سے مجاہدہ کرتا ہے جیسا کہ خدا نے کہا "تم بہترین امت ہو جو دنیا کے لئے پیدا کئے گئے ہو"

[1] تم بہترین قوم ہو جو انسانوں کے لئے (پردۂ عدم سے) باہر لائی گئی، جو نیکیوں کا حکم دیتی، اور برائیوں سے روکتی ہو،

ہر جہت کی گوناگون اور لاعلاج مشکلات تھیں، اور ایسی تھیں جن میں سے ایک کا حل کرنا بھی قدرت انسانی سے بالاتر تھا، بنو اسرائیل ایک مدت سے مصر میں، قبطیوں کی غلامی کر رہے تھے، اور قبطیوں کے جور و ظلم کا طوفان اُن کے سر سے گذر چکا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر یہ احسان عظیم کیا کہ فرعون کے پنجۂ ستم سے اُن کو چھڑا کر مصر سے نکال لائے، لیکن غلامی میں رہتے رہتے اُن کی طبیعت مین اس قدر ذلت پسندی آگئی تھی کہ جب ان سے کہا گیا کہ آگے کنعان کی زمین ہے، اُس کو دبالو اور اُسی پر تختِ سلطنت بچھاؤ، تو انھون نے حضرت موسیٰؑ سے صاف کہدیا کہ تم اور تمھارا خدا دونون جا کر لڑو، ہم تو یہان سے آگے قدم نہین بڑھاتے، یہ ایک امتدادِ معاشرت کا اثر تھا جو مرتے مرتے ان لوگون کی طبیعت سے نہین گیا، اور جب تک یہ نسل پوری اپنی موت سے مر کر منقرض نہین ہوگئی بنو اسرائیل کو کنعان کی زمین میں قدم رکھنا نصیب نہیں ہوا،

یہ صرف ایک مشکل کی مثال تھی، اب عرب کی مشکلات کا اندازہ کرو،

جہالت عرب کی قوم امی محض تھی، الوہیت، رسالت، کتاب، معاد، عبادت ان میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے اُن کے کان آشنا ہون، اسلام کا ہر لفظ جو اُن کے کان میں پڑتا تھا اُنکو ایک تعجب انگیز اور بالکل بیگانہ آواز معلوم ہوتی تھی، قرآن مجید نے اُن کی اس جاہلانہ حیرت و استعجاب کو متعدد آیتون مین ذکر کیا ہے،

یٰسٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۙ اِنَّكَ لَمِنَ	قرآن حکیم کی قسم، تو بے شبہ پیغمبرون میں ہے
الْمُرْسَلِيْنَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ	راہ راست پر ہے، یہ قرآن رحمت والے غالب
تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ لِتُنْذِرَ	خدا کے پاس سے اترا ہے، تاکہ تو اس قوم کو ڈرائے

قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُھُمْ فَھُمْ	کرے جن کے اسلاف کو آگاہ نہیں کیا،
غٰفِلُوْنَ ہ (یٰسین - ۱)	گیا، اور اس لئے وہ غفلت میں پڑے ہیں،

یہ نبوت کے شرف سے محروم قوم ایک آسمانی مذہب کے تمام خصائص سے محض بیگانہ تھی،

وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَھُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْھُمْ	اور انھوں نے تعجب کیا کہ اُن میں ایک پیغمبر
وَقَالَ الْکٰفِرُوْنَ ھٰذَا سٰحِرٌ کَذَّابٌ	ہو کر اُن کے پاس آیا، کافروں نے کہا یہ دروغگو
اَجَعَلَ الْاٰلِھَۃَ اِلٰھًا وَّاحِدًا اِنَّ	جادوگر ہے اُس نے اتنے خداؤں کو ایک خدا بنا دیا،
ھٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ہ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ	یہ عجیب بات ہے، اُن کے پنچ اُٹھ کھڑے ہوئے
مِنْھُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓی	کہ چلو اپنے معبودوں پر جمے رہو اس میں اسکی
اٰلِھَتِکُمْ اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ مَا	(پیغمبر کی) کوئی غرض ہے، ہم نے تو سابق
سَمِعْنَا بِھٰذَا فِی الْمِلَّۃِ الْاٰخِرَۃِ	مذہب میں یہ نہیں سُنا، یہ سب گھڑی
اِنْ ھٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ، (ص - ۱)	ہوئی بات ہے،
بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَھُمْ مُّنْذِرٌ	بلکہ اُن کو تعجب ہوا کہ ان ہی میں سے
مِّنْھُمْ فَقَالَ الْکٰفِرُوْنَ ھٰذَا شَیْءٌ	ایک اُن کے پاس پیغمبر بن کر آیا، کافروں
عَجِیْبٌ ، (ق - ۱)	نے کہا یہ تو بڑی تعجب کی بات ہے،

صفاتِ الٰہی، آثارِ نبوت، احوالِ معاد، ان میں سے ہر بات کو سُن کر وہ اسی طرح سراپا حیرت بنجاتے تھے، نبوت کے متعلق یہ سمجھتے تھے کہ انسان تو اس کے سزاوار نہیں، اس منصب پر تو فرشتوں کو ممتاز ہونا چاہیے تھا،

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا لَوْلَا
أُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰئِكَةُ (فرقان -۳)

جو ایک دن ہمارے سامنے آنے کے منکر ہیں وہ کہتے
ہیں کہ فرشتے پیغمبر بنا کر ہم پر کیون نہ اُتارے گئے

إِذْ جَاءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ
وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللّٰهَ قَالُوا
لَوْ شَاءَ رَبُّنَا لَأَنْزَلَ مَلٰئِكَةً فَإِنَّا بِمَا
أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ (فصلت ۲)

پیغمبر جب اُن کے پاس سامنے سے اور پیچھے سے آتے
ہیں کہ ایک خدا کے سوا کسی اور کو نہ پوجو تو وہ کہتے
ہیں کہ خدا اگر کسی کو پیغمبر بنا کر بھیجنا چاہتا تو فرشتون
کو اُتارتا، ہم تو تمھاری باتون کا انکار ہی کرینگے

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ
الْهُدٰى إِلَّا أَنْ قَالُوا أَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا
رَسُولًا، قُلْ لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ
مَلٰئِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا
عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَسُولًا (بنی اسرائیل)

ہدایت آنے کے بعد صرف اس شبہہ نے لوگون کو
ایمان لانے سے باز رکھا ہے کہ کیا خدا نے آدمی کو پیغمبر بنا کر
بھیجا ہے جواب مین کہدو کہ اگر زمین مین فرشتے
چلتے پھرتے بستے ہوتے تو البتہ ہم آسمان سے
کسی فرشتہ کو پیغمبر بنا کر بھیجتے،

نبی کا تخیل اگر اُن کے ذہن میں کبھی آتا تھا، تو بشریت سے ماورا صورت مین، یعنی
یہ کہ وہ انسانی ضروریات سے منزہ ہو، اُس کے پیچھے خدا کا اور فرشتون کا پہرا ہو، آسمان اور
زمین کے خزانے اُس کے دستِ قدرت مین ہون،

وَقَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ
لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوعًا أَوْ تَكُونَ
لَكَ جَنَّةٌ مِنْ نَخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ

انھون نے کہا اے پیغمبر ہم تجھ پر اس وقت تک ایمان
نہ لائین گے جب تک زمین سے ہمارے لئے تو چشمہ
بہا دے یا تیری ملکیت مین کھجورون اور انگورون

خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا، اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ	کا کوئی باغ نہ ہو جس میں نہریں جاری کر دی
كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ	ہوں یا جیسا کہ تو نے کہا ہے ہم پر بادل کا کوئی
بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا، اَوْ يَكُوْنَ	ٹکڑا نہ گرا دے یا خدا اور فرشتوں کو آمنا کر
لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى	نہ لے آئے، یا تیرے پاس کوئی سونے کا گھر
فِى السَّمَآءِ (بنی اسرائیل ۱۰)	ہو، یا تو آسمان پر نہ چڑھ جائے،
وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ	انھوں نے کہا یہ عجیب پیغمبر ہے، یہ تو کھاتا پیتا ہے
الطَّعَامَ وَيَمْشِىْ فِى الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ	بازاروں میں چلتا پھرتا ہے اس پر کوئی فرشتہ کیوں
اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ	نہ اترا، جو اس کے ساتھ مل کر لوگوں کو ڈراتا
نَذِيْرًا، اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ	یا اس کے پاس کوئی خزانہ کیوں نہیں ڈالدیا گیا
لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا (فرقان ۱۰)	یا اس کے لئے خاص کوئی باغ کیوں نہ ہو جس سے یہ کھاتا

پیغمبر کے لئے اُن کے خیال میں یہ بھی ضروری بات تھی کہ وہ بڑا دولت مند ہو، اس کے قبضہ میں کوئی بڑی جائداد ہو، میووں کے ہرے بھرے باغ اور سونے چاندی کے خزانے اس کے پاس ہوں، چنانچہ گذشتہ آیت میں کفار کے اس خیال کی طرف بھی اشارہ ہے، اسی لئے مکہ اور طائف کے چودھری، دولتمند تھے، وہ اس منصب کے سب سے زیادہ مستحق سمجھے جاتے تھے،

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ	وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن مکہ یا طائف کے کسی
عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (زخرف ۳)	بڑے آدمی پر کیوں نہیں اُترا،

کسی کتاب کے نازل ہونے کے معنی اُن کے خیال میں یہ تھے، کہ آسمان سے کاغذوں میں

ایک لکھی لکھائی، ترشی ترشائی جلد بندھی ہوئی ایک کتاب سب کے سامنے مجمع میں اتر آئے،

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً (فرقان ۳)	کافروں نے کہا اس پر قرآن یکبارگی کیوں نہیں اترا،
وَلَنْ نُؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَقْرَؤُهُ (بنی اسرائیل ۱۰۰)	اور (کافروں نے کہا) ہم تیرے آسمان پر چڑھ جانے کے بھی اس وقت تک قائل نہیں ہونگے جب تک ہم پر کوئی ایسی کتاب نہ اتار لا جس کو ہم پڑھیں
وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ، (انعام ۱)	اور اگر کاغذوں میں لکھی ہوئی کوئی کتاب ہم آسمان سے تم پر اتارتے جس کو وہ اپنے ہاتھوں سے چھو بھی سکتے تو کافر یہی کہتے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے

غرض ایک آسمانی مذہب کی کیفیت سے بالکل بے خبر تھے، الوہیت اور صفاتِ الٰہی کے اسرار، نبوت کے خصائص، نزولِ کتاب کی حقیقت، ہر چیز اُن کیلئے حیرت و استعجاب کا سرمایہ تھی،

أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ أَمْ جَاءَهُمْ مَا لَمْ يَأْتِ آبَاءَهُمُ الْأَوَّلِينَ أَمْ لَمْ يَعْرِفُوا رَسُولَهُمْ فَهُمْ لَهُ مُنْكِرُونَ (مومنون ۴)	کیا انھوں نے بات پر غور نہیں کیا، یا اُن کے پاس وہ تعلیم آئی ہے، جو اُن کے اسلاف کے پاس نہیں آئی، یا انھوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا تو اس کے منکر ہیں،

اس بنا پر عرب کے مشرکین، اور کفار کو ایک مدت تک صدائے نبوت سے گوش آشنا ہونے کی حاجت تھی، اور اس میں کئی برس صرف ہو گئے، لیکن وہ لوگ جو اس صدا سے نامانوس نہ تھے

ان تک آواز پہنچنے کی دیر تھی کہ وہ سرتاپا لبیک تھے، حصۂ اول میں گذر چکا ہے کہ سابقین اسلام عموماً وہی لوگ تھے، جو اہل کتاب یا حنفا کے آغوش پروردہ تھے، اشخاص کے علاوہ قبائل کا بھی یہی حال تھا، مشرکین کلام الٰہی کا جواب خندۂ تحقیر سے دیتے تھے، اور رموز نبوت کے دانا چشم پرنم اور دل پرکیف سے

إِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ
إِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ يَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ
سُجَّدًا وَيَقُولُونَ سُبْحَانَ رَبِّنَا إِنْ
كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا وَيَخِرُّونَ
لِلْأَذْقَانِ يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا
(بنی اسرائیل - ١٢)

جن کو اس سے پہلے علم دیا گیا ہی (یہود و نصاریٰ)
جب اُن کو قرآن کی آیتیں سنائی جاتی ہیں تو
منھ کے بل وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں
کہ پاک ہی، ہمارا پروردگار، ہم سے (ایک پیغمبر زمان
کے بھیجنے کا) جو وعدہ کیا تھا، وہ ضرور پورا ہوا، روکر
وہ منھ کے بل گر پڑتے ہیں، اور یہ اُن کے خشوع کو

وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَوَدَّةً لِلَّذِينَ
آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ذَٰلِكَ
بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَ
أَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ، وَإِذَا سَمِعُوا
مَا أُنْزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ
تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ
الْحَقِّ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا
مَعَ الشَّاهِدِينَ ؛ (مائدہ - ١١)

اُن میں سب سے زیادہ مسلمانوں کیساتھ محبت
رکھنے والے وہ ہیں، جو اپنے کو نصاریٰ کہتے
ہیں، سبب یہ ہی کہ اُن میں قسیس اور راہب ہیں
اور وہ تکبر نہیں کرتے، اور جب وہ کلام سنتے
ہیں جو پیغمبر پر اترا ہے، تو اُن کی آنکھوں کو
تو دیکھے گا، کہ حق کو پہچان کر آنسو بہاتی ہیں،
اور کہتے ہیں کہ خدایا ہم ایمان لائے، ہم کو بھی
شہادت دینے والوں میں لکھ لے،

مدینہ کے یہود جو اسلام سے سیاسی اور دینی کینہ اور تعصب رکھتے تھے، اور اس بنا پر اسلام کے مقابلہ مین زبان سے اپنی کور باطنی کا اظہار وہ اپنا فرض سمجھتے تھے، وہ بھی چشمِ دل کو بنیش حق سے باز نہیں رکھ سکتے تھے،

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ

(بقرہ - ۱۷)

جن کو ہم کتاب دیچکے ہیں، وہ اس پیغیبر کو اسی طرح پہچانتے ہین جس طرح وہ اپنے بیٹون کو پہچانتے ہیں، اُن مین سے کچھ لوگ جان کر حق پوشی کرتے ہیں،

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ،

(بقرہ - ۱۱)

اور جب خدا کے پاس سے پیغیبر وہ کتاب لیکر آیا جو خود اُن کی آسمانی کتابون کو سچ کررہی ہے، تو باوجود اس کے کہ وہ کافرون کو اس سے پہلے اسی کے نام سے دباتے تھے، اب حق پہچان کہ اس کا انکار کرتے ہیں،

قرآن مجید کی شہادتون سے قطع نظر کرکے، اگر واقعات پر غور کیا جائے تب بھی یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی، مجرد دعوتِ حق سننے کے ساتھ جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام کو لبیک کہا، اُن کے حالات پیش نظر کرلینے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے لئے صرف اثر پذیر دل، اور ذوق آشنا نگاہ کا جویان تھا، حضرت سعید بن زیدؓ، عثمان بن مظعونؓ، صہیب رومیؓ، ابوذر غفاریؓ، سلمان فارسیؓ وغیرہ جو سابقین اسلام ہیں، اسی قسم کے لوگ تھے

بوجہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل وغیرہ قریش کے مشرکین خدا کا کلام تیرہ برس تک متصل سنتے رہے، لیکن اُن کے دل کی سنگینی مین کوئی فرق نہ آیا، ورقہ مکہ کا قریشی عیسائی، صرف ایک بار قرآن سنتاہے، اور ناموس اکبر کی آواز پہچان لیتاہے، مکہ کے مشرک ترپن ۵۳ برس تک آپکے چہرہ کو دیکھتے رہے لیکن نور الٰہی کو نہ پہچان سکے، اور عبد اللہ بن سلام یہودی عالم نے صرف ایک دفعہ جمالِ پُرانوار کو دیکھا، اور پکار اُٹھے کہ یہ حق کی تجلی ہے، رؤسائے قریش ہر روز اپنی آنکھوں سے نزولِ وحی کا تماشا دیکھتے ہین، اور جنبش نہین کرتے، اور نجاشی حکومت کی مسند پر اور ہرقل شہنشاہی کے تخت پر بیٹھکر غائبانہ کلام اللہ کی چند آیتیں سنتے ہیں، اور تڑپ جاتے ہین، قریش کے گھر یہ دولت خود اُترتی ہے، اور وہ اس کو ٹھکرا دیتے ہین لیکن مدینہ سے بنی اسرائیل کے پڑوسی جو اُن کی زبان سے آخری نبوت کی بشارت سن چکے تھے، اتفاقاً مکہ آتے ہین، او اس دولت ابدی کو اپنے گھر اٹھا لیجاتے ہیں، طائف کے سنگدل جاہل نبیؐ پر پتھر برساتے ہین اور اُسکی ہنسی اُڑاتے ہین، اور نجران کے عیسائی عالم مناظرہ کی غرض سے مدینہ آتے ہین لیکن چہرۂ پیغمبری کی معصومیت دیکھکر دہل جاتے ہیں، اور صلح کا ہدیہ پیش کرتے ہیں،

قریش اور حجاز کے ناز نبوت کے نامحرم دعوتِ حق کا جواب اکیس برس تک تیغ وسنان سے دیتے ہین لیکن یثرب، ہجر، یمن، عمان اور بحرین کے بڑے بڑے اور عظیم الشان قبائل جو یہود، نصاریٰ، اور مجوسیون کے اثر سے ان رموز سے کسی قدر آگاہ ہو چکے تھے، وہ آوازِ حق پہنچنے کے ساتھ دفعۃً مسلمان ہوگئے،

آبائی دین و رسوم کی پابندی

ہر نئی تحریک کو غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس کے قبول کرنے مین جو

چیز سب سے پہلے عائق ہوتی ہے، وہ قومی رسم ورواج اور آبائی دین و مذہب کی پابندی ہی انسانیت
کے پاؤن مین اس سے بھاری کوئی زنجیر نہین، دوست آشنا کا چھوٹنا، ماں باپ سے علیحدگی،
آل و اولاد سے کنارہ کشی، مال و جائداد سے دست برداری، جماعت کی مخالفت، قوم سے انقطاع
وطن سے دوری، ایسی چیزین نہین ہیں جن کو ہر انسان آسانی سے برداشت کر سکے، ملکی رسم و
رواج کی دیرینہ محبت، اور آبائی کیش وآئین کی موروثی الفت، حق و باطل کی تمیز، اور نیک و بد
کی پہچان کی حس مٹا دیتی ہے، عام دنیا کی فطری حالت کے علاوہ عرب کی قوم قدامت پسندی
اور قدیم حالت پر بقا اور استحکام مین خاص شہرت رکھتی ہے، دنیا کہان سے کہان بدلتی چلی گئی،
پرانی سامی نسل کی بدویانہ خصوصیتیں جو توراۃ مین پڑھتے ہین، وہ تمام سامی قومون سے مٹ گئین،
مگر عرب مین اس وقت بھی نمایان تھین، اور آج بھی نظر کے سامنے ہیں، دین ابراہیم کے چند اصول
حج، ختنہ اور قربانی وغیرہ ہزارون برس کے بعد بھی عرب مین مٹ مٹا کر باقی رہ گئے تھے، اور
اُن سے نہیں چھوٹتے تھے، اُن کے شعر وشاعری اور فخر ومباہات کا سب سے پرجوش مضمون آبا واجداد
اور نام ونسب پر فخر وغرور تھا، جس کو چھوڑنا اُن کے نزدیک اپنی پرانی عزت وعظمت کی دنیا
کو خود گرا دینا تھا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ مین دین حق کی منادی شروع کی، تو اس کی شدید
مخالفت جس بنا پر سب سے زیادہ کی گئی، وہ یہی دین آبائی کے ترک کا مسئلہ تھا، اور یہی دین جدید
کے ابطال کی سب سے مستحکم دلیل اُن کے پاس تھی، چنانچہ قرآن مجید نے بار بار اُن کے اس قول کو دہرایا
ہے اور اسکی لغویت ظاہر کیا ہے،

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا
اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا
وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ،

(بقرہ ع ـ ٢١)

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ
وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ وَكَذٰلِكَ
مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ
نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَا
اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ
مُّقْتَدُوْنَ ٥ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى
مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ قَالُوْٓا
اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ٥

(زخرف ـ ٢)

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا
عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا قُلْ
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اَتَقُوْلُوْنَ

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اُتارا ہے
اُس کی پیروی کرو، کہتے ہیں، (نہیں) بلکہ ہم
اُسکی پیروی کریں گے جس پر اپنے باپ دادون
کو ہم نے پایا، کیا اگرچہ اُن کے باپ دادا نہ کچھ
سمجھتے ہوں اور نہ راہِ راست پر ہوں (تب بھی)
بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگون کو ایک
روش پر پایا ہے اور ہم اِن ہی کے نقشِ قدم پر چلکر
رہنمائی پائیں گے اور اسی طرح ہم نے اے پیغمبر تم
سے پہلے کسی آبادی میں کوئی پیغمبر نہیں بھیجا لیکن
لیکن اُس کے دولتمندون نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے
بزرگون کو ایک روش پر پایا ہے اور ہم انہی کے
نقشِ قدم کے پیرو ہیں، انکو اے پیغمبر کہا اگرچہ
میں اس روش سے جس پر تم نے اپنے بزرگون کو پایا
زیادہ سیدھا راستہ لیکر تمہارے پاس کیون نہ آؤن
اور جب وہ کوئی بے شرمی کی بات کرتے ہیں
تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگون کو اسی پر پایا
اللہ نے ہم کو اسی کا حکم دیا ہے، کہدو اے پیغمبر کہ

[illegible]

عَلَى اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝	اللہ تو بے شرمی کی بات کا کبھی حکم نہیں دیتا کیا
(اعراف ـ ۳)	تم اللہ پر وہ تہمت باندھتے ہو جو تم نہیں جانتے
وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا اِلٰی مَآ اَنْزَلَ	اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے
اللّٰہُ وَاِلَی الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا	اُس کے پاس اور رسول کے پاس آؤ تو کہتے ہیں ہم
وَجَدْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ کَانَ	نے اپنے باپ دادوں کو جس پر پایا ہے وہی ہم کو کافی
اٰبَآؤُھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّلَا	ہے کیا اُن کے باپ دادا کچھ نہ جانتے ہوں اور
یَھْتَدُوْنَ (مائدہ ـ ۱۴)	نہ سیدھے راستہ پر ہوں (تب بھی وہ اُن ہی کی پیروی
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی	کچھ لوگ ایسے ہیں جو علم و ہدایت اور روشن
اللّٰہِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّلَا ھُدًی وَّلَا کِتٰبٍ	کتاب کے بغیر اللہ کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں اور
مُّنِیْرٍ ۝ وَاِذَا قِیْلَ لَھُمُ اتَّبِعُوْا مَآ	جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اسکی
اَنْزَلَ اللّٰہُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا	پیروی کرو تو کہتے ہیں، بلکہ ہم اسی کی پیروی کریں گے
عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ کَانَ الشَّیْطٰنُ	جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا، کیا اگرچہ
یَدْعُوْھُمْ اِلٰی عَذَابِ السَّعِیْرِ	اُن کو شیطان دوزخ کے عذاب ہی کی طرف
(لقمان ـ ۳)	کیوں نہ پکارے (تو وہ اسی کی پیروی کریں گے)

کفار کے یہ سوال و جواب خود ظاہر کرتے ہیں کہ اُن کو اپنے آبائی رسوم کا چھوڑنا کس درجہ محال نظر آتا تھا، آپ نے بعثت کے تین برس بعد جب بُت پرستی کی علانیہ مذمت شروع کی، تو قریش کی عدالت میں آپ پر سب سے بڑا جرم یہی قائم کیا گیا کہ یہ خاندانی دیوتاؤں کی تحقیر اور بزرگوں کی توہین

اور آبائی رسم ورواج کی مذمت کرتے ہیں، مکہ مین جب آپ نے علی الاعلان لوگون کو اسلام کی دعوت دی اور بہت سے نیک لوگون نے اس دعوت پر لبیک کہا، تو قریش کے بڑے بڑے رئیسون نے ابوطالب کے پاس جاکر آپکے خلاف جو الزامات قائم کئے، وہ یہ تھے "اے ابوطالب! تمھارا بھتیجا ہمارے دیوتاؤن کو بُرا کہتا ہے، ہمارے مذہب کی توہین کرتا ہے، ہم کو بے وقوف اور نادان کہتا ہے، اور ہمارے باپ دادون کو گمراہ بتاتا ہے، تو یا تو تم اُس کو روکو، یا ہم کو اور اس کو چھوڑدو کہ باہم سمجھ لین"،

یہ اُن کی عدالت کا پہلا مطالبہ تھا، ابوطالب نے ان کو سمجھا بجھا کر واپس کیا، تو کچھ دنون کے بعد انھون نے پھر اپنا مطالبہ ان الفاظ مین پیش کیا، "اے ابوطالب! تم نے اپنے بھتیجے کو اب تک منع نہین کیا، اب خدا کی قسم ہم اپنے بزرگون کی برائی، اپنی نادانی، اور اپنے دیوتاؤن کی ہجو نہین سن سکتے، تو یا تو اُس کو باز رکھو، اور یا ہم سے لڑنے پر آمادہ ہوجاؤ" اس اعلانِ جنگ سے کام نہ چلا، تو وہ تیسری دفعہ ابوطالب کے پاس جاتے ہیں، اور کہتے ہیں "اے ابوطالب! ولید کا بیٹا عمارہ کیسا خوشرو نوجوان ہے تم اس کو متبنیٰ بنالو، اور اپنے بھتیجے کو قتل کے لئے ہماری حوالہ کردو کہ اُس نے تمھارے اور تمھارے بزرگون کے دین و مذہب کی مخالفت کی ہے، تمھاری قوم کی جماعت کو پراگندہ کر دیا ہے، اور اُن کو بیوقوف اور نادان کہتا ہے" سب سے آخری دفعہ قریش کے رئیسون نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر گفتگو کی اور کہا کہ "اے محمدؐ! تمھارے سوا کسی قوم مین ایسا آدمی نہین ملا جو اپنی قوم پر مصیبت لایا ہو، جو تم لائے ہو، تم نے باپ دادون کو بُرا کہا، ہمارے مذہب کی تحقیر کی، دیوتاؤن کو گالی دی، ہم کو بے وقوف اور نادان بنایا، اور جماعت میں تفرقہ ڈالا، غرض

کوئی بُرائی نہ تھی، جو تم نے ہمارے ساتھ نہین کی[1]۔

ان الزامات کی فہرست کی ایک ایک دفعہ پڑھو، معلوم ہوگا کہ آبائی دین، موروثی رسم و رواج اور خاندانی دیوتاؤن کی غلامی سے آزاد ہونا، ان پر کتنا بار تھا، اور وہ اس جرم کو کتنا سنگین سمجھتے تھے، موسم حج مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگون کے پاس جا جا کر توحید کا پیغام سُناتے تھے تو ابو لہب آپ کے اثر کو باطل کرنے کے لئے آپ کی تقریر کے بعد آپکے پیچھے پیچھے صرف یہ کہتا جاتا تھا لوگو! یہ وہی ہے، جو تم کو تمھارے باپ دادون کے مذہب سے برگشتہ کرتا پھرتا ہے[2]،،

ابو طالب جنھون نے ہر موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کی تھی، اور وہ آپ کو اپنے جان و دل سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، وہ بھی آپ کی دعوتِ حق کو اپنے دینِ آبائی کے مقابلہ مین پذیرائی کے قابل نہ سمجھے، بھتیجے نے بار بار کہا "چچا جان! کلمۂ شہادت ایک دفعہ پڑھ لیجئے کہ قیامت مین آپ کی شفاعت کی ایک سند مجھے ہاتھ آجائے"، ابو طالب نے جواب دیا جانِ پدر! سب کچھ تم پر نثار، لیکن بزرگون کے مذہب کو نہین چھوڑ سکتا" عین اس وقت جب ابو طالب دنیا سے رخصت ہورہے تھے، اور نزع کی حالت تھی آپ اُن کے پاس تشریف لے گئے، اور فرمایا کہ "چچا جان! اب تو لا الہ الا اللہ کہدیجئے کہ مین خدا کے ہان آپکے ایمان کی شہادت دون" ابو جہل اور عبد اللہ بن امیہ نے جو اُن کے پاس بیٹھے تھے کہا "ابو طالب کیا تم (اپنے باپ) عبد المطلب کے دین سے پھر جاؤگے" آپ بار بار لا الہ الا اللہ پڑھنے کی درخواست کرتے تھے، اور یہ دونون اُن کو وہی عبد المطلب کے دین سے علحدگی پر شرم دلاتے تھے، بالآخر ابو طالب نے یہی کہا کہ "مین عبد المطلب کے دین پر مرتا ہون"

[1] یہ تمام واقعات ابن اسحق اور سیرۃ کی تمام کتابون مین بتفصیل مذکور ہین [2] مستدرک حاکم جلد ا صفحہ ۱۵ کتاب الایمان

اور لا الٰہ الا اللہ نہین کہا۔ صحیح بخاری کی روایت ہے[1]۔ صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے کہ ابوطالب نے کہا کہ بھتیجے! جو فقرہ تم کہتے ہو مین کہکر تمھاری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا لیکن قریش کہین گے کہ ابوطالب موت سے ڈر گیا[2]۔ ابن اسحاق میں ہے کہ انھون نے آہستہ آہستہ وہ فقرہ کہدیا[3]۔ بہرحال اس واقعہ سے جو دکھانا ہے وہ یہ ہے کہ اس حالت مین بھی مخالفین کے پاس اسلام سے باز رکھنے کے لئے اس سے زیادہ پرزور اور پُراثر دلیل نہ تھی کہ "ابوطالب کیا آبائی مذہب کو چھوڑ دوگے"؟ اس سے معلوم ہوگا کہ اسلام کی اشاعت کے راستہ مین یہ تخیل کتنا بڑا پتھر تھا،

توہم پرستی

عرب کی اصلاح و ہدایت کی راہ مین ایک اور عائق عرب کی توہم پرستی تھی، ہر قوم مین جاہلون کا جس طرح یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ فلان دیوتا یا فلان پیر کے خلاف اگر کچھ زبان سے نکلا تو فوراً بلائین آکر ہم کو لپٹ جائین گی، عرب مین گھر گھر سیکڑون بت اور بیسیون صنم خانے تھے، دنیا کے تمام کام انہی اصنام اور بتون سے متعلق سمجھے جاتے تھے، مدتون سے یہ خیال راسخ چلا آتا تھا کہ فلان بت کی پرستش یا خدمت گذاری میں اگر کوتاہی کی گئی تو آسمان سے پانی برسنا بند ہو جائے گا، فرزند نرینہ پیدا نہ ہوگا، باغون مین پھل نہ آئین گے، اسی بنا پر اسلام کے نام سے ان کو لرزہ آتا تھا، اور یہ تخیل صرف اسی وقت پیدا نہین ہوا تھا، بلکہ ایک مدت سے عرب مین چلا آتا تھا، حضرت ہودؑ کی دعوت کے جواب مین ثمود نے کہا،

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ — ہم تو اس کے سوا کچھ اور نہ کہین گے کہ ہمارے

---

[1] کتاب الجنائز باب اذا قال المشرک عند الموت لا الٰہ الا اللہ [2] صحیح مسلم کتاب الایمان، باب ۹۔ [3] ابن ہشام، وفات ابی طالب؛

اِعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ[1] (هود ۵) کسی دیوتا نے تم کو آ کے ستایا ہے،

ابتدا ًجب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتون کے خلاف وعظ کہنا شروع کیا تو اکثر لوگون نے (نعوذ باللہ) پاگل سمجھ لیا[2] جاہلیت کے زمانہ کے بعض کافر احباب ہمدردی کی راہ سے جھاڑ پھونک کرنے آئے[3] ضمام بن ثعلبہؓ ایک صحابی تھے، وہ مسلمان ہو کر اپنے قبیلہ مین جب واپس گئے، اور لات وعزیٰ کی مذمت شروع کی، تو تمام قبیلہ خوف سے کانپ گیا کہ "ضمام! اُن کو برا نہ کہو دیکھو کہین تم کو برص، جنون یا جذام نہ ہو جائے"[4] حضرت زنیرہؓ مسلمان ہونے کے بعد بصارت سے محروم ہو گئی تھین، کفار نے کہنا شروع کیا کہ "لات وعزیٰ نے اُن کو اندھا کر دیا ہے"[5] حضرت طفیل بن عمرو دوسیؓ مسلمان ہو کر جب اپنے وطن تشریف لے گئے، اور اپنی بیوی کو اسلام کی دعوت دی، تو انھون نے کہا "دیکھو ذوالشریٰ (بت) کہین برباد نہ کر دے"[6]

فتح مکہ کے بعد جب کہ دیوتاؤن کے زور و قوت کا راز افشا ہو چکا تھا، اور اکثر قبائل نے اسلام قبول کر لیا تھا تاہم لات، عزیٰ، مناۃ، ذی الکفین، سواع کے تبخانون کو وہ اپنے ہاتھ سے نہ توڑ سکے، خاص مدینہ سے راسخ الایمان مسلمان بھیجے گئے جنھون نے اس فرض کو انجام دیا، پوجاریون نے کوئی مزاحمت نہ کی، وہ سمجھتے تھے کہ ان دیوتاؤن کو کون توڑ سکتا ہے، جو اس گستاخی کا ارادہ کرے گا وہ خود تباہ و برباد ہو جائے گا[7]

---

[1] ابن کثیر و زمخشری، ابن حبان، بغوی وغیرہ تمام مفسرین نے لکھا ہے، [2] دیکھو تفسیر آیۃ بنعمۃ ربک بمجنون ونیز مابصاحبھم من جنۃ، [3] صحیح مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبہ [4] مسند دارمی کتاب الصلوٰۃ [5] اسد الغابہ ترجمہ حضرت زنیرہؓ وسیرۃ ابن ہشام ذکر مستضعفین مسلمین [6] اسد الغابہ ذکر طفیل بن عمرو دوسیؓ [7] ابن سعد طبری ذکر ہدم اصنام

توہم پرستوں میں کسی مذہب کی صحت و بطلان کی دلیل شواہد عقلی نہیں، بلکہ دنیا کے ظاہری مادی فوائد، اور جانی و مالی خیر و برکت ہوتی ہے، لیکن قوانین گاہِ عالم میں ایک مذہب پرست بھی اسی طرح آلام و مصائب میں گرفتار ہو سکتا ہے جس طرح ایک غیر مسلمان، عرب کے بدو اور اعراب ابتداءً مسلمان ہونے کی ہمت بھی کرتے تھے، تو معاً یہ توقع بھی کر لیتے تھے کہ اب وہ ہر قسم کے آفاتِ ارضی و سماوی سے محفوظ ہیں، اس بنا پر اگر کبھی اُن کی اس توقع کو صدمہ پہنچتا، تو دفعتہً وہ متزلزل ہو جاتے تھے، صحیح بخاری کتاب التفسیر میں ہے[۱]

کان الرجل یقدم المدینۃ فان	باہر کا جو شخص مسلمان ہو کر مدینہ آتا تھا اس
ولدت امرأتہ غلاماً ونتجت	کی یہ حالت تھی کہ اگر اس کی بیوی لڑکا جنتی
خیلہ قال ھذا دین صالح و	اور اُس کی گھوڑی بچہ دیتی تو وہ کہتا کہ یہ
ان لم تلد امرأتہ ولم تنتج خیلہ	نہایت عمدہ مذہب ہے لیکن اگر ایسا
قال ھذا دین سوء،	نہ ہوتا، تو وہ کہتا کہ یہ نہایت بُرا مذہب ہے۔

قرآن مجید کی یہ آیت اسی قسم کے لوگوں کی شان میں نازل ہوئی ہے[۲]

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ	اور بعض لوگ وہ ہیں جو خدا کی بندگی کنارہ پر
عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ن	ہو کر کرتے ہیں (یعنی دل سے نہیں کرتے) اگر انکو
اطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ	فائدہ پہنچا تو اُن کو اطمینان ہو جاتا ہے لیکن اگر
فِتْنَةُ نِ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ (حج ۲)	مبتلائے مصیبت ہوئے تو فوراً و برگشتہ ہو جاتے ہیں

[۱] تفسیر سورۂ حج جلد ثانی ص ۲ ۰ ۹ ۔ [۲] صحیح بخاری تفسیر سورہ حج ۔

ہجرت کے بعد جب مسلمان مدینہ آئے اور اتفاق سے ایک عرصہ تک کسی مسلمان گھرانے
میں کوئی لڑکا نہ پیدا ہوا تو دشمن اس واقعہ کو اپنی بد دعاؤں کا نتیجہ سمجھتے تھے اور خوش ہوتے تھے،
آخر چھ مہینے کے بعد عبداللہ بن زبیرؓ پیدا ہوئے، تو مسلمان بے انتہا مسرور ہوئے[1] سوء اتفاق یہ کہ
اول اول جو لوگ مدینہ میں آتے تھے، ان کو وہاں کی آب و ہوا راس نہیں آتی تھی، ابتداے ہجرت
میں جب حضرت ابو بکرؓ و حضرت بلالؓ آئے، تو سخت بیمار ہو گئے[2] حضرت طفیل بن عمرو دوسیؓ نے
جب مدینہ کو ہجرت کی تو اُن کو بھی مدینہ کی آب و ہوا ناموافق ہوئی[3] اگرچہ مخلصین اور ارباب فہم
پر اس قسم کی عارضی ناگواریوں کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا تاہم عام لوگ جن کی وہم پرستی فطرت
ثانیہ ہو گئی تھی، وہ اس قسم کے اتفاقی واقعات سے بید متاثر ہوتے تھے، چنانچہ جب عکل و عرینہ
کے چند لوگوں نے مدینہ میں آکر اسلام قبول کیا، اور آب و ہوا کی ناموافقت کے سبب سے بیمار ہو گئے، آ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تبدیل آب و ہوا کی غرض سے ان کو اونٹوں کی چراگاہ میں بھیج دیا وہ گو
وہ صحیح ہو گئے، تاہم مرتد ہو گئے[4] اسی طرح ایک بدو نے آکر آپ کے دست مبارک پر بیعت کی لیکن
سوء اتفاق سے دوسرے دن بخار میں مبتلا ہوا، تو اپنی بیعت توڑنی چاہی، آپ نے تین بار منع فرمایا لیکن
اس کے اصرار سے آخر بیعت فسخ کر دی، اور فرمایا[5]

المدینة کالکیر تنفی خبثھا د — مدینہ آگ کی بھٹی ہے جو میل کو الگ کر دیتا ہے

---

[1] مستدرک حاکم جلد ۳ و اصابہ ذکر عبداللہ بن زبیرؓ [2] صحیح بخاری کتاب المرضی و باب مقدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم
المدینة [3] صحیح مسلم کتاب الایمان [4] صحیح بخاری کتاب المحاربین [5] بخاری جلد ا ص ۲۵۲، کتاب الحج
فضائل مدینة، و باب عقمام السنة،

تنصع طیبہا، اور حقیقی جوہر کو خالص کر دیتا ہے،

ان ہی اسباب کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے متعلق یہ دعا فرمائی؛

اللّٰھم حبب الینا المدینۃ کحبنا	خداوندا مکہ کی طرح یا اس سے زیادہ ہمارے
مکۃ او اشد، اللّٰھم وصححھا	لئے مدینہ کو محبوب بنا دے، اس کو امراض سے
وبارک لنا فی مدھا وصاعھا	صحیح کر دے، اس کے پیمانے میں برکت دے
وانقل حماھا فاجعلھا بالجحفۃ[1]	اور اس کے بخار کو جحفہ میں منتقل کر دے،

قبائل کی خانہ جنگیاں اسلام کی اشاعت کا ایک بڑا مانع عرب کی باہمی خانہ جنگیاں تھیں جو عرب کے خصائص قومی کا عنصر اعظم بن گئی تھیں، یہ خانہ جنگیاں ہزاروں برس سے چلی آتی تھیں اور اُن کی وجہ سے قبائل میں ایسے مستمر اور ثابت الاساس انتقامی جذبات پیدا ہو گئے تھے، جن کا مٹنا قریبًا محال تھا، ان ہی لڑائیوں نے ثار (انتقام خون) کی رسم پیدا کر دی تھی جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، یہ رسم ایسی سخت اور شدید الاثر تھی کہ ایک شخص کے خون کے لئے قبیلہ کا قبیلہ مٹ جاتا تھا، ہزاروں برس کے خون قومی قرض کی طرح باقی چلے آتے تھے جو درج رجسٹر ہوتے چلے تھے، اور بچہ بچہ کی زبان پر ہوتے تھے، جو بچہ پیدا ہوتا تھا، وہ ہوش سنبھالنے کے وقت سے پہلے ثار کا لفظ سنتا تھا یعنی خاندان میں فلاں شخص قتل کیا گیا ہے اور اس کے خون کا انتقام اب تک باقی ہے، اس لئے بچہ بچہ کا نصب العین ابتدائے زندگی سے یہی ثار ہوتا تھا،

اس بنا پر ایک شخص یا ایک خاندان جس خلوص اور عقیدتمندی کے ساتھ اسلام کی طرف

---

[1] صحیح بخاری باب مقدم النبی صلعم المدینۃ،

جھکتا تھا، مگر اسی زور اور قوت کے ساتھ دوسرا فریق اسلام کی مخالفت اور اس سے سرکشی پر آمادہ ہوجاتا تھا، مکہ میں اسلام کی مخالفت کا صرف یہی راز تھا کہ خدا نے نبوت کے لئے ہاشم کا گھرانہ چن لیا تھا، بنو امیہ کی مخالفت اس کے لئے لامحالہ ہونی تھی،

مدینہ میں اوس و خزرج دو قبیلے تھے، اسلام سے پہلے دونوں لڑلڑ کر تھک گئے تھے اسلام کی آواز آئی تو گو دونوں نے ایک ساتھ لبیک کہا، تاہم قبیلۂ اوس کا ایک ایک فرد اگر ہمہ تن اخلاص و جوش تھا، تو خزرج میں بیسیوں منافق تھے، انتہا یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں ہجرت سے پہلے دونوں قبیلوں کی نماز کی امامت کے لئے باہر سے ایک تیسرے قبیلہ کا آدمی بلوایا گیا تھا کہ خدا کے سامنے بھی ایک کو دوسرے کے پیچھے کھڑے ہونے سے عار تھا[۱]

خزاعہ اور بنو بکر باہم شدید دشمن تھے، اور ان میں باہم پرانی عداوت چلی آتی تھی، مدینہ آنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو صلح کا پیام اور اسلام کی دعوت دی خزاعہ نے اسلام کی دعوت قبول کی، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بنو بکر قریش کے حلیف بن گئے،

خوب غور کرو، انصار اسلام لاکر ہمہ تن نیکوکاری اور پاکیزہ نفسی کے پیکر بن گئے، لیکن ان کے جذبات کس طرح آسانی سے دفعۃً مشتعل ہوجاتے تھے، ایک موقع پر ایک یہودی نے جنگ بعاث کا تذکرہ چھیڑ دیا، تو انصار کے دونوں قبیلوں (اوس و خزرج) کی تلواریں میان سے نکل آئیں، اور بڑی مشکل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جوش کو فرو کیا،

---

[۱] ابن ہشام ذکر بیعت عقبہ [۲] اصابہ جلد ۱، مطبوعہ مصر، ص ۵۰ معجم صغیر طبرانی میں بھی ایک اور اسی قسم کا واقعہ مذکور ہے، معجم عبد اللہ،

حضرت عائشہؓ کے واقعۂ افک میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر کھڑے ہو کر اس کی شکایت کی، اور حضرت سعد بن معاذؓ نے کہا یا رسول اللہ! اگر وہ (تہمت لگانیوالا) ہمارے قبیلہ کا ہے تو میں اسکی گردن اڑا دیتا ہوں اور اگر ہمارے بھائی خزرج کے قبیلہ سے ہے تو آپ حکم دیں میں بجالاؤں گا"، اس پر سعدؓ بن عبادہ جو قبیلۂ خزرج کے رئیس تھے، دفعۃً کھڑے ہو گئے اور کہا

کذبت لعمر اللہ لاتقتلہ ولا	خدا کی قسم تو جھوٹ کہتا ہے تو اس کو قتل
تقدر علی قتلہ ولو کان من	نہ کریگا، نہ کرسکتا ہے اور وہ شخص اگر تیرے
رھطک ما احببت ان یقتل[1]	قبیلہ کا ہوتا تو تو اس کو قتل کیا جانا

اس پر اوس اور خزرج دونوں قبیلوں کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے، یہاں تک کہ قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے، چنانچہ صحیح بخاری حدیث افک میں ہے،

فثار الحیان الاوس والخزرج	پس دونوں قبیلے اوس و خزرج مشتعل
حتی ھموا ان یقتتلو ورسول	ہوگئے، یہاں تک کہ دونوں کشت و خون
اللہ قائم علی المنبر،	پر آمادہ ہوگئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منبر

ایک بار محلم بن جثامہ لیثی نے عہد اسلام میں قبیلۂ اشجع کے ایک شخص کو قتل کر ڈالا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مقدمہ پیش ہوا، قبائل کے تعلقات کی بناء پر عیینہ نے مقتول اور اقرع ابن حابس نے قاتل کی طرف سے وکالت کی، بات بڑھی، اور سخت شور و شغب ہوا تو آپ نے عیینہ سے فرمایا، "دیت کیوں نہیں قبول کرلیتے"، اس نے کہا خدا کی قسم اس وقت تک دیت نہ

---

[1] صحیح بخاری کتاب المغازی باب حدیث الافک۔

قبول کروں گا جب تک اس کی بیویوں کو اس قدر نہ ستاؤں جس قدر اس نے ہماری بیویوں کو ستایا ہے
اس پر اور شور و غل ہوا آپنے پھر یہی الفاظ فرمائے، اور عیینہ نے وہی پہلا جواب دیا چونکہ یہ اسلام
کا ابتدائی زمانہ تھا، اور قتل کا یہ پہلا مقدمہ تھا، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا
تھا اس لئے قبیلۂ بنو لیث کے ایک شخص نے جو مسلح کھڑا تھا، کہا کہ ابتداے اسلام میں اس واقعہ
کی مثال بکری کے اُس ریوڑ کی سی ہے کہ اس کے پہلے حصہ کو تیر مارا گیا، تو دوسرا بدک کر بھاگ
گیا یعنی اگر قاتل کے موافق فیصلہ کیا گیا تو لوگ سمجھیں گے کہ اسلام قصاص کو دیت سے بدل دینا چاہتا
ہے اور چونکہ دلوں میں اب تک انتقام کے جذبات تازہ ہیں، اور لوگ دیت لینا پسند نہیں کرتے
اس لئے اُن کو اسلام کے قبول کرنے میں تامل ہو گا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ سفر میں تھے
اس لئے دیت میں پچاس اونٹ اسی وقت دیئے، اور مدینہ پہنچکر ۵۰ اونٹ کا وعدہ فرمایا[1]،

اہلِ عرب میں یہ جذبہ اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ گو آپنے فتح مکہ میں امنِ عام کی منادی کردی
اور تلوار کے میان میں کر لینے کا حکم دیا، تاہم انتقام کا جوش اب تک تازہ تھا،

قبیلۂ ہذیل کا ایک شخص اسلام لانے کی غرض سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا رہا
تھا، اس نے زمانۂ جاہلیت میں قبیلۂ خزاعہ کا کوئی جرم کیا تھا، اور وہ لوگ انتقام کے لئے اس کو
ڈھونڈ رہے تھے، سوءِ اتفاق سے وہ راہ میں مل گیا، اور اُن لوگوں نے اس کو فوراً قتل
کر دیا کہ اگر بارگاہِ نبوت میں پہنچ گیا، تو پھر اس کا موقع ہاتھ نہ آئے گا، آپ کو اس واقعہ
کی خبر ہوئی تو سخت برہم ہوئے اُن لوگوں نے حضرت عمر، حضرت ابوبکر، حضرت علی رضی اللہ عنہم سے

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۵۵ کتاب الدیات،

سفارش کی درخواست کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بعد ایک خطبہ دیا جس کے الفاظ یہ تھے:

"خدا نے مکہ کو دار الحرام بنایا ہے آدمیوں نے نہیں بنایا ہے، خدا نے کل چند گھنٹوں کے لئے اس کو میرے لئے حلال کر دیا تھا لیکن آج اس کی قدیم حرمت دوبارہ لوٹ آئی ہے اور خدا کے سب سے نافرمان بندے تین آدمی ہیں، ایک وہ جس نے حدود حرم میں کسی کو قتل کیا، دوسرا وہ جس نے اپنے قاتل کے سوا کسی دوسرے شخص کو مار ڈالا، تیسرا وہ جس نے زمانۂ جاہلیت کا انتقام لیا، تم نے جس شخص کو قتل کر ڈالا ہے، میں اس کی دیت دوں گا"

چنانچہ آپ نے اس کی دیت ادا فرمائی،[1]

بنو ثعلبہ کے ایک آدمی نے جاہلیت میں اوس وخزرج کے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا، بنو ثعلبہ اسلام لا کر جب مدینہ آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے، ایک انصاری بے اختیار چلا اٹھے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہمارے مجرم ہیں، اُن سے قصاص لوائیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھا کر فرمایا، الا لا یجنی والد علی ولد[2] یعنی لڑکے کے جرم کا بدلہ باپ سے نہیں لیا جائے گا،

ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ثار کا جذبہ کس طرح رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا، اور اس جذبہ کا مشتعل ہو جانا کس قدر آسان ہوتا تھا،

خانہ جنگیوں پر ختم نہیں، یوں بھی تمام قبائل رقیب اور حریف مقابل تھے، دو مختلف قبیلوں کے آدمیوں میں کسی ذاتی معاملہ پر بھی نزاع ہو جاتی تھی، اور اُن میں کوئی اپنے قبیلہ کا نام پکارتا تھا

[1] مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۳۱ [2] دارقطنی جلد ۲ صفحہ ۳۰۰،

تو قومی جنگ کا سامان ہو جاتا تھا، ایک دفعہ ایک مہاجر نے ایک انصاری کو تھپڑ مار دیا، انصاری نے یاللانصار (انصار کی دہائی) پکارا، مہاجر نے بھی یاللمہاجرین کا نعرہ مارا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی آپ نے نکل کر فرمایا کہ "یہ کیا جہالت کی پکار ہے"،

مابال دعوی الجاھلیۃ[1] یہ کیا جہالت کا دعوی ہے

لوگوں کو معلوم تھا کہ اسلام اس فعل شنیع کا سخت دشمن ہے، اس لئے جب تک وہ اپنا انتقام نہ لے لیتے اُن کو اسلام لانے میں تامل ہوتا تھا، عمرو بن اقیش ایک صاحب تھے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اسلام سے متاثر اور اس کے قبول کرنے کیلئے سر طرح آمادہ تھے لیکن ایک مانع تھا، جو اس راہ میں حائل تھا یعنی ثار، وہ جانتے تھے کہ اسلام لاکر اس خاندانی فرض کے ادا کرنے کی اُن کو اجازت نہیں مل سکتی، ابن مندہ نے اُن کے حال میں لکھا ہے،

وکان لہ ثار فی الجاھلیۃ و کرہ ان یسلم حتی یاخذ[2] | اُن کا انتقام زمانہ جاہلیت میں باقی رہ گیا تھا جب تک وہ نہ لے لیں انھوں نے مسلمان ہونا پسند نہ کیا،

اسی طرح حضرت عمرو بن مالک جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اسلام لاکر اپنے قبیلہ میں واپس گئے اور اسلام کی دعوت دی تو قبیلہ والوں نے کہا بنو عقیل پر ہمارا ثار (انتقام) باقی ہے، وہ لے لیں تو اسلام لائیں، چنانچہ انھوں نے اسی وقت بنو عقیل پر جو مسلمان ہو چکے تھے حملہ کیا اور اس فرض سے سبکدوش ہوئے۔[3]

سیاسی مشکلات | جہالت، وحشت، پابندی رسوم، آبائی اثر وغیرہ وغیرہ ان میں سے ایک چیز بھی مانع اصلاح نہ ہوتی تاہم صرف سیاسی اسباب ایسے جمع تھے کہ قریش یا دیگر قبائل عرب کبھی اسلام

---

[1] صحیح بخاری جلد ۱ ص ۴۹۹ ذکر نہی دعوت جاہلیہ [2] اسد الغابہ ص ۵، جلد ۴ [3] اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر عمرو بن مالک

آگے سر نہیں جھکا سکتے تھے، مکہ میں دو خاندان برابر کے رقیب تھے، امیہ اور ہاشم، اور آنحضرت کی بعثت سے پہلے امیہ کا پلہ ترجیح علانیہ گران ہو چکا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نبوت کا اظہار کیا تو سب سے پہلے امیہ کے خاندان نے سرکشی کی، اور فتح مکہ تک یہی خاندان تھا، جو تمام لڑائیوں اور معرکہ آرائیوں کا علمبردار تھا، بنو امیہ کے بعد اور خاندان تھے، اور وہ بھی حرم کے مناصب (دہ گانہ (رفادہ وغیرہ) کے ممتاز حصہ دار تھے، ان میں سے ہر ایک دیکھ رہا تھا کہ اس جدید انقلاب مین ان فوائد اور اقتدار کا بالکل خاتمہ ہے ابوجہل سے جب ایک شخص نے کہا کہ "محمد کی دعوت اسلام کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے" تو اس نے صاف کہا کہ "میں کیا کہوں، محمد کے خاندان نے عزت و شرف مین برتری کا دعویٰ کیا اور ثبوت میں دعوتین کھلائین، اسی کے جواب مین ہم نے اسی شان کی دعوتیں دین، انھون نے خون بہا دیئے، ہم نے بھی دیئے، انھوں نے زرپاشیاں کیں، ہم نے بھی کیں، ہم دونوں دوش بدوش ہو چکے تھے کہ دفعۃً اُن کی طرف سے یہ دعویٰ پیش ہوا کہ ہمارے خاندان میں نبوت اور آسمان سے وحی بھی آگئی، اب ہم کہاں تک برداشت کریں، خدا کی قسم ہم کبھی محمد پر ایمان نہیں لا سکتے"[1] یہی ابوجہل جب انصار کے ہاتھ سے قتل ہوا تو اس نے مرتے وقت حسرت سے کہا کہ کاش مجھکو کاشتکاروں کے سوا کسی اور قوم نے قتل کیا ہوتا،[2]

خوب غور سے دیکھو بدر، اُحد، حمراء الاسد، احزاب وغیرہ تمام لڑائیوں میں یہی امویٰ عنصر تھا، جو کام کر رہا تھا، قریش کے قبیلہ سے باہر جو بڑے بڑے قبیلے تھے مثل غطفان، اسد وغیرہ

---

[1] ابن ہشام حصہ اول ص ۱۰۰ مطبوعہ مصر طبع اول [2] صحیح بخاری واقعہ بدر،

یا اہلِ مکہ ہی کے خاندان کی کوئی شاخ تھی، یا قریش کے حلیف و ہمعہد تھے، خیبر میں یہود تھے جو
قوم کے لحاظ سے قریش سے الگ تھے لیکن عرب تجارتی حیثیت سے تمامتر ان ہی کے زیر بار تھے ان ہی سے
قرض دام لیتے تھے ان ہی کے ہاں مال و متاع رہن رکھتے تھے[1] خیبر اور غطفان ایک مدت دراز سے باہم
حلیف تھے، اس طرح مکہ سے لیکر خیبر اور نجد تک ایک سلسلۂ اتحاد میں مربوط تھا،

کعبہ۔ تمام عرب میں قبلہ گاہِ اعظم تھا، ہر سال تمام ملک حج کرنے کے لئے آتا تھا، اور آستانۂ
کعبہ پہ سر جھکاتا تھا، کعبہ کے مجاور معمولی پنڈ وے نہ تھے، بلکہ خیمۂ و خرگاہ، تیغ و سپر، جاہ و حشم غرض ریاست
و امارت کے تمام سروسامان رکھتے تھے، اس لئے تمام عرب میں ان کی شہنشاہی قائم تھی، یہی
بات ہے کہ جب تک مکہ فتح نہین ہوا، اسلام چین سے نہیں بیٹھ سکا، لیکن اسلام کی مخالفت صرف
قریش کی متابعت تک محدود نہ تھی، بلکہ بڑا سبب یہ تھا کہ اسلام سے خاص قریش کو جو نقصان
پہونچ سکتا تھا، براہِ راست وہی تمام رؤسائے قبائل کو پہنچتا تھا، عرب کا ملکی نظام یہ تھا
کہ تمام ملک میں قبائل پھیلے ہوئے تھے، اور ہر قبیلہ کا ایک رئیس اعظم ہوتا تھا جو تمام قبیلہ پر حکمران
ہوتا تھا، اور مالِ غنیمت سے چوتھ وصول کرتا تھا جس کو مرباع کہتے تھے، اس کے علاوہ غنائم میں
سے جو عورت، یا اور کوئی عمدہ چیز اس کو پسند آتی تھی، اس کو چھانٹ لیتا تھا، اس کا نام صفی تھا
یہ گویا چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں، جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھیں، یہ ریاست خاندانی اصول پر چلتی تھی
باپ کے مرنے کے بعد بیٹا رئیس منتخب ہوتا تھا، قبیلہ کے تمام معاملات، ذاتی نزاعیں، قصاص یا
خون بہا کے فیصلے سب، رئیس کے ہاتھ سے فیصل ہوتے تھے، یہ رؤسا عام قوم سے بہت سے

---

[1] طبری واقعۂ خیبر،

حقوق مین ممتاز ہوتے تھے،

قبائل میں یہی امتیاز مراتب تھا کہ جو قبائل زیادہ شریف مانے جاتے تھے، اُن میں سے ایک آدمی کو اگر کوئی دوسرا قبیلہ قتل کر دیتا تھا، تو اس کا خون دوسرے قبیلہ کے دو خون کے برابر سمجھا جاتا تھا، اور اس لئے ایک کے بدلہ مین دو کو قتل کرتے تھے، یہ امتیاز اور فرق مراتب اس حد تک پہونچ گیا تھا کہ جب غزوۂ بدر مین قریش کی فوج مین سے عتبہ و شیبہ میدان میں آئے، اور مبارز طلب ہوئے، اور انصار اُن کے مقابلہ کو نکلے، تو عتبہ نے اس بنا پر اُن کے مقابلہ سے انکار کر دیا کہ قریش اور انصار کا جوڑ نہیں،

حضرت عمرؓ کے زمانہ مین جبلہ بن الایہم خاندانِ غسّان کا اخیر فرمانروا اسلام لایا، اور مکہ مین آیا، ایک دن طواف مین اس کی چادر کسی شخص کے پاؤن کے نیچے آگئی، جبلہ نے اس کے گال پر تھپڑ کھینچ مارا، اُس نے بھی برابر کا جواب دیا، جبلہ نے حضرت عمرؓ کے پاس جا کر شکایت کی حضرت عمرؓ نے واقعہ سُن کر کہا، اس کا کیا قصور ہے، تم نے جو کیا اس کی جزا پائی، جبلہ نے کہا میرا یہ رتبہ ہے کہ کوئی مجھ پر ہاتھ اٹھاتا، تو قتل کر دیا جاتا، حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہان زمانہ جاہلیت میں یہی قاعدہ تھا، لیکن اسلام نے اس کا خاتمہ کر دیا، جبلہ نے کہا جو مذہب شرفا کو ذلیل کر دیتا ہے، مین اس سے باز آتا ہون، یہ کہکر چوری سے روم چلا گیا، اور عیسائی ہو گیا،

عرب کا ہر رئیس قبیلہ درحقیقت جبلہ تھا، اور اسلام قبول کرنے کے وقت اس کو یہی منظر نظر آتا تھا، اسلام ان تمام واقعات اور خصوصیات کو مٹاتا تھا، اس کے دربار میں شاہ و گدا رئیس و عامی، شریف و حقیر کا ایک درجہ تھا، اس لئے عرب میں تمام رؤسائے قبائل کو صاف

نظر آتا تھا کہ اسلام کا پھیلنا اُن کے ہر قسم کے فخر و امتیاز کا مٹ جانا ہے،

عرب میں ایک دوسری حریف طاقت یہودیوں کی تھی، جو حجاز سے لیکر شام کے دروازوں تک پھیلے تھے، اُن کے ہاتھ میں بڑے بڑے مضبوط قلعے تھے، فنِ جنگ سے واقف تھے، سامان واسلحہ وافر رکھتے تھے، دولت کی بہتات تھی، باغوں اور زمینوں پر اُن کا قبضہ تھا، عرب کے تمام مادی ذرائعِ معاش کے وہ تنہا اجارہ دار تھے، پھر اسلام آیا، تو اس طرح کہ اُس نے یہودیوں کی ایک ایک برائی کو طشت از بام کیا، اور اُن کے مذہبی وقار کے کھوکھلے پن کو علی الاعلان ظاہر کیا، اس لئے انھیں صاف نظر آتا تھا کہ یہ نئی طاقت ملک میں جڑ پکڑ کر اُن کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دے گی، چنانچہ قریظہ، بنی نضیر، بنی قینقاع، اور یثرب، خیبر، فدک، تیما، وادی القریٰ وغیرہ کے یہودی زمیندار، سوداگر، مہاجن، اور قلعہ نشین دل سے چاہتے تھے کہ اس قوت کو کسی طرح ابھرنے نہ دیں، اور آخر لڑائیاں پیش آئیں، اور دینِ توحید کے مقابلہ میں انھوں نے اہلِ شرک کا ساتھ دیکر خندق و احزاب و غطفان کے معرکے پیش کئے، عرب کے مختلف قبیلوں اُور سرحدی صوبوں پر ایران اور روم کی سلطنتیں فرمانروائی کرتی تھیں، عراق یمن اور بحرین پر ایران کی حکومت تھی، اور حجاز کے شامی حدود پر قیصر کا قبضہ تھا، عرب کے مختلف ہمسایہ قبیلے ان ہی دو میں کسی ایک سلطنت کی حفاظت کا دم بھرتے تھے، اور یہ دونوں سلطنتیں اس بیچ کے سرحدی ملک کی ایک ایک حرکت اور جنبش پر نظر رکھتی تھیں، اس لئے اس ملک میں ایک اتنی بڑی عظیم الشان تحریک کا قوت پکڑنا، اُن کو کسی طرح پسند نہیں آسکتا تھا اسی لئے عرب میں اسلام کی قوت کا اُن کو جب احساس ہوا تو انھوں نے اس کی دار و گیر کرنی چاہی، کسریٰ ایران نے یمن کے

اپنے ایرانی گورنر کو لکھا کہ اس نئے مدعی کو پکڑ کر ہمارے سامنے حاضر کرو، اور قیصر نے تو کھلم کھلا حملہ کی تیاری ہی کر دی تھی جس کے باعث تبوک کی فوج کشی ہوئی، اور آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اسلام کو ان دونوں ہمسایہ طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑا،

ذریعۂ معاش

اسلام لانے کا ایک بڑا مانع یہ تھا کہ عرب کا ذریعۂ معاش عموماً قافلوں پر حملہ اور سلب اموال اور رہزنی تھا، اوپر ہم امالی قالی سے نقل کر آئے ہیں کہ عرب کا ذریعۂ معاش غارتگری تھا، اور چونکہ حج کے چار مہینوں میں جنگ و غارت سے باز رہنے میں اُن کے ذرائع معاش مسدود ہو جاتے تھے، اس ضرورت سے وہ حج کے مہینوں کو ادل بدل کر لیا کرتے تھے،

اندرونی عرب تمامتر دشت و صحرا اور بالکل ویرانہ ہے، زراعت یا تجارت کی کوئی صورت نہیں، باوجود اس کے لاکھوں نفوس آباد ہیں، اس لئے اُن کو غارتگری کرنی پڑی، اور امتداد زمانہ سے یہ عادت اُن میں راسخ ہو گئی تھی، رفتہ رفتہ ٹھگی، رہزنی، اور سرقہ تمام ملک میں پھیل گیا تھا، یہانتک کہ بڑے بڑے نامور شعراء چور اور رہزن ہوتے تھے،

اکثر بڑے بڑے جتھے اس لئے قائم ہوتے تھے کہ بنجارے جو ملک میں پھر کر غلہ کی تجارت کرتے تھے، اُن کو لوٹ لیا کریں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دومۃ الجندل پر جو سریہ بھیجا تھا، اسی کے انسداد کی غرض سے بھیجا تھا، دومۃ الجندل مدینہ منورہ سے پندرہ منزل کے فاصلہ پر ہے تاہم یہ لوگ اس قدر فاصلہ سے خود مدینہ پر چھاپہ مارنے کی تدبیر کر رہے تھے کہ آپ کو خبر ہو گئی اور حفظ ماتقدم کیلئے خود وہاں تک گئے، اور چند روز قیام کر کے ان اطراف کا بندوبست کیا.

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے اسلام لانے سے پہلے چند شخصوں کو قتل کر کے اُن کا مال چھین

لیا تھا، چنانچہ جب اسلام لائے اور اس واقعہ کا اظہار کر کے لوٹ کا مال بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے فرمایا کہ

اما الاسلام فاقبل واما المال فلست منہ — اسلام تو میں نے قبول کیا لیکن مال سے
فی شئی (صحیح بخاری کتاب الشروط ذکر صلح حدیبیہ) — مجھکو کسی قسم کا واسطہ نہین،

ایک نکتہ یہاں خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے حدیثوں میں جو یہ وارد ہے کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم اکثر بیعتِ اسلام کے وقت جن باتون کا اقرار لیتے تھے، ان میں ایک یہ بھی ہوتا تھا
کہ "چوری نہ کرین گے" اس کی یہی وجہ تھی کہ ان جرائم کا رواج تھا، ورنہ آج اگر شرفا سے بیعت
کے وقت یہ اقرار لیا جائے تو لوگوں کو تعجب ہوگا کہ یہ بیعت لینے کی کیا چیز ہے،

اسلام قبول کرنے کیساتھ ان تمام جرائم سے توبہ کرنا ہوتا تھا، اس لئے عرب کو اسلام قبول
کرنے کے وقت یہ نظر آتا تھا کہ وہ تمام ذرائعِ معاش سے مجبور ہو جاتے ہیں، یعنی وہ قافلون پر
حملہ نہیں کر سکتے، کہین ڈاکہ نہین ڈال سکتے، کسی کا مال نہیں چھین سکتے، تو اب اُن کے لئے کیا
باقی رہ جاتا ہے،

قریش خود رہزن اور غارتگر نہ تھے، وہ شہر کی متمدن زندگی بسر کرتے تھے تاہم دیگر اسباب
کے ساتھ ان کے اسلام قبول کرنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ قبول اسلام کا اثر اُن کے وسائلِ معاش
پر بھی پڑ سکتا تھا، قریش کا ذریعۂ معاش صرف ان تجارتی تعلقات تک محدود تھا جو انھون نے
باضابطہ طور پر دوسرے قبائل اور ممالک سے قائم کر رکھے تھے، اور یہ تمام قبائل اور ممالک مذہبی حیثیت
سے اسلام کے دشمن اور حریف مقابل تھے، اس بنا پر قریش کو خوف تھا کہ اگر وہ اسلام کے حلقہ میں داخل

ہو جائیں گے تو دفعتہً یہ تمام تجارتی تعلقات منقطع ہو جائیں گے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح (صفحہ ۱۳۰ جلد ۴) میں امام شافعی کی روایت سے لکھتے ہیں،

قال الشافعی کانت قریش تنتاب الشام انتیاباً کثیراً وکان کثیر من معائشها منه، وتاتی العراق فیقال لما دخلت فی الاسلام ذکرت للنبی صلی اللہ علیہ وسلم خوفها من انقطاع معائشها بالتجارة من الشام والعراق اذا فارقت الکفر ودخلت فی الاسلام وخلاف ملک الشام والعراق لاهل الاسلام فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا هلك کسریٰ فلا کسریٰ بعده فلم یبق بارض العراق کسریٰ یثبت له امر بعده وقال اذا هلك قیصر فلا قیصر بعده فلم یکن بارض الشام قیصر فاجابهم علی ما قالوا،

امام شافعی کا بیان ہے کہ قریش شام میں اکثر تجارتی حیثیت سے آمد ورفت رکھتے تھے، اور اُن کی معاش کا تعلق زیادہ تر اسی سے تھا، اور اس غرض سے وہ عراق میں بھی آتے جاتے تھے، تو کہا جاتا ہے کہ جب قریش کے لوگ اسلام لائے تو آنحضرت سے ان ذرائع معاش کے منقطع ہوجانے کا خوف ظاہر کیا اور شام وعراق کے بادشاہوں کی اس مخالفت کا ذکر کیا جو اُن کو اہلِ اسلام کے ساتھ تھی، اس پر آپ نے فرمایا کہ جب کسریٰ ہلاک ہوجائیگا تو پھر اُس کے بعد دوسرا کسریٰ نہ ہوگا، چنانچہ عراق سے کسریٰ کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا، اور اور آپ نے فرمایا کہ جب قیصر ہلاک ہوجائیگا تو پھر دوسرے قیصر کا وجود نہ ہوگا، چنانچہ ارض شام میں پھر کوئی قیصر نہیں ہوا جس کی وہاں حکومت ہو، اس لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان

جواب اُن کے سوال کے مطابق دیا

رفعِ شک | اس موقع پر ایک غلطی کا ذکر کرنا ضرور ہے جو عام طور پر یورپ مین پھیلی ہوئی ہے، اہلِ مغرب کا خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت کی وجہ زیادہ تر یہ ہوئی کہ اس مین عرب کی ہر قسم کی خواہش ہائے نفسانی کے پورے کرنے کا سامان موجود تھا، عرب جنگ وجدل، اور لوٹ مار کے شائق تھے، اسلام نے ان ہی چیزون کو جہاد و غنیمت کی صورت مین بدل دیا، عرب سخت نفس پرست تھے، اسلام نے چار بویان اور غیر محدود لونڈیون کی اجازت دیدی اہلِ عرب اہانہ زندگی سے بالکل آشنا نہ تھے، اسلام نے بھی رہبانیت کی تحقیر کی، اب کیا چیز تھی جو اہلِ عرب کو اسلام سے روک سکتی تھی،

لیکن یہ خیال تمامتر غلط ہے، جہاد، اور تعددِ ازدواج، اور سراری کی بحث کتاب کے دوسرے حصون مین آئیگی، یہان اس قدر بیان کردینا کافی ہے کہ جہاد یا تعددِ ازدواج جو کچھ بھی تھا قدیم آزادی سے کوئی نسبت نہین رکھتا تھا، جہاد صرف کافرون سے جائز تھا، فرض کرو ایک قبیلہ نے اسلام قبول کرلیا تو اس پر کوئی شخص ہتھیار نہین اٹھا سکتا تھا، اور اس کے مال و متاع سے تعرض نہین کرسکتا تھا، لیکن قدیم رسم کے لحاظ سے اتحادِ مذہب کوئی روک نہ تھی، تمام قبائل بت پرستی مین متحد تھے لیکن ہمیشہ ایک دوسری کو لوٹتے رہتے تھے، جہاد کیلئے اور بہت سی پابندیان ہین، جو پہلے بالکل نہ تھین، جہاد مین صرف پاس پاس کے قبائل شریک ہوتے تھے، دور، دور کے قبائل اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتے تھے جہاد مین جو لونڈیان گرفتار ہوتی تھین، اُن سے اس وقت تمتع جائز ہوتا تھا جب ایک مہینہ کی مدت گذر جائے یا اگر حاملہ ہے تو بچہ پیدا ہوچکے لیکن اسلام سے پہلے فتح کیساتھ ہی عورتون کو تصرف مین لے آتے تھے، اور اس پر فخر کرتے تھے پہلے نکاح کے لئے تعداد کی کوئی

قید نہ تھی، ایک ساتھ آٹھ آٹھ دس دس شادیاں کرتے تھے، اب چار کی قید ہوگئی، اور وہ بھی اس سخت شرط کے ساتھ کہ سب میں عدل اور مساوات رہے، اس لئے یہ کہنا کہ اسلام عرب کے مرغوبات کو قائم رکھتا تھا، تمامتر غلط ہے، برخلاف اس کے عرب کی ایک ایک چیز روایات، قدیمہ جہالت عادات و رسوم نفس پرستی، ہر چیز اسلام کے قبول کرنے کی مانع تھی،

ہر قوم پر جو چیز سب سے زیادہ سختی کے ساتھ حکمران ہے، وہ قدیم عادات اور رسوم اور خیالات ہیں آج یورپ علوم و فنون اور آزادی خیال میں اس حد تک ترقی کر گیا ہے لیکن جو بیہودہ تعجب انگیز رسمیں پہلے قائم تھیں اب بھی قائم ہیں، یا تو تعوّد کی وجہ سے ان کی بُرائیاں سرے سے نظر ہی نہیں آتیں یا آتی ہیں، تو عادت کی حکومت کے مقابلہ میں آزادی خیال اور علوم و فنون سب عاجز ہو کر رہ جاتے ہیں،

عرب میں جس قدر رسمیں قومی عادتیں تھیں، جو اُن کی ہستی کی عناصر بنگئی تھیں، اسلام ایک ایک کا دشمن تھا، ثار یعنی انتقام خون، عرب کے جذبات کا سب سے بڑا مظہر تھا، اسلام نے ان کو بالکل مٹا دیا، خاندانی فخر و مباہات اُن کی قومی زندگی کی روح تھی جو فنا کر دی گئی ابوسفیان رئیس العرب کو بلال رض (جو حبشی غلام تھے) کے ساتھ بیٹھنا پڑا، یا تو قریش کو انصار کے مقابلہ میں تلوار اٹھانے سے بھی عار تھا، یا اب قریش کی لڑکیاں غلاموں (زید و سالم وغیرہ) کے گھر میں گئیں، عکاظ وغیرہ کے میلے جہاں عرب سال کے سال جمع ہو کر اپنے مفاخر کی داستانیں سُناتے تھے، سرد پڑ گئے،

اسلام ایک طرف تو عرب کے تمام مفاخر کو خاک میں ملاتا تھا، دوسری طرف خود اس میں ہوائے نفس اور تفریح طبع کا کوئی سامان نہ تھا، اسلام قبول کرنے کے ساتھ پانچ وقت کی نمازیں

گلے کا ہار بنجاتی تھی، جو آزاد مزاجون پر سخت گران تھی،

وَاِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ (بقرہ - ۵) اور وہ (نماز) خاشعین کے سوا، اورون پر یقیناً گران ہے،

روزہ یعنی تیس دن تک متصل کھانا چھوڑ دینا کوئی آسان کام نہ تھا، زکوٰۃ ایسا سخت ٹکس تھا کہ محض اس کے ادا کرنے پر حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں عام بغاوت ہوگئی، صرف حج ایک ایسا فرض تھا، جو بظاہر زندہ دلی کا سامان رکھتا تھا، لیکن اب حج وہ جاہلیت کا حج نہین رہا تھا، طوافِ عریان کی اجازت نہیں رہی تھی، بڑی دلچسپی کی چیز بت تھے، وہ ایک ایک کرکے حرم سے نکال دیئے گئے، مقامِ منیٰ میں خاندانی واقعات کی رجز خوانی کا جو طریقہ چلا آتا تھا، بند کردیا گیا، یہ فرائض اور اوامر کا حال تھا اُسی کے ساتھ محرمات اور نواہی کی وہ عالمگیری تھی کہ اُن کے جاہلانہ خیال کے مطابق زندگی، زندگی نہیں بلکہ زندان بن گئی تھی، زنا حرام، شراب حرام، قمار حرام، سونا چاندی حرام، اطلس وحریر حرام، چنگ وعود حرام، تصویر حرام، پھر زندہ دلی، اور لطفِ زندگی کیلئے باقی کیا بچا؟ خوب غور سے دیکھو، تمام دیگر مذاہب نے عبادتون میں بھی دلچسپی کا سامان رکھا ہے عیسائیون کی نماز گاکر ادا کیجاتی ہے، پارسیون میں زمزمہ ہوتا ہے، ہندو بھی عبادت کے وقت بھجن گاتے ہیں، اور سامنے دلفریب بت ہوتے ہیں لیکن اسلام مین بظاہر دلآویزی اور دلفریبی کی ایک چیز بھی نہیں،

مذکورۂ بالا واقعات کی بنا پر یورپ کا یہ اعتراض کس قدر غلط اور تمامتر بے سروپا ہے کہ اسلام اس لئے پھیلا کہ وہ نفس پرستی کی ترغیب دلاتا اور اس کے سامان مہیا کرتا تھا،

پھر کیا تھا؟ اس کا جواب آگے آتا ہے،

تبلیغِ نبویؐ

اور

اُس کے اصول اور اس کی کامیابی کے اسباب

تمام گذشتہ موانع، عوائق، مشکلات اور دشواریوں کی دیواریں آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے ٹوٹتی گئیں، اسلام پھیلا، اور اس طرح پھیلا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دنیا کو چھوڑا تو تمام عرب میں ایک بھی بُت پرست نہ تھا، اس لئے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُس کے اسباب کیا تھے؟ مخالفین کے نزدیک تو اس کا جواب صرف تلوار ہے لیکن کارلائل[1] کے بقول تنہا اور یکہ و تنہا اسلام کے ہاتھ میں یہ تلوار کس تلوار کے زور سے آئی؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تلوار صرف اسلام کی تبلیغی دعوت تھی، اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں، اسلام کی اس طاقت کی تشریح کر دینا مناسب ہے۔

فریضۂ تبلیغ "تبلیغ" کے لفظی معنی پیغام پہنچانے کے ہیں، اور اصطلاح میں اس کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کو ہم اچھا سمجھتے ہیں اُس کی اچھائی اور خوبی کو دوسرے لوگوں اور دوسری قوموں اور ملکوں تک پہونچائیں، اور اُن کو اس کے قبول کرنے کی دعوت دیں، قرآن پاک میں تبلیغ کے ہم معنی

[1] سیروز اینڈ ہیرو ورشپ (محمد)

چند اور الفاظ بھی ہیں جن میں سے ایک لفظ انذار ہے جس کے معنی ہشیار اور آگاہ کرنے کے ہیں، دوسرا لفظ دعوۃ ہے جس کے معنی بلانے اور پکارنے کے ہیں، اور تیسرا لفظ تذکیر ہے جس کے معنی یاد دلانے اور نصیحت کرنے کے ہیں، بعثتِ نبویؐ کے وقت دنیا میں دو قسم کے مذہب تھے، وہ ایسے جو تبلیغی تھے، یعنی عیسائیت اور بودھ مت، باقی زیادہ تر ایسے ہی تھے، جو تبلیغی نہیں، جیسے یہودیت، مجوسیت، ہندوئیت، جو دو تبلیغی سمجھے جاتے تھے، اُن کی نسبت یہ فیصلہ مشکوک ہے کہ آیا یہ تبلیغ اُن کے اصل مذہب کا حکم تھا، یا بعد کے پیرؤں کا عمل ہے؟ کیونکہ اُن کے مذہبی صحیفوں میں اس تعمیم دعوت کی کھلی ہوئی ہدایتیں، اور اُن کے بانیوں کی زندگی میں اس کی عملی مثالیں نہیں ملتیں، تمام مذاہب میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے، جس نے تبلیغ کی اہمیت کو سمجھا، اور اس کے متعلق اپنے صحیفہ میں کھلے احکام دیے، اور اس کے داعی و حامل علیہ السلام نے اپنی زندگی میں اس کی عملی مثالیں پیش کیں،

جن مذہبوں نے تبلیغ کو اپنا اصول نہیں ٹھہرایا، اُن کے ایسا کرنے کی اصلی وجہیں دو ہیں، ایک یہ کہ اُن کے نزدیک اس حق کے قبول کرنے کی عزت کا استحقاق پیدائش سے حاصل ہوتا ہے، کوشش سے نہیں، دوسرا سبب یہ ہے کہ جو حق اُن کے پاس ہے، وہ اُن کے نزدیک اتنا پاک و مقدس ہے کہ اُن کی خاص پاک و بزرگ و محترم نسل و قوم کے علاوہ دوسری تمام قومیں جو ناپاک و نجس و کمتر ہیں، اُن تک اپنے پاک مذہب کو لیجانا خود اس مذہب کی پاکی کو صدمہ پہنچانا ہے، یہی سبب ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے ایک دفعہ جب ایک کنعانی (متی ۱۵) یا یونانی (مرقس ۷) عورت نے اُن سے برکت چاہی تو فرمایا، میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے

پاس نہین بھیجا گیا، (متی ۱۵-۲۵) پھر فرمایا "مناسب نہین کہ لڑکوں کی روٹی (بنی اسرائیل کا مذہب) کتوں (غیر اسرائیلی قوموں) کو پھینک دیں" (۲۶) پھر فرمایا "غیر قومون کی طرف نہ جانا، اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا، بلکہ پہلے اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑون کے پاس جاؤ، اور چلتے ہوئے منادی کرو" (متی ۱۰-۶) پھر ارشاد فرمایا "وہ چیز جو پاک ہو کتون کو مت دو، اور اپنے موتی سورون کے آگے نہ پھینکو" (متی ۷-۶)

ہندوؤن نے اپنے مذہب کو تمام قوموں سے جو چھپا کر رکھا، اس کا بھی یہی سبب تھا کہ وہ اپنا پاک دھرم ملیچھون اور اچھوتون کو سکھا کر اس کو ناپاک نہیں کرنا چاہتے تھے" یہودیون کا بھی یہی خیال تھا کہ نامختون اس نعمت کے اہل نہیں،

تبلیغ کی اہمیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی تمام قومون کو برابری اور مساوات کی ایک ہی سطح پر لاکر کھڑا کیا، اور خدا کے پیغام کی منادی کا سب کو یکسان مستحق قرار دیا، اس لئے اپنی تبلیغ کے لئے قریش وغیر قریش، حجاز و یمن، عرب و عجم، ہند و روم کی تخصیص نہیں فرمائی بلکہ دنیا کی ہر قوم، ہر زبان اور ہر گوشہ مین صدائے الٰہی کا پہنچانا فرض قرار دیا، ابتدائی وحی میں انجانون کو ہشیار اور بیخبروں کو آگاہ کرنا سب سے پہلا حکم تھا، يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنذِرْ (مدثر) "اے چادر پوش! اٹھ کھڑا ہو، اور ہشیار (آگاہ کر" پھر بار بار حکم ہوتا رہا کہ "بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ" (جو تیری طرف اُتارا گیا اس کو اورون تک پہنچا، فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ (شوریٰ) لوگون کو دعوت دے، اور مضبوطا قائم رہ جس طرح تجھے حکم دیا گیا، فَذَكِّرْ إِن نَّفَعَتِ الذِّكْرَىٰ (اعلیٰ) لوگون کو نصیحت کر اگر نصیحت فائدہ مند ہو" وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ (ذاریات) اور نصیحت کر

کر نصیحت اہلِ ایمان کو فائدہ پہنچاتی ہے" فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ (ق ۳) قرآن سے سمجھاؤ اس کو جو میری دھمکی سے ڈرتا ہو" اور ان کے علاوہ بیسیوں آیتوں میں اس فرض کی اہمیت ظاہر کی گئی، حضرت علیؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے علی! تمھاری کوشش سے ایک آدمی کا بھی دینِ حق کو قبول کر لینا دنیا کی بڑی سے بڑی دولت سے بھی بڑھکر ہے[۱]"

اس سے زیادہ یہ کہ اسلام نے اپنے ہر پیرو پر خیر کی دعوت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور تواصی بالحق، یعنی باہم ایک دوسرے کو سچائی کی نصیحت کرنا، ضروری قرار دیا ہے اور مسلمانوں کا یہ فرض بتایا ہے کہ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی تاریکی سے نکالنے کی جد وجہد کریں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے خطرات سے بے پروا ہو کر پیامِ الٰہی لوگوں تک پہنچایئے، اور اگر ایسا نہ کیا تو رسالت کا فرض انجام نہیں دیا،

يَآاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ	اے خدا کے پیغام پہنچانے والے تیرے پروردگار کے
رَّبِّكَ ط وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ	پاس سے جو کچھ تیری طرف اترا ہے اس کو پہنچا دے،
رِسَالَتَهٗ ط وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ	اگر تو نے ایسا نہیں کیا تو تو نے خدا کا پیغام نہیں
(مائدہ ۱۰-۱۰)	پہنچایا اور تجھکو خدا لوگوں سے بچا لیگا،

اس کی وسعت

اس کے بعد اس فریضۂ تبلیغ کی وسعت کی بحث ہے، پیغامِ الٰہی سچائی کا ایک بہتا چشمہ ہے جو آہستہ آہستہ قدرتی رفتار سے پہلے اپنی قریب کی زمین کو پھر آگے کو پھر اُس سے آگے کو سیراب کرتا چلا جاتا ہے، یہانتک کہ وہ زمین کے کناروں تک پہنچ جاتا ہے آنحضرتؐ

---

[۱] صحیح مسلم باب خیبر،

صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تبلیغ کا حکم اسی تدریج کے ساتھ ہوا، سب سے پہلے خاص اپنے گھر اور خاندان کے لوگوں کو سمجھانے کا حکم ہوا،

وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ (شعراء ۱۱) — اور اپنے سب سے نزدیک اہل خاندان کو آگاہ و ہشیار کر،

اس کے بعد یہ دائرہ بڑھ کر شہر مکہ اور اس کے اطراف کی آبادیوں تک پہنچتا ہے،

لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا (شوریٰ -۱) — تاکہ تو مکہ اور جو اس کے آس پاس (کے بستی) ہیں اُن کو آگاہ و ہشیار کرے،

اب تبلیغ کا دائرہ اس سے بھی آگے بڑھتا ہے، اور ہر زندہ روح یعنی سمجھ بوجھ، احساس، عقل وغیرہ حقیقی زندگی کی علامتیں جس میں موجود ہوں اس کی مخاطب ہوتی ہے،

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِکْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ لِّیُنْذِرَ مَنْ کَانَ حَیًّا (یٰسٓ ۵) — یہ قرآن تو صرف ایک نصیحت اور صاف صاف خدا کا کلام ہے تاکہ وہ اُس کو ہشیار کرے جو زندہ ہو،

پھر جس حد تک بھی وہ آواز پہنچ جائے سب سے اس کا خطاب ہے،

لِاُنْذِرَکُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ، (انعام -۲) — تاکہ میں تمھیں آگاہ و ہشیار کروں اور اُن کو جن تک میری یہ آگاہ و ہشیار کرنیوالی آواز پہنچے،

پھر تمام انسانوں تک اس کی وسعت ہوتی ہے،

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ (ابراھیم -۷) — یہ قرآن تمام انسانوں کے لئے پیغام ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوا،

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ — اور ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لئے خوشخبری

مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ٥ (سبا - ۳) سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر بھیجا،

آپ کو حکم ہوا کہ تمام انسانوں کو خطاب کر کے یہ اعلان فرما دیں،

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ٥ (اعراف - ۲۰) اے لوگو! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغام دیکر بھیجا گیا ہوں،

اس سے زیادہ یہ ہے کہ تمام کائنات آپ کی دعوت و تبلیغ کے دائرہ میں داخل فرمایا،

تَبَارَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۙ الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (فرقان - ۱) برکت والا ہو وہ خدا جس نے حق اور باطل میں امتیاز بتانیوالی کتاب اپنے بندہ (محمدؐ) پر نازل کی تاکہ وہ دنیا جہان کے لئے ہشیار و آگاہ کرنیوالا ہو، وہ خدا جس کی ملکیت میں آسمانوں کی اور زمین ہے

اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس تبلیغ و دعوت کی وسعت اور اس میں کامیابی کی خوشخبری عین اسی وقت دیدی گئی تھی، جب مسلمانوں کے دلوں میں ایک قسم کی مایوسی چھائی ہوئی تھی، چنانچہ آیت ذیل نازل ہوئی،

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ (ص - ۵) یہ قرآن تو دنیا کے لئے نصیحت ہے، اور تم ایک زمانہ کے بعد اس کی خبر جانو گے،

انبیاء اور بانیانِ مذاہب کے عملی نمونوں اور مثالوں کی تلاش اور جستجو کرو تو یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو جائے گی کہ اسلام کے سوا اور جو مذہب تبلیغی سمجھے جاتے ہیں، وہ حقیقت میں تبلیغی نہیں، خود بودھ نے ہندوؤں کے علاوہ کسی کو اپنی نجات کا راستہ نہیں بتایا، اور نہ اس کا

حکم دیا حضرت عیسیٰؑ نے اسرائیل کے علاوہ کسی دوسری قوم کو نہ اپنا وعظ سنایا، اور نہ اُن کو اپنا مخاطب بنایا، اور نہ ان میں سے کسی کو اپنا شاگرد کیا، نہ کسی دوسری قوم میں اپنی زندگی میں اپنا واعظ اور مُبلغ بھیجا، حالانکہ فلسطین میں رومیوں اور یونانیوں کی بڑی جماعت موجود تھی،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں رہ کر مکہ اور اُس کے پاس کے لوگوں کو بیدار و ہشیار کیا، حج کے موسم میں عرب کے ایک ایک قبیلہ کے پاس جاکر حق کا پیغام پہنچایا، اور اسی زمانہ میں یمن اور حبشہ تک آپ کی آواز پہونچ گئی، اور لوگ تلاش حق کے لئے آپ کے پاس آئے مدینہ منورہ آئے تو قریش کو برسوں تک دوسرے قبیلوں تک اسلام کے پہنچنے میں سدراہ بنے رہے، پھر بھی مبلغ اور داعی بھیج کر قبیلوں تک آواز پہنچائی گئی، اور بالآخر قریش کے خلاف اسلئے تلوار اٹھانی گئی کہ اسلام کو تبلیغ کی پُرامن آزادی ملے، چھ برس کے جنگ وجدل کے بعد حدیبیہ میں قریش نے اسلام کے اس مطالبہ کو تسلیم کیا، اور تبلیغ کی آزادی عطا کی، قرآن نے اسلام کی اس روحانی فتح کو **فتح مبین** قرار دیا، اور اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا، نازل ہوئی[۱]، اس کے بعد ہی عرب اور بیرون عرب میں اسلام کے واعظ، قاصد، اور مبلغ بھیجے گئے، اور دنیا کے امراء و سلاطین کو دعوت اسلام کے خطوط لکھے گئے، اور عربوں کے علاوہ دیلم، ایران، حبش، اور روم کے طالب آئے، اور فیضانِ حق سے سیراب ہوئے، مشرکین عرب، یہود، عیسائی، اور پارسی سب نے آپکے زمانہ ہی میں آپکے نور سے روشنی حاصل کی،

لیکن نفس تبلیغ کی فرضیت واہمیت سے بھی زیادہ اہم چیز تبلیغ کے اصول ہیں،

---

[۱] صحیح مسلم باب صلح الحدیبیہ،

تبلیغ کے اصول | یہ نکتہ کہ کس طرح لوگون کو کسی سچائی کے قبول کی دعوت دینی چاہیے دنیا میں پہلی دفعہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان سے ادا ہوا، وہ مذہب بھی جو تبلیغی ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں، یہ نہین کہہ سکتے کہ اُن کے صحیفون نے ان کے لیے تبلیغ کے اہم اصول کی تشریح کی ہے لیکن صحیفۂ محمدی نے نہایت اختصار لیکن پوری تشریح کیساتھ اپنے پیروون کو یہ بتایا ہو کہ پیغام الٰہی کو کس طرح لوگون تک پہنچایا جائے اور اُن کو قبولِ حق کی دعوت کس طرح دیجائے

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِکْمَةِ	اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو دانائی
وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ	اور عمدہ نصیحت کے ذریعہ سے بلا، اور اُن سے
بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ، (نحل - ۱۶)	مناظرہ خوش آیند طریق سے کر،

تبلیغ و دعوت کے یہ تین اصول مسلمانون کو سکھائے گئے، عقل[۱] و حکمت، موعظۂ[۲] حسنہ اور مناظرہ[۳] بطریق احسن، مسلمان متکلموں نے بیان کیا ہے کہ تبلیغ و دعوت کے یہ تینون اصول وہی ہیں، جو منطقی استدلال مین عموماً کام میں لائے جاتے ہیں یعنی ایک تو برہانیات جن میں یقینی مقدمات کے ذریعہ سے دعوی کے ثبوت پر دلیلیں لائی جاتی ہیں، دوسرے خطابیات جن مین مؤثر اور دلپذیر اقوال سے مقصود کو ثابت کیا جاتا ہے، اور تیسرے جدلیات جن مین مقبول عام اقوال اور فریقین کے مسلّم مقدمات سے استدلال کیا جاتا ہو، قرآن پاک نے پہلے طریقہ کو حکمت دوسرے کو موعظتِ حسنہ اور تیسرے کو جدال سے تعبیر کیا ہو اور استدلال کے یہی وہ تین طریقے ہیں، جن سے ایک شخص دوسرے کے سامنے اپنے مدعا کو ثابت کرتا ہے،

خیر یہ تو فلسفیانہ نکتہ آفرینی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جب ہم کسی کے سامنے کوئی نئی بات

پیش کرکے اُس کے قبول کی دعوت دیتے ہیں تو عموماً تین طریقے برتتے ہیں، یا تو اُس بات کے ثبوت اور تائید میں کچھ دلنشیں دلیلیں پیش کرتے ہیں، یا اس کو مخلصانہ نصیحت کرتے ہیں، اور مؤثر انداز سے اس کو نیک و بد اور نشیب و فراز سے آگاہ کرتے ہیں، یا یہ کرتے ہیں کہ اس کی دلیلوں کو مناسب طریقہ سے رد کرکے اس کی غلطی کو اس پر واضح کرتے ہیں، پہلے طریقہ کا نام حکمت ہے، دوسرے کا نام موعظہ حسنہ، اور تیسرے کا نام جدال بطریق احسن ہے، تبلیغ و دعوت کے یہی تین طریقے ہیں،

قول لین | حکیمانہ استدلال ہو، یا وعظ و نصیحت ہو یا جدال و مناظرہ ہو، ضرورت یہ ہے کہ داعی نرمی اور خیر خواہی سے باتیں کرے کہ سختی اور شدت کا طریق دوسرے کے دل میں نفرت اور عداوت کے جذبات پیدا کرتا ہے، اور کیسی ہی اچھی اور سچی بات ہو لیکن اس قسم کے جذبات اس کے قبول کی استعداد اس سے سلب کرلیتے اور سننے والے میں اپنی غلطی پر ضد اور ہٹ پیدا کردیتے ہیں، جس سے دعوت کا فائدہ اور نصیحت کا اثر باطل ہوجاتا ہے، اسی لئے قرآن پاک نے اپنے پیغمبروں کو اپنے مخالف سے مخالف دشمن سے بھی نرمی ہی سے باتیں کرنے کی تاکید کی ہے، حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو، فرعون جیسے سرکش کے سامنے پیغام ربانی لے کر جانے کی ہدایت ہوتی ہے تو ساتھ ارشاد ہوتا ہے،

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى	تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، اُس نے
فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ	سرکشی کی ہے، تو اس سے نرم گفتگو کرنا، شاید
يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (طٰہٰ ۲)	نصیحت قبول کرے یا (خدا سے) ڈرے،

دعوت وتبلیغ میں رفق ونرمی اور لطف وتحمل کی تعلیم کی اس سے بہتر مثال نہیں ہوسکتی، کہ نہ کوئی داعی اور واعظ پیغمبروں سے بہتر ہوسکتا ہے، اور نہ فرعون سے بڑھکر کوئی مجرم ہوسکتا ہے، پھر ایسے مجرم کے سامنے اس لطف ونرمی سے وعظ ونصیحت کی تعلیم جب پیغمبروں کو ہوتی ہے، تو عام داعیوں مبلغوں اور واعظوں کو عام مخالفوں، مجرموں، اور سرکشوں کے ساتھ بدرجہا زیادہ رفق و ملاطفت سے اپنا فرض ادا کرنا چاہیئے،

اعراض وقول بلیغ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن منافقوں کے بارہ میں، جو آپ کی نافرمانی کے جرم کے مرتکب ہوئے تھے، یہ حکم ہوتا ہے،

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا، (نساء ۹)

تو اُن سے درگذر کر، اور اُن کو نصیحت کر، اور اُن سے ایسی بات کہہ جو اُن کے دلوں میں اثر کرے،

اس تعلیم میں تین باتیں ہیں، اول یہ کہ دعوت وتبلیغ میں مخالف کی بدسلیقگی، بدتہذیبی اور درشتی سے درگذر اور اُن کو برداشت کرنا چاہیئے، دوسری یہ کہ اُن کو نصیحت کرنا اور سمجھانا چاہیئے اور تیسری یہ کہ گفتگو کا وہ موثر طرز و انداز اختیار کرنا چاہیئے جو دل میں گھر کرے،

تیسیر و تبشیر ان ہی ربانی ہدایتوں کی تعمیل میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ ابن جبلؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ کو یمن میں اسلام کی دعوت وتبلیغ کے لئے متعین فرمایا، تو رخصت کرتے وقت یہ نصیحت فرمائی یسّرا ولا تعسّرا وبشّرا ولا تنفّرا[1] دینِ الٰہی کو آسان کرکے پیش کرنا سخت بنا کر نہیں، لوگوں کو خوشخبری سنانا، نفرت نہ دلانا" یہ وہ تبلیغی اصول ہیں جو ایک داعی و مبلغ کی

---

[1] صحیح بخاری بعث معاذ الی الیمن جلد دوم صفحہ ۶۲۲

کامیابی کی جان ہین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کے سامنے، اور صحابہؓ نے عام مسلمانون کے سامنے اسی اصول کے مطابق دینِ الٰہی کو پیش کیا، اور کامیابی حاصل کی، دین کی جائز آسانی اور سہولت کو پیش کرنا، اور اس کو سخت درشت اور مشکل نہ بنانا ہی اس کے قبول عام کی راہ ہے، اسی طرح اسی اللہ تعالیٰ کے لطف و شفقت، رحم و کرم اور مہر و محبت کی دلنواز صداؤن سے دلون کو پُرامید اور مسرور بنانا اس سے بہتر ہے، کہ بات بات پر خدا کی قہاری و جباری، اور ہیبت و جلال کا ذکر کرکے دلون کو خوفزدہ اور مایوس بنایا جائے،

تدریج | تبلیغ کا ایک اور اصول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم فرمایا کہ کسی نئی قوم کو دعوت دیتے وقت شریعت کے تمام احکام کا بوجھ ایک دفعہ اس کی گردن پر نہ ڈالا جائے، بلکہ رفتہ رفتہ وہ اس کے سامنے پیش کئے جائین، پہلے توحید اور رسالت کو پیش کرنا چاہیئے، اس کے بعد عبادات کو، عبادات مین بھی اہم پھر اہم کے اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیئے، عبادات مین سب سے اہم نماز ہے، پھر زکوٰۃ ہے پھر دوسرے فرائض ہین، حضرت معاذؓ بن جبل کو یمن بھیجتے وقت آپ نے فرمایا تم یہودیون اور عیسائیون کی ایک قوم کے پاس جاؤ گے تو انکو پہلے اس کی دعوت دینا کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہین، اور محمدؐ اس کا رسول ہے، جب وہ یہ مان لین تو اُن کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے اُن پر دن رات مین پانچ وقت کی نمازین فرض کی ہین، اور جب وہ یہ بھی مان لین تو انکو بتاؤ کہ خدا نے اُن پر صدقہ فرض کیا ہے، صدقہ اُن کے دولتمندون سے لیکر اُن کے غریبون کو دیدیا جائے، جب وہ اس کو تسلیم کرلین تو دیکھو صدقہ مین چن چنکر اُن کے بڑھیا مال کو نہ لینا، اور ہان مظلوم کی بددعا سے ڈرتے رہنا کہ اُس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہین [1]

---

[1] صحیح بخاری باب مذکور جلد دوم ص ۶۴۳،

تالیف قلب | تبلیغ و دعوت کے سلسلہ مین اسلام نے ایک اور طریقہ بھی پیش کیا ہے جس کو تالیف قلب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ (توبہ - ۸) اس کے لفظی معنی ہین، "دلون کو ملانا" اور اس سے مقصود اس شخص کے ساتھ جس کو اسلام کی طرف مائل کرنا ہو، لطف و محبت امداد و اعانت، اور غمخواری و ہمدردی کرنا ہے کیونکہ انسان طبعًا شریفانہ جذبات کا ممنون ہوتا ہے اور یہ ممنونیت عناد اور ضد کے خیالات کو دور کر کے قبولِ حق کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے لوگوں کو اپنے اس اعجاز سے اسلام کا حلقہ بگوش بنا لیا تھا، چنانچہ مکہ کے بعض رئیس اسی جذبہ سے متاثر ہو کر اسلام لائے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین کی غنیمت کا سارا مال ان ہی مین تقسیم کر دیا تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ پھر حق کے خلاف اُن کی گردنین نہ اٹھ سکین؛ صفوانؓ جو اسلام کے سخت مخالف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت بغض رکھتے تھے؛ وہ کہتے ہیں کہ "مجھکو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا، جتنا دیا، اور مجھے اُن سے سخت بغض تھا، لیکن آپ کے ان احسانات نے مجھے ایسا متاثر کیا کہ اب میری نگاہ مین اُن سے زیادہ کوئی پیارا نہیں"، ایک دفعہ ایک بدو نے آکر کہا کہ ان دونون پہاڑون کے درمیان بکریوں کے جتنے ریوڑ ہین، مجھکو عنایت کیجئے، آپ نے اُس کو وہ سب دیدیے، یہ فیاضی دیکھکر ایسا اُس پر اثر پڑا کہ اُس نے اپنے پورے قبیلہ سے جا کر کہا "بھائیو! اسلام قبول کرو، محمد اتنا دیتے ہین کہ اُن کو اپنے فقر و افلاس کا ڈر ہی نہیں رہتا"[۵۲]

ایک یہودی کا لڑکا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتا تھا، وہ بیمار پڑا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۵۱] صحیح مسلم باب جود صلی اللہ علیہ وسلم جلد ۲ ص ۲۹۰ مصر [۵۲] ایضًا،

اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، اور جاکر اس کے سرہانے بیٹھے، پھر فرمایا کہ لڑکے اسلام قبول کرلے، اُس نے مستفسرانہ نگاہ سے باپ کیطرف دیکھا، اس نے کہا ابوالقاسم (آپ کی کنیت) کی بات مان لے، چنانچہ وہ مسلمان ہوگیا، اور جب آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم وہاں سے اٹھے تو زبانِ مبارک پر یہ فقرہ تھا کہ اُس خدا کی حمد جس نے اس کو دوزخ سے بچالیا[1]

دعوتِ عقل | اسلام نے تبلیغ و دعوت کے جو اصول بتائے ہیں، اُن کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ایک استدلالی، اور عقلی مذہب ہو کہ بغیر اس کے حکمت و دانشمندی، وعظ و نصیحت اور جدال و مناظرہ کی بنیاد قائم نہیں رہ سکتی، اس بنا پر مذاہبِ عالم کی تاریخ میں نبوتِ محمدیؐ یہ سب سے پہلی ربانی آواز ہے، جس نے حاکمانہ قانون (توراۃ) یا صرف لفظوں کے الٹ پھیر (انجیل) یا راجاؤں کے احکام (وید) کے بجائے عقلِ انسانی کو مخاطب کیا، غور و فکر کی دعوت دی، فہم و تدبر کا مطالبہ کیا، اُس نے اپنی ہر تعلیم کے ساتھ اپنی تعلیم کی خوبی، مصلحت اور حکمت خود ظاہر کی، اور بار بار مخالفوں کو آیاتِ الٰہی میں غور و فکر کی ہدایت کی، فرمایا،

قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ	کہہ اے پیغمبر کہ تمہارے پاس کوئی (یقینی)
لَنَا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ	علم ہے کہ اس کو تم ہمارے لئے ظاہر کرو تم تو
اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ، قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ	گمان ہی کے پیچھے چلتے ہو اور تم تو اٹکل ہی
الْبَالِغَةُ، ج (انعام - ۱۸)	کرتے ہو، کہہ کہ اللہ ہی کی ہے پہنچتی ہوئی دلیل

نیز ارشاد ہوا،

[1] صحیح بخاری کتاب الجنائز

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّ	تاکہ جو ہلاک ہو وہ دلیل سے ہلاک ہو اور
يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ط وَاِنَّ اللّٰهَ	جو جیتا رہے، وہ دلیل سے جے، اور اللہ
لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (انفال - ۵)	ہے سننے والا جاننے والا،

غفلت شعار کافروں کی نسبت فرمایا،

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ	اور آسمانوں مین اور زمین میں (خدا کی توحید
الْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ	کی) کتنی نشانیاں (دلیلیں) ہیں، جن پر
عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ، (یوسف - ۱۲)	وہ گذر جاتے ہیں، اور اُن پر غور نہین کرتے

غور و فکر کرنے والے اہلِ ایمان کی تعریف مین فرمایا،

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	بے شبہہ آسمانوں اور زمین کی بناوٹ اور
وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ	رات، اور دن کے الٹ پھیر میں عقلمندوں
لِّاُولِي الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ	کے لئے نشانیاں ہیں، جو اللہ کو کھڑے بیٹھے
اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ	اور اپنی کروٹوں پر یاد کرتے ہین، آسمانون
وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ	اور زمین کی بناوٹ مین غور کرتے ہیں (اور
الْاَرْضِ ج رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا	کہتے ہین کہ) اے ہمارے پروردگار تونے
بَاطِلًا ، (آلِ عمران - ۲۰)	(یہ عالم) بیکار نہیں بنایا،

اس سے زیادہ عقلی، اور علمی استدلال کی دعوت اور کیا ہوگی، مگر بہر حال یہ خارجی استدلال تھا، اندرونی استدلال کی بھی اس نے دعوت دی، فرمایا،

وَفِی اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (ذاریات ۱) | اور خود تمہارے اندر نشانیاں ہیں تم دیکھتے نہیں

صحیفۂ محمدی کی نسبت ہر جگہ یہ الفاظ فرمائے،

تَبْصِرَۃً وَّذِکْرٰی لِکُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ (ق - ۱) | یہ بصیرت اور نصیحت ہے، ہر رجوع ہونیوالے بندہ کے لئے،

ھٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّکُمْ (اعراف ۲۴) | یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے بصیرتیں ہیں

ھٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ (جاثیہ ۲) | یہ لوگوں کے لئے بصیرتیں ہیں،

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ (نساء - ۱۱) | کیا یہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے،

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا، (محمد - ۳) | کیا یہ قرآن میں غور نہیں کرتے، یا دلوں پر کچھ تالے ہیں،

وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ، (یٰسین - ۱) | حکمت والے قرآن کی قسم،

تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْحَکِیْمِ (یونس و لقمان) | یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں،

نہ صرف اسی قدر بلکہ خدا کا وجود، توحید، رسالت، قیامت، جزا و سزا، عبادت، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، اخلاق وغیرہ ہر تعلیم کی تلقین کرتے وقت اس نے اس کی صداقت کی عقلی دلیلیں پیش کی ہیں، اور ہر مسئلہ کی مصلحتیں اور حکمتیں علی الاعلان ظاہر کی ہیں، آئندہ صفحوں میں ہر قدم پر اس کی دلیلیں آپ کو ملیں گی،

مذہب میں زبردستی نہیں یہ وہ حقیقت ہے، جس کی صدا آج ہر در و دیوار سے آتی ہے، لیکن شاید لوگوں کو معلوم نہیں کہ دنیا میں اس حقیقت کا اعلان سب سے پہلے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ہی کی زبانِ مبارک سے ہوا، اور ظاہر ہے کہ جو مذہب اپنی اشاعت کے لئے صرف دعوت وتبلیغ
کا راستہ رکھتا ہو جس نے اس کے اصول بتائے ہوں جس نے عقل وبصیرت، اور فہم وتدبر کا ہر معاملہ
مین لوگون سے مطالبہ کیا ہو، ہر قدم پر عقلی استدلال اور مصلحت وحکمت کا اظہار کیا ہو، وہ کیونکر جبر
اکراہ اور زبردستی کے طریقہ کو اختیار کر سکتا تھا، اسلام نے نہ صرف یہ کہ مذہب کی جبری اشاعت کو
ناپسند کیا، بلکہ اس کا فلسفہ بتایا کہ مذہب زبردستی کی چیز نہیں، اسلام مین مذہب کا اولین جزایمان
ہے، ایمان یقین کا نام ہے اور دنیا کی کوئی طاقت کسی کے دل مین یقین کا ایک ذرہ بھی بزور پیدا نہین
کر سکتی، بلکہ تیز سے تیز تلوار کی نوک بھی کسی لوحِ دل پر یقین کا کوئی حرف نقش نہیں کر سکتی، فرمایا،

لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ، (بقرہ - ۳۴)	دین میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی،

یہ وہ عظیم الشان حقیقت ہے جس کی تلقین انسانون کو صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے ذریعہ سے ہوئی، دوسری جگہ فرمایا،

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ، (کہف - ۴)	اور کہدے کہ حق تمھارے پروردگار کی طرف سے ہے تو جو چاہے قبول کرے، اور جو چاہے انکار کرے،

ایمان اور کفران دو میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے پر کوئی زبردستی نہین ہے عقل و
بصیرت والے اسے خود قبول کرین گے، اور نافہم اس سے محروم رہین گے، اسی لئے بار بار یہ تصریح
کیا گیا کہ رسول کا کام لوگون تک خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے، زبردستی منوانا نہیں،

اِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ	ہمارے رسول پر تو یہی فرض ہو کہ وہ صاف
(مائدہ - ۱۲)	صاف ہمارا پیغام پہنچا دے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو قریش کے اعراض و مخالفت سے حد درجہ غمگین تھے تسکین دی گئی

اِنْ عَلَیْکَ اِلَّا الْبَلٰغُ (شوریٰ - ۵)	اے پیغمبر تیرا فرض صرف پیام پہنچا دینا ہے،
اِنَّمَا اَنْتَ مُذَکِّرٌ. لَسْتَ عَلَیْهِمْ	اے پیغمبر تو تو نصیحت کرنے والا ہے، تو اُن پر
بِمُصَیْطِرٍ، (غاشیہ - ۱)	داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا،
فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَا اَرْسَلْنٰکَ عَلَیْهِمْ	پھر اگر وہ اسلام کی دعوت سے انکار کریں تو اے
حَفِیْظًا، اِنْ عَلَیْکَ اِلَّا الْبَلٰغُ،	پیغمبر ہم نے تجھکو اُن پر گماشتہ بنا کر نہیں بھیجا،
(شوریٰ - ۵)	تیرے ذمہ صرف پیغام پہنچا دینا ہے،

کسی دین کو زبردستی پھیلانا اسلام کی نگاہ مین ایک ایسا فعل ہی جس سے رسول کی شان کو اُس نے بہت بلند سمجھا ہے، فرمایا،

وَلَوْ شَاءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی	اگر تیرا پروردگار چاہتا کہ (لوگون کو زبردستی
الْاَرْضِ کُلُّهُمْ جَمِیْعًا، اَفَاَنْتَ تُکْرِهُ	مومن بنادے) تو زمین کے سب لوگ ایمان
النَّاسَ حَتّٰی یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ،	لے آتے تو کیا اے پیغمبر تو لوگوں پر زبردستی کریگا
(یونس - ۱۰)	کہ وہ ایمان لے آئین،

اسلام مین حق کی حمایت اور باطل کی شکست کے لئے لڑنا جائز ہی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مجبوراً لڑنا پڑا، اس سے مخالفوں نے یہ نتیجہ نکالا ہی کہ یہ لڑائی صرف اسلئے تھی کہ اسلام کو تلوار

کے زور سے لوگوں میں پھیلایا جائے، حالانکہ قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں کسی کافر کو زبردستی مسلمان بنانے کا حکم ہو، اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں کوئی واقعہ ایسا ہے جس میں کسی کافر کو زبردستی تلوار کے زور سے مسلمان بنایا گیا ہو، بلکہ اگر ہے تو یہ ہے،

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ	اور اگر (لڑائی میں) کوئی مشرک تجھ سے پناہ کا
فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ	طالب ہو تو اس کو پناہ دے یہاں تک کہ وہ
اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ	خدا کا کلام سُن لے، پھر اس کو وہاں پہنچادے
لَّا يَعْلَمُوْنَ (توبہ - ۱)	جہاں وہ بخوف ہو کہ یہ بے علم لوگ ہیں،

یہ نہیں کہا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائے، اس کو پناہ نہ دو، بلکہ یہ فرمایا کہ اس کو پناہ دیکر اس کی جائے پناہ تک پہنچا دیا جائے، اور اس کو کلامِ الٰہی سُنایا جائے تاکہ اس کو غور و فکر کرنے کا موقع ملے، ظاہر ہے کہ جو مشرک اس طرح مسلمان ہوگا، اُس کے تبدیلِ مذہب کا محرک تلوار کے بجائے کوئی اور چیز (پیامِ حق) ہوگی،

حقیقت یہ ہے کہ جہاد کی مشروعیت، مظلوموں کی حمایت، جلاوطنوں کے حق دلانے حج کا راستہ کھولنے، اور عقیدہ کی آزادی حاصل کرنے کے لئے ہوئی تھی، جیسا کہ اس کا مفصل بیان کتاب میں کہیں آئیگا، قرآن کی اس آیت میں،

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ	اور ان کافروں سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ نہ
وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (انفال ۵)	رہے اور دین پورا اللہ کے لئے ہو جائے،

"فتنہ" سے مراد عقیدہ اور مذہب کی آزادی نہ ہونا ہے حضرت ابن عمرؓ صحابہ کی خانہ جنگیوں میں

شریک نہ تھے، ایک شخص نے اُن سے آکر کہا کہ کیا خدا نے فتنہ کے مٹانے کے لئے لڑنے کا حکم نہیں دیا اور اوپر کی آیت پیش کی، انھوں نے جواب دیا کہ "ہم یہ فرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ادا کر چکے، جب مسلمان کم تھے، تو انسان اپنے دین کے سبب فتنہ مین مبتلا کیا جاتا تھا، اس کو لوگ مار ڈالتے تھے، یا قید کر لیتے تھے، یہانتک کہ مسلمانون کی تعداد بہت بڑھ گئی، تو پھر فتنہ باقی نہ رہا"[1]

میدانِ جنگ میں تبلیغ۔ ناواقفون نے ایک اور مسئلہ کی بھی غلط تعبیر کی ہے، اسلام کی امن پسندی نے یہ قانون بنایا ہے کہ اگر کسی مخالف قوم سے لڑائی آپڑے، تو میدانِ جنگ میں پہنچ کر بھی صلح و آشتی کا خیال دور نہ کیا جائے، بلکہ تلوار کے فیصلہ سے پہلے دو باتین اُن کے سامنے پیش کرنی چاہئیں، اول کہ تم کلمۂ شہادت پڑھکر مسلمان ہو جاؤ، اور لڑائی سے ہاتھ اٹھا کر ہمارے بھائی بنجاؤ، اگر ایسا کرو تو تم دین، حکومت اور عزت کے تمام حقوق مین ہمارے برابر ہو جاؤ گے، اگر یہ منظور نہ ہو تو اپنے مذہب پر قائم رہ کر ہماری سیاسی حکومت کو قبول کر لو، اس حالت مین تمھاری حفاظت کی ہر قسم کی ذمہ داری ہمارے سر ہوگی، اگر وہ ان دو میں سے کوئی بات قبول کر لیں تو اُن سے لڑنا جائز نہیں، اسلام کی تاریخ میں ایسے کتنے منظر ہین کہ کسی دشمن سے دشمن قوم نے اسلام یا محض اطاعت قبول کر لی ہے، اور خونریزی رُک گئی ہے، اور لڑائی کا میدان محبت و آشتی کی بزم بن گئی ہے،

یہ قانون جو سر تا پا امن پسندی، سلامت طلبی اور خونریزی سے بچنے کی آخری کوشش پر مبنی ہے، اس کو مخالفون نے اس صورت مین پیش کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگون کو تلوار کے زور سے مسلمان بنانے کی تعلیم دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جب کسی فوج کو متعین کرتے تو

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم تفسیر انفال صفحہ ۶۷۰

سردار کو یہ ہدایت فرماتے،

"جب تو مشرکوں میں سے کسی دشمن قوم سے مقابل ہو تو اس کو تین باتوں میں سے کسی ایک بات کے قبول کرنے کی دعوت دے، اُن میں سے جو بات بھی وہ مان لے اُس کو قبول کرلے اور اس پر حملہ کرنے سے رُک جا، اُس کو اسلام کی دعوت دے، اگر وہ قبول کرلے تو پھر اس سے رُک جا، اس کے بعد اس سے خواہش کر کہ وہ مسلمانوں کے ملک میں آجائے تو اُس کا وہی حق ہوگا جو مسلمانوں کا ہے، اگر وہ نہ مانے تو اس کی حالت بدوی مسلمانوں کی سی ہوگی، قانون اس پر مسلمانوں کا جاری ہوگا، لیکن غنیمت اور فئی میں اس کا حصہ نہ ہوگا، جب تک وہ جہاد میں شرکت نہ کرے، اگر وہ اسلام قبول نہ کرے، تو اس کو جزیہ دیکر ذمی بننے کو کہہ، اگر وہ اس کو مان لے تو اس سے بھی رُک جا، اگر وہ اس کو بھی نہ مانے تو پھر خدا کی مدد مانگ، اور لڑائی شروع کردے[۱]"

یہ وہ اصولِ جنگ ہے جس سے خونریزی کی روک تھام مقصود تھی، نہ یہ کہ کسی کو مجبور کرکے بزورِ شمشیر مسلمان بنا لینا، صحابۂ کرامؓ کے زمانہ میں ایرانیوں سے جب لڑائی شروع ہوئی تو مسلمانوں نے تین روز تک میدانِ جنگ میں تلوار نہیں اٹھائی، حضرت سلمان فارسیؓ تین روز تک اُن کو سمجھاتے رہے، اور کہتے رہے کہ "میں تمہاری قوم سے ہوں لیکن دیکھتے ہو کہ عرب میرے زیرِ فرمان ہیں، اگر تم بھی مسلمان ہو جاؤ تو تم کو بھی وہی حقوق ملیں گے جو ہمارے ہیں، اور اگر تم اپنے ہی مذہب پر رہنا چاہو تو جزیہ دیکر رہ سکتے ہو، لیکن محکوم ہو کر رہو گے[۲]" اس سے معلوم ہوا کہ جنگ میں

---

[۱] صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر [۲] جامع ترمذی ابواب السیر

دشمن کو بھی تبدیلِ مذہب پر مجبور نہین کیا گیا، بلکہ اس کے سامنے دوسری راہیں بھی کھلی تھین،

ثمامہ بن اثال قبیلۂ بنی حنیفہ میں سے تھے، اور یمامہ کے رئیس تھے، یہ وہ قبیلہ ہو جو آخر تک سرکش رہا، اور اسی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر زمانہ مین مسیلمہ پیدا ہوا تھا، ثمامہ اتفاق سے مسلمانون کے ایک لشکر کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے، اور مدینہ لاکر مسجد نبوی کے کھمبے میں باندھ دیئے گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لئے تشریف لائے تو پوچھا کہ ثمامہ تمھاری کیا رائے ہے؟ جواب دیا، محمد! میری رائے اچھی ہے، اگر مجھے قتل کروگے تو ایک خون والے کو قتل کروگے، اور اگر احسان کروگے تو ایک شکر گذار پر احسان ہوگا، اور اگر زرِ فدیہ چاہتے ہو تو جو مانگو گے دیا جائے گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہین فرمایا، پھر اسی طرح دوسرے دن سوال وجواب ہوا، پھر تیسرے دن ہوا، تیسرے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ثمامہ کو چھوڑ دو، لوگوں نے کھولدیا، وہ رسی سی کھل کر آزاد ہو گئے، مگر سچائی کی زنجیر اُن کے پاؤن مین پڑ گئی، مسجد نبوی کے قریب ایک نخلستان مین جاکر غسل کیا، اور پھر مسجد میں آکر کلمۂ شہادت[1] پڑھ کر مسلمان ہو گئے، کیا کسی کو زبردستی مسلمان بنانے کے لئے اس سے بہتر موقع مل سکتا تھا؟ بدر کے قیدی گرفتار ہو کر آئے، لیکن اُن سے یہ نہین کہا گیا کہ تلوار یا اسلام، اسی طرح جنگ کے دوسرے قیدیون کیساتھ بھی یہی برتاؤ رہا، قرآن پاک نے جنگ کے قیدیون کے متعلق کہا فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً (محمد - ۱) لڑائی ختم ہونے کے بعد ان قیدیون کو احسان دھر کر چھوڑ دو، یا فدیہ لے کر چھوڑ دو" یہ ارشاد نہ ہوا کہ اسلام یا تلوار!

غزوۂ خیبر میں مسلمان روزانہ بعض قلعوں پر حملہ کرتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں بالآخر شیرِ خدا

---

[1] صحیح بخاری وسنن ترمذی ربط الاسیر [2] صحیح بخاری غزوۂ خیبر،

علی مرتضیٰؓ کو حکم ہوتا ہے کہ فوج لیکر جائین، وہ پوچھتے ہین یا رسول اللہ کیا مین اُن سے لڑون، یہانتک کہ وہ ہماری طرح ہو جائین؟ فرمایا، آہستگی سے روانہ ہو، یہان تک کہ اُن کے میدان میں پہنچ جاؤ، پھر اُن کو اسلام کی طرف بلاؤ، اور اس میں اُن کا جو حق ہوگا، وہ اُن کو بتاؤ خدا کی قسم اگر ایک شخص کو بھی خدا تمھارے ذریعہ سے ہدایت دیدے تو اُس سے بہتر ہے کہ تمھاری ملکیت مین سُرخ اونٹ ہون[1]" لیکن خیبر کے یہودنے اسلام کا مذہب قبول نہین کیا، بلکہ اسلام کی حکومت قبول کرلی اور مصالحت ہوکر تلوار نیام مین کرلی گئی،

اسی طرح ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان پر ہتھیار اٹھانا جائز نہین، بلکہ کفر کا موجب ہے کفار کو مسلمانون کا یہ طرزِ عمل معلوم تھا، اکثر لڑائیون مین جب مشرک حملہ آور اپنی کمزوری محسوس کرتا تھا تو اپنی جان بچانے کے لیے کلمۂ توحید پڑھ دیتا تھا، اور ایک بپھرے ہوئے مسلمان کو مجبوراً اپنے غصہ کو ضبط کرکے، ہاتھ روک لینا پڑتا تھا،

ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے پوچھا کہ اگر لڑائی میں میرا حریف اپنی تلوار سے میرا ہاتھ اڑادے اور جب میرے حملہ کی باری آئے تو درخت کی آڑ پکڑکر کہے" مین مسلمان ہوتا ہون" تو اے خدا کے رسول میں کیا کرون، اس کو قتل کردون؟ فرمایا نہین، اس کا قتل جائز نہیں، عرض کی یارسول اللہ میرا ہاتھ اُس نے کاٹ ڈالا، فرمایا، پھر بھی اس کا قتل جائز نہین کہ اگر تم نے اب اس کو قتل کیا تو وہ وہ ہوگیا جو تم اُس کے قتل سے پہلے تھے، اور تم وہ ہو جاؤگے جو وہ اس اقرارِ توحید سے پہلے تھا[2] حضرت اسامہ بن زیدؓ آپکے بڑے چہیتے خادم تھے، وہ ایک فوجی دستہ کے سپہ سالار بنا کر ایک لڑائی

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ خیبر [2] صحیح مسلم کتاب الایمان،

میں بھیجے گئے، جب گھمسان کا رن پڑا تو ایک کافر اُن کی زد میں آیا، انھوں نے حملہ کا قصد کیا تو وہ
لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پکار اٹھا، ایک انصاری جو پہلے اُس پر جھپٹے تھے، وہ تو رک گئے، مگر اسامہ رضؓ
نے اس کافر کے اس کلمہ پڑھنے کو اس کی جان بچانے کے فریب پر محمول کر کے کچھ خیال نہ کیا، اور
نیزہ سے اس کا کام تمام کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر معلوم ہوئی تو اسامہؓ سے سخت آزردہ
ہوئے، اسامہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) اُس نے صرف تلوار کے ڈر سے کلمہ پڑھا
تھا، فرمایا اور کتنا بلیغ فقرہ فرمایا "اے اسامہ! تم نے کیا اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا" پھر برابر
یہ فرماتے رہے، اے اسامہ تم قیامت میں اس کے لا الٰہ الا اللہ کا کیا جواب دو گے، اسامہ کہتے ہیں
کہ مجھ کو اتنی ندامت تھی کہ میں نے دل میں آرزو کی کہ کاش میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا،[۱]

دیکھو کہ واقعہ کی تصویر کتنی الٹ دی گئی ہے، واقعہ تو یہ تھا کہ اپنی حملہ آورانہ لڑائی کے
گھمسان میں بعض کفار و مشرکین جن کو یہ معلوم تھا کہ کسی کلمہ گو کو مسلمان اپنے مذہب کے حکم کے موجب
قتل نہیں کرتے، جب وہ مسلمانوں کی زد میں پڑتے تھے، تو اپنی جان بچانے کے لئے فوراً کلمہ شہادت
پڑھ دیتے تھے، اور بیان اس صورت میں کیا جاتا ہے کہ اسلام نے کفار کو تلوار کی نوک سے کلمہ
پڑھنے پر مجبور کیا، یہ صداقت ہے؟

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور اعلان ہے، جس کو اکثر غلط معنی میں پیش
کیا گیا ہے، آپ نے فرمایا امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الٰہ الا اللہ[۲] مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ میں
لوگوں سے اس وقت تک لڑائی کروں جب تک وہ توحید کا اقرار نہ کریں اور جب وہ اقرار

[۱] صحیح مسلم کتاب الایمان ص ۵۲، مصر،

کرلین تو انھون نے اپنے جان و مال کو مجھ سے بچا لیا، اور اُن کی نیت کی پرسش خدا کا کام ہے۔ اس حدیث کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ مسلمان سے لڑنا ناجائز ہنین لیکن کسی غیر مسلم قوم سے بھی لڑنا اُسی وقت تک جائز ہے جب تک وہ توحید کا اقرار نہ کرے اور جب اُس نے یہ کرلیا تو پھر اس سے بھی لڑنا روا ہنین، خواہ وہ حملہ کے ڈر سے لاالہ الااللہ پڑھے یا سچے دل سے اُس نے یہ اقرار کیا ہو اُس کی تحقیق کہ کس نیت سے اُس نے کلمہ پڑھا، انسان کا فرض ہنین، خدا کا ہے، یہ بالکل ایک مصالحانہ اعلان ہے لیکن لوگ اس کو اس معنی مین پیش کرتے ہیں کہ گویا اسلام کا حکم یہ تھا کہ مسلمان دیوانہ وار تلوار لئے پھرتے اور جس کو پاتے، اس کو ڈرا دھمکا کر کہتے کہ کلمہ پڑھو، ورنہ سر قلم کر دین گے، غور کرو، اگر یہ حکم ہوتا تو قیدی اقرارِ توحید کئے بغیر اس آسانی سے چھوڑے جاتے اور ہاری ہوئی قومون سے اسلام ہنین، صرف چند درہم کا جزیہ لیکر اُن کو آزاد کر دیا جاتا؟ اور کیا مسلمانون کو یہ اجازت ملتی کہ

وَاِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَهَا (انفال - ۸)

اگر کفار کا محارب فریق صلح کے لئے جھکے تو تو بھی جُھک جا،

بلکہ اس کے بجاے یہ حکم ہوتا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائین اُن سے صلح نہ کرنا، اور نیز کیا مسلمانون کو یہ حکم ہوسکتا تھا کہ

وَاِنۡ اَحَدٌ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ اسۡتَجَارَكَ فَاَجِرۡهُ حَتّٰى يَسۡمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبۡلِغۡهُ مَاۡمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَوۡمٌ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ، (توبہ - ۱)

اور اگر (لڑائی کے میدان میں) مشرکون میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے، یہانتک کہ وہ خدا کا کلام سُن لے پھر اُس کو اُس کے امن کی جگہ پہنچا دے، یہ اس لئے

بلکہ یہ ہوتا کہ پناہ ملنے اور کلام الٰہی سننے کے بعد وہ مسلمان نہ ہو تو اس کو اس کی امن کی جگہ پہنچانے کے بجائے اس کو قتل کر کے جہنم میں پہنچا دو، مگر ایسا نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی امن پسندی اور رواداری کے مفہوم کو کس طرح الٹ کر بیان کیا جاتا ہے، حالانکہ اسلام نے ان مشرکوں سے بھی جو ہمارے کسی دوست مشرک قبیلہ کے دوست ہوں، اور ہم سے صلح و آشتی کے ساتھ رہنا چاہتے ہوں لڑنے کو منع کیا ہے،

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَ	تو اگر وہ تم سے کنارہ پکڑیں، پھر نہ لڑیں اور
اَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ	تمہارے سامنے صلح کی طرح ڈالیں تو اللہ نے
اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۔ (النساء ۱۲)	تم کو اُن پر حملہ کرنے کی راہ نہیں دی،

یعنی پھر اُن پر تلوار اٹھانا درست نہیں، حالانکہ اگر اسلام کی مذہبی جنگجوئی کے وہی معنی ہوتے کہ یا تلوار یا اسلام" تو کیا اس امن پسندی اس صلح جوئی اور اس ترکِ جنگ کی صورت ممکن ہو سکتی تھی

مسلح تبلیغی جماعتیں غلط فہمی پھیلانے کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ تبلیغ و دعوت کیلئے جو جماعتیں ملک میں بھیجی جاتی تھیں، وہ مسلح ہوتی تھیں لیکن یہ حقیقت بھلا دی جاتی ہے کہ یہ عرب کا واقعہ ہے جہاں کوئی منتظم اور باضابطہ حکومت نہ تھی جس پر تمام رعایا کی حفاظت کی ذمہ داری ہو، ایک ایک آدمی میں ایک ایک قبیلہ اپنی اپنی الگ الگ ریاست قائم کئے ہوئے تھا، اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے برسرپیکار تھا، راستوں پر رہزنوں اور ڈاکوؤں کا قبضہ تھا جن سے اکا دکا آدمی کا صحیح و سالم بچنا ناممکن تھا، اسی لئے جب کہیں کوئی تبلیغی مہم بھیجی جاتی تھی، تو بدامنی کے ملک میں رہنے والوں کے عام دستور کے مطابق وہ اپنی ممکن حفاظت کے لئے مسلح جاتی تھی، اور اس بات کی دلیل کہ اس مسلح جماعت کا تبلیغ و دعوت کے سوا کوئی مقصد نہ تھا

اس سے ظاہر ہی کہ اُن کی تعداد تھوڑی ہوتی تھی، جو فوجی حملہ کے لئے کافی نہین ہوسکتی تھی،

غزوۂ بدر کے بعد جب قریش کا زور ٹوٹ گیا، اور ملک مین اسلام بھی ایک قوت شمار ہونے لگا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض بعض قبیلوں کی درخواست پر مسلمانون کی مختلف جماعتون کو تبلیغ و تعلیم کے لئے ادھر ادھر بھیجا، تب بھی وہ اکثر راستہ مین جان سے ماری گئین، واقعۂ رجیع مین ستر داعیون کا مارا جانا، واقعۂ بیر معونہ مین چھ یا دس داعی مسلمانون کا قتل ہونا، سریۂ ابن ابی العوجا مین پچاس مسلمانون کی شہادت، واقعۂ ذات اطلاح مین چودہ داعی مسلمانون کا تیرون سے مارا جانا عروہ بن مسعود ثقفی کا تیرون سے چھد جانا اس دعویٰ کی شہادت ہی،

تبلیغ و دعوت کی تنظیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ معظمہ مین تشریف فرما رہے بنفس نفیس اس فرض کو انجام دیتے رہے، ایک ایک کے پاس جاتے، اور حق کا پیغام سناتے، شہر سے نکل کر مکہ کے آس پاس جاتے، اور آنے جانے والون کو بشارت سناتے، مکہ سے نکل کر طائف گئے، اور وہان بھی اپنا فرض ادا کیا، یہ بھی خدا کی مصلحت تھی کہ اُس نے اپنے آخری دین کا مرکز مکہ معظمہ کو قرار دیا، جو عرب کا مرکزی شہر تھا، اور حج کے موسم مین تمام قبیلے خود یہان آجاتے تھے، آپ سالہا سال حج کے موسم مین ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے، اور خدا کی دعوت پیش کرتے، اسی سالانہ تبلیغ سے اسلام کو وہ جماعت ہاتھ آئی جس کا نام انصار ہی،

الغرض ان تبلیغی سرگرمیوں سے مکہ مین سینکڑون آدمی مسلمان ہوچکے تھے، مگر قریش کے ظلم سے وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ سے وہ حبشہ کی طرف روانہ ہوئے، اس سفر کی مصلحت بھی عجیب و غریب تھی، ان مظلوم مسلمانون کی ہجرت نے یہ موقع بہم پہنچایا

کہ وہ اس مسافرت میں جہان جہان سے گذرے اسلام کی آواز پہنچاتے گئے، اور اس طرح یمن اور حبشہ دونون ملکوں میں اسلام کی تحریک روشناس ہوئی،

مکہ مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عام مسلمانون مین سب سے پہلے مبلّغ اور داعیِ حق حضرت ابوبکرؓ تھے، مکہ کے بہت سے معزز گھرانون کے پرجوش نوجوان انہی کی تبلیغ سے اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ حضرت ابوبکرؓ ہی کی کوششون سے دائرۂ اسلام مین آئے، حضرت ابوبکرؓ کے بعد اسلام کے دوسرے مبلّغ حضرت مصعب بن عمیرؓ ہین جن کے مؤثر وعظون کو سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے ہی مدینہ کے گھرانے کے گھرانے توحید کے پرستار ہوگئے تھے،

مدینہ منورہ آکر اسلام نے امن و اطمینان کی سانس لی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان نومسلمون کی تعلیم کے لئے جو اطرافِ ملک سے دارالاسلام مین آتے تھے، نیز ملک کے مختلف گوشون میں اسلام کی تبلیغ کے لئے ایک جماعت قائم کی جس کا نام عام طور سے اصحابِ صفہ (چبوترہ والے) مشہور ہے، اس میں بعض اوقات سو سے زیادہ آدمی داخل رہے ہین، یہ لوگ ملک میں اسلام کی دعوت کے لئے بھیجے جاتے، اور خود نومسلموں کو تعلیم دیتے، بیرمعونہ میں ستر کے قریب جو داعی اور مبلّغ راہ میں بید ردانہ قتل ہوئے تھے، وہ اسی جماعت کے ارکان تھے،

ان کے علاوہ وہ اکابر صحابہ جو وقتاً فوقتاً مختلف ملکون، بادشاہون قومون اور قبیلون مین اسلام کی دعوت لیکر پھیلے، احادیث و سیر کی کتابون مین ان کے نام متفرق طور سے ملتے ہیں، میں نے تھوڑی سی کوشش سے اس قسم کے پینتیس ۳۵ صحابیون کے نام جمع کئے ہین جنھون نے

از خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اس فرض کو انجام دیا اُن کے نام یہ ہیں، ابو ذرغفاریؓ، طفیل ابن عمرو دوسیؓ، جعفر طیارؓ، عمرو بن عبسہ سلمیؓ، ضماد بن ثعلبہؓ، خالد بن ولیدؓ، علی بن ابی طالبؓ، مہاجر بن ابی امیہؓ، زیاد بن لبیدؓ، خالد بن سعیدؓ، عدی بن حاتمؓ، علاء بن حضرمیؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ، معاذ بن جبلؓ، جریر بن عبد اللہ بجلیؓ، وحیہ کلبیؓ، عمرو بن اُمیہ ضمریؓ، مغیرہ بن شعبہؓ، عمرو بن العاصؓ، وبر بن یحنسؓ، عروہ بن مسعود ثقفیؓ، عامر بن شہرؓ، منقذ بن حبانؓ، ثمامہ بن اثالؓ، محیصہ بن مسعودؓ، احنفؓ، ابوزید انصاریؓ، عمرو بن مرہؓ، عیاش بن ربیع مخزومیؓ، واثلہ بن اسقعؓ، عبد اللہ بن حذافہ سہمیؓ، حاطب بن ابی بلتعہ، سلیط بن عمرو بن عبد شمس، شجاع بن وہب اسدیؓ ان ہی مبلغون اور داعیون اور قاصدون کی پکار تھی جس نے یمن، یمامہ، بحرین، حجاز، نجد، غرض پورے عرب کو بیدار کردیا، اور عرب سے باہر ایران، شام، مصر، حبش، ہر جگہ اسلام کا پیغام پہنچ گیا،

مبلغون کی تعلیم و تربیت | سیرۃ کی دوسری جلد کے آغاز مین اشاعت اسلام کی تاریخ، اور دعاۃ معلمین کی تعلیم و تربیت کا حال لکھا جاچکا ہے، سلسلۂ بیان کے لئے یہان صرف اس قدر کہنا ہے کہ ان کو سب سے پہلے قرآن پاک کی سورتین یاد کرائی جاتی تھین، لکھنا پڑھنا بھی سکھایا جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شب و روز کے ارشادات سننے کا موقع بھی اُن کو ملتا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تبلیغ کا درس اوّلین قرآن اور صرف قرآن تھا،

دعوت بالقرآن | قرآن پاک اسلام کے دعوی اور دلیل دونون کا مجموعہ ہے اور وہی اس کے مذہب کا صحیفہ ہے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے مبلغ صحابہ بھی تبلیغ و دعوت مین صرف قرآن کی سورتین پڑھ کر سناتے تھے، اور جہان اُن کو اس کا موقع مل جاتا، وہان اسکی تاثیر اپنا

کام کرجاتی تھی، اور یہ فرض خود قرآن نے اپنا آپ قرار دیا تھا، اسکی تبلیغ کے لئے جہاد کی ضرورت تھی، مگر اس جہاد کا ہتھیار لوہے کی تلوار نہین، بلکہ قرآن کی تلوار تھی جس کی ضرب کی روک خود اور سپر سے بھی ممکن نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو اسی تلوار سے جہاد کا حکم دیا، فرمایا،

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ	تو اے پیغمبر منکرون کا کہنا مان، اور اس
بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (فرقان-۵)	قرآن سے اُن کے ساتھ بڑے زور سے جہاد کر،

اس پیغام الٰہی کے زمین مین اترنے کی غرض ہی یہ تھی کہ وہ خدا کے بھولے ہوئے بندون کو اُن کا عہد یاد دلائے، فرمایا،

فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ	تو اے پیغمبر اُن کو جو میری دھمکی سے ڈرتے ہین
وَعِيْدِ، (ق - ۳)	ہون قرآن کے ذریعہ سے یاد دلا،

قرآن رحمتِ عالم کا پیام عمومی ہے، اور یہی اس کے نزول کی غرض و غایت ہے فرمایا

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ	برکت والا ہو وہ جس نے حق و باطل میں
عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ	امتیاز کرنے والی کتاب اپنے بندون پر اسلیے
نَذِيْرًا ہ (فرقان - ۱)	اتاری تاکہ وہ تمام دنیا کو بیدار اور ہشیار کرے

یہی قرآن اسلام کی طاقت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی ہتھیار تھا جس کی کاٹ نے کبھی خطا نہ کی،

اشاعتِ اسلام کی قدرتی ترتیب

عرب میں صرف تین قومیں تھین جن کا اسلام لانا گویا تمام جزیرہ نمائے عرب کا اسلام لانا تھا، یعنی مشرکین، یہود اور نصاریٰ، مشرکین عرب کا مرکز خانہ کعبہ تھا

اور اُن کے مذہبی پیشوا قریش تھے، یہود کا صدر مقام مدینہ اور خیبر تھا، نصاری اور مجوس شام اور یمن کے اطراف مین پھیلے ہوئے تھے،

اس بنا پر الاقرب فالاقرب کے لحاظ سے اشاعتِ اسلام کی قدرتی ترتیب یہ تھی کہ قریش اور کفار مکہ کو پہلے دعوتِ توحید دیجاتی، پھر یہود کو حلقہ بگوش اسلام بنایا جاتا، اس کے بعد نصاری اور مجوس کو دعوت دیجاتی، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ترتیب کے ساتھ اسلام کی اشاعت کی، اور اسی بنا پر قرآن مجید کا طریق ․․․․ دعوت مختلف نظر آتا ہے، تمام مکی سورتون کے مخاطب کفارِ مکہ تھے، اس لئے ان مین بت پرستی کی مذمت توحید کی ترغیب، عجائبِ قدرت کا بیان عذابِ الٰہی سے تخویف، اور صنادیدِ قریش کی مخالفت کے جواب کے سوا کچھ نہین لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے، تو یہود سے سابقہ پڑا، اور اب قرآن مجید کا طرزِ خطاب بدل گیا، چنانچہ ابتدائی مدنی سورتین زیادہ تر یہود کی مذہبی تاریخ، اُن کی تحریفات، اُن کی اخلاقی کمزوریون اور قصصِ بنی اسرائیل پر مشتمل ہیں، سب سے اخیر مین نصاری کی باری آئی، اور فتح مکہ کے بعد قبائلِ عرب کے وفود کے سلسلہ مین نجران کے عیسائیون کا وفد آیا اسی زمانہ مین سورۂ آل عمران نازل ہوئی جس میں نصاری کا ذکر ہے،

مجوس عرب میں بہت کم تھے، بحرین اور یمن میں خال خال وہ پائے جاتے تھے، وہ بھی ایرانی النسل تھے، خالص عرب نہ تھے، اس لئے قرآن مجید نے خاص طور پر کسی سورہ مین ان سے خطاب نہین کیا ہے، البتہ جابجا مناسب موقعون پر اُن کا نام لیا ہے، اور اُن کے عقائد کی تردید کی، اور انکو ثنویت یعنی دو خداؤن کی پرستش کے بجائے توحید کی دعوت دی ہے،

قبولِ اسلام کے لئے کیا چیز درکار تھی؟ اگرچہ یورپ کا یہ عام دعویٰ ہے کہ عرب میں اسلام صرف تلوار کے زور سے پھیلا لیکن ابتداءً میں جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام کو قبول کیا، ان کے اوصاف کے پیش نظر کر لینے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے لئے صرف اثر پذیر دل کا جویان تھا، اور جب یہ آشنا مل جاتا تھا، تو اُس کے سامنے یہ طائر قدس اپنے پر ڈال دیتا تھا، چنانچہ ابتدائے بعثت میں جن اشخاص نے اسلام قبول کیا، وہ وہی تھے، جو نیک طبع، ایماندار، راستی پسند اور حق جو تھے، اور جو نبوّت کے اوصاف و خصائص سے واقف تھے، گذشتہ آسمانی مذاہب سے کچھ نہ کچھ آگاہ تھے، اور معاشرت و تمدن سے بہرہ ور تھے، اشخاص کے علاوہ جن قبائل اور آبادیوں نے اسلام کے قبول کرنے میں پیش دستی کی وہ بھی وہی تھیں، جن میں یہ خصوصیتیں پائی جاتی تھیں، عرب کے دو مختلف حصوں جنوبی و شمالی میں سب سے زیادہ اسلام کو کامیابی عرب کے جنوبی حصہ یعنی یمن، عمان، بحرین، یمامہ میں ہوئی، اور شمالی حصہ میں سے مدینہ منورہ اور اس کے اطراف میں ہوئی، کیونکہ وہ تمدنی حیثیت سے دنیا کی ممتاز متمدن قوموں ایرانیوں اور رومیوں سے متاثر تھے، اور مذہبی حیثیت سے یہودیوں اور عیسائیوں تک ان کا میل جول اور خلا ملا تھا، اہلِ مدینہ بھی یہودیوں کے تمدن و معاشرت روایات اور رسم و رواج سے بہت کچھ متاثر تھے[1]

اسلام کو عربوں سے جس قدر لڑائیاں پیش آئیں، وہ سب نجد اور حجاز میں پیش آئیں لیکن مسلمانوں کی کوئی جرار فوج مدینہ، یمن، یمامہ اور بحرین کو فتح کرنے کے لئے نہیں بھیجی گئی، انصارِ مدینہ نے خود مکہ میں آکر اسلام کو لبیک کہا، اطرافِ مدینہ کے قبائل میں غفار نے خود مکہ آکر قریش کی تلوار کی آگ میں کھڑے ہو کر لا الٰہ الا اللہ پڑھا، یمن سے دوس کے قبیلہ کے آدمیوں نے خود مکہ معظمہ پہنچ کر ایمان کی دولت حاصل کی، اور اس کے سردار نے اپنا قلعہ اسلام کی پناہ کے لئے پیش

[1] مستدرک حاکم، جلد ۲ ص ۱۹۵ (صحیح علی شرط مسلم)

کیا، اشعر کا قبیلہ بھی اسی زمانہ میں غائبانہ مشرف باسلام ہوا، ہمدان کا قبیلہ حضرت علیؓ کی دعوت پر ایک دن میں مسلمان ہوگیا؛

عمان کا بھی یہی حال ہوا، وہان بھی اسلام نے صرف اپنی تبلیغی کوششون کے ذریعہ سے اقتدار حاصل کیا، ایک بار آپنے عرب کے کسی قبیلے کے پاس ایک آدمی بھیجا، وہ لوگ اس کے ساتھ سختی سے پیش آئے، اور اس کو زدوکوب کیا، اس نے آکر آپ سے یہ واقعہ بیان کیا، تو آپنے فرمایا کہ اگر اہلِ عمان ہوتے، تو تم کو نہ گالیان دیتے، نہ مارتے، (مسلم فضائل اہلِ عمان)

یمامہ کے رئیس ثمامہ قید ہوکر مدینہ آئے، یہان آزاد کردیے گئے، مگر مدینہ کی مسجد مین جو جلوہ انھون نے دیکھا، اپنی ظاہری مادی آزادی کے بعد بھی اس کی نورانی زنجیر سے انھون نے رہائی نہ پائی، خودبخود مسلمان ہوگئے، اور اپنے قبیلہ مین جاکر اسلام کے داعی بن گئے، اور آخر خون کا ایک قطرہ گرے بغیر اسلام نے وہان اکثریت حاصل کرلی،

دیہاتوں مین سب سے پہلے قریۂ جواثی نے صدائے توحید پر لبیک کہا جو مضافاتِ بحرین مین تھا، اسی قریۂ جواثی کے باشندے فتحِ مکہ سے پہلے اسلام قبول کرچکے تھے، چنانچہ مسجدِ نبویؐ کے بعد عرب کے دیہاتوں میں سب سے پہلا جمعہ اسی گاؤں میں پڑھا گیا[1]، بارگاہِ نبوت میں عرب کے وفود اگرچہ فتحِ مکہ کے بعد حاضر ہوئے لیکن بحرین کے لوگوں نے اس میں تمام قبائلِ عرب پر پیش دستی کی، چنانچہ ۵ھ میں سب سے پہلا وفد جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین حاضر ہوا، وہ قبیلۂ عبدالقیس کا تھا، جو بحرین مین[2] سکونت گزین تھا،

---

[1] صحیح بخاری باب الجمعۃ فی القریٰ والمدن، [2] صحیح مسلم کتاب الایمان،

اہل یمن کا شمار اگرچہ مہاجرین اولین میں نہیں کیا جاتا، لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا حال معلوم ہوا اُسی وقت حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ بھی یمن سے ۵۲ آدمیوں کو لیکر مدینہ کی طرف ہجرت کی غرض سے روانہ ہوگئے، بحری سفر تھا، وہ لوگ کشتی میں سوار ہوئے تو بادِ مخالف کے جھونکوں نے اس کو حبشہ میں پہنچا دیا، جو مسلمانوں کا سب سے پہلا دار الہجرت تھا، وہاں حضرت جعفر ابن ابی طالبؓ سے ملاقات ہوئی، تو انھوں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو یہیں اقامت کا حکم دیا ہے، تم لوگوں کو بھی یہیں ٹھہر جانا چاہئے، چنانچہ وہ لوگ وہیں مقیم ہوگئے، اور فتح خیبر کے زمانے میں مہاجرین حبشہ کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے[1]

یہ حقیقت کہ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ جہالت اور وحشت اور اس کی اشاعت کی سب سے بڑی محرک چیز تمدن، معاشرت اور اخلاق کی بلندی، اور کتب آسمانی اور دیگر مذاہب سے واقفیت تھی، خود قرآن مجید نے اُس کو ظاہر کیا ہے،

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (توبہ-۱۲)

دیہاتی بدوی کفر اور نفاق میں سب سے زیادہ سخت ہیں اور زیادہ اس کے اہل ہیں کہ وہ ان احکام کو نہ جانیں، جو خدا نے اپنے رسول پر اتارے ہیں، اور اللہ جاننا اور حکمت والا ہے،

اور بھی اس قسم کی آیتیں ہیں، جو لوگ بادیہ سے آکر اسلام لائے تھے، اور کچھ مسائل سیکھ کر واپس چلے جاتے تھے، اُن سے جو بیعت لیجاتی تھی، اس کا نام بیعتِ اعرابی تھا جو کم درجہ سمجھی جاتی

[1] صحیح مسلم فضائل جعفر بن ابی طالب واسماء بنت عمیسؓ،

تھی اس بنا پر بادیہ میں الگ تھلگ رہنا صحابہ کے زمانہ میں معیوب سمجھا جاتا تھا بلکہ بعض لوگ اس کو ارتداد کی علامت سمجھتے تھے[۱]

اشاعتِ اسلام کے اسباب و ذرائع گذشتہ مباحث پر ایک غائر نظر ڈالنے کے بعد خودبخود یہ عقدہ کھل جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دینِ حق کو عربوں میں کس طرح پھیلایا، اور آپ کو کیونکر کامیابی ہوئی تاہم اگر واقعات کی روشنی میں ایک ایک صحابی کے قبولِ اسلام کے اسباب کی تلاش کی جائے تو حسبِ ذیل اسباب سامنے آئیں گے،

۱- اسلام کے نشر و اشاعت کا سب سے مقدم اور اصلی سبب معجزۂ قرآنی تھا، قرآن مجید جس موثر اور دل کپکپا دینے والے طریقہ سے عقائد و معارف و اخلاق کی تلقین کرتا تھا، اس کے سامنے وہ تمام عوائق، اور موانع جن کا ذکر اوپر ہو چکا، فنا ہو جاتے تھے، جو لوگ سرے سے خدا کے وجود کے منکر تھے، قرآن مجید اُن کے سامنے عالم کی بوقلمونی، مظاہرِ قدرت کی بوالعجبی، کائنات کی نیرنگی، اجرامِ فلکی کی جلوہ گری، اور عناصر کی نگار آرائی سے اس طرح استدلال کرتا تھا،

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ	تم خدا کا انکار کس طرح کرتے ہو حالانکہ تم
اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ	کبھی بیجان تھے تو اس نے تم کو زندگی بخشی پھر
يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ،	ایک دن تم کو مردہ بنا دیگا، پھر زندہ کریگا، اور
(بقرہ - ۳)	اور پھر اسی کے پاس واپس کئے جاؤ گے،
اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	آسمان و زمین کی پیدائش میں شب و روز

[۱] صحیح مسلم کتاب الامارۃ اور سنن نسائی کتاب البیعۃ،

وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ
الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ
وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ
فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ
بَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ
الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ
السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ
يَعْقِلُونَ ، (بقرہ - ۲۰)

کے اختلاف میں، اُن کشتیوں میں جو سمندر مین
مین انسانون کے لئے سود مند چیزون کو لیکر
چلتی ہیں، بادلون سے پانی برسانے مین اس
پانی سے مردہ زمین کو زندہ کرنے میں، اور اس
زمین مین ہر قسم کے جانداروں کے پھیلانے
مین ہواؤں کے چلانے میں، ان بادلون میں
جو فضائے آسمانی میں مسخر ہیں، دانشمندون
کے لئے یقیناً بڑی نشانیان ہیں،

وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ
وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ
يُرْجَعُونَ ؛ (آل عمران - ۹)

آسمان و زمین میں جو بھی ہے، برضا یا مجبوراً
اسی کا اطاعت گذار ہے، اور اسی کی طرف ایک
دن سب لوٹائے جائین گے،

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ
اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ
الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَامًا وَقُعُودًا
وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ
السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ
هٰذَا بَاطِلًا ، (آل عمران - ۲۰)

آسمان و زمین کی خلقت اور شب و روز کے
الٹ پھیر میں ان ارباب عقل کے لئے بے شبہ
بڑی نشانیاں ہیں، جو اٹھتے بیٹھتے لیٹتے (ہر حال میں)
خدا کو یاد کرتے ہیں، اور آسمان و زمین کی
خلقت پر غور کرتے ہین کہ خدایا تو نے یہ بیکار
پیدا نہیں کیا،

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ
حَتَّى إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ
بِهِمْ بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا
جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ
الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ
أُحِيطَ بِهِمْ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ
الدِّينَ ، (یونس - ۳)

وہ وہ ہی جو تم کو خشکی اور دریا میں سفر کراتا ہی،
یہانتک کہ جب تم کشتی مین ہوتے ہو اور موافق
ہوا کشتی والون کے لئے جاری ہو اور لوگ خوش
ہوتے ہیں کہ (دفعتہً) زور کا جھکڑ آیا، اور
ہر طرف سے موجیں آگئیں، اور لوگوں کو
یقین ہو چلا کہ اب وہ گھر گئے. اس وقت
خدا کو مخلص ہو کر پکارنے لگتے ہین،

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ
أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا
وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً
إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ
وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ
وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ
إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِلْعَالِمِينَ وَمِنْ
آيَاتِهِ مَنَامُكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَ
ابْتِغَاؤُكُمْ مِنْ فَضْلِهِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ
لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَسْمَعُونَ (روم - ۳)

اور خدا کی نشانیون میں سے یہ ہی کہ تمھارے لئے
تم ہی مین سے جوڑے بنائے کہ تم کو اُن سے تسلی
ہو اور تم میں باہمی محبت اور ہمدردی پیدا کی اس
بات میں سوچنے والون کے لئے نشانیان ہین، اور
اُس کی نشانیوں میں سی آسمان اور زمین کا پیدا
کرنا ہی اور تمھاری زبانوں اور رنگون کا مختلف
ہونا ہی، اس بات مین جاننے والون کے لئے نشانیان
ہیں، اور خدا کی نشانیوں میں سی تمھارا رات اور
دن مین سونا، اور خدا کے فضل (روزی) کو
ڈھونڈنا ہی اس میں سننے والون کے لئے
نشانیان ہین

خدا، یا ایک قوتِ اعظم کا اعتراف خود انسان کی فطرت ہی لیکن غفلت شعاری، اور آبائی آثار اور دیگر اسباب سے یہ فطرت کبھی کبھی مردہ اور بے حس ہو جاتی ہے، قرآن مجید اسی خفتہ حس کو بیدار کرتا تھا،

اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (ابراھیم-۲)

کیا خدا میں شک ہی جو آسمانون اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے،

کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَکُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ، (بقرہ-۳)

اور کیسے تم خدا کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم بیجان تھے تو اُس نے تم کو زندگی دی، پھر وہ تم کو موت دیگا، پھر وہ تم کو زندہ کریگا، پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤگے،

عرب مین ملحد کم تھے ازیادہ تر بلکہ قریبًا تمام تر مشرکین تھے، جو خدا کو اگرچہ مانتے تھے لیکن یہ بھی مانتے تھے کہ اس کے سوا اور بھی خدا ہین، جو خدا کے شریک ہین اور نظام عالم ان ہی کے ہاتھ سے انجام پاتا ہے، انسان کی فطرت ہی کہ جس سے براہِ راست اسکو کام پڑتا ہی اسکو زیادہ مانتا ہے اُسی سے زیادہ محبت کرتا ہی اُسی کی زیادہ پرستش کرتا ہے، چونکہ مشرکین کا اعتقاد تھا کہ بادلون کی بارش، غلہ کی پیداوار، نباتات کی روئیدگی، سب اجرام فلکی، یا اصنام کا کام ہے، اس لئے اُن کو عبودیت کا جو تعلق تھا، ان ہی معبودوں سے تھا، وہ انہی کی عبادت کرتے تھے، اُن ہی سے محبت رکھتے تھے، ان ہی پر نظر چڑھاتے تھے، انہی کے سامنے قربانیاں کرتے تھے معرکون میں انہی کے نام کی جے پکارتے تھے، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی کا

اسی شرک اور اصنام پرستی کو مٹانا تھا، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید مین اصل وجود باری کے متعلق بہت کم استدلال ہی، زیادہ تر شرک کا ابطال اور اس کی تحقیر اور تہجین ہے،

قرآن مجید طرح طرح سے نہایت موثر پیرایون مین شرک کی لغویت کا اظہار کرتا تھا،

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ	کیا وہ جس نے زمین کو قرارگاہ بنایا، اور اُس کے
خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ	بیچ مین نہرین بہائین اور اس کے لئے پہاڑون
وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا، ءَاِلٰهٌ	کی میخین گاڑین اور دونوں دریاؤن میں
مَّعَ اللّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ	اوٹ رکھا، کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے،
اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ	بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان مین اکثر لوگ جانتے نہین،
وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ	کیا وہ جو پریشان خاطروں کی سنتا ہے جب وہ
خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ	اس کو پکارتے ہیں اور بلا کو ہٹا دیتا ہے اور تمکو دنیا
قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ	کا حکمران بناتا ہے کیا خدا کیساتھ کوئی اور بھی خدا ہے،
فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ	تم بہت کم سوچتے ہو کیا وہ جو تم کو خشکی اور تری کی
الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ	اندھیرون میں راستہ دکھاتا ہے اور وہ جو کہ اپنی
ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا	رحمت (بارش) کے آگے ہواؤن کو بھیجتا ہے کیا
يُشْرِكُوْنَ. اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ	خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے مشرکین جنکو خدا کا
ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ	شریک کہتے ہیں خدا اُن سے برتر ہے آیا کون ہے جو
السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ، ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ	آفرینش کا آغاز کرتا ہے پھر اسکو لوٹا لاتا ہے اور وہ کون ہے

قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ، (نمل - ۵) — جو تم کو آسمان و زمین سے روزی دیتا ہے کیا خدا کے سوا کوئی اور ہے تو کہہ کہ اگر سچے ہو تو دلیل

کفار اور مشرک عموماً قیامت کے منکر تھے، اور کہتے تھے کہ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ یعنی جب ہڈیاں سڑ گل چکیں تو اب کون اُن کو جلائیگا، قرآن مجید اُن سے خطاب کرتا تھا،

اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى — کیا انسان پہلے منی نہین تھا، پھر گوشت

ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى فَجَعَلَ — کا لوتھڑا بنا، پھر خدا نے اس کو ٹھیک کیا

مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى — اور اس سے دو جوڑ مرد اور عورت بنائے

اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ — کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مردے کو زندہ

يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى ، (قیامۃ - ۲) — کر دے،

غرض عقائد، عبادات، اخلاق، اعمال ہر چیز کو قرآن اس مؤثر اور دل نشین طرز سے ادا کرتا تھا کہ دل مین گھر کر جاتا تھا، اور رسم و عادت کا بند اس سیلاب کو کسی طرح روک نہیں سکتا تھا، اس پر بھی جو کفر پر ثابت قدم رہے، وہ ذاتی اغراض کا اثر تھا حقیقی جہود اور انکار نہ تھا،

تمام بڑے بڑے صحابہ، بڑے بڑے رؤسائے قبائل، بڑے بڑے شعراء اور خطباء قرآن ہی سن کر ایمان لائے، حضرت عمرؓ کس ارادہ سے چلے تھے لیکن جب قرآن مجید کی آیتین سنیں تو کانپ اُٹھے، اور اسلام قبول کر لیا، عتبہ جو رئیس قریش اور علوم عرب کا ماہر تھا، جب اس نے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت مین آکر کہا کہ تم نبوت کی دعوت سے

باز آؤ، ہم تمہارے لئے سب کچھ مہیا کردیتے ہیں، آپ نے حٰم کی ابتدائی آیتیں پڑھیں جب یہ آیت آئی،

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ، (حٰم۔ فصلت۔۲)

تو اگر وہ منہ پھیریں تو کہدے کہ میں تم کو اس کڑک سے ڈراتا ہوں جو عاد و ثمود کی کڑک کی طرح ہے،

تو عتبہ نے بیتاب ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ پر ہاتھ رکھدیا، اور کہا خدا کے لئے بس، تم کو قرابت کی قسم دلاتا ہوں، پھر واپس جاکر قریش سے کہدیا کہ محمد جو کلام پیش کرتے ہیں، وہ نہ تو شعر ہے، نہ جادو ہے، اور نہ کہانت ہے،[۱] (بلکہ کوئی اور چیز ہے) حضرت ابوذرؓ نے اسلام لانے سے پہلے اپنے بھائی انیس کو جو شعرائے عرب میں تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تحقیقِ حال کے لئے بھیجا تھا، وہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور قرآن مجید سنا تو جاکر حضرت ابوذرؓ سے کہا کہ لوگ اُن کو کاہن اور شاعر کہتے ہیں لیکن میں کاہنوں اور شاعروں دونوں کے کلام سے واقف ہوں، اُن کا کلام دونوں سے الگ ہے، انیس کے بعد حضرت ابوذرؓ خود گئے، اور واپس آئے تو اُن کا آدھا قبیلہ اسی وقت مسلمان ہوگیا،[۲]

ولید بن مغیرہ (حضرت خالدؓ کا باپ) جو اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور آپ نے یہ آیتیں پڑھیں،

---

[۱] علامہ ابن تیمیہ نے الجواب الصحیح جلد چہارم ص ۸۸ میں مسند ابو یعلیٰ وغیرہ سے روایت نقل کی ہے، نیز یہ روایت مستدرک حاکم میں بھی ہے [۲] صحیح مسلم فضائل حضرت ابوذرؓ،

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ	خدا عدل کا، احسان کا اور رشتہ داروں کو
وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ	عطا کرنے کا حکم دیتا ہے، اور فحش سے، بُری بات
وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ	سے اور ظلم سے منع کرتا ہے، وہ تم کو سمجھاتا ہے
(نحل - ۱۳)	کہ شاید تم سمجھ جاؤ،

ولید نے کہا پھر پڑھنا، آپ نے دوبارہ پڑھا، وہ واپس گیا، اور قریش سے جا کر کہا کہ یہ انسان کا کلام نہیں،[1]

عثمان بن مظعونؓ بڑے پایہ کے صحابی، اور سابقین اسلام میں ہیں، یہی آیتیں ہیں جن کو سُن کر اُن کے دل نے سب سے پہلے اسلام کا جلوہ دیکھا، وہ خانۂ کعبہ کو جا رہے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے راستہ میں، اپنے پاس بٹھالیا، پھر فرمایا کہ ابھی مجھ پر یہ کلام اترا ہے، یہ کہکر آپنے اوپر والی آیتیں پڑھیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ پہلا موقع تھا کہ اسلام نے میرے دل میں گھر کیا،[2]

جبیر بن مطعم نے کفر کے زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۂ طور پڑھتے سُنا جب اس آیت پر پہنچے،

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ ھُمُ	کیا یہ لوگ از خود پیدا ہو گئے، یا یہ خود خالق ہیں کیا
الْخَالِقُوْنَ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ	آسمان اور زمین کو انہی لوگوں نے پیدا کیا بلکہ
بَلْ لَّا یُوْقِنُوْنَ اَمْ عِنْدَھُمْ خَزَآئِنُ	(واقعہ یہ ہے کہ) ان میں ایمان نہیں کیا ان کے پاس
رَبِّکَ اَمْ ھُمُ الْمُصَیْطِرُوْنَ (طور-۲)	خدا کے خزانے ہیں کیا یہی لوگ سربراہ کار ہیں،

[1] الجواب الصحیح جلد ۴ ص ۶۴ بحوالہ عبد الرزاق [2] مسند ابن حنبل جلد اول ص ۳۱۸ و ادب المفرد امام بخاری باب البغی،

تو خود جبیر کا بیان ہے کہ مجھکو یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا دل اڑنے لگا[1]،

طفیل بن عمرو الدوسی مشہور شاعر اور شرفائے عرب میں تھے، ہجرت سے پہلے وہ مکہ گئے، لوگون کو آنے کی خبر ہوئی تو اُن کے پاس گئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کہا کہ اُن کے پاس نہ جانا، وہ لوگون پر جادو کردیتے ہیں، لیکن جب حرم میں اتفاقیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قرآن سُنا تو ضبط نہ کرسکے، اور مسلمان ہوگئے[2]،

ہجرت سے پہلے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کا سفر کیا، اور مشرکین کو اسلام کی دعوت دی، تو اگرچہ ادھر سے اس کا جواب ڈھیلا اور پتھر تھا تاہم خالد العدوانی نے جو طائف کے رہنے والے تھے، آپ کو

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ (طارق) قسم ہو آسمان کی اور رات کے چلنے والے ستارہ کی،

پڑھتے سُنا تو وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ انھون نے اسی حالتِ کفر مین پوری سورہ یاد کرلی[3]، اور آخر اسلام لائے،

حضرت ابو بکرؓ کو قیامِ مکہ کے زمانہ مین بعض مشرکین نے اپنے پناہ مین لے لیا تھا اسی زمانہ مین انھون نے ایک مسجد بنوالی تھی، اور اس میں نماز پڑھا کرتے تھے لیکن نماز بلند آواز سے پڑھتے تھے جس کو سُن کر محلہ کے نوجوان اور عورتین جمع ہوجاتین، اور قرآن سنتین، تو اُن کا دل خود بخود اسلام کی طرف کھینچتا، چنانچہ اسی بنا پر کفار نے حضرت ابو بکرؓ سے شکایت کی کہ قرآن پکار کر نہ پڑھا کرو اس سے

---

[1] صحیح بخاری کتاب تفسیر سورۂ طور [2] اُن کے اسلام کا حال ابن القیم (زاد المعاد) نے بتفصیل لکھا ہے، اور ابن اسحاق کے حوالہ سے لکھا ہے [3] مسند ابن حنبل جلد ۴ ص ۳۳۵،

ہمارے بچے اور عورتیں مفتوں ہوتی جاتی ہیں [۱]، انصار اول اول جب مقام عقبہ میں اسلام لائے تو قرآن ہی سن کر لائے تھے، جو لوگ داعی بنا کر بھیجے جاتے اُن کو قرآن یاد کرایا جاتا، اور وہ جہاں جاتے یہی کارگر آلۂ تسخیر لے کر جاتے، نجاشی کے دربار میں کفار قریش جب سفیر بنکر گئے، اور اُن کی شکایت پر نجاشی نے مسلمانوں کو بلا کر باز پرس کی، تو حضرت جعفر طیارؓ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں نجاشی بے اختیار رو پڑا اور کہا کہ خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل ایک ہی چشمہ سے نکلے ہیں [۲]،

حبش میں جب آپ کی بعثت کا چرچا ہوا، تو بیس شخص جو مذہباً عیسائی تھے تحقیق حال کے لئے مکہ میں آئے، اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے اُن کے سامنے قرآن مجید کی آیتیں پڑھیں، اُن کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے، اور اسی وقت اسلام لائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے یہ لوگ اٹھے تو ابوجہل نے اُن سے مل کر کہا کہ تم سخت احمق ہو، اتنے دور سے سفر کر کے آئے اور دم بھر میں اپنا مذہب بدل لیا، انھوں نے کہا ہم تم سے لڑنا نہیں چاہتے [۳]

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلَنَا دِيْنُنَا،

قرآن کی پیشین گوئیوں کی صداقت نے بھی لوگوں کے دلوں کو کھینچا، چنانچہ اہل ایران کے مقابلہ میں رومیوں کی فتح کی جو پیشینگوئی کی تھی جس دن یہ پیشینگوئی حرف بحرف پوری ہوئی صدہا کافر مسلمان ہوئے [۴] تھے،

ایک ضروری نکتہ | عام خیال یہ ہے کہ اہل عرب جو قرآن مجید سن کر اسلام قبول کر لیتے تھے، وہ صرف فصاحت و بلاغت کا کرشمہ تھا، یعنی چونکہ عرب میں شعر و خطابت کا بہت چرچا تھا،

[۱] بخاری شریف ذکر ہجرت [۲] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۲۹۱ [۳] ابن ہشام جلد اول صفحہ ۱۳۷ مطبوعہ مصر ذکر ہجرت حبش [۴] صحیح ترمذی تفسیر سورۂ روم،

اور تمام ملک مین شاعری کا مذاق سرایت کر گیا تھا، اس لئے جب وہ دیکھتے تھے، کہ کسی اور شاعر یا خطیب کا کلام ایسا فصیح و بلیغ نہین ہے تو وہ اسلام قبول کر لیتے تھے،

بے شبہہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجز ہے لیکن اس کا اعجاز جس قدر عبارت و انشاء میں ہے اس سے کہیں زیادہ معانی و مطالب میں ہے،

فرض کرو کہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ایسا ہی معجز ہوتا جیسا اب ہے، لیکن اس مین صرف تاریخی واقعات یا اسی قسم کی اور کوئی بات ہوتی، تو کیا یہی اثر پیدا ہو سکتا تھا؟ قرآن مجید ایک طرف تو فصاحت و بلاغت کے بنا پر اعجاز کا کام دیتا تھا، دوسری طرف جو مطالب اور مقاصد ادا کرتا تھا، وہ اسلام ہی کے مقاصد اور مطالب تھے، وہ خدا کی عظمت و جلالت، اصنام کی تحقیر، انسان کا عجز و تعبد، سزا و جزا، بعثت و نشر، جور و ظلم کی تقبیح، اخلاق حسنہ کی تحسین، ان مطالب کو اس طرح ادا کرتا تھا کہ خود بخود دلون مین گھر کرتے جاتے تھے، اور ان کو یہ نظر نہین آتا تھا کہ وہ ان باتون کو اس لئے مان رہے ہین، کہ مسلمان ہو چکے ہیں، بلکہ یہ باتین براہ راست اُن کے دل مین اتر جاتی تھین، اور وہ مسلمان ہوتے جاتے تھے،

موانع کا ازالہ

عرب کو جو چیزین اسلام سے روکتی تھین، اُن مین سب سے اہم (جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہین) اُن کے اوہام و اعتقادات باطلہ تھے، جو سینکڑون، ہزاروں برس سے چلے آتے تھے، یا سیاسی و معاشی ضرورتین تھین، مقدم الذکر باتون کا قرآن مجید اور اعجاز نبوی نے استیصال کر دیا، عرب مین جو لوگ صاحب فہم اور ذی اثر تھے، اور سیاسی اسباب سے مجبور نہ تھے، یہ ناممکن تھا کہ وہ قرآن سنتے، اور اُن کے تمام عقائد اور اوہام دفعۃً فنا نہ ہو جاتے، یہ ارباب اثر جب خود متاثر ہو جاتے تھے تو

اُن مین سے ایک ایک شخص کے اثر سے ہزارون اشخاص مسلمان ہو جاتے تھے، کیونکہ قبائل پرستی کی بنا پر قبیلہ کا ہر معزز رئیس اپنے پورے قبیلہ کے دل و دماغ کا مالک ہوتا تھا،

البتہ جو لوگ سیاسی اسباب سے مطلقاً دعوتِ اسلام کی طرف متوجہ ہی ہونا نہیں چاہتے تھے، انھون نے بار بار دار النبوۃ (مدینہ منورہ) پر چڑھائیان کین، لیکن نصرتِ ایزدی نے اُن کو اسقدر شکستین دین کہ بالآخر مجبور ہو کر بیٹھ گئے، ان مین سے کچھ فنا ہو گئے، کچھ چار و ناچار اسلام کے حلقہ مین داخل ہوے، جن مین سے اکثر رفتہ رفتہ بالآخر دل سے مسلمان بن گئے،

قبائل کی ریاست سیاسی حیثیت سے گو اسلام کے مخالف تھی، لیکن بعض وجوہ سے اسلام کو تائید بھی پہنچاتی تھی، اسلام کی جمہوریت جس قدر ریاست کی مخالف تھی اسی قدر عام جماعت کی حامی تھی، اسلام سے اگر ایک رئیس کی شانِ ریاست و خودسری کو نقصان پہنچتا تھا، تو ہزارون آدمیون کو نظر آتا تھا، کہ اسلام قبول کر لینے سے ہر شخص رئیس کا ہمسر ہو جاتا ہے، غرض اسلام اگر ایک رئیس کو مٹاتا تھا، تو سینکڑون کو رئیس بنا دیتا تھا،

اس کے ساتھ رؤسا کی ریاست بالکل زائل نہیں ہو جاتی تھی، بلکہ اسلام قبول کرنے پر وہ اپنے قبیلہ کے رئیس باقی رہتے تھے، صرف اتنا ہوتا تھا کہ اُن کی بے قید مطلق العنانی قائم نہیں رہتی تھی اور اسلامی احکام کا پابند رہنا پڑتا تھا، اس لئے اگر کوئی خود غرضی بھی کرنا چاہتا تھا، تو اُسکو بھی یہ سودا گران نہیں پڑتا تھا، مؤلفۃ القلوب کا گروہ اس کی ایک صریح نظیر تھا،

اب صرف معاش کی ضرورت سدِ راہ ہو سکتی تھی، لیکن لوگون کو نظر آتا تھا کہ جن حدود مین اسلام کی حکومت قائم ہو جاتی ہے وہان امن و امان قائم ہونیکی وجہ سے تجارت اور دیگر ذرائعِ معاش کثرت

سے ترقی کرجاتے ہین،

۲- نبوّت کے متعلق اُن کو جو شکوک تھے، مشاہدہ اور تجربہ نے ان کا پردہ چاک کردیا، بڑی سے بڑی انسانیت اور پاک سے پاک زندگی کا جو تخیل ایک انسان کے ذہن میں آسکتا تھا، محمد رسول اللہ کی زندگی اس سے بھی بدرجہا بالاتر اور ارفع تھی، اُن کو نظر آتا تھا کہ گو مدعیِ نبوت بظاہر جامۂ بشریت مین ہے لیکن اپنی معنوی زندگی، اپنے معجزانہ اخلاق، اپنے مافوق الفطرت علم و معرفت اپنے ربانی کرشموں کی بناء پر بشریت سے کوئی بالاتر مخلوق ہی مَاهٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَا اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ قرآن مجید نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقِ نبوت پر اسی مقدس اور معصوم زندگی سے استدلال کیا ہے،

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ .	اے قریش! نبوت سے پہلے بھی میں نے تم مین
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (یونس - ۲)	ایک مدت دراز تک زندگی بسر کی ہے کیا تم نہیں سمجھتے،

زندگی کا یہی اعجاز تھا جس نے ظہور نبوت سے پہلے ہی امین کا خطاب اپنے لئے حاصل کرلیا تھا، بیوی کے برابر انسان کے اصلی حالات و اخلاق کا واقفکار کوئی اور نہیں، نبوتِ محمدی کا معتقد اوّلین دنیا مین کون تھا، ام المومنین خدیجہؓ بنت خویلد، لیکن اُن کی اس زود اعتقادی کا راز کیا تھا، ۱۵ برس کے معجزانہ اخلاق اور مافوق الفطرت اوصاف و حالات کا تجربہ! وہ خود پیغمبر کو خطاب کرکے نبوت کی تسکین ان الفاظ میں دیتی ہین، "محمدؐ! خدا کبھی تمہین رسوا نہ کریگا، تم رشتہ دارون کیساتھ احسان کرتے ہو، ناداروں کی طرف سے قرض ادا کرتے ہو، محتاجون کی خبر لیتے ہو، مہمانون کیساتھ مدارات پیش آتے ہو جو لوگ حقیقت میں مبتلاے آلام ہیں، اُن کی اعانت کرتے ہو"[1]

[1] صحیح بخاری، بدء الوحی،

سُن چکے ہو کہ عرب میں آپ کی نبوت کا جب چرچا پھیلا تو ابو ذر غفاریؓ نے انیسؓ اپنے بھائی کو تحقیقِ حال کے لئے بھیجا، انھون نے واپس آکر پیکرِ نبوّت کا نقشہ ان الفاظ مین کھینچا میں ایک ایسے شخص کو دیکھ کر آیا ہوں جو بھلائیوں کا حکم دیتا ہے، اور برائیون[۱] سے روکتا ہے"،

نبوت کے بعد قریش نے ذاتِ نبویؐ کے ساتھ گو عداوت اور کینہ پروری کا کوئی پہلو اٹھا نہیں رکھا، تاہم کوئی ادنیٰ اخلاقی جرم بھی آپ کی طرف منسوب نہ کر سکے، اسلام کے سب سے اوّل اعلان دعوت کے موقع پر جب آپنے ایک پہاڑ پر کھڑے ہو کر قریش کے مجمع کو مخاطب کیا، اور پوچھا کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک فوجِ گران تم پر حملہ آور ہونے کو تیار ہے تو کیا سچ مانوگے ؟ سب نے بیک آواز کہا "محمدؐ ! تیری بات آج تک ہم نے جھوٹ نہ پائی"[۲] ابو سفیان جو ہجرت کے آٹھوین سال تک اسلام کے سخت ترین دشمن تھے، ۶ھ مین ہرقل قیصرِ روم کے دربار مین کفارِ قریش کی ایک جماعت کے ساتھ محمدؐ رسول اللہ کے اخلاق و اوصاف کے متعلق اپنی شہادتین پیش کر رہے تھے تاہم وہ ایک حرف بھی صداقت کے خلاف پیش نہ کر سکے، انھون نے شہادت دی کہ "محمد کبھی جھوٹ نہین بولے، انھوں نے کبھی بدعہدی نہ کی، شرک سے روکتے ہین، توحید کی تعلیم دیتے ہین، عبادت، صدق، عفت، صلۂ رحمی کی تاکید کرتے ہین" ہرقل ہر فقرہ پر کہتا جاتا تھا کہ نبوت کے یہی آثار و دلائل ہین، یہ سب سے پہلا دن تھا کہ ابو سفیان کے دل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کا یقین کیا[۳]،

---

[۱] صحیح بخاری جلد اوّل ص ۴۹۹ قصۂ اسلام ابی ذرؓ [۲] صحیح بخاری تفسیر سورۂ تبت و صحیح مسلم کتاب الایمان باب وَ اَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْاَقْرَبِينَ [۳] صحیح بخاری بدء الوحی،

کتاب کی دوسری جلد میں آپ کے تمام محاسن اخلاق یعنی رفق و ملاطفت، حسن معاملت، جود و سخا، عدم تشدد، عفو، درگذر وغیرہ کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے، اس پر مجموعی طور پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ تھا اور یہ معجزہ تسخیر قلوب ہی کے لئے عطا ہوا تھا، قرآن مجید اس نکتہ کو خود بتاتا ہے،

وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَا — اور محمد اگر تم درشت خو اور سخت دل ہوتے تو

انْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران) — لوگ تمہارے پاس سے چل دیتے،

آپ کی یہی معجزانہ کشش تھی جو لوگوں کو کھینچ کھینچ کے دائرۂ اسلام میں داخل کرتی تھی، اور کفار کے جاہلانہ شکوک و اوہام کو دم کے دم میں مٹا دیتی تھی، صحیح مسلم میں ہے، کہ ایک شخص نے آپ سے بہت سی بکریاں مانگیں، آپ نے دیدیں، اس پر آپ کی فیاضی کا اس قدر اثر پڑا کہ اپنے قبیلے میں جاکر اُس نے کہا لوگو مسلمان ہو جاؤ کیونکہ محمد اس قدر دیتے ہیں کہ ان کو خود اپنے تنگدست ہونے کا مطلق خوف نہیں ہوتا،[1]

فتح مکہ میں جب صفوان بن امیہ مجبوراً اسلام لایا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکو تین سو اونٹ دیدیئے، خود صفوان کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھکو اس قدر دیا کہ آپ پہلے میرے نزدیک مبغوض ترین خلق تھے لیکن اس فیاضی سے محبوب ترین شخص بن گئے،[2] ہند خاندان نبوت کی قدیم ترین دشمن تھی، جنگ اُحد میں قوت بازوے اسلام حضرت حمزہؓ کے شکم کو اسی نے چاک کیا تھا، اُسی نے اُن کا جگر نکال کر چبایا تھا جس کو نگل نہ سکی، اور پھر اُگل دیا تھا، اور اُسی نے بعض شہیدوں کے

[1] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۹۰ باب ما سئل رسول اللہ شیئاً قط فقال لا، و صحیح بخاری باب حسن الخلق والسخا، [2] صحیح مسلم باب مذکور

ناک کان کاٹ کر گلے کا ہار بنایا تھا، وہ فتح مکہ میں بھیس بدل کر آپ کی خدمت میں اسلام لانے کے لئے حاضر ہوئی، اور اب بھی گستاخی سے باز نہیں آئی لیکن دربارِ رسالت میں پہنچکر آپ کے حسن خلق سے اس قدر متاثر ہوئی کہ بے اختیار بول اٹھی، یا رسول اللہ! سطحِ زمین پر آپکے گھرانے سے زیادہ کوئی گھرانا مجھے مبغوض نہ تھا لیکن آج آپکے گھرانے سے زیادہ کوئی گھرانا محبوب نہیں ہے آپنے یہ سنکر فرمایا کہ خدا کی قسم ہمارا بھی یہی حال تھا[1]

آپؐ پر ایک یہودی عالم کا قرض آتا تھا، اُس نے تقاضا کیا تو آپنے فرمایا کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے اس نے کہا کہ میں تو لے ہی کے ٹلون گا، آپنے کہا " تو اب میں تمہارے ساتھ بیٹھتا ہون"، چنانچہ آپ ظہر سے لیکر فجر کی نماز تک اُس کے ساتھ بیٹھے رہے، صحابہ نے اُس کی اس گستاخی پر ناراضی ظاہر کی، اور خدمتِ اقدسؐ میں عرض کی کہ یا رسول اللہ آپ کو ایک یہودی نے روک رکھا ہے" آپنے فرمایا ہاں لیکن مجھے خدا نے اس سے منع کیا ہے، کہ میں کسی ذمی یا اور کسی شخص پر ظلم کرون" دن چڑھا تو یہودی نے کلمہ پڑھا اور کہا کہ "میرا نصف مال خدا کی راہ میں صدقہ ہے، میں نے یہ گستاخی صرف اس لئے کی کہ توراۃ میں پیغمبر کے جو اوصاف مذکور ہیں، اُن کا تجربہ کرون[2]"

ثمامہ بن اثال یمامہ کا ایک رئیس تھا، جو اسلام کا مجرم تھا، صحابہ کا ایک دستہ نجد کے اطراف میں بھیجا گیا تھا حسن اتفاق سے وہ راہ میں مل گیا، گرفتار ہو کر مدینہ آیا، اور مسجد نبویؐ کے ایک ستون میں باندھ دیا گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لئے تشریف لائے، تو اس پر نظر پڑی، آپنے دریافت کیا کہ ثمامہ تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے، ؟ اُس نے کہا کہ اگر قتل کرنا چاہیں تو ایک خونی مجرم کو اپ

---

[1] مسلم جلد ۲ صفحہ ۵۵ باب قضیۂ ہند [2] مشکوٰۃ صفحہ ۵۲۱، کتاب الفتن فی اخلاقہ صلی اللہ علیہ وسلم،

قتل کرین گے، اور اگر عفو فرمائین تو یہ احسان ایک احسان شناس کی گردن پر ہوگا اگر مال کی خواہش ہی
تو فرمائیے جو ارشاد ہوگا حاضر کیا جائے گا، یہ سُن کر آپ اسی حالت مین اُس کو چھوڑ کر چلے گئے، دوسرے
دن پھر اسی قسم کا سوال وجواب ہوا، تیسرے دن پھر یہی گفتگو کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے
دستِ مبارک سے اس کے بند گرہ کھولدیئے اور رہا کر دیا، اس پر اس واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ مسجد سے نکل کر
ایک کھجور کے درخت کی آڑ مین گیا، اور وہان غُسل کیا، غسل کر کے مسجد میں آیا اور کلمۂ توحید پڑھ کر آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مخاطب ہوا "محمد! زمین پر آپکے چہرے سے زیادہ کوئی چیز مجھکو مبغوض نہ تھی
لیکن آج وہ مجھکو سب سے زیادہ محبوب ہے، مجھکو آپ کے دین سے زیادہ کسی دین سے عداوت نہ
تھی لیکن آج وہ میرے لئے تمام مذاہب سے عزیز تر ہوگیا ہے، مجھے آپ کے شہر سے زیادہ کسی شہر سے
دشمنی نہ تھی، لیکن وہ آج مجھکو تمام شہرون سے زیادہ خوش نما نظر آتا ہے"[1]

ایک بار آپ کسی سفر میں تھے، اور پانی ساتھ نہ تھا، صحابہ نے پیاس کی شکایت کی، آپ نے
ایک صحابی کے ساتھ حضرت علی رضؓ کو پانی کی جستجو میں روانہ فرمایا، راہ میں ایک عورت اونٹ پر پانی
کی دو مشکیں بھرے ہوئے لئے جا رہی تھی، دونوں صاحب اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت
میں لے آئے، آپنے برتن منگوائے، اور مشکوں کے منھ کھول دیئے، صحابہ نے باری باری سے پانی
پینا شروع کر دیا، وہ کھڑی یہ تماشا دیکھتی رہی، فراغت کے بعد اس کی محنت کے صلہ مین آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے کھجور، آٹا، اور ستو تھوڑا تھوڑا لوگون سے جمع کر کے ایک کپڑے میں بندھوا کر اسکے اونٹ پر رکھوا دیا
گھر پہنچی تو لوگون نے تاخیر کا سبب پوچھا، اس نے کہا راہ مین مجھکو دو آدمی ملے، اور وہ مجھکو اس

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۶، کتاب الجہاد والسیر،

شخص کے پاس لے گئے، جس کو لوگ بددین کہا کرتے ہیں، خدا کی قسم وہ یا تو اس آسمان و زمین کے درمیان سب سے بڑا جادوگر ہے، اور یا واقعی خدا کا رسول ہے،

لیکن اسلام کا یہ اثر صرف اسی کی ذات تک محدود نہ رہا، بلکہ تربیت یافتگانِ نبوت کے فیضِ اثر سے اُس کے تمام قبیلے تک وسیع ہو گیا،[۱]

نبی کے امتیاز و شناخت کا ذریعہ صرف اخلاق ہی کا اعجاز نہیں، اس کی زبان کا ایک ایک حرف اس کی معصوم شکل و صورت کی ایک ایک ادا اعجاز اور سرتاپا اعجاز ہوتی ہے،

روے و آواز پیمبر معجزہ است (رومی)

آپ کی صداقت سے لبریز تقریر کا ایک ایک حرف دل میں اتر جاتا تھا، اور نبوت کا اصلی معیار سامع کے سامنے روشن ہو جاتا تھا،

جب آپ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو تمام مدینہ میں غل پڑ گیا، حضرت عبداللہؓ بن سلام جو مدینہ کے مشہور یہودی عالم تھے، اپنے نخلستان میں کھجور توڑ رہے تھے، آمد کی خبر اُن کے کان میں پہنچی تو فوراً آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ فرما رہے تھے، افشوا السلام، واطعموا الطعام، وصلوا الارحام، وصلوا والناس نیام، تدخلوا الجنة بسلام،[۲] واپس گئے تو اس قدر متاثر تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اٹھکر حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مکان میں جونہی پہنچے حضرت عبداللہ بن سلامؓ بھی آئے، اور کہا کہ میں آپ کی رسالت کی گواہی دیتا ہوں اور نیز یہ شہادت دیتا ہوں کہ آپ ایک حق مذہب لیکر آئے ہیں،[۳]

---

۱ بخاری جلد ۱ صفحہ ۴۹ کتاب التیمم ۲ مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۴۵۱، ۳ بخاری جلد ۱ صفحہ ۵۵۶ باب ہجرۃ النبی صلعم واصحابہ الی المدینہ

ضمادؓ ایک شخص تھے جن کے ساتھ زمانۂ جاہلیت مین آپکے دوستانہ تعلقات رہ چکے تھے وہ جنون کا علاج کرتے تھے، اتفاق سے وہ مکہ مین آئے، تو کفار سے سُنا کہ آپ (نعوذ باللہ) مجنون ہوگئے ہین، وہ آپکے پاس آئے اور کہا محمد! مین جنون کا علاج کرتا ہون" اس کے جواب مین آپنے ایک تقریر کی، اور اس کو ان الفاظ سے شروع کیا،

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِینُہٗ مَن	تمام تعریفین خدا کے لئے ہین مین اسکی حمد کرتا ہون
یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن	اور اس سے مدد چاہتا ہون، خدا جس کو ہدایت دیتا
یضللہ فلا ھادی لہ واشھد	ہے اس کو کوئی شخص گمراہ نہیں کرسکتا جسکو گمراہ کرتا
الا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہ	ہے اس کو کوئی ہدایت نہین کرسکتا، مین گواہی دیتا
واشھد ان محمدًا عبدہٗ و	ہون کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہین ہے وہ تنہا ہے
رسولہٗ	اس کا کوئی شریک نہین ہے اور مین گواہی دیتا ہون

ان پر ان فقرون کا یہ اثر پڑا کہ وہ مکرر سننے کے مشتاق ہوئے آپنے تین باران کلمات کا اعادہ فرمایا، انھون نے کہا کہ مین نے کاہنون، جادوگرون اور شاعرون کا کلام سنا ہے لیکن آپکے اس کلام کی طرح مؤثر کلام کبھی نہین سُنا، وہ سمندر تک پہنچ جائیگا، ہاتھ لائیے، مین اسلام پر بیعت کرتا ہون[1]،

حضرت حلیمہؓ کے شوہر حارث یعنی آپکے رضاعی باپ جب مکہ مین تشریف لائے تو قریش نے کہا کچھ سُنا ہے، تمھارا بیٹا کہتا ہے کہ لوگ مرکر پھر زندہ ہون گے انھون نے آپسے کہا، بیٹا یہ کیا کہتے ہو؟

[1] مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبہ،

آپنے نہایت زور دار لہجہ میں فرمایا، ہاں اگر وہ دن آیا تو آپ کا ہاتھ پکڑ کر بتا دون گا، کہ جو کچھ مین کہتا تھا، سچ تھا، اُن پر اس کا یہ اثر پڑا کہ فوراً مسلمان ہو گئے، اور یہ اثر اس قدر دیر پا ہوا کہ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر میرا بیٹا ہاتھ پکڑے گا تو جنت مین پہنچا ہی کر چھوڑے گا[۱]

انسان کا چہرہ حقیقت کا آئینہ ہے، آپ کی ایک ایک ادا صداقت اور معصومیت کا پیکر تھی، آپ کی شکل نہایت پرجلال تھی، چہرہ پرنور تھا، آواز موقر اور پُر رعب تھی، اور ان تمام چیزوں کا مجموعی اثر پیغمبرانہ اعجاز کے ساتھ دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا، حضرت عبداللہ بن سلام نومسلم یہودی عالم آپکے چہرۂ مبارک کو دیکھ کر اسی اثر سے متاثر ہوئے، اور بے اختیار بول اٹھے تھے،

وجہ لیس بوجہ کذاب (ترمذی ص۴۰۹) جھوٹے آدمی کا یہ چہرہ نہیں ہو سکتا،

اور یہی کشش تھی جس کا اظہار حجۃ الوداع مین اعراب بادیہ کی زبان سے ان الفاظ مین ہوا تھا

ھذا وجہ مبارک (ابوداؤد حج جلد اص۲۲۱) یہ مبارک چہرہ ہے،

بارگاہِ نبوت میں پہنچنے کے ساتھ ہی یہ اثر آنکھون کی راہ سے دل میں پہنچ جاتا تھا، ابورافع نام ایک شخص قریش کی طرف سے قاصد بنکر آپ کی خدمت مین آئے تھے، جون ہی چہرۂ اقدس پر نظر پڑی وہ بہزار جان شیدا اٹھے، اسلام قبول کیا[۲]، اور آپ کی غلامی کو فخر سمجھا[۳]،

---

[۱] اصابہ جلد ا صفحہ ۲۹۶ تذکرہ حارث [۲] ابوداؤد کتاب الجہاد باب یستجن بالامام فی العہود [۳] اصابہ استیعاب

اسلام

یا

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغمبرانہ کام

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس عظیم الشان پیغام کو لیکر آئے تھے، اور جس مہتم بالشان کام کو انجام دینے کے لئے بھیجے گئے تھے، نیک دل اور حقیقت شناس لوگ تو سننے اور دیکھنے کے ساتھ اس کے قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے، لیکن وہ بھی جن کے دل کے آئینے زنگ آلود تھے، پیغام کی سچائی، وحی کی تاثیر، پیغمبر کی پُراثر دعوت، اعجازِ معصومیت اور اخلاق کے پرتو سے صاف وشفاف ہوتے گئے، اور عوائق، موانع، شبہات اور شکوک کی تو بر تو ظلمتیں، اور تاریکیاں رفتہ رفتہ چھٹتی چلی گئیں اور اسلام کا نور روز بروز زیادہ صفائی اور چمک کے ساتھ عرب کے اُفق پر درخشاں اور تاباں ہوتا گیا، یہاں تک کہ ۲۳ برس کی مدت میں ایک متحدہ قومیت، ایک متحدہ سلطنت، ایک متحدہ اخلاقی نظام، ایک کامل قانون، ایک مکمل شریعت، ایک ابدی مذہب اور عملی جماعت، خدا پرستی، اخلاق، ایثار، تدین، تقویٰ، ایمانداری، اخلاق اور سچائی کا ایک مجسم عہد یعنی ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان پیدا ہو گیا، اور گویا یہی حقیقت تھی جس کی طرف آپ نے اپنی امت کے سب سے بڑے مجمع میں (حجۃ الوداع) اپنی

وفات سے تقریباً دو ماہ پیشتر یہ ارشاد فرمایا

الا انّ الزمان قد استدار کھیئتہ	ہاں اب زمانہ کا دور اپنی اسی حالت پر آگیا
یوم خلق اللہ السّمٰوات والارض	جس حالت پر اس دن تھا جس دن خدا
(بخاری)	نے آسمان وزمین کو پیدا کیا،

اور یہی حقیقت تھی جس کی نسبت آپ نے اپنی وفات سے کچھ دنوں پیشتر ایک نہایت پُر درد وداعی تقریر کے آخر میں یہ الفاظ فرمائے[۱]

قد ترکتم علی البیضاء لیلھا	میں تم کو ایک روشن راستہ پر چھوڑ جاتا ہوں جسکی
کنھارھا	روشنی کا یہ حال ہے کہ اسکی رات بھی دن کے مانند ہے

اور آخری حجۃ الوداع کے مجمع عام میں تکمیل کی بشارت آئی کہ

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ	آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا، اور اپنی
عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ، (مائدہ-۱)	نعمت تم پر ختم کر دی:

پروفیسر مارگولیتھ جن کی تائیدی شہادت بہت کم مل سکتی ہے، لکھتے ہیں،

"محمد کی وفات کے وقت اُن کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہا، آپ ایک سلطنت کی جس کا ایک سیاسی و مذہبی دارالسلطنت مقرر کیا گیا، تھا، بنیاد ڈال چکے تھے، آپ نے عرب کے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا، آپ نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا، اور اُن میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا، جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا،[۲]

[۱] سنن ابن ماجہ ابواب سنت و بدعت و مستدرک حاکم جلد اول صفحہ ۹۶ و مسند ابن حنبل جلد ۴ صفحہ ۱۲۶۔ [۲] لائف آف محمد مارگولیتھ صفحہ ۴۷۱

ایک دور (یورپ) کے بیگانہ مستشرق کی بہ نسبت جس کا علم، عرب اور اسلام کے متعلق صرف چند کتابوں سے مستعار ہے، خود ایک عرب عیسائی اہلِ قلم کو فیصلہ کا زیادہ حق حاصل ہے، بیروت کے مسیحی اخبار الوطن نے ۱۹۱۱ء میں لاکھوں عرب عیسائیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا انسان کون ہے؟ اس کے جواب میں ایک عیسائی عالم (داور مجاعص) نے لکھا،

"دنیا کا سب سے بڑا انسان وہ ہے جس نے دس برس[۱] کے مختصر زمانہ میں ایک نئے مذہب، ایک نئے فلسفہ، ایک نئی شریعت اور ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی، جنگ کا قانون بدل دیا، اُس ایک نئی قوم پیدا اور ایک نئی طویل العمر سلطنت قائم کر دی لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود وہ اُمی اور ناخواندہ تھا، وہ کون؟ محمد بن عبد اللہ قریشی، عرب اور اسلام کا پیغمبر، اس پیغمبر نے اپنی عظیم الشان تحریک کی ہر ضرورت کو خود ہی پورا کر دیا، اور اپنی قوم اور اپنے پیروؤں کے لئے اور اس سلطنت کے لئے جس کو اُس نے قائم کیا، ترقی اور دوام کے اسباب بھی خود مہیا کر دیئے اس طرح کہ قرآن اور احادیث کے اندر وہ تمام ہدایات موجود ہیں جن کی ضرورت ایک مسلمان کو اُس کے دینی یا دنیاوی معاملات میں پیش آسکتی ہے، حج کا ایک سالانہ اجتماع فرض قرار دیا تاکہ اقوام انسانی میں اہلِ استطاعت ایک مرکز پر جمع ہو کر اپنے دینی و قومی معاملات میں باہم مشورے کر سکیں، اپنی اُمت پر زکوٰۃ فرض کر کے قوم کے غریب طبقہ کی حاجت پوری کی، قرآن کی زبان کو دنیا کی دائمی اور عالمگیر زبان بنا دیا کہ وہ مسلمان اقوام کے باہمی تعارف کا ذریعہ بن جائے، قوم کے ہر فرد کو ترقی کا موقع اس طرح عنایت کیا کہ یہ کہدیا کہ ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان پر صرف تقویٰ کی بزرگی حاصل ہے، اس بنا پر اسلام

---

[۱] مدینہ منورہ میں آپ دس برس زندہ رہے تھے،

ایک حقیقی جمہوریت بن گیا جس کا رئیس قوم کی پسند سے منتخب ہوتا ہے مسلمانون نے ایک مدت تک اس اصول پر عمل کیا، یہ کہکر کہ عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر کوئی فوقیت نہیں، اسلام میں داخل ہونا ہر شخص کے لئے آسان کر دیا، نامسلمون کے لئے اسلامی ملکون میں عیش و آرام اور امن و اطمینان سے سکونت کی ذمہ داری یہ کہکر اپنے اوپر لے لی کہ "تمام مخلوق خدا کی اولاد ہے، تو خدا کا سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کی اولاد کو سب سے زیادہ فائدہ پہونچائے"، خاندانی اور ازدواجی اصلاحات بھی اس کی نظر سے پوشیدہ نہ رہیں، اُس نے نکاح و وراثت کے احکام مقرر کئے، عورت کا مرتبہ بلند کیا، نزاعات اور مقدمات کے فیصلے کے قوانین بنائے، بیت المال کا نظام قائم کرکے قومی دولت کو بیکار نہ ہونے دیا، علم کی اشاعت اور تعلیم اس کی کوششون کا بڑا حصہ رہی، اُس نے حکمت کو ایک مومن کا گمشدہ مال قرار دیا، اسی سبب سے مسلمانون نے اپنی ترقی کے زمانہ میں ہر دروازہ سے علم حاصل کیا، کیا ان کارنامون کا انسان دنیا کی سب سے بڑی ہستی قرار نہ پائے گا"؟

انگلستان کے مشہور انشاپرداز کارلائل نے اپنے "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" میں لاکھون پیغمبرون اور مذہب کے بانیون میں صرف محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کے وجود گرامی کو اس قابل سمجھا کہ وہ آپ کو نبوت کا ہیرو قرار دے، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار "محمد" آپ کی نسبت کہتا ہے،

"قرآن سے اس شخص کے روحانی ارتقاء کا پتہ چلتا ہے، جو تمام نبیون اور مذہبی لوگون مین سب سے زیادہ کامیاب رہا"[1]،

الغرض دوست و دشمن سب کو اس کا اعتراف ہے کہ انبیاء مین یہی برگزیدہ ہستی ہے، جس نے

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم مضمون "قرآن" جلد ۱۵ ص ۸۹۸،

کم سے کم مدت میں اپنی بعثت اور رسالت کے زیادہ سے زیادہ فرائض ادا کئے، اور اصلاحات انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہ چھوڑا جس کی تکمیل اس کی تعلیم اور عمل سے نہ ہوگئی ہو، اور یہ اس لئے کہ تمام انبیاءؑ میں خاتم نبوت، مکمل دین، اور آخری معلم کی حیثیت آپ ہی کو عطا ہوئی تھی، اگر انسان کی علمی و اخلاقی و دینی ضرورتوں کا کوئی گوشہ آپ کے فیض سے محروم رہ کر تکمیل کا محتاج ہوتا تو آپ کے بعد بھی کسی آنے والے کی حاجت باقی رہجاتی، حالانکہ آپ نے فرمادیا کہ "میرے بعد کوئی نبی نہیں، میں نبوت کی عمارت کی آخری اینٹ ہوں[۱]"

آپ کی تعلیمات کی یہی ہمہ گیری ہے جس پر کوتاہ بینوں کو آج نہیں بلکہ خود صحابہؓ کے عہد میں بھی تعجب ہوتا تھا، بعض مشرکوں نے حضرت سلمان فارسیؓ سے مذاقاً کہا کہ تمہارے پیغمبر تم کو ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں، یہاں تک کہ اس کی بھی کہ تم کو قضائے حاجت کیونکر کرنی چاہئے، حضرت سلمانؓ نے کہا ہاں یہ سچ ہے، آپ نے ہم کو یہ حکم دیا ہے کہ ہم ایسی حالت میں قبلہ رخ نہ بیٹھیں، نہ اپنے داہنے ہاتھ سے طہارت کریں، اور نہ تین ڈھیلوں سے کم استعمال کریں جن میں کوئی ہڈی اور گوبر نہ ہو[۲]، نبوت محمدیؐ کی تعلیمات کی یہ ہمہ گیری ہی اسکی تکمیل کی دلیل ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پست سے پست اور غیر متمدن سے غیر متمدن اقوام سے لے کر بلند سے بلند اور متمدن سے متمدن قوموں تک کے لئے یکساں تعلیمات اور ہدایات رکھتی ہے، عرب کے بدویوں اور قریش کے رئیسوں دونوں کے لئے آپؐ کی بعثت تھی، اس لئے آپ کی تعلیمات میں پست کو بلند، اور بلند کو بلند تر بنانے کی برابر کی ہدایتیں ہیں، آج یہی چیز ہے کہ افریقہ کے وحشیوں میں اسلام اپنی تعلیمات کے ساتھ تنہا جاتا ہے، اور

---

[۱] صحیح بخاری جلد اول باب خاتم النبیین وجامع ترمذی کتاب الامثال، [۲] جامع ترمذی وسنن ابن ماجہ کتاب الطہارۃ

اُن کو متمدن اور مہذب بنانے کے لئے مذہب سے باہر کسی تعلیم کی اس کو ضرورت پیش نہیں آتی ہے،
لیکن عیسوی مذہب کو چند اخلاقیات کو چھوڑ کر جن کا ماخذ انجیل ہے، عقائد یادیون کی کونسلون سے
دعائین اور عبادات کلیساؤن کے حکمرانون سے، اور تہذیب و تمدن کی تعلیمات یورپ کے بے دینون
اور ملحدون سے حاصل کرنی پڑتی ہین، لیکن اسلام مین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کچھ نہین
عقائد ہون کہ عبادات اور دعائین، اخلاق ہون کہ آدابِ تمدن، خانگی معاملات ہون، یا دنیا و دین
کے کاروبار، انسانون کے ساتھ معاملہ ہو یا خدا کے ساتھ، سب کا ماخذ محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی ہمہ گیر تعلیمات ہیں،

آپ کی ان ہمہ گیر تعلیمات کی کتاب جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے، جا بجا ابواب
پر منقسم ہے اور ان ہی کے مجموعہ کا نام اسلام ہے،

آپؐ نے بتایا ہے کہ ہر انسان کا تعلق تو اپنے خالق کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے خالق کی
دوسری مخلوقات کے ساتھ، اسی مفہوم کو دوسری عبادت میں یون کہو کہ اُس کا ایک تعلق اپنے آقا
اور مالک کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے آقا اور مالک کے غلامون کیساتھ، یا یون کہو کہ اس کا ایک
رُخ تو آسمان کی طرف ہے، اور دوسرا زمین کی سمت، اس کو ایک لگاؤ تو عالمِ غیب سے ہے، اور دوسرا
عالمِ شہود سے، پہلے کیساتھ اس کا تعلق ایک مہربان آقا اور فرمانبردار غلام کا ہے، اور دوسرون کے
ساتھ اس کا تعلق برادری اور بھائی چارے کا ہے، خالق اور مخلوق یا خدا اور بندہ کے درمیان جو علاقہ
اور رابطہ ہے، اس کا تعلق اگر صرف ہمارے ذہنی قویٰ اور قلبی حالات سے ہے، تو اس کا نام
عقیدہ ہے اور اگر ان قلبی حالات کے ساتھ ہمارے جسم و جان اور مال و جائداد سے بھی ہے تو اس کا

نام عبادت ہی، باہم انسانوں انسانون مین، یا انسانون اور دوسری مخلوقات میں جو علاقہ وربطہ ہی اس کی حیثیت سے جو احکام ہم پر عائد ہیں اگر اُن کی حیثیت محض قانون کی ہے، تو اُس کا نام معاملہ ہی، اور اُن کی حیثیت قانون کی نہین بلکہ روحانی نصیحتون اور برادرانہ ہدایتون کی ہی تو اُس کا نام اخلاق ہی،

قرآن پاک کی اصطلاح مین پہلے تعلقات کی مضبوطی اور استحکام کا نام ایمان ہی اور دوسرے تیسرے اور چوتھے کی بجاآوری کا نام عملِ صالح ہے، اور ان ہی دونون کے مجموعہ پر کامل نجات کا انحصار ہی، عمل صالح کی تین قسمیں ہیں، خدا کے سامنے اپنی عبودیت کا اظہار اور اُس کے احکام کی تعمیل، بندون کے ساتھ کاروبار اور معاملہ مین قانونِ الٰہی کی پابندی، اور اُن کے ساتھ محبت الفت اور نیکی اور بھلائی کا برتاؤ، اور کو اس لحاظ سے کہ اُن میں سے ہر ایک عمل کو جس میں خدا کی خوشنودی اور رضامندی مقصود ہو، اسلام عبادت کہتا ہے لیکن اصطلاح میں پہلے کا نام عبادات، دوسرے کا نام معاملات اور تیسرے کا نام اخلاق ہے الغرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو عالمگیر شریعت اور دائمی ہدایت لیکر آئے، وہ ان ہی چارون عنوانون کا مجموعہ ہی یعنی عقائد عبادات معاملات اور اخلاق، ان ہی کی اصلاح، تعلیم اور تکمیل کے لئے آپ کی بعثت ہوئی، اور یہی آپکے پیغمبرانہ فرائض کے اصلی کارنامے ہیں،

عقائد

عقائد کی حقیقت اور اہمیت | انسان کے تمام افعال، اعمال اور حرکات کا محور اس کے خیالات ہیں یہی اس کو بناتے اور بگاڑتے ہیں، یہ عام خیالات درحقیقت اس کے چند پختہ، غیر متزلزل اور غیر مشکوک اصولی خیالات پر مبنی ہوتے ہیں، ان ہی اصولی خیالات کو عقائد کہتے ہیں یہی وہ نقطۂ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے، اور اس کے دائرۂ حیات کا ہر خط اسی پر جاکر ختم ہوتا ہے ہمارے تمام افعال اور حرکات ہمارے ارادہ کے تابع ہیں، ہمارے ارادہ کا محرک، ہمارے خیالات اور جذبات ہیں، اور ہمارے خیالات اور جذبات پر ہمارے اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں، عام بول چال میں ان ہی چیزوں کی تعبیر ہم "دل" کے لفظ سے کرتے ہیں، اسلام کے معلم نے بتایا کہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا دل ہی نیکی اور بدی کا گھر ہے، فرمایا،

الا وان فی الجسد مضغةً اذا صلحت	انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے
صلح الجسد کلّه واذا فسدت فسد	جو اگر درست ہے تو تمام بدن درست ہے اور
الجسد کلّه الا وهی القلب،	اگر وہ بگڑ گیا، تو تمام بدن بگڑ گیا، ہاں! وہ
(صحیح بخاری کتاب الایمان)	ٹکڑا دل ہے،

قرآن پاک نے دل (قلب) کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں، سب سے پہلے قلبِ سلیم درست

دل) جو ہر گناہ سے پاک رہ کر بالطبع نجات اور سلامت روی کے راستہ پر چلتا ہے، دوسرا اس کے مقابل قَلْبٌ اٰثِمٌ[1] (گنہگار دل) یہ وہ ہے جو گناہوں کی راہ اختیار کرتا ہے اور تیسرا قَلْبٌ مُّنِيْبٌ (رجوع ہونے والا دل) یہ وہ ہے، جو اگر کبھی بھٹکتا اور بے راہ بھی ہوتا ہے، تو فوراً نیکی اور حق کی طرف رجوع ہو جاتا ہے، غرض یہ سب نیرنگیاں اسی ایک بے رنگ ہستی کی ہیں جس کا نام دل ہے ہمارے اعمال کا ہر محرک، ہمارے اسی دل کا ارادہ اور نیت ہے، اسی بھاپ کی طاقت سے اس مشین کا ہر پرزہ چلتا اور حرکت کرتا ہے، اسی لئے آپ نے فرمایا:-

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّات (صحیح بخاری آغاز کتاب) تمام کاموں کا مدار نیت پر ہے،

اسی مطلب کو دوسرے الفاظ میں آپ نے یوں ادا فرمایا،

انما لامرئ ما نوی فمن کانت	ہر شخص کے کام کا ثمرہ وہی ہے جس کی وہ نیت
ھجرته الی دنیا یصیبھا او الی	کرے، تو جس کی ہجرت کی غرض دنیا کا حصول
امرأة ینکحھا فھجرته الی ما	یا کسی عورت سے نکاح کرنا ہے، تو اس کی
ھاجر الیه،	ہجرت اسی کے لئے ہے جس کے لئے اس نے
(صحیح بخاری آغاز کتاب)	ہجرت کی (یعنی اس سے اس کو ثواب حاصل نہ ہوگا)

آج کل علم نفسیات نے بھی اس مسئلہ کو بداہۃً ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی عملی اصلاح کے لئے اس کی قلبی اور دماغی اصلاح مقدم ہے اور انسان کے دل اور ارادہ پر اگر کوئی چیز حکمراں ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے، اب صحیح اور صالح عمل کے لئے ضروری یہ ہے کہ چند صحیح اصول و مقدمات

[1] قرآن پاک کی آیت میں یہ ہے فَاِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ (بقرہ - ۳۹)

سکا ہم اس طرح تصور کریں کہ وہ دل کا غیر مشکوک یقین اور غیر متزلزل عقیدہ بنجائیں، اور اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدہ کے تحت میں ہم اپنے تمام کام انجام دیں،

جس طرح اقلیدس کی کوئی شکل چند اصولِ موضوعہ اور اصولِ متعارفہ کے مانے بغیر نہ بن سکتی ہے نہ ثابت ہو سکتی ہے، اسی طرح انسان کا کوئی عمل صحیح و درست نہیں ہو سکتا، جب تک اس کے لئے بھی چند مبادی اور چند اصولِ موضوعہ ہم پہلے تسلیم نہ کرلیں،

بظاہر عقل ہمارے ہر کام کے لئے ہم کو رہنما نظر آتی ہے لیکن غور سے دیکھو کہ ہماری عقل بھی آزاد نہیں، وہ ہمارے دلی یقین، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اس لئے اس پابز نجیر عقل کے ذریعہ ہم اپنے دلی خیالات، ذہنی رجحانات، اور اندرونی جذبات پر قابو نہیں پا سکتے، اگر پا سکتے ہیں تو اپنے صحیح دلی یقینیات اور چند مضبوط دماغی و ذہنی تصورات کے ذریعہ، یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے ایمان" کا ذکر ہمیشہ "عمل صالح" کے ذکر سے پہلے لازمی طور سے کیا ہے، اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کے قابل نہیں سمجھا ہے کہ ایمان کے عدم سے، دل کے ارادہ اور خصوصاً اُس مخلصانہ ارادہ کا بھی عدم ہو جاتا ہے جس پر حسن عمل کا دارو مدار ہے، عبد اللہ ابن جدعان ایک قریشی تھا جس نے جاہلیت میں بہت سے نیکی کے کام کئے تھے، مگر باانہمہ مشرک تھا، اس کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عائشہؓ نے ایک دفعہ دریافت کیا، کہ "یا رسول اللہ! عبد اللہ بن جدعان نے جاہلیت میں جو نیکی کے کام کئے کیا اُن کا ثواب اسکو ملیگا؟" فرمایا نہیں اے عائشہؓ کیونکہ کسی دن اس نے یہ نہیں کہا کہ بار الہا! میرے گناہوں کو قیامت میں بخشدے[1]"

[1] مصنف ابن ابی شیبہ غزوات نسخہ قلمی دار المصنفین و ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۹۳، ۱۲۰ مصر ا

بدر کی لڑائی کے موقع پر ایک مشرک نے جس کی بہادری کی دھوم تھی، حاضر ہو کر کہا کہ اے محمد! میں بھی تمہاری طرف سے لڑنے کے لئے چلنا چاہتا ہوں کہ مجھے بھی غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے فرمایا کیا تم اللہ عزوجل اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہو، اس نے جواب دیا "نہیں" فرمایا واپس جاؤ کہ میں اہلِ شرک سے مدد کا خواستگار نہیں" دوسری دفعہ وہ پھر آیا، اور وہی پہلی درخواست پیش کی مسلمانوں کو اُس کی شجاعت و بہادری کی وجہ سے اس کی درخواست سے بڑی خوشی ہوئی، اور وہ دل سے چاہتے تھے کہ وہ اُن کی فوج میں شریک ہو جائے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پھر وہی سوال کیا کہ کیا تم کو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول پر ایمان ہے" اس نے پھر نفی میں جواب دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی فرمایا کہ "میں کسی مشرک سے مدد نہ لونگا" غالباً مسلمانوں کی تعداد کی کمی، اور اس کی بہادری کے باوجود اس سے آپ کی بے نیازی کی کیفیت نے اس کے دل پر اثر کیا، تیسری دفعہ جب اُس نے اپنی درخواست پیش کی، اور آپ نے دریافت فرمایا کہ "تم کو خدا اور رسول پر ایمان ہے"، تو اُس نے اثبات میں جواب دیا، اور نورِ اسلام سے منور ہو کر لڑائی کی صف میں داخل ہوا[1]،

قرآن پاک نے ان لوگوں کے کاموں کی مثال جو ایمان سے محروم ہیں، اُس راکھ سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اڑا اڑا کر فنا کر دیتے ہیں، اور اُن کا کوئی وجود نہیں رہتا، اسی طرح اُس شخص کے کام بھی جو ایمان سے محروم ہے بے بنیاد اور بے اصل ہیں،

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ — جنھوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا، اُن کے

---

[1] صحیح مسلم باب غزوات جلد دوم صفحہ ۱۰۲ مصر،

كَرَمَادِنِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ
عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا
عَلٰى شَيْءٍ ط ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ

(ابراهیم - ۳)

کا مون کی مثال راکھ کی ہی، جس پر آندھی
والے دن زور سے ہوا چلی، وہ اپنے کامون
سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے یہی سب
بڑی گمراہی ہے،

سورۂ نور مین ایمان کی دولت سے محروم لوگون کے اعمال کی مثال سراب سے دی گئی ہے
کہ اُس کے وجود کی حقیقت فریب نظر سے زیادہ نہیں،

وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ
بِقِيْعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ط حَتّٰى
اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا،

(نور - ۵)

اور جنھون نے خدا کا انکار کیا، اُن کے کام
اس سراب کی طرح ہیں، جو میدان میں ہو
جس کو پیاسا پانی سمجھتا ہے، یہانتک کہ جب وہ
اس کے پاس پہنچے، تو وہان کسی چیز کا وجود

اس کی ایک اور مثال ایسی سخت تاریکی سے دی گئی ہے جس مین ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی
نہیں دیتا، اور جس میں ہوش وحواس اور اعضاء کی سلامتی کے باوجود ان سے فائدہ اٹھانا ناممکن ہے

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ
فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ط ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا
فَوْقَ بَعْضٍ ط اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ط
وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ
نُّوْرٍ ط، (نور - ۵)

یا اُن کے کامون کی مثال ایسی ہی جیسے کسی گہری
سمندر مین سخت اندھیرا ہو، اُس کے اوپر موج اور
موج پر پھر موج ہو اور اُس کے اوپر بادل گھرا
ہو، اندھیرے میں ایک کے اوپر ایک، اسمین ہاتھ
نکالے تو وہ بھی سوجھائی نہ دے، جس کو خدا نے نور

الغرض ایمان کے بغیر عمل کی بنیاد کسی بلند اور صحیح تخیل پر قائم نہین ہوسکتی، اسی لئے ریا، نمایش اور خود غرضی کے کامون کو کوئی عزت نہین دیجاسکتی، وہ کام جو گو بظاہر نیک ہون لیکن نیکی کرنے والے کا اُن سے اصلی مقصد نام ونمود پیدا کرنا ہوتا ہے، تو اخلاقی نقطۂ نظر سے، تمام دنیا اُن کو بے وقعت اور ہیچ سمجھتی ہے، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانون کو متنبہ کیا، اور فرمایا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا ۖ لَا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِمَّا كَسَبُوا ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ،

(بقرہ ۔ ۳۶)

اے ایمان والو! اپنی خیراتون کو احسان رکھکر اور ایذا دیکر اس طرح نہ برباد کرو جس طرح وہ برباد کرتا ہی جو لوگون کے دکھانے کے لئے اپنا مال خرچ کرتا ہے اور خدا پر (جو نیکیون کی جزا دیتا ہے) اور قیامت پر (جس مین نیکیون کی جزا ملیگی) یقین نہیں کرتا، پس اس کی خیرات کی مثال اس چٹان جیسی ہی جس پر کچھ مٹی پڑی ہو، پھر اس پر پانی برسا، اور مٹی دھل کر پتھر رہ گیا، جس پر جو کچھ بویا جائے گا وہ اُگے گا نہیں، اور خدا

غرض ایمان ہمارے تمام اعمال کی اساس ہے جس کے بغیر عمل بے بنیاد ہے، وہ ہماری سیرابی کا اصلی سرچشمہ ہے جس کے فقدان سے ہمارے کامون کی حقیقت سراب سے زیادہ نہین رہتی، کیونکہ وہ دیکھنے مین تو کام معلوم ہوتے ہین، مگر روحانی اثر و فائدہ سے خالی اور بے نتیجہ

ہوتے ہیں، خدا کے وجود کا اقرار اور اس کی رضامندی کا حصول ہمارے اعمال کی غرض وغایت ہے،
یہ نہ ہو تو ہمارے تمام کام بے نظام اور بے مقصد ہو کر رہ جائیں ، وہ ہمارے دل کا نور ہے، وہ
نہ ہو تو پوری زندگی تیرہ وتاریک نظر آئے، اور ہمارے تمام کاموں کی بنیاد ریا، نمایش، جاہ پسندی
خودغرضی اور شہرت طلبی وغیرہ کے دلی جذبات اور پست محرکات کے سوا کچھ اور نہ رہجائے،

توراۃ میں بعض عقیدوں کا ذکر ہے، مگر ایمان کی حقیقت اور اسکی اہمیت کی تعلیم سے وہ خالی
ہے انجیل میں ایمان کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے، مگر اخلاق کی سچائی، اعمال کی راستی، اور دل......
کے اخلاص کے لئے نہیں، بلکہ معجزوں اور کرامتوں کے ظاہر کرنے کے لئے اور خوارقِ عادت پر قدرت
اور اختیار پانے کے لئے[1]، اس کے برخلاف فلسفۂ یونان کے بہت سے پیروؤں اور ہندوستان کے
بہت سے مذہبوں نے محض ذہنی جولانی، مراقبہ، تصور، دھیان اور علم کو انسان کی نجات کا ذریعہ
قرار دیا، اور اخلاق وعمل سے کوئی تعرض نہیں کیا، عیسائیوں، زردشتیوں اور برہمنوں نے عقائد کو
یہ وسعت دی، اور اُن کی ایسی تفصیل کی کہ وہ سرتاپا خیالی فلسفہ بن گئے جس سے تصوریت عملیت پر
غالب آگئی، اور انسان کے قوائے عملی سرد ہوگئے،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے علم وعمل، تصور اور فعل، عقلیت اور عملیت میں لزوم
ثابت کیا، مگر اصلی زور انسان کی عملیت پر صرف کیا، اور عقائد کے اتنے ہی حصہ کا یقین واقرار ضروری
قرار دیا جو دل کی اصلاح کرے، اور عمل کی بنیاد، اخلاق وعبادات کی اساس قرار پا سکے عقائد کے فلسفیانہ
الجھاؤ، اور تصورات ونظریات کی تشریح وتفصیل کرکے عملیت کو برباد نہیں کیا، چند سیدھے سادے

[1] متی - ۱۷، ۲۰

اصول جو تمام ذہنی سچائیون اور واقعی حقیقتوں کا جوہر اور خلاصہ ہیں، ان کا نام عقیدہ، اور اُن پر یقین کرنے کا نام ایمان رکھا، آپ نے صریح الفاظ مین عقائد کے صرف پانچ اصول تلقین کئے، خدا پر ایمان، خدا کے فرشتون پر ایمان، خدا کے رسولوں پر ایمان، خدا کی کتابون پر ایمان اور اعمال کی جزا اور سزا کے دن پر ایمان،

یہ تمام وہ حقائق ہیں جن پر دل سے یقین کرنا، اور زبان سے اُن کا اقرار کرنا ضروری ہے، اُن کے بغیر خالص عمل کا وجود نہین ہوسکتا، اللہ تعالیٰ پر ایمان کہ وہ اس دنیا کا تنہا خالق اور مالک اور ہر ظاہر و باطن سے آگاہ ہے، تاکہ وہی ہمارے کامون کا قبلہ مقصود قرار پاسکے، اور اسی کی رضاجوئی اور اسی کی مرضی کی تعمیل ہمارے اعمال کی تنہا غرض و غایت ہو، اور ہم جلوت کے سوا خلوت مین بھی گناہون اور برائیون سے بچ سکیں، اور ہر نیکی کو اس لئے کریں، اور ہر برائی سے اس لئے بچین کہ یہی ہمارے خالق کا حکم اور یہی اسکی مرضی ہے، اس طرح ہمارے اعمال ناپاک اغراض اور ناجائز خواہشون سے مبرا ہوکر خالص ہوسکیں، اور جس طرح ہمارے جسمانی اعضا رگناہون سے پاک ہون، ہمارا دل بھی ناپاک خیالات اور ہوا وہوس کی آمیزش سے پاک ہو اور اُس کے احکام اور اُس کے پیغام کی سچائی پر دل سے ایسا یقین ہو کہ ہماری ناپاک جذبات ہماری غلط استدلالات ہماری گمراہ خواہشیں بھی اس یقین مین شک اور تذبذب پیدا نہ کرسکین،

خدا کے رسولون پر بھی ایمان لانا ضروری ہے کہ خدا کے ان احکام اور ہدایات اور اسکی مرضی کا علم ان ہی کے واسطے سے انسانون کو پہنچا ہے، اگر ان کی صداقت، سچائی اور راستبازی کو کوئی تسلیم نہ کرے، تو پیغام ربانی اور احکام الٰہی کی صداقت اور سچائی بھی مشکوک و مشتبہ ہوجائے، اور انسانون

کے سامنے نیکی، نزاہت اور معصومیت کا کوئی نمونہ موجود نہ رہے، جو انسانوں کے قوائے عملی کی تحریک کا باعث بن سکے، پھر اچھے اور برے، صحیح اور غلط کاموں کے درمیان ہماری عقل کے سوا جو ہمارے جذبات کی محکوم ہے، کوئی اور چیز ہمارے سامنے ہماری رہنمائی کے لئے نہیں ہوگی،

خدا کے فرشتوں پر بھی ایمان لانا واجب ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان قاصد اور سفیر ہیں، مادیت اور روحانیت کے مابین واسطہ ہیں، مخلوقات کو قانونِ الٰہی کے مطابق چلاتے ہیں، اور ہمارے اعمال و افعال کے ایک ایک حرف کو ہر دم اور ہر لحظہ کرتے جاتے ہیں تاکہ ہم کو ان کا اچھا یا برا معاوضہ مل سکے،

خدا کے احکام و ہدایات جو رسولوں کے ذریعہ انسانوں کو پہنچائے گئے، ان کو دور دراز ملکوں اور آیندہ نسلوں تک پہنچانے کے لئے ضروری ہوا کہ وہ تحریری شکلوں یعنی کتابوں، اور صحیفوں میں یا لفظ و آواز سے مرکب ہو کر ہمارے سینوں میں محفوظ رہیں، اس لئے خدا کی کتابوں اور صحیفوں کی صداقت پر اور جو کچھ ان میں ہے، اس کی سچائی پر ایمان لانا ضروری ہے، ورنہ رسولوں کے بعد خدا کے احکام اور ہدایتوں کے جاننے کا ذریعہ مسدود ہو جائے اور ہمارے لئے نیکی و بدی کی تمیز کا کوئی ایسا معیار باقی نہ رہے جس پر تمام ادنیٰ و اعلیٰ، جاہل و عالم، بادشاہ اور رعایا سب متفق ہو سکیں،

اعمال کی بازپرس، اور جوابدہی کا خطرہ نہ ہو، اور اس کے مطابق جزا اور سزا کا خیال نہ ہو تو دنیاوی قوانین کے باوجود دنیائے انسانیت سراپا درندگی اور بہیمیت بن جائے یہی عقیدہ ہے جو انسانوں کو جلوت اور خلوت میں اُن کی ذمہ داری محسوس کراتا ہے، اس لئے روزِ جزا اور

یومِ آخرت پر ایمان رکھے بغیر انسانیت کی صلاح و فلاح ناممکن ہے، اسی لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس پر بیحد زور دیا ہی، بلکہ مکی وحی کا بیشتر حصہ اسی کی تلقین اور تبلیغ پر مشتمل ہی،

یہی پانچ باتین اسلام کے ایمانیات کے اصلی عناصر ہین یعنی اللہ تعالیٰ پر، اس کے تمام رسولون پر، اُس کی کتابون پر، اُس کے فرشتون پر، اور روزِ جزا پر ایمان لانا، یہ عقائد خمسہ یکجا طور پر سورہ بقرہ مین متعدد دفعہ کہیں مجمل اور کہین مفصل بیان ہوئے ہیں،

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ	جو لوگ غیب (خدا، خدا کی صفات، اور ملائکہ)
...... وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ	پر ایمان رکھتے ہین ...... اور جو کچھ تم پر (اے محمدؐ) اترا
بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ	اور تم سے پہلے (پیغمبروں پر) اترا اس پر یقین رکھتے
(بقرہ ع - ۱)	ہیں (یعنی انبیاءؑ اور اُن کی کتابوں پر)
وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ (بقرہ ع ۱)	اور آخرت (روزِ جزا) پر یقین رکھتے ہیں،

یہ تو سورہ کے آغاز کی آیتیں ہیں، سورہ کے بیچ میں پھر ارشاد ہوا،

وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ	اور لیکن نیکی یہ ہے کہ جو شخص خدا پر، آخری دن
الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ وَالْکِتٰبِ وَ	پر، فرشتون پر، اور کتاب پر، اور سب نبیون
النَّبِیّٖنَ، (بقرہ ع - ۲۲)	پر ایمان لائے،

سورہ کے آخر میں ہے،

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ	پیغمبر پر جو کچھ اُتارا گیا، اُس پر وہ خود، اور
مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ، کُلٌّ	تمام مومن ایمان لائے، سب خدا پر، اُس کے

اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ، (بقرہ - ۴۰)

فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے،

سورۂ نساء میں ان ہی عقائد کی تعلیم ہے،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا،

(نساء - ۲۰)

اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو، ایمان لاؤ خدا پر، اور اس کے رسول پر، اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری، اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے اتاری، اور جو شخص خدا کا، اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا، اس کے پیغمبروں کا، اور روز آخرت کا انکار کرے گا وہ سخت گمراہ ہوا،

اللہ تعالیٰ پر ایمان

اٰمَنَ بِاللّٰہِ

ایک قادرِ مطلق اور ہمہ صفت موصوف ہستی پر یقین، اور اس کو ایک جاننا تعلیمِ محمدی کی پہلی ابجد ہے، اسلام سے پہلے جو مذاہب تھے، باوجود اس کے کہ خدا کی توحید اور صفات پر ایمان رکھنا اُن کے اصول میں بھی داخل تھا، مگر اُن کی تعلیمات میں ترتیب مفقود تھی، اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اُن کی نگاہ میں توحید کا مسئلہ اہمیت کے کس درجہ پر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس مسئلہ کی اصلی اہمیت محسوس کی، اور اس کو اپنے نصابِ درس کا پہلا سبق اور روحانی معارف و حقائق جسمانی اور اعمال و اخلاق کا سرِ بنیاد قرار دیا، خدا اگر چاہے تو انسان کے تمام گناہوں سے درگذر کر سکتا ہے، مگر اسی ایک حقیقت سے انکار وہ جرم ہے جس کو وہ کبھی معاف نہ فرمائیگا،

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ	یقیناً خدا شرک کو معاف نہ کرے گا، اور
وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ	اس کے سوا جس کے جو گناہ چاہے معاف
(نساء - ۱۸)	کردے،

پھر اس کے ساتھ خالص توحید کا بیان اسماء و صفات کی تشریح، شرک کے ہر پہلو کی نفی، اور

توحید کے ہر پہلو کی تکمیل تعلیم محمدیؐ کی امتیازی شان ہے، معلوم ہوچکا ہے کہ نبوتِ محمدیہ کی غرض وغایت صرف تخیل، نظریہ آرائی اور الہیاتی فلسفہ نہ تھا، بلکہ ایک زندہ قوم، جد وجہد اور عمل والی قوم اخلاص و ایثار اور نیکی و تقویٰ والی قوم کو پیدا کرنا تھا، اور اس کو تمام دنیا کی پیشوائی کے لئے نمونۂ عمل بنانا تھا، اس لئے سب سے پہلے اہلِ عرب کو جو اس کے مخاطبِ اوّل تھے، رموز و اسرار توحید کا اس طرح حامل بنانا تھا کہ اُن کے رگ و ریشہ میں ولولہ اور جوش کا ایک نشہ پیدا ہو جائے، اس کے لئے ضرورت تھی کہ سب سے پہلے زمین کو ہموار کیا جائے، شرک کے وہ تمام عقائد جو عربوں میں پھیلے ہوئے تھے، اُن کو مٹا دیا جائے، اور جن وجوہ اور اسباب سے شرک کے یہ عقائد پیدا ہوتے ہیں اُنکی بیخ کنی کیجائے۔

اصلاحِ عقائد معلوم ہوچکا ہے کہ عرب میں جہالت اور وحشت کی وجہ سے سیکڑوں غلط عقائد اور توہمات پھیل گئے تھے، اور دنیا کے دوسرے مذاہب کے عقائد میں بھی بہت سی غلطیاں داخل ہوگئی تھیں، ان میں سب سے زیادہ بدتر، اور تمام برائیوں کا اصلی محور شرک تھا، اس لئے سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی اصلاح سے آغاز کیا،

شرک اور بُت پرستی کا اصلی زینہ اسباب و مؤثرات کا وجود ہے، خدا نے عالم میں ایک سلسلۂ اسباب قائم کر دیا ہے، اور عالم کے تمام واقعات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں لیکن یہ تمام سلسلہ ایک قادرِ مطلق کے دستِ قدرت میں ہے، اور اس سلسلہ کی ایک کڑی بھی اس کے اشارہ کے بغیر جنبش نہیں کر سکتی، شرک اس طرح شروع ہوتا ہے کہ پہلے انسان ان اسباب و علل میں سے بعض نمایاں اور قوی الاثر اسباب سے متاثر ہوتا ہے، اجرامِ فلکی کی عظمت، آفتاب و ماہتاب کی نور افشانی، سمندر کا پُر زور تلاطم، عناصر کی نیرنگ آرائیاں انسان کو مبہوت کر دیتی ہیں، وہ اُن کی عظمت و تاثیر سے

متاثر، پھر منفعل، اور بالآخر اُن کا غلام بن جاتا ہے، اعتقاد کے پہلے مرحلہ مین انسان، غور رسی کے دعوی سے اس قدر امتیاز اور تفریق کرتا ہے کہ یہ چیزین خود خدا یا معبود نہیں ہیں لیکن یہ تمیز آخر تک قائم نہیں رہتی، بلکہ رفتہ رفتہ خوش اعتقادی کا اثر غالب آتا جاتا ہے، اور یہ چیزیں خدا کی شریک بنتی جاتی ہین یہانتک کہ اصلی مسبب الاسباب نظر سے بالکل اوجھل ہو جاتا ہے،

شرک کی جو گوناگوں صورتیں دنیا مین موجود تھین، اور جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا استیصال کیا، اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے،

۱۔ دنیا کی مشہور قومون میں سے عیسائی اور مجوسی علانیہ مشرک تھے، یعنی تین اور دو خدا مانتے تھے، ہندو بھی اسی کے قریب قریب تھے، ان مذہبوں کی ابتدا، اس طرح ہوئی کہ خدا کے جو مختلف نمایان اور اہم اوصاف ہیں، ان کا مستقل اور مجسم وجود قائم ہو گیا، مثلاً صفتِ خلق، اور احیائ واماتت، برہما، بشن، مہیش کے نام سے موسوم ہیں، مجوسیون نے دیکھا کہ دنیا میں جس قدر اشیا، اور افعال وحرکات ہیں، سب باہم متضاد ہیں، نور و ظلمت، پستی و بلندی، یمین و شمال، نرم و سخت، رات دن، خیر و شر، حلم و غضب، غرور، خاکساری، فسق و صلاح، کوئی چیز مقابلہ اور تضاد سے خالی نہیں اسلئے ایسے دو متضاد عالم کا خالق ایک نہیں ہو سکتا، اس بنا پر اُنھوں نے دو خدا تسلیم کئے، اور ان کا نام یزدان اور اہرمن یا نور و ظلمت، رکھا،

قرآن مجید مین تمام احکام، نہایت تدریج کے ساتھ نازل ہوئے ہیں، یہانتک کہ ۱۲ برس کی وسیع مدت تک روزہ، زکوٰۃ اور حج کچھ فرض نہیں ہوا تھا لیکن شرک کا استیصال کلی نبوت کا پہلا سبق تھا سورۂ زمر مکہ میں نازل ہوئی، اور اسی سورہ میں شرک کی تمام صورتین مٹا دی گئیں، تمام دیگر سورتون

میں نہایت کثرت سے اس قسم کے شرک کا ابطال اور رد کیا ہی، اس لئے اسکی تفصیل کی ضرورت نہین،

مجوسیون کے شرک کی بنیاد اس پر تھی کہ افعالِ خیر و شر کا ایک خالق نہیں ہو سکتا، ورنہ لازم آئیگا کہ خدا شر کو پیدا کرتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص بُرائی کے پیدا ہونے کو جائز رکھتا ہی، وہ خود اچھا نہیں ہو سکتا، اس لئے قرآن مجید مین نہایت کثرت سے تصریحات آئین کہ جن کو ہم خیر و شر کہتے ہیں سب کا فاعل خدا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت تصریح و تاکید کیساتھ تعلیم کی کہ جو کچھ ہوتا ہی سب خدا کے حکم سے ہوتا ہی، باقی یہ مسئلہ کہ بُری چیز کا خالق اچھا نہیں ہو سکتا، اولاً تو یہ مغالطہ آمیز غلطی ہی، ایک صناع مصور اگر ایک نہایت بدصورت جانور کی تصویر نہایت اچھی کھینچے تو اس کے کمال مصوری میں اس سے کچھ داغ نہیں آئیگا کہ جانور خود برا ہے، دوسرے یہ کہ اسلام نے اس مسئلہ کی جس اصلی گرہ کو کھولا ہے، وہ یہ ہے کہ اشیاء بذاتہ خیر و شر نہیں ہیں، بلکہ وہ اپنے صحیح یا غلط طریقۂ استعمال سے خیر یا شر ہو جاتی ہیں، آگ بجائے خود نہ خیر ہے، نہ شر، اگر اس سے اچھا کام لیا جائے تو خیر ہے، اور بُرا لیا جائے تو شر ہے، زہر نہ اچھا ہے، نہ بُرا، اگر اس کو بیماریوں کے استیصال میں استعمال کیا جائے تو خیر ہے، اور اگر کسی بیگناہ کے قتل مین استعمال کرو تو شر ہے، اسی طرح دوسری اشیاء کے بھی خیر و شر کے دونون پہلو ہیں، نہ کوئی شے دنیا میں خیر مطلق ہی، نہ کوئی شرِ محض، اسی لئے قرآن نے شر کی نسبت خدا کی طرف نہیں کی ہے، بلکہ خود انسان کی طرف کی ہے،

أَشَرٌّ أُرِيدَ بِمَن فِي الْأَرْضِ أَمْ	آیا اہل زمین کے ساتھ شر کا ارادہ کیا گیا ہی
أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا (جن - ۱)	یا اُن کے پروردگار نے اُن کو راہ پر لانا چاہا ہے،
مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ	تجھکو جو نیکی پہونچی تو وہ خدا کی طرف سے ہی،

وَمَا اَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَۃٍ فَمِنْ نَفْسِکَ (نساء)	اور جو مصیبت پہنچی وہ خود تیری طرف سے ہے،
اَوَلَمَّا اَصَابَتْکُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَدْ اَصَبْتُمْ	کیا جب تم کو کوئی مصیبت پہنچی جس کی دوگنی
مِّثْلَیْھَا قُلْتُمْ اَنّٰی ھٰذَا ط قُلْ ھُوَ مِنْ	تم اُن کو پہنچا چکے ہو، تو تم نے کہا یہ کہاں سے
عِنْدِ اَنْفُسِکُمْ، اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ	آئی، کہدے کہ خود تمھاری طرف سے ہے،
قَدِیْرٌ، (آل عمران - ۱۷)	خدا ہر بات پر قدرت رکھتا ہے،

الغرض کسی شے کا ایسا پیدا کرنا جس میں خیر و شر کے دونون پہلو ہیں، شر نہیں ہے، اُن میں اُس کے شر کے پہلو کو استعمال کرنا اور کام میں لانا شر ہے، ڈاکٹر بہت سی بیماریوں کے لئے زہر کی دوائین بناتے ہیں، مگر یہ شر نہیں، البتہ جب کوئی شریر ان دواؤن سے ان امراض کے ازالہ کے بجائے کسی کی جان لے لیتا ہے، تو وہ شر ہے، حاصل یہ کہ اس دنیا میں جب خیر و شر اشیا رمین بذاتہ نہیں ہے، تو اچھی چیزون کے لئے الگ اور بُری چیزون کے لئے الگ خالق تسلیم کرنے کی ضرورت نہین ہے، بلکہ خالق ایک ہی ہے، دو نہیں ہین،

وَقَالَ اللّٰہُ لَا تَتَّخِذُوْا اِلٰھَیْنِ اثْنَیْنِ	اور خدا نے کہا کہ دو خدا نہ بناؤ وہ ایک ہی خدا ہے،
اِنَّمَا ھُوَ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ج فَاِیَّایَ فَارْھَبُوْنَ	تو مجھی سے ڈرو، اور اسی کے لئے ہے جو آسمانون
وَلَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (نحل)	میں اور زمین میں ہے،

بندگون کی مشرکانہ تعظیم سے روکنا

۲- شرک کا بہت بڑا ذریعہ کسی خاص شخص، خاص شے کی تعظیم مفرط ہے جس کو شخص پرستی یا یادگار پرستی سے تعبیر کر سکتے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، رامچندر، کرشن کو اسی خوش اعتقادی نے آدمی سے خدا بنا دیا، اس بنا پر قرآن مجید مین نہایت پرزور اور پرعب الفاظ مین شخص پرستی کی تحقیر کیگئی

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَ
لَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ اِنَّمَا
الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ
لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا
لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ وَمَنْ
يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ
فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا (نساء ۲۴)
لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ
الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ
مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ
الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي
الْاَرْضِ جَمِيْعًا ج وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ
وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (مائدہ ۳)
وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ
ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ
اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالَ

(نساء ۲۳-۲۲)

اے اہل کتاب اپنے دین میں حد سے زیادہ
نہ بڑھ جاؤ، اور خدا کی نسبت وہی کہو جو حق ہے
مسیح یعنی عیسیٰ بن مریم صرف خدا کے پیغمبر ہیں،
مسیح کو خدا کا بندہ ہونے سے ہرگز عار نہیں اور
نہ مقرب فرشتوں کو (عار ہے) اور جس شخص کو
خدا کی بندگی سے عار ہوگا، اور بڑائی کی لیگا تو
خدا سب کو عنقریب اپنے حضور میں جائیگا،
وہ لوگ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ عیسیٰ بن مریم
خدا ہیں، کہدو کہ اگر خدا یہ چاہے کہ مسیح بن مریم
کو اس کی ماں کو اور دنیا میں جو کچھ ہے سب کو برباد
کر دے تو کون ہے، جو خدا کو روک لے، اور
خدا ہی کے لئے آسمان و زمین اور جو چیزیں ان
دونوں میں ہیں، سب کی حکومت ہے، وہ جو چاہے
کرے، اور خدا ہر چیز پر قادر ہے،
اور جب خدا کہے گا کہ کیوں عیسیٰ! تم نے
لوگوں سے کہدیا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھکو اور
میری ماں کو خدا کہو عیسیٰ عرض کریں گے کہ سبحان اللہ

سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا	میری یہ مجال ہو کہ میں ایسی بات کہوں جس کے
لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ	کہنے کا مجھے حق نہیں، اگر میں نے کہا ہوگا تو تو
عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ	جانتا ہوگا، تو میرے دل کی بات جانتا ہے اور
اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ	میں تیرے دل کی بات نہیں جانتا تو بڑا غیب دان
الْغُيُوْبِ ؕ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ	ہے، میں نے لوگوں سے صرف وہی کہا تھا جس کا
بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ	حکم تو نے مجھ کو دیا تھا، یعنی یہ کہ خدا کی عبادت
(مائدہ ۱۶ - ۱۶)	کرو جو میرا بھی خدا ہے، اور تمھارا بھی'

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باوجود اس کے کہ حاصلِ کون و مکان تھے، لیکن بار بار قرآن مجید میں تاکید آتی تھی،

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ	کہدے اے پیغمبر کہ میں تو تمھاری ہی طرح
اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ	آدمی ہوں لیکن یہ کہ میری طرف وحی بھیجی جاتی
(کہف - ۱۲)	ہے کہ تمھارا خدا ایک خدا ہے،

ایک خاص نکتہ غور کے قابل ہے جس قدر جلیل القدر انبیاء علیہم السلام گذرے ہیں، اُن کے خاص خاص لقب ہیں، مثلاً حضرت موسیٰ کلیم اللہ تھے، حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت عیسیٰ روح اللہ تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باوجود اس کے کہ اشرفِ انبیاء تھے، آپ کا کیا لقب تھا ؟ اور کلمۂ توحید میں، نماز میں، درود میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمِ گرامی کے ساتھ کیا امتیازی وصف شامل کیا گیا ؟ صرف رسالت اور عبدیت !

اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ — میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد خدا کے بندہ اور رسول ہیں،

اس میں بھی عبدیت کا وصف رسالت پر مقدم ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ بعض کفار کے حق میں دعائے بد کی، اس پر یہ آیت اُتری[1]،

لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْئٌ اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْہِمْ — تم کو کچھ اختیار نہیں ہے، خدا چاہیگا، تو اُن پر

اَوْ یُعَذِّبَہُمْ فَاِنَّہُمْ ظَالِمُوْنَ (آل عمران ۱۳) — توجہ کرے گا، یا ان کو عذاب دیگا، کہ وہ ظالم ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعض کفار کی ہدایت پانے اور اسلام قبول کرنے کے نہایت خواہشمند تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

اِنَّکَ لَا تَہْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ (قصص ۶) — تم جس کو چاہتے ہو اس کو ہدایت نہیں کر سکتے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی کے لئے دعائے مغفرت کی اُس پر قرآن مجید میں آیا[2]،

اِسْتَغْفِرْ لَہُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَہُمْ — تم اُن کے لئے مغفرت چاہو یا نہ چاہو، اگر تم

اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَہُمْ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً — ان کے لئے ستر دفعہ بھی مغفرت چاہو گے تو

فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَہُمْ (توبہ - ۱۰) — خدا ان کی مغفرت نہ کرے گا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ہر موقع پر اس امر کی تاکید، اور اس کا لحاظ رکھتے تھے، کہ لوگ آپ کی زائد از اعتدال مدح نہ کریں، جو منجر ہو کر شرک تک پہنچ جائے، بار بار فرماتے تھے،

لا تطرونی کما اطری الیھود — میری شان میں اس طرح مبالغہ نہ کرو جس طرح

---

[1] بخاری غزوہ احد، یہ حدیث بخاری کے مختلف ابواب میں مذکور ہے،

[2] بخاری کتاب التفسیر، تفسیر سورۂ توبہ،

والنصاریٰ[1]، یہود و نصاریٰ نے اپنے پیغمبروں کی شان میں کیا،

ایک دفعہ آپ راستہ میں جا رہے تھے، ایک شخص نے دفعۃً آپ کو دیکھا اور اس پر اس قدر رعب طاری ہوا کہ کانپنے لگا آپ نے فرمایا، ڈرو نہیں، میں ایک قریشی خاتون کا بیٹا ہوں جو گوشت کو خشک کرکے کھایا کرتی تھی[2]،

بنو عامر کا ایک وفد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو لوگوں نے عرض کی آپ ہمارے سید (آقا) ہیں، آپ نے فرمایا سید خدا ہے، لوگوں نے عرض کی آپ ہم سب سے افضل اور سب سے برتر ہیں، آپنے فرمایا اچھا، یہ کہو لیکن دیکھو کہیں تم کو شیطان اپنا وکیل نہ بنا لے[3]، اصلی الفاظ یہ ہیں؛ قولوا بقولکم ولا یستجرینکم الشیطان،

ایک دفعہ ایک شخص نے ان الفاظ میں آپ کو مخاطب کیا اے ہمارے آقا! اور ہمارے آقا کے فرزند! اور اے ہم میں سب سے بہتر اور سب سے بہتر کے فرزند آپ نے فرمایا، لوگو! پرہیزگاری اختیار کرو، شیطان تمہیں گراں نہ دے، میں عبد اللہ کا بیٹا محمد ہوں، خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، مجھ کو خدا نے جو مرتبہ بخشا ہے، مجھے پسند نہیں کہ تم مجھے اس سے زیادہ بڑھاؤ[4]،

غور کرو کہ رسول کی شان میں یہ الفاظ ناجائز نہیں، مگر توحید کو شرک کے ہر شائبہ سے بچانے کا خیال ہر خیال پر غالب تھا،

درمیانی واسطوں کا مشرکانہ اعتقاد

۳- شرک کا اصلی ضرریہ ہے کہ خدا سے انسان کو جس درجہ کا تعلق، جس قسم کا عجز و نیاز جس مرتبہ

---

[1] بخاری جلد اول کتاب الانبیاء باب اذکر فی الکتاب مریم [2] شمائل ترمذی و مستدرک جلد ۳ صفحہ ۴۸ علی شرط الشیخین واقعہ فتح مکہ،

[3] ادب المفرد امام بخاری باب یقول سیدی و ابو داؤد کتاب الادب باب کراہیۃ التمادح [4] مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۵۳

کی محبت جس درجہ التجا درکار ہے، اس کا رُخ دوسری جانب بدل جاتا ہی، ہزارون لاکھون آدمی ہین جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ دیوتا کائنات اور زمین وآسمان کے خالق نہیں ہیں، تاہم وہ ہر قسم کی حاجتیں اور مرادین ان ہی دیوتاؤن اور معبودون سے مانگتے ہین، انہی کو حاجت روا جانتے ہین، اٹھتے بیٹھتے ان ہی کا نام لیتے ہین، ان ہی پر نذر ونیاز چڑھاتے ہیں، غرض براہ راست اُن کو جو تعلق ہوتا ہے، ان ہی معبودون سے ہوتا ہی، خود مسلمانون میں ہزارون لاکھون آدمیون کا طرز عمل انبیاء و صلحاء بلکہ مزارات کی نسبت اس کے قریب قریب ہی، اس بنا پر مقدم ترین امر یہ ہی کہ معبودون کی نسبت اس قسم کا خیال نہ پیدا ہونے پائے، بلکہ صاف صاف بتادیا جائے کہ خدا کے آگے کسی کی کچھ نہین چل سکتی، اور اس کی مرضی میں کوئی دست اندازی نہیں کرسکتا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے طلب مغفرت کا وعدہ کیا، تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا،

لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَکَ وَمَآ اَمْلِکُ لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ، (ممتحنہ-۱)

مین آپ کے لئے مغفرت کی درخواست ضرور کرون گا، لیکن مجھ کو خدا کے سامنے آپ کی نسبت کوئی اختیار نہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مین نے اپنی والدہ کے لئے استغفار کی اجازت مانگی تھی، وہ نہیں ملی، البتہ یہ درخواست قبول ہوئی کہ مین اُن کی قبر کی زیارت کرلون[1]،

قرآن مجید مین جب یہ آیت اتری وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ تو آپ نے خاندان کے لوگون کو جمع کرکے فرمایا" اے قریشیو! اے اولادِ عبدالمطلب! اے عباس! اے صفیہ!

[1] صحیح مسلم کتاب الجنائز،

اے فاطمہ! میرے مال مین سے جو مانگوین دیسکتا ہون لیکن خدا کے ہان میں تمھارے لئے کچھ نہین کرسکتا[۱]"

قرآن مجید مین نہایت کثرت اور نہایت تشدد کے ساتھ اس مضمون کو ادا کیا گیا کہ تم لوگ جن کو حاجت روا سمجھتے ہو اور جن سے حاجتیں مانگتے ہو، اُن کو کارخانۂ ہستی مین کسی قسم کا اختیار نہین،

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُوْنِهٖ	کہدو کہ خدا کے علاوہ تم جن کو پکارتے ہو،
فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَ	وہ تمھاری مصیبت کے ہٹانے یا بدلنے کا
لَا تَحْوِيْلًا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ	کچھ اختیار نہین رکھتے، جن کو یہ لوگ پکارتے
يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ	ہیں، وہ (بھی) زیادہ قرب حاصل کرنے
اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ	کے لئے خود خدا ہی کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں
عَذَابَهٗ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ	اور اسکی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں، اور
مَحْذُوْرًا، (بنی اسرائیل - ۶)	اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، بے شبہہ
	تیرے خدا کا عذاب ڈرنے ہی کے قابل ہے'

۵- شرک کا ایک بڑا ذریعہ خوارقِ عادات کی نسبت غلط فہمی ہے، جن اشخاص سے خوارقِ عادات سرزد ہوتے ہیں، اُن کی نسبت لوگون کو پہلے یہ خیال آتا ہے کہ یہ خود خدا نہیں ہیں، لیکن اُن مین خدائی کا شائبہ ضرور ہے، ورنہ ایسے افعال کیونکر سرزد ہوتے، جو قدرتِ انسانی سے بالاتر ہین یہی خیال رفتہ رفتہ دیوتا اور اوتار تک ترقی کرتا ہے، اور بالآخر خدائی تک پہنچا دیتا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام

[۱] یہ روایت اس آیت کی تفسیر مین تمام تفسیرون اور حدیث کی کتابون مین منقول ہی،

اسی بنا پر آج چالیس کرور آدمیوں کے خدا، یا خدا کے بیٹے ہیں،

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ انبیا علیہم السلام سے معجزات صادر ہوتے ہیں، اور یہ امر خصائصِ نبوت میں ہے، تاہم یہ مسئلہ اسلام کے زمانہ تک مشتبہ اور مجمل رہا، قرآن مجید میں اس کے متعلق حسب ذیل امور بیان کئے گئے ہیں،

(۱) معجزات صادر ہو سکتے ہیں، اور خدا اپنے مقبول بندوں کو معجزات عطا کرتا ہے،

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ قُلْ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَن يُنَزِّلَ آيَةً وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ، (انعام-۴)

اور کفار کہتے ہیں کہ اُن (آنحضرتؐ) پر کوئی معجزہ خدا کے یہاں سے کیوں نہیں اُترا، کہدو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ معجزہ نازل کرے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے،

(۲) باوجود اس کے کفار کو معجزہ طلبی سے روکا جاتا تھا، اور کہا جاتا تھا کہ نبوت اور رسالت معجزہ پر موقوف نہیں،

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ، (رعد-۱)

اور کفار کہتے ہیں کہ اُن (آنحضرت) پر کوئی معجزہ خدا کے ہاں سے کیوں نہیں اُترا، تم تو صرف ڈرانے والے ہو، اور ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہوتا ہے،

وَقَالُوا لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنبُوعًا، أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ

اور کفار کہتے ہیں کہ ہم تمہارا ایمان نہ لائینگے جب تک تم زمین سے چشمہ نہ نکالدو، یا تمھارے

مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ وَّتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ	پاس کھجوروں یا انگوروں کا باغ نہ ہو کہ جس کے
خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۙ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ	بیچ میں تم نہریں جاری کر دو، یا آسمان کو ٹکڑے
كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ	ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گرا دو، جیسا کہ تمہارا گمان
بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۙ اَوْ يَكُوْنَ	تھا، یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے
لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى	نہ لے آؤ، یا تمہارا گھر سونے کا نہ بنجائے یا تم
فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ	آسمان پر نہ چڑھ جاؤ، اور ہم تو اس چڑھنے
حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۚ	پر بھی یقین نہ لائیں گے، جب تک ہم پر کوئی
قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا	کتاب نہ اتارو جس کو ہم خود پڑھیں" کہدو کہ
رَّسُوْلًا ۝ (بنی اسرائیل ۱۰)	سبحان اللہ میں تو صرف بشر ہوں اور رسول ہوں

(۳) جو معجزے اس آیت میں کفار نے طلب کئے، وہ ناممکن باتیں نہ تھیں تاہم خدا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو جواب تلقین کیا، وہ یہ تھا کہ میں تو بشر ہوں، دوسری جگہ اس کا جواب یہ دیا کہ معجزے تو خدا کے پاس ہیں یعنی معجزے صادر ہوں گے، تو یہ میرا فعل نہ ہوگا، بلکہ خدا کا ہوگا۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ	اور کفار کہتے ہیں کہ اُن (آنحضرتؐ) پر اُن کے
رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَ	خدا کے یہاں سے معجزے کیوں نہیں اترے کہدو
اِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ	کہ معجزے تو خدا کے ہاں ہیں، اور میں تو صرف
اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ	صاف صاف ڈرانے والا ہوں کیا اِن
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ	(کفار) کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے تمہارے

لِقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ، اور یہ کتاب (قرآن) اُتاری جو اُن پہ تلاوت کی جاتی ہے، اس میں بے شبہہ ایمان لانے والوں کے لئے رحمت اور یاد رکھنے کی چیز ہے،

(عنکبوت - ۵)

اسی لئے معجزات کے ذکر میں ہمیشہ بِاِذۡنِ اللّٰہ (خدا کی اجازت سے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں،

۴- شرک کی ایک قسم یہ بھی کہ انبیاء یا پیشوایان مذہبی کو تحریم و تحلیل کا مجاز سمجھتے تھے یعنی وہ جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں، اور جس چیز کو چاہیں حلال ٹھہرا دیں، قرآن مجید میں جب یہ آیت اتری،

حرام و حلال کرنا خدا کا کام ہے

اِتَّخَذُوۡۤا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا ان لوگوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو رب بنا لیا ہے،

(توبہ - ۵)

تو حضرت عدیؓ نے جو حاتم طائی کے فرزند اور اسلام لانے سے پہلے عیسائی تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ ہم لوگ اپنے پیشوایان مذہبی کو اپنا رب تو نہیں سمجھتے تھے، آپنے ارشاد فرمایا کیا تم لوگوں کا یہ اعتقاد نہ تھا کہ یہ لوگ جس چیز کو چاہیں حلال اور جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں، عرض کی کہ ہاں، آپ نے فرمایا یہی رب بنانا ہے[1]" عموماً اہل مذاہب پیغمبروں کو شارع مستقل سمجھتے ہیں لیکن یہ بھی ایک قسم کا شرک ہے، شریعت کی تاسیس، حلال و حرام کی تعیین، جائز و ناجائز کی تفریق امر و نہی کے احکام یہ سب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں، پیغمبر صرف مبلّغ اور پیغام رساں اور تعلیم الٰہی سے ان احکام کے شارح اور بیان کرنے والے ہیں، اسی بنا پر قرآن مجید میں ذات نبویؐ کی صفت رسالت کو بار بار تاکید، اور اصرار کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے،

---

[1] جامع ترمذی و ابن کثیر تفسیر آیت مذکور،

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ	محمد تو صرف ایک رسول ہے اس سے پہلے اور
مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ، (آل عمران ۱۵)	رسول گذر چکے ہیں،
اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ	مریم کا بیٹا عیسیٰ، اللہ کا صرف رسول
رَسُوْلُ اللهِ (نسا-۲۳)	تھا،

اس حصر سے مقصود یہ ہے کہ انبیا میں خدائی کی کوئی صفت نہیں ہوتی، بلکہ جو کچھ ان مین ہے وہ رسالت اور نبوت کے اوصاف ہیں،

غیر خدا کی مشرکانہ تعظیم

۷- شرک کا ایک بڑا ذریعہ یہ تھا کہ جو اعمال اور آداب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں، وہ اوروں کے ساتھ بھی برتے جاتے تھے، یہ اگرچہ شرک فی العبادۃ یا شرک فی الصفات ہے لیکن رفتہ رفتہ شرک فی الذات تک منجر ہوتا ہے، سجدۂ عبادت خدا کیساتھ مخصوص ہے لیکن کفار اور دیگر اہل مذاہب بتون اور مقتدایان دینی کو بھی سجدہ کرتے تھے اور سلاطین و امرار کو سجدہ کرنا عام طور سے رائج تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت سختی سے اس کو روکا، بنواسرائیل میں سجدۂ تعظیمی یا سجدۂ محبت جائز تھا، چنانچہ حضرت یوسف کو ان کے والدین نے سجدہ کیا تھا لیکن چونکہ اسلام میں توحید کو انتہائے کمال تک پہنچانا تھا، سجدۂ تعظیمی بھی منع کر دیا گیا، ایک صحابی خدمتِ اقدس مین آئے، اور عرض کی کہ مین نے اہل عجم کو دیکھا ہے وہ اپنے رئیسوں کو سجدہ کرتے ہیں آپ اجازت دین تو ہم آپ کو سجدہ کرین آپ نے فرمایا تو کیا میری قبر پر گذروگے تو اسکو سجدہ کروگے؟ عرض کی نہیں، فرمایا تو اب بھی نہ کرو، اگر مین کسی کو دوسرے کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیسکتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے[۱] اسی طرح ایک اور صحابی ملک شام سے آئے تو آپ کو سجدہ کیا آپ نے

[۱] ابوداؤد کتاب النکاح باب حق الزوج علی المرأۃ

پوچھا کہ یہ تم نے کیا کیا؟ عرض کی کہ میں نے شام میں رومیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے مذہبی افسروں کو سجدہ کرتے ہیں، تو میرا جی چاہا کہ میں بھی آپ کو سجدہ کروں، فرمایا ایسا نہ کرو، اگر میں کسی کو خدا کے سوا سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے[1]،

۸- شرک کی ایک قسم یہ ہے کہ خدا کے ساتھ جو اوصاف مخصوص ہیں وہ اوروں میں تسلیم کیے جائیں جس کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ وہ شرکت وصف کی بنا پر، خدا کے شریک اور ہمسر بنجائیں، ان میں سے ایک وصف علم غیب ہے، اکثر اہلِ مذاہب اعتقاد رکھتے تھے، اور اب بھی رکھتے ہیں کہ انبیاء اور اولیا کو علم غیب ہوتا ہے، بنی اسرائیل کے زمانہ میں کاہنوں کا یہی کام تھا کہ وہ آیندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کیا کرتے تھے، عرب میں بھی کاہن یہی پیشہ کرتے تھے، اور مختلف طریقوں سے پیشین گوئی کرتے تھے کبھی فال سے کبھی پانسے پھینک کر، اور کبھی یہ ظاہر کرکے کہ اُن کو جنات غیب کا حال بتا جاتے ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت تاکید اور استقصا، کیساتھ اس اعتقاد کو مٹایا، اور علم غیب کی تمام صورتیں باطل کیں، خود قرآن مجید میں نہایت کثرت سے اس کے متعلق آیتیں نازل ہوئیں،

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ، (انعام - ۷)	اور خدا کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجمال کی تفصیل بیان فرمائی، اور فرمایا کہ مفاتیح غیب پانچ ہیں، جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا،

---

[1] ابن ماجہ باب حق الزوج علی المرأۃ [2] صحیح بخاری کتاب الرد علی الجہمیہ میں تفصیل مذکور ہے،

۱- حمل یعنی لڑکا ہوگا یا لڑکی،

۲- کل کیا ہوگا،

۳- بارش کب ہوگی،

۴- کس جگہ موت آئے گی،

۵- قیامت کب آئے گی،[1]

اگرچہ علم غیب کی اور بھی صورتیں ہیں، لیکن زیادہ تر ان ہی امور کی نسبت لوگ علم غیب کے مدعی تھے، اور ان ہی باتوں کو لوگ پہلے سے جاننے کے خواہشمند ہوتے ہیں،

یہاں تک کہ خود اپنی ذات سے بھی علم غیب کی نفی کی، ایک دفعہ ایک شادی کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، انصار کی چند لڑکیاں گا رہی تھیں، گاتے گاتے انھوں نے یہ گانا شروع کیا،

وفینا رسول یعلم ما فی غد	اور ہم میں ایک ایسا پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ یہ نہ کہو، وہی کہو جو پہلے گا رہی تھیں،[2] اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاص حکم دیا کہ آپ اس حقیقت کو واضح کر دیں،

قُلْ لَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَائِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ،	کہدو کہ اے پیغمبر کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، اور نہ میں غیب کی
(انعام - ۵)	باتیں جانتا ہوں،

---

[1] صحیح بخاری کتاب الرد علی الجہمیہ میں تفصیل مذکور ہے، [2] صحیح بخاری کتاب النکاح،

اور غیب کا علم صرف خدا کی صفت ہے،

قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ (نمل ۵) — کہدے اے پیغمبر کہ خدا کے سوا آسمانوں مین زمین مین کوئی غیب نہیں جانتا،

غیب دانی کے مدعی کاہن جو عرب کی گلی گلی مین خدع و فریب کا جال پھیلائے بیٹھے رہتے تھے، اور بتخانون مین خدائی کرتے تھے، اُن کی سطوت خاک مین مل گئی، بتخانے ویران ہو گئے، تو اُن کے یہ پجاری بھی فنا ہو گئے، صحابہؓ نے آکر پوچھا کہ یارسول اللہ! ہم جاہلیت مین کاہنون کے پاس جایا کرتے تھے، فرمایا اب نہ جایا کرو، عرض کی ہم پرندون سے فال لیا کرتے تھے، فرمایا یہ تمھارا وہم تھا، اس کے سبب سے اپنے ارادہ سے باز نہ رہا کرو، بعض لوگون کے سوال کے جواب مین فرمایا کہ کاہن کچھ نہیں، انھون نے کہا یارسول اللہ! ان کی بعض باتین سچی بھی نکل آتی ہین فرمایا شیطان ایک آدھ بات سُن لیتا ہے، اور مرغی کی طرح قر قر قر کرکے اپنے دوست کے کانون مین ڈالتا ہے، اور وہ اس مین سو باتین جھوٹ ملا دیتا ہے، کبھی فرمایا کہ فرشتون کی زبان سے شیاطین فضائے آسمانی مین چوری چھپے کچھ سُن لیتے ہین، اور کاہن اس مین سیکڑون جھوٹ اپنی طرف سے ملا کر بیان کرتے ہین، جاہلون مین کچھ ایسے مکار ہوتے ہیں، جو چوری کا غائبانہ پتہ بتانے کا دعویٰ کرتے ہیں، عرب اُن کو عراف کہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی کسی مال کا پتہ پوچھنے کے لئے کسی عراف کے پاس جائیگا اسکی چالیس دن کی نماز قبول نہ ہوگی علم نجوم جس کے زور سے لوگ غیب کا حال دریافت کر لینے کے مدعی بنتے تھے، آپنے اس کا سیکھنا بھی جادو کی طرح گناہ بتایا، اور فرمایا کہ جو کسی کاہن کے پاس جا کر اسکی باتون کو سچ سمجھے وہ محمد پر جو کچھ اترا ہے اس سے انکار کرتا ہے[1]

[1] مشکوٰۃ باب الکہانۃ مین صحیحین سے یہ حدیثیں نقل کی ہیں، علم نجوم کی حرمت والی حدیث ابو داؤد و ابن ماجہ اور احمد سے لی گئی،

ان تعلیمات نے خدا کے علاوہ دوسروں کی غیب دانی کے عقیدہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا کہانت کی گرم بازاری سرد ہو گئی، فال، شگونِ بد، نجوم اور غیب دانی کے دوسرے خدا عامہ طریقے مٹ گئے، پرندوں اور پانسوں کے ذریعہ سے غیب کا حال دریافت کرنا وہم و وسوسہ قرار پایا، اور غیب کی مملکت پر خدا کے سوا کسی اور کی حکومت قائم نہ رہی،

مخفی قوتوں کا ابطال

۹- کائنات میں خدا کے سوا جن غیبی اسباب و علل یعنی سحر و طلسم، جنات و شیاطین اور ارواحِ خبیثہ اور دوسری قسم کی قوتوں کی غیبی قدرت و تصرف کا اعتقاد تھا، اور اُن سے بچنے کے لئے ان کی دہائی پکاری جاتی تھی، نذر چڑھائی جاتی تھی، قربانی کیجاتی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور وحی نے اُن تمام مزخرفات کا قلع قمع کر دیا، اور خدا کے سوا تمام دوسری مخفی اور پوشیدہ قوتوں کا ڈر انسانوں کے سینوں سے ہمیشہ کیلئے نکال کر پھینک دیا، اور دعا و کلماتِ الٰہی کے سوا، ہر نوع کی جھاڑ پھونک، منتر، تعویذ گنڈے، ٹوٹکے جن میں کسی غیر خدا سے غیبی استمداد یا شرک کا کلمہ ہو، کفر قرار پائے، اسی قسم کے فاسد خیالات کے استیصال کے لئے ہر نماز میں، اور نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے ضمن میں اس آیت کے پڑھنے کا حکم دیا گیا،

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ،	(اے عالم کے پروردگار) ہم تیرے ہی آگے
(فاتحہ)	سر جھکاتے ہیں، اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں،

سحر و طلسم و جادو اور ٹوٹکے کے متعلق ارشاد خداوندی ہوا،

وَمَا هُمْ بِضَآرِّیْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا	یہ جادو اور ٹوٹکے کرنے والے کسی کو کچھ نقصان
بِاِذْنِ اللّٰهِ وَیَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّهُمْ	نہیں پہنچا سکتے، لیکن خدا کے حکم سے اور یہ ہیو

وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؕ

(بقرۃ ۱۲)

وہ (جادو اور ٹونکے) سیکھتے ہیں، جو ان کو نقصان رسان ہیں، نفع بخش نہیں، اور یقیناً ان کو علم ہو کر جو ان کو حاصل کرتا ہے اس کا آخرت میں

یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ سحر و جادو کی حقیقت وہم و تخیل سے زیادہ نہیں، فرمایا،

یُخَیَّلُ اِلَیْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰی

(طٰہٰ ۳)

مصری جادوگروں کے جادو سے یہ اس کو خیال ہوتا تھا، کہ وہ دوڑ رہے ہیں،

بلکہ بعض صحابہ نے ان مکار جادوگروں کے قلع قمع کے لئے ان کے قتل تک کا حکم دیدیا[1] تاکہ انسانوں کے دلوں میں ان کا جو خوف و ہراس بیٹھا ہوا ہے، وہ دور ہو، اور ان کے اس عاجزانہ قتل ہونے سے یہ ثابت ہو کہ اُن میں کوئی غیر معمولی طاقت نہیں، وہ بالکل بے بس ہیں،

ابوداؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ "یا رسول اللہ! ہم جاہلیت میں جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے، اب آپ کیا فرماتے ہیں"؟ ارشاد فرمایا کہ "تم اپنے منتر ہمارے سامنے پیش کرو، اگر ان میں شرک کی کوئی بات نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں" ایک اور صحابی نے ایک بیمار پاگل پر سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کی وہ اچھا ہو گیا، اُس نے اُن کو انعام دیا انھوں نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے واقعہ عرض کیا، فرمایا کہ "میری عمر کی قسم ہر جھاڑ پھونک باطل ہے لیکن تم نے سچی جھاڑ سے روزی کھائی" ایک اور صحابی روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا،

ان الرقی والتمائم والتولۃ

بیشک جھاڑ پھونک، گنڈے اور میاں بیوی

[1] جامع ترمذی باب ما جاء فی حد الساحر و ابوداؤد باب اخذ الجزیۃ من المجوس،

شرک ، (ابوداؤد و ابن ماجہ) کے چھڑانے کے تعویذ شرک ہیں،

ان ہی صحابی کے گھر میں ایک بڑھیا آیا کرتی تھی، گھروالوں نے اس سے کسی بیماری کا کوئی ٹوٹکا کرایا، ایک دھاگا پڑھ کر اس نے باندھ دیا تھا، وہ گھر آئے تو اس دھاگے پر ان کی نظر پڑی، انھوں نے ہاتھ بڑھایا اور اس کو توڑ کر پھینک دیا، پھر فرمایا کہ عبد اللہ کا خاندان شرک کی باتوں سے مستغنی ہے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے کہ جھاڑ پھونک، گنڈے، اور میاں بیوی کے چھڑانے کے تعویذ شرک ہیں" اُن کی بیوی نے کہا کیا وجہ ہے کہ ایک دفعہ میری آنکھوں میں کچھ پڑگیا، جب میں جھاڑتی تھی تو پانی رک جاتا تھا، اور جب چھوڑ دیتی تھی تو پانی بھر آتا تھا، انھوں نے جواب دیا، یہ شیطانی بات ہے، تم نے کیوں وہ نہ کیا، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے، آنکھوں میں پانی ڈالتیں اور یہ دعا پڑھتیں" اے لوگوں کے پروردگار! اس بیماری کو دور کر، تو ہی شفا دینے والا ہے، تیری شفا بخشی کے سوا کوئی شفا نہیں، ایسی شفا دے کہ پھر کوئی بیماری نہ رہے"[1]

۱۰- وہ تمام اوہام و خرافات جن سے شرک پرست اہل عرب لرزہ براندام رہتے تھے اور جن کو وہ بالذات موثر اور متصرف سمجھتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کا طلسم توڑ دیا اور اعلان فرمادیا کہ انکی کوئی اصل نہیں فرمایا۔

لاعدوی ولاطیرۃ ، وَلا صَفر ، نہ چھوت ہے نہ بدفالی ہے نہ پیٹ میں بھوک کا

وَلا ھامۃ ، (ابوداؤد و ابن ماجہ) سانپ ہے نہ مردہ کی کھوپڑی سے پرندہ نکلتا ہے؛

ایک اور صحابی کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا،

العیافۃ وَالطیرۃ والطرق من پرندوں کی بولی سے فال لینا، ان کے اڑنے سے فال

---

[1] یہ تمام روایتیں ابوداؤد جلد دوم باب التمائم و باب ماجاء فی الرقی اور ابن ماجہ باب تعلیق التمائم میں ہیں،

الجبلت ، (ابوداؤد وابن ماجہ) [1] لینا اور کنکری پھینک کر یا خط کھینچ کر حال بتانا شیطانی

ایک اور صحابی آپ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہین کہ فال نکالنا شرک ہے" پھر ان صحابی نے کہا کہ ہم صحابہ میں کوئی نہین جو اس کو بُرا نہ سمجھتا ہو، بلکہ خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیے" یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نچھتر (نو) کچھ نہین"[2] یعنی پانی کی بارش مین اس کو بالذات کوئی دخل نہیں، اسی طرح غولِ بیابانی کے متعلق عربون کے جو معتقدات تھے، ان کو آپ نے ایک لفظ سے باطل کردیا فرمایا،

لَا غول ، (ابوداؤد باب فی الطیرۃ) غولِ بیابانی کچھ نہین،

بحیرہ اور سائبہ وغیرہ جانورون کے متعلق اُن کے خیالاتِ فاسدہ کا قرآن نے ابطال کیا سورۂ انعام مین اُن کے ان مشرکانہ عقائد اور اعمال کی بتصریح تردید کی گئی اور سورۂ مائدہ مین فرمایا گیا

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ خدا نے بحیرہ اور سائبہ اور وصیلہ اور حام

وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ (مائدہ ۱۳) نہیں ٹھرایا،

بحیرہ اُس بچہ کو کہتے تھے جس کا کان پھاڑ کر بتون کی نذر کرتے تھے،

سائبہ اُس جانور کو کہتے تھے جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا،

وصیلہ بعض لوگ نذر مانتے تھے، کہ اگر بچہ نر ہو، تو اس کو بُت پر چڑھائین گے، اور اگر مادہ ہوا تو اپنے پاس رکھیں گے پھر اگر نر و مادہ پیدا ہوتے تو مادہ کیسا تھ نر بھی رکھ لیتے تھے یہ وصیلہ تھا

حامی وہ اونٹ جس کی نسل بوجھ اٹھانے اور سواری کے لائق ہو چکتی تو دیوتا کے نام پر آزاد کردیا جاتا

یہ اور اسی قسم کے دوسرے اوہام جو عرب میں پھیلے ہوئے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انکا

---

[1] ابوداؤد وابن ماجہ ذکر فال [2] ابوداؤد باب الطیرہ،

استیصال فرمایا، یہ اوہام پرستی حقیقت میں قوموں کی تباہی کا ایک بڑا سبب ہوتی ہے، یہ اوہام حقیقت کے خلاف ہونے کے علاوہ بہت سے کاموں میں خلل انداز ہوتے ہیں، اور غور سے دیکھو تو ان کا سلسلہ بالآخر کسی نہ کسی شرک تک منجر ہوتا ہے، اور انسان کو صحیح طریق عمل سے روک دیتے ہیں، مثلاً بیماری میں طب کے قاعدہ کے موافق علاج کیا جائے، تو مفید ہوگا، لیکن بہت سے لوگ وہم پرستی کے بناپر ٹونے ٹوٹکے کو دافع مرض سمجھتے ہیں، اس قسم کے اوہام عرب میں نہایت کثرت سے پھیلے ہوئے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو تصریح اور تعیین کیساتھ باطل قرار دیا، مثلاً

۱۔ عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مرجاتا ہے تو چاند یا سورج میں گرہن لگتا ہے، حضرت ابراہیمؑ آپکے صاحبزادہ نے جب انتقال کیا تو سورج میں گرہن لگا ہوا تھا، لوگوں نے خیال کیا کہ ان ہی کے مرنے کا اثر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو مسجد میں جاکر خطبہ دیا کہ چاند اور سورج خدا کی قدرت کے مظاہر ہیں، کسی کے مرنے سے ان میں گرہن نہیں لگتا[1]

۲۔ یہ خیال تھا کہ سانپ اگر مارا جائے، تو اس کا جوڑا آتا ہے اور انسان کو ہلاک کرتا ہے،

۳۔ ایک دفعہ آپ مسجد میں تشریف رکھتے تھے، ایک ستارہ ٹوٹا آپنے دریافت فرمایا کہ جاہلیت میں تم لوگ اس کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے تھے، لوگوں نے عرض کی کہ ہمارا اعتقاد تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مرجاتا ہے یا کوئی بڑا شخص پیدا ہوتا ہے تو ستارے ٹوٹتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ کسی کے مرنے یا پیدا ہونے سے ستارے نہیں ٹوٹتے[2]،

۴۔ شیرخوار بچوں کے سرہانے استرا رکھ دیا کرتے تھے کہ جنات ان کو نہ ستانے پائیں، ایک دفعہ

---

[1] صحیح بخاری باب الصلوٰۃ الکسوف [2] مسند ابن حنبل جلد اول ص۲۱۸ مصر،

حضرت عائشہؓ نے دیکھا تو اٹھا کر پھینک دیا، اور کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان باتون کو ناپسند کرتے تھے[۱]

۵۔ نظر بد سے بچنے کے لئے اونٹون کے گلے میں قلاوہ لٹکاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ کسی اونٹ کے گلے میں قلادہ نہ رہنے پائے[۲]،

الغرض توحید کامل کی تعلیم نے عربون کے تمام مشرکانہ اوہام وخرافات کو ہمیشہ کیلئے مٹادیا، اسلام کی اس اصلاحی اہمیت کا اندازہ عیسائیت کی ان مقدس روایات وحکایات سے کرو جنھون نے صدیون تک دنیا کو دیوون، بھوتون اور چڑیلون کے تسلط اور عذاب کے شکنجہ مین مبتلا رکھا اور ان کو نکالنا اور بھگانا عیسائیت کا کمال اور اعجاز سمجھا جاتا رہا،

کفارہ اور شفاعت کے غلط معنی کی تردید

۱۱۔ شرک کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب کفارہ اور شفاعت کے وہ غلط معنی تھے، جو عربوں اور عیسائیون وغیرہ میں رائج تھے، عربون نے شفاعت کے جو غلط معنی سمجھ رکھے تھے، اس کا اصلی سبب ان کا وہ تخیل تھا، جو خدا اور بندون کے تعلق کی نسبت اُن کے ذہن مین قائم تھا، وہ خدا اور بندون کے درمیان وہی نسبت سمجھتے تھے، جو ایک قاہر وجابر بادشاہ اور اسکی رعایا کے درمیان ہے اور جس طرح بادشاہ کے دربار تک ایک عام اور معمولی رعایا کی رسائی درباری سفارشیون اور مقربون کے بغیر ممکن نہین، اسی طرح اس شہنشاہ کے دربار میں بھی وہ اُس کے درباری سفارشیون اور مقربون کے بغیر رسائی ممکن نہیں سمجھتے تھے، اسی لئے وہ ان درمیانی ہستیون کے خوش رکھنے کی ضرورت کے بھی معتقد تھے، چنانچہ وہ اپنے بتون، دیوتاؤن اور فرشتون کو اسی نیت سے پوجتے تھے، اور کہتے تھے،

هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللهِ (یونس ۲) یہ اللہ کے ہان ہمارے سفارشی ہیں،

[۱] ادب المفرد باب الطیرۃ من الجن صفحہ ۱۰۰ مصر [۲] موطا امام مالک باب ماجاء فی نزع التعلیق والجرس من العین ص ۳۷۳،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کی اس بت پرستی پر ان کو ملامت کی تو انھوں نے صاف کہا

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى، (زمر-۱)

ہم ان کو اسی لئے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کے تقرب میں نزدیک کردیں،

یہودیوں میں بھی اسی قسم کی دوسری غلط فہمی تھی، وہ یہ سمجھتے تھے کہ بنی اسرائیل کا گھرانا خدا کا خاص کنبہ اور خاندان ہے اور ان کے خاندان کے پیغمبر اور نبی چونکہ خدا کے پیارے اور محبوب ہیں، اس لئے اُن کی اولاد و نسل بھی دنیا اور آخرت میں یہی درجہ رکھتی ہے، اگر ان پر کوئی مصیبت بھی پڑے گی، تو بھی اُن کے خاندان کے بزرگ جو خدا کے مقرب اور برگزیدہ ہیں وہ ہر طرح اُن کو اس سے بچالیں گے، اُن کا دعویٰ تھا کہ

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (مائدہ-۳)

ہم خدا کی اولاد اور اس کے پیارے ہیں،

قرآن نے کہا

بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ (مائدہ ۳)

بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہو، اسی کو اختیار ہے کہ جس کو چاہے بخشے اور جس کو چاہے سزا دے،

اور اسی بنا پر اُن کا دعویٰ تھا،

لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ (اٰلِ عمران-۳)

ہم کو دوزخ صرف چند گنتی کے دن چھو کر چھوڑ دے گی

قرآن نے کہا:

وَغَرَّهُمْ فِىْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا

اور یہ اپنے دل سے بنا کر جو جھوٹ عقیدہ گھڑ چکے ہیں

يَفْتَرُوْنَ ، (آل عمران) وہ اُن کے مذہب کے بارہ میں اُن کو دھوکا دے رہا ہے،

عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا اور ہے کہ باپ (خدا) نے تمام انسانوں کی طرف سے جو موروثی اور طبعی طور سے گنہگار ہیں اپنے اکلوتے بیٹے (حضرت عیسیٰؑ) کو قربانی دیکر اُن کے گناہوں کا کفارہ دیدیا اور وہ گناہوں سے پاک وصاف ہوگئے، اور حضرت عیسیٰؑ اور اُن کے بعد اُن کے جانشین پوپوں کو گناہوں کے معاف کرنیکا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جو زمین پر کھولیں گے وہ آسمان پر کھولا جائیگا اسی لئے پوپوں کے سامنے کے سامنے اعترافِ گناہ کا عقیدہ عیسائیوں میں پیدا ہوا اور انکو بندوں کے گناہوں کے معاف کرنیکا دنیا میں حق ملا،

پیغام محمدیؐ نے ان کو ملزم قرار دیا اور کہا،

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ انھوں نے خدا کو چھوڑ کر، اپنے عالموں اور راہبوں

اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (توبہ-۵) کو اپنا خدا بنا رکھا ہے،

اور اصولی طور پر اُس نے یہ بتادیا کہ

وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ (آل عمران) اور خدا کے سوا کون گناہوں کو معاف کرسکتا ہے،

اُن کا عقیدہ تھا کہ بیٹا قیامت کے دن باپ کے داہنے بازو برابر بیٹھکر خلق کا عدل و انصاف کریگا قرآن پاک نے ایک بڑے موثر طرز میں اسکی تردید کی ہے قیامت کے دن خدا حضرت عیسیٰؑ سے پوچھے گا،

ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اے عیسیٰؑ! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کو

اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ، (مائدہ-۱۶) چھوڑ کر مجھکو اور میری ماں کو خدا بناؤ،

وہ کہیں گے، بار الٰہا! میں نے تو اُن سے وہی کہا جو تو نے کہا تھا، میں نے تو اُن کو یہ تعلیم نہیں دی تھی، میں نے تو اُن سے یہی کہا تھا کہ صرف ایک خدا کو پوجا

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ط و	اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں
اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ	اور اگر تو بخشدے تو تو سب کچھ کر سکتا ہے
الْحَكِيْمُ (مائدہ - ۱۶)	کہ تو غالب اور حکمت والا ہے،

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ گناہوں کی مغفرت اور معافی یا گناہوں پر سزا اور عذاب دینا صرف خدا کے ہاتھ میں ہے کسی دوسرے کو اس میں کوئی دخل نہیں،

بت پرست عربوں کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ یہ دیوتا اور ان کے یہ بت خدا کی طرف سے دونوں عالم میں مختار کل ہیں، وہ یہاں دینے نہ دینے کا، اور اس عالم میں بخشنے کا اختیار رکھتے ہیں اس عقیدہ کا نام ان کے یہاں "شفاعت" تھا، اور یہ دیوتا ان کے شفیع تھے، قرآن مجید نے کفارہ غیر خدا کے اختیار مغفرت، اور بت پرستانہ طریقۂ شفاعت کے عقائد باطلہ کی ہر طرح تردید کی، اور بتایا کہ یہ اختیار خدا کے سوا کسی اور کو نہیں سب اسکی عظمت اور جلال کے سامنے عاجز اور درماندہ ہیں،

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ	یہ کافر خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت
دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ	کا اختیار نہیں رکھتے، لیکن وہ جس نے حق کی
بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (زخرف،)	شہادت دی، اور وہ جانتے بھی ہوں،
لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ	یہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ
عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا (مریم-۲)	جس نے رحم والے خدا سے اقرار لے لیا،
ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ	کیا خدائے برحق کو چھوڑ کر جھوٹے معبودوں
الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّیْ شَفَاعَتُهُمْ	کو خدا بناؤں اگر رحمٰن مجھے نقصان پہنچانا

شَيْئًا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ، (یٰسٓ - ۲) | چاہے تو اُن کی شفاعت مجھے ذرا بھی فائدہ فائدہ نہیں پہونچا سکتی، اور نہ وہ مجھے چھڑا!

کفار فرشتوں کو بھی اسی غرض سے پوجتے تھے، حکم ہوا،

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا	اور کتنے فرشتے ہیں، آسمانوں میں کہ اُن کی
تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْ	شفاعت کچھ فائدہ نہیں پہونچاتی لیکن اس کے
بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ	بعد کہ اللہ اجازت دے، جس کے لئے چاہے
وَيَرْضٰى ٥ (نجم - ۲)	اور پسند کرے،
اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ	کیا اُن کافروں نے خدا کے سوا کو شفیع بنایا ہے،
قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا	کہدے کہ اگر یہ کچھ اختیار اور سمجھ بوجھ نہ رکھتے
وَّلَا يَعْقِلُوْنَ - (زمر - ۵)	ہوں، تو بھی؟ (شفیع بننے کے قابل ہیں؟)

خدا قیامت میں اُن سے کہے گا،

وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ	اور ہم دیکھتے نہیں، تمہارے ساتھ تمہارے
الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ	ان شفیعوں کو جن کو تم سمجھتے تھے کہ وہ تمہاری
شُرَكٰٓؤُا، (انعام - ۱۱)	ملکیت میں خدا کے ساتھ شریک ہیں،
وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ	اور جب قیامت قائم ہوگی تو مشرکین ناامید
الْمُجْرِمُوْنَ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ	ہوں گے کہ جن کو وہ خدا کا شریک کار بتاتے
شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا (روم - ۲)	تھے، ان میں سے کوئی اُن کا شفیع نہ ہوا،

خاص یہود کو مخاطب کرکے اُن کے عقیدہ کی تردید مین کہا گیا،

يٰبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ........	اے فرزندانِ اسرائیل..........
وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ	اور ڈرو اُس دن سے جس میں کوئی ایک دوسرے
نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ	کے وہ کام نہ آئیگا، اور نہ اس کی طرف سے کوئی
وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ	شفاعت قبول کی جائیگی، اور نہ کچھ اس کے بدلہ
يُنْصَرُوْنَ، (بقرہ ۔ ۶)	مین لیا جائیگا اور نہ کوئی اُن کو مدد پہنچائی جائیگی'

پھر اسی معنی کی آیت اسی سورہ میں دوسری جگہ ہے،

يٰبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ........	اے فرزندانِ اسرائیل..........
وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ	اور ڈرو اس دن سے جس مین کوئی کسی کے
نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ	ذرا بھی کام نہ آئیگا، اور نہ اسکی طرف سے کوئی
وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ (بقرہ ۱۵)	بدلہ قبول ہوگا اور نہ شفاعت فائدہ دے گی'

اور اسی معنی میں مسلمانوں سے بھی کہا گیا کہ وہ عمل پیش کرین شفاعت کے بھروسہ نہ رہین'

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا	اے مسلمانو! جو کچھ ہم نے تم کو روزی دے رکھی
رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ	ہے، اس مین سے کچھ خرچ کر دیا کرو اس دن
لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ	کے آنے سے پہلے جس میں نہ لین دین ہے نہ دوستی
(بقرہ ۔ ۳۴)	ہے نہ شفاعت ہے،

غرض آپ کے پیغام نے ان معنوں مین شفاعت کے عقیدۂ باطل کی ہر جگہ تردید کی ہے،

وراعلان کیا ہے کہ اس شفاعت کا اختیار صرف خدا کے ہاتھ میں ہے ۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ	کیا انھون نے خدا کے سوا اورون کو شفیع بنا رکھا
قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا	ہی کہدے کہ اگرچہ ان کو کسی چیز کا اختیار نہو اور
وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ط قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ	نہ ان کو سمجھ ہو تو بھی ، کہدے کہ شفاعت کا کل اختیار
جَمِيْعًا ط لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ	خدا ہی کو ہی ، اسی کا راج آسمانون اور زمین مین
الْاَرْضِ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (زمر۔ ۵)	ہی ، پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤگے ،

اس آیتِ پاک نے کفار و مشرکین کے عقیدۂ شفاعت کی قطعی طور سے تردید کی ، دوسری آیت مین یہود و نصاریٰ کے عقیدۂ شفاعت کا صرف اتنا حصہ تسلیم کیا کہ خدا کے نیک بندے اپنے دوسرے بھائیوں کے حق میں شفاعت کرین گے ،

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ	اور یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں ، وہ
دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ	شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جنھون نے
بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ، (زمر۔ ۷)	حق کی گواہی دی اور وہ دانش رکھتے ہین '

دوسری جگہ اسی شہادت کو اقرار لینا کہا گیا ہے ،

لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ	یہ لوگ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے ، لیکن وہ
اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ،	جو خدا کے نزدیک (دنیا میں اپنے عمل کے
(مریم۔ ۶)	ذریعہ سے) اقرار لے چکا ہے ،

لیکن اس شہادتِ حق اور عہدِ الٰہی کے باوجود اس اختیار کے استعمال کیلئے اللہ تعالیٰ

کی اجازت اور رضامندی شرط ہے،

مَا مِنْ شَفِيعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ (یونس - ۱)	(خدا کی بارگاہ میں) کوئی شفیع نہیں لیکن اسکی اجازت کے بعد،
مَنْ ذَا الَّذِىْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ (بقرہ - ۳۴)	وہ کون ہے جو خدا کے سامنے کسی کی شفاعت کر سکے لیکن اس کی اجازت سے،
وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِى السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِىْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى (نجم ۲)	اور کتنے فرشتے ہیں، آسمانوں میں کہ ان کی شفاعت ذرا بھی کام نہیں آسکتی، البتہ اس کے بعد کہ خدا اجازت دے جس کو چاہے اور پسند کرے،
لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ، (نباء - ۲)	یہ فرشتے اور روح کوئی خدا سے اس دن بات کرسکیگا لیکن جسکو وہ رحم والا اجازت دیا اور ٹھیک کہے،

پھر یہ شفاعت بھی ان ہی لوگوں کے حق میں ہو سکے گی، جن کے حق میں اللہ تعالیٰ انبیاء اور صالحین کو اس کی اجازت دے گا، فرمایا،

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ، (سبا - ۳)	اور شفاعت خدا کے نزدیک نفع نہ دیگی، لیکن اسکے لئے جس کیلئے وہ شفاعت کی اجازت دے،
يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِىَ لَهٗ قَوْلًا ، (طٰہٰ - ۶)	اُس دن شفاعت نفع نہ دے گی، لیکن اسکو جس کے لئے خدا اجازت دے، اور اس کیلئے بات کرنا پسند کرے،

بلکہ خود انبیار علیہم السّلام بھی سفارش ان ہی کی کریں گے جن کی سفارش خدا خود چاہیگا فرمایا!

وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی وَھُمْ مِّنْ خَشْیَتِہٖ مُشْفِقُوْنَ، (انبیاء - ۲)

اور وہ شفاعت نہیں کریں گے لیکن اس کی جس کے لئے خدا اپنی خوشنودی ظاہر کرے، اور وہ اس کے خوف سے ترساں ہوں گے،

پھر ایک جماعت ایسی بھی ہے جس کے افراد کے لئے ازل ہی سے یہ اعلانِ عام ہو چکا ہے کہ ان کے لئے مغفرت اور شفاعت کا دروازہ بند ہے، اور یہ وہ مجرم ہیں جن کے دل حق کی شہادت سے محروم رہ گئے،

فَمَا تَنْفَعُھُمْ شَفَاعَۃُ الشَّافِعِیْنَ، (مدثر - ۲)

تو ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت نفع نہ دے گی،

وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ حَمِیْمٍ وَّلَا شَفِیْعٍ یُّطَاعُ، (مومن - ۲)

ظالمون (مشرکون) کا نہ کوئی دوست (اس دن) ہوگا، اور نہ کوئی شفیع جس کی بات مانی جائے،

اور وہ بدنصیب گروہ جس کے حق میں رحمت کا یہ دروازہ بند رہے گا، مشرکین ہیں، جیساکہ ذیل کی آیت سے ظاہر ہے،

اِنَّ اللہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ، (نساء - ۱۸)

اللہ اس گناہ کو کہ اس کے ساتھ کوئی شریک ٹھرایا جائے نہیں بخشتا، اور اس سے نیچے کے گناہ جس کو چاہے بخش دے،

لہ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (لقمان - ۲) بیشک شرک بڑا ظلم ہے (صحیح بخاری ذکر لقمانؑ، جلد اص ۴۸۷)

لیکن اب ایسی حالت میں جب کہ وہی شفاعت کرسکیں گے، جن کو اللہ تعالیٰ اس کی اجازت دیگا، اور وہ بھی ان ہی کی شفاعت کرین گے جن کی شفاعت کرانا خود خدا کو منظور ہوگا، تو حقیقت مین خود اللہ ہی اپنے دربار میں اپنا آپ شفیع ہوگا، یا صوفیانہ اصطلاح میں یون کہو کہ جلالِ الٰہی کی بارگاہ مین اُس کی صفتِ کریمی ورحیمی خود شفیع بن کر کھڑی ہوگی، اسی لئے ارشاد ہوا،

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا	اور اس قرآن کے ذریعہ (اے پیغمبر) ان لوگون
اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ	کو ہشیار کردے جو اس سے ڈرتے ہیں کہ وہ اپنے
وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ،	رب کے پاس جمع کئے جائین گے، ان کے لئے
(انعام - ۵)	اُن کے رب کے سوا کوئی حمایتی اور شفیع نہیں شاید
مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا	خدا کے سوا تمھارا کوئی حمایتی اور شفیع نہین،
شَفِيْعٍ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ (سجدہ-۱)	پھر کیا تم سوچتے نہین،

خدا کی اس صفتِ کریمی ورحیمی کے مظہر اس دنیا میں بھی وہی ہون گے، جو اس دنیا مین اُس کے مظہر بن کر آئے تھے، اور وہ انبیاے کرام ہین کہ خدا کے رحم وکرم ہی کے سبب سے جو اس کو اس دنیا کے ساتھ ہے، ان انبیاؑ کی بعثت ہوئی اور وہ اپنی اپنی امت پر شاہد قرار پائے، اسی طرح خدا کی اجازت کے بعد اس دنیا مین بھی وہی خدا کے اُس رحم وکرم وفضل عمیم کے مظہر قرار پائین گے، نیز رحمت کے فرشتے اور امت کے نیکوکار اور صالح افراد بھی جن کو رحمت الٰہی نے چنا ہو، اس منصب پر ممتاز ہوسکیں گے، خصوصًا وہ سراپا رحمت جو اس دنیا مین رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ، کا مظہر بن کر آیا،

اجرام سماوی کی قدرت کا انکار

۱۲- بظاہر دنیا مین بہت سی باتیں آفتاب و ماہتاب کی گردش، اور اُن کے سبب سے اختلاف موسم کے اثرات سے ہوتی ہیں، اس لئے ستارہ پرست قومون مین یہ اعتقاد پیدا ہو گیا تھا کہ دنیا مین جو کچھ ہوتا ہے وہ ستارون کی گردش کے اثر سے ہوتا ہے، یہی اعتقاد عرب کے مشرکون مین بھی پھیلا تھا، وہ سورج اور چاند کو سجدے کرتے تھے، اسلام نے اُن کو اس شرک سے روکا اور کہا،

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ (فصلت۵) سورج اور چاند کو سجدے نہ کیا کرو،

اسی طرح وہ زمانہ کو دنیا کے کاروبار مین حقیقی مؤثر جانتے تھے، اور یہ کہتے تھے،

وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ، (جاثیہ-۳) ہم کو تو زمانہ مارتا ہے،

اسی کا اثر ہے کہ ہماری شاعری کی زبان میں "فلکِ کج رفتار" اور "دہرِ ناہنجار" کی شکایت اب تک چلی جاتی ہے، عرب کے مشرکین بھی اسی طرح بولا کرتے تھے، اُن کو جب کوئی خلاف توقع تکلیف پہونچتی تھی، تو زمانہ کی شکایت کرتے تھے، اور اُس کو بُرا کہتے تھے[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا، اور فرمایا کہ "زمانہ کو گالی نہ دیا کرو کہ زمانہ خود خدا ہے[2]" اور فرمایا کہ خدا ارشاد فرماتا ہے کہ آدم کا بیٹا مجھے تکلیف پہنچاتا ہے، وہ زمانہ کو بُرا کہتا ہے، زمانہ مین ہون، میرے ہاتھ میں تمام کام ہین، مین شب و روز کا انقلاب کرتا ہون[3]" یعنی زمانہ کو جن تکلیفون اور مصیبتوں کا خالق سمجھ کر لوگ بُرا کہتے ہیں، حقیقت میں اُن کا پیدا کرنے والا خدا ہی ہے، اس لئے یہ گالی حقیقت مین خدا کو دیجاتی ہے،

اسی خیال کا یہ بھی اثر تھا کہ اہلِ عرب بارش کو "نچھتر" کی طرف منسوب کیا کرتے تھے اور کہا کرتے

---

[1] فتح الباری شرح بخاری جلد ۸ ص ۴۴۴ و کتاب الاسماء والصفات بیہقی صفحہ ۱۱۵، الہ آباد [2] صحیح مسلم الفاظ الادب، [3] صحیح بخاری تفسیر سورہ جاثیہ و کتاب الرد علی الجہمیہ جلد ۲ صفحہ ۱۱۱۶،

تھے کہ فلان نچھتر کے سبب سے ہم پر پانی برسایا گیا، حدیبیہ کے موقع پر اتفاق سے رات کو بارش ہوئی صبح کو نماز کے بعد آپؐ صحابہ کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا "تم جانتے ہو تمہارے رب نے کیا کہا" صحابہؓ نے عرض کی کہ "خدا اور اس کا رسول زیادہ جانتا ہے"، ارشاد ہوا "اس نے فرمایا آج صبح کو میرے بندون مین سے کچھ مومن ہو کر اٹھے، اور کچھ کافر ہو کر جنھون نے یہ کہا کہ خدا کے فضل و رحمت سے ہم پر پانی برساؔ تو خدا پر ایمان لانے والے اور ستارہ کے انکار کرنے والے ہین، اور جنھوں نے یہ کہا کہ فلان نچھتر سے پانی ہم پر برسا تو وہ خدا کے انکار کرنے والے اور ستارہ پر ایمان لانے والے ہین[۱]"

سورج گرہن اور چاند گرہن کو بھی لوگ عظیم الشان واقعات اور انقلابات کی علامت سمجھتے تھے، کم و بیش دنیا کی تمام قومون مین وہ آسمانی دیوتاؤن کے غیظ و غضب کے مظہر یقین کئے جاتے تھے، سنہ ۹ھ مین اتفاق سے ایک دن سورج مین گرہن لگا، اور اسی دن آپؐ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیمؑ نے وفات پائی، صحابہ نے یہ خیال کیا کہ یہ سورج مین گرہن لگنے کا سبب، حضرت ابراہیمؑ کی موت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ سُنا تو تمام مسلمانون کو مسجد مین جمع ہونے کا حکم دیا، اور ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا جس مین اس خیال کی تردید کی، فرمایا کسوف و خسوف اور (گرہن) کو کسی کے جینے مرنے سے کوئی تعلق نہیں، یہ بھی خدا کے نشانون مین سے ایک نشان ہے[۲]

غیر خدا کی قسم سے روکنا

۱۳- شرک کی ایک نہایت ہی باریک صورت یہ تھی کہ لوگ غیر خدا کی قسمیں کھاتے تھے، قسم کھانے کے معنی حقیقت مین شہادت کے ہین جس کی قسم کھائی جاتی ہے اس کو دراصل واقعہ پر گواہ بنایا جاتا ہے عرب(؟)، مین بت پرستی کے رواج کے باعث بتون اور دیوتاؤن کی قسمین

---

[۱] صحیح بخاری باب الاستغفار و باب الذکر بعد الصلوٰۃ و صحیح مسلم کتاب الایمان [۲] صحیح بخاری صلوٰۃ الکسوف،

کھائی جاتی تھیں، جو صریح کفر تھا، قریش اپنے دیوتا لات اور عزیٰ کی قسمیں کھایا کرتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا[1] لیکن رواج اور عادت کے باعث مسلمان ہونے کے بعد بھی بے اختیار اُن کی زبان سے اُن کی قسمیں نکل جاتی تھیں آپ نے فرمایا کہ "جس شخص کی زبان سے لات اور عزیٰ کی قسم نکل جائے تو وہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہہ لے" یہ گویا اس کفر کے کلمہ سے توبہ ہے، قریش میں باپ کی قسم کھانے کا بھی رواج تھا، اس سے بھی آپ نے منع فرمایا، ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو اپنے باپ کی قسم کھاتے سنا تو آپ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ نے تم کو اس سے منع کیا ہے کہ اپنے باپ کی قسم کھایا کرو جس کو قسم کھانی ہو وہ یا تو خدا کی قسم کھائے اور یا چپ رہے" حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ "حضورؐ کے ارشاد کا یہ اثر ہوا کہ اس وقت سے آج تک میں نے نہ تو اپنی بات میں اور نہ کسی اور کی بات دہرانے میں کبھی باپ کی قسم کھائی[2]" اُن کی قسم بھی لوگ کھایا کرتے تھے، اس سے بھی آپ نے منع فرمایا، اسی طرح کعبہ کی بھی قسم لوگ کھایا کرتے تھے، اس پر ایک یہودی نے آکر مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ تم بھی شرک کرتے ہو کعبہ کی قسم کھاتے ہو، آپ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ کعبہ نہیں بلکہ کعبہ والے (خدا) کی قسم کھایا کرو[3]

ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کسی کو کعبہ کی قسم کھاتے سنا تو اس کو منع کیا، اور کہا کہ غیر خدا کی قسم نہ کھائی جائے، میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے کہ جس نے غیر خدا کی قسم کھائی، اس نے کفر کیا، یا شرک کیا[4]" دوسری روایت میں ہے کہ "ہر وہ قسم جو غیر خدا کی کھائی جائے شرک ہے[5]"

---

[1] سنن نسائی کتاب الایمان والنذور [2] یہ تمام واقعات صحیح بخاری صحیح مسلم، نسائی کتاب الایمان میں مذکور ہیں [3] نسائی کتاب النذور [4] جامع ترمذی ابواب النذور والایمان و مستدرک حاکم ص ۱۸ جلد ۱ کتاب الایمان [5] مستدرک حاکم بحوالہ مذکور

خداکی مشیت میں کوئی شریک نہین

۱۴- اکثر نیک لوگون کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ اُن کی مشیت عین خدا کی مشیت ہی، اس مین نہ صرف بدعقیدہ لوگ بلکہ اہل توحید بھی غلطی سے مبتلا ہوجاتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانون کو اس دقیق غلطی سے بھی آگاہ کیا، اور بتایا کہ دنیا مین مشیت صرف خدا کی ہی، اسی کی خواہش کے مطابق دنیا چل رہی ہی، تمام مشیتین اور خواہشیں اسی کی مشیت اور خواہش کے ماتحت ہین، اس کے ساتھ کسی مخلوق کی مشیت، عالم کے کاروبار مین شریک نہین لیکن لوگون نے خدا کی مشیت کیساتھ اورون کی مشیت کو بھی شریک کردیا تھا، توحید کامل کے معلم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیال کی سختی سے تردید کی، اور قرآن مجید نے جابجا اس حقیقت کو واضح کیا کہ مشیتِ الٰہی کے علاوہ کوئی اور حقیقی مشیت نہین، تمام دیگر مشیتیں اس کی تابع اور ماتحت مین، عقیدہ کی یہ غلطی اس قدر عام تھی کہ جو لوگ عقیدۃً نہین رکھتے تھے، وہ بھی سلاطین، حکام اور بزرگون کیساتھ گفتگو میں یہ کہنا حسنِ ادب سمجھتے تھے کہ "جو خدا چاہے اور جو حضورؐ چاہیں" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرز کلام سے منع فرمایا، یہانتک کہ خدا کی مشیت کیساتھ برابری سی خود اپنی مشیت کے ذکر سی بھی صحابہ کو روکا، اس قسم کا طرز کلام لوگون کی زبانون پر چڑھ گیا تھا، اسمیں یہ تصحیح فرمائی کہ خدا اور غیر کی مشیت کے درمیان عطف کا واؤ (اور) نہ لایا جائے کہ اس سی برابری کا شائبہ نکلے، بلکہ "پھر" کا لفظ بولا جائے تاکہ معلوم ہو کہ خدا کی مشیت کے بعد اورون کی مشیت کا درجہ ہی،

نسائی میں ہے کہ ایک یہودی نے خدمتِ نبوی مین آکر مسلمانوں سی کہا کہ "تم لوگ شرک کرتے ہو، کہتے ہو کہ جو خدا چاہے اور جو محمد چاہین" آپ نے صحابہ کو مخاطب کرکے فرمایا یوں کہو کہ "وہ ایک ہے جو چاہے، پھر جو آپ چاہین[1]" یہی واقعہ ابن ماجہ مین اس طرح ہے کہ ایک صحابی نے خواب

---

[1] نسائی کتاب الایمان والنذور،

میں دیکھا تھا کہ ایک یہودی یا عیسائی اُن سے کہہ رہا ہے کہ "تم مسلمان بڑے اچھے لوگ ہوتے اگر شرک نہ کیا کرتے، تم کہا کرتے ہو کہ "خدا جو چاہے اور جو محمد چاہیں"، ان صحابی نے خدمت اقدس میں آکر اپنا یہ خواب بیان کیا، آپ نے فرمایا میں اس فقرہ کی بُرائی جانتا تھا، یوں کہو کہ "جو خدا چاہے، پھر جو محمد چاہیں"[1] ابوداؤد میں یہی تعلیم اس واقعہ کی تقریب کے بغیر اس طرح مذکور ہے کہ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ "یہ نہ کہا کرو کہ جو خدا چاہے اور جو فلاں چاہے، بلکہ یوں کہو کہ جو خدا چاہے پھر جو فلاں چاہے"[2] لیکن امام بخاری نے ادب المفرد میں اور بیہقی نے کتاب الاسمار میں جو روایت کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کے ساتھ کسی اور کی مشیت کا نام بھی نہ لینا چاہئے، ایک شخص نے خدمت والا میں حاضر ہو کر سلسلۂ کلام میں کہا کہ "جو خدا چاہے اور جو آپ چاہیں"، ارشاد ہوا کہ "تم نے خدا کا ہمسر اور مقابل ٹھہرایا، جو خدا چاہے مَا شَاءَ اللهُ وَحْدَهٗ"[3]

اس سلسلہ میں یہاں تک اہتمام مدِنظر تھا کہ اس سے بھی منع فرمایا کہ خدا اور رسول کی طرف ایک ضمیر پھر کر ایک فعل لایا جائے تاکہ یہ سمجھا جائے کہ خدا اور رسول کا درجہ برابر برابر ہے، ایک دفعہ آپ کے سامنے کسی شخص نے خطبہ کے اثنا میں یہ فقرہ کہا "جس نے خدا اور رسول کی اطاعت کی، اس نے ہدایت پائی، اور جس نے اُن دونوں کی نافرمانی کی" یہاں تک اُس نے کہا تھا کہ آپ نے اُس کو روک دیا، اور فرمایا "اُٹھ جاؤ تم بُرے خطیب ہو"[3] آپ نے آزردگی کا اظہار اس لئے فرمایا کہ "ان دونوں" کو ساتھ کہنے سے سامعین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ خدا کی اور رسول کی نافرمانی کا حکم برابر ہے،

---

[1] ابن ماجہ کتاب النذور [2] ابوداؤد کتاب الادب باب لا تقولوا خبثت نفسی [3] ادب المفرد امام بخاری ص۱۵۶ مصر و کتاب الاسمار والصفات امام بیہقی صفحہ ۱۱۰ مطبوعہ الہ آباد،

اور اس مین شرک کا شائبہ ہے، اس لئے خطیب کو یون کہنا چاہئے تھا کہ اور جو خدا کی اور رسول کی نافرمانی کریگا وہ ...."جیسا کہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے، اور ماثورہ خطبون مین بھی منقول ہے،

مشبہات شرک کی مخالفت

۱۵- جن باتون مین شرک کا ذرا بھی شائبہ پایا جاتا تھا، اُن سے بالکل منع کر دیا، لوگ اولاد کا نام آفتاب، ماہتاب وغیرہ کی عبدیت کیساتھ رکھتے تھے مثلاً عبد الشمس، عبد مناف، ان نامون سے سخت منع فرمایا، ارشاد ہوا کہ بہترین نام عبد اللہ اور عبد الرحمٰن ہین[۱]، اہل عجم اپنے سلاطین کو شاہنشاہ یعنی تمام بادشاہون کا بادشاہ کہتے تھے، چونکہ اس میں شرک کا احتمال تھا، آنحضرت[۲] نے فرمایا کہ یہ نام خدا کو سب سے زیادہ ناپسند ہے[۲] دوسری روایت مین ہے کہ آپنے فرمایا اس شخص پر اللہ کا بیحد غضب ہو جس نے اپنے کو شہنشاہ کہا، خدا کے سوا کوئی بادشاہ نہین (حاکم فی المستدرک ص ۲۷۵ ج ۴)

غلامون کو لوگ عبد یعنی بندہ کہتے تھے، حالانکہ انسان خدا کا بندہ ہے، آدمیون کا نہین، اسی طرح غلام اپنے مالک کو "رب" کہتے تھے، حالانکہ رب خدا ہے اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قطعاً منع فرما دیا کہ کوئی شخص غلامون کو عبد یعنی بندہ نہ کہنے پائے، بلکہ یوں کہے کہ "میرا بچہ" یا "بچی" اور اسی طرح غلام اور باندیاں اپنے آقا کو رب نہ کہین، مالک کہیں کہ تم سب غلام ہو، اور رب اللہ ہے[۳]، ہانی رض ایک صحابی تھے، جن کی کنیت ابو الحکم تھی، وہ جب خدمت اقدس میں اپنی قوم کیساتھ آئے تو آپنے فرمایا کہ حکم خدا ہے اور خدا ہی حکم دینے والا ہے، تم کو لوگ ابو الحکم کیوں کہتے ہین، عرض کی کہ میرے قبیلہ مین جب کوئی نزاع ہوتی ہے تو لوگ مجھ کو حکم یعنی ثالث بناتے ہین، اور میں جو فیصلہ کرتا ہون، اس کو سب تسلیم کر لیتے ہیں، آپنے فرمایا تمھارے بچون کے کیا نام ہین، بولے

---

[۱] ابو داؤد کتاب الادب باب تغییر الاسماء [۲] ابو داؤد کتاب الادب [۳] ابو داؤد کتاب الادب باب لکریم بحفظا المنطق

شریح، مسلم، عبداللہ، آپ نے پوچھا سب مین بڑا کون ہے، عرض کی "شریح" فرمایا تو تمھاری کنیت ابو شریح ہے[۱]،

اکثر لوگون کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی بُرا کام کرتے ہیں، تو شیطان پر لعنت بھیجتے ہین گویا اُس نے بُرائی کرائی، ایک دفعہ ایک صاحب آنحضرتؐ کیساتھ گھوڑے پر سوار تھے، گھوڑے نے ٹھوکر کھائی، انھون نے کہا شیطان کا برا ہو، آپ نے فرمایا یوں نہ کہو، ورنہ شیطان غرور سے پھول جائیگا، اور کہے گا، میری قوت سے یہ ہوا، خدا کا نام لو تو شیطان دب کر مکھی کے برابر ہو جائے گا[۲]،

تصویر بنانے سے سخت منع کیا، اس کی یہی وجہ تھی کہ اوّل اوّل لوگ کسی بزرگ اور مقتدا کی تصویر گھر مین رکھتے تھے، تو محبت یا یادگار کے طور پر رکھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ ان ہی تصویرون کی پرستش ہونے لگتی تھی، چنانچہ ہندؤون اور رومن کیتھلک عیسائیوں مین اسی طرح تصویر پرستی اور اس سے بڑھ کر بت پرستی کا رواج ہوا، اس بناپر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سرے سے تصویر کھینچنے سے منع فرمایا،

۱۶- شرک کا بڑا ذریعہ قبر پرستی اور یادگار پرستی ہی، قبرون اور یادگارون کو لوگ عبادتگاہ بنالیتے ہیں، سالانہ مجمع کرتے ہیں، دور دور سے سفر کرکے آتے ہین، قبرون پر مسجدیں بناتے ہیں منتین مانتے ہیں، نذرین چڑھاتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام افعال سے منع کیا، وفات سے پانچ دن پہلے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ قبرون کو مسجد بنالیتے تھے، دیکھو میں تم کو منع کرتا ہون کہ قبرون کو مسجد نہ بنانا[۳]، عین وفات کے وقت چہرہ سے چادر الٹ دی، اور فرمایا کہ خدا یہود و نصارٰی پر

[۱] ابوداؤد کتاب الادب باب تغییر الاسم القبیح [۲] ابوداود کتاب الادب باب لایقول خبثت نفسی [۳] صحیح مسلم کتاب المساجد،

لعنت کرے ان لوگون نے اپنے پیغمبرون کی قبرون کو مسجد بنالیا،

ریا اور عدم اخلاص بھی معنوی شرک ہو

۱۱- یہ توحید کے متعلق وہ اصلاحات تھین جن کا تعلق زیادہ تر اعمال اور روزمرہ کی بول چال سے تھا لیکن حقیقی اصلاح جس سے توحید کی تکمیل ہوتی ہے، وہ قلب و روح کی توحید ہے انسان کے تمام کامون کا کوئی نہ کوئی نفسیاتی محرک ہوتا ہو کوئی طلب شہرت کے لئے کام کرتا ہے کوئی دنیاوی معاوضہ کے لئے کرتا ہے، کوئی نمایش اور دکھاوے کے لئے کرتا ہو کوئی غیر کی محبت یا عداوت مین کرتا ہو، ان تمام کامون کا محرک درحقیقت غیر خدا ہے جس نے خدا کی جگہ لے لی ہو اسی لئے قرآن مجید نے کہا،

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ	تم نے اُن کو دیکھا جس نے اپنا خدا خود اپنی
(فرقان - ۴)	نفسانی خواہش کو بنالیا ہے،

اسی لئے بڑا بت وہی ہے جس کو انسان نے خود اپنے دل کے تہخانے مین چھپا رکھا ہے اس بُت کو توڑنا توحید کی اصل تکمیل ہے، آپ نے بتایا کہ انسان کے تمام کامون کا دار و مدار خود اُس کے دل کے عمل پر ہے، اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ اس لئے ایک مسلمان کے ہر قسم کے کامون کا اصلی محرک صرف خدا کا حکم، خدا کا خوف، خدا کی اطاعت، خدا کی خوشنودی، خدا کی محبت، غرض صرف خدا ہونا چاہیئے جس درجہ تک ایک مومن کی اس قلبی کیفیت مین ترقی ہوگی، اس کے ایمان و توحید کی تکمیل بھی پایۂ کمال کو پہنچتی جائے گی، اسی بنا پر وحی محمدیؐ نے ہر جگہ اور ہر موقع پر انسان کو اس کے عمل کی غرض و غایت مَرْضَاتِ اللهِ اللہ کی خوشنودی مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ، اخلاص اور وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى، ذاتِ خدا کو قرار دینے کی تعلیم دی ہو، اس بنا پر انسان جو کام خدا کے علاوہ کسی اور

غرض ونیت سے کرے، تو درحقیقت اُس کام کے لئے اُس نے ایک مؤقت خدا الگ بنالیا، اور وہ گو اس وقت لفظی اور قانونی شرک کا مجرم نہیں لیکن معنوی ونفسی شرک کے ارتکاب کا یقیناً مجرم ہے، آپنے فرمایا جس نے خدا کے لئے دیا، اور خدا ہی کے لئے روکیا، خدا کے لئے چاہا، اور خدا ہی کے لئے عداوت کی اور خدا ہی کے لئے بیاہ کیا، اُس نے اپنے ایمان کو کامل کر لیا"۔[۱]

متعدد صحابیونؓ سے روایت ہے کہ آپنے فرمایا کہ "ریا چھپا ہوا شرک ہے"، حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہین کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "چھپا ہوا شرک یہ ہے کہ انسان کوئی کام دوسرے کی توجہ کے سبب کرے"۔[۲] حضرت شداد بن اوسؓ روایت کرتے ہین کہ آپ نے فرمایا کہ "جس نے دکھاوے کی نماز پڑھی، اس نے شرک کیا جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا اس نے شرک کیا جس نے دکھاوے کی خیرات کی اس نے شرک کیا"،[۳] یہی صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ صحابہ کے مجمع مین آپ فرمارہے تھے، کہ "مجھے اپنی امت کے لوگون پرسب سے زیادہ جس کا خوف ہے، وہ شرک کا ہے، ہان میرا مطلب نہین کہ وہ چاند یا سورج کو سجدہ کرین گے یا بتون کو پوجین گے، بلکہ یہ ہے کہ وہ غیر خدا کے لئے عمل کرنے لگین، اور چھپی نفسانی خواہش مین[۴] نہ مبتلا ہون"، حضرت محمود بن لبیدؓ انصاری آپ کا قول نقل کرتے

[۱] مستدرک حاکم ترمذی آخر کتاب الزہد، ترمذی کے دو نسخون مین اس حدیث کے متعلق دو تنقیدیں درج ہین ایک مین منکر لکھا ہے اور دوسرے میں حسن، اس کے ایک راوی اجلح کی نسبت لوگون نے کلام کیا ہے مگر حدیث کا نفس مضمون تمام اسلامی روایات اور احکام کے عین مطابق ہے، [۲] حضرت ابوسعید خدریؓ، معاذ بن جبلؓ، ابوہریرہؓ، شداد بن اوسؓ، محمود بن لبیدؓ، ابوسعید بن ابی فضالہ، ان صحابیون کی روایتین، ابن حنبل، ابن ماجہ، مستدرک وغیرہ میں ہیں [۳] مستدرک حاکم کتاب الرقاق ص ۳۲۹ جلد ۴ (صحیح) [۴] بحوالہ سابق مستدرک، ابن حنبل، مسند شداد بن اوس صفحہ ۱۲۴ جلد ۴ [۵] سنن ابن ماجہ باب الریاء والسمعة

ہیں کہ آپنے صحابہ سے فرمایا کہ "مجھکو سب سے زیادہ جس کا تم پر خوف ہے، وہ شرک اصغر ہے" صحابہ نے عرض کی، "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! شرک اصغر کیا ہے، فرمایا "ریا" قیامت کے دن جب لوگوں کو اپنے اپنے عمل کا بدلہ مل رہا ہوگا، خدا ریاکار لوگوں سے کہیگا کہ تمھارے لئے ہمارے یہاں کچھ نہیں تم ان ہی کے پاس جاؤ، جن کے دکھانے کو دنیا میں یہ کام کیا کرتے تھے[۱] حضرت ابوسعید خدری رض کہتے ہیں کہ ایک موقع پر ہم لوگ دجال کے متعلق آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ اسی اثنا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور فرمایا کہ "دجال سے بڑھکر جو خوفناک چیز میرے نزدیک ہے کیا میں تم کو اس سے آگاہ نہ کروں" ہم سب نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا "وہ شرک خفی ہے یعنی یہ کہ (مثلاً) کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو تو وہ نماز کو محض اس لئے درست کر کے پڑھے کہ کوئی دوسرا شخص اسکو دیکھ رہا ہے"[۲] ابوسعید بن ابی فضالہ انصاری بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "قیامت میں جب خدا اگلوں اور پچھلوں کو یکجا کرے گا، تو ایک منادی آکر پکاریگا کہ جس نے اپنے کسی عمل میں خدا کیساتھ کسی غیر کو بھی شریک بنالیا ہو تو وہ اپنا ثواب اسی غیر سے مانگے کہ خدا سا جھے سے بے نیاز ہے"[۳] ابوہریرہ رض کہتے ہیں کہ آپنے ارشاد کیا کہ خدا فرماتا ہے کہ "میں تمام شرکوں میں سب سے زیادہ شرکت سے بے نیاز ہوں تو جس نے اپنے کسی کام میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کر لیا، تو میں اس سے الگ ہوں اور وہ اسی کا ہے جسکو اس نے میرا شریک بنایا"[۴] ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ صحابہ اپنے ہر عمل میں اس شرک خفی سے ڈرتے تھے، شداد بن اوس کہتے ہیں کہ ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ حیات میں ریا کو شرک اصغر گنا کرتے تھے[۵] ایک دفعہ حضرت

۱؎ ابن حنبل مسند محمود بن لبید انصاری رض ص ۴۲۸، جلد ۵ ابوداؤد و مسند ابن حنبل ۲؎ سنن ابن ماجہ باب الریاء والسمعہ ۳؎ سنن ابن ماجہ باب الریاء و ترمذی و مسند ابن حنبل ۴؎ ابن ماجہ باب الریاء ۵؎ مستدرک حاکم کتاب الرقاق جلد ۴ ص ۳۲۹ صحیح

عمر فاروقؓ جا رہے تھے، دیکھا کہ حضرت معاذ بن جبلؓ صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں، حضرت عمرؓ نے رونے کا سبب دریافت کیا، تو انھوں نے قبر مبارک کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس قبر میں مدفون ہستی نے کہا تھا کہ ریا کا ادنیٰ شائبہ بھی شرک ہے[1] اسی طرح ایک دفعہ عبادہ تابعی نے دیکھا کہ حضرت شداد بنؓ اوس صحابی اپنی جا نماز پر بیٹھے زار و قطار رو رہے ہیں رونے کا سبب دریافت کیا، تو انھوں نے بیان کیا کہ ایک دن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ اقدس پر غم و ملال کے آثار دیکھے، عرض کی میرے ماں باپ حضورؐ پر فدا ہوں اس حزن و ملال کا سبب کیا ہے؟ ارشاد ہوا کہ "میں اپنے بعد اپنی امت پر ایک چیز سے ڈرتا ہوں" عرض کی "یا رسول اللہ! وہ کیا ہے؟" فرمایا شرک اور چھپی نفسانی خواہش" میں نے دوبارہ گذارش کی، یا رسول اللہ کیا آپ کی اُمت آپ کے بعد شرک میں مبتلا ہوگی"؟ فرمایا" اے شداد! میری اُمت یقیناً سورج یا چاند یا بت اور پتھر کی پرستش نہیں کرے گی لیکن وہ اپنے عمل کی نمائش اور ریا کرے گی" عرض کی "یا رسول اللہ! کیا ریا شرک ہے؟" فرمایا" ہاں[2]"

ان واقعات اور تعلیمات کو پڑھ کر ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح ہر پہلو سے شرک کی تردید اور توحید کی تکمیل فرمائی ہے، وہی عرب جو پہلے خدا کے سوا ہر چیز کی پرستش کرتے تھے، انھوں نے آپ کی تعلیم کے اثر سے خدا پرستی اور توحید کی انتہائی معراج حاصل کر لی،

---

[1] مستدرک حاکم کتاب الرقاق جلد ۴ ص ۳۲۰ (صحیح) [2] مستدرک حوالۂ مذکور حاکم نے اس حدیث کو صحیح الاسناد لکھا ہے مگر ذہبی نے تصریح کی ہے کہ "اس کا ایک راوی عبدالواحد بن زید متروک ہے" تاہم چونکہ حدیث کا نفس مضمون مسند ابن حنبل (ج ۴ ص ۱۲۶) اور سنن ابن ماجہ (باب الریاء) میں ایسے سلسلوں سے مذکور ہے جن میں یہ عبدالواحد نہیں پڑتا، اس لئے ہم نے اس حدیث کو بیان درج کیا ہے،

اور
اسکے ایجابی اصول وارکان

یہ تو توحید کے سلبی اجزا تھے یعنی توحید کے مخالف عقائد وخیالات کی نفی اور تردید لیکن نبوت محمدیؐ کا کارنامہ اس سے اہم اور بالاتر ہے، اور وہ توحید کی اصل بنیاد کی استواری، اُس کے اصول کی تعیین، امورِ ایمان کی تفصیل، اور اس کے اجزار کی تکمیل ہے، عرب مین شرک وبت پرستی بھی تھی، اور کہین کہین آسمانی مذاہب کی محرف صورتین بھی موجود تھین، مگر ایک صحیح مذہب کا تخیل اُن کے سامنے مطلق نہ تھا، اس بنا پر عقائد اور ایمان کی کوئی صحیح اور مرتب صورت بھی اُن کے ذہن مین نہین ہوسکتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے تمام پچھلے مزخرفات اور اوہام کو جن کو دین کا درجہ دیدیا گیا تھا، یک قلم محو کردیا، بت پرستی، جن پرستی، فرشتہ پرستی، ستارہ پرستی، فطرت پرستی، انسان پرستی، غرض شرک کی تمام صورتین قطعاً مٹادین، اور اُن کی جگہ مرتب، متیقن، سنجیدہ حقائق، اور سچائیون سے معمور چند عقائد کی تعلیم دی جو انسان کے تمام اعمال اور اخلاق کا بنیادی پتھر ہین،

اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلیل اس سلسلہ مین سب سے پہلی چیز خدا کی ہستی کا یقین اور پھر اسکی توحید پر ایمان ہے،

دنیا میں جتنے پیغمبر آئے اُن میں سے ہر ایک نے اس قادرِ مطلق کی طرف لوگوں کو دعوت دی، مگر یہ دعوت
اُن کے ایک مسلّم دعویٰ کی حیثیت سے تھی، انھوں نے اس دعویٰ کو دلائل کا محتاج نہ سمجھا، اور حقیقت
میں جن نامحدود زمانوں میں قوموں کے لئے اُن کی بعثت ہوئی، اُن میں دلیل اور برہان کی ضرورت
بھی نہ تھی، کیونکہ ان زمانوں میں بت پرستی، ستارہ پرستی، اور فطرت پرستی کا رواج تھا، الحاد کا
وجود نہ تھا لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عمومی تھی جو آخری زمانہ تک کے لئے اور
تمام قوموں کے لئے تھی، اور علم الٰہی میں یہ تھا کہ بعثتِ محمدیؐ کے بعد عقلِ انسانی تحقیق و تلاش کے
آخری مراحل طے کرنا چاہے گی، اور قدرت کے سربسر خزانے و قعتِ عام ہوں گے اور عقلیت کا
دور دورہ ہوگا، اور ہر شے دلیل و ثبوت کی محتاج قرار پائے گی، اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کو دلائل و براہین، ثبوت اور شواہد کی بھی تلقین کی گئی،

ایک اور سبب یہ ہے کہ انبیائے سابقین صرف اپنی قوموں کی دعوت پر مامور ہوئے تھے،
جنمیں مشرکین کا وجود تھا، ملحدین کا نہ تھا لیکن خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام قوموں اور طبقوں
کے لئے ہوئی، اس لئے آپ کی دعوت میں یہ صاف نظر آتا ہے کہ آپ انسانی عقل کی ہر صنف کو مخاطب
کر رہے ہیں، اور اس کے معیار اور سطح کے مطابق اُس قادرِ مطلق کی ہستی اور وجود پر دلیلیں بھی پیش
کر رہے ہیں، اس لئے آپ نے دوسرے پیغمبروں کی طرح صرف مشرکوں کو مخاطب نہیں فرمایا بلکہ
مشرکوں، کافروں، ملحدوں، متشککوں، دہریوں، ہر ایک کو مخاطب فرمایا، اور ان میں سے ہر ایک
کی تسکین و تشفی کا سامان بہم پہنچایا،

ایک قادرِ مطلق، خالقِ عالم، اور صانعِ کائنات کی ہستی کے ثبوت اور انکار پر جب سے فلسفہ

کا وجود ہے، ہمیشہ بحثیں پیدا ہوتیں، اور دلیلیں پیش کیجاتی رہی ہیں، مصر، یونان، ہندوستان،
اسلامی ممالک اور آج یورپ مین بھی اس مسئلہ پر، عقلاے زمانہ نے اپنی جودتِ ذہن، نکتہ رسی
اور دقیقہ فہمی کا بہترین ثبوت پیش کیا ہے، مگر غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ دلائل کی زبان اور طرزِ تعبیر
مین گو تبدیلی ہوتی رہی ہی، مگر اصل مغزِ سخن صرف ایک ہی، اس بنا پر وحیِ محمدیؐ نے اللہ تعالیٰ کی
ہستی اور وجود پر جو دلیل قائم کی، اس مین اسی مغز کو لے لیا ہی اور نہایت مؤثر طرزِ ادا مین اس کو
بار بار دہرایا، اور انسانون کو متنبہ کیا ہی،

وحیِ محمدیؐ کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہی کہ اس ایک قادرِ مطلق، خالقِ عالم اور صانع
ہستی کا اعتراف انسان کی فطرت مین داخل ہے، متمدن سے متمدن اور وحشی سے وحشی قوم مین
بھی اس اعتراف کا سراغ ملتا ہے، آثارِ قدیمہ کی تحقیقات نے سینکڑون مردہ اور گمنام
قومون کی تاریخ کا سراغ لگایا جس مین سامانِ تمدن، اعلیٰ خیالات اور علوم کی لاکھ کمی محسوس
ہوتی ہو مگر مذہبی عقیدت اور کسی خدا کے اعتراف کی کمی بالکل نہیں نظر آتی اُن کی عمارتون کے
منہدم کھنڈرون میں جو چیز سب سے پہلے ملتی ہی وہ کسی معبد کی چہار دیواری ہوتی ہی آج بھی دنیا کے
مختلف گوشون میں جو بالکل وحشی قومین ملتی ہین، وہ بھی کسی نہ کسی شکل مین عالم کے خالق اور کائنات
کے صانع کے تخیل سے بہرہ ور ہین، غرض جماعتِ انسانی کا کوئی حصہ، زمین کا کوئی گوشہ، زمانہ کا
کوئی عہد اس تخیل سے خالی نہیں ملتا، اس سے ظاہر ہوتا ہی کہ یہ اعتراف بھی انسان کے فطری
تصورات اور وجدانی جذبات مین داخل ہے، اسی لئے وحیِ محمدیؐ نے اس کو فطرت سے تعبیر کیا ہی،

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ — اپنا منہ سب طرف سے پھیر کر، دین کی طرف کر، یہ

الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ	خدا کی وہ فطرت ہی جس پر خدا نے لوگون کو بنایا
لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَ	خدا کی خلقت مین تبدیلی نہیں یہی سیدھا اور
لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (روم ۴)	ٹھیک دین ہی لیکن اکثر لوگ جانتے نہین

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

كُلُّ مَوْلُوْدٍ یُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ [1]	ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے،

اسی لئے خدا کا اعتراف روزِ اول کا وہ عہد و پیمان ہے، جو خالق و مخلوق کے درمیان ہوا تھا، اور یہ اسی عہد و پیمان کا احساس ہے، جو انسان کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہی کہ ہزار انکار کے بعد بھی کسی نہ کسی رنگ میں وہ اعتراف نمایان ہو جاتا ہی، قرآن پاک نے اس واقعہ کی تصویر ان الفاظ مین کھینچی ہے،

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْ اٰدَمَ مِنْ	اور جب تیرے خدا نے بنی آدم کی پیٹھ سے
ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ	ان کی نسل کو لیا، اور خود ان کو، انہی پر گواہ
عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا	کیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں، تو ان اُنھوں
بَلٰى شَهِدْنَا (اعراف - ۲۲)	نے کہا، ہان، ہم گواہ ہیں،

انسان کا یہ جذبہ فطرت کبھی کبھی خارجی اثرات سے دب جاتا ہے، وحی محمدی نے بارہا انسان کے اسی دبے ہوئے جذبہ کو ابھارا ہے، اور اسی زیر خاکستر آگ کو ہوا دی ہے، اور انسان کو اس کا بھولا ہوا وعدہ یاد دلایا ہے، وہ انسانون سے پوچھتی ہے،

---

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان،،

اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ، (ابراھیم-۲)

کیا آسمان وزمین کے پیدا کرنے والے خدا میں شک ہے؟

ایک اور مقام پر اُس نے کہا،

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ ھُمُ الْخَالِقُوْنَ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بَلْ لَّا یُوْقِنُوْنَ، (طور-۲)

کیا وہ آپ ہی آپ بن گئے، یا وہی آپنے آپ خالق ہیں، یا ان ہی آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہو (یہ کوئی بات نہیں) بلکہ اُن کو یقین نہیں ہے

دنیا اور کائنات جس مین انسان بھی شامل ہے اور جو اپنی عقل اور فہم کی بنا پر سب سے بالاتر ہے بہرحال موجود ہے، اور اس کے اس وجود میں کوئی شک بھی نہیں ہے اب سوال یہ ہے کہ کسی کے بن بنائے وہ آپ سے آپ بن گئی ہے، یا خود اُس نے اپنے آپ کو بنا لیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتین باطل ہیں، نہ آپ سے آپ کوئی چیز بن سکتی، اور نہ کوئی مفعول اپنا فاعل آپ ہو سکتا ہے، اگر کوئی بیوقوف یہ کہے کہ نر و مادہ مل کر اپنا بچہ پیدا کرتے ہیں تو اس سے پوچھا جائیگا کہ سلسلۂ توالد و تناسل کا آغاز کیونکر ہوا، اور اولین نر و مادہ کا اور مادۂ تخلیق و روح کا خالق کون ہے؟

یہ گوناگون عالم، یہ رنگارنگ کائنات، یہ تارون بھرا آسمان یہ بوقلمون زمین، یہ سورج یہ چاند، یہ درخت، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ لاکھون جاندار اور بے جان اشیا، یہ علل و اسباب کا تسلسل، تغیر و انقلاب کا نظام، یہ کائنات کا نظم، اور اُس کے ذرہ ذرہ کا قاعدہ و قانون، انسان کے اندرونی قوی اور ان کی باہمی ترتیب، موت و حیات کے اسرار، خواص و قوی کے رموز، انسان کی خیالی بلند پروازی، اور عملی عجز و درماندگی، یہ تمام باتین ایک خالق و صانع کے اعتراف پر مجبور کرتی ہیں،

یہ نیلگون آسمان کی چھت، یہ زمین کا سبزہ زار فرش، اور ایک ہی حرکت سے شب و روز کا انقلاب ایک خالقِ کل کا پتہ دیتا ہے،

اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ — آسمانون کی اور زمین کی پیدائش، اور رات
وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ — اور دن کے بدلنے میں عقلمندوں کے لئے
لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ (آل عمران - ۲۰) — نشانیاں ہیں،

یہ شب و روز کا نور و ظلمت، یہ سورج اور یہ چاند کی روشنی، اُن کی مقررہ رفتار، در باقاعدہ طلوع و غروب اس کی دلیل ہے کہ اس ابلقِ ایام پر کوئی سوار ہے جس کے ہاتھ میں اُس کا سیاہ سپید باگ ہے،

وَمِنْ اٰیٰتِهِ الَّیْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ — اور اُس کی نشانیون میں سے رات، دن
وَالْقَمَرُ، (فصّلت - ۵) — اور سورج اور چاند ہیں،

آسمان اور زمین کی پیدائش، دن اور رات کا الٹ پھیر، تو ہے، دیکھو کہ خطرناک سمندرون میں کس طرح لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک کو تجارت کا سامان لیکر دوڑتے پھرتے ہین اگر پانی مین مٹی اور لوہے کا ایک ذرہ بھی ڈالو تو فوراً ڈوب جائیگا، مگر یہ لاکھون من کے لدے ہوئے جہاز کیسے پھول کی طرح پانی پر تیر رہے ہین جس طرح فطری قاعدہ کے موجب یہ عمل ظہور میں آرہا ہے، وہ جس کے حکم سے بنا ہے اس کا کتنا بڑا احسان ہے، پھر ان سمندرون سے بخارات اٹھتے ہیں، وہ اوپر جاکر بادل بنتے ہیں، اور وہ وہیں پہنچکر برستے ہیں، جہاں پیداوار اور زمین کی نشو و نما کی حاجت ہے، اور پھر وہ بادل ہواؤن کے تخت پر بیٹھکر کیسے ادھر ادھر ضرورت کے مطابق اڑتے پھرتے ہین،

اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ — بے شبہہ آسمانون کی اور زمین کی پیدائش

وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ	اور دن رات کے الٹ پھیر میں، اور ان جہازون
الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ	میں جو انسانون کے لئے فائدہ رساں سامان لیکر
وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ	سمندر میں چلتے ہیں، اور آسمان سے اس کے پانی
مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا	برسانے میں اور پھر اس پانی کے ذریعہ مرے پیچھے
وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ	زمین کو زندگی بخشنے میں، اور زمین میں ہر طرح
الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ	کے لون کو پھیلانے میں اور ہواؤن کے کبھی ادھر
وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ،	اور کبھی ادھر بہنے میں، اور آسمان و زمین کے بیچ
(بقرہ ۲۰ - ۲۰)	مین جو بادل کام مین لگے ہیں ان سب میں سمجھ
	والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں،

آسمان اور زمین کی عجیب و غریب خلقت کے ساتھ خود انسان کی اپنی پیدایش کی حکایت کتنی عجیب ہے،

إِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ		بیشک آسمانون میں اور زمین میں ایمان اون
لِلْمُؤْمِنِينَ ، وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ	[illegible]	کے لئے نشانیاں ہیں، اور خود تمھاری پیدایش
مِنْ دَابَّةٍ آيَاتٌ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ (جاثیہ)		میں، اور جو چلنے والے پھیلائے، اُن مین یقین

سورۂ انعام میں نباتات اور ان کی نیرنگیون کو اپنی ہستی کی دلیل میں پیش کیا، یہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ ایک ہی زمین ہے جس میں سے وہ اُگتے ہیں، ایک ہی پانی ہے جس سے وہ سینچے جاتے ہیں، ایک ہی ہوا ہے جس میں وہ سانس لیتے ہیں، مگر کتنے رنگ برنگ کے پھل پھول، میوے

اور درخت لگتے ہین جن میں سے ہر ایک کا رنگ، ہر ایک کا مزہ، ہر ایک کی پتی، ہر ایک کا قد و قامت، ہر ایک کے خواص اور فائدے، دوسرے سے بالکل الگ ہوتے ہین،

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ	اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اُتارا پھر
مَاۗءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ	ہم نے اُس سے اُگنے والی ہر چیز نکالی، پھر اس
فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ	سے سبز خوشے نکالے جن سے ہم جڑے ہوے دانے
حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ	نکالتے ہیں، اور کھجور کے گابھے میں سے لٹکتے
طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ	گچھے، اور انگور کے باغ اور زیتون اور انار
اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ	ہمشکل اور جدی جدی شکل کے جب وہ
مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ اُنْظُرُوْٓا	پھلیں تو اُن کے پھل اور پکنے کو دیکھو، بیشک
اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۭ اِنَّ	اُن میں ایمان والے لوگون کے لیے دلیلین
فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (انعام[۲])	ہیں،

سورہ روم میں پہلے مٹی سے انسان کی پیدایش کو، پھر اس میں عورت مرد کے جوڑے ہونے کو، اور اُن کے درمیان مہر و محبت کے جذبات کے ظہور کو اپنی ہستی کی دلیل بتایا ہی، پھر اپنی قدرت کے دوسرے عجائبات کو جو آسمان سے زمین تک پھیلے ہین، ایک ایک کرکے پیش کیا ہی، اول تو خود انسانون کی پیدایش، پھر ان مین عورت مرد ہونا اور اُن کے درمیان جذبات کی لہر پھر مختلف قومون کی بولیون شکلوں اور رنگون کو دیکھو کہ ایک ایک سے الگ ہے، پھر انسانون کے اندر کے اعمال کو دیکھو، ایک نیند ہی کی حقیقت پر غور کرو یہی تمھاری آنکھین کھولنے

کے لئے کافی ہے،

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ
ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ وَمِنْ
اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ
اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ
مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ، وَمِنْ
اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ
وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ
وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ، وَمِنْ
اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا
وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ
الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ

اور اُس کی نشانیون میں سے یہ ہی کہ اُس نے
تم کو مٹی سے بنایا، پھر تم آدمی بنکر چلتے پھرتے
ہو، اور اُس کی نشانیون میں سے یہ ہی کہ اُس نے
تمھاری جنس سے تمھارے جوڑے بنائے کہ تم
اُن سے سکون حاصل کرو، اور تم سب کے
درمیان پیار اور مہر رکھا، اور اس میں
اُن لوگون کے لئے جو سوچتے ہیں، دلیلیں ہیں،
اور اُس کی نشانیوں میں سے آسمانون کی
اور زمین کی بناوٹ اور تمھاری بولیون
اور رنگون کی بوقلمونی ہے، اس میں جاننے
والون کے لئے یقیناً دلیلیں ہیں اور اسکی عجیب
قدرتون میں سے تمھارا رات دن میں سونا، اور
تمھارا اسکی مہربانیون کو تلاش کرنا ہی، اس میں
اُن کے لئے جو سنتے ہیں، دلیلیں ہیں، اور اُس کے
عجائب قدرت میں سے یہ ہی کہ تمھیں وہ بجلی کی
چمک دکھاتا ہی جس سے تم ڈرتے ہو اور کبھی

اَنْ تَقُوْمَ السَّمَاءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ،

(روم - ۳)

(رحمت کی بارش کی) امید باندھتے ہوا ور وہ آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اس سے زمین کو اس کے مرے پیچھے زندہ کرتا ہے اس میں ان کے لئے جو سمجھ رکھتے ہیں دلیلیں ہیں اور اس کی دلیلوں میں سے یہ ہے کہ

اس اخیر آیت میں آسمان وزمین کے اس کے حکم سے قائم رہنے کا ذکر ہے، تم کہتے ہو کہ یہ باہمی جذب وکشش سے قائم ہیں لیکن خود یہ جذب وکشش کس کی کشش کا نتیجہ ہے؟ یہ خود حیرت انگیز ہے سورۂ لقمان میں آسمانوں کے بلا کسی نظر نہ آنے والے سہارے کے کھڑے ہونے اور زمین کے اپنی جگہ پر ٹھہرے ہونے کا ذکر ہے، یہ نظر نہ آنے والا سہارا قوتِ کشش ہی سہی لیکن وہ بھی تو اسی کے اسرار میں سے ہے، اس کے بعد ایک جامد اور بے حیات مردہ زمین کے اندر سے پانی برسنے کے ساتھ انواع واقسام کی زندگی کے نمونوں کا ابھرآنا کتنا حیرت انگیز ہے، یہ بھی اسی کا کرشمہ ہے،

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ کُلِّ دَآبَّةٍ، وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْبَتْنَا فِیْهَا مِنْ کُلِّ زَوْجٍ کَرِیْمٍ،

(لقمان - ۱)

اس نے آسمانوں کی چھت کو کسی ایسے ستونوں کے بغیر کھڑا کیا ہے جو تم کو نظر آتے ہوں اور زمین میں ایسے کھونٹے ڈال دیئے کہ وہ تم کو لیکر ہل نہ جائے اور اس نے اس زمین پر ہر قسم کے چلنے پھرنے والے پھیلائے اور آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے اسی زمین میں

سورہ سجدہ میں انسان کی پیدائش کا مٹی سے آغاز، پھر قطرۂ آب (نطفہ) کے ذریعہ توالد

وتناسل، پھراس سڈول جسم کا بنجانا، پھراس مٹی کے مردہ قالب میں دفعۃً کہیں سے زندگی آجانا اوراس میں روح پھک جانا، اوراس میں علم وحواس کے حیرت انگیز آلات کا پیدا ہوجانا، ان سب کواپنی صفت مین پیش کیا ہی،

اَلَّذِیۡۤ اَحۡسَنَ کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَہٗ وَ	وہ جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی، اورانسان
بَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِیۡنٍ ثُمَّ	کی پیدائش مٹی سے شروع کی، پھراس کی
جَعَلَ نَسۡلَہٗ مِنۡ سُلٰلَۃٍ مِّنۡ مَّآءٍ	نسل ذلیل سے نچڑے پانی سے بنائی، پھراس کو
مَّہِیۡنٍ، ثُمَّ سَوّٰىہُ وَ نَفَخَ فِیۡہِ مِنۡ	سڈول کیا، اوراس میں اپنی جان سی کچھ
رُّوۡحِہٖ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ	پھونک دیا، اورتمھارے لئے کان اورآنکھیں
وَالۡاَفۡـِٕدَۃَ قَلِیۡلًا مَّا تَشۡکُرُوۡنَ،	اوردل بنادیئے، تم ان احسانون کا بہت
(سجدہ ۔۱)	کم شکرادا کرتے ہو،

مردہ زمین کے اندر کیا کیا قوتین ودیعت ہین اورخود انسانون کے جسم وجان مین عجائبات کا کتنا خزانہ رکھا ہے لیکن کوئی صاحبِ نظر ادھر نہیں دیکھتا، انسان کی زندگی اُس کے اندرونی جذبات، حواس، ذہنی قوی اوردماغی حرکات، ان میں سے ہر شے معما ہی،

وَفِی الۡاَرۡضِ اٰیٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِیۡنَ وَ	اورزمین میں یقین کرنے والون کے لئے
فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ،	نشانیان ہین، اورخود تمھاری جانون
(ذاریات ۔۱)	کے اندر، کیا تم نظر نہیں کرتے،

جانورون کے مجمعوں کے اندر جو عجیب وغریب نظام ہی، وہ بھی غور کے قابل ہی، ایک

ہی گھاس پھوس کی غذا اُن کے پیٹ مین جاتی ہے، پھراسی کا کچھ حصّہ لید اور گوبر، کچھ خون، اور کچھ دودھ بنجاتا ہے، اور اسی لید اور گوبر کے باہر آنے کے راستون اور سُرخ خون کی رگون کے درمیان سے خالص، سپید، شیرین دودھ کی دھاروں کا نکلنا کتنا عجیب ہی؟

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي بُطُونِهِ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِلشَّارِبِينَ، (نحل - ۹)

اور تمھارے لئے جانورون مین عبرت ہے ہم تمھین اُن کے پیٹون کے اندر سے لید، اور خون کے بیچ سے خالص اور پینے والون کیلئے خوشگوار دودھ پلاتے ہین،

ایک ہی قسم کے پھل ہین، اگران کو ایک طرح سے کھاؤ تو تمھاری عقل اور قوت کو بڑھاتے ہین، اور دوسری طرح کھاؤ تو اس کو ضائع کر دیتے ہین،

وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا وَرِزْقًا حَسَنًا اِنَّ فِي ذَالِكَ لَاٰيَةً لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ، (نحل ۹)

اور کھجو ہارون اور انگورون کے پھلون کو دیکھو کہ ان میں سے تم نشہ اور اچھی روزی بھی حاصل کرتے ہو اس مین سمجھ والون کے لئے دلیل ہی

زمین اور زمین پر کی مخلوقات کو چھوڑ کر اوپر آسمان کی طرف نظر اٹھاؤ، سورج کا روشن چراغ اور چاند کی خوشنما قندیل کتنی عجیب ہی، پھر سورج کو دیکھو کہ سال کے بارہ مہینون مین آسمان کے بارہ بُرج طے کر کے کس طرح زمین میں مختلف موسمون اور زمانون کو نمایان کرتا ہے،

تَبَارَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا (فرقان - ۲)

بابرکت ہی وہ ہستی جس نے آسمانون مین برج بنائے اور ان مین ایک چراغ اور چمکانے والا چاند

ان ہی چند چیزون تک اس کی قدرت کے عجائبات محدود نہین، بلکہ ہر شے اپنی خلقت اپنی محکم روش، اور اپنے قانونِ فطرت سے اس کی گواہی دیتی ہے،

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ، (نحل - ۱۷)

اس اللہ کی صنعت ہے جس نے ہر شے کو مضبوط (نظام پر) بنایا،

اس کی صنعت ہر قسم کے عیب سے پاک ہے، اس مین مستحکم نظم ونسق کی بندش نظر آتی ہے

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ (ملک ۱)

تجھے خدائے رحمٰن کی بناوٹ میں کوئی بے ربطی نظر آتی ہے؟ پھر نگاہ کر، کیا کوئی خلل دکھائی پڑتا ہے؛ پھر دہرا کر دوبارہ نظر کر، تیری نگاہ رد ہوکر تھک کر تجھ تک پلٹ آئے گی (مگر کوئی نقص نظر نہ آئے گا)

اس قسم کی اور سینکڑون آیتیں ہیں جن کا استقصا بھی مستقل ہے، ان آیتون مین تین قسم کے دلائل ہین،

۱- قدرت کے عجائبات اور نیرنگیان، اور پھر اُن کا ایک قانون کے ماتحت ہونا،

۲- عالم کا نظم ونسق اور اس کا مرتب سلسلہ،

۳- کائنات اور سلسلۂ عالم کی ہر کڑی مین بے انتہا مصلحتون، حکمتون، اور فائدون کا ہونا

ان مقدمات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے یہ عجائبات اور اس کے یہ منظم علل واسباب، خودبخود بخت واتفاق سے نہین بن گئے، بلکہ کسی حکیم ودانا، اور قادرِ مطلق صانع نے اپنی قدرتِ اور ارادہ سے اُن کو بنایا ہے،

عالم میں ہر چیز کے لئے علل واسباب کا سلسلہ ہے یہ سلسلہ یا تو کہیں جاکر ختم ہوگا یا یوں ہی مسلسل چلا جائیگا اگر یہ یونہی مسلسل چلا جائیگا تو لازم آتا ہے کہ ہر چیز کے پیدا ہونے پر غیر متناہی علل گذر جائیں اور غیر متناہی علل کا خاتمہ نہیں ہوسکتا، اور نہ کہیں اُن کا آغاز ہوسکتا ہے، اس لئے کوئی چیز پیدا بھی نہیں ہوسکتی، تسلسل عقلاً بھی محال ہے، بلکہ انسان اس کے تخیل سے بھی عاجز ہے اس بنا پر لامحالہ سلسلۂ علل کا کہیں خاتمہ ہونا ضروری ہے جب علتِ کل پر تمام علتیں ختم ہوجاتی ہیں، وہی خلق و پیدایش اور وجود کی اصلی علت العلل ہے،

یہ دلیل گو بہت کچھ پیچیدا اور اصطلاحات سے لبریز، اور بہت سے محذوف مقدمات پر مبنی ہے، تاہم وہ انسانی عقل میں آتی ہے، اور بہتوں کے لئے تسکین کا باعث ہے، قرآن پاک کی ایک دو آیتوں میں بھی اس دلیل کا ماخذ مذکور ہے، سورۂ ہود کے آخر میں ہے،

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	اور خدا ہی کے پاس ہے آسمانوں اور زمین کی چھپی
وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ، فَاعْبُدْهُ	بات اور اسی کی طرف ہر بات لوٹائی جاتی ہے
وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ، (هُود-۱۰)	تو اس کو پوج اور اس پر بھروسہ کر،
وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى (نجم-۳)	اور یہ کہ تیرے رب کی طرف ہے سب کی انتہا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انسانی کمزوریوں سے واقف تھے، چند صحابیوں نے آکر عرض کی، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کبھی کبھی ہمارے دلوں میں ایسے خیالات اور وسوسے آتے ہیں، جن کو ہم زبان سے ادا نہیں کرسکتے، فرمایا کیا تم کو یہ کیفیت حاصل ہوگئی، عرض کی ہاں یارسول اللہ، فرمایا یہ تو خالص ایمان ہے، مقصود یہ ہے کہ دل میں وسوسوں کا آنا اور پھر ان وسوسوں کو اتنا

بدتر جاننا کہ ان کا زبان پر لانا بھی وہ گناہ سمجھے، یہ کیفیتِ ایمانی کے بغیر ممکن نہیں، اسی طرح آپ نے فرمایا" لوگ علم و دانش کا سوال کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ خیر اس کو تو خدا نے پیدا کیا، اور پھر اس خدا کو کس نے پیدا کیا، آسمان کو خدا نے بنایا زمین کو خدا نے بنایا یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے پھر پوچھتے ہیں، اچھا تو پھر خدا کو کس نے پیدا کیا، فرمایا یہ شیطانی وسوسہ ہے جب یہ حالت کسی کو پیش آئے تو کہدے اٰمنتُ باللہ میں اللہ پر ایمان لایا"[1]

یہ تعلیم درحقیقت اسی مسئلہ کی ہے کہ خدا پر تمام علتون کی انتہا ہے، اور اس کے بعد کوئی علت نہیں، اس لئے یہ وسوسہ لائق جواب نہیں، یہ جہالت اور نادانی کا سوال ہے،

توحید پر عقلی دلیلین اگر کوئی عالم کا خالق و صانع ہے، تو وہ یقیناً ایک ہے، دو نہین تاہم دنیا میں ایسے عقلمند بھی ہیں، جو دو تین بلکہ متعدد خداؤں کے قائل ہین، اور عالم کی ایک مملکت کو سیکڑوں حصوں مین تقسیم کرکے اُن کو مختلف خداؤن کی حکومتین قرار دیتے ہین، وحی محمدیؐ نے اس شرک کے ابطال پر سب سے زیادہ جس دلیل کو پیش کیا ہے، وہ نظام عالم کی یکسانی اور وحدت، اور کائنات کے علل و اسباب کا باہم توافق، تعاون، اشتراک اور اتحاد ہے، دنیا مین ایک ذرہ بھی اس وقت تک پیدا نہین ہوسکتا جب تک آسمان سے لیکر زمین تک کی تمام کارکن قوتین اور اسباب ایک دوسرے کے موافق و مناسب نہ ہون، اور باہم ان میں اشتراک عمل نہ ہو، ایک دانہ زمین سے اُس وقت تک اُگ نہین سکتا جب تک دانہ اُگنے کے لائق نہ ہو، زمین میں اُگانے کی صلاحیت نہ ہو، موسم اس کے مناسب نہ ہو، بارش موافق نہو، آفتاب سے اس کو گرمی اور روشنی اس کے مزاج کے مطابق

---

[1] یہ دونون حدیثیں صحیح مسلم کتاب الایمان مین متعدد روایتون سے مذکور ہین،

ہم نہ پہنچے، پھراس کے اگنے کے مواقع اور حوائق ایک ایک کرکے دفع نہ ہون، ان سب مراحل کے بعد وہ دانہ اگیگا، اور پھل لائے گا، قرآن پاک نے اسی حقیقت کوان الفاظ مین اداکیا ہے،

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ (انبیا-۲)	اگر زمین وآسمان میں اس ایک خدائے برحق کے سوا چند اور خدا بھی ہوتے، توزمین وآسمان برباد ہوجاتے تو پاک ہو عرش والا خدا ان باتون سے جو

آسمان وزمین کا یہ تمام کاروبار، یہ تمام قوانینِ قدرت اگر ایک کے بجائے دو طاقتوں کے ہاتھ مین ہوتے، تو یہ باہمی تصادم میں ایک لمحہ کے لئے بھی قائم نہ رہتے، فلسفیانہ اصطلاحات مین اس مطلب کوادا کرو تو یوں ہوگا کہ عالم کائنات معلول ہے، اسکی کوئی علتِ تامہ ہوگی، یہ ظاہر ہوکہ ایک معلول کی دو علتِ تامہ نہیں ہوسکتیں، کیونکہ علتِ تامہ اس کو کہتے ہین جس کے وجود کے بعد معلول کے وجود میں کسی اور چیز کا انتظار نہ ہو، اب عالم کی علتِ تامہ اگر ایک نہ ہو بلکہ دو ہوں تو سوال یہ ہے کہ ایک علتِ تامہ کے وجود کے بعد، عالم کے وجود میں دوسری علتِ تامہ کا انتظار رہیگا یا نہیں، اگر رہیگا تو پہلی شے علت تامہ نہین رہے گی، اور اگر انتظار نہ ہے گا تو دوسری شے علت تامہ نہ ہوگی، اس سے یہ ثابت ہوا کہ عالم کی علتِ تامہ ایک ہی ہوسکتی ہے،

توحید کے ثبوت اور شرک کے ابطال کی دوسری دلیل نظامِ عالم کی وحدت ہے سورج چاند اور تارون سے لے کر انسان، حیوان، ہوا، پانی، درخت، اور گھاس پات تک کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ سب ایک مقررہ نظام اور بندھے اصول کے ماتحت ہیں جنمین کبھی سرمو فرق نہیں ہوتا ہر شے ایک اصول کی پابند اور ایک عادتِ جاریہ کے مطابق چل رہی ہو گویا ایسا معلوم ہوتا ہو کہ ان سب میں

یکسانی اور مساوات کی ایک خاص وحدت قائم ہے، اور وہ سب کسی ایک ہستی کے اشارے پر چل رہے ہیں،

وَمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ	اور نہ اس خدائے برحق کے ساتھ کوئی اور خدا ہے
اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ	اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو الگ لیجاتا، اور
(مومنون - ۵)	ایک دوسرے پر چڑھ جاتا،
قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ	کہ اگر خدائے برحق کے ساتھ کچھ اور خدا ہوتے
اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا	جیسا کہ یہ مشرکین کہتے ہیں تو ایسی حالت میں وہ
سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا	تخت والے (حکران خدا سے حکومت چھیننے) کا راستہ
كَبِيْرًا، تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ	ڈھونڈتے، پاک اور بلند ہو وہ (خدا) اس بات سے
وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ	جس کو یہ (مشرک) کہتے ہیں اس (خدا) برحق
اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ، (بنی اسرائیل - ۵)	کی پاکی ساتوں آسمان اور زمین اور جو اُن کے اندر ہیں

اسی وحدتِ نظام کے استدلال کو ایک اور آیت میں خدا نے بیان فرمایا ہے،

مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ	تو خدا کے بنائے میں کوئی فرق نہیں دیکھتا پھر
فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ	نگاہ کر، کیا کوئی فطور تجھ کو دکھائی دیتا ہے؟ پھر
ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ	دوبارہ نظر دوڑا، تیری نظر رد ہو کر، تھک کر
الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ (ملک - ۱)	واپس جائے گی،

اس واقعاتی استدلال سے بڑھ کر جو بالکل نظمِ فطرت پر مبنی ہے کوئی دوسری صحیح دلیل نہیں،

ہو سکتی، اسی لئے قرآن پاک نے اس کو اختیار کیا ہے، یہ دنیا وحدت نظام ہی کے ماتحت چل رہی ہے
ورنہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی چل نہ سکے، اسی سے اس دنیا کے حاکم و فرما نروائے مطلق کی وحدت
بخوبی ثابت ہے،

توحید کی تکمیل توحید خواہ کسی قدر محرّف، شرک آمیز اور ناقص شکل مین ہو، دنیا کے تمام مذاہب
و ادیان کی مشترک ورادلین تعلیم ہے، لیکن ان مذاہب مین وہ کسی خاص اصل پر مبنی نہ تھی محمد
رسول اللہ کی تعلیم نے اس عمارت کو چند خاص اصول کے بنیادی پتھرون پر قائم کیا، یہ پتھر
کیا ہین، ؟ خدا کی حقیقی عظمت کی شناخت اور اس عالم کائنات مین انسان کی اصلی حیثیت اور مرتبہ کی تعیین

خدا کی حقیقی عظمت اہل عرب ایک حقیقی قوت کے نام سے واقف تھے، اور اس کو خالق بھی مانتے
تھے، قدرت کے کارخانہ کا اس کو تنہا مالک نہین سمجھتے تھے، یہودیون کا خدا، ایک خاندانی خدا
تھا جس نے ساری دنیا صرف بنی اسرائیل کے لئے پیدا کی تھی، اور اس کو بنا کر ساتوین دن
وہ تھک کر بیٹھ گیا تھا، وہ انسانون سے کشتی لڑتا تھا، اس کی اولادین تھیں، عیسائیون
کا خدا اب کچھ مسیح بن مریم کو دیکر خود معطل ہو گیا، تھا ایرانیون کے خدا کی خدائی نیکی و بدی
کی دو مملکتون مین بٹی ہوئی تھی، ہندوؤن کا خدا اوتارون کا بھیس بدل کر لاکھون خدا بن گیا
تھا، اور برہما، مہیش، اور بشن تینون نے مل کر خدائی کے کاروبار باہم تقسیم کر لئے تھے لیکن محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خدا کا جلوہ نمایان کیا، جو آسمان کے اوپر سے لیکر زمین کے نیچے تک کا تنہا مالک ہے،
اس کے کاروبار مین کوئی دوسرا شریک نہین، اس کی شاہنشاہی مین کسی دوسرے کا حصہ نہین،
اس کے کارخانۂ قدرت مین کوئی دوسرا ساجھی نہین، کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہین،

دنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہوں سے چھپی نہیں، شجر، حجر، جنگل، پہاڑ، صحرا، دریا، سورج، چاند، زمین، آسمان، انسان، حیوان، زبان والے اور بے زبان سب اس کے آگے سربسجود، اور اُس کی تسبیح و تہلیل میں مصروف ہیں، سب کمزور ہیں، وہی ایک قوت والا ہے، سب جاہل ہیں، اسی ایک کو علم ہے، سب فانی ہیں، اسی ایک کو بقا ہے، سب محتاج ہیں، وہی ایک بے نیاز ہے، سب اس کے بندے ہیں، وہی ایک شہنشاہ ہے، غرض عرش سے فرش تک جو کچھ ہے، وہ اس کا ہے، اور اس پر صرف اسی کی حکمرانی ہے، وہ ہر عیب سے پاک، ہر برائی سے منزّہ، اور ہر الزام سے بَری ہے، وہ ہر قسم کے صفاتِ عالیہ، اوصافِ کمالیہ، اور محامد جمیلہ سے متصف ہے، اس کے مانند کوئی نہیں، اس کی شبیہ و مثال کوئی نہیں، وہ تشبیہ و تمثیل سے بالاتر اور انسانی رشتہ ناتے سے پاک ہے،

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ،	وہ ہے اللہ تمہارا رب، اسی کی بادشاہی ہے،
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، (زمر-۱)	اس کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے،
لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (زمر-۱)	آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے،
فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (انعام-۲)	آسمانوں کا اور زمین کا پیدا کرنے والا،
عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ (انعام-۹)	چھپی اور کھلی کا جاننے والا،
كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهُ لَهُ الْحُكْمُ، (قصص-۹)	اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے، اسی کے ہاتھ میں فیصلہ کی طاقت ہے،
لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ، (شوریٰ-۲)	اس کے مانند کوئی چیز نہیں، اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے

هُوَ الْحَيُّ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ، (مومن - ۷)

وہی زندہ ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔

وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ إِلَّا
هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ
مِنْ وَّرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي
ظُلُمٰتِ الْأَرْضِ، (انعام - ۷)

غیب کی کنجیاں اُسی کے پاس ہیں اس کے سوا
ان کو کوئی نہیں جانتا خشکی اور تری میں جو کچھ ہے وہ
اُس کو جانتا ہے، درخت کا کوئی پتہ نہیں گرتا
نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ہے لیکن وہ

اَللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ
مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ
وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ
بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ
(آل عمران - ۳)

اے اللہ اے بادشاہی کے مالک! تو جس کو
چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے
اور جس کو چاہے عزت دے، اور جسے چاہے ذلت
نصیب کرے، تیرے ہاتھ میں بھلائی ہے بیشک
تو ہر بات پر قادر ہے۔

وَإِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا
كَاشِفَ لَهٗٓ إِلَّا هُوَ، وَإِنْ يُّرِدْكَ
بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ يُصِيبُ بِهٖ مَنْ
يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ
(یونس - ۱۱)

اور اگر اللہ تجھے مصیبت پہنچائے تو اس کے سوا کوئی
اُس کا دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تیرے ساتھ
بھلائی کرنا چاہے تو اس کے فضل وکرم کا کوئی
روکنے والا نہیں، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے
اپنے فضل سے ممتاز کرے، اور وہی گناہوں

اَللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ
لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهٗ

اللہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہیں، وہی
جیتا ہے اور سب اس کے سہارے جیتے ہیں۔

مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا يَـٔـُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ،

(بقر ۲ - ۳۴)

اس کو اونگھ ہی نہ نیند، آسمان اور زمین میں جو کچھ ہی، اسی کا ہے، کون ایسا ہی جو اُس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے، جو لوگون کے روبرو ہی، اور جو اُن کے پیچھے ہی سب کو جانتا ہی، اور وہ اس کے علم کے حصہ کا احاطہ نہین کر سکتے، مگر جتنا وہ چاہی، اُس کا تخت آسمانوں کو اور زمین کو سمائے ہے، اُن آسمانون کی اور زمین کی نگرانی اُس کو تھکاتی نہیں، اُور

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاۗءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ، لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ، (حدید - ۱)

جو زمین مین گھستا، اور جو اس سے نکلتا ہی، اور جو آسمان سے اُترتا، اور اس مین چڑھتا ہی وہ سب کو جانتا ہی، اور تم جہان بھی ہو وہ تمھارے ساتھ ہی، اور تم جو کچھ کرو اللہ اس کو دیکھتا ہے، اور آسمانون اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور تمام کاموں کا مرجع وہی ہی،

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (فاتحہ)

سب تعریف اللہ کے لئے ہی جو تمام عالم کا پالنے والا ہے،

وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، (آل عمران - ۹)

اور آسمانون میں اور زمین میں جو کچھ ہی سب اُس کے زیر فرمان ہی،

وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ، ذُوالْعَرْشِ الْمَجِیْدُ، فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ، (بروج - ۱)

وہی گناہوں کا بخشنے والا ہے، بندوں سے محبت کرنے والا ہے تخت کا مالک ہے، بڑی شان والا ہے، جو چاہتا ہے، کردیتا ہے،

یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ، (جمعہ - ۱)

آسمانوں میں اور زمین میں جو ہے، سب اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں،

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (اسرائیل)

اور کوئی چیز نہیں جو اسکی حمد کی تسبیح نہ پڑھتی ہو،

ان معنوں کی ہزاروں آیتیں قرآن پاک میں ہیں، ان تعلیمات نے خدا کی عظمت، جلالت اور کبریائی کا وہ جلوہ پیش کیا جس کے سامنے معبودانِ باطل کی عزت خاک میں مل گئی، بتوں کی بڑائی کا طلسم ٹوٹ گیا، سورج، چاند تاروں کی خدائی کا چراغ ہمیشہ کے لئے بجھ گیا، جن وانس، شجر و حجر، بحر و بر، سب اس کے جلال و جبروت کے سامنے سربسجود نظر آئے، پھر اس کے سوا کون تھا، جو نیرنگِ جو کے سازسے انا اللہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھو (میں ہوں خدا جس کے سوا کوئی دوسرا نہیں) کی صدا بلند کرسکتا،

انسان کا مرتبہ

توحید محمدی کا دوسرا بنیادی اصول، اس عالمِ خلق میں انسان کی حیثیت اور درجہ ہے، جو لوگ بتوں کو سجدہ کرتے ہیں، پتھروں کو پوجتے ہیں، درختوں کے آگے جھکتے ہیں، جانوروں کو دیوتا مانتے ہیں، جنات اور ارواحِ خبیثہ کے نام کی دہائی پکارتے ہیں، آسمانی مخلوقات کو ارباب جانتے ہیں، انسانوں کو خدا سمجھتے ہیں، وہ حقیقت میں انسان کے درجہ اور مرتبہ سے ناواقف ہیں، وہ دراصل اس طرح انسان کو پتھروں سے، درختوں سے، جانوروں سے، دریاؤں سے، پہاڑوں سے، اور چاند تاروں سے کمتر جانتے ہیں، انھوں نے درحقیقت انسان کے اصلی رتبہ و حیثیت کو نہیں پہچانا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وحی کی زبان سے جاہل عربوں کو یہ نکتہ سوجھایا کہ انسان اس عالم خلق میں تمام مخلوقات سے اشرف ہے، اور وہ اس دنیا میں خدا کی نیابت کا فرض انجام دینے آیا ہے، قرآن کے ابتدائی سورہ میں آدم کی خلافت کا قصہ محض داستان نہیں بلکہ انسان کی اصلی حیثیت کو عیان اور نمایاں کرنے والی تعلیم کا اولین دیباچہ ہے، اس کو فرشتوں کا مسجود بنانا گویا تمام کائنات کا مسجود بنانا تھا اس کو تمام اسمار کا علم عطا کرنا گویا تمام اشیا کو اس کے تصرف میں دینا تھا اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً کے فرمان کے رو سے اس عالم میں خدا کا نائب ہے، اور اس کا سر خلافت الٰہی کے تاج سے ممتاز ہے، کروڑوں مخلوقاتِ الٰہی میں خدا کی امانت کا حامل وہی منتخب ہوا یہ منصب اعلیٰ نہ فرشتوں کو ملا، نہ آسمان کو عطا ہوا، نہ زمین کے حصہ میں آیا، نہ پہاڑ اس کے مستحق قرار پائے، صرف انسان ہی کا سینہ تھا، جو اس امانت کا خزینہ دار ہوا اور اسی کی گردن تھی، جو اس بوجھ کے قابل نظر آئی، فرمایا،

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَ	ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر، اور زمین پر، اور
الْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا	پہاڑوں پر پیش کی، تو سب نے اس بار (امانت)
وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ	کے اٹھانے سے انکار کیا، اور اس سے ڈرے
(احزاب - ۹)	اور انسان نے اس کو اٹھا لیا،

وحی محمدی نے انسان کا رتبہ یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بندگیوں سے سرفراز فرمایا عالم مخلوقات میں برتر بنایا، اور انعام واکرام سے معزز کیا ہے،

وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْۤ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ	ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی، اور ہم نے
فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ	خشکی اور تری میں انکو سواری دی، اور ستھری

وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (بنی اسرائیل - ۷)	چیزون کی اُن کو روزی بخشی اور اپنی بہت سی پیدا کی ہوئی چیزون پر اُن کو فضیلت عطا کی،

انسان ہی وہ مخلوق ہے جو سب سے بہتر قوی اور بہترین اندازہ کیساتھ دنیا میں پیدا ہوئی

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝	البتہ ہم نے انسان کو بہتر اندازہ پر پیدا کیا،

یہان تک کہ انسان خدا کی صورت کا عکس قرار پایا، متعدد حدیثون مین ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا[1]، اسی بنا پر آپ نے تعلیم دی کہ "غلام کو سزا دو تو اس کے چہرہ پر نہ مارو کہ وہ صورتِ الٰہی کا عکس ہے"، عین میدان جنگ میں اگر تلوارین برس رہی ہون تو حریف کے چہرہ پر وار نہ کرنا چاہیئے کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت[2] پر بنایا ہے"، غصہ میں یہ بھی نہ کہنا چاہیئے کہ خدا تیرے چہرہ کو اور تیرے جیسے چہرہ کو بگاڑ دے کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر خلق کیا[3]، ان حدیثون کا مطلب یہ نہیں کہ انسان کی طرح خدا کی کوئی جسمانی شکل ہے، اور آدم کی شکل اس کی نقل ہے، لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ بلکہ یہ مطلب ہے کہ انسان مین خدا کی صفاتِ کاملہ کی ایک دھندلی سی جھلک موجود ہے، علم، قدرت، حیات، سمع، بصر، ارادہ، غضب، رحم، سخا، وغیرہ، صفات کی ناقص مثالین اس کے اندر اللہ نے ودیعت رکھی ہین، اور چونکہ انسان کے تمام اعضا مین اس کا چہرہ ہی اس کی شخصیت کا آئینہ دار اور اس کے اکثر حواس کا مصدر ہے، جن سے اس کے تمام اوصاف کا ظہور ہوتا ہے، اس لیئے آنحضرت

---

[1] صحیح بخاری کتاب الاستیذان ابن ابی عاصم فی السنۃ والطبرانی من حدیث ابن عمر باسناد رجالہ ثقات و ادب المفرد بخاری واحمد بن ابی ہریرۃ وصحیح مسلم کتاب البر، نیز توراۃ میں بھی یہ فقرہ ان الفاظ مین ہے "جس دن خدا نے آدم کو پیدا کیا، خدا کی صورت پر اسے بنایا" (پیدائش ۵-۲) [2] صحیح بخاری کتاب العتق، وصحیح مسلم کتاب البر والصلۃ [3] صحیح مسلم کتاب البر آخری ٹکڑا صرف مسلم میں ہے، [4] الادب المفرد امام بخاری باب لا تقل قبح اللہ وجہہ،

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے انسان کے اعضا میں اُسی کو فیضِ رحمانی کا موزوں[1] ظاہر کیا، اب غور کرو کہ وہ چہرہ جس کو خدا سے ایسی نسبت ہو کیا اس لائق ہے کہ غیر خدا کے آگے زمین پر رکھا جائے،

انسان تو کائنات میں خلیفۃ اللہ بن کر آیا ہے،

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ (انعام[2]) اور اسی نے تم کو زمین کا نائب بنایا،

تو اب وہ عالم کائنات میں خدا کے سوا کس کو سجدہ کرے،

روے زمین کی تمام چیزیں اسکے خاطر بنیں وہ روے زمین کی خاطر نہیں بنا ہے،

خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (بقرہ ۳) جو کچھ زمین میں ہو خدا نے (اے انسان) تمھارے لئے بنایا،

أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ (حج - ۹) زمین میں جو کچھ ہو خدا نے اسکو تمھارے بس میں دیدیا ہے،

تو اب وہ روے زمین کی کس ہستی کے سامنے سر جھکائے،

مشرک، بت پرست، ستارہ پرست، فطرت پرست حقیقت میں غیروں کے آگے جھک کر یہ ثبوت دیتے ہیں کہ یہ اُن کے لیے نہیں، بلکہ وہ اُن کے لیے بنے ہیں، جو چاند اور سورج کو پوجتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں، کہ چاند اور سورج اُن کے لیے نہیں بلکہ وہ چاند اور سورج کیلئے بنے ہیں، محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے اپنی وحی اور تعلیم کے ذریعہ سے یہ بتایا کہ کائنات کی ہر چیز انسان کے لیے بنی ہی اور انسان خدا کے لیے بنا ہو، اس لیے جب کائنات کا ہر ذرہ انسان کی خدمت گذاری میں مصروف ہو، تو انسان کو بھی خدا ہی کی خدمت گذاری میں مصروف رہنا چاہیئے،

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

---

[1] اس حدیث کی شرح میں فتح الباری شرح بخاری میں یہ قول نقل کیا گیا ہے،

انسانون نے آسمانی مخلوقات کو اپنا معبود بنایا، تو وحیِ محمدیؐ نے اُن سے کہا،

وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ	اور خدا نے رات، دن، اور چاند اور سورج کو
وَالْقَمَرَ ط وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ ط	تمھارے لئے کام مین لگایا، اور ستارے اس کے
(نحل - ۲)	حکم سے کام میں لگے ہیں،

انسانون نے جانورون کو پوجا تو پیغام محمدیؐ نے ان انجانون کو بتایا کہ یہ تمھارے ہین، تم اُن کے نہیں ہو،

وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَ	اور جانوروں کو اُس نے پیدا کیا تمھارے لئے
مَنَافِعُ، (نحل - ۱)	جن مین اُون کی گرمی اور دوسری فائدے ہین

انسانون نے دریا اور سمندر کو دیبی اور دیوتا بنایا، حالانکہ وہ بھی ان ہی کی خاطر عدم سے وجود مین آئے ہین،

وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ	اور وہی خدا ہے، جس نے دریا کو کام مین لگایا
لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً	کہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ، اور تاکہ تم اس
تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ	میں سے آرایش کے موتی پہننے کو نکالو، اور دیکھتے
فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ ط	ہو کہ جہاز سمندر کو پھاڑتے پھرتے ہیں، اور تاکہ
(نحل - ۲)	تم خدا کے فضل و کرم (روزی) کی تلاش کرو،

آگ بھی انسانون کی مسجود بنی، حالانکہ وہ خود ان ہی کی محبت مین جل رہی ہے،

الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ	جس نے تمھارے واسطے ہرے درخت

نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ، — سے آگ پیدا کی پس اس وقت تم اُس سے روشنی کرتے ہو،

(یٰسٓ - ۵)

الغرض زمین سے لیکر آسمان تک جو مخلوق بھی ہے، انسان اُس سے اشرف اور بلند تر ہے
اور ساری مخلوق اسی کے لئے ہے، پھر اس انسان سے بڑھ کر اور کون نادان ہے جو مخلوقات مین
سے کسی کو اپنا معبود، اور مسجود بنائے، اس حقیقت کے آشکارا ہونے کے بعد شرک کا کوئی پہلو
بھی ایسا ہے جسمیں کوئی سچا مسلمان گرفتار ہو سکے، ورایک آستانہ کو چھوڑ کر دوسری اور چوکھٹ پر اپنا سر جھکا سکے؟
الغرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس توحید کی تلقین کی، وہ ان ہی دو اصولون
پر قائم ہے، ایک یہ کہ انسان تمام مخلوقات مین اشرف ہے، اس لئے کسی مخلوق کے سامنے اس کا سر نہ
جھکنا چاہیئے، اور دوسرا یہ کہ ہر قسم کی قوت، ہر قسم کی قدرت، اور تمام اوصاف کمالیہ صرف ایک
بزرگ و برتر ہستی کے لئے ہیں جو ماوراے عرش سے زیر فرش تک ہر ذرہ پر حکمران ہے، اسکی اطاعت کے دائرہ سے
کوئی نقطہ باہر نہین، انسان کی پیشانی کو ہر چوکھٹ سے اٹھکر صرف اسی کے آستانہ پر جھکنا چاہیئے، ہماری
تمام عقیدت، ہماری تمام محبت، ہمارا تمام خوف، ہماری تمام امیدین، ہماری تمام دعائین، ہماری تمام التجائین
ہماری تمام عاجزیان صرف اسی ایک درگاہ پر نثار ہون، اور اسی کے رحم و کرم کے سہارے ہماری زندگی کا ہر لمحہ بسر ہو،
وہ بزرگ و برتر ہستی کیا ہے؟ اور اسکی نسبت ہمارا کیا تخیل ہو؟ تعلیم محمدی نے اسکا بھی جواب دیا ہے،

خدا کا جامع اور بالغ تخیل

قرآن پاک کی آیات، جاہلیت کے اشعار، اسلام سے پہلے عربون کے واقعات بلکہ
عرب کے آثار قدیمہ کے کتبات سے یہ واضح طور پر ثابت ہے: کہ عربون کے ذہن میں ایک بالاتر ہستی کا تخیل
ضرور موجود تھا، جس کا نام اُن کے ہان اللہ تھا، مگر اللہ کیا ہے؟ کیسا ہے؟ اسکے صفات کیا ہیں؟ اسکی تعریف

کیا کیا باتیں منسوب کیجا سکتی ہیں کن کن باتوں سے وہ پاک ہے؟ اس کا تعلق اپنے بندوں کے ساتھ کیسا ہے؟
ہم کو اُس کے آگے کیسے جھکنا چاہیے؟ اس سے کیا مانگنا چاہیئے؟ اور کیونکر مانگنا چاہیئے؟ اس کے حضور
مین دعا کیونکر کرنی چاہیئے؟ ہم اس سے کیوں ڈرین اور کیونکر ڈرین؟ اور اس سے ڈرنے کی کیا حقیقت
ہے؟ اس سے محبت کیجا سکتی ہے یا نہیں؟ اگر کیجا سکتی ہے تو کیونکر؟ اور اس سے محبت کی حقیقت
کیا ہے؟ اُس کی قدرت کہاں تک ہے؟ اس کے علم کی کیا حیثیت ہے؟ کیا وہ ہم سے دور ہے یا بالکل قریب ہے؟
اُس کے تقدس بڑائی اور عظمت کی کوئی حد ہے؟ اس پر ہم توکل اور بھروسہ کیونکر کرین؟ کیا وہ انسانون
کی کسی صنف سے کلام بھی کرتا ہے؟ کیا اُس کے کچھ احکام بھی ہین؟ اور وہ احکام واجب الاطاعۃ
بھی ہیں، وہ کن باتون سے خوش اور کن سے ناخوش ہوتا ہے؟ کیا وہ ہمارے دلوں کے چھپے ہوئے رازون سے
بھی آگاہ ہے؟ کیا اس کی اجازت کے بغیر زمین کا ایک ذرہ بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرسکتا؟ اس کی
مشیئت اور اس کا ارادہ کیونکر آسمان سے زمین تک ہر چیز کو محیط ہے؟ کیا اس کے بنائے ہوئے
قاعدے اور قانون بھی ہیں۔؟ کیا وہ انسانون کی تعلیم اور اصلاح کیلئے پیغمبرون کو بھی مبعوث کرتا ہے؟
کیا ہم اسکی بارگاہ مین اپنے اعمال کے جواب دِہ بھی ہیں؟ ہم سے وہ کیوں اور کیونکر ہمارے اعمال کا
مواخذہ کریگا؟ یہ وہ باتیں ہیں جن سے عرب جاہلیت کا دل و دماغ بالکل عاری اور خالی تھا، اوران
چیزون کے متعلق اُن کے ذہن مین کوئی تخیل نہ تھا، جاہلیت کا ایک ایک ذرہ پڑھ جاؤ، ان کے مذاہب
واعتقادات کا ایک ایک حرف تلاش کرلو، اس سے زیادہ کچھ نہ پاؤ گے کہ اللہ ایک طاقتور اعلیٰ
ہستی ہے جس نے سب کو پیدا کیا ہے اور مصیبتون اور بلاؤن مین اس کو پکارنا چاہیئے،
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ربانی تعلیمات سے ان کو اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت سے

آشنا کیا، اس کی وحدت اور بے مثالی سے باخبر کیا، اسکی مشیت وارادہ اور قدرت و وسعت سے آگاہ کیا، ایک ایسی ہستی کے اعتقاد کی اُن کو تعلیم دی جس کی قدرت بے انتہا جس کی وسعت غیر محدود ہے، جس کی مشیت کائنات کے ہر ذرہ مین نافذ ہے جس کے علم کے احاطہ مین اندھیرے اور اُجالے کی ہر چیز داخل ہے دلون کے اسرار، زبانون کے الفاظ، اور ہاتھ پاؤن کے اعمال سب ہر لحظہ اور ہر لمحہ اُس کے روبرو ہین آسکے روبرو ہین، اس کے سامنے انسان اپنے ہر عمل کا جوابدہ اور ذمہ دار ہے اس کے مواخذہ کا خوف اس کی رحمت کی امید ہے، وہ محبوبِ ازل ہے اسکی محبت کا نشہ ہمارے دلون کی ہشیاری ہے اس کے فضل وکرم اور لطف ومحبت کی نیرنگیان اوپر سے نیچے تک پھیلی ہین، اس کی قوت ہر قوت پر غالب، اس کا ارادہ ہر ارادہ مین نافذ اور اس کا حکم ہر حکم سے بالاتر ہے، اس کی عبادت ہر مخلوق پر فرض، اور اس کی اطاعت ہر مکلف پر واجب ہے، وہ ہر عیب سے پاک ومنزہ اور ہر وصف کا مستحق اور اس سے متصف ہے، انسانون کو اپنی یاد دلانے اور اُن کے تزکیہ واصلاح کے لئے رسولوں اور پیغمبرون کو بھیجتا رہا، اور ان سے ہم کلام ہوتا رہا، اس کے کچھ احکام اور بندھے ہوئے قوانین ہیں، جن کی اطاعت نیکی اور نافرمانی گناہ ہے، وہ اندھیرے کی روشنی، بھوکون کی سیری، مایوسون کی امید، زخمیون کا مرہم، بیقرارون کی تسلی اور بیکسون کا سہارا ہے، وہ ہم سے ہماری گردن کی رگ سے بھی قریب تر ہے، ہم اس کو جب پکارین وہ سنتا ہے، وہ نیکیون کو پسند اور گناہون سے نفرت کرتا ہے، وہ جب چاہے آسمان وزمین کو فنا کردے اور جب چاہے، اُن کو پھر جلا دے، اس کی محبت دنیا کا حاصل، اسکی عبادت ہماری زندگی کا مقصود اور اسکی یاد ہمارے دلون کی راحت ہے۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (رعد ۴)   ہان خدا کی یاد سے دلون کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ وہ لوگ جن کو بھولے سے بھی خدا کا نام یاد نہ آتا تھا، وہ اُس کے سوا سب کچھ بھول گئے؛ اور اس کی راہ مین ہر چیز قربان کرنے کو تیار ہو گئے، وہ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے، ہر حال میں اس کی یاد مین سرمست و سرشار رہتے تھے،

یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ (آل عمران - ۲۰)

وہ خدا کو کھڑے، بیٹھے، اور لیٹے، یاد کرتے ہین،

اس سرمستی و سرشاری مین بھی انھون نے جنگلون مین راہبانہ زندگی بسر نہین کی دوسرون کی بھیک کو اپنا سہارا نہین بنایا، دنیا کی کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لیے بزدلانہ گوشہ نشینی کو تقدس کا نام دیکر اختیار نہین کیا، بلکہ فرائض کی ادائگی اور اس راہ مین جدّ وجہد اور سعی و کوشش کو اپنا مذہب سمجھا، اور خدا کا حکم جان کر اس کو پوری مستعدی کے ساتھ بجالائے اور ان تمام ہنگامون کے ساتھ دل کا معاملہ دلدارازل کے ساتھ ہمیشہ قائم رکھا، خدا نے اُن کی مدح کی کہ

رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ (نور - ۴)

وہ لوگ جن کو تجارت اور خرید و فروخت خدا کی یاد سے غافل نہین کرتی،

ان کی محبتِ الٰہی کا درجہ دنیا کی ہر محبت پر غالب آگیا خدا نے اُن کی توصیف کی کہ

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ (بقرہ ۲۰)

ایمان والے سب سے زیادہ خدا سے محبت کرتے ہین

اُن کا توکل، اُن کا صبر، اُن کا استقلال، انکی استقامت، اُن کی بہادری اُن کی بے خوفی، اُن کی صداقت اُن کی راست بازی، اُن کی اطاعت، غرض اُن کی ہر چیز اُن کے اسی جذبۂ ایمانی کا پرتو تھی، اور ہر وقت اُن کے پیشِ نظر یہ تعلیم رہتی تھی کہ

وَمَن یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ (طلاق) — جو خدا پر بھروسہ کرتا ہے تو خدا اس کو بس کرتا ہے،

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ (زمر-۴) — کیا خدا اپنے بندہ کو کافی نہین،

وَتَخْشَی النَّاسَ وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰہُ (احزاب-۵) — اور تو لوگوں سے ڈرتا ہے، حالانکہ سب سے زیادہ خدا سے ڈرنا چاہیے،

اُن میں یہ تمام روحانی و اخلاقی جوہر اسی ایمان باللہ کے بدولت پیدا ہوئے،

اسماء و صفات دنیا کے آغاز مین خدا نے کہا تھا، کہ ہم نے آدم کو سب نام سکھائے" دنیا کہان سے کہان نکل گئی، اور علم کی وسعت کہاں سے کہان پہنچی، مگر غور کیجئے، تو نامون کے ہیر پھیر سے ہم ابتک آگے نہیں بڑھے یہی ہماری حقیقت رسی ہے اور یہی ہمارا فلسفہ ہے، ہم اپنے مفروضہ اصول منطق کی بنا پر ذاتیات اور حقائق کے ذریعہ سے اشیاء کی تعریف کے مدعی بن گئے ہیں لیکن ہزاروں صدیان گذرنے پر بھی ذاتی اور حقیقی تعریف (حد منطقی) کی ایک مثال بھی پیش نہ کر سکے، جو کچھ کر سکے وہ یہ کہ صفات و عوارض اور خواص کے مختلف رنگون سے نئی نئی طفلانہ شکلیں بناتے اور بگاڑتے ہیں، جب مادیت کا یہ عالم ہے، تو دور ارا اور راء ہستی میں ہماری بشری طاقت اس سے زیادہ کا تحمل کیونکر کر سکتی، تجلی گاہ طور اسی رمز کی آتشیں تصویر ہے،

ہم خدا کو بھی اُس کے نامون، اُس کے کامون اور اُس کی صفتوں ہی سے جان سکتے ہین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے جاہلون کو اسی نصاب انسانی کے مطابق تعلیم دی، عرب کا جاہل اللہ نام ایک اعلیٰ ہستی سے واقف تھا، لیکن اس کے نامون اور کامون کے تخیل سے بڑی حد تک ناآشنا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات سے بھی وہ قطعاً بیگانہ تھا، دیوانِ عرب یعنی اُن کی

شاعری کے دفتر میں کہیں کہیں اللہ کا نام آتا ہے اگر کہیں اس کی صفت کا ذکر نہیں آتا قرآن پاک میں اُن کے خیالات کا پورا عکس اُتارا گیا ہے لیکن کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات سے بھی آگاہ تھے، بعض عیسائی عربوں میں، اللہ کے ساتھ الرحمان کا لفظ بھی مستعمل تھا، جس کے معنی "رحم کرنے والے" کے ہیں، اصحاب الفیل کے عیسائی رئیس ابرہہ کے نام سے سد عرم (یمن) پر جو کتبہ لگا ہے، اور جس کو جرمن فاضل گلازر نے شائع کیا ہے، اس میں بھی دو جگہ رحمان کا لفظ آیا ہے، عرب عیسائی شعراء کے کلام میں بھی یہ لفظ ملتا ہے، عیسائیوں میں اس کے استعمال کا نتیجہ یہ تھا کہ عرب مشرکین کو اس لفظ سے چڑھ ہو گئی تھی، اس لئے جب اسلام نے اس لفظ کو اختیار کیا تو مشرکین نے اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا، صلح حدیبیہ کے موقع پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کے کاغذ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھوائی تو قریش کے نمائندے نے کہا کہ "قسم ہے اللہ کی مجھے نہیں معلوم[1] کہ رحمان کیا ہے؟"

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سننے اور قرآن مجید میں بار بار خدا کیلئے رحمان کا لفظ مستعمل ہونے کی وجہ سے مشرکوں کو برہمی ہوتی تھی، اور وہ کہتے تھے، کہ ہم کبھی رحمان کے آگے سرنگوں نہیں ہو سکتے، قرآن نے اُن کی اسی حالت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے؛

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ	اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ رحمان کو سجدہ
قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا	کرو تو کہتے ہیں کہ رحمان کیا ہے کیا تم جسکو کہو اسکو
وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ، (فرقان ۵)	ہم سجدہ کریں، رحمان کا نام انکی نفرت کو اور بڑھا دیتا ہے۔

مشرکین کو یہ برا لگتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف تو اُن کے بتوں اور دیوتاؤں کی مذمت

[1] صحیح بخاری جلد اول شروط ص ۳۷۹

کرتے ہیں اور دوسری طرف عیسائیوں کے رحمان کی مدح وستایش کرتے ہیں،

اَهٰذَا الَّذِیْ یَذْکُرُ اٰلِهَتَکُمْ وَهُمْ	(مشرک آپ کو دیکھتے تو مذاق سے کہتے کہ) یہی وہ
بِذِکْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ کٰفِرُوْنَ ،	ہے جو تمہارے دیوتاؤں کو بُرا کہتا ہے، اور یہی
(انبیاء - ۳)	مشرک رحمان کے ذکر سے انکار کرتے ہیں،

تعلیم محمدیؐ نے عرب کے ناآشنایانِ حقیقت کو بالآخر آگاہ کیا کہ خدا کے اسماء وصفات کی کوئی حد نہیں، اس کو سب ہی اچھے ناموں سے پکارا جا سکتا ہے،

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ	کہدو (اے پیغمبر کہ) خدا کو اللہ کہہ کر پکارو یا
اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی	رحمان کہہ کر جس نام سے بھی پکارو، سب اچھے
(اسرائیل - ۱۲)	نام اسی کے ہیں،

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا مسئلہ اسلام کے ان اہم مذہبی اصلاحات میں سے ہے جن سے نہ صرف عرب کے جاہل ناآشنا تھے، بلکہ دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں کے پیرو بھی اُن کے متعلق غلطیوں میں مبتلا تھے، یہودیوں کے اسفار اور صحیفوں میں خدائے برحق کا اصلی نام "یہوا" تھا مگر کبھی عام یہودیوں کو اس مقدس نام کے زبان پر لانے کی اجازت نہ تھی، دوسرا عام نام "ایلیم" ہے جو ہر موقع پر استعمال ہوتا ہے، ان دو کے علاوہ خدا کے بیسیوں نام اور اسماء جو درحقیقت اُس کے اوصافِ ذاتی اور اعمالِ ربانی کے ترجمان ہیں، توراۃ کا دفتر اُن کے ذکر سے بالکل خالی ہے، صفاتِ الٰہی میں سے جو صفت یہودی صحیفوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے، وہ "فوجوں والا خدا" یعنی "ربّ الافواج" ہے، جو خدا کی صفاتِ جلالی کا مظہر ہے،

عیسائیون کی انجیل اور مذہبی کتابون مین "باپ" کا لفظ خدا کے لیے استعمال ہوا ہے، اس لفظ کی حقیقت اور خدا پر اس کے اطلاق سے مقصود کیا ہے؟ گوشت و پوست اور مادیت سے بھرے ہوئے لفظ کا خدا پر مجازاً اطلاق بھی کہانتک جائز ہے؟ اور اس سے اس مذہب مین کہانتک غلطیان پھیلیں، ان باتون کو چھوڑکر بھی دیکھیے تو خدا کے صرف جمالی صفات کی ناقص اور مادی تعبیر ہے، عیسائیت مین فلسفہ کی آمیزش نے تثلیث کے اختراعی عقیدہ کو اسی مسئلۂ صفات کے پردہ مین چھپا لیا اور یہ تاویل کی گئی، کہ تثلیث کے اقانیم ثلثہ، باپ (خدا) بیٹا (حضرت عیسیٰؑ) اور روح القدس حیاۃ، خلق اور عظیم تین صفتون سے عبارت ہین، باپ حیات، بیٹا خلق، اور روح القدس علم ہے، اور یہ تینون ایک ہیں، اور تینون وجود مین الگ الگ ہیں، اس تشریح سے صفاتِ الٰہی کے تجسم کے مسئلہ نے جنم لیا، اور ایک خدا کئی خداؤن کا مجموعہ بن گیا،

ہندوؤن مین اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کی نیرنگی نظر آتی ہے لیکن ہر صفت نے اُن کے ہان ایک مستقل وجود حاصل کرلیا ہے، اور خود خدا ہر قسم کی صفات سے خالی، اور مجرد رہ گیا ہے، اسی لیے ہندوستان کے تمام مذاہب اسی تجسّمِ صفات کے جلوہ گاہ ہوکر رہ گئے ہین، برہما، مہیش، وشنو تین صفات خالق، ممیت (مارنے والا) اور قیوم کے مجسّمے ہیں، غلط تعبیر نے وحدت کی جگہ یہان بھی تثلیث پیدا کردی ہے، شنکراچاریہ نے خدا کے صرف تین اصلی صفات تسلیم کئے، حیات، علم، اور سرور یا آنند، جین مذہب اور بعض ہندو فرقون مین ایک خالقیت کی صفت کے تجسّم نے اعضائے تناسل کی پرستش کی گمراہی پیدا کی، عام ہندوؤن مین ۳۳ کروڑ عجیب الخلقت دیوتاؤن کی عظیم الشان بھیڑ بھی صفات و اسمائے الٰہی کی تجسیم اور مستقل وجود کے غلط فلسفہ نے پیدا کی اور اُسی نے بُت پرستیون

کی نت نئی صورتین نمایان کین، مجوسیون مین یزدان اور اہرمن کی ثنویت اور دوئی بھی، خدا کی دو صفتون ہادی اور مضل کو دو مستقل ہستیون مین منقسم کر دینے کا نتیجہ ہے، اس تفصیل سے اندازہ ہوا ہوگا کہ اس مسئلہ کی غلط تعبیر نے دنیا مین کتنی گمراہیان پیدا کی ہین،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانون کے ان تمام فاسد تخیلات کو باطل ٹھہرایا، ان کے غلط عقیدون کی تصحیح کی، اور ربانی ہدایت کے نور سے سراج منیر بن کر جس طرح حقیقت کو روشن کیا، وہ نبوتِ محمدیؐ کے عظیم الشان کارنامون میں ہے،

آپ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ گنتی اور شمار کی حد سے باہر ہیں، اور اس کی باتون کی کوئی انتہا نہیں، آپ نے یہ دعا سکھائی: "اے خداوندا تیرے ہر اُس نام کے وسیلہ سے جو تو نے اپنا رکھا، یا اپنی کتاب میں اتارا، یا کسی مخلوق کو سکھایا، یا اپنے لئے اپنے علم غیب میں اسکو چھپا رکھا، میں تجھ سے مانگتا ہون" حضرت عائشہؓ کو یہ الہامی دعا تعلیم ہوئی خداوندا! میں تیرے سب اچھے نامون کے وسیلہ سے جن میں سے کچھ کو ہم نے جانا، اور جن کو نہیں جانا تجھ سے درخواست[1] کرتا ہون" قرآن پاک کے ذریعہ بتایا گیا،

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ۔ (الکہف ۱۲)

کہدے (اے پیغمبر) کہ اگر سمندر میرے پروردگار کی باتون کے لکھنے کیلئے سیاہی بنجائے تو سمندر ختم ہو جائے لیکن میرے پروردگار کی باتین ختم نہ ہونگی اگرچہ ہم ایسا ایک [illegible]

دوسری جگہ کہا گیا،

---

[1] یہ تینون دعائیں امام بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات مین نقل کی ہیں اور پہلی روایت مسند ابن حنبل مین بھی (مسند عبد اللہ بن مسعودؓ) ہے،

وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ	اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں وہ قلم بنجائیں
اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ	اور سمندر اور اس کے بعد سات سمندرون
سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ	کا پانی سیاہی ہوجائے تب بھی اللہ کی
اللّٰهِ ط (لقمان -۳)	باتیں ختم نہ ہوں گی،

الغرض تمام اچھے اور کمالی نام اسی کے لئے ہین، اور اسی کو زیبا ہین،

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ط لَهُ الْاَسْمَآءُ	نہیں ہے کوئی معبود، لیکن وہی اللہ اسی
الْحُسْنٰى ط (طہ -۱)	کے لئے ہیں سب اچھے نام،

بڑائی کا ہر نام اور خوبی کا ہر وصف اسی ذاتِ بے ہمتا کے لئے ہے، خواہ اس کو خدا کہو، یا اللہ کہو، لغت اور زبان کا کوئی فرق اس میں خلل انداز نہین،

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ	کہدے (اے پیغمبر) اس کو اللہ کہہ کر پکارو،
اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى	یا رحمان کہہ کر، جو چاہو کہکر پکارو، سب
(اسرائیل -۱۲)	اچھے نام اُسی کے ہیں.

لیکن مشرکون کی طرح اس کو ایسے نامون سے نہ پکارو، جو اُس کے کمال اور بڑائی کے منافی ہین، اور بتون اور دیوتاؤن کے ناموں سے بھی اُس کو یاد نہ کرو،

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ	اور اللہ ہی کے لئے ہیں، سب اچھے نام اُسکو
بِهَا ص وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ	ان ناموں سے پکارو، اور ان لوگوں سے علیحدہ
اَسْمَآئِهٖ ط (اعراف -۲۲)	رہو جو اُس کے ناموں میں کجی کرتے ہیں،

تعلیمِ محمدیؐ کا صحیفۂ وحی اللہ تعالیٰ کے تمام اوصافِ حمیدہ اور اسمائے حُسنیٰ سے بھرا ہوا ہے بلکہ اس کا صفحہ صفحہ خدا کے اسماء و صفات کی جلوہ گریوں سے معمور ہے قرآن پاک کا کوئی ایسا رکوع ہوگا جس کا خاتمہ خدا کی توصیف اور حمد پر نہ ہو، اور یہ تمام اوصاف اور نام اُس عشق و محبت کو نمایاں کرتے ہیں جو اس محبوبِ ازل اور نورِ عالم کیساتھ قرآن کے ہر پیرو کے دل میں ہونا چاہیے

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ	اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اُس کے نور
مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ ؕ	کی مثال یہ ہے کہ ایک طاق ہو جس میں چراغ
اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ ؕ اَلزُّجَاجَۃُ	ہو چراغ ایک شیشہ کے اندر ہو شیشہ اتنا صاف ہو کہ
کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ	گویا ایک چمکتا ستارہ ہے وہ چراغ زیتون کے مبارک
شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ	درخت کے تیل سے جلایا گیا ہو، نہ وہ پورب نہ پچھم ہے،
وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ یَّکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ	اس کا تیل اتنا صاف ہے کہ آگ کے چھوے بغیر
لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ؕ	وہ آپ سے آپ جلنے کو ہو، روشنی پر روشنی، خدا اپنی
یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ	روشنی تک جس کو چاہے پہنچا دے اور خدا لوگوں
یَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ	(کے سمجھانے) کے لیے یہ مثالیں بیان کرتا ہے،
وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ؕ (نور - ۵)	اور اللہ کو ہر چیز کا علم ہے۔
اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ	اللہ، نہیں ہے اُس کے سوا کوئی اور معبود،
لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَہٗ	وہ ہمیشہ زندہ، تمام دنیا کو سنبھالے ہے، اُس کو
مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ	اونگھ اور نیند نہیں آتی آسمانوں میں اور زمین میں جو

ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ
يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَ
وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا
بِمَا شَاءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ
وَالْأَرْضَ ج وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا
وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ،

(بقرہ ۔ ۳۴)

هُوَ اللّٰهُ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ج
عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ج هُوَ الرَّحْمٰنُ
الرَّحِيمُ، هُوَ اللّٰهُ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا
هُوَ ج اَلْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلٰمُ
الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ
سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ هُوَ
اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ
الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي
السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ
الْحَكِيمُ، (حشر ۔ ۳)

کچھ ہے اسی کا ہے کون ہو جو اس کی مرضی کے
بغیر اس کے سامنے سفارش کرنے کو کھڑا ہو انسانوں
کے سامنے اور پیچھے جو کچھ ہو اس کو وہ جانتا ہو اور
اور وہ لوگ اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے
لیکن جتنے کا وہ چاہے اس کا تخت آسمانوں
اور زمین کو سمائے ہوئے ہو اور ان دونوں (آسمان
وزمین) کی نگہبانی اس کو تھکاتی نہیں، اور وہی
وہی اللہ ہو جس کے سوا کوئی اللہ نہیں چھپے اور
کھلے کا علم رکھنے والا وہی رحم کرنے والا، اور مہربانی
والا ہے، وہی اللہ ہو جس کے سوا کوئی اللہ نہیں
سب کا بادشاہ، پاک، پوری سلامتی، امن والا، ہر
شے پر گواہ غالب، سب پر قابو والا، بڑائی والا،
اس چیز سے پاک ہو جس کو یہ مشرک خدا کا
شریک بتاتے ہیں، وہی اللہ پیدا کرنے والا بنانے
والا، ہر چیز کی صورت کھینچنے والا اسی کے لیے سب
اچھے نام ہیں، جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے
سب اس کی پاکی بیان کرتے ہیں، وہی سب پر

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ، لَهٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج یُحْیٖ وَیُمِیْتُ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ، هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ، هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ط یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا ط وَهُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ ط وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ، لَهٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ، یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَیُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ وَ هُوَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ،

(حدید ۔ ۱)

آسمانوں مین اور زمین مین جو کچھ ہی وہ سب خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں، اور وہی غالب اور دانا ہے، آسمانوں کی اور زمین کی حکومت اسی کی ہی، وہی جلاتا ہے، اور مارتا ہے، اور وہ ہر بات پر قادر ہی، وہی پہلا اور وہی پچھلا ہی، وہی کھلا ہے، اور وہی چھپا ہے، اور ہر بات کو جانتا ہے، وہی ہی جس نے آسمانوں کو اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر تخت پر برابر ہوا، وہ جانتا ہی جو زمین مین گھستا ہے، اور جو اس سے نکلتا ہے، اور جو آسمان سے اترتا ہی، اور جو اس میں چڑھتا ہی، اور جہاں کہیں تم ہو وہ تمھارے ساتھ ہی، اور اللہ تمھارے کاموں کو دیکھتا ہی، آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہی، اور اللہ ہی تمام چیزوں کا مرجع ہی، وہ رات کو دن میں داخل کر دیتا ہے، اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، اور وہ سینوں کے سب

مضمون: صفات باری تعالیٰ

خدا کے متعلق اہلِ عرب کا جو پست تخیل تھا، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ملا کر ان کے

سامنے جو بلند تخیل پیش کیا اس کا انداز حسب ذیل واقعہ سے ہو سکتا ہے آپ نے جب توحید کا آوازہ بلند کیا، تو مشرکین جو اپنے دیوتاؤں کی آل و اولاد اور بیویوں اور گو پیوں کی حمد کے ترانے گاتے تھے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایش کی کہ ذرا اپنے خدا کا نسب تو ہمارے سامنے بیان کرو گویا وہ اپنے دیوتاؤں سے اسلام کے خدا کا مقابلہ کرکے تبانا چاہتے تھے، کہ اس حیثیت سے اسلام کا خدا ہمارے دیوتاؤں کی ہمسری نہیں کرسکتا، اس کے جواب میں وحی محمدی نے اپنے خدا کی حقیقت قرآن پاک، کی اس سب سے مختصر سورہ میں پیش کی ہے[1]

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ، اَللّٰهُ الصَّمَدُ ، لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ، وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ،

(اخلاص)

کہدے (اے پیغمبر) وہ اللہ ایک ہے، وہ تنہا ہے بزرگ اور بے نیاز، اور عالم کا مرجع اور جائے پناہ ہے نہ اس کے کوئی اولاد ہے، اور نہ اس کے ماں باپ ہیں، جنھوں نے اس کو جنا ہو، اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے

یہ روایت حضرت ابی بن کعبؓ سے مروی ہے، جو صحابہ میں سب سے زیادہ قرآن کے ماہر سمجھے جاتے تھے، وہ اسی کے بعد اس سورہ کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ "صمد" وہ ہے جو نہ جنتا ہو اور نہ کسی نے اس کو جنا ہو، کیونکہ جو جنا جاتا ہے، وہ مرتا بھی ہے، اور جو مرتا ہے وہ اپنا وارث و جانشین بھی چھوڑ جاتا ہے، اور خدا نہ مرتا ہے، نہ اُس کا کوئی جانشین ہے، اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے یعنی کوئی اس کے برابر نہیں، اور نہ کوئی اُس کے مثل ہے، غور کرو کہ محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے پہلے اہل عرب میں خدا کا کتنا پست و ذلیل تخیل تھا جس کا اندازہ تم اُن کے سوال ہی کر سکتے ہو اور آپ کی تعلیم کے بعد

[1] مستدرک حاکم تفسیر اخلاص (صحیح) جامع ترمذی تفسیر سورۂ مذکور و کتاب الاسماء بیہقی صفحہ ۲۳ (الہ آباد)

وہ تخیل کتنا پاک، اعلیٰ اور بلند ہوگیا جس کا اندازہ حضرت ابیؓ کی تفسیر سے ہوسکتا ہے جو اسی عرب کے ایک قبیلہ کے ایک ممتاز فرد تھے لیکن اُن کا دل اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض تعلیم سے منور ہوچکا تھا۔
حضرت ابوہریرۃؓ آپ سے سنکر کہتے ہیں کہ خدا فرماتا ہے کہ آدم کے بیٹے نے مجھے جھٹلایا، اور آدم کے بیٹے نے مجھکو گالی دی، اس کا جھٹلانا یہ ہے کہ اُس نے کہا کہ خدا دوبارہ پیدا نہیں کریگا، حالانکہ پہلی بار کے پیدا کرنے سے دوسری بار کا پیدا کرنا بہت آسان ہے اور اس کا گالی دینا یہ ہے کہ اُس نے کہا کہ خدا کی اولاد ہے حالانکہ مین وہ ایک اور صمد ہوں جس نے نہ کسی دوسرے کو جنا ہے اور نہ اُس کو کسی نے جنا ہے، اور نہ اُس کا کوئی ہمسر ہے[1]
حضرت ابوہریرۃؓ یمنی عرب ہیں یعنی اس عرب کے ایک فرد ہیں، جو تعلیم محمدیؐ سے پہلے ان حقائق سے بے بہرہ تھا، اور اب وہ تنزیہ و تقدیس کے یہ موتی اپنے منھ سے اگل رہے ہیں،

اس مختصر سورہ میں سب سے چھوٹا لفظ "صمد" ہے لیکن درحقیقت قرآن کی بلاغت نے اس ایک لفظ مین صفات الٰہی کا بے پایان دفتر چھپا رکھا ہے "صمد" کے معنی لغت مین اونچی پتھریلی زمین یا چٹان کے ہین، جو کسی ایسے آدمی مین ہو، جہان جب سیلاب آتا ہو، تو اُس پر نہ چڑھتا ہو اور لوگ اس وقت دوڑ دوڑ کر اسی پر چڑھکر اپنی جانین بچائین، پھر صمد کے اس لغوی معنی سے اس سردار کے معنی پیدا ہوئے جو بزرگی اور شرافت مین انتہائی معراج کمال پر ہو، اس سردار کو بھی کہنے لگے جس کی موجودگی کے بغیر مجلس مین کوئی فیصلہ نہ ہوسکتا ہو، اور اس سردار کو بھی کہتے ہین، جس کے اوپر کوئی سردار نہ ہو، اور اس جائے پناہ کے معنی مین بھی مستعمل ہوا جو سب کو مصیبت کے وقت اپنے دامن مین پناہ دے سکے اور اس مرجع و مرکز کے معنی مین بھی آیا جس کی طرف ہر شخص دوڑ دوڑ کر جاتا ہے صمد ٹھوس کو بھی کہتے ہیں جس کے اندر خول نہ ہو، اسی سے اس کو بھی کہتے ہین جو کھاتا پیتا نہ ہو اور جس کے

[1] صحیح بخاری تفسیر سورہ اخلاص

آل واولاد نہ ہو اُس کو بھی کہتے ہیں جس سے کوئی بے نیاز نہ ہو، اُس بہادر کو بھی کہتے ہیں جس کو لڑائی میں بھوک اور پیاس نہ لگتی ہو، صَمَدۃ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کے حمل نہ رہا ہو، حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ صمد وہ سردار ہے، جو اپنی بزرگی اور سرداری میں درجۂ کمال پر ہو، وہ شریف جس کی شرافت کامل ہو، وہ بڑا جس کی بڑائی میں کوئی نقص نہ ہو، وہ بردبار جس کی بردباری بدرجۂ اتم ہو، وہ بے پروا و بے نیاز جس کی بے پروائی و بے نیازی کی کوئی حد نہ ہو، وہ زبردست جس کے جبروت کی انتہا نہ ہو، وہ علم والا جس کا علم بدرجۂ اتم ہو، وہ حکیم جس کی دانائی بمرتبۂ کمال ہو، یعنی وہ جو بڑائی اور بزرگی کی ہر صنف میں کامل ہو[1]

ان معنوں کے علاوہ صحابہ اور تابعین نے اس کی تفسیر میں حسب ذیل معانی بھی لکھے ہیں :۔

ابن عباسؓ	وہ جس کی طرف مصیبت کے وقت لوگ رجوع کریں،
حسن بصری	وہ حیّ و قیّوم جس کو زوال نہ ہو، اور جو باقی ہو،
ربیع بن انس	جس کے نہ اولاد ہو، نہ ماں باپ،
عبداللہ بن مسعودؓ	جس کے اندر معدہ وغیرہ، جسمانی اعضا نہ ہوں،
بریدہؓ	جس میں جوف نہ ہو،
عکرمہ و شعبی	جو کھاتا نہ ہو،
عکرمہؓ	جس میں سے کوئی دوسری چیز نہ نکلے،
قتادہؓ	باقی غیر فانی،

[1] کتاب الاسماء والصفات امام بیہقی بسند صفحہ ۴۳۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام[1] معانی اس ایک لفظ کے اندر پوشیدہ ہیں، اور یہ سب صرف ایک حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں، کیونکہ اوپر یہ معلوم ہوچکا ہے کہ اس لفظ کے معنی "چٹان" کے ہیں جو لڑائی اور مصیبتوں کے وقت جائے پناہ کا کام دے، اسرائیلی الٰہیات میں بھی یہ لفظ یہی اہمیت رکھتا ہے، اور بنی اسرائیل کے صحیفوں میں جائے پناہ کے لئے چٹان کا لفظ آیا ہے (۳۲-۳۰-۳۱) میں ہے

"اگر اُن کی چٹان اُن کو بیچ نہ ڈالتی، اور خداوند تم کو اسیر نہ کرواتا، کیونکہ ان کی چٹان ایسی نہیں جیسی ہماری چٹان"

یہ "چٹان" اس موقع پر حقیقت میں خدا کی مدد و نصرت سے کنایہ ہے سموآل کے پہلے صحیفہ میں یہ کنایہ تصریح سے بدل جاتا ہے، خداوند کے مانند کوئی قدوس نہیں، تیرے سوا کوئی نہیں، کوئی چٹان ہمارے خدا کے مانند نہیں" (۲-۲)

اس سورہ میں خدا کی صفت میں دو لفظ ہیں، اَحَدٌ (ایک) اور صَمَدٌ (جائے پناہ) اور یہ دونوں خدا کے دو متضاد کمالی اوصاف کو حاوی ہیں، اس کی یکتائی کا نتیجہ تو یہ ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں، نہ اس کو کسی کی حاجت، نہ اس کو کسی سے غرض، وہ یکہ و تنہا، اکیلا، بے ہمتا، بے نیاز، بے پروا، سب سے مستغنی اور سب سے الگ ہے، لیکن اسی کمال یکتائی کے ساتھ وہ سب کے ساتھ، سب کا دستگیر، سب کی جائے پناہ، سب کا محتاج الیہ، سب کا مرکز، سب کا مرجع، سب کا ماویٰ، سب کا ملجا، یعنی سب کی چٹان ہے، جو مصیبتوں میں سہارا، بلاؤں میں تسلی، اور اضطرابوں میں تشفی ہے،

فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ ۔ ہر جگہ سے بھاگ کر اللہ کے ہاں پناہ لو،

یہ سورہ پاک توحید اسلامی کے ہر شعبہ کو حاوی ہے اور اسی لئے اس کو ثلث القرآن (تہائی قرآن

[1] ان معانی کے لئے دیکھو کتاب الاسماء بیہقی صفحہ ۳۳ و مفردات القرآن راغب اصفہانی، ابن جریر طبری، ابن کثیر اور تفسیر سورۃ الاخلاص لابن تیمیہ،

کا درجہ دیا گیا ہے، ایک صحابی تھے، جو نماز کی ہر دو رکعت میں قرات کے آخر میں اس سورہ کو پڑھا کرتے تھے لوگوں نے یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا، آپنے اُن سے اسکی وجہ دریافت کرائی انھوں نے کہا "اس میں میرے رب کی صفتیں بیان ہوئی ہیں، جو مجھ کو بہت محبوب ہیں" آپنے فرمایا "بشارت ہو کہ خدا بھی تم سے محبت کرتا ہے" ایک اور انصاری صحابی تھے، جو قبا کی مسجد میں امامت کرتے تھے، اُن کا یہ حال تھا کہ ہر رکعت میں فاتحہ کے بعد پہلے اس سورہ کو پڑھ لیتے تب کوئی دوسری سورہ پڑھتے تھے اُن کے مقتدی صحابہ نے اس پر اعتراض کیا تو انھوں نے کہا کہ مجھے امامت چھوڑنی منظور ہے مگر اپنی روش بدلنی منظور نہیں لوگوں نے اس واقعہ کا تذکرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، آپنے اُن سے اُس کی وجہ دریافت کی تو گذارش کی کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے یہ سورہ بہت محبوب ہے، ارشاد ہوا کہ یہ محبت تم کو جنت میں لیجائیگی، قتادہ بن نعمانؓ ایک صحابی تھے جو رات رات بھر اسی ایک سورہ کو دہراتے اور لطف حاصل کرتے رہتے تھے، لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا کہ یہ سورہ قرآن کا تہائی حصہ ہے۔

اُس گمراہی اور تاریکی کا اندازہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب پر چھائی ہوئی تھی، اس روحانی لطف اور نورانی فیض سے کرو، جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کے حصہ میں آیا،

قرآن مجید اور احادیث میں اللہ تعالیٰ کے سو سے زیادہ نام اور اوصاف آئے ہیں، صحیح حدیثوں میں ہے کہ آپنے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں، جو اُن کو محفوظ رکھے یا نگاہ

---

۱ صحیح بخاری کتاب التوحید ۲ ایضاً کتاب الصلوٰۃ ۳ مسند احمد بسند ابی سعید الخدری۔

رکھے، وہ جنت میں داخل ہوگا[1] خدا طاق ہی، وہ طاق عدد کو پسند کرتا ہی" آخری فقرہ اس علت کو ظاہر کرتا ہے کہ ۹۹ نام کیوں رکھے گئے، پورے سَو کیوں نہ مقرر کئے گئے، اس لئے کہ اگر پورے سَو ہوتے تو عدد طاق نہ رہتا، اور اس سے توحید کا رمزِ آشکارانہ ہوتا، صحیح احادیث میں اسی قدر ہی یعنی ان ۹۹ نامون کی تصریح نہین ہے، ترمذی میں اور بعض کم درجہ حدیثوں مین ان نامون کو گنایا بھی ہی لیکن محدثین نے عموماً یہانتک کہ حافظ ابنِ حجر نے بھی لکھا ہے کہ یہ روایتین ضعیف اور کمزور ہین[2] پھر ان روایتوں مین بعض نامون کا ادل بدل اور الٹ پھیر بھی ہی، اور بعض ایسے نام بھی اُن میں ہیں جو قرآن میں مذکور نہین، اور بعض ایسے نام جو قرآن میں ہیں، ان میں نہیں ہیں، اسی لیے علماء کا فیصلہ یہ ہی کہ ان روایتون میں نامون کا انتخاب راویون نے خود اپنی تلاش و تفحص سے کیا ہے اس لیئے ان روایتوں سے یہ شبہ نہ ہو کہ اسمائے الٰہی صرف ان ننانوے ۹۹ میں محصور ہین، بلکہ بڑے بڑے ائمہ اور محدثین مثلاً عبد العزیز بن یحیٰی، ابو بکر بن عربی امام نووی، حافظ ابن حجر امام خطابی، ابنِ تیمیہ اور قرطبی وغیرہ نے تصریح کی ہی، کہ اسمائے الٰہی ان ننانوے ۹۹ میں محصور نہین، اور یہ بھی تصریحات ملتی ہیں کہ اسماء و صفاتِ الٰہی کی کوئی حد و پایان نہیں ہی[3] اور اس پر محدثین نے حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایتوں سی جو آغازِ مضمون میں اوپر گذر چکی ہیں استدلال کیا ہی،

بہرحال قرآن پاک اور احادیثِ صحیحہ کے تتبع سے علما نے ننانوے ۹۹ نامون کا پتہ چلایا ہی اور ان کو الگ الگ ایک ایک کر کے گنایا ہی، یہ تمام نام وہ ہیں جو بطور علم اور بطور صفت قرآن پاک

---

[1] صحیح بخاری کتاب التوحید صحیح مسلم کتاب الذکر و مسند احمد مسند ابی ہریرہ وجامع ترمذی نسائی و ابن ماجہ و ابن خزیمہ و ابو عوانہ و ابن جریر و طبرانی و بیہقی وغیرہ [2] تمہید ابو شکور سالمی [3] القول الثالث فی عدد الاسماء، یہ ماتریدیہ کی مشہور مستند کتاب ہے،

میں آئے ہیں یا افعال کی حیثیت سے خدا کی طرف منسوب ہوئے ہیں، اور یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاؤں میں اُن کی تعلیم کی ہے، ہم ذیل میں بہ ترتیب ایک ایک نام لکھتے ہیں، اور اس کی مختصر لغوی تشریح کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کا جو تخیل اور عقیدہ اپنے پیروؤں کو سکھایا وہ کتنا وسیع، کتنا بلند، کتنا منزہ اور پاکیزہ ہے، علما نے ان ناموں کو یا ان صفات کو مختلف معنوی مناسبتوں سے ترتیب دیا ہے لیکن ہم نے اُن کے صرف تین مرتبے قرار دیے ہیں، ایک وہ جن سے اُس کے رحم و کرم عفو و درگذر یعنی **صفاتِ جمالی** ظاہر ہوتے ہیں دوسرے وہ جن سے اس کی شاہنشاہی، جلال و جبروت اور حکومت و استیلا کا اظہار ہوتا ہے، اور ہم اُن کو **صفاتِ جلالی** کہتے ہیں، تیسرے وہ اسما اور صفات جن سے اُس کی تنزیہہ، بلندی، کمالات کی جامعیت، اور ہر قسم کے اوصافِ حسنہ اور محامدِ عالیہ کا ثبوت ملتا ہے اور اُن کو ہم **صفاتِ کمالی** سے تعبیر کرتے ہیں،

الغرض خدا کے تمام اسماء و صفات انہی تین عنوانوں کی تشریح ہیں، یعنی یا تو اُن سے خدا کی رحیمی و کریمی ظاہر ہوتی ہے، یا اُس کے جاہ و جلال کا اظہار ہوتا ہے، اور یا اُس کی تنزیہہ کمال کا اثبات ہوتا ہے

صفاتِ جمالی | یعنی وہ اسما و صفات جن سے خدا کے رحم و کرم اور شفقت و محبت کا اظہار ہوتا ہے

اللہ، یہ خدا کا وہ نام ہے، جو قرآنِ پاک میں بطور علم ہر جگہ استعمال کیا گیا ہے، اسلام سے پہلے بھی یہ عرب میں خدائے برحق کے لیے استعمال ہوتا تھا، اس لفظ کی لغوی تحقیق میں بہت کچھ اختلاف کیا گیا ہے، کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی اس ہستی کے ہیں جس کی پرستش کی جائے، بعضوں نے کہا ہے کہ وہ جس کی حقیقت و معرفت میں عقلِ انسانی حیران و سرگرداں ہو، دوسروں کی تحقیق یہ ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ جو اپنی مخلوقات کے ساتھ ایسی شفقت اور محبت رکھے جو ماں اپنے بچے کے ساتھ

ہوتی ہے اس اخیر تعبیر کی بنا پر اللہ کے معنی پیار کرنے والے یا پیارے کے ہیں،

اَلرَّحْمٰن اللہ کے بعد یہ دوسرا لفظ ہے جس کو علم کی حیثیت حاصل ہے، اس کے معنی رحم والے کے ہیں، یہ گذر چکا ہے کہ رحمان کا لفظ اسلام سے پہلے صرف عیسائی عربوں میں مستعمل تھا عام اہلِ عرب میں اللہ کا لفظ مستعمل تھا، قرآن مجید نے ہر سورہ کے شروع میں، نیز اور مقامات میں اللہ کو الرحمٰن کہکر سینکڑون جگہ استعمال کیا ہے بظاہر تو یہ وصف و موصوف کی معمولی ترکیب ہے، مگر درحقیقت یہ بدل و مبدل منہ ہیں، اور اس سے اس رمز کی طرف اشارہ ہے کہ عام عربون کا اللہ اور عرب عیسائیون کا رحمان دو اجنبی ذاتین اور دو بیگانہ ہستیان نہین، بلکہ ایک ہی حقیقت کی دو تعبیرین اور ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں، اس طرح ان دو مختلف قومون کو وحدتِ الٰہی کی دعوت دیگئی، جو نامون کے تعدد کو حقیقت کے تعدد کا مرادف سمجھتی تھین اور کہا گیا

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوا فَلَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى (اسرٰئیل)

اللہ کہو یا رحمٰن کہو، جو چاہو کہو، اسی کے لئے سب اچھے نام ہین،

اَلرَّحِيْمُ رحم کرنے والا" رحم کا لفظ اُس رِحم سے نکلا ہے، جس سے بچہ کی پیدایش ہوتی ہے اسلئے اصل لغت کے لحاظ سے اس لفظ میں بھی مربیانہ محبت کا جذبہ نمایان ہے، یہی اَلرَّحْمٰن اور اَلرَّحِيْمُ خدا کی وہ دو صفتیں ہیں جن سے قرآن کا صفحہ صفحہ منور ہے، کائنات مین جو کچھ ہے، جو کچھ ہوگا، وہ اسکی رحمانی اور رحیمی ان ہی دو صفتون کا پرتو ہے، اس عالم، اور اس عالم دونوں میں اس کی ان ہی دونوں شانون کا ظہور ہے اور ہوگا،

اَلرَّبُّ پرورش کرنیوالا یعنی ہستی کے اوّل نقطہ سے لیکر آخر منزل تک ہر لمحہ اور ہر لحظہ مخلوقات

کی نشو ونما اور ظہور وترقی کا ذمہ دار

اَللَّطِيفُ، لطف والا مہربان،

اَلْعَفُوُّ، معاف کرنے والا، درگذر کرنے والا،

اَلْوَدُودُ، محبوب، محبّت کرنے والا، پیار کرنے والا،

اَلسَّلَامُ، امن وسلامتی، صلح وآشتی، ہر عیب سے پاک وصاف،

اَلْمُحِبُّ، محبت والا، پیار والا، چاہنے والا،

اَلْمُؤْمِنُ، امان دینے والا، امن بخشنے والا، ہر خوف سے بچانیوالا، اور ہر مصیبت سے نجات دینے والا

اَلشَّكُورُ، اپنے بندوں کے نیک عمل کو قبول، اور پسند کرنے والا،

اَلْغَفُورُ وَالْغَفَّارُ، معاف کرنے والا، گناہ بخشنے والا، درگذر کرنے والا،

اَلْحَفِيظُ وَالْحَافِظُ، حفاظت کرنے والا نگہبان، بچانے والا،

اَلْوَهَّابُ، دینے والا، عطا کرنے والا، بخشنے والا،

اَلرَّازِقُ وَالرَّزَّاقُ، روزی دینے والا، نشو ونما کا سامان بہم پہنچانے والا،

اَلْوَلِيُّ، دوست، حمایتی، طرفدار،

اَلرَّؤُفُ، مہربان، نرمی اور شفقت کرنے والا،

اَلْمُقْسِطُ، انصاف والا، عادل،

اَلْهَادِيُّ، راہ دکھانیوالا، رہنما،

اَلْكَافِيُّ، اپنے بندوں کی ہر ضرورت کے لئے کافی،

اَلْمُجِیْبُ ، قبول کرنے والا ، دعاؤن کا سننے والا .

اَلْحَلِیْمُ ، بُردبار ، بندون کی برائیون سے چشم پوشی کرنے والا ،

اَلتَّوَّابُ وَ قَابِلُ التَّوْبِ ، توبہ قبول کرنے والا ، گنہگار کے گناہون سے درگذر کرکے دوبارہ اس کی طرف رجوع ہونے والا ،

اَلْحَنَّانُ ، مان کی طرح بچّون پر شفقت کرنے والا ،

اَلْمَنَّانُ ، احسان کرنے والا ،

اَلنَّصِیْرُ ، مدد کرنے والا ،

ذُوالطَّولِ ، کرم والا ،

ذُوالفَضْلِ ، فضل والا ،

اَلْکَفِیْلُ ، بندون کی کفالت کرنے والا ،

اَلْوَکِیْلُ ، بندون کی ضرورتون کا ذمّہ لینے والا ، سامان کرنے والا ،

اَلْمُقِیْتُ ، روزی پہنچانے والا ،

اَلْمُغِیْثُ ، فریاد کو پہنچنے والا ، فریاد سننے والا ،

اَلْمُجِیْرُ ، پناہ دینے والا ،

اَلْمُغْنِی ، پناہ دینے والا ،

صفاتِ جلالی | یعنی وہ اسمار وصفات جن سے خدا کی بڑائی ، کبریائی ، شہنشاہی ظاہر ہوتی ہے

اَلْمَلِکُ وَالْمَلِیْکُ ، بادشاہ ، فرمانروا ،

اَلْعَزِیْزُ. غالب جس پر کوئی دسترس نہ پائے،

اَلْقَاهِرُ وَالْقَهَّارُ، جس کے حکم سے کوئی باہر نہیں جا سکتا، سب کو دبا کر اپنے قابو میں رکھنے والا

اَلْمُنْتَقِمُ، سزا دینے والا برائیوں کی جزا دینے والا،

اَلْجَبَّارُ، جبروت والا جس کے سامنے کوئی دوسرا نام نہ پا سکے جس سے کوئی سرتابی نہ کر سکے،

اَلْمُهَیْمِنُ، سب پر شاہد اور گواہ اور دلیل،

اَلْمُتَکَبِّرُ، اپنی بڑائی دکھانے والا، کبریائی والا، سخت سزا دینے والا،

شَدِیْدُ الْعِقَابِ، سخت سزا والا،

شَدِیْدُ البطش، بڑی گرفت والا، جس سے کوئی چھوٹ نہین سکتا،

نکتہ خدا کے صفاتِ جلالی کا ذکر زیادہ تر توراۃ مین ہے لیکن صحیفہ محمدی میں جہان کہیں خدا کی ان جلالی صفتون کا ذکر آتا ہے ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ خدا کے عادل، حکیم اور علیم ہونے کا بھی ذکر ہوتا ہے، جس سے انسان کی اس غلط فہمی کا مٹانا مقصود ہے، کہ خدا کی ان جلالی صفتون کا یہ منشا نہیں ہے کہ وہ نعوذ باللہ ایک لاابالی کی طرح دم کے دم میں جو چاہے کر گذرتا ہے بلکہ اس کا قہر اس کا غلبہ اس کا انتقام اور اُس کی گرفت عدل و انصاف اور حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتی ہے اور اس طرح ان جلالی نامون سے بے رحمی، اور ظالمانہ سخت گیری کا جو شبہہ پیدا ہو سکتا ہے، وہ دور ہو جاتا ہے فرمایا

اِنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (آل عمران ۱۹) بیشک خدا بندوں پر ظلم کرنیوالا نہین،

اسی لیئے اللہ تعالیٰ کے وصف میں عَزِیْزٌ (غالب) کیساتھ حَکِیْمٌ (حکمت والا) ہمیشہ قرآن مین آیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ خدا کے عذاب کے ذکر کیساتھ اس کی رحمت کا تذکرہ بھی ہمیشہ قرآن مین کیا

جاتاہے اور دوزخ کے بیان کے ساتھ جنت کا سماں بھی لازمی طور پر دکھایا جاتا ہے،

جہاں یہ کہا گیا کہ وَمَا مِنْ اِلٰہٍ اِلَّا اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ، وہیں یہ بھی کہا گیا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا الْعَزِیْزُ الْغَفَّارُ (ص - ۵) قوموں کی تباہی و بربادی کا ذکر کیا گیا تو فرمایا گیا،

وَمَا اللّٰہُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ (مومن ۴) اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا،

اس کی صفت ذُوْعِقَابٍ اَلِیْمٍ، دردناک عذاب دینے والا، جہاں بیان کی گئی تو اُس سے پہلے لَذُوْ مَغْفِرَۃٍ یقینی بخشش والا، (حٰمٓ السجدہ ع - ۵) بھی فرما دیا گیا، غرض صفات جلالی کے بیان میں یہ رعایت پیش نظر رکھی گئی ہے، کہ اُن کیساتھ یا آگے پیچھے خدا کی صفاتِ جمالی کا بھی ذکر ہو تاکہ خوف و خشیت کیساتھ اس کی محبت اور لطف و کرم کے جذبات بھی نمایاں ہوں،

صفاتِ کمالی | یعنی وہ اسماء و صفات جن سے خدا کی خوبی، بڑائی، بزرگی اور ہر وصف میں اس کا کامل ہونا ظاہر ہوتا ہے، اس طرح کے اسماء و صفات پانچ قسم کے ہیں، ایک وہ جو اسکی وحدانیت سے متعلق ہیں، دوسرے اس کے وجود سے تعلق رکھتے ہیں، تیسرے اس کے علم سے، چوتھے اس کی قدرت سے اور پانچویں اس کی تنزیہہ اور پاکی سے،

صفاتِ وحدانیت | یعنی وہ صفتیں جو خدا کی یکتائی اور بے مثالی کو ظاہر کرتی ہیں، اور وہ یہ ہیں؛

الواحِدُ: ایک

اَلْاَحَدُ: ایک

اَلْوِتْرُ، طاق جس کا کوئی جوڑا نہیں،

صفاتِ وجودی | یعنی وہ صفتیں جن سے اس کا وجود، بقا، دوام، ازلیت اور بے زوالی ظاہر ہوتی ہے

اَلْمَوْجُوْدُ، وجود والا، ہست

اَلْحَیُّ، ہمیشہ زندہ، غیر فانی؛

اَلْقَدِیْمُ، وہ جس سے پہلے کوئی دوسرا موجود نہیں، جو ہمیشہ سے ہے،

اَلْقَیُّوْمُ، جو اپنے سہارے تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے،

اَلْبَاقِیْ، جس کو ہمیشہ بقا ہے،

اَلدَّائِمُ، ہمیشہ رہنے والا؛

اَلْاَوَّلُ، وہ پہلا، جس کے پہلے کوئی نہین،

اَلْاٰخِرُ، وہ پچھلا جو سب کے فانی ہونے کے بعد بھی ہمیشہ باقی رہے گا،

اَلْمُقَدِّمُ، جو سب کے آگے سے ہے،

اَلْمُؤَخِّرُ، جو سب سے پیچھے رہ جائے گا،

اَلظَّاهِرُ، جس کا وجود کھلا اور نمایاں ہے، (یعنی جو اپنے کاموں اور قدرتوں کے لحاظ سے ظاہر ہے)

اَلْبَاطِنُ، جو چھپا اور مخفی ہے، (یعنی جو اپنی ذات کے لحاظ سے پوشیدہ ہے)

علم

یعنی وہ صفتیں جو اس کے ہر چیز سے باخبر اور آگاہ ہونے کو ظاہر کرتی ہین،

اَلْخَبِیْرُ، خبر رکھنے والا،

اَلْعَلِیْمُ، جاننے والا،

عَلَّامُ الغیوب، جو باتین سب سے پوشیدہ ہیں، اُن کو جاننے والا،

عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ، دلوں کے چھپے ہوئے بھید کو جاننے والا،

اَلسَّمِیْعُ، سننے والا،

اَلْبَصِیْرُ ، دیکھنے والا،

اَلْمُتَکَلِّمُ، بولنے والا، اپنے علم اور ارادہ کو ظاہر کرنے والا،

اَلْوَاجِدُ ، پانے والا، جس کے علم سے کوئی چیز گم نہین،

اَلشَّہِیْدُ، حاضر، جس کے سامنے سے کوئی چیز غائب نہین،

اَلْحَسِیْبُ ، حساب کرنے والا یعنی جن چیزوں کا علم حساب کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا ہے، یعنی وزن اور مقدار اُن کا بھی جاننے والا،

اَلْمُحْصِیْ ، گننے والا یعنی جن چیزونکا علم گن کر حاصل کیا جاتا ہے یعنی اعداد اُنکا جاننے والا،

اَلْمُدَبِّرُ، تدبیر کرنے والا، انتظام کرنے والا،

اَلْحَکِیْمُ ، حکمت والا، عقل والا، سب کامون کو مصلحت سے کرنے والا،

اَلْمُرِیْد، ارادہ کرنے والا، مشیئت والا،

اَلْقَرِیْبُ ، نزدیک، جو اپنے علم کے لحاظ سے گویا سب کے پاس ہی،

قدرت | یعنی وہ صفتیں جن سے اُس کی قدرت کی وسعت کا اظہار ہوتا ہی،

اَلْفَاتِحُ وَالْفَتَّاحُ، ہر مشکل کو کھولنے والا،

اَلْقَدِیْرُ وَالْقَادِرُ، قدرت والا،

اَلْمُقْتَدِرُ. اقتدار والا، جس کے سامنے کوئی چون و چرا نہین کرسکتا،

اَلْقَوِیُّ زبردست جس کے سامنے کسی کا بس نہیں چل سکتا،

اَلْمَتِیْنُ، مضبوط جس میں کوئی کمزوری نہین،

اَلْجَامِعُ، جمع کرنے والا، متفرق اور پراگندہ چیزون کو اکٹھا کرنے والا،

اَلْبَاعِثُ، اٹھانے والا، مردون کو قبروں سے اٹھانے والا، یا دنیا مین ہر واقعہ اور ہر حادثہ کا محرک اول

مَالِکُ الْمُلْکِ، سلطنت کا مالک جس کے سامنے کسی کی کوئی ملکیت نہین،

اَلْبَدِیْعُ، نئی نئی چیزین ایجاد کرنے والا،

اَلْوَاسِعُ، سمانے والا، جو ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے،

اَلْمُحِیْطُ، احاطہ کرنے والا، جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے کوئی اُس کے احاطہ سے باہر نہیں،

اَلْمُحْیِ وَالْمُمِیْتُ، جلانے والا، اور مارنے والا،

اَلْقَابِضُ وَالْبَاسِطُ، سمیٹنے والا اور پھیلانے والا،

اَلْمُعِزُّ وَالْمُذِلُّ، عزت دینے والا، اور ذلت دینے والا،

اَلْخَافِضُ وَالرَّافِعُ، نیچا کرنے والا، اور اونچا کرنے والا،

اَلْمُعْطِیُ وَالْمَانِعُ، دینے والا اور روک لینے والا،

وَالنَّافِعُ وَالضَّارُّ، نفع پہنچانے والا، اور نقصان پہنچانے والا یعنی نفع اور ضرر دونون اسی کے ہاتھ مین ہیں،

اَلْمُبْدِیُٔ وَالْمُعِیْدُ، جو چیز پہلے سے موجود نہ ہو، اُس کو وجود میں لانے والا، اور جو موجود ہو کر فنا کردی گئی، اُس کو پھر دوبارہ وجود میں لانے والا،

نکتہ: اس قسم کی صفتین جن مین بظاہر قبح نظر آتا ہے، جیسے الضّاد (نقصان پہنچانے والا)

اَلْمُذِلُّ (ذلت دینے والا) اَلْخَافِضُ (پست کرنے والا) اَلْمَانِعْ (روکنے والا) وغیرہ، ان کا تنہا
استعمال چونکہ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے، اس لئے جب تک اُن کے ساتھ اُن کے مقابل کی صفت
نہ بولی جائے، اُن کا استعمال جائز نہیں رکھا گیا ہے یعنی خدا کو صرف الضّادُّ، الخافِضُ، اَلْمَانِعُ
اور اَلْمُذِلُّ کہنا درست نہیں جب تک اُس کے ساتھ دوسرے پہلو کو بھی نہ ملایا جائے، یعنی
اَلضَّادُّ کیساتھ النافِع، اَلْخَافِضُ کیساتھ اَلرَّافِعُ، اَلْمَانِعُ کیساتھ اَلْمُعْطِی اور اَلْمُذِلُّ کے ساتھ
اَلْمُعِزُّ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، قرآن پاک اور احادیث دونوں میں ان صفات کے استعمال میں
رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، کیونکہ تنہا نقصان پہنچانے والا، ذلت دینے والا، اور روکنے والا، کوئی
خوبی نہیں، بلکہ ایک طرح کی برائی ہے، ہاں نقصان و نفع پہنچانے والا، عزت و ذلت دینے والا
اور دینے والا، اور روکنے والا، دونوں کو ملا کر کہا جائے تو جائز ہوگا کہ اس سے مقصود خدا کی
قدرت کی وسعت ہے، اگر کوئی ایسا نفع پہنچانے والا ہے جس میں نقصان پہنچانے کی قدرت
ہی نہیں، یا ایسا عزت دینے والا ہے جس میں ذلیل کرنے کی استطاعت ہی نہیں تو وہ اس عزت
دینے اور نفع پہنچانے پر مجبور و مضطر ہوگا، اور اس کی قدرت کا یہ کمال نہ ہوگا، البتہ جو نقصان
پہنچانے کی طاقت رکھنے کے باوجود نفع پہنچاتا، اور ذلت دے سکنے کے باوصف عزت دیتا ہے اس
کا کمال ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑتا ہے،

تنزیہیہ یعنی وہ صفات جو اس کی بڑائی، کبریائی، پاکی، اور نیکی، اور ہر عیب نقصان سے اسکی
برأت کو ظاہر کرتی ہیں،

اَلْعَلِیُّ، مرتبہ والا،

اَلْعَظِیْمُ ، عظمت والا ،

اَلْکَبِیْرُ ، بڑا ،

اَلرَّفِیْعُ ، بلند ،

اَلْجَلِیْلُ ، بزرگ ،

اَلْکَرِیْمُ ، شریف ،

اَلْغَنِیُّ ، بے نیاز ،

اَلصَّادِقُ ، سچا ، راست باز

اَلْمَاجِدُ ، عزت والا ،

اَلْحَمِیْدُ ، تعریف والا ،

اَلْقُدُّوْسُ پاک ،

اَلْحَقُّ ، سچا اور اصلی یعنی ، یہ کہ اس کے سوا سب باطل ہیں ،

اَلْجَمِیْلُ ، اچھا ،

اَلْبَرُّ ، نیک ،

اَلْعَدْلُ ، عادل

سُبُّوْحٌ ، ہر عیب سے پاک ،

اَلصَّمَدُ ، بزرگی کی ہر صفت میں کامل ،

اَلرَّشِیْدُ ، سیدھی راہ چلنے والا ، نہ بھٹکنے والا ،

ان تعلیمات کا اثر اخلاق انسانی پر | اللہ تعالیٰ کے اُن اسماء و صفات کا عقیدہ، دینِ محمدیؐ میں

محض نظری نہیں، بلکہ عملی حیثیت بھی رکھتا ہے، یعنی اُس کے یہ محامد و اوصاف اخلاقِ انسانی کا معیار ہیں، اُن اوصاف کو چھوڑ کر جو اُس ذوالجلال کے لیے خاص ہیں، اور جو بندہ کی حیثیت اور طاقت سے زیادہ ہیں، بقیہ اوصاف و محامد انسان کے لیے قابلِ نقل ہیں، کہ وہ خدا کے محامد و اوصاف سے دور کی نسبت رکھتے ہیں، اس لیے انسان پر فرض ہے کہ اگر وہ خدا سے نسبت پیدا کرنا چاہتا ہے، تو اپنے اندر اس کے محامد و اوصاف سے نسبت پیدا کرے اور اُن کو خوبیوں کا انتہائی معیار جان کر اُن کی نقل اور پیروی کی خواہش کرے، محامد الٰہی گویا استاد اعلیٰ کی وصلی ہیں جس کو دیکھ کر شاگرد کو اپنے خط کی خوبی میں ترقی کرنی چاہیے اس لیے انسان کو بھی اپنے حرف کے لکھنے (محامد الٰہی کی نقل اتارنے) میں ایک نظر اُس استادِ ازل کی وصلی پر ڈال لینی چاہیے تاکہ معلوم ہو کہ اسکی ذاتی مشق کہاں تک اصل وصلی کے مطابق ہے،

گذر چکا ہے کہ قرآن کا پہلا سبق یہ ہے کہ بحکم اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (بقرہ ۴) آدم کا بیٹا زمین میں خدا کا خلیفہ اور نائب بنایا گیا ہے، خلیفہ اور نائب میں اصل کے اوصاف و محامد کا پرتو جتنا زیادہ نمایاں ہوگا، اتنا ہی وہ اپنے اندر اس منصب کا استحقاق زیادہ ثابت کریگا، اور نیابت کے فرائض زیادہ بہتر ادا کر سکے گا، یہاں تک کہ اس میں وہ جلوہ بھی نمایاں ہوگا جب وہ سر تا پا خدائی رنگ میں رنگ کر نکھر جائے گا،

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ	خدا کا رنگ اور خدا کے رنگ سے کس کا
اللّٰهِ صِبْغَةً ، (بقرہ ۱۶-۱۰)	رنگ اچھا ہے ؟

تمام اہلِ تفسیر متفق ہیں کہ اس "خدائی رنگ" سے مقصود خدا کا "دین فطرت" ہے،

یہ حدیث اوپر گذر چکی ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ "خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا" اور ساتھ ہی اس کی تشریح بھی گذری ہے کہ اس "صورت" سے مقصود جسمانی نہیں، بلکہ معنوی شکل و صورت ہے، یعنی یہ کہ خدا نے انسان میں اپنے صفاتِ کاملہ کا عکس جلوہ گر کیا ہے اور اُن کے قبول کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے، اور اُن میں حدِ بشری تک ترقی کی استعداد بخشی ہے اور انسان کو اخلاق و صفت میں ملاءِ اعلیٰ سے تشبّہ اور ہمشکلی کا جوہر مرحمت فرمایا ہے، اور یہی صوفیہ اور خاصانِ خدا کے اس مقولہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ "خدا کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو" کا مطلب ہے، حدیث میں یہی مفہوم بروایت طبرانی ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ حسن الخلق خلق اللّٰہ الاعظم "حسنِ خلق خدا تعالیٰ کا خلق عظیم ہے"[1]

اللہ تعالیٰ کے صفاتِ کاملہ کی تین قسمیں اوپر بیان ہوئی ہیں، جلالی، کمالی اور تنزیہی صفات، جلالی جو کبریائی، عظمت، شہنشاہی اور بڑائی کے اوصاف ہیں، اللہ تعالیٰ کے سوا مخلوقات ان کی مستحق نہیں، اور نہ یہ اوصاف بندگی و عبودیت کے رتبہ کے مناسب ہیں، اُن کا انعکاس یہ ہے کہ بندوں میں اُن کے مقابل کے صفات پیدا ہوں یعنی عاجزی، تواضع، فروتنی اور خاکساری، اس لیے ترفّع، تکبر، اور بڑائی کا اظہار منع ہے، اسی لیے آدم جس نے فروتنی اختیار کی، اور عجز و قصور کا اعتراف کیا، وہ مغفرت کے خلعت سے سرفراز ہوا، اور شیطان جس نے ترفع اور غرور ظاہر کیا، دائمی لعنت کا مستحق ٹھہرا

اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ	اس نے (آدم کے سجدہ سے) انکار کیا اور
(بقرہ ۷-۴)	غرور کیا، اور کافروں میں سے ہو گیا،

[1] کنز العمال جلد ۲ ص ۲، بروایت عمار بن یاسرؓ

قرآن پاک میں ہے کہ بڑائی اور کبریائی صرف خدا کے لئے ہے اس کے سوا کوئی اور اسکا مستحق نہیں،

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (جاثیہ) اور آسمانوں اور زمین میں اسی کے لئے بڑائی ہے

صحیح مسلم[1] میں، ابو سعید خدریؓ اور ابو ہریرہؓ دو صحابیوں سے روایت ہے کہ آپنے فرمایا کہ عزت اس کا لباس اور کبریائی اسکی چادر ہے، (خدا فرماتا ہے) تو جو کوئی عزت اور کبریائی میں میرا حریف بنے گا، میں اُسے سزا دوں گا،" دوسری جگہ ہے کہ آپنے فرمایا کہ "خدا کے نزدیک سب سے بُرا وہ ہے جو اپنا نام بادشاہوں کا بادشاہ اور شہنشاہ رکھتا ہے، خدا کے سوا کوئی بادشاہ اور مالک نہیں"[2] اَلْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ (حشر-۳) اُسی کی شان ہے، البتہ اللہ تعالیٰ اپنی عزت وجلال اور قوت وجبروت کا فیضان بعض بندوں اور امتوں پر نازل کرتا ہے، اور وہ اُن کو طاقت اور قوت اور بادشاہی عطا کرتا ہے، مگر اس نوازش کے بعد بھی نیک بندوں اور صالح اُمتوں کا فرض یہی ہے کہ عین اُس وقت جب کہ اُن کے دست و بازو سے قوتِ حق، اور ربانی جاہ وجلال کا اظہار ہو رہا ہو، اُن کی پیشانیاں فرطِ عبودیت سے اُس کے آگے جھکی ہوں، اور سرِ نیاز اظہارِ بندگی کے لئے اُس کے سامنے خم ہوں، کہ عزت وجلال خاص خدا کی شان تھی جس کا فیضان رسول پر ہوا، اور رسول کی وساطت سے مومنوں پر ہوا، یہ ترتیب خود قرآن میں ملحوظ رکھی گئی ہے،

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (منافقون-۱) اور عزت خدا کے لئے ہے، اور اس کے رسول کے لئے اور مومنوں کے لئے ہے،

حاکم میں ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تین کپڑے ہیں وہ اپنی عزت وجلال کا

---

[1] کتاب الادب، باب الکبر جلد دوم صفحہ ۳۰۰ مصر، [2] صحیح بخاری و مسلم کتاب الادب،

زار باندھتا ہے اور اپنی رحمت کا جامہ پہنتا ہے اور اپنی کبریائی کی چادر اوڑھتا ہے تو جو شخص اس عزت کے سوا جو خدا کی طرف سے اس کو عنایت ہوئی ہے، معزز بننا چاہتا ہے، تو وہی وہ شخص ہے جس کو قیامت میں کہا جائے گا "(اس کا) مزہ چکھ تو معزز اور شریف بنتا تھا، (قرآن) اور جو انسانوں پر رحم کرتا ہے خدا اس پر رحم کرتا ہے کیونکہ اس نے وہ جامہ پہنا جس کا پہننا اس کو روا تھا اور جو کبریائی کرتا ہے تو وہ خدا کی اس چادر کو اتارنا چاہتا ہے جو خدا ہی کیلئے تھی"[1]

خدا کے صفاتِ کمالی میں سے وحدانیت اور بقائے ازلی وابدی کے سوا کہ اُن سے تمام مخلوقات اور ممکنات طبعاً محروم ہیں، بقیہ اوصاف کے فیضان سے انسان مشرف ہوتا ہے، صفاتِ تنزیہی مثلاً قدرت، علم، سمع، بصر، کلام وغیرہ سے بھی مخلوقات تمامتر محروم ہیں الا تنزیہی ہی کہ وہ خدا کے عصیان، نافرمانی اور گنہگاری کے عیب سے بری اور پاک ہوں،

خدا کے صفاتِ جمالی وہ اصلی اوصاف ہیں جن کے فیضان کا دروازہ ہر صاحب توفیق کے لئے حسب استعداد کھلا ہوا ہے ان صفات کا سب سے بڑا مظہر عفو و درگذر ہے عیسائیوں کی عام دعا میں ایک فقرہ ہے کہ "خداوندا! تو ہمارے گناہوں کو معاف کر جس طرح ہم اپنے قرضداروں کو معاف کرتے ہیں"، اسلام نے اس الٹی تشبیہ کو جائز نہیں رکھا ہے، اس کے ہاں یہ ہے کہ "اے انسان تو اپنے مجرموں کو معاف کر کہ خدا تیرے گناہوں کو معاف کرے" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی اپنے بھائی کے گناہوں پر پردہ ڈالے گا خدا اس کے گناہوں پر پردہ ڈالیگا"[2] قرآن کہتا ہے کہ تم دوسروں کو معاف کرو کہ خدا تم کو معاف کرتا ہے،

---

[1] کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۱۰۹ و مستدرک حاکم، [2] صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ،

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ، (نساء - ۲۱)

اگر تم کوئی نیکی دکھا کر یا چھپا کر کرو یا کسی کی برائی کو معاف کرو تو اللہ (بھی) معاف کرنے والا قدرت والا ہے ،

ایک دفعہ عہد نبوت میں بارگاہ عدالت قائم تھی ، ایک مجرم کو سزا دیجا رہی تھی ، سزا کا منظر دیکھ کر حضورؐ کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو رہا تھا ، اداشناسون نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ "امام تک معاملہ پہونچنے سے پہلے ہی اپنے بھائیون کو معاف کر دیا کرو ، خدا معاف کرنا اور عفو و درگذر کو پسند کرتا ہے ، تو تم بھی معاف اور درگذر کیا کرو ، کیا تمھیں یہ پسند نہیں کہ خدا تمھیں بھی معاف کرے ، وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے"[۱]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ صحابہ کے مجمع میں فرما رہے تھے ، کہ جس کے دل میں غرور کا ایک ذرہ بھی ہوگا وہ بہشت مین داخل نہ ہو گا " ایک صحابی نے عرض کی یا رسول اللہ ! انسان چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہون اس کا جوتا اچھا ہو ، کیا یہ بھی غرور ہے فرمایا ،

اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ[۲]

اللہ تعالیٰ اچھا ہے اور جمال والا ہے اچھائی اور جمال کو پسند کرتا ہے ،

یہ غرور نہیں ، غرور حق کو پامال کرنا ، اور انسانون کو دبانا ہے " یہی روایت حدیث کی دوسری کتابون میں ان الفاظ کیساتھ ہے . خدا جمال والا ہے ، وہ جمال کو پسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے بندہ پر اُس کی نعمت کا اثر ظاہر ہو[۳] ، یہ روایت بھی ہے خدا جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے وہ سخی ہے

[۱] مستدرک للحاکم جلد ۴ ص ۳۸۲ کتاب الحدود [۲] صحیح مسلم کتاب الایمان و ترمذی باب الکبیر [۳] کنز العمال کتاب الزینۃ بحوالہ شعب الایمان بیہقی ،

سخاوت کو پسند کرتا ہی، وہ صاف ستھرا ہے، صفائی اور ستھرے پن کو پسند کرتا ہے[۱]" روایت کے یہ الفاظ بھی آئے ہیں"، وہ جمیل ہے، جمال کو پسند کرتا ہے، اخلاقِ عالیہ سے محبت، اور بداخلاقیوں سے نفرت رکھتا ہے[۲]" ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہؓ کو نصیحت فرماتے ہیں" اے عائشہ! خدا نرمی والا ہے، وہ ہر بات میں نرمی پسند کرتا ہے[۳]" ایک دفعہ آپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا" لوگو! خدا پاک ہے اور پاک ہی کو قبول کرتا ہے[۴]" عام مسلمانوں کو مخاطب کرکے فرمایا" اے قرآن کے ماننے والو! وتر نماز پڑھا کرو کہ خدا یکتا (وتر) ہے، وہ یکتا (وتر) کو پسند کرتا ہے[۵]"

رحمت وشفقت اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے، مگر خدا کی رحمت وشفقت کے وہی مستحق ہیں جو دوسروں پر رحمت وشفقت کرتے ہیں، آپنے فرمایا" رحم کرنے والوں پر وہ رحم کرنیوالا بھی رحم کرتا ہے، لوگو! تم زمین والوں پر رحم کرو، تو آسمان والا تم پر رحم کریگا" (ابوداؤد باب فی الرحمۃ) رشتہ داری اور قرابت کے حقوق اداکرنے کا حکم دیا گیا ہے، تمام رشتہ داریاں اور قرابتیں رحم کے تعلق پر قائم ہیں، آپ نے فرمایا ہے کہ" رحم کی جڑ رحمان سے ہے خدا فرماتا ہے. کہ اے رحم! جو تجھکو قطع کرے گا، میں اس کو قطع کرونگا، جو تجھکو ملائے گا، اس کو میں بھی ملاؤں گا[۶]" ترمذی میں یہی تعلیم ان الفاظ میں ہے" میں خدا ہوں میں رحمان ہوں میں نے رحم کو پیدا کیا ہے. اور اپنے نام (رحمان) سے اسکا نام (رحم) مشتق کیا ہی، تو اس کو ملائیگا میں اس کو ملاؤنگا، جو اس کو قطع کریگا میں اسکو قطع کرونگا[۷]" پھر فرمایا" جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا، خدا اس پر رحم نہیں کرتا[۸]" بخاری میں اس روایت کے یہ الفاظ ہیں جو رحم نہیں کرتا اس پر

---

[۱] کنز العمال کتاب الزینۃ بحوالہ کامل لابن عدی [۲] ایضاً بحوالہ معجم اوسط طبرانی [۳] صحیح مسلم ابوداؤد حاکم، نسائی، ابن ماجہ بیہقی فی الآداب [۴] صحیح مسلم کتاب الصدقات وترمذی تفسیر سورہ بقرہ [۵] ابوداؤد استحباب الوتر [۶] صحیح بخاری باب صلۃ الرحم، [۷] ابواب البر والصلۃ [۸] ترمذی باب مذکور،

رحم نہیں کیا جاتا[1]" آپنے فرمایا "خدا نے رحم کے سو حصے کیئے ۹۹ حصے اپنے پاس رکھے اور ایک حصہ زمین والون کو عنایت کیا، اُسی کا یہ اثر ہے کہ باہم لوگ ایک دوسرے کیساتھ رحم و شفقت سے پیش آتے ہین، یہانتک کہ گھوڑی بھی اپنے بچہ کے لیئے اس خوف سے پاؤن اٹھالیتی ہو کہ اُس کو صدمہ نہ پہونچے"[2]

بخل خدا کی صفت نہین، مگر آپنے فرمایا "تم اپنی تھیلی کے منھ نہ بند کرو، ورنہ تم پر تھیلی کا منہ بند کیا جائیگا[3]" یہ نصیحت بھی فرمائی کہ جو بندہ دوسرے بندہ کی پردہ پوشی کریگا، قیامت میں اس کی پردہ پوشی خدا کریگا[4]" یہ بھی تعلیم دی گئی ہو کہ جب تک تم اپنے بھائی کی مدد میں ہو، خدا تمھاری مدد مین ہے[5]"

ایک اور موقع پر آپنے فرمایا کہ "خدا سے بڑھ کر کوئی غیرت مند نہیں، اسی لئے اُس نے فحش باتون کو حرام کیا ہے[6]" اسی کی تفسیر دوسری حدیث میں ہو آپنے فرمایا کہ خدا بھی غیرت والا ہے، اور مومن بھی غیرت والا ہے، اور خدا کی غیرت یہ ہے کہ اُس نے اپنے مومن پر جس بات کو حرام کیا ہے، اگر کوئی اس کا ارتکاب کرے تو وہ اس پر خفا ہو[7]"

اللہ تعالیٰ ظلم سے پاک ہے،

وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (آل عمران ۱۹) — اور بیشک خدا بندون پر ظلم نہیں کرتا،

اس لیئے اس کے بندون کا فرض ہو کہ وہ بھی آپس مین ایک دوسرے پر ظلم نہ کرین، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی زبان سے اسکی اس عملی تعلیم کو ان الفاظ مین ادا فرمایا،

یا عبادی انی حرمت الظلم علی — اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام

---

[1] جامع بخاری باب رحمۃ الولد [2] ایضاً [3] صحیح ترمذی ابواب البر والصلۃ [4] مسلم کتاب البر والصلہ باب بشارۃ من ستر اللہ تعالیٰ علیہ فی الدنیا ان یستر علیہ فی الآخرۃ [5] ابوداؤد کتاب الادب باب فی المعونۃ للمسلم [6] صحیح بخاری کتاب التوحید جلد دوم ص ۱۱۰۳ [7] جامع ترمذی باب ماجاء فی الغیرۃ من ابواب النکاح،

نفسی وجعلته بینکم محرّمًا فلا	کیا ہے اور اس کو تمھارے درمیان بھی حرام
تظالموا،[1]	کیا ہے تو تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا،

پاکیزگی اور لطافت خدا کی صفتیں ہیں، اس لئے خدا کے ہر بندہ کو بھی پاک وصاف رہنا چاہیئے آپ نے فرمایا،

اِنَّ اللّٰہ طیّب یحبُّ الطّیب و	خدا پاکیزہ ہے، پاکیزگی کو پسند کرتا ہے اور پاک و
نظیفٌ یحب النظافۃ فتنظّفوا	صاف ہے، پاکی اور صفائی کو پسند کرتا ہے تو تم پاک
ولا تشبّھوا الیھودؔ،[2]	وصاف رہا کرو، یہودیوں کی طرح گندے نہ بنو،

یہ توحید کا ایک رُخ تھا، اب اس کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ کے قابل ہے،

وہ قومیں جو توحید سے آشنا نہ تھیں، انھوں نے انسانیت کا مرتبہ بھی نہیں پہچانا تھا، وہ انسان کو فطرت کے ہر مظہر کا غلام سمجھتی تھیں، یہ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم توحید ہی تھی جس نے خدا کے سوا ہر شے کا خوف انسانوں کے دلوں سے نکال دیا، سورج سے لیکر زمین کے دریا اور تالاب تک ہر چیز آقا ہونے کے بجائے انسانوں کی غلام بنکر اُن کے سامنے آئی، بادشاہوں کے جلال و جبروت کا طلسم ٹوٹ گیا، اور وہ بابل و مصر، ہند و ایران کے خدا اور ربکم الاعلیٰ ہونے کے بجائے، انسانوں کے خادم، راعی اور چوکیدار کی صورت میں نظر آئے، جن کا عزل و نصب دیوتاؤں اور فرشتوں کے ہاتھ میں نہ تھا، بلکہ خود انسانوں کے ہاتھ میں تھا،

تمام انسانی برادری جس کو دیوتاؤں کی حکومتوں نے اونچے نیچے، بلند و پست، شریف و ذلیل

---

[1] صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ و مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۱۶۰ مصر و ادب المفرد امام بخاری باب الظلم ص ۹۵ مصر [2] ترمذی باب فی النظافۃ ص ۲۵۶

مختلف طبقون اور ذاتون مین منقسم کردیا تھا اور جنمیں سے کچھ کی پیدایش پرمیشور کے منہ کچھ کی اُس کے ہاتھ اور کچھ کی اُس کے پاؤں سے تسلیم کیجاتی تھی، اس عقیدہ کی وجہ سے ایسی مختلف جنسون میں بٹ گئی تھی جنکو کسی طرح متفق نہین کرسکتے تھے! ور اس طرح مساواتِ انسانی کی دولت دنیا سے گم ہوگئی تھی، اور زمین قومون اور ذاتون کے ظلم وجبر اور غرور وفخر کا دنگل بنگئی تھی توحید نے آکر اس اونچائی نیچائی بلندی وپستی اور نشیب فراز کو برابر کیا اب انسان خدا کے بندے اُسکے سامنے برابر سب باہم بھائی بھائی اور سب حقوق کے لحاظ سے یکسان قرار پائے، ان تعلیمات نے دنیا کی معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی اصلاحات مین جو کام کیا، اس کے نتائج تاریخ کے صفحون میں ثبت ہین،

بالآخر اس اصول کی صداقت کو انھون نے بھی تسلیم کرلیا، جو حقیقی توحید سے ناآشنا ہین، اور اسی لیے وہ مساواتِ انسانی کے حقیقی کوچہ سے بھی ابتک نابلد ہیں، انتہا یہ ہے کہ خدا کے گھر میں جاکر بھی تفاوتِ درجہ کا خیال اُن کے دل سے دور نہیں ہوتا، اور وہ دولت وفقر اور رنگ وقومیت کے امتیازات کو خدا کے سامنے سرنگون ہوکر بھی نہیں بھولتے، مسلمانون کو تیرہ سو برس سے مساوات کی نعمت اسی توحید کامل کی بدولت حاصل ہے اور وہ ہر قسم کے مصنوعی امتیازات سے پاک ہیں اسلام کی نظر مین سب ایک خدا کے بندے ہیں اور سب یکسان اسکے سامنے سرافگندہ ہیں دولت وفقر رنگ روپ اور نسل وقومیت کا کوئی امتیاز ان کو منقسم نہین کرتا اگر کوئی امتیاز ہے تو صرف تقوی اور خدا کی فرمانبرداری کا ہے،

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ	تم مین خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا ہے
(حجرات - ۲)	وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے تقوی کرتا ہے،

خدا کا ڈر اور پیار | اس سلسلہ میں ایک اور اہم مسئلہ خدا سے ڈرنے اور اُس سے محبت کرنیکا ہے،

عام طور سے مخالفون نے یہ سمجھا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس خدا کی تعلیم دی ہے وہ فقط قہار، جبار اور مہیب شہنشاہ مطلق ہے جس کی ہیبت و جلال سے تمام بندون کو صرف ڈرتے اور کانپتے رہنا چاہیئے اس کے گوشۂ چشم مین لطف و عنایت کا گذر نہیں محبت اور پیار کا اندرانہ اُس کے دربار مین قبول نہیں ہوتا، وہ اپنے کمزور بندون پر نہ خود محبت کی نظر رکھتا ہے، اور نہ بندون سے اپنی محبت کا تقاضا کرتا ہے لیکن درحقیقت یہ تعلیم محمدیؐ کی بالکل غلط تصویر ہے اللہ تعالیٰ کے جو اسما و صفات اوپر گذر چکے ہین، ان میں سے ایک ایک پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ اس کے چند پُر جلال نامون کو چھوڑ کر جو اس کی قدرتِ تامہ اور مالکیتِ عامہ کی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں بقیہ تمام نام صرف محبت اور پیار، لطف اور کرم رحمت اور مہر کی تجلی گاہ ہیں، مخالفون کو اس حقیقت کے سمجھنے مین دو وجہون سے مغالطہ ہوا،

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے خوف اور خشیت کی بھی انسانوں کو دعوت دی،

۲۔ دوسرے مذہبون نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کے اظہار کی جو اصطلاحین مقرر کی تھین آپ نے شدت کے ساتھ اُن کی مخالفت کی، اور اُن کو شرک قرار دیا،

محبت کے ساتھ خوف و خشیت کی تعلیم یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم میں خدا کی محبت اور پیار کیساتھ اس کے خوف و خشیت کو بھی جگہ دی ہے غور کرو انسانون میں تمام کامون کے محرک دو ہی جذبے ہوتے ہیں، خوف اور محبت، یہ دونون جذبے الگ الگ بھی پائے جاتے ہین، اور ایک ساتھ یا آگے پیچھے بھی، ان دونون جذبات کے لوازم بھی الگ الگ ہوتے ہیں، ادعائے محبت کا نتیجہ ناز تبختر اور کبھی گستاخی، اور کبھی اپنے مہربان و محبوب پر غایتِ اعتماد کی بنا پر نافرمانی بھی ہے اور ظاہر ہے کہ جذبہ محبت کے ان لوازم اور اثرات کا انسداد صرف خوف کے جذبہ سے ہوسکتا ہے اسلیئے خالق و مخلوق

کے درمیانی رابطہ کی تکمیل نہ تنہا خوف سے ہوسکتی ہے اور تنہا محبت سے، بلکہ ان دونوں کے اشتراک امتزاج اور اعتدال سے یہ مقصد حاصل ہوسکتا ہے، اور یہی نبوتِ محمدیؐ کی تعلیم ہے،

اسلام سے پہلے جو آسمانی مذاہب موجود تھے اُن کے اندر اس مسئلہ میں بھی افراط و تفریط پیدا ہوگئی تھی، اور صراط مستقیم سے وہ تمامتر ہٹ گئے تھے، یہودی مذہب کی بنا سراپا خوف و خشیت اور سخت گیری پر تھی، اس کا "خدا فوجوں کا سپہ سالار[1]"، اور "باپ کا بدلہ پشتہا پشت تک بیٹوں سے لینے والا تھا"[2] حالانکہ یہودیت کے صحیفوں میں خدا کے رحم و کرم اور محبت و شفقت کا ذکر کہیں کہیں موجود ہے[3]، اس کے برعکس عیسائیت زیادہ تر خدا کے رحم و کرم اور محبت شفقت کے تذکروں سے معمور تھی گو ایسا نہیں ہے کہ اس میں خدا کے خوف و خشیت کی مطلق تعلیم نہ ہو، بلکہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنے کی تاکید ہے[4]، مگر دونوں مذہبوں کے پیرؤں نے ان دو متقابل تعلیموں کے درمیان اعتدال ملحوظ نہیں رکھا تھا، اسلام نے اسی نقطۂ اعتدال کو پیش نظر رکھا ہے وہ نہ تو خدا کو محض جبار قہار، ربّ الافواج اور صرف بنی اسرائیل یا بنی اسمٰعیل کا خدا مانتا ہے، نہ اس کو مجسم انسان، انسانوں کا باپ یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا باپ سمجھتا ہے، اور نہ تنہا رحم و کرم اور محبت و شفقت کے صفات سے اس کو متصف کرتا ہے، بلکہ وہ خدا کی نسبت یقین رکھتا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر قاہر بھی ہے، اور رحمٰن و کریم بھی، وہ منتقم اور شدید العقاب بھی ہے اور غفور و رحیم بھی، وہ اپنے بندوں کو سزا بھی دیتا ہے اور پیار بھی کرتا ہے، خفا بھی ہوتا ہے اور نوازتا بھی ہے، اس سے ڈرنا بھی چاہیئے اور اس سے محبت بھی کرنی چاہیئے،

---

[1] یرمیا ۳۲-۱۴-۱۵ وغیرہ [2] خروج ۲۰، ۵ و ۳۴، ۷، و استثنا ۵-۳۴ و ۹، ۱۵ وغیرہ [3] خروج ۲۰، ۶، و ۳۴، زبور ۵۰-۱۵- و ۱۰۳، ۸ وغیرہ میں خدا کے پیار اور رحم و کرم کا ذکر ہے، [4] لوقا کی انجیل ۱۲، ۵- اول پطرس ۱۷-۱ دوم قرنتیوں ۷، ۱- افسیون ۵-۲۱، الغرض خدا سے ڈرنے کی تعلیم عیسائیت میں بھی دی گئی ہے،

أُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ، وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۚ إِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ،

(اعراف - ۷)

(لوگو!) اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارا کرو، وہ حد سے بڑھ جانے والوں کو پیار نہیں کرتا، اور زمین کی درستی کے بعد اس میں فساد نہ پھیلاؤ، اور اس کو (اس کے عذاب سے) ڈرتے ہوئے اور (اس کے فضل وکرم کی) لگاتے ہوئے پکارا کرو، بیشک خدا کی رحمت اچھے کام کرنیوالوں کے (قریب ہے)

چند نیک بندوں کی مدح میں فرمایا،

إِنَّهُمْ كَانُوْا يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ، (انبیاء)

وہ نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے تھے، اور ہم کو امید اور ڈر کے ساتھ پکارتے تھے،

اس سے زیادہ پُرلطف بات یہ ہے کہ اسلام خدا سے لوگوں کو ڈراتا تو ہے، مگر اس کو جبّار وقہّار کہکر نہیں، بلکہ مہربان اور رحیم کہکر، چنانچہ خدا کے سعید بندوں کی صفت یہ ہے کہ

وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ، (یٰسٓ - ۱)

اور رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا،

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ (ق - ۳)

جو رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا،

نہ صرف انسان بلکہ تمام کائنات کی زبان اس مہربان کے جلال کے سامنے گنگ ہے،

وَخَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ (طٰہٰ)

اور رحم والے کے ادب سے تمام آوازیں پست ہو گئیں

دنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے، وہ دو قسم کے تھے ایک وہ جن کی آنکھوں کے سامنے صرف خدا کے جلال وکبریائی کا جلوہ تھا، اس لئے وہ صرف خدا کے خوف وخشیت کی تعلیم دیتے تھے مثلاً حضرت

نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ، دوسرے وہ جو محبت الٰہی میں سرشار تھے، اور وہ لوگون کو اسی خمخانۂ عشق کی طرف بلاتے تھے، مثلاً حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ،

لیکن پیغمبرون میں ایک ایسی ہستی بھی آئی، جوان دونون صفتوں کی برزخ کبریٰ جلال وجمال دونون کا مظہر، اور پیار اور ادب دونون کی جامع تھی، یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ایک طرف آپ کی آنکھیں خوفِ الٰہی سے اشک بار رہتی تھیں، اور دوسری طرف آپ کا دل خدا کی محبت اور رحم وکرم کے سرور سے سرشار رہتا تھا، کبھی ایسا ہوتا کہ ایک ہی وقت میں یہ دونوں منظر آپکے چہرۂ انور پر لوگون کو نظر آجاتے تھے، چنانچہ جب راتون کو آپ شوق وولولہ کے عالم مین نماز کے لئے کھڑے ہوتے، قرآن مجید کی لمبی لمبی سورتین زبان مبارک پر ہوتین، اور ہر معنی کی آیتیں گذرتی جاتین تو جب کوئی خوف وخشیت کی آیت آتی، آپ پناہ مانگتے، اورجب کوئی مہر ومحبت اور رحم وبشارت کی آیت ہوتی تو اُس کے حصول کی دعا کرتے تھے،[1]

الغرض اسلام کا نصب العین یہ ہے کہ وہ خوف اور محبت کے کنارون سے ہٹاکر جہان سے ہر وقت نیچے گرنے کا خطرہ ہے، خوف وخشیت اور رحم ومحبت کے بیچ کی شاہراہ میں انسانوں کو کھڑا کرے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ الایمان بین الخوف والرجاء ایمانِ کامل، خوف اور امید کے درمیان ہے، کہ تنہا خوف لوگون کو خدا کے رحم وکرم سے ناامید، اورمحض رحم وکرم پر بھروسہ اُن کو خودسر اور گستاخ بنا دیتا ہے، جیسا کہ اس عملی دنیا کے روزانہ کے کاروبار میں نظر آتا ہے اور مذہبی حیثیت سے اس کے نتائج کا مشاہدہ عملاً یہودیون اور عیسائیوں مین کیا جاسکتا ہے، اسی لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۶ ص ۹۲،

تعلیم میں ان دونوں متضاد کیفیتوں کو ایمان اور عقیدہ کے رو سے برابر کا درجہ دیا لیکن ساتھ ہی عاجز درماندہ انسانوں کو یہ بھی بشارت سنائی کہ خدا کی رحمت کا دائرہ اُس کے غضب کے دائرہ سے زیادہ وسیع ہے، فرمایا،

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف ۱۹) — اور میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہوئے ہی،

اور اُس کی تفسیر خود صاحبِ قرآن علیہ السلام نے ان الفاظ میں کی،

رَحْمَتِي سَبَقَتْ غَضَبِي (بخاری) — میرے غضب سے میری رحمت آگے بڑھ گئی ہی،

عیسائیوں نے خدا سے اپنا رشتہ جوڑا، اور اپنے کو "فرزندِ الٰہی" کا لقب دیا، بعض یہودی فرقوں نے بنی اسرائیل کو خدا کا خانوادہ اور محبوب ٹھہرایا، اور حضرت عیسیٰؑ کے جوڑ پر حضرت عزیرؑ کو فرزندِ الٰہی کا رتبہ دیا، لیکن اسلام یہ شرف کسی مخصوص خاندان، یا خاص قوم کو عطا نہیں کرتا، بلکہ وہ تمام انسانوں کو بندگی، اور اطاعت کی ایک سطح پر لا کر کھڑا کرتا ہے، مسلمانوں کے مقابلہ میں یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کو دعویٰ تھا،

نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ (مائدہ ۳) — ہم خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں،

قرآن مجید نے اُس کے جواب میں کہا،

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِمَّنْ خَلَقَ (مائدہ ۳) — اگر ایسا ہی تو خدا تمہارے گناہوں کے بدلے تمکو عذاب کیوں دیتا ہی (اس لئے تمہارا دعویٰ صحیح نہیں) بلکہ تم بھی انہی انسانوں میں سے ہو جنکو اس نے پیدا کیا،

دوسری جگہ قرآن نے تنہا یہودیوں کے جواب میں کہا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا إِنْ زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ — اے وہ جو یہودی ہو اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو

اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا	کہ تمام انسانون کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے خاص چہیتے ہو
الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (جمعہ-۱)	تو موت (یعنی خدا کی ملاقات) کی تمنا کیون نہین کرتے

اسلام رحمتِ الٰہی کے دائرہ کو کسی خاندان اور قوم تک محدود نہین رکھتا، بلکہ وہ اس کی وسعت میں انسانون کی ہر برادری کو داخل کرتا ہے، ایک شخص نے مسجد نبوی میں آکر دعا کی کہ خدایا مجھکو اور محمدؐ کو مغفرت عطا کر" آپ نے عطا خدا کی وسیع رحمت کو تم نے تنگ کر دیا۔[۱] ایک اور اعرابی نے مسجد مین دعا مانگی کہ "خدایا مجھ پر اور محمد پر رحمت بھیج، اور ہماری رحمت میں کسی کو شریک نہ کر" آپنے صحابہ کی طرف خطاب کرکے فرمایا، یہ زیادہ گمراہ ہے یا اس کا اونٹ۔[۲]"

محبت کے جسمانی اصطلاحات کی ممانعت

اس مسئلہ میں تعلیم محمدی کے متعلق غلط فہمی کا دوسرا سبب جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، یہ ہے کہ بعض مذاہب نے خدا کی محبت و کرم کی تعبیر کے لیئے جو مادی اور جسمانی اصطلاحین قائم کی تھیں، اسلام نے اُن کی مخالفت کی، اور اُن کو شرک قرار دیا، اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا، کہ اسلام کا خدا رحم و کرم اور محبت اور پیار کے اوصاف سے معرّا ہے،

اصل یہ ہے کہ انسان دوسرے غیر مادی خیالات کی طرح خدا اور بندہ کے باہمی مہر و محبت کے جذبات کو بھی اپنی ہی انسانی بول چال مین ادا کر سکتا ہے، محبت اور پیار کے جذبات انسانون کے اندر باہمی مادی اور جسمانی رشتون کے ذریعہ سے نمایان ہوتے ہیں، اس بناپر بعض مذاہب نے اس طریقۂ ادا کو خالق و مخلوق کے ربط و تعلق کے اظہار کے لئے بھی بہترین اسلوب سمجھا چنانچہ کسی نے خالق، اور مخلوق کے درمیان باپ اور بیٹے کا تعلق پیدا کیا، جیسا کہ عیسائیون مین ہے، دوسرے نے ماں کی محبت

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الادب، [۲] ابو داؤد کتاب الادب،

کا بڑا درجہ سمجھا، اس تعلق اس تعلق کو ماں اور بیٹے کی اصطلاح سے واضح کیا اور دیبیاں انسانوں کی مائیں
بنیں، جیسا کہ ہندوؤں کا عام مذہبی تخیل ہے، خاص ہندوستان کی خاک میں زن و شو کی باہمی محبت کا
امتیازی خاصہ ہے، جس کی نظیر دوسرے ملکوں میں نہیں مل سکتی ہے، اسکی نگاہ میں محبت کا اس سے زیادہ
پُراثر منظر اور ناقابلِ شکست پیمان کوئی دوسرا نہیں، اس لیئے یہاں کے بعض فرقوں میں خالق و
مخلوق کی باہمی محبت کے تعلق کو زن و شو کی اصطلاح سے ادا کیا گیا، سدا سہاگ فقرا اس تخیل کی مضحکہ انگیز تصویر ہیں،
یہ تمام فرقے جنھوں نے خدا اور بندہ کے تعلق کو جسمانی اور مادی رشتوں کے ذریعہ ادا کرنا چاہا،
راہ سے بے راہ ہو گئے، اور لفظ کے ظاہری استعمال نے نہ صرف اُن کو عوام بلکہ خواص تک کو گمراہ
کر دیا، جو لفظ کی اصلی روح کو چھوڑ کر جسمانیت کے ظاہری مغالطوں میں گرفتار ہو گئے، عیسائیوں نے واقعی
حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا سمجھ لیا، ہندوستان کے بیٹوں نے ماتاؤں کی پوجا شروع کر دی، سدا سہاگ فقیروں
نے چوڑیاں اور ساڑیاں پہن لیں، اور خدائے قادر سے شوخیاں کرنے لگے، اسی لیئے اسلام نے جو توحید
خالص کا مبلغ تھا، ان جسمانی اصطلاحات کی سخت مخالفت کی، اور خدا کے لیئے ان الفاظ کا استعمال
ضلالت اور گمراہی قرار دیا، لیکن وہ ان الفاظ کے اصلی معنی اور منشار کا اور اس مجاز کے پردہ میں جو حقیقت
مستور ہے اس کا انکار نہیں کرتا، بلکہ وہ ان جسمانی معنوں کو خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و
تعلق کے اظہار کے لیئے ناکافی اور غیر مکمل سمجھتا ہے، اور وہ اُن سے زیادہ وسیع و کامل معنی کا طالب ہے،

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا، (بقرہ ۔ ۲۵)	تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو،

دیکھو کہ باپ کی طرح کی محبت کو وہ اپنے پروردگار کی محبت کے لیئے ناکافی قرار دیتا ہے اور

عبد و معبود کے درمیان محبت کے رشتہ کو اس سے کہیں زیادہ مضبوط و استوار ظاہر کرنا چاہتا ہے
الغرض رحم و محبت کے اس جسمانی طریقۂ تعبیر کی مخالفت سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسلام سرے
سے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے درمیان محبت اور پیار کے جذبات سے خالی ہے آنا کون
نہیں سمجھتا کہ مذہب کی تعلیمات انسانوں کی بولی میں اتری ہیں انسانوں کے تمام خیالات اور
تصورات اسی مادی اور جسمانی ماحول کا عکس ہیں، اسلیئے اُن کے ذہن میں کوئی غیر مادی اور غیر جسمانی
تصور کسی مادی اور جسمانی تصور کی وساطت کے بغیر براہ راست پیدا نہیں ہو سکتا، اور نہ اُس کیلیے انکے
لغت میں کوئی ایسا لفظ مل سکتا ہے جو کسی غیر مادی اور غیر جسمانی مفہوم کو اس قدر منزہ اور بلند طریقہ سے بیان
کرے جس میں مادیت اور جسمانیت کا مطلق شائبہ نہ ہو انسان ان دیکھی چیزوں کا تصور صرف دیکھی ہوئی
چیزوں کی تشبیہ سے پیدا کرتا ہے اور اس طرح اُن اَن دیکھی چیزوں کا ایک دھندلا سا عکس ذہن کے آئینہ میں اُتر جاتا ہے،
اس ان دیکھی ہستی کی ذات و صفات کے متعلق جس کو خدا کہتے ہو ہر مذہب میں ایک تخیل ہے غور سے
دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ تخیل بھی اس مذہب کے پیروؤں کے گرد و پیش کی اشیاء سے ماخوذ ہے، لیکن ایک
بلند تر اور کامل تر مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ اس تخیل کو مادیت جسمانیت اور انسانیت کی آلایشوں
سے اس حد تک پاک و منزہ کردے، جہاں تک بنی نوع انسان کیلیئے ممکن ہے، خدا کے متعلق باپ ماں
اور شوہر کا تخیل اس درجہ مادی اور جسمانی اور انسانی ہے کہ اس تخیل کے معتقد کے لیئے ناممکن ہے کہ وہ
خالص توحید کے صراطِ مستقیم پر قائم رہ سکے، اسی لیے نبوتِ محمدی نے ان مادی تعلقات اور جسمانی رشتوں
کے ظاہر کرنے والے الفاظ کو خالق و مخلوق کے اظہارِ ربط و تعلق کے باب میں یک قلم ترک کر دیا بلکہ انکا
استعمال بھی شرک قرار دیا تاہم چونکہ روحانی حقائق کا اظہار بھی انسانوں ہی کی مادی بولی میں کرنا

تھا، اس لیئے جسمانی و مادی رشتہ کے بجائے جس کو دوسری مذاہب نے منتخب کیا تھا اس رشتہ کو محض جذبات
احساسات اور عواطف کو خالق و مخلوق کے تعلقات باہمی کے اظہار کے لیئے اسلام نے مستعار لیا،
اس طرح خالق و مخلوق کے درمیان کوئی جسمانی رشتہ قائم کیئے بغیر اُس نے ربط و تعلق کا اظہار کیا، اور
استعمالات کی لفظی غلطی سے جو گمراہیان پہلے پیش آچکی تھیں، اُن سے انسانون کو محفوظ رکھا،

ہر زبان مین اس خالق ہستی کی ذات کی تعبیر کے لیئے کچھ نہ کچھ الفاظ ہیں جن کو کسی خاص تخیل
اور نصب العین کی بنا پر مختلف قومون نے اختیار کیا ہے اور گو انکی حیثیت اب علم اور نام کی ہے تاہم وہ
درحقیقت پہلے پہل کسی نہ کسی وصف کو پیش نظر رکھکر استعمال کیئے گئے تھے، ہر قوم نے اُس علم اور نام کیلیئے
اسی وصف کو پسند کیا ہے جو اس کے نزدیک اس خالق ہستی کی سب سے بڑی اور سب سے ممتاز صفت ہو سکتی تھی

اسلام نے خالق کے لیئے جو نام اور علم اختیار کیا ہے، وہ لفظ اللہ ہے، اللہ کا لفظ اصل مین کس
لفظ سے نکلا ہے، اس مین اہل لغت کا یقیناً اختلاف ہے، مگر ایک گروہ کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہ ولاہ
سے نکلا ہے، اور ولہ کے اصلی معنی عربی مین اُس "غم محبت" اور "تعلق خاطر" کے ہیں، جو ماں کو اپنی اولاد
کے ساتھ ہوتا ہے، اسی سے بعد کو مطلق عشق و محبت کے معنی پیدا ہو گئے، اور اسی سے ہماری
زبان مین لفظ والہ (شیدا) مستعمل ہے، اس لیئے اللہ کے معنی "محبوب اور پیارے" کے ہیں، جس کے
عشق و محبت مین نہ صرف انسان بلکہ ساری کائنات کے دل سرگردان متحیر اور پریشان ہیں، حضرت
مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مرادآبادی قرآن مجید کی آیتون کے ترجمے اکثر ہندی مین فرمایا کرتے تھے
اللہ کا ترجمہ وہ ہندی میں "من موہن" یعنی "دلون کا محبوب" کہا کرتے تھے،

قرآن مجید کھولنے کے ساتھ ہی خدا کی جن فضیلتون پر پہلے نگاہ پڑتی ہے وہ "رحمان" اور "رحیم" ہیں

ان دونوں لفظوں کے تقریبا ایک ہی معنی ہیں، "رحم والا" "مہربان" "لطف وکرم والا" بسم اللہ الرحمن الرحیم (محبوب، مہربان، رحم والا) کے ضمن میں قرآن مجید کے ہر سورہ کے آغاز میں انہی صفات ربانی کے بار بار دہرانے کی تاکید کی گئی ہے، ہر نماز میں کئی کئی دفعہ اُن کی تکرار ہوتی ہے، کیا اس سے بڑھ بڑھکر اللہ تعالیٰ کے متعلق اسلام کے تخیل کو واضح کرنے کے لیے کوئی دلیل ہوسکتی ہے؟

لفظ اللہ کے بعد اسلام کی زبان میں خدا کا دوسرا عَلَم یہی لفظ "رحمٰن" ہے، جو رحم وکرم اور لطف ومہر کے معنی میں صفتِ مبالغہ کا صیغہ ہے،

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوا — اس کو "محبوب" (اللہ) کہو یا "مہربان" (رحمان)

فَلَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى، (بنی اسرائیل ۱۲) — کہو جو کہکر اُس کو پکارو، سب اچھے نام اسی کے ہیں،

قرآن مجید نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کی صدہا بار کی تکرار کے علاوہ خاص طور سے ۵۲ موقعوں پر خدا کو اس رحمان کے نام سے یاد کیا ہے،

ابھی اس سے پہلے باب میں اسمائے الٰہی کا ایک ایک نام تمھاری نظر سے گذر چکا ہے، ان ناموں میں اللہ تعالیٰ کے ہر قسم کے جلالی وجمالی اوصاف آگئے ہیں، استقصار کرو تو معلوم ہوگا کہ ان میں بڑی تعداد انہی ناموں کی ہے جن سے اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم اور مہر ومحبت کا اظہار ہوتا ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ایک نام یا ایک صفت اَلْوَدُوْدُ (سورۂ ذات البروج میں) آیا ہے جس کے معنی "محبوب" اور "پیارے" کے ہیں، کہ وہ سرتاپا مہر ومحبت اور عشق اور پیار ہے، اس کے سوا خدا کا ایک اور نام اَلْوَلِیّ ہے جس کے لفظی معنی "یار" اور "دوست" کے ہیں، خدا کا ایک اور نام جو قرآن مجید میں بار بار استعمال ہوا ہے اَلرَّءُوْف ہے، رءوف کا لفظ رافت سے نکلا ہے، رافت کے معنی اُس محبت اور تعلق خاطر کے ہیں

جو باپ کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے، اسی طرح خدا کا ایک اور نام حَنَّانٌ ہے۔ جو حَنَّ سے مشتق ہے؛ حَنَّ الحنین اس سوزِ دل اور محبت کو کہتے ہیں، جو ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے؛ یہ الفاظ ان مجازی اور مستعار معانی کو ظاہر کرتے ہیں، جو اسلام نے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لیئے اختیار کیئے ہیں، دیکھو کہ وہ ان رشتوں کا نام نہیں لیتا، لیکن اُن رشتون کے سبب سے محبت اور پیار کے جو خاص جذبات پیدا ہوتے ہیں، اُن کو خدا کے لیئے بے تکلف استعمال کرتا ہے اور اس طرح مادیت اور جسمانیت کا تخیل آئے بغیر وہ ان روحانی معنون کی تلقین کر رہا ہے؛

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ غَفَّارٌ (بخشش کرنے والا) اور غفور (بخشنے والا ہے) یعنی بندون کے گناہوں کو معاف کرنیوالا ہے، وہ سَلَامٌ (امن و سلامتی) ہے یعنی اپنے بے پناہ بندون کے لئے وہ سرتاپا امن و سلامتی ہے، وہ مُومِنٌ (امن دینے والا) ہے؛ وہ العَدْل ہے یعنی سرتاپا انصاف ہے، وہ الْعَفُوّ (معاف کرنے والا) ہے، الوَهَّابُ (عطا کرنے والا) ہے، الحکیم (بردبار) ہے، (الصَّبُوْرُ) (بندون کی گستاخیوں پر صبر کرنے والا) ہے، التوّابُ (بندون کے حال پر رجوع ہونے والا) ہے، البَرُّ (نیک اور مجسم خیر) ہے، اور المقسط (منصف اور عادل) ہے، ان میں سے ہر لفظ پر ٹھہر کر ذرا غور کرو کہ اسلام کا تخیل کس قدر بلند اور برتر ہے؛

توراۃ کے اسفار، انجیل کے صحائف اور وید کے حصص کا ایک ایک ورق پڑھ جاؤ کیا اللہ تعالیٰ کے لیئے ایسے پُرمحبت اور سراپا مہر و کرم، اسماء و صفات کی کثرت تم کو وہاں ملیگی؟ یہ سچ ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ کے لئے ماں اور باپ کا لفظ یہود و نصاریٰ اور ہنود کی طرح استعمال کرنا جائز نہیں سمجھتا مگر اس سے یہ قیاس کرنا غلطی ہے کہ وہ لطفِ احساس اور مہر و کرم کے جذبات دعوا طلف سے یکسر خالی ہے

جن کو یہ فرقے اپنا مخصوص سرمایہ سمجھتے ہین بات یہ ہو کہ اسلام ان روحانی جذبات اور معنوی احساسات
کے ساتھ شرک و کفر کی اُس ضلالت اور گمراہی سے بھی انسانون کو بچانا چاہتا ہی جو ذرا سی لفظی غلط فہمی
سے مجاز کو حقیقت اور استعارہ کو اصلیت سمجھ کر پاک اور سرتاپا روحانی معنون کو مادی اور مجسم یقین کر لیتے
ہیں اور اس طرح وہ توحید کی بلند ترین سطح سے بہت نیچے گر کر سر رشتہ حقیقت کو ہاتھ سے چھوڑ بیٹھتے ہین،
محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم ازل کا آخری پیغام لیکر آئے تھے، اس لئے ضرورت تھی کہ
آپ کی تعلیم اس قسم کی لغزشون سے پاک اور مبرا ہو، روحانی حقائق کی تعبیر کے لیے جیسا کہ پہلے کہا
جا چکا، یقیناً مادی اور جسمانی استعارات و مجازات سے چارہ نہیں، تاہم ایک دائمی تعلیم کا فرض
تھا کہ وہ اپنے کو استعمالات کی غلطیون اور مجازات کی غلط فہمیون سے محفوظ رکھتی، چنانچہ اسلام
نے اسی بنا پر ان استعارات و مجازات کے استعمال میں بڑی احتیاط برتی ہی، اور خدا کے حرم
کرم اور عشق و محبت کے تذکرون کے ساتھ ادب و لحاظ کے قواعد کو فراموش نہین کیا ہی، قرآن مجید
اور احادیث روحانی عشق و محبت کے ان دلآویز اور ولولہ انگیز حکایات سے معمور ہین، باایں ہمہ اسلام انسان
کو بیٹا اور خدا کو (باپ) نہین کہتا کہ عبد و معبود کے تعلقات کے اظہار کیلئے اُسکے نزدیک یہ کوئی بلند تر تعبیر نہین، وہ
خدا کو اَب (باپ کے) بجائے "رَبّ" کہکر پکارتا ہی، وہ اُس کو تمام دنیا کا باپ نہین بلکہ تمام دنیا کا رب کہتا ہی
(اَب اور رَبّ" ان دونون لفظوں کا باہمی معنوی مقابلہ کرو تو معلوم ہوگا کہ عیسائیون
اور یہودیون کا تخیل، اسلام کے مطمح نظر سے کس درجہ پست ہی، اَب یعنی باپ کا تعلق اپنے بیٹے سے ایک
خاص حالت کی بنا پر ایک خاص لحظہ مین قائم ہوتا ہی، اور پھر اس کی حیثیت بدل کر، پرورش، اور
حفاظت کی صورت مین بچپنا کے ایک محدود عرصہ تک قائم رہتا ہی اس طرح گو باپ کو بیٹے کے وجود

میں یک گونہ تعلق ضرور ہوتا ہے اگرچہ یہ تعلق حد درجہ ناقص، محدود اور آنی ہوتا ہے بیٹے کے وجود، قیام و بقا، ضروریاتِ زندگی، سامانِ حیات، نشو و نما، اور ارتقا کسی چیز میں باپ کی ضرورت نہیں ہوتی وہ اپنے باپ سے الگ مستقل اور بے نیاز زندگی بسر کرتا ہے مگر ذرا غور کرو کیا عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان جو ربط و تعلق ہے اس کا انقطاع کسی وقت ممکن ہے، کیا بندہ اپنے خدا سے ایک دم اور ایک لمحہ کیلئے بھی بے نیاز اور مستغنی ہو سکتا ہے، کیا یہ تعلق باپ اور بیٹے کے تعلق کی طرح محدود اور مخصوص الاوقات ہے

ربوبیت (پرورش) عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان اس تعلق کا نام ہے جو آغاز سے انجام تک پیدائش سے وفات تک بلکہ وفات کے بعد سے ابد تک قائم رہتا ہے، جو ایک لمحہ کے لئے منقطع نہیں ہو سکتا جس کے بل اور سہارے پر دنیا اور دنیا کی مخلوقات کا وجود ہے وہ گہوارۂ عدم سے لیکر فنائے محض کی منزل تک ہر قدم پر ہر موجود کا ہاتھ تھامے رہتا ہے انسان ذرہ ہو یا بصورتِ غذا، قطرۂ آب ہو یا قطرۂ خون، مضغۂ گوشت ہو یا مشتِ استخوان شکم مادر میں ہو یا اس سے باہر بچہ ہو یا جوان ادھیڑ ہو یا بوڑھا کوئی آن، کوئی لمحہ رب کے مہر و کرم اور لطف و محبت سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتا

علاوہ ازیں باپ اور بیٹے کے الفاظ سے مادیت جسمانیت ہم جنسی اور برابری کا جو تخیل پیدا ہوتا ہے، اس سے لفظ رب یک قلم پاک ہے اور اس میں ان ضلالتوں اور گمراہیوں کا خطرہ نہیں جن میں نصرانیت اور ہندویت نے ایک عالم کو مبتلا کر رکھا ہے،

اب ان آیتوں اور حدیثوں کو دیکھو جن سے یہ روشن ہوتا ہے کہ اسلام کا سینہ اس ازلی و ابدی عشق و محبت کے نور سے کس درجہ معمور ہے اور وہ خمخانہ الست کی سرشاری کی یاد بھکے ہوئے انسانوں کو کس کس طرح دلا رہا ہے اسلام کا سب سے پہلا حکم ایمان ہے، ایمان کی سب سے بڑی خاصیت

اور علامتِ حُبِّ الٰہی ہے، اور یہ وہ دولت ہے جو اہلِ ایمان کی پہلی جماعت کو عملاً نصیب ہو چکی تھی، زبان
الٰہی نے شہادت دی،

وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (بقرہ ۲۰)	اور جو ایمان لائے وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت ؟

اس نشۂ محبت پر باپ، ماں، اولاد، بھائی، بیوی، جان، مال، خاندان، سب کو قربان
اور نثار ہو جانا چاہیے، ارشاد ہوتا ہے،

اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (توبہ ۳)	اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ دولت جو تم نے کمائی ہے اور وہ سوداگری جس کے مندا پڑ جانے کا تم کو اندیشہ ہے اور وہ مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو خدا اور اس کے رسول اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے سے تم کو زیادہ محبوب اور پیارے ہیں، تو اس وقت تک

ایمان کے بعد بھی اگر نشۂ محبت کی سرشاری نہیں ملی، تو وہ بھی جادۂ حق سے دوری ہے
چنانچہ جو لوگ راہِ حق سے بھٹکنا چاہتے تھے، اُن کو پکار کر سنا دیا گیا،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ، (مائدہ ۸)	مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین (اسلام) سے پھر جائیگا تو خدا کو اس کی کچھ پروا نہیں، وہ ایسے لوگوں کو لا کر کھڑا کریگا جن کو وہ پیار کریگا اور وہ

حضرت مسیحؑ نے کہا درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، ہر معنوی اور روحانی حقیقت ظاہری

آثار اور جسمانی علامات سے پہچانی جاتی ہے، تم کو زید کی محبت کا دعوی ہے، مگر نہ تمہارے دل میں اس کے دیدار کی تڑپ ہے، نہ تمہارے سینہ میں صدمۂ فراق کی جلن ہے، اور نہ آنکھوں میں ہجر و جدائی کے آنسو ہیں، تو کون تمہارے دعوی کی تصدیق کرے گا، اسی طرح خدا کی محبت اور پیار کے دعویدار تو بہتیرے ہو سکتے ہیں، مگر اس غیر محسوس کیفیت کی مادی نشانیاں اور ظاہری علامتیں اُس کے احکام کی پیروی اور اُس کے رسول کی اطاعت ہے، خدا کے رسول کو اس اعلان کا حکم ہے؛

إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ	اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میری پیروی کرو
يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ، (آل عمران ۴)	کہ خدا بھی تم کو پیار کرے گا،

محبّت کیونکر حاصل ہو، وحیِ محمدیؐ نے اس رتبۂ بلند کے حصول کی تدبیر بھی بتادی فرمایا؛

إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے، رحمت
سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (مریم ۶)	والا خدا، اُن کے لئے محبّت پیدا کرے گا،

اس آیت میں محبّت کے حصول کے دو ذریعے بتائے گئے ہیں، ایمان اور عملِ صالح یعنی نیک کام، چنانچہ طبقاتِ انسانی میں متعدد ایسے گروہ ہیں، جن کو ان ذریعوں سے خدا کی محبت اور پیار کی دولت ملی ہے،

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (مائدہ ۲ بقرہ ۲۴)	خدا نیکی کرنے والوں کو پیار کرتا ہے،
إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ، (بقرہ ۲۸)	خدا توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے،
إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (آل عمران ۱۷)	خدا توکّل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے،
إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (مائدہ ۶ حجرات ۱)	خدا منصف مزاجوں کو پیار کرتا ہے

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ (توبہ ۱ و ۲)	خدا پرہیزگاروں کو پیار کرتا ہے،
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ	خدا اُن کو پیار کرتا ہے جو اُس کے
فِیْ سَبِیْلِہٖ (صف - ۱)	راستہ میں لڑتے ہیں،
وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ (آل عمران ۱۵)	اور خدا صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہی،
وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُطَّھِّرِیْنَ (توبہ ۱۳)	اور خدا پاک صاف لوگوں کو پیار کرتا ہی،

مسند احمد مین ہے کہ آپنے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تین قسم کے آدمیوں سی محبت کرتا ہی اور تین قسم کے آدمیون کو پیار نہیں کرتا، محبت اُن سی کرتا ہے جو اُس کی راہ مین خلوص نیت کیساتھ اپنی جان فدا کرتے ہین، اور اُن سے جو اپنے پڑوسی کے ظلم پر صبر کرتے ہیں، اور اُن سے جو وضو کرکے خدا کی یاد کے لیئے اُس وقت اٹھتے ہیں جب قافلہ رات کے سفر سے تھک کر آرام کیلئے بستر لگاتا ہی اور خدا کی محبت سی محروم یہ تین ہیں، اترانیوالا مغرور، احسان دھرنے والا بخیل، جھوٹی قسمیں کھا کھا کر مال بیچنے والا سوداگر،[1]

دنیا کے عیش و مسرت مین اگر کوئی خیال کانٹا سا چبھتا ہی اور ہمیشہ انسان کے عیش و سرور کو مکدر اور منغص بنا کر بے فکری کی بہشت کو فکر و غم کی جہنم بنا دیتا ہی تو وہ ماضی اور حال کی ناکامیون کی یاد اور مستقبل کی بے اطمینانی ہی پہلے کا نام حزن و غم اور دوسری کا خوف و دہشت ہی غرض غم اور خوف یہی دو کانٹے ہیں جو عاجز و درماندہ انسان کے پہلو مین ہمیشہ چبھتے رہے ہیں، لیکن جو محبوب حقیقی کے طلبگار اور اسکے والہ و شیدا ہین اُن کو بشارت ہی کہ اُن کے عیش کا چمن زار ان کانٹون سے پاک و صاف ہوگا،

---

[1] احمد بن حنبل مسند ابوذر جلد ۵ ۱۷۶،

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ ، (یونس -۷) ہان خدا کے دوستون کو نہ کوئی خوف ہواد نہ وہ غمگین ہون گے ،

محبت کا وہ جذبہ جو بڑے کو چھوٹے کے ساتھ احسان، نیکی، درگذر اور عفو و بخشش پر آمادہ کرتا ہی اُس کا نام "رحم" اور "رحمت" ہی، اسلام کا خدا تمام تر رحم ہی، اس کی رحمت کے فیض سے عرصہ کائنات کا ذرہ ذرہ سیراب ہی، اُس کا نام رحمٰن و رحیم ہی، جو کچھ یہان ہی سب اسکی رحمت کا ظہور ہی، وہ نہین تو کچھ نہین، اسی لیے اسکی رحمت سے "ناامیدی جرم اور مایوسی گناہ ہی" مجرم سے مجرم، اور گنہگار سے گنہگار کو وہ نوازنے کے لیے ہمہ وقت آمادہ و تیار رہتا ہے، گنہگارون اور مجرمون کو وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے میرے بندو! کہکر اُن کے پاس تسلی کا یہ پیام بھیجتا ہی،

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ ، اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ، (زمر - ۶) اے پیغمبر! میرے اُن بندون کو پیام پہنچادو جنھوں نے اپنی جانون پر ظلم کیا ہی کہ تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اللہ یقیناً تمام گناہوں کو بخش سکتا ہی، بیشک وہی بخشش کرنے والا اور رحم کھانیوالا ہی،

فرشتے حضرت ابراہیمؑ کو بشارت سناتے ہیں، تو کہتے ہیں،

فَلَا تَکُنْ مِّنَ الْقٰنِطِیْنَ (حجر) تم ناامید ہونے والوں میں سے نہ ہو،

خلیل اللہ اس رمز سے ناآشنا نہ تھے، کہ مرتبۂ خلت محبت سے مافوق ہی اس لیے جواب دیا،

وَمَنْ یَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَۃِ رَبِّہٖٓ اپنے پروردگار کی رحمت سے گمراہ لوگون کے

اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ، (حجر - ۴) سوا اور کون نا امید ہوتا ہے ؟

بندوں کی جانب سے خدا پر کوئی پابندی عائد نہیں، مگر اُس نے اپنی رحمت کے اقتضا سے اپنے اوپر خود کچھ چیزیں فرض کر لی ہیں، منجملہ اُن کے ایک رحمت بھی ہے، خدا مجرموں کو سزا دیسکتا ہے، گنہگاروں پر عذاب بھیج سکتا ہے، سیہ کاروں کو اُن کی گستاخیوں کا مزہ چکھا سکتا ہے، وہ غالب ہے، قاہر ہے، جبار ہے، منتقم ہے لیکن ان سب کے ساتھ وہ غفار و غفور بھی ہے رحمان و رحیم بھی، اور عفو و رؤف بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُس نے اپنے اوپر رحمت کی پابندی خود عائد کر لی ہے، اور اس کو اپنے اوپر فرض گردان لیا ہے،

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (انعام ۲) اللہ نے از خود اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے،

قاصدِ خاص کو حکم ہوتا ہے کہ ہمارے گنہگار بندوں کو ہماری طرف سے سلام پہنچا دو، اور تسلی کا یہ پیام دو کہ ہمارا بابِ رحمت ہر وقت کھلا ہے،

وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ	اے پیغمبر جب تیرے پاس وہ آئیں جو میری آیتوں
بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ	پر یقین رکھتے ہیں تو اُن سے کہہ کہ تم پر سلامتی ہو،
رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ	تمھارے پروردگار نے اپنے اوپر از خود اپنے بندوں
مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ	پر مہربان ہونا لازم کر لیا ہے کہ جو کوئی تم میں سے
ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ	براہ نادانی برائی کر بیٹھے، پھر اُس کے بعد
فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ،	بارگاہِ الٰہی کی طرف رجوع کرے، اور نیک
(انعام - ۶)	بنے، تو بیشک خدا بخشنے والا اور رحم کرنیوالا ہے،

قرآن کی تعلیم کے مطابق اس وسیع عرصۂ کائنات کا کوئی ذرہ اس سایۂ رحمت سے محروم نہیں،

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف۔۱۹) اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر لیا ہے،

بخاری و ترمذی وغیرہ کی صحیح حدیثوں مین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اس عالم کو پیدا کیا تو ازخود اپنے اوپر رحمت کی پابندی عائد کرلی، جامع ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ آپنے فرمایا "اگر مومن کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کے پاس کتنا عقاب ہے تو وہ جنت کی طمع نہ کرتا، اور اگر کافر کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کی رحمت کس قدر بے حساب ہے، تو وہ جنت سے مایوس نہ ہوتا" یہ اسلام کے تخیل کی صحیح تعبیر ہے بارگاہِ احدیت کا آخری قاصد اپنے دربار کی جانب سے گنہگاروں کو بشارت سناتا ہے کہ "اے آدم کے بیٹو! جب تک تم مجھے پکارتے رہوگے، اور مجھ سے آس لگائے رہوگے تمھین بخشتا رہونگا خواہ تم مین کتنے ہی عیب نہ ہون مجھے پروا نہین، اے آدم کے بیٹو! اگر تمھارے گناہ آسمان کے بادلوں تک بھی پہنچ جائین، اور پھر تم مجھ سے معافی مانگو تو مین معاف کردون خواہ تم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں، مجھے پروا نہیں، اے آدم کے بیٹو! اگر پوری سطح زمین بھی تمھارے گناہوں سے بھری ہو، پھر تم میرے پاس آؤ اس حال میں کہ کسی کو میرا شریک نہ بناتے ہو تو میں بھی تمھارے پاس پوری سطحِ زمین بھر مغفرت لیکر آدن[1]"، کیا انسانوں کے کانوں نے اس رحمت، اس محبت اس عفو عام کی بشارت کسی اور قاصد کی زبان سے بھی سُنی ہے؟

حضرت ابو ایوبؓ صحابی کی وفات کا وقت جب آیا، تو انھوں نے لوگوں سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "اگر تم لوگ گناہ نہ کرتے تو خدا اور کوئی مخلوق پیدا کرتا جو گناہ کرتی

[1] جامع ترمذی (ابواب الدعوات) و دیگر کتب احادیث (صحیح)

اور وہ اس کو بخشتا" یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنے رحم وکرم کے اظہار کے لئے گنہگاروں ہی کی تلاش ہے کہ نکوکاروں کو توسب ڈھونڈتے ہیں، مگر گنہگاروں کو صرف وہی ڈھونڈتا ہے،

دنیا میں انسانوں کے درمیان جو رحم وکرم اور مہر ومحبت کے عناصر پائے جاتے ہیں اور جن کی بنا پر دوستوں، عزیزوں، قرابتداروں اور اولادوں میں میل ملاپ اور رسم ومحبت ہے نیز جس کی بنا پر دنیا میں عشق ومحبت کے شاندار مناظر آتے ہیں، تم کو معلوم ہے کہ یہ اس شاہد حقیقی کے سرمایۂ محبت کا کونسا حصہ ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصے کئے اُن میں سے ایک حصہ اپنی مخلوقات کو عطا کیا جس کے اثر سے لوگ ایک دوسرے پر باہم رحم کیا کرتے ہیں، باقی ننانوے ۹۹ حصے خدا کے پاس ہیں[۲]، اس لطف وکرم اور مہر ومحبت کی بشارتیں کس مذہب نے انسانوں کو سنائی ہیں، اور کس نے گنہگار انسانوں کے مضطرب قلوب کو اس طرح تسلی دی ہے؟ صحیح بخاری میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک شخص شراب خوری کے جرم میں بار بار گرفتار ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا صحابہ نے تنگ آکر کہا خداوندا تو اپنی لعنت اس پر نازل کر کہ یہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے" رحمۃ للعالمین کو لوگوں کی یہ بات ناپسند آئی فرمایا "اس پر لعنت نہ کرو کہ اس کو خدا اور رسول سے محبت ہے[۳]" تم نے دیکھا کہ اسلام نے گنہگاروں کے لئے خدا کی محبت کا دروازہ کس طرح کھول رکھا ہے،!

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اُن عربوں کو جو خدا کی محبت کیا خدا کی معرفت سے بھی

---

[۱] مسند ابن حنبل جلد ۵ ص ۴۴۱ [۲] بخاری کتاب الادب باب صفحہ ۸۸۰، [۳] بخاری کتاب الحدود باب ما یکرہ من لعن شارب الخمر، صفحہ ۱۰۰۲،

ناآشنا تھے، کس طرح آشنائے حقیقت کردیا، اور اُن کو ذاتِ الٰہی کیساتھ وابستگی، محبت اور سرشاری کے لطف سے کس درجہ بہرہ اندوز کردیا، بلال رض کو دیکھو، ٹھیک دوپہر کے وقت عرب کی جلتی ہوئی ریت پر اُن کو لٹایا جاتا ہے، ایک گرم پتھر سینہ پر رکھا جاتا ہے، اور خدائے واحد سے انحراف کیلئے اُن کو مجبور کیا جاتا ہے، وہ یہ سب تکلیفیں اٹھاتے ہیں، مگر زبان سے وہی احد احد (ایک ایک) کا ترانہ[1] نکلتا ہے، مکہ کا ذرہ ذرہ صدائے حق کا دشمن ہے، ابوذر غفاری رض یہ جان کر بھی صحن کعبہ میں جوشِ وحدت سے سرشار ہو کر کلمۂ توحید کا آواز بلند اعلان کرتے ہیں، ہر طرف سے پتھروں اور ہڈیوں کی بارش ہوتی ہے، بعض لوگ آکر چھوڑا دیتے ہیں لیکن جب دوسری صبح نمودار ہوتی ہے، تو پھر محبتِ الٰہی کے کیف و مستی کا وہی عالم نظر آتا ہے، اور مشرکین کی طرف سے وہی سزا ملتی ہے[2]،

ایک صحابی جو رات کو میدانِ جنگ میں ایک پہاڑ پر پہرہ دینے کے لئے متعین تھے، وہ اپنی نیند ٹالنے کے لئے خدا کی یاد میں مصروف ہوتے ہیں، دشمن پے درپے تین دفعہ تیر مارتا ہے جو بدن میں پیوست ہو جاتا ہے، اور وہ بدستور نماز میں محو رہتے ہیں، اُن کے ساتھی پوچھتے ہیں کہ تم نے نماز کیوں نہیں توڑی، کہتے ہیں، کہ جو سورہ شروع کی تھی جی نہ چاہا کہ اس کو تمام کئے بغیر چھوڑ دوں[3]،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو جانشین عینِ حالتِ نماز میں زخم کھا کر گرتے ہیں مگر مقتدیوں کی صف اس حیّ و باقی کے سامنے کھڑی ہو کر، ہر فانی و میّت ہستی کی محبت سے بے نیاز رہتی ہے۔ اسی لئے خدا نے بشارت دی کہ وہ خدا کے محبوب اور خدا اُن کا محبوب ہے یعنی رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ذکر عدوان المشرکین و اسد الغابہ جلد ا ص ۲۰۶ مصر [2] طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت ابوذر غفاری رض [3] صحیح بخاری و سنن ابی داؤد، کتاب الطہارۃ باب الوضوء من الدم،

مدینہ میں ایک اللہ والے مسلمان نے وفات پائی، اس کا جنازہ اٹھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کے ساتھ نرمی کرو کہ اللہ نے بھی اس کیساتھ نرمی کی ہی کیونکہ اس کو اللہ اور اس کے رسول سے محبت تھی، قبر کھودی جانے لگی، تو فرمایا اس کی قبر کشادہ رکھو کہ خدا نے بھی اس کے ساتھ کشادگی فرمائی ہی، اس بار بار کے اہتمام کو دیکھ کر صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو اس مرنے والے کی موت کا غم ہی؟ فرمایا، ہاں! کیونکہ اس کو خدا اور رسول پیارے تھے[1] ایک دفعہ آپ نے ایک صحابہ کو کسی جماعت کا افسر بنا کر بھیجا: وہ جب نماز پڑھاتے تو ہر سورہ کے آخر میں قل ھو اللہ ضرور پڑھتے جب یہ جماعت سفر سے لوٹ کر آئی تو خدمت اقدس میں یہ واقعہ عرض کیا فرمایا ان سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ لوگوں نے پوچھا تو جواب دیا کہ میں اسلیئے کرتا ہوں کہ اس سورہ میں رحم والے خدا کی صفت کا بیان ہی تو مجھ کو اس کے پڑھنے سے محبت ہی، فرمایا ان کو بشارت دو کہ رحم والا خدا بھی ان سے محبت کرتا ہی[2]، یہ بشارت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک کے سوا کسی اور نے بھی سنائی ہی؟

صحیح بخاری اور مسلم میں متعدد طریقوں سے حضرت انس سے روایت ہی کہ ایک دفعہ ایک صحابی نے خدمت والا میں حاضر ہو کر دریافت کیا، کہ یا رسول اللہ! قیامت کب آئیگی، فرمایا تم نے اس کیلئے کیا سامان کر رکھا ہی، انھوں نے نادم ہو کر شکستہ دلی سے عرض کی کہ یا رسول اللہ! میرے پاس نہ تو نماز کا بڑا ذخیرہ ہے، نہ روزوں کا اور نہ صدقات و خیرات کا، جو کچھ سرمایہ ہے وہ صرف خدا اور رسول کی محبت ہے، اور بس: فرمایا تو انسان جس سے محبت کریگا اسی کیساتھ رہیگا، صحابہ نے

---

[1] ابن ماجہ کتاب الجنائز باب ما جاء فی حفر القبر [2] مسلم کتاب صلوٰۃ المسافرین و قصرہا باب فضل قرأۃ قل ہو اللہ احد و بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الجمع بین السورتین میں دوسری طرح مروی ہی اور اسمیں رسول اللہ صلعم کے الفاظ بھی دوسرے ہیں

اس بشارت کو سن کر اُس دن بڑی خوشی منائی۔[1]

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا جب خدا کسی بندہ کو چاہتا ہے، تو فرشتۂ خاص جبرئیل سے کہتا ہے کہ میں فلان بندہ کو پیار کرتا ہون، تم بھی اس کو پیار کرو تو جبرئیل بھی اس کو پیار کرتے ہین، اور آسمان والے بھی اس کو پیار کرتے ہین، اور پھر زمین مین اس کو ہر دلعزیزی اور حسن قبول بخشا جاتا ہے۔[2]

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو بندہ اپنی اطاعتون سے میری قربت کو تلاش کرتا رہتا ہے تو مین اُس سے محبت کرنے لگتا ہون یہانتک کہ میں اسکا کان بنجاتا ہون جس سے وہ سنتا ہے، اور اسکی آنکھ ہوجاتا ہون جس سے وہ دیکھتا ہے ہاتھ بنجاتا ہون جس سے وہ پکڑتا ہے، اور پاؤن بنجاتا ہون جس سے وہ چلتا ہے۔[3] یہ دولت، یہ نعمت یہ سعادت آستانۂ محمدی کے سوا کہیں اور نہیں ملتی،

امام بزار نے مسند مین حضرت ابو سعیدؓ سے روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ان لوگون کو پہچانتا ہوں جو نہ نبی ہیں اور نہ شہید ہیں لیکن قیامت مین اُن کے مرتبہ کی بلندی پر انبیا اور شہدا بھی رشک کرین گے، یہ وہ لوگ ہین جن کو خدا سے محبت ہے اور جن کو خدا پیار کرتا ہے وہ اچھی باتین بتاتے اور بری باتوں سے روکتے ہین۔[4] یہ قابلِ رشک رتبہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کس ذریعہ سے عطا ہو

امام مالک نے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا خداوند تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے کہ اُن کو پیار کرنا مجھ پر لازم ہے، جو آپس میں ایک دوسرے کو میری محبت کے سبب سے پیار کرتے ہین، اور میری محبت مین

---

[1] مسلم کتاب الادب باب المرء مع من احب بخاری کتاب الادب باب ما جاء فی قول الرجل ویلک [2] مسلم کتاب الادب باب اذا احب اللہ عبدا حببہ بعبادہ [3] بخاری کتاب الرقاق باب التواضع [4] اس کی ہم معنی حدیثیں ترمذی، مالک اور شعب الایمان بیہقی میں بھی ہین، دیکھو مشکوٰۃ کتاب الآداب فی حب اللہ فصل ثانی،

ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے ہیں، اور میری محبت میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں، اور میری محبت میں ایک دوسرے کے لئے اپنی جان و مال وقف کرتے ہیں۔[۱]

یہ محبتِ الٰہی کی نیرنگیاں اسلام ہی کے پردہ پر نظر آتی ہیں،

ترمذی میں حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا " لوگو! خدا سے محبت کرو کہ وہ تمہیں اپنی نعمتیں عطا کرتا ہے، اور اسی کی محبت کے سبب مجھ سے محبت کرو، اور میری محبت کے سبب سے میرے اہلِ بیت سے محبت کرو"[۲]، یہ عشق و محبت کی دعوت محبوبِ ازل کے سوا اور کون دے سکتا ہے؟ عام مسلمانوں میں پیغمبرِ اسلامؐ کا لقب "حبیبِ خدا" ہے، دیکھو کہ حبیب اور محبوب میں خلوتِ محبت کے کیا کیا ناز و نیاز ہیں، آپ خشوع و خضوع کی دعاؤں اور خلوت و تنہائی کی روحانی ملاقاتوں میں کیا ڈھونڈھتے اور کیا مانگتے تھے، کیا چاہتے اور کیا سوال کرتے تھے، امام احمد اور بزار نے مسندوں میں ترمذی نے جامع میں، حاکم نے مستدرک میں، اور طبرانی نے معجم میں متعدد صحابیوں سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں محبتِ الٰہی کی دولت مانگا کرتے تھے، انسان کو اس دنیا میں سب سے زیادہ محبوب اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جان ہے، لیکن محبوبِ خدا کی نگاہ میں یہ چیزیں ہیچ تھیں، دعا فرماتے تھے، خداوندا!

أسئلك حبك وحب من يحبك	میں تیری محبت مانگتا ہوں اور جو تجھ سے محبت
وحب عمل يقرب الى حبك	کرتا ہو اس کی محبت اور اس کام کی محبت جو
(احمد۔ ترمذی۔ حاکم)	تیری محبت سے قریب تر کر دے،
اللهم اجعل حبك احب الى من	الٰہی تو اپنی محبت کو میری جان ہی میرے اہل

[۱] مشکوٰۃ باب مذکور، [۲] مشکوٰۃ مناقب اہلِ بیت بروایت ترمذی،

نفسی واھلی ومن الماء البارد،	عیال سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ
(ترمذی وحاکم)	میری نظر میں محبوب بنا،

عرب مین ٹھنڈا پانی دنیا کی تمام دولتون اور نعمتون سے زیادہ گران اور قیمتی ہی لیکن حضور کی پیاس اس مادی پانی کی خنکی سے نہین بجھتی تھی، وہ صرف محبتِ الٰہی کا زلال خالص تھا جو اس تشنگی کو تسکین دیسکتا تھا عام انسان روٹی سمجھتے ہین مگر ایک عاشقِ الٰہی (مسیح) کا قول ہو کہ انسان صرف روٹی سے نہین جیتا، پھر وہ کون روٹی ہو جس کو کھا کر انسان پھر کبھی بھوکا نہین ہوتا حضور دعا فرماتے ہین،

اللّٰھُمَّ ارزقنی حبك وحب من	خداوندا! تو اپنی محبت اور اس کی محبت جو
ینفعنی فی حبك (ترمذی)	تیری محبت کی راہ مین نافع ہو مجھے روزی کر،

عام ایمان خدا اور رسول پر یقین کرنا ہی مگر جانتے ہو کہ اس راہ مین آخری منزل کیا ہے؟ صحیحین مین ہی،

من کان اللّٰہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما[۱]	یہ کہ خدا اور رسول کی محبت کے آگے تمام سوا کی محبتیں ہیچ ہو جائیں

بعض مذاہب کو اپنی اس تعلیم پر ناز ہو کہ وہ انسانون کو یہ سکھاتے ہین کہ وہ اپنے خدا کو ماں باپ سمجھین، اور اُس سے اسی طرح محبت کرین جس طرح اپنے والدین سے کرتے ہین اور چونکہ اسلام نے اس طریقۂ تعبیر کو اس بنا پر کہ وہ شرک کا راستہ ہی ممنوع قرار دیا ہی، اس لئے ان مذاہب کے بہت سے پیرو یہ سمجھتے ہین کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم محبتِ الٰہی کے مقدس جذبات سے خالی ہی لیکن جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے دعوی سرتاپا بے بنیاد ہی، بلکہ واقعہ یہ ہی کہ تعلیمِ محمدی کی بلندی نظر اور محبت کا علوی معیار

[۱] مسلم کتاب الایمان باب بیان خصال من اتصف بھن وجدہ حلاوۃ، (بخاری کتاب الایمان باب حلاوۃ الایمان)

دونوں ان مذاہب کے پیش کردہ نظرو معیار سے بہت بالاتر ہیں، ثبوت میں قرآن مجید کی یہ آیت پاک بھی پہلے پیش کی جاچکی ہے،

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا (بقرہ ۲۵-۲۵)	تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو، بلکہ اس سے بہت زیادہ

لیکن احادیث سے ہمارا دعویٰ اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے، لڑائی کا میدان ہے، دشمنوں میں بھاگ دوڑ مچی ہے جس کو جہاں امن کا گوشہ نظر آرہا ہے، اپنی جان بچا رہا ہے، بھائی بھائی سے ماں بچہ سے، بچہ ماں سے الگ ہے، اسی حال میں ایک عورت آتی ہے جس کا بچہ میدان حشر میں گم ہو گیا ہے، محبت کی دیوانگی کا یہ عالم ہے کہ جو بچہ بھی اس کے سامنے آجاتا ہے اُس کو اپنے بچہ کے جوش محبت میں چھاتی سے لگا لیتی ہے، اور دودھ پلا لیتی ہے، دفعۃً رحمۃ للعالمین کی نظر پڑتی ہے اور آپ صحابہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں "کیا یہ ممکن ہے کہ یہ عورت خود اپنے بچہ کو اپنے ہاتھ سے دہکتی آگ میں ڈال دے"؟ لوگ عرض کرتے ہیں "ہرگز نہیں" آپ فرماتے ہیں، "تو جتنی محبت ماں کو اپنے بچہ سے ہے خدا کو اپنے بندوں سے اس سے کہیں زیادہ محبت[1] ہے"،

ایک دفعہ ایک غزوہ سے آپ واپس تشریف لا رہے ہیں، ایک عورت اپنے بچہ کو گود میں لیکر سامنے آتی ہے، اور عرض کرتی ہے "یا رسول اللہ! ایک ماں کو اپنی اولاد سے جتنی محبت ہوتی ہے کیا خدا کو اپنے بندوں سے اُس سے زیادہ نہیں ہے؟ فرمایا ہاں بیشک اس سے زیادہ ہے" بولی تو کوئی ماں تو اپنی اولاد کو خود آگ میں ڈالنا گوارا نہ کرے گی، یہ سُن کر فرطِ اثر سے آپ پر گریہ طاری ہو گیا، پھر سر اٹھا کر

[1] صحیح بخاری کتاب الادب، باب رحمۃ الولد،

فرمایا، خدا صرف اُس بندہ کو عذاب دیتا ہے، جو سرکشی سے ایک کو دو کہتا ہے[۱]"

آپ ایک مجلس میں تشریف فرما ہیں، ایک صحابی ایک پرندکو مع اُس کے بچوّں کے چادر میں باندھ کر لاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یارسول اللہ! میں نے ایک جھاڑی سے ان بچوں کو اٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا، ماں نے یہ دیکھا، تو میرے سر پر منڈلانے لگی، میں نے ذرا سا کپڑے کو کھول دیا تو فوراً آکر بچوں پر گر پڑی، ارشاد ہوا، کیا بچوں کیساتھ ماں کی اس محبت پر تم کو تعجب ہے، قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھکو حق کے ساتھ مبعوث کیا، جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کیساتھ ہے خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ ہے[۲]،

ایک صاحب ایک چھوٹے بچہ کو لیکر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے ہیں محبت کا یہ حال تھا کہ وہ بار بار اس کو گلے سے لگائے جاتے تھے، آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اُن سے پوچھا کہ کیا تم کو اس بچہ سے محبت ہے، انھوں نے کہا "ہاں" فرمایا تو اللہ کو تم سے اُس سے زیادہ محبت ہے جتنی تم کو اس بچہ سے ہے، وہ تمام رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے[۳]"

جمالِ حق کا پہلا مشتاق، اور مستورِ ازل کے زیرِ نقاب چہرہ کا پہلا بندکشا، زندگی کے آخری مرحلوں میں ہے، مرض کی شدت ہے، بدن بخار سے تپ رہا ہے، اُٹھکر چل نہیں سکتا لیکن یک بیک وہ اپنے میں ایک اعلانِ خاص کی طاقت پاتا ہے، مسجد نبوی میں جان نثار حاضر ہوتے ہیں، سب کی نظریں حضورؐ کی طرف لگی ہیں نبوت کا آخری پیغام سننے کی آرزو ہے، دفعۃً لبِ مبارک ہلتے ہیں، اور یہ آواز آتی ہے لوگو! میں خدا کے سامنے اس بات کی برأت کرتا ہوں کہ انسانوں میں میرا کوئی دوست ہے

---

[۱] سنن نسائی باب برحی من لرحمۃ [۲] مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد کتاب الاسماء باب رحمۃ اللہ غضبہ [۳] ادب المفرد امام بخاری باب رحمۃ العیال ص۵۵، مصر

مجھکو خدا نے اپنا پیارا بنایا ہے، جیسے ابراہیم کو اُس نے اپنا پیارا بنایا تھا[1]، یہ تو وفات سے پہلے کا اعلان تھا عین حالت نزع میں زبان مبارک پر یہ کلمہ تھا "خداوندا رفیق"[2]

اللہ تعالیٰ کی کریمی و رحیمی اس کی بیچارہ نوازی، عاجزوں اور درماندوں کی دستگیری، اور اپنے گنہگار بندوں پر اُس کی شان تجسّس کا ترانہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے کانوں سے سُنا اور نادم و متاسف سیہ کاروں تک اس مژدہ کو پہنچا کر اُن کے شکستہ اور زخمی دلوں پر مرہم رکھا حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ حضرت رحمۃ للعالمینؐ نے یہ پیام ربانی ہم کو سنایا،

میرے بندو! میں نے اپنے اوپر بھی اور تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام کیا ہے، تو ایک دوسرے پر تم ظلم نہ کیا کرو، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک گمراہ تھا لیکن جس کو میں نے راہ دکھائی تو مجھ سے راستہ پوچھو، میں بتاؤں گا، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک بھوکا تھا لیکن جس کو میں نے کھلایا تو مجھ سے کھانا مانگو میں تم کو کھلاؤں گا، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک پیاسا تھا لیکن جس کو مینے پلایا تو مجھ سے پانی مانگو مین تم کو پلاؤں گا، اے میری بندو! تم مین ہر ایک ننگا تھا لیکن جسکو مینے پہنایا تو مجھ سے کپڑا مانگو مین تم کو پہناؤنگا، اے میری بندو! تم دن رات گناہ کرتے ہو اور میں سب گناہوں کو معاف کرتا ہون تم مجھ سے معافی مانگو میں تم کو معاف کرونگا، اے میرے بندو! مجھے نقصان پہنچانا تمہاری طاقت میں نہیں ہے؛ اور نہ مجھے نفع پہنچانا تمہاری قدرت مین ہے؛ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے جن اور انس چھوٹے اور بڑے مرد اور عورت دنیا کے سب سے بڑے پرہیز گار کے دل کے برابر ہو جائیں تو میری شہنشاہی میں ایک ذرہ اضافہ نہ ہوگا، اور اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے جن و

---

[1] صحیح مسلم کتاب المساجد [2] صحیح بخاری ذکر وفات نبویؐ،

انس چھوٹے اور بڑے مرد اور عورت، دنیا کے سب سے بڑے گنہگار کے دل کے برابر ہو جائیں، تو بھی میری شہنشاہی میں ذرہ برابر کمی نہ ہوگی، اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے جن وانس سب کسی ایک زمین میں کھڑے ہو کر مجھ سے مانگیں، اور میں سب کے سوال کو پورا کروں تو میرے خزانہ میں کچھ کمی نہ ہوگی، لیکن اتنی جتنی ایک سوئی سمندر کے پانی میں ڈبو کر نکال لی جائے، اے میرے بندو! تمہارے ہی عمل ہوں گے جن کو میں گن گن کر تم کو واپس کروں گا، اور پورا کروں گا تو جس کو بھلائی ملے، وہ خدا کا شکر ادا کرے، اور جس کو برائی ملے وہ خود اپنے ہی کو ملامت کرے۔

محبت کا یہ پرکیف نغمہ دنیا نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی زبان مبارک سے سُنا، تسلی وتشفی کا یہ روح افزا پیام آپ ہی کے مبارک لبوں سے ادا ہوا، عفو وکرم کے بحر بے کراں کا یہ ساحل امید آپ ہی کے دکھانے سے ہم کو نظر آیا، اور گنہگاروں کو میرے بندو کہکر پکارے جانے کی عزت آپ ہی کے وسیلہ سے میسر آئی، (صلی اللہ علیہ وسلم)

لہ صحیح مسلم وترمذی کتاب الزہد ومسند احمد بن حنبل جلد ۵ صفحہ ۱۲۰ وصفحہ ۱۵۴، و ۱۷۷، وادب المفرد امام بخاری باب الظلم ص ۹۵ - مصر، میں نے صحیح مسلم کی روایت سامنے رکھی ہے لیکن بعض الفاظ مسند سے لیکر بڑھا دیے ہیں، اس کے بعض بعض ٹکڑے انجیل میں بھی ملتے ہیں، (دیکھو متی ۲۵، ۲۵ تا ۴۵) مگر دونوں کے ملانے سے وہی فرق نمایاں ہوتا ہے جو ناقص اور کامل میں ہونا چاہیے،

فرشتوں پر ایمان

وَمَلٰٓئِكَتِهٖ

ملائکہ کا لفظ جمع ہے، اس کا واحد مَلَک، مَلاک اور مالک تین طرح سے مستعمل ہے، اس کے لغوی معنی "قاصد اور رسول" کے ہیں، اسی لئے قرآن پاک میں ملائکہ کے لئے رُسُل کا لفظ بھی آیا ہے، جس کے معنی "قاصد اور پیام رساں" کے ہیں، اُن سے مراد وہ غیر مادی مگر مخلوق نیک، ہستیاں یا ارواح ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق عالم اور اس کے اسباب و علل کے کاروبار کو چلا رہی ہیں، اگر یہ عالم ایک مشین ہے تو ملائکہ اس کا انجن، اور اس کے کل پرزوں کو حرکت دینے والی قوتیں ہیں، جو خدا کے مقررہ احکام اور قوانین کے مطابق اُن کو حرکت دے رہے اور چلا رہے ہیں، یعنی وہ خالق اور اسکی مخلوقات کے درمیان پیام رسانی اور سفارت کی خدمت اس طرح انجام دے رہے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ اپنے حکم اور مرضی کو اُن پر القا کرتا ہے، اور وہ ایک بے اختیار محکوم کی طرح اسکو مخلوقات میں جاری اور نافذ کرتے ہیں، اُن کو خود نہ کوئی ذاتی اختیار ہے، اور نہ اُن کا کوئی ذاتی ارادہ ہے، وہ سرتاپا اطاعت ہیں، اور خدا کے حکم سے سرمو تجاوز نہیں کرتے، گویا اُن کی خلقت، اطاعت اور فرمانبرداری کیلئے کی گئی ہے، دنیا پر رحمت یا عذاب جو کچھ نازل ہوتا ہے وہ اُنہی کے ذریعہ سے ہوتا ہے، اور خدا انبیاء پر اپنے جو احکام اتارتا یا اُن سے کلام کرتا ہے وہ اُنہی کی وساطت سے کرتا ہے،

دنیا کے تمام مذاہب، بلکہ قدیم یونانی مصری فلسفہ مین بھی اس قسم کی ہستیون کا وجود تسلیم کیا گیا ہی
صابی مذہب میں یہ ستارون اور سیارون کی صورت مین مانے گئے ہیں، یونانی مصری (اسکندری) فلسفہ
میں ان کا نام عقولِ عشرہ (دس عقلیں) رکھا گیا ہی، اور ساتھ ہی نو آسمانون کے اندر بھی الگ الگ ذی
ارادہ نفوس تسلیم کئے گئے ہیں بلکہ خالص یونانی فلسفہ مین بھی بعض غیر مادی ارواحِ مجردہ کا پتہ لگتا ہی
جن مین سب سے اہم لوگس کا تخیل ہی جس سے مقصود وہ اولین ہستی ہی جس کو خدا نے تمام کائنات کی پیدایش کا
ذریعہ اور واسطہ قرار دیا ہے اور جس کو اہلِ فلسفہ عقلِ اول سے تعبیر کرتے ہیں، پارسیون مین ان ہستیون کا
نام "امشاسپند" ہی، اور اُن کی بیشمار تعداد قرار دیگئی ہی یہودی ان کو کروبیم کہتے ہیں، اور ان میں سے خاص خاص
کے نام جبرئیل اور میکائیل وغیرہ رکھتے ہیں، عیسائی بھی انکو انھی نامون سے یاد کرتے ہیں، اور جبرئیل کو
روح القدس وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، ہندوؤں میں وہ دیوتاؤں اور دیبیون کے نام سے
روشناس ہیں، جاہل عرب اُن کو خدا کی بیٹیان کہہ کر پکارتے ہیں، بہرحال یہ تمام مختلف صحیح اور غلط
نام ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیرین ہیں، جس سے مراد وہ روحانی وسائط ہیں، جو صانع و مصنوعات
اور خالق و مخلوقات کے درمیان اُس کے حکم کے مطابق عمل پیرا اور کارفرما ہیں،

مذاہبِ سابقہ مین ان غیر مادی ذی روح مخلوق ہستیوں کی حیثیت نہایت مشتبہ تھی وہ
کبھی مخلوق کہی جاتی تھیں اور کبھی خدائی کے مرتبہ تک بھی بلند کر دیجاتی تھیں، ہندوؤں کے دیوتاؤں
اور دیبیون کی یہی کیفیت تھی، پارسیون مین امشاسپند کا بھی یہی حال تھا، کہ کبھی اُن کی حیثیت
فرشتوں کی رہتی تھی، کبھی وہ خدا کے مقابل بنجاتی تھیں، اور کبھی خود خدا ان میں سے ایک ہوجاتا
تھا، ہندوؤں کی طرح پارسیون میں بھی وہ قابلِ پرستش سمجھی جاتی تھیں، اُن کے نزدیک سب سے عالی رتبہ

اَمشاسپند، تھے، اور اُن کے تحت میں ۳۳، پھر اُن میں سے ہر ایک کے ماتحت ہزاروں تھے اور چونکہ پارسی نیکی اور بدی کے دو متقابل خداؤں کے قائل تھے، اس لیئے دونوں کے ماتحت اچھے اور بُرے فرشتوں کی بےشمار تعداد تھی، نیکی کے فرشتے براہِ راست نیکی کی چیزوں کو اور بُرائی کے فرشتے مصیبتوں، ہلاکتوں اور برائیوں کو دنیا میں پیدا کرتے تھے اور اپنے اپنے خدا کی طرف سے اُن اشیاء پر حاکم سمجھے جاتے تھے، دونوں خدا اپنی اپنی فوجوں اور لشکروں کے پُرے لیکر باہم نبرد آزما رہتے تھے، یہ بھی اُن کا اعتقاد تھا، کہ ہر امشاسپند یا نر فرشتہ کیساتھ ایک یزد یعنی مادہ (فرشتہ) بھی ہوتی تھی، جو اُس کی بیوی تھی، ہندؤوں میں نر دیوتاؤں اور مادہ دیبیوں کا تصور تھا، مگر ان نر و مادہ ہستیوں میں کسی نر کو کسی مادہ سے خصوصیت خاص تھی، بلکہ ہر ایک جنس کا ہر فرد دوسری جنس کے ہر فرد سے لطف اندوز ہو سکتا تھا، یہودیوں میں فرشتوں کی حیثیت ایسی تھی کہ اُن کی تقدیس، اور ثنا و صفت خدا سے مشتبہ ہو جاتی تھی، نظر آنے والے فرشتہ کی تعظیم کیجاتی تھی، اُس کے آگے جھکا جاتا تھا، اور اس کو خداوند کہکر اس طرح خطاب کیا جاتا تھا، کہ کہیں کہیں یہ شبہہ ہو جاتا ہے کہ خدا مخاطب ہے یا فرشتہ (تکوین ۱۶، ۱۳ و ۱۸، ۲، ۳، ۲۲) وہ کبھی کبھی خدا کے بیٹے بھی کہے جاتے تھے، (تکوین ۶-۲) عیسائیوں میں اُن میں سے بعض مثلاً روح القدس خدا کا ایک جزو تسلیم ہو کر تثلیث کا رکن ہے، صابئیوں میں فرشتوں کی قربانی کیجاتی تھی، اُن کے ہیکل بنائے جاتے تھے، اور ان کو مظہر خدا تسلیم کیا جاتا تھا، عربوں میں فرشتے مادہ سمجھے جاتے تھے، وہ خدا کی بیٹیاں کہکر پکارے جاتے تھے، اُن کی پرستش ہوتی تھی، اور سمجھا جاتا تھا، کہ وہ خدا کے دربار میں سفارشی ہوں گے، یونانیوں میں عقلِ اول اور عقولِ عشرہ تمام عالم کے خالق، کار فرما اور مرجع کل مانے گئے، اور خدا کو معطل ٹھہرایا گیا:

اسلام نے آکر ان تمام عقائد کو مٹا دیا، خدائی اور ربوبیت کی ہر صفت سے وہ محروم بتائے گئے، اُن کی

پرستش ناجائز کی گئی، نہ وہ مادہ کی مادّی جنسیت سے وہ پاک کئے گئے، اور انسانوں کو ان پاک مخلوقات کی غلامی و بندگی سے آزاد کیا گیا، اُن کی تعداد و بیشمار اور درجہ بندی کا کوئی تخیل باقی نہیں رکھا گیا، اُن کی ہستی خدائے تعالیٰ کے سامنے ایک سراپا مطیع و فرمانبردار غلام کی قرار دی گئی جس کا کام شب و روز صرف آقا کا حکم بجا لانا ہے، عالم میں اُن کا کسی قسم کا تصرف نہیں مانا گیا، اور نہ نیکی و بدی کی دو دیوں کی تقسیم کی گئی، نہ وہ الگ الگ جنس مخلوقات کے حاکم و منتظم قرار دیئے گئے، قرآن میں اُن کی ہستی صرف اس قدر تسلیم کی گئی ہے کہ وہ غیر مادی ذی روح مخلوقات ہیں جن کا کام خدا کی حمد و ثنا اور اطاعت و فرمانبرداری ہے خالق اور اس کے مخلوقات کے درمیان وہ پیغام رسانی کا ذریعہ ہیں، خدا کے حکم کے مطابق وہ مخلوقات کے کارخانہ کو چلاتے ہیں لیکن اس چلانے میں خود اُن کی ذاتی مرضی اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہے اسی لئے قرآن پاک نے یہودیوں کی طرح اُن کو "خداوند" کا خطاب نہیں دیا، نہ پارسیوں کی طرح اُن کو قابل پرستش کے لقب سے یاد کیا، نہ ہندوؤں کی طرح دیوا اور دیوتا، اور دیبی کہا، بلکہ صرف ملک، اور رسول کے الفاظ استعمال کئے جن کے لفظی معنی فرستادہ، قاصد، پیغام رسان اور ایلچی کے ہیں، بلکہ قرآن نے آغاز خلقتِ انسانی کے قصہ میں یہ حقیقت واضح کر دی کہ ملائکہ اس لائق نہیں ہیں کہ آدم اُن کو سجدہ کرے، بلکہ آدم میں یہ صلاحیت ہے کہ ملائکہ کا مسجود بنے، چنانچہ اُس کو مرتبۂ علم میں اُن سے بالاتر ٹھہرایا گیا اور خدا کی جس تسبیح اور تقدیس کا اُن کو دعوی تھا، اس کے باوجود جب انسان کا جوہر طبیعت انھوں نے پہچانا تو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ

سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا	تو پاک ہے ہم کو کوئی علم نہیں لیکن وہ جو تونے
إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ، (بقرہ-۴)	ہم کو سکھایا، بیشک تو جاننے والا اور حکمت والا ہے

اس قصہ نے شروع ہی میں یہ واضح کردیا کہ وہ ہستیاں جن کو دوسرے مذاہب نے انسانوں کا دیوتا، انسانوں کا خداوند اور کبھی خدا کا ہمسر اور متصرف مطلق قرار دیا تھا، اسلام میں اُن کی حیثیت انسان کے مقابلہ میں کیا ہے؟ انسان اور فرشتے خدا کے سامنے برابر کے مخلوق اور بندے یکساں عاجز و درماندہ ہیں، انسانوں کو مادی اشیا پر حکومت بخشی گئی ہے کہ اپنے نفع و نقصان کے لیے اُن سے کام لے سکیں اور ملائکہ کو اپنے حضور میں متعین فرمایا گیا ہے کہ آسمان و زمین اور پوری مملکتِ الٰہی میں خدا کے احکام کی تعمیل و تنفیذ کریں

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اسباب و علل کا ایک سلسلہ رکھا ہے جو ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے لوگ انہی ظاہری اسباب و علل کو دیکھ کر دھوکا کھاتے ہیں اور اُن کی پرستش کرنے لگتے ہیں، مثلاً آگ جلاتی اور روشن کرتی ہے اسکو دیکھ کر آتش پرست اور مادہ پرست یقین کرتے ہیں کہ خود آگ میں جلانے کی طاقت ہے لیکن فرق یہ ہے کہ آتش پرست اُس کے آگے سجدہ میں گر پڑتے ہیں، اور مادہ پرست گو اپنا سر اُس کے آگے نہیں جھکاتے، مگر اُن کا دل جھک جاتا ہے کیونکہ وہ بھی یہ ایمان رکھتے ہیں کہ یہ طاقت خود آگ کے اندر موجود ہے، کچھ لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ جلانے کی طاقت آگ میں نہیں ہے، بلکہ اس کا ایک مستقل دیوتا یا فرشتہ ہے، جو اس پر حکمران ہے، یہ لوگ اس آگ کے فرمانروا کے سامنے جھکتے ہیں، اسلام کے نظریۂ توحید نے اس شرک کو بھی مٹایا، اور بتایا کہ آگ اور آگ کا اگر کوئی فرشتہ ہے تو وہ کل کے کل اسی ایک رب العٰلمین اور فرمانروائے ارض و سما کے حکم کے تابع ہیں، انہی کے آگے جھکنا چاہیے اور اُسی کی بندگی کرنی چاہیے،

اسلام میں فرشتوں کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا جواب ان نصوص سے مل سکتا ہے جو اُن کے کاموں کے متعلق قرآن میں مذکور ہیں، اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن سے مراد وہ غیر مادی ذی روح

ہستیاں ہیں، جو احکام اور پیغام الٰہی کو دنیا ے خلق تک پہنچاتے، اور نافذ کرتے ہین، اور وہ اسباب وعلل جن کو مادہ پرست ذاتی طور سے موثر جانتے اور جن کو بت پرست، دیوتاؤن کا کرشمہ سمجھتے ہین، اُن کو فرشتے احکام الٰہی کے مطابق کام میں لگاتے، اور مرضیِ الٰہی کو پورا کرتے ہین،

عقلی حیثیت سے یہ عقیدہ بھی اسی طرح قبول اور انکار کے قابل ہو جس طرح عقلیات کے دوسرے عقائد اور نظریے ہیں، جن کی تصدیق یا تکذیب عقل کی دسترس سے باہر ہے، اس لیئے اس عقیدہ کو یہ کہکر کوئی رونے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ یہ خلافِ عقل ہے، بلکہ جس طرح قیاسات اور عقلی نکتہ پردازی سے دوسرے عقلی مباحث کا فیصلہ کیا جاتا ہے، ویسا ہی یہان بھی کیا جاسکتا ہی، اشیاء مین خصائص اور لوازم کے وجود، اور اُن کے اسباب وعلل کا مسئلہ عقلا میں ہمیشہ اختلافات کا دنگل رہا ہی اور یہ معما آج بھی اسی طرح لاینحل ہے جس طرح پہلے تھا، اس کا حل سائنس کی مادی تحقیقات اور تجربون کی طاقت سے باہر ہے، اور فلسفہ بھی اس کی گتھی کے سلجھانے سے عاجز ہی، اس لیئے اگر حکما ی ملحدین کی شاہراہ سے الگ ہٹ کر اُس کے حل کی کوئی صورت اربابِ مذاہب نے نکالی ہے، تو وہ محلِ اعتراض نہیں ہوسکتی، اور نہ خلافِ عقل کہی جاسکتی ہی، کائنات کے حوادث میں جس طرح مادی علل و اسباب کارفرما ہین اسی طرح ان سے بالاتر روحانی علل واسباب بھی ساتھ ساتھ کارفرما ہیں اور ان دونون قسم کے اسباب کے توافق سے حوادث کا وجود ہوتا ہی، یہی سبب ہی کہ انسان اکثر مادی علل واسباب موجود ہونے یا نہ ہونے کے باوجود کامیاب یا ناکام ہوتا ہی اور اس کا نام بخت و اتفاق رکھتا ہی، حالانکہ مسئلہ علل واسباب کو مان لینے کے بعد بخت و اتفاق کوئی چیز نہیں رہجاتا، یہی روحانی علل واسباب ہیں، جن کا سررشتہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی سے ان فرشتون کو سپرد کیا ہے، جو فرمانبردار چاکرون کی حیثیت سے نظام عالم کو چلارہے ہین، انھا

اور دوسرے متکلمین اور حکمار کے اصطلاحات مین فرق یہ ہے کہ وہ ملائکہ کی تعبیر اسباب وعلل کے "قوائے طبعی" سے کرتے ہیں، اور ہم "قوائے روحانی" سے،

اس تقریر کا یہ منشا نہیں ہے کہ اشیار مین خواص وطبائع، اور اس مادہ کی ملکیت مین مقرر طبعی اصول وقوانین موجود نہیں ہین، بلکہ یہ مقصد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ازلی اندازہ (تقدیر) کے مطابق ہر چیز کے خصائص وطبائع اور اصول وقوانین مقرر کر کے ملائکہ کو حکم دیا ہے کہ وہ اس کو ان ہی اصول وطبائع مقررہ کے مطابق چلاتے رہیں،

سمجھنے کے لیئے اس کی صحیح مثال خود انسان بلکہ ہر جاندار ہستی ہے مخلوقات کی دو قسمیں ہین، ذی روح اور غیر ذی روح، ذی روح مخلوقات کے اکثر افعال وحرکات اسکی روح کی ارادی قوت کی وساطت سے انجام پاتے ہیں، وہی روح اس کے ہاتھ پاؤن، اور تمام اعضا، بلکہ ہر عضو کے ایک ایک رگ وریشہ پر حکمران اور مسلط ہو باایں ہمہ وہ روح اصول مقررہ کے تحت ہی اعضار سے کام لیتی ہے اور ان اصول سے باہر نہین جا تی اسی طرح غیر ذی روح اشیار میں ابر وباد سے لیکر دریا، پہاڑ، چاند اور سورج تک پر ارواح مقرر ہیں جو ان اشیار سے خدا کے اصول مقررہ کے مطابق یکساں افعال وحرکات کا صدور کراتی ہین جس طرح ہماری روح اپنے اعضا اور اعضا کے ذریعہ سے مادہ میں جو تغیرات پیدا کرتی ہے وہ اشیا کے مقررہ خواص وطبائع کے سہارے پر کرتی ہے اسی طرح ملائکہ بھی انہی مقررہ خواص وطبائع کے ذریعہ اپنے مفروضہ فرائض انجام دیتے ہیں،

الغرض جس طرح ہمارے ارادی افعال اور حکم الٰہی کے درمیان ہماری انسانی ارواح ونفوس واسطہ ہیں، اسی طرح تمام عالم مخلوقات اور کائنات کے افعال اور حکم الٰہی کے درمیان یہ ملکوتی ارواح اور نفوس مجردہ واسطہ ہیں اور جس طرح ہماری انسانی ارواح کی اس وساطت سے خدا کی حکومت علی الاطلاق

کوئی اعتراض نہیں واقع ہوتا، اسی طرح ان ملکوتی ارواح کی وساطت سے بھی خدا کی علی الاطلاق حکومت میں کوئی نقص نہیں واقع ہوتا ہیں سے یہ بات بھی سمجھ مین آتی ہی، کہ ہمارے ارادی افعال میں اختلافات کی اتنی نیرنگیان نظر آتی ہیں، مگر ہمارے اور عالم کائنات کے جو نوعی افعال ہین اُن مین اختلافات اور نیرنگیون کے بجائے یکسانی، ہمرنگی اور عدم اختلاف پایا جاتا ہے؟ کیونکہ انسان نے ارادہ پاکر کسی قدر ذاتی اختیار پالیا، ہی اور یہی ذاتی اختیار اُس کے افعالِ اختیاری کی ذمہ داری باز پرس اور مواخذہ کی بنیاد ہی اور جس کی بنا پر وہ اپنی اطاعت کے ذریعہ سے ثواب اور عصیان کر کے عتاب کا مستحق ہوجاتا ہی، مگر دنیا کی یہ ملکوتی ارواحِ مجردہ یعنی یہ ملائکہ ذاتی ارادہ اور اختیار سے تمامتر محروم ہوکر صرف اطاعت، فرمانبرداری، اور انقیاد کے لیئے پیدا کئے گئے ہیں، اس لئے اُن مین عصیان، تمرد، سرکشی اور حکم الٰہی سے انحراف کی کوئی صلاحیت نہیں ہی، اسی بنا پر اشیا کے تمام نوعی افعال و حرکات اور خصائص میں یکسانی، ہمرنگی، اور عدم اختلاف پایا جاتا ہی یہی حقیقت ہی جو فطرت طبیعت اور نوعی خاصیت کی اصطلاحات کی صورتون میں ہمارے لئے دھوکے اور اشتباہ کا باعث بن گئی ہی

۱۔ اب ہم کو تعلیماتِ نبوی یعنی آیات واحادیث سے ملائکہ کی حیثیت کو روشن کرنا چاہیئے ملائکہ کی سفارت و پیام رسانی یعنی خالق کے احکام اور مرضی کو مخلوقات تک پہنچانا، اور اس کام مین اُن کا بے اختیار ہونا، ان دو آیتوں سے ثابت ہوتا ہے،

اِنَّ اللّٰہَ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا	خدا ہی ہے جو فرشتوں اور آدمیوں میں سے پیام
وَّمِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ	رسان اور قاصد منتخب کرتا ہی بیشک خدا سننے والا
یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ	اور دیکھنے والا ہے اور وہ انکے آگے اور پیچھے

وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (الحج - ۱۰)　　کا حال جانتا ہے اور تمام کاموں کا مرجع خدا ہی ہے

یعنی پیام رسانی اور سفارت کے سوا اُن کو اصل حکم میں کوئی دخل نہیں ہے اختیارات سب خدا کے ہاتھ میں ہیں، اور وہی تمام امور اور انتظامات کا مرجع کل ہے، دوسری جگہ ہے،

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	حمد ہو اُس خدا کی جو آسمانوں اور زمین کا پیدا
جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ	کرنے والا ہے، اور فرشتوں کو دو دو تین تین
مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۭ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ	اور چار چار شہپر بازوؤں والے پیام رسان
مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ	بنانے والا ہے، وہ پیدایش میں جو چاہے بڑھادے
مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا	وہ ہر چیز پر قادر ہے، وہ لوگوں کیلئے رحمت
مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا	کھولے تو کوئی اس کا روکنے والا نہیں، اور
مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَهُوَ	جو روک دے تو اُس کے سوا کوئی چھوڑنے والا
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (فاطر - ۱)	نہیں، اور وہی غالب دانا ہے،

اس آیت پاک میں بھی یہی حقیقت ظاہر کی گئی ہے، کہ ملائکہ سفارت اور درمیانگی کے علاوہ اور کوئی اختیار نہیں رکھتے، رحمت کے دروازوں کا کھولنے والا، اور بند کرنے والا صرف خدا ہے، یہ تعلیم اس غلط عقیدہ کی تردید کرتی ہے، کہ فرشتوں کو دنیا کی حکمرانی اور انتظامات میں کوئی ذاتی دخل ہے، یا اُن میں الوہیت اور ربوبیت کا کوئی شائبہ ہے، یا وہ پرستش کے قابل ہیں یا اُن کی دہائی بھی پکارنی چاہیے،

۲- ملائکہ خدا کے احکام کو دنیا میں جاری کرتے ہیں،

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ط (انفال-۲) — (یاد کر) جب تیرا پروردگار فرشتوں کو وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، تم مومنوں کو ثابت رکھو۔

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ ط (قدر ۱) — اس میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کے حکم سے ہر کام کو لیکر نیچے اترتے ہیں،

وہ جس طرح احکام لیکر اترتے ہیں، اسی طرح دربارِ الٰہی تک عروج بھی کرتے ہیں،

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ (معارج ۱) — فرشتے اور روح اس تک چڑھتے ہیں،

موت کے وقت روح کا قبض کرنا، انہی سے متعلق ہے،

قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ، (سجدہ-۱) — کہدو کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر ہے وہ تم پر موت طاری کرے گا،

وَلَوْ تَرٰٓى إِذِ الظّٰلِمُونَ فِي غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوٓا أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوٓا أَنْفُسَكُمْ، (انعام-۱۱) — اور اگر دیکھو تم جب گنہگار موت کے سکرات میں ہوں، اور فرشتے اپنے ہاتھوں کو پھیلائے ہوں کہ نکالو، اپنی جانوں کو،

وَلَوْ تَرٰٓى إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ، (انفال-۷) — اور اگر دیکھو جب فرشتے کافروں کو موت دے رہے ہوں،

اسی کے ہم معنی اور بھی کئی آیتیں ہیں، جن سے ظاہر ہے کہ حکم الٰہی کے مطابق موت و فنا کی تدبیر علل و اسباب کی انہی روحانی قوتوں سے متعلق ہے،

دنیا میں کسی شے کے وجود، انقلاب اور فنا کے لیے کسی ایک علت و سبب کا وجود کافی نہیں ہے

بلکہ ضروری ہے کہ اُس کے متعلقہ علل واسباب کی تمام کڑیاں باہم پیوستہ اور ایک دوسرے کی معاون ہوں اور موانع اور عوائق معدوم ہوں، یہ متعلقہ علل واسباب کا توافق اور موانع کا انسداد ہی تدبیر ہے، جو بحکم الٰہی ملائکہ کے سپرد ہے[1] اس تدبیر کو کبھی اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے، یُدَبِّرُ الْاَمْرَ (وہ کام کی تدبیر کرتا ہے) اور کبھی ملائکہ کی طرف،

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا	(فرشتے)	ڈوب کر (روحوں کے) کھینچنے والوں کی قسم ہے،
وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا، فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا		(رگوں کی) گرہوں کے کھولنے والوں کی قسم ہے،
فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا،		(اس فضائے آسمانی میں) تیرنے والوں کی، پھر دوڑ کر
(نازعات - ۱)		(مادی اسباب و علل پر سے) آگے بڑھ جانیوالوں کی پھر

یہی ملائکہ خدا اور رسول کے درمیان بھی سفیر ہیں،

اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ	یا خدا (آدمی سے اس طرح باتیں کرتا ہے کہ اپنا) ایک
مَا يَشَآءُ،	ایک سفیر بھیجتا ہے تو وہ اس (خدا) کی اجازت سے
(شوریٰ - ۵)	جو وہ (خدا) چاہتا ہے وحی کرتا ہے،

دوسری جگہ ہے،

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ	خدا روح کے ساتھ فرشتوں کو اپنے حکم سے اپنے
عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (نحل - ۱)	بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے، اتارتا ہے،

خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہے،

[1] صحیح بخاری کتاب بدءالخلق باب ذکر الملائکہ میں ہے کہ رحم نسوانی پر ایک فرشتہ مقرر ہے جو بچہ کی نسبت قضائے الٰہی کو تحریر کرتا ہے

فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (بقرہ ۔ ۱۲) بس اُس (جبریل فرشتہ) نے (قرآن) کو خدا کے حکم سے تمہارے دل پر اتارا،

۴۔ یہ لوگون پر بشارت اور عذاب لیکر بھی اُترتے ہیں،

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى (ہود) ہمارے سفیر ابراہیم کے پاس بشارت لیکر اترے

اسی طرح حضرت زکریا اور حضرت مریم علیہما السلام کو انھون نے بشارت دی،

اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا، (مریم ۔ ۲) میں تیرے پروردگار کا فرستادہ ہون کہ تجھے ایک پاک لڑکا بخشون،

حضرت لوطؑ کے پاس اُن کی قوم کی بربادی کے لیئے آئے اور

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ (ہود ۔ ۷) کہا، اے لوط ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہین

اس کے بعد یہ فرشتے حضرت لوطؑ کی قوم پر کوہِ آتش فشان کا منھ کھول دیتے ہیں، اور تمام قوم برباد ہو جاتی ہے، یہ کام اگرچہ فرشتون نے انجام دیا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو خود اپنی طرف منسوب کیا ہے، کیونکہ وہ فرشتوں کے ذاتی اختیار کے بجائے خدا ہی کے حکم سے ہوا تھا،

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ، (ہود ۔ ۷) تو جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے اُس کے اوپر کو نیچے کر دیا، (یعنی زمین الٹ دی) اور اس پر تہ بہ تہ پتھرون کی بارش کی،

۵۔ فرشتے انسانون کے اعمال کی نگہبانی اور نگرانی کرتے ہیں، اور ان کے ثواب اور گناہ کے کاموں کو محفوظ رکھتے ہین،

وَاِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ کِرَامًا کَاتِبِیْنَ یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ، (انفطار-۱)

بیشک تم پر نگہبان ہیں جو بزرگ ہیں لکھنے والے ہیں، جو تم کچھ کرتے ہو اسکو وہ جانتے ہیں،

مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْہِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ ، (ق-۲)

کوئی بات منہ سے نہیں نکالتا، لیکن اُس کے پاس ایک نگہبان حاضر ہے،

سَوَآءٌ مِّنْکُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَھَرَ بِہٖ وَمَنْ ھُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّیْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّھَارِ لَہٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْ بَیْنِ یَدَیْہِ وَمِنْ خَلْفِہٖ یَحْفَظُوْنَہٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ ، (رعد-۲)

تم میں سے کوئی بات چھپا کر کہے، یا زور سے کہے یا وہ رات میں چھپے یا دن کو کرے خدا کے تعاقب کرنیوالے اس کے سامنے سے اور اس کے پیچھے سے، خدا کے حکم سے اس کی نگرانی کرتے ہیں،

وَیُرْسِلُ عَلَیْکُمْ حَفَظَۃً ط حَتّٰی اِذَا جَآءَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْہُ رُسُلُنَا وَھُمْ لَا یُفَرِّطُوْنَ ۝ (انعام)

اور وہ (خدا) تم پر نگران بھیجتا ہے، یہاں تک کہ تم میں سے جب کسی کو موت آتی ہے، تو ہمارے قاصد اسکی عمر پوری کرتے ہیں اور وہ (اپنے اس کام میں)

۷- وہ انسانوں کے اعمال کے مطابق اُن پر خدا کی رحمت یا لعنت کے نزول کا ذریعہ اور واسطہ ہیں،

لَا یَحْزُنُھُمُ الْفَزَعُ الْاَکْبَرُ وَتَتَلَقّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ط ھٰذَا یَوْمُکُمُ الَّذِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ، (انبیاء-۷)

نیکوکاروں کو وہ بڑی گھبراہٹ (قیامت) غمگین نہ کریگی اور فرشتے اُن کا آگے بڑھ کر استقبال کریں گے (کہ) یہی وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ

جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے،

اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ	پھر اس پر قائم رہے، اُن پر فرشتے یہ کہتے ہوئے
اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا	اترین گے کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو، اور اس جنت
بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ	کی خوشخبری سُنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا
اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ	تھا، ہم ہیں جو تمہاری پہلی اور اس دوسری
فِي الْاٰخِرَةِ، (فصلت - ۴)	زندگی میں تمہارے رفیق ہیں،

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ (احزاب ۶) وہی خدا تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے
اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ (،،،) اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں

وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ،	اور جو زمین میں ہیں، اُن کے لیے وہ خدا سے
(شوریٰ - ۱)	مغفرت کی دعا مانگتے ہیں،

اسی طرح وہ بدکاروں پر لعنت بھی کرتے ہیں،

اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ	اُن کی سزا یہ ہے کہ اُن پر اللہ کی اور فرشتوں

لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (آل عمران ۹) کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے،

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ	جو کفر کی حالت میں مرگئے، اُن پر اللہ کی
كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ	اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی
الْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (بقرہ ۱۹)	لعنت ہے،

۷۔ جنت اور دوزخ کا کاروبار بھی ملائکہ کے زیر اہتمام ہوگا،

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى جَهَنَّمَ	اور کفر کرنے والے گروہ در گروہ کرکے دوزخ

زُمَرًا حَتّٰی اِذَا جَاءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا اَلَمْ یَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ (زمر-۸)

کی طرف لیجائیں گے یہانتک کہ جب اُس کے پاس پہنچیں گے، تو اُس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اُس کے چوکیدار (فرشتے) کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس تمھیں میں سے

وَسِیْقَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا حَتّٰی اِذَا جَاءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِیْنَ، (زمر-۸)

اور جو اپنے پروردگار سے ڈرتے تھے وہ گروہ در گروہ جنت میں لیجائیں گے یہانتک کہ جب وہ اُس کے پاس پہنچیں گے، اور اُس کے دروازے کھولے جائینگے، اور اُس کے پاسبان کہیں گے، تم پر سلامتی ہو خوش چشم جنت میں ہمیشہ کے لئے داخل ہو جاؤ،

وَالْمَلٰٓئِكَةُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (رعد-۳)

اور اُن (جنتیوں) پر فرشتے ہر دروازہ سے داخل ہو کر کہیں گے تم پر سلامتی ہو، یہ تمہارے صبر کا بدلہ ہے یہ کیسا اچھا عاقبت کا گھر ہے،

عَلَیْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ، (تحریم-۱) اُس (دوزخ) پر سخت دل طاقتور فرشتے مقرر ہیں

وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً، (مدثر-۱) اور ہم نے دوزخ کا اہلکار فرشتوں ہی کو بنایا ہے،

۸۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ قدس کے حاضر باش ہیں،

وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ، (زمر-۸)

اور تم فرشتوں کو دیکھو گے کہ عرش کے اردگرد احاطہ کئے ہوئے اپنے پروردگار کی حمد و ثنا میں مصروف ہونگے،

لَا یَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى، (صافات) اعلیٰ اہلِ دربار کی باتیں وہ (شیاطین) نہیں سن سکتے،

مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَإِ الْأَعْلَىٰ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ، (ص - ۵)

مجھے خدا کے بلند درباریوں کا علم نہیں جب وہ باتیں کرتے ہیں،

قیامت کے دن بھی یہ تختِ الٰہی کے حامل اور اُس بارگاہ کے حاضر باش ہوں گے جو ہر وقت اُس کے ہر حکم کو بجالانے کے لیئے تیار رہیں گے،

وَالْمَلَكُ عَلَىٰ أَرْجَائِهَا وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ ، (حاقہ - ۱)

اور فرشتے اُس کے کنارون پر ہونگے اور تیرے پروردگار کے تخت کو آٹھ (فرشتے) اُس دن اپنے اوپر اٹھائے ہونگے،

كَلَّا إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا

ہرگز نہیں جب زمین ریزہ ریزہ کردیجائیگی، اور تیرا رب تشریف فرما ہوگا، اور فرشتے قطار در قطار

يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا (نبأ ۲) جس دن روح اور فرشتے صف باندھے کھڑے ہونگے

۹ - فرشتے خدا سے سرکشی اور اس کی نافرمانی نہیں کرتے، ہمیشہ اسکی تہلیل و تقدیس اور حمد و ثنا میں مصروف رہتے ہیں، اُس کے جلال و جبروت سے ڈرتے اور کانپتے رہتے ہیں، اور اُس کے حضور میں اہل زمین کے لئے عمومًا اور نیکو کاروں کے لئے خصوصًا مغفرت کی دعا مانگا کرتے ہیں،

وَالْمَلَائِكَةُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَنْ فِي الْأَرْضِ أَلَا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ، (شوریٰ ۱)

اور فرشتے حمد کیساتھ اپنے رب کی تسبیح کرتے ہیں اور زمین والوں کی بخشایش کی دعا مانگا کرتے ہیں، ہشیار کہ بخشنے والا اور رحم کرنیوالا خدا ہی ہے،

یعنی یہ دھوکا نہ ہو کہ فرشتوں کی دعا ہی رحمت و برکت کا ذاتی سبب ہے، بلکہ بخشش اور رحمت کرنیوالا صرف وہی خدائے واحد ہے اور یہ بخشش و رحمت اُسی کے دستِ اختیار ہے،

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، (مومن-۱)		جو (فرشتے) عرش کو اٹھائے ہیں، اور جو اس کے پاس ہیں، وہ سب اپنے پروردگار کی حمد و تسبیح کرتے ہیں، اور اس پر ایمان رکھتے ہیں، اور ایمان لانے والوں کی بخشایش کی دعا
وَلَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا یَسْتَحْسِرُوْنَ یُسَبِّحُوْنَ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ، (انبیاء-۲)		آسمانوں میں اور زمین میں جو کوئی ہے اسی کا ہے اور جو اس کے پاس ہیں، یعنی فرشتے، وہ اس کے سامنے اپنی عبودیت کے اظہار سے غرور نہیں کرتے، اور نہ اسکی عبادت سے تھکتے ہیں وہ رات دن خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں، اور سستی
بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ .... وَهُمْ مِّنْ خَشْیَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ، (انبیاء-۲)		بلکہ وہ بزرگ بندے ہیں، جو بات میں اس (خدا) پر پیش دستی نہیں کرتے، اور وہ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں، .... اور وہ اس کے خوف سے ترساں رہتے ہیں،
لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (تحریم-۱) وَیُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ، (رعد-۲)		خدا ان کو جس بات کا حکم دیتا ہے وہ اسمیں اسکی نافرمانی نہیں کرتے، اور وہی کرتے ہیں جس کا اور بجلی کی کڑک اور فرشتے خدا کی ڈر سے اسکی حمد و تسبیح کرتے ہیں،

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا	اور آسمانون مین اور زمین میں جو چارپایے
فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ	اور فرشتے ہیں، وہ سب خدا کو سجدہ کرتے ہین
وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ. يَخَافُوْنَ	اور اُس کے سامنے اپنی بڑائی نہیں کرتے
رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ	وہ اپنے مالک سے جو اُن کے اوپر ہے ڈرتے رہتے ہیں
مَا يُؤْمَرُوْنَ ؕ (نحل - ۶)	اور وہی کرتے ہیں جس کا اُن کو حکم ہوتا ہے

گذر چکا ہے کہ ملائکہ کا اعتقاد دنیا کے تمام مذہبون اور قومون میں کسی نہ کسی طرح رہا ہے، لیکن اُن کے اس اعتقاد میں بہت سی باتین ایسی داخل تھیں جو توحیدِ کامل کے منافی تھین، اسکندریہ کے نوافلاطونی فلسفہ کے روسے عقلِ اوّل کی اضطراری پیدایش کے بعد خدا کو معطل ہو جانا پڑا، اور فرشتون کو عقول کی صورت میں اصلی کارفرما قرار دیا گیا تھا، عراق کے صابی اجرام سماوی کی شکل میں اُن کی پرستش کرتے تھے، اور انھیں کو عالم کا فرمانروا مانتے تھے، یہود بھی اُن کو کسی قدر صاحبِ اختیار تصور کرتے تھے اور کبھی کبھی اُن کو خداوُن کا درجہ دیتے تھے، جیسا کہ توراۃ (صحیفۂ تکوین ۱۶-۱۲، ۱۸ و ۲۱ و ۳۲ و ۲۲) کے قصّوں میں کہیں کہیں نظر آتا ہے، انکو وہ خدا کے بیٹون کے خطاب سے بھی کبھی کبھی یاد کرتے تھے، (تکوین ۶،۲) ہندوؤن میں وہ دیوتا اور دیبی بن کر ایک طرف انسانی خصائص سے ملوث تھے، اور دوسری طرف اپنے ذاتی اختیارات کے لحاظ سے چھوٹے خداوُن کے مرتبہ پر بھی فائز تھے، عیسائی ان میں سے بعض مثلاً روح القدس کو خدا کا ایک جزء تسلیم کرتے تھے، اور یہ تثلیث کا ایک رکن تھا، عربون میں فرشتے خدا کی بیٹیون کا درجہ رکھتے تھے وہ اُن کی پوجا کرتے، اور اُن کو اپنے گناہون کا شفیع سمجھتے تھے،

تعلیم محمدی نے ان تمام عقائدِ باطلہ کو مٹا دیا، اور ایک ایک کر کے اُن میں سے ہر عقیدہ کی تردید کر دی، اور بتایا کہ فرشتے بھی خدا کی دوسری مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہیں، اُن کو خدائی کا کوئی اختیار حاصل نہیں، وہ صرف خدا کی اطاعت، عبادت اور اُس کے احکام کی بجاآوری مین مصروف رہتے ہیں، اُن مین سے جس کے جو کام سپرد ہے، وہ اسی کو انجام دیتا ہے، وہ ہماری ہی طرح بندۂ محض ہیں، وہ نہ عبادت کے مستحق ہیں، نہ خدا کے بے اذن وہ شفاعت کا ایک حرف زبان سے نکال سکتے ہیں، اور نہ خدا کے سامنے کچھ عرض کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں، یہودی اُن کو خدا کے بیٹے اور عرب خدا کی بیٹیان کہتے تھے، قرآن نے دونون کی تردید کی، اور بتایا کہ وہ انسانی خصائص اور میلانات سے پاک ہیں، وہ نہ مرد ہیں، نہ عورت ہیں، نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں، اور نہ خدائی کا دعویٰ کر سکتے ہیں، وہ خدا کے خوف سے ہمیشہ کانپتے اور لرزتے رہتے ہیں،

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّىْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ كَذٰلِكَ نَجْزِى الظّٰلِمِيْنَ (انبیا ۲)

مشرکون نے کہا کہ مہربان خدا نے اپنا لڑکا بنایا ہے، وہ اس سے پاک ہے بلکہ یہ (فرشتے) اس کے معزز بندے ہین جو بات میں اُس پر پیشدستی نہین کرتے اور وہ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں، خدا اُس سے جو اُن کے آگے اور پیچھے ہوتا ہے واقف ہے، وہ شفاعت نہین کرتے لیکن اُسی کی جس کیلئے خدا پسند کرتا ہے، اور وہ خدا کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں اور اُن میں سے جو یہ کہے کہ میں خدا ہون تو اسکو بھی اسی طرح ہم جہنم کی سزا دین گے،

اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ط سُبْحٰنَهٗ اَنْ
يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِي الْاَرْضِ ط وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا
لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا
لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ط وَمَنْ
يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ
فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا (نساء ۲۳-۲۴)

خدا تو ایک ہی ہے وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے
کوئی اولاد ہو آسمانوں میں اور زمین میں جو
کچھ ہے وہ اس کی ملکیت ہے، اور خدا کا وکیل
ہونا کافی ہے، مسیح کو اس سے عار نہ ہوگا کہ وہ خدا
کا بندہ ہے، اور نہ مقرب فرشتوں کو (اس سے عار ہے)
اور جو لوگ اسکی عبادت سے عار اور غرور کریں گے
تو وہ اُن سب کو اپنے پاس اکٹھا کریگا،

وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ
وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ط اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ
بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (اٰل عمران)

خدا اس کا حکم تم کو نہیں دیتا کہ تم فرشتوں
کو اور پیغمبروں کو خدا بناؤ کیا تم کو مسلمان
ہونے کے بعد کفر کرنے کا حکم دے گا،

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ
لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ
قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ
دُوْنِهِمْ ج بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ج
اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ (سبا-۵)

اور جس دن وہ سب کو جمع کریگا پھر فرشتوں
سے کہیگا کہ کیا یہ مشرکین تمہیں کو پوجتے تھے
وہ کہیں گے پاک ہے تو، تو ہمارا والی ہے
وہ نہیں ہیں، بلکہ وہ جنوں کو پوجتے تھے
وہ اکثر انہی جنوں پر ایمان لائے ہیں،

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ
صَفًّا ط لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ

جس دن روح اور فرشتے صف بستہ خدا کے
سامنے کھڑے ہونگے تو کچھ بول نہ سکیں گے لیکن

الرَّحۡمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ط (نبا-۲)	وہ جس کو وہ مہربان اجازت دی اور وہ ٹھیک
وَكَمۡ مِّنۡ مَّلَكٍ فِى السَّمٰوٰتِ لَا تُغۡنِىۡ	اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں جنکی سفارش
شَفَاعَتُهُمۡ شَيۡـًٔا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ	کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی لیکن اس کے بعد کہ
يَّاۡذَنَ اللّٰهُ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيَرۡضٰى (نجم-۲)	خدا جس کو چاہے اجازت دے اور پسند کرے
اَفَاَصۡفٰكُمۡ رَبُّكُمۡ بِالۡبَنِيۡنَ وَاتَّخَذَ	کیا تمہارے لیے خدا نے بیٹوں کو پسند کیا اور
مِنَ الۡمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ط اِنَّكُمۡ لَتَقُوۡلُوۡنَ	خود فرشتوں میں سے لڑکیاں اپنے لیے پسند کیں
قَوۡلًا عَظِيۡمًا، وَلَقَدۡ صَرَّفۡنَا فِىۡ هٰذَا	تم یقیناً بہت بڑی بات منہ سے نکالتے ہو اور
الۡقُرۡاٰنِ لِيَذَّكَّرُوۡا ط وَمَا يَزِيۡدُهُمۡ	ہم نے اس قرآن میں پھیر پھیر کر سمجھنے کو باتیں بیان
اِلَّا نُفُوۡرًا، قُلۡ لَّوۡ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ	کی ہیں لیکن یہ اُن کی نفرت کو اور بڑھاتا ہے، کہدو
كَمَا يَقُوۡلُوۡنَ اِذًا لَّابۡتَغَوۡا اِلٰى ذِى	اے پیغمبر کہ اگر اس ایک خدا برحق کیساتھ اور
الۡعَرۡشِ سَبِيۡلًا، سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا	بھی چند خدا ہوتے تو اُس تخت والے خدا کی طرف
يَقُوۡلُوۡنَ عُلُوًّا كَبِيۡرًا، تُسَبِّحُ لَهُ	وہ راستہ ڈھونڈھتے (کہ اس کے ہاتھ سے حکومت
السَّمٰوٰتُ السَّبۡعُ وَالۡاَرۡضُ وَمَنۡ	چھین کر خود قبضہ کرلیں) یہ مشرک جو کہتے ہیں
فِيۡهِنَّ، (اسرائیل-۵،۴)	خدا اُس سے بلند و برتر ہے، ساتوں آسمان اور
وَجَعَلُوا الۡمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيۡنَ هُمۡ عِبٰدُ	اور ان مشرکوں نے فرشتوں کو جو رحمت والے
الرَّحۡمٰنِ اِنَاثًا ط اَشَهِدُوۡا خَلۡقَهُمۡ	خدا کے بندے ہیں، عورتیں بنا دیا کیا وہ اُن کی
سَتُكۡتَبُ شَهَادَتُهُمۡ وَيُسۡـَٔلُوۡنَ ﴿﴾	پیدائش کے وقت حاضر تھے ہم انکی گواہی لکھیں گے

اور اس کی پاکی بیان کرتے ہیں زمین اور جو ان میں ہیں

وَقَالُوا لَوْ شَاءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ	اور اُن سے اُس کی باز پرس کیجائیگی، اور انھون نے
مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ	کہا کہ اگر خدا چاہتا تو ہم اُن (فرشتون) کو نہ پوجتے
إِلَّا يَخْرُصُوْنَ ، (زخرف - ۲)	انھین اُس کا تحقیقی علم نہین وہ صرف اٹکل لگاتے ہین

قرآن پاک میں اس مفہوم کی اور بہت سی آتیں ہیں، مگر یہان استقصا مقصود نہین، یہودیوں کا خیال تھا کہ فرشتے کھاتے پیتے بھی ہین، چنانچہ توراۃ میں جہان حضرت ابراہیمؑ کے پاس فرشتون کے آنے کا ذکر ہی، یہ بھی مذکور ہے کہ ابراہیمؑ نے اُن کیلئے دعوت کا سامان کیا" اور انھون نے کھایا" تکوین ۱۸-۸) لیکن قرآن پاک نے اس قصہ کو دہرا کر یہ تصریح کر دی ہی کہ فرشتے انسانی ضرورتون سے پاک ہین، چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے اُن کیلئے دعوت کا سامان کیا مگر

فَلَمَّا رَاٰ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ	جب ابراہیمؑ نے دیکھا کہ وہ کھانے کو ہاتھ نہین لگاتے
وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّا	تو اُس کو وہ انجان معلوم ہوئے، اور دل میں ڈرا انھون نے
اُرْسِلْنَا اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ، (هود - ۷)	کہا ڈر نہین، ہم لوطؑ کی قوم کی طرف (انکے تباہ کرنے)

کفار قریش کا مطالبہ تھا کہ انسان کے بجائے کوئی فرشتہ پیغمبر بنا کر کیون نہیں بھیجا گیا، اس کے جواب مین کہا گیا،

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ	اور اگر ہم پیغمبر کو فرشتہ بنا کر بھیجتے تو (آدمیون کیلئے)
لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝	اسکو آدمی ہی بناتے اور جس شبہہ میں اب ہم نے انکو
(انعام - ۱)	ڈالا ہی اسی میں وہ پھر بھی پڑے رہتے یعنی یہی کہتے

اس آیت اور دوسری آیتون سے ملکوتیت اور بشریت کی قوتون کا اختلاف ظاہر ہوتا ہم

فرشتے کبھی کبھی عارضی طور سے انسان کے مثالی لباس مین بھی جلوہ گر ہوتے ہیں، جیسا کہ حضرت مریمؑ وغیرہ کے قصوں مین ہی،

فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا، (مریم-۲) وہ فرشتہ ایک اچھے خاصے بشر کی مثالی صورت مین ظاہر ہوا

یہی وہ صورت تھی جس میں حضرت ابراہیمؑ کو فرشتون کے انسان ہونے کا دھوکا ہوا اور اُن کیلئے دعوت کا سامان کیا مگر یہ دھوکا جلد رفع ہوگیا اور معلوم ہوگیا کہ وہ انسان کی مثالی صورت میں فرشتے ہین،

ان تمام تفصیلات کے بعد یہ غور کرنا ہی کہ فرشتون پر ایمان لانے سے اسلام کا کیا مقصود ہے؟ حقیقت مین اس سے دو باتین مقصود ہیں،

۱- ایک یہ کہ اسلام سے پہلے بت پرست اقوام اور دوسرے اہلِ مذاہب مین ان فرشتون کو خدائی کا جو مرتبہ دیا گیا تھا، اس غلط عقیدہ کو مٹا کر یہ حقیقت ظاہر کیجائے کہ ان کی حیثیت بے اختیار محکوم بندہ کی ہی جب تک اُس کی تصریح نہ ہوتی، کلمۂ توحید کی تکمیل ممکن نہ تھی،

۲- دوسرا مقصد یہ ہے کہ مادہ کے خواص وطبائع کو دیکھکر مادہ پرست جوان مادی خواص طبائع کی بالذات کارفرمائی کا یقین کرتے ہیں اس کا ازالہ کیا جائے، کیونکہ یہی چیز اُن کی ٹھوکر کا باعث ہوتا ہی اور بالآخر خدا کے انکار تک اُن کو لیجاتا ہی، درحقیقت ان مادی خواص طبائع پر روحانی اسباب مسلط ہین، جو خدا کے حکم سے اس کے مقررہ اصول کے مطابق نظامِ عالم کو چلا رہے ہیں، مادہ اور اُس کے خواص بالذات مؤثر نہین، بلکہ کوئی دوسرا ہی جو اپنے ارواح مجردہ کے ذریعہ سے اُون کو موثر بناتا ہی، اس عقیدہ سے مادیت کا بت ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جاتا ہی، غرض منزہ خالق اور مادی مخلوق کے درمیان احکام و شرائع کا نزول اور قدرتِ الٰہی کے افعال کا صدور ان محکوم ارواحِ مجردہ کے ذریعہ ہوتا ہے،

رسولوں پر ایمان

وحدتِ رسالت

یہ عقیدہ اسلام کی اُن خصوصیات میں سے ہے جن کی تکمیل صرف اُسی کے ذریعہ سے انجام کو پہنچی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ مبارک سے پہلے دنیا کی ہر قوم کو بجائے خود یہ خیال تھا، کہ وہی اللہ تعالیٰ کی خاص محبوب اور پیاری ہے، تمام دنیا کی قوموں میں ہدایتِ ربانی کے لئے وہی منتخب کی گئی ہے، اُس کے علاوہ دنیا کی تمام قومیں اس فیض سے قطعاً محروم ہیں اور رہیں گی، اسی کی سرزمین دیوتاؤں اور دیبیوں کا مسکن اور اسی کی زبان خدا کی خاص مقدس زبان ہے، بابل و نینوا ہو یا مصر و یونان ایران ہو یا آریہ ورت ہندوستان، ہر ملک کے لوگوں کو بجائے خود تنہا خدا کی مقدس اور برگزیدہ مخلوق ہونے کا دعویٰ تھا، اور وہ صرف اپنے کو خدا کے پیغام اور خطاب سے مشرف ہونے کا مستحق جانتے تھے، لیکن تعلیم محمدی نے تنگ خیالی کے اس محدود دائرہ کو دنیا کی عظیم الشان وسعت سے بدل دیا آپ نے یہ سکھایا کہ دنیا کی تمام قومیں خدا کی نظر میں یکساں ہیں نہ عرب کو عجم پر اور نہ عجم کو عرب پر فضیلت ہے اور نہ کالے کو گورے پر اور نہ گورے کو کالے پر کوئی تقدم حاصل ہے[1] ساری زمین خدا کی ہے اور تمام قومیں ایک خدا کی مخلوق ہیں، آپ نے فرمایا لوگو! تم سب ایک ہی باپ (آدم) کی اولاد ہو، اور وہ مٹی

---

[1] مسند احمد ابن حنبل (از ابو نصر تابعی)

سے پیدا ہوا تھا[1] اسی طرح یہ بھی تعلیم دی کہ انسانوں اور قوموں کا امتیاز رنگ، روپ، ملک، مرز و بوم اور زبان سے نہیں ہے، بلکہ صرف تقوی اور نکوکاری سے ہے[2]،

اس تعلیم کا سب سے پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ قوموں اور ملکوں کی فطری فضیلت کی پرانی داستان فراموش ہوگئی، دنیا کی تمام قومیں ایک سطح پر آگئیں اور مساوات انسانی کا راستہ صاف ہوگیا، بنی اسرائیل جن کو خدا کا کنبہ ہونے پر ناز تھا، وحی محمدیؐ نے اُن کی اس حیثیت کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، اور کہا

بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ، (مائدہ ۳)	بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے بشر ہو،

بنی اسرائیل کو دعویٰ تھا کہ نبوت اور پیغمبری صرف ہمارے خاندان کا ورثہ ہے جس طرح اس آریہ ورت کا دعویٰ ہے کہ خدا کی بولی صرف یہیں کے رشیوں اور منیوں نے سنی جو ویدکے اوراق میں محفوظ ہے، اسی طرح دوسری قوموں کو بھی اپنی اپنی جگہ پر یہی خیال تھا اسلام نے اس تخصیص کو خدا کے انصاف وعدل وکرم اور رحمتِ عام کے منافی قرار دیا، اور کہدیا:-

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ	یہ (نبوت) اللہ کی مہربانی ہے جس کو چاہے دے،
وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ، (جمعہ ۱)	اور اللہ بڑی مہربانی والا ہے،
قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ اَنْ	کہدو کہ ہدایت، اللہ کی ہدایت ہے (اسرائیلی علما
يُّؤْتٰۤى اَحَدٌ مِّثْلَ مَاۤ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ	اپنے ہم مذہبوں سے کہتے ہیں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ)
عِنْدَ رَبِّكُمْ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ	جیسا دین تم کو دیا گیا کسی اور کو دیا جائے، یا یہ
يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ	دین والے تم سے خدا کے آگے جھگڑا سکیں کہدو کہ

---

[1] جامع ترمذی آخر کتاب المناقب [2] قرآن اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ،

يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (آل عمران ۔ ۸)	(یہ نبوت کا) فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے اُس کو دیتا ہے اور اللہ کی رحمت بہ عام ہے اور وہ اپنی مصلحتوں کو اچھی طرح جانتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کیساتھ مخصوص
مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۔ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاءُ ۔ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (بقرہ ۔ ۱۳)	اہلِ کتاب میں جو منکر ہیں، وہ یہ نہیں پسند کرتے، اور نہ مشرکین پسند کرتے ہیں کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے کوئی بھلائی نازل ہو، اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے مخصوص کرتا ہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے

اُس نے یہ تعلیم دی کہ روے زمین کی ہر آبادی میں ہر قوم میں اور ہر زبان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کی راہ دکھانے والے اُس کی آواز پہنچانے والے اور انسانوں کو اُن کی غفلت سے چونکانے والے پیغمبر یا نائب پیغمبر آئے، اور یہ سلسلہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک جاری رہا۔

بعثتِ محمدی ؐ سے پہلے دنیا کی کل آبادی مختلف گھرانوں میں بٹی ہوئی اور ایک دوسرے سے ناآشنا تھی، ہندوستان کے رشیوں اور منیوں نے آریہ ورت سے باہر کی دنیا کو خدا کی آواز سننے کا کبھی مستحق نہیں سمجھا تھا اُن کے نزدیک پرمیشور صرف آریہ ورت کی ہدایت اور رہنمائی کا خواہاں تھا زردشت نے پاک نژادانِ ایران کے سوا سب کو یزداں کے جلوۂ نورانی سے محروم یقین کیا تھا، بنی اسرائیل اپنے خانوادہ کے سوا کہیں اور کسی نبی یا رسول کی بعثت کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے، عیسائی صرف

اپنے کو خدا کی فرزندی کا مستحق سمجھتے تھے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر بتایا کہ خدا کی ہدایت اور رہنمائی کے ظہور کے لیئے کسی ملک، قوم اور زبان کی تخصیص نہیں، اس کی نگاہ میں عرب و عجم شام و ہند سب برابر ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمہ بین آنکھوں نے پورب، پچھم، اتر، دکھن ہر ملک اور ہر قوم میں خدا کا نور دیکھا، اور ہر زبان میں اس کی آواز سنی،

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ (یونس-۵)	اور ہر قوم کے لیئے ایک رسول ہے،
وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِی كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا (نحل۵)	اور یقیناً ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا،
وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا	اور ہم نے تجھ سے پہلے کتنے رسول اُن کی اپنی
اِلٰی قَوْمِهِمْ، (روم-۵)	اپنی قوم میں بھیجے،
وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ، (رعد-۱)	اور ہر قوم کے لئے ایک رہنما آیا،
وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ	اور کوئی قوم نہیں جس میں ایک ہشیار کرنیوالا
(فاطر-۳)	نہ آیا ہو،
وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِیٍّ فِی الْاَوَّلِيْنَ، (زخرف۱)	اور ہم نے پہلی قوموں میں کتنے پیغمبر بھیجے،
وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ	اور ہم نے ہر پیغمبر کو اُس کی قوم کی بولی میں
قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ، (ابراهيم-۱)	بھیجا، تاکہ وہ اُن کو بتا سکے،

اس آخری آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ رسول تعلیم الٰہی تشریح و بیان کیلئے مامور ہیں، ایک یہودی کے لئے حضرت موسیٰؑ کے سوا کسی اور کو پیغمبر ماننا ضروری نہیں ایک عیسائی تمام دوسرے پیغمبروں کا انکار کرکے بھی عیسائی رہ سکتا ہے ایک ہندو تمام دنیا کو ملیچھ، شودر، اور

چنداں کہکر بھی پکا ہندو رہ سکتا ہے، ایک زردشتی تمام عالم کو بجز ظلمات کہکر بھی نورانی ہو سکتا ہے، وہ ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو نعوذ باللہ جھوٹا کہکر بھی دینداری کا دعویٰ کر سکتا ہے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ناممکن کر دیا ہے کہ کوئی اُن کی پیروی کا دعوی کر کے اُن سے پہلے کے کسی پیغمبر کا انکار کر سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تہجد میں جو دعا پڑھتے تھے، اس میں ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا وَالنَّبِيُّونَ حَقٌّ وَمُحَمَّدٌ حَقٌّ[۱] (سب نبی برحق تھے، اور محمد بھی برحق ہے) غرض کوئی شخص اس وقت تک محمدی نہیں ہو سکتا، جب تک وہ پہلے موسوی و عیسوی اور ایرانی و ہندی نہ بن لے، اور کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ دنیا کے تمام پیغمبروں کی یکساں صداقت حقانیت اور راست بازی اور معصومیت کا اقرار نہ کر لے اور یقین نہ کرے، کہ اُن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے عرب کی طرح ہر قوم کو اپنی ہدایت و رہنمائی سے سرفراز کیا ہے اور اُن کا ماننا ایسا ہی ضروری ہے جیسا خدا کا ماننا

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ	بیشک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا
وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ	انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں، کہ اللہ اور اس کے
وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ	رسولوں کے درمیان فرق کریں اور کہتے ہیں کہ
وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا	ہم بعض کو مانیں گے اور بعض کو نہیں مانیں گے اور
بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا أُولَٰئِكَ هُمُ	چاہتے ہیں کہ اس کے بیچ بیچ میں کوئی راستہ نکالیں
الْكَافِرُونَ حَقًّا وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ	وہی تو حقیقت میں کافر ہیں، اور کافروں
عَذَابًا مُهِينًا وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ	کے لئے ہم نے اہانت والا عذاب تیار رکھا ہے

[۱] صحیح بخاری باب التہجد،

وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا، (نساء - ۲۱)

اور جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کیا، تو وہی لوگ ہیں جن کی مزدوری خدا اُن کو دیگا، اور اللہ بخشنے والا، رحمت والا ہے

وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ، (بقرہ - ۲۲)

اور فرشتوں پر، کتاب پر، اور سب نبیوں پر ایمان لانا نیکی ہے،

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا (نساء - ۲۰)

اور جس نے خدا کا اور اُس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا، اور اُس کے رسولوں اور قیامت کا انکار کیا، وہ نہایت سخت گمراہ ہوا

بقرہ کے خاتمہ میں ہے،

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ، (بقرہ - ۴۰)

ہر ایک خدا پر، اور اُس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا، ہم خدا کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ، (بقرہ ۱۶، وآل عمران - ۹)

ہم اُن پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے،

پیغمبروں میں تفریق کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اُن میں سے بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں، اسلام نے اس کی ممانعت کی اور عام حکم دیا کہ دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکسان

خدا کا رسول صادق اور راستباز تسلیم کیا جائے،

یہودی حضرت عیسیٰؑ کو نعوذ باللہ جھوٹا اور کاذب سمجھتے تھے، اور ان پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے تھے، اور اب بھی ان کا یہی عقیدہ ہے، یہودیت اور اسلام میں جو اشتراک ہے، وہ مسیحیت سے زیادہ ہے، اس لیے اگر اسلام کی راہ میں حضرت مسیحؑ کا نام نہ آئے، تو بہت سے یہود مسلمان ہونے کو تیار ہو جائیں مگر اسلام نے کبھی یہ ننگ گوارا نہیں کیا، اور جب تک کسی یہودی سے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت معصومیت اور تقدس کا اقرار نہیں لے لیا، اس کو اپنے دائرہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بہت سے یہود آپ کی رسالت اور شریعت پر ایمان لانے کو تیار تھے، مگر حضرت عیسیٰؑ کو ماننے کیلیے تیار نہیں تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی دوستی کے عظیم الشان فائدوں سے محروم رہنا گوارا کیا، مگر مسیح علیہ السلام کی سچائی سے محروم رہنا قبول نہ فرمایا[1] اور ان سے صاف کہا

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ هَلْ تَنْقِمُونَ مِنَّا	اے یہود! کیا برا ہے تم کو ہم سے، مگر یہی کر
إِلَّا أَنْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا	ہم خدا پر، اور جو ہماری طرف اتارا گیا، اور
وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ وَأَنَّ أَكْثَرَكُمْ	جو پہلے اتارا گیا، اس پر ایمان رکھتے ہیں اور
فَاسِقُونَ (مائدہ ۸ - ۹)	تم میں اکثر بے حکم ہیں،

خود قریش کا یہ حال تھا کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے نام سے چڑتے تھے، تاہم ان کی خاطر حضرت عیسیٰؑ کی نبوت، تقدس اور معصومیت کا انکار نہیں کیا گیا، قرآن نے کہا،

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا	اور جب مریم کے بیٹے کی کہاوت بیان کی گئی

[1] تفسیر ابن جریر طبری جلد ششم ص ۱۶۷ مصر۔

قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ، وَقَالُوْآ	تو تیری قوم اس سے چلانے لگتی ہے اور
ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ	بولی کہ ہمارے معبود اچھے ہیں، یا وہ، یہ
اِلَّا جَدَلًا ط بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ	نام جو وہ تجھ پر دھرتے ہیں، صرف جھگڑنے کو،
اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ،	بلکہ وہ جھگڑالو ہیں، وہ ایک بندہ ہے جس پر
(زخرف - ۶)	ہم نے فضل کیا،

قریش کو معلوم تھا کہ اسلام عیسیٰؑ بن مریم کو بندہ اور رسول مانتا ہے، خدا نہیں، باوجود اس کے عیسائیون کی طرح مسلمانون کو بھی حضرت عیسیٰؑ کے ماننے کی وجہ سے عیسیٰ پرستی کا الزام دھرتے تھے، قرآن نے اُن کے اس بے معنی اعتراض کی تردید کی،

اسلام میں پیغمبروں کی کوئی تعداد محدود نہیں ہے، طبرانی کی ایک ضعیف روایت میں آیا ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء مبعوث ہوئے، دوسری روایت میں اس سے کم تعداد بھی مروی ہے قرآن پاک نے نام کیساتھ صرف انہی انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے جن سے عرب مانوس تھے، یا اُن کے ہمسایہ یہود و نصاریٰ کے صحیفون مین جن کے تذکرے تھے، قرآن میں بعض ایسے انبیاء بھی مذکور ہین جن سے صرف عرب واقف تھے، اور یہود و نصاریٰ بے خبر تھے، مثلاً حضرت ہودؑ، اور حضرت شعیبؑ بعض ایسے بھی ہیں جن کو یہود و نصاریٰ جانتے تو تھے لیکن پیغمبر نہین تسلیم کرتے تھے مثلاً حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ، وحی محمدی نے ان سب کو پیغمبر تسلیم کیا، اور اُن کی صداقت و عظمت کا اقرار کیا،

اسی سلسلہ میں ایک اور واقعیت کی طرف اشارہ کر دینا مناسب ہے، اسلام سے پہلے نبوت، رسالت، اور پیغمبری کی کوئی خاص واضح اور غیر مشتبہ حقیقت دنیا کے سامنے نہ تھی،

یہود کے ہاں نبوت کے معنی صرف پیشین گوئی کے تھے، اور نبی پیشین گو کو کہتے تھے، اور جس کے متعلق وہ یقین رکھتے تھے کہ اُس کی دعا یا بد دعا فوراً قبول ہو جاتی ہے[1] اسی لئے حضرت ابراہیمؑ حضرت لوطؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کی نبوت اور رسالت کا نقش دھندلا سا خاکہ اُن کے ہاں موجود ہے، بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے مقابلہ میں شالم کے کاہن مالک کی پیغمبرانہ شان اُن کے نزدیک زیادہ نمایاں معلوم ہوتی ہے[2] حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کی حیثیت اُن کے ہاں صرف بادشاہ کی ہے، اور اُن کے زمانہ کے پیشین گوئی کرنے والے پیغمبر اور ہیں، یہی سبب ہے کہ یہود کے قصوں اور کتابوں میں اسرائیلی پیغمبروں کی طرف نہایت سخیف باتیں بے تامل منسوب کی گئی ہیں، عیسائیوں کے ہاں بھی رسالت اور نبوت کی کوئی واضح حقیقت نہیں بیان کی گئی ہے ورنہ یہ نہ کہا جاتا کہ مجھ سے پہلے جو آئے، وہ چور اور ڈاکو تھے[3] موجودہ انجیلوں میں نہ خدا کے رسولوں کی تعریف ہے، نہ اُن کے تذکرے ہیں، نہ اُن کی سچائی اور صداقت کی گواہی ہے، حضرت زکریاؑ، اور حضرت یحییٰؑ جن کے تذکرے انجیل میں ہیں، وہ بھی پیغمبرانہ شان کے ساتھ اُن کے ہاں مسلم نہیں، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر اس جلیل القدر منصب کی حقیقت ظاہر کی، اس کے فرض بتائے، اُس کے خصوصیات کا اظہار کیا، اور اُن سب پر ایمان لانے کو نجات کا ضروری ذریعہ قرار دیا! آپ نے بتایا کہ نبوت و رسالت خاص انسانوں کو خدا کا بخشا ہوا ایک منصب ہے جس کو دیکر وہ دنیا میں اس غرض سے بھیجے گئے کہ خدا کے احکام لوگوں کو بتائیں، اور سچائی اور نیکی کا راستہ اُن کو دکھائیں، وہ ہادی (رہنما) نذیر (ہشیار کرنے والے) داعی (خدا کی طرف بلانیوالے) مُبشر (خوشخبری

---

[1] دیکھو توراۃ صحیفۂ تکوین، باب ۲۰-۷، [2] سفر تکوین ۱۴-۱۸، [3] انجیل،

سُنانے والے) معلّم (سکھانے والے) مبلّغ (خدا کے احکام پہنچانے والے) اور نور (روشنی) تھے، خدا
اُن سے ہم کلام ہوتا تھا، اپنی باتوں سے اُن کو مطلع کرتا تھا، اور وہ اُن سے دوسرے انسانوں کو آگاہ
کرتے تھے، وہ گناہوں سے پاک اور برائیوں سے محفوظ تھے، وہ خدا کے نیک اور مقبول بندے
تھے، اور اپنے عہد کے سب سے بہتر انسان تھے، اُن کے سب کام خدا کے لیۓ تھے، اور خدا اُن کیلئے
تھا، یہ ہستیان اپنے فرائض کو انجام دینے کے لیۓ ہر قوم مین پیدا ہوئین جنھون نے اُن کو مانا، نجات
پائی، اور جنھون نے جھٹلایا، ہلاک و برباد ہوۓ، قرآن پاک نے اُن کی زندگی کے سوانح اُن کی
تبلیغ کی روداد، اُن کے اخلاق کی بلند مثالیں، اور اُن کی خدا پرستی کا اخلاص اس طرح بیان
کیا ہے کہ اُن کے پڑھنے اور سننے سے اُن کی پیروی کا جذبہ اُن کی اتباع کا شوق اور اُن کی
صداقت کا یقین دلون میں پیدا ہو جاتا ہے، اور ساتھ ہی اُس نے شان نبوت کے خلاف
جو غلط باتین دوسرے صحیفوں میں اُن کی طرف منسوب تھین اُنکو چھوڑ دیا ہے اور یا اُن کی تردید کر دی ہے،
الغرض نبوت اور رسالت کی سب سے اہم خصوصیت اسلام نے جو یہ قرار دی کہ نبی و رسول گناہون
سے پاک اور برائیوں سے محفوظ، اور معصوم ہوتے ہیں، بنی اسرائیل کو نبوت و رسالت کے اس بلند تخیل
کی ہوا ابھی نہیں لگی تھی، اس لیۓ انھون نے نہایت بے باکی سے اپنے پیغمبروں کی طرف ہر قسم کے
گناہ منسوب کر دیئے عیسائی ایک حضرت عیسیٰؑ کو تو معصوم کہتے ہیں، باقی سب کی گنہگاری کے
قائل ہین لیکن اسلام نے دنیا کے تمام پیغمبرون اور رسولون کی عظمت کی ایک ہی سطح قائم کی ہے
اس کے نزدیک گناہون سے پاکی اور عصمت تمام انبیاء اور مرسلین کا مشترک وصف ہے کیونکہ
گنہگار گناہگارون کی رہنمائی کا مستحق نہیں، اور اندھا اندھے کو راہ نہیں دکھا سکتا اس بنا پر محمد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی و تعلیم نے خدا کے تمام معصوموں کی عظمت و جلالت دنیا میں قائم کی، اور جن کور باطنوں نے اُن کی عصمت و بے گناہی کے دامن پر اپنے وہم و نادانی سے داغ لگائے تھے اُن کو دھو کر پاک و صاف کیا، اور یہ رسالت محمدیؐ کا عظیم الشان کارنامہ ہے،

خود انجیل کے طرز سے ظاہر تھا، کہ حضرت عیسیٰ احکام عشرہ کے برخلاف اپنی ماں کی عزت نہیں کرتے تھے، قرآن نے اس کی تردید کی، اور خود حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے کہلوایا،

وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا، (مریم - ۲)	اور اپنی ماں کے ساتھ نیکی کرنے والا، اور مجھ کو خدا نے جبار اور بدبخت نہیں بنایا،

کیونکہ احکامِ عشرہ کے مطابق ماں باپ کا ادب نہ کرنا بدبختی تھی، اسی طرح موجودہ انجیل نے حضرت عیسیٰؑ پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ نماز و روزہ کی پروا نہیں کرتے تھے، قرآن نے ان کی زبان سے کہلوایا،

وَأَوْصَانِي بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا، (مریم - ۲)	اور خدا نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے، جب تک میں جیتا رہوں،

یہود حضرت مریمؑ پر تہمت رکھتے تھے، قرآن نے اس الزام کو دور کیا، اور کہا،

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُّوحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ، (تحریم - ۲)	اور مریم بنت عمران جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی، اور اس نے اپنے پروردگار کی باتوں اور اس کی کتابوں کو سچ جانا، اور وہ بندگی

وہم پرست یہود حضرت سلیمانؑ کو گنڈا، تعویذ اور عملیات وغیرہ کا موجد سمجھتے تھے، حالانکہ سحر و جادو وغیرہ توراۃ میں شرک قرار دیا جا چکا تھا، قرآن نے علانیہ یہودیوں کے اس الزام کی تردید کی،

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَكِنَّ الشَّيَاطِيْنَ	اور سلیمانؑ نے کفر کا کام نہیں کیا بلکہ شیطانوں
كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ (بقرہ)	نے کیا، لوگوں کو وہ جادو سکھاتے تھے،

اسی طرح حضرت لوطؑ پر بدکاری کا جو الزام یہود لگاتے ہیں، اس کی تردید کی،

اوپر گذر چکا ہے کہ قرآن نے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے تمام پیغمبروں کے نام نہیں لیے ہیں، صرف ناموں کی فہرست یا نامعلوم اشخاص کے نام لے لینے سے دلوں میں جوش عقیدت نہیں پیدا ہو سکتا تاہم معلوم تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صدائے دعوت ایک دن دنیا کے کناروں تک پہنچے گی، اور بہت سی غیر قومیں اور دوسرے انبیاء کی امتیں اس حلقہ میں داخل ہوں گی، اور اپنے اپنے انبیاء کا نام و نشان صحیفۂ محمدیؐ میں تلاش کریں گی، اس لیے ایک جامع آیت میں تمام انبیاء کا تذکرہ کر دیا گیا، اور اُن کی صداقت کی پہچان بتا دی گئی فرمایا،

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ	ہم نے (اے محمد) تمہارے پاس وحی بھیجی جس طرح
اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ	نوحؑ اور اُن کے بعد کے پیغمبروں کے پاس بھیجی، اور
اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَ	ہم نے ابراہیمؑ کو، اور اسماعیلؑ کو اور اسحاقؑ کو، اور
يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَ	یعقوبؑ کو اور اُن کے خاندان کو، اور عیسیٰؑ کو، اور
يُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا	ایوبؑ کو اور یونسؑ کو اور ہارونؑ کو اور سلیمانؑ کو وحی
دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۚ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ	بھیجی اور داؤدؑ کو زبور عطا کی، اور دوسرے رسولوں

عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ	کو بھیجا جن کا حال تم سے ہم نے پہلے بیان کیا اور
عَلَيْكَ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا، رُسُلًا	اُن رسولوں کو جن کا حال ہم نے تم سے بیان نہیں
مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ	کیا، اور خدا نے موسیٰ سے بات کی، اُن رسولوں کو
لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَ	خوشخبری سُنانے والا اور ہشیار کرنیوالا بنا کر بھیجا،
كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا،	تاکہ لوگوں کو رسولوں کے آجانے کے بعد خدا کے
(نساء ۔ ۲۳)	آگے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے، اور خدا غالب دانا ہے،

انبیائے کے متعلق یہی حقیقت سورۂ مومن میں دوبارہ بیان کی گئی ہے،

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ	اور ہم نے یقیناً تم سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے، ان
مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ	میں کچھ وہ ہیں جن کا حال تم سے بیان کیا اور
مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (مومن ۸)	کچھ وہ ہیں، جن کا حال تم سے بیان نہیں کیا،

تعلیم محمدیؐ کے اصول کے مطابق یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی قوموں اور ملکوں جیسے چین، اور ایران اور ہندوستان میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے خدا کے انبیا مبعوث ہو چکے ہیں، اور اس لئے یہ تمام قومیں اپنے جن بزرگوں کی عزت وعظمت کرتی ہیں اور اپنے دین ومذہب کو جن کی طرف منسوب کرتی ہیں، اُن کی صداقت اور راستبازی کا قطعی انکار کوئی مسلمان نہیں کرسکتا، اسی بنا پر بعض علمائے نے ہندوستان کے کرشن اور رام[1] کو بلکہ ایران کے زروشت[2] کو بھی اور بعض صاحبوں نے تو بودھ تک کو پیغمبر کہا ہے، بہرحال امکان میں تو شک ہی نہیں لیکن یقین کیساتھ ان ناموں

[1] کلمات طیبات حضرت شاہ مرزا مظہر جانجاناں [2] ملل ونحل ابن حزم،

کی تعیین بھی حد سے تجاوز کرنا ہی، اصل یہ ہے کہ قرآن نے انبیار کی دو قسمین کی ہین، ایک وہ جن کے نامون کی اُس نے تصریح کی ہی، اور دوسرے وہ جن کے نام اُس نے بیان نہین کیے ہین، اسلیے صحیح یہ ہے کہ جن انبیاء کے نام مذکور ہین، تمام مسلمانون کو اُن پر نام بنام ایمان لانا چاہیے اور جن کے نام مذکور نہین، اُن کی نسبت صرف یہ اجمالی ایمان کافی ہی کہ اُن قومون میں بھی خدا کے فرستادہ پیغمبر آئے تھے، گو بہ تخصیص ان کے نام ہنیں معلوم ہین، وہ قومیں جن کا نام لیتی ہیں، اگر اُن کی زندگی، اور ان کی تعلیم نبوت اور رسالت کی شان کے مطابق ہین، تو اُن کی نبوت اور رسالت کی طرف رجحان اور میلان بلکہ قرینۂ غالب ہوسکتا ہی لیکن یقین اس لیے نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے پاس ان باتون پر یقین کرنے کا ذریعہ صرف وحی ہے، اور وہ اس تخصیص وتعین سے خاموش ہے،

اس قسم کے انبیاء جن کے نام گو قرآن مین مذکور نہیں، مگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے گذر چکے ہین، اور اُن کے پیرو اُن کو اپنے ہان نبوت ورسالت کا درجہ دیتے ہیں، اُن کی شناخت اور پہچان کا ایک اصول قرآن نے مقرر کیا ہی اور وہ یہ ہی کہ انھون نے اپنی قوم کو توحید کی تعلیم دی ہی

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا	اور ہم نے ہر قوم مین ایک رسول بھیجا کہ اللہ
أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ	کی پرستش کرو، اور جھوٹے معبود سے بچے رہو،
وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ	اور ہم نے تجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں بھیجا لیکن
إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا	اس کو یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی خدا نہین،
فَاعْبُدُونِ ٥ (انبیاء - ۲)	مجھی کو پوجو،

اس لیے وہ تمام قدیم رہبرانِ انسانی اور رہنمایانِ عالم جو دنیا مین کسی مذہب کو لائے اور جنکی

تبلیغ وتعلیم توحید کی دعوت اور بت پرستی سے اجتناب تھی، اور جن کی زندگی اس تعلیم کے شایان شان تھی، اُن کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنی قوم کے اور اپنے وقت کے رسول اور پیغمبر نہ تھے اتنی بڑی بڑی قومیں خود قرآن کے اصول کے مطابق انبیاءؑ اور رسولوں کے وجود سے خالی نہیں رہ سکتی تھیں، اسی بنا پر اسلام کی ان تلقینات مین سے جن کے تسلیم کیے بغیر کوئی شخص مسلمان نہین ہو سکتا، ایک یہ بھی ہے کہ وہ تمام ملکوں کے پیغیبرون اور تمام قومون کے رسولون کو جو حضرت خاتم نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے پہلے پیدا ہوئے، یکسان صداقت کیساتھ تسلیم کرے ان سب نے تمام دنیا کو ایک ہی تعلیم دی ہے اور وہ توحید ہے البتہ ان انبیاء مین سے ایک کو دوسرے پر بعض بعض حیثیتوں سے ترجیح ہے

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ، (بقرہ ۷-۳۳)

ان رسولوں میں سے ہم نے کسی کو کسی پر فضیلت دی، اُن میں سے کسی سے اللہ نے کلام کیا، کسی کے بہت درجے بڑھائے، اور ہم نے عیسیٰ بن مریمؑ کو نشانیان دین اور پاکی کی روح سے اس کی تائید کی،

آپ نے دوسرے انبیاء کی جائز تعظیم وتکریم یہان تک کی ہے کہ اُن کے مقابلہ مین کبھی کبھی اپنی ہستی بھی فراموش کر دی ہے ایک دفعہ ایک صحابی نے آپ کو "یا خیر البریۃ" اے بہترین خلق! کہکر خطاب کیا، فرمایا "وہ تو ابراہیمؑ تھے"[۱]، ایک دفعہ ایک صاحب نے دریافت کیا کہ سب سے عالی خاندان کون تھا؟ فرمایا یوسف پیغمبر بن پیغمبر بن پیغمبر بن خلیل اللہ[۲] ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک یہودی

---

۱ مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۵۲، ۲ صحیح بخاری کتاب الانبیاء مناقب حضرت یوسف ص ۴۷۹،

مدینہ میں کہہ رہا تھا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس نے موسیٰ کو بشر پر فضیلت دی، ایک مسلمان یہ کھڑے سُن رہے تھے، اُن کو غصہ آگیا، کہ ہمارے پیغمبر کی موجودگی میں تم یہ کہہ رہے ہو اور اس کو ایک تھپڑ کھینچ مارا اُس نے دربار نبویؐ میں جاکر شکایت کی، آپ نے اُن صحابی کو بلا بھیجا اور مقدمہ کی رُوداد سنی پھر نہایت برہم ہوکر فرمایا کہ پیغمبروں میں باہم ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو[1]، یعنی ایسی فضیلت جس سے کسی دوسرے نبی کی تنقیص ہوتی ہو

یہی وہ تعلیماتِ محمدی ہیں جن کے ذریعہ سے دنیا میں وحدتِ مذاہب روحانی مساوات انسانی اخوت، اور تمام انبیاءؑ اور پیغمبروں کے ادب احترام کے جذبات پیدا ہوئے بنی اسرائیل کے وہ پیغمبر جن کو ماننے والے تمام دنیا میں چند لاکھ سے زیادہ نہ تھے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اُن کی عظمت وجلالت اور ادب واحترام کرنیوالے چالیس کروڑ سے زیادہ ہوگئے وہ حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ جو چھ سو برس تک یہودیوں کی جھوٹی تہمت سہتے رہے محمد رسول اللہؐ نے آکر وہ فتنہ اس کو مٹادیا، اور اُن کی پاکی کی گواہی دی جس کے بدولت آج چالیس کروڑ زبانیں انکی عصمت کی شہادت دیرہی ہیں، ہندوستان، ایران، چین جن کے سچے رہنماؤں کا اُن کے ملک سے باہر کوئی ادب نہ تھا، جہاں جہاں مسلمان گئے، اُن کے جائز ادب احترام کو اپنے ساتھ لیتے گئے،

وہ عرب جو پیغمبروں کے ناموں تک سے ناواقف تھے، جو نبوت ورسالت کے خصائص کے علم سے محروم تھے، جو انبیاءؑ اور رسولوں کی سیرتوں سے ناآشنا تھے، جو اُن کے ادب واحترام اور تصدیق واعتراف سے بیگانہ تھے، جن کو اپنے دیوتاؤں کے سامنے عیسیٰؑ بن مریم پر تحقیرانہ ہنسی آتی تھی[2]، اور جو حضرت موسیٰؑ کی فضیلت کا ذکر سنکر اپنے غصہ کو ضبط نہیں کرسکتے تھے[3] محمد رسول اللہ

[1] صحیح بخاری مناقب حضرت موسیٰ ص ۴۸۴، [2] قرآن پاک سورہ زخرف رکوع ۶ [3] صحیح بخاری مناقب حضرت موسیٰؑ

صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے ان کا یہ حال ہوا کہ وہ ایک ایک پیغمبر کے نام ونشان اور تاریخ وسیرت سے واقف ہو گئے، اور تبرکاً اُن کے ناموں پر اپنی اولادوں کے نام رکھنے لگے، اور جو آج بھی تمام مسلمانوں میں شائع اور ذائع ہیں، انھوں نے پیغمبروں کی صداقت اور سچائی کی گواہی دی، اُن کے ادب واحترام کو اپنے سینوں میں جگہ دی، اُن کی تعظیم وتکریم کو اپنے دین وایمان کا جزو بنالیا، دنیا کی کسی قوم میں یہ رواج نہیں ہے، کہ انبیاء علیہم السلام کے نام ادب سے لیے جائیں، مگر ایک مسلمان کے لیے لازم ہے کہ جب کسی پیغمبر کا نام لے تو ادب سے لے، اور اُن پر درود وسلام پڑھے،

وَکُتُبِہٖ

ایک مسلمان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کے صحیفۂ وحی پر ایمان لائے، ہرچند یہ عقیدہ گذشتہ عقیدۂ رسالت کا لازمی نتیجہ ہے، یعنی رسول کو رسول مان لینا اُس کی تعلیمات اور وحی کو مان لینے کا مرادف ہے، تاہم یہ تصریح اس لئے کیگئی، تاکہ پوری طرح صاف اور واضح ہوجائے کہ رسول کو رسول مان لینے کے بعد اُس کے صحیفۂ وحی کو مان کر اس کی تعلیمات پر عمل کرنا ضروری ہے، سورۂ بقرہ کے شروع ہی میں سچے مومنوں کی تعریف میں کہا گیا ہے،

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ ، (بقرہ ۵-۱)

اور جو اس (کتاب یا وحی) پر ایمان رکھتے ہیں، جو تجھ پر (اے محمدؐ) اتاری گئی، .....

کتابِ الٰہی پر ایمان لانے سے مقصود ان تمام صداقتوں اور حکموں کو بجان و دل قبول کرنا ہے، جو اس میں مذکور ہیں، یہ گویا پوری شریعتِ مطہرہ کو قبول کرلینے کا مختصر ترین طریقۂ تعبیر ہے اور اس لیے ایمانیات کی بہت سی دوسری باتیں جن کی تفصیل ہر موقع پر ضروری نہیں، اس ایک فقرہ کے تحت میں آجاتی ہیں قرآن پر ایمان لانے کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ قرآن میں علمی و عملی عقائد

عبادات واحکام مذکور ہیں اُن سب کو بے کم وکاست ہم تسلیم کرتے ہیں، کہ اگر کوئی سرے سے اُن کو تسلیم ہی نہیں کرتا تو اُن کی تعمیل وپیروی کا اس سے کیونکر مطالبہ کیا جا سکتا ہی؟ اسی بنا پر اس کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ان الفاظ مین فرمائی ہو کہ بِمَا جِئْتُ بِہٖ جو کچھ مین لیکر آیا اس پر ایمان لاؤ قرآن نے کہا

وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ (محمد ۱) اور ایمان لائے اس پر جو محمد پر اتارا گیا۔

لیکن قرآن اگر اتنا ہی کہتا کہ میرے پیرو صرف مجھ پر ایمان لائین تو یہ کوئی اہم بات نہ ہوتی کہ ہر صاحبِ مذہب کی یہی تعلیم ہوتی ہی، قرآن نے عقائد کی اس دفعہ میں بھی اپنے تکمیلی پہلو کو پیش نظر رکھا ہی اور یہ ضروری قرار دیا ہو کہ اہلِ قرآن قرآن کیساتھ ہی دوسری آسمانی کتابوں کی صداقت کو بھی تسلیم کرین یعنی کوئی شخص اُس وقت تک مسلمان نہین ہو سکتا جب تک صحیفۂ محمدی کے ساتھ دوسرے پیغمبرون کے صحیفون کو بھی من جانب اللہ تسلیم نہ کرے، چنانچہ سورۂ بقرہ کے شروع اولیٰ مذکورۂ بالا آیت کے ساتھ یہ بھی فرمایا،

وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ، (بقرہ-۱) اور جو ایمان لائے اس پر ... جو تجھ سے پہلے اترا

پھر اسی سورہ کے آخر میں فرمایا،

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ، (بقرہ-۴۰) رسول ایمان لایا، اس پر جو خدا کی طرف سے اس پر اترا، اور اہلِ ایمان بھی، ہر ایک، خدا پر، اس کے فرشتون پر اور اس کی کتابون پر ایمان لایا،

بقرہ کی آیتون مین بعض انبیاء علیہم السلام کا تفصیلی درجہ اور بقیہ تمام انبیاء کا اجمالی ذکر کرکے اُن کی کتابون اور وحیون کی تصدیق کا حکم دیا گیا ہے،

قُولُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَا اُنْزِلَ اِلَیْنَا	(اے مسلمانو!) تم کہو کہ ہم خدا پر، اور جو کچھ ہماری
وَمَا اُنْزِلَ اِلٰٓی اِبْرَاهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ	طرف اتارا گیا، اس پر، اور جو کچھ ابراہیم اور اسمٰعیل اور
وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَ	اسحاق اور یعقوب اور خاندان یعقوب کی طرف
مَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَمَآ اُوْتِیَ	اتارا گیا، اس پر اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا
النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ	اس پر اور جو کچھ اور سب پیغمبروں کو اُن کے پروردگار
(بقرہ - ۱۶)	کی طرف سے دیا گیا، ہم ان سب پر ایمان لائے،

آل عمران میں کسی قدر تفصیل ہے،

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا	کہہ کہ ہم خدا پر، اور جو کچھ ہم پر اتارا گیا، اس پر، اور
وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓی اِبْرَاهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ	جو کچھ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب
وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ	اور خاندان یعقوب پر اتارا گیا، اس پر اور جو کچھ
اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَالنَّبِیُّوْنَ	موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا، اس پر اور دوسرے سب
مِنْ رَّبِّهِمْ،	پیغمبروں کو اُن کے پروردگار کی طرف سے جو
(آل عمران - ۹)	کچھ دیا گیا، اس پر، ہم اُن سب پر ایمان لائے

سورۂ نساء میں اس پر ایمان لانے کے حکم کیساتھ ساتھ اسکے انکار کو کفر بھی قرار دیا گیا ہے

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا بِاللّٰہِ وَ	اے وہ لوگو جو ایمان لاچکے ہو! ایمان لاؤ خدا پر، اسکے
رَسُوْلِهٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی	رسول پر اور اُس کتاب پر جو اُس نے اپنے رسول پر
رَسُوْلِهٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی	اتاری، اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری اور جس نے

وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ	خدا کا اور اُس کے فرشتوں کا اور اُس کی
قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ	کتابوں .... کا انکار کیا وُ
وَكُتُبِهٖ .... فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا	نہایت سخت گمراہ ہوا،
بَعِيْدًا ۔ (الآیۃ) (نساء - ۲۰)	

سورۂ مومن میں ان منکروں کو عذاب کی بھی دھمکی دی گئی ہے جو کسی پیغمبر کے پیغام کی تکذیب کریں

اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَآ اَرْسَلْنَا	جن لوگوں نے کتاب کو، اور جو پیغام دیکر
بِهٖ رُسُلَنَا ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۔	ہم نے اپنے پیغمبروں کو بھیجا، اس کو جھٹلا دیا
اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ	وہ عنقریب جانیں گے، جب اُن کی گردنوں
يُسْحَبُوْنَ (مومن - ۸)	میں طوق اور زنجیریں ہونگی وہ گھسیٹے جائینگے

نام کی تخصیص کے ساتھ قرآن پاک میں چار آسمانی کتابوں کا ذکر ہے تورات جس کو ایک جگہ صحف موسیٰ بھی کہا گیا ہے (اعلیٰ - ۱) اور حضرت داؤدؑ کی زبور، اور حضرت عیسیٰؑ کی انجیل ہے اور خود قرآن اُنکے علاوہ ایک موقع پر صحف ابراہیم کا بھی تذکرہ ہے،

اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى	یہ باتیں گذشتہ صحیفوں میں بھی ہیں ابراہیم
صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى (اعلیٰ)	اور موسیٰ کے صحیفوں میں،

ان کے ماسوا اجمال کیساتھ دو موقعوں پر گذشتہ آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے الفاظ ہیں

اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ	کیا اگلے صحیفوں میں جو کچھ ہے، اُس کی
الْاُوْلٰى ۔ (طٰہٰ - ۸)	گواہی اُن کو نہیں پہنچی ؟

وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ (شعراء ۱۱) اور بے شبہہ یہ پہلوں کی کتابوں میں کور ہی

اس بنا پر انبیاء کی طرح ان کتابون پر بھی ہر مسلمان کا تفصیلی اور اجمالی ایمان ہے جن کتابون کے نام مذکور ہین ان پر نامون کے ساتھ، اور جن کے نام مذکور نہین اُن پر بالاجمال ایمان ضروری ہے کسی قوم مین اگر کوئی آسمانی کتاب ہے جس کا وجود قرآن سے پہلے ہے لیکن اس کا تصریحی نام قرآن میں مذکور نہین ہے اور اس میں توحید الٰہی کی دعوت اور طاغوت سے بچنے کی نصیحت بھی ہے تو اگرچہ ہم اسکو بتصریح خدا کی کتاب تسلیم نہین کر سکتے، تاہم بالتصریح اس کا انکار بھی نہیں کر سکتے اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب[۱] یہی حال دوسری مشکوک کتابون کا ہے

یہود توراۃ کے سوا کچھ نہیں مانتے عیسائی توراۃ کے احکام نہیں مانتے لیکن اسکی اخلاقی نصیحتون کو قبول کرتے ہیں، تاہم انجیل سے پہلے کی دوسری زبانون اور ملکون کی آسمانی کتابونکی نسبت مسلمانون کی طرح ادب اور احتیاط کا پہلو بھی اختیار نہیں کرتے، پارسی اوستا کے باہر خدا کے کلام ہونے کا شبہہ بھی نہیں کر سکتے اور برہمن دیدوں کے باہر خدا کے فیضان کا تصور بھی نہیں کر سکتے لیکن قرآن پر ایمان لانے والا مجبور ہے، کہ صحیفۂ ابراہیمؑ توراۃ، زبور اور انجیل کو خدا کی کتابیں یقین کرے، اور دوسری اگلی آسمانی کتابون کی جن میں آسمانی تعلیمات کی خصوصیتیں پائی جاتی ہون تکذیب کرے کہ انکا کتب الٰہی ہونا ممکن ہے،

حقیقت مین، اسلام کی یہ تعلیم دنیا کی مہتم بالشان تعلیمات میں سے ہے جس کا وجود کسی دوسرے مذہب میں نہ تھا، یہ رواداری بے تعصبی اور عام انسانی اخوت کی سب سے بڑی تعلیم ہے، یہود دی اپنی

[۱] صحیح بخاری کتاب التوحید و حدیث الافک و تفسیر سورۂ بقرا

کتاب کو چھوڑکر تمام دوسری آسمانون کتابون سے انکار کرکے بھی نجات کا منتظر رہ سکتا ہی عیسائی توراۃ اور تمام دوسرے صحیفون کا انکار کرکے بھی آسمانی بادشاہون کا متوقع ہوسکتا ہی پارسی اوستا کے سوا دوسری ربانی کتابون کو باطل مانکر بھی مینو (جنت) کا استحقاق پیدا کرسکتا ہی، ہندو اپنے ویدون کے سوا دنیا کی ہر آسمانی کتابون کو جعل و فریب مان کر بھی اواگون سے نجات حاصل کرسکتا ہے، بودہ مت والے اپنے سوا تمام دنیا کی وحیون کا انکار کرکے بھی نروان کا درجہ حاصل کرسکتے ہین، مگر مسلمان جب تک قرآن کے ساتھ تمام دنیا کی آسمانی کتابون کو منجانب اللہ نہ تسلیم کرے، جنت کا مستحق نہین ہوسکتا،

یہ تعلیم صرف نظریہ کی حیثیت نہین رکھتی، بلکہ عملاً اس پر اسلامی حکومت کے قوانین، اور احکام مبنی ہین، یہودیون کی نظر میں صرف دوہی قومیں ہیں، بنی اسرائیل اور غیر بنی اسرائیل، یا اسرائیل کا گھرانا، اور غیر قومین یا مختون، اور غیر مختون، اور انہی دونون تقسیمون پر اُن کے قانون کی بنیاد ہے، عیسائیوں میں مذہبی حیثیت سے مسیحی، یہود اور بت پرست گویتین قومین مانی جاتی ہیں، مگر چونکہ اُن کے مذہب میں قانون نہین ہی اس لیئے وہ اکثر امور مین رومن لا کے پیرو رہے ہیں لیکن رومن عیسائیون مین بھی ملکی حیثیت سے دوہی تقسیمیں ہیں، رومی اور غیر رومی، ایک رومی ملک میں غیر رومی کا کوئی حق نہیں کہ رومی حکومت کیلئے اور غیر رومی غلامی کیلئے پیدا ہوا ہی، پارسیون میں پاک ژادان ایران اور بیرونی لوگ دنیا کی دوہی حیثیں ہین، ہندوؤن مین اونچی ذاتیں اور اچھوت قومون کی دوہی صورتین ہین مگر اسلام کے گذشتہ عقیدہ کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قانونی حیثیت سے دنیا کی قومونکی چار حصون مین تقسیم فرمایا، اور اُن کے علحدہ علحدہ حقوق قرار دیئے جن پر اسلام کی تیرہ صدیون مین برابر عمل ہوتا رہا

یہ قسمیں حسب ذیل ہیں،

۱- مسلمان جو قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں کو کتاب الٰہی یقین کرتے ہیں، اُن میں سے ہر ایک دوسرے کا بھائی اور ہر اچھائی اور بُرائی میں ایک دوسرے کا شریک ہے، وہ آپس میں ایک دوسرے سے شادی بیاہ کر سکتے ہیں، اور ایک دوسرے کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھا سکتا ہے اسلام کی سلطنت میں اُن کے حقوق یکساں ہیں،

۲- اہلِ کتاب یعنی اُن کتابوں کے پیرو جن کے نام قرآن میں مذکور ہیں، یا یوں کہو کہ جو قرآن کو گو آسمانی کتاب نہیں مانتے، مگر ان کتابوں میں سے جن کا نام قرآن میں مذکور ہے کسی کو خدا کی آسمانی کتاب مانتے ہیں، وہ اپنی حفاظت کا مالی ٹکس (جزیہ) ادا کر کے اسلامی حکومتوں میں رہ سکتے ہیں، اُن کے معابد اور مذہبی عمارتیں محفوظ رہتی ہیں، اُن کو اپنے مذہب کے بدلنے پر مجبور نہیں کیا جاتا، اُن کی جان ومال اور عزت کے مسلمان محافظ ہوتے ہیں، اُن کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں، اور اُن کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھا سکتے ہیں، اُن کا جائز کھانا ہم کھا سکتے ہیں اور ہم اپنا کھانا اُن کو کھلا سکتے ہیں،

۳- شبہ اہلِ الکتاب یعنی وہ لوگ جو قرآن اور توراۃ وانجیل وزبور کو نہیں مانتے، مگر وہ خود اپنے لیے کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدعی ہیں، جیسے صابی جو ایک آسمانی کتاب کے دعوی کے باوجود ستاروں کو پوجتے تھے، اور مجوس یعنی پارسی جو ایک آسمانی کتاب رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں، اور ساتھ ہی سورج آگ، اور دیگر مظاہر قدرت کی پرستش کرتے ہیں، ترکستان اور سندھ کی فتح کے موقع پر علمائے اسلام نے انہی پر قیاس کر کے ہندؤں اور بودھوں وغیرہ کو

بھی اسی صنف میں داخل کیا، مسلمان اُن کی عورتون سے نکاح نہین کرسکتے، اور اُن کا ذبیحہ نہیں کھا سکتے، ان دو باتون کے علاوہ اہلِ کتاب کے بقیہ تمام حقوق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو عطا کیئے ہیں، وہ اسلامی حکومتون میں اداے جزیہ کے بعد ہر قسم کے ملکی حقوق میں شریک ہیں، اُن کی جان و مال و آبرو اور اُن کے معبدون کی حفاظت اسلامی حکومتوں کا فرض ہے،

۴۔ کفار و مشرکین یعنی وہ لوگ جن کے پاس کوئی آسمانی کتاب ہے، اور نہ وہ کسی دینِ الٰہی کی طرف منسوب ہیں، اُن کو چند شرائط کے ساتھ امن دیا جا سکتا ہے، لیکن حقوق حاصل کرنے کے لیئے اُن سے کہا جائے گا کہ وہ کسی نہ کسی آسمانی دین کے اندر اپنے کو داخل کرلین، جیسا کہ عباسیون کے ابتدائی زمانہ میں حرانی عراقیون نے اپنے کو صابئیوں میں داخل کرکے اپنے لیئے حقوق حاصل کیئے تھے،

اس تفصیل سے معلوم ہو سکتا ہے، کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم نے دنیا میں امن وامان اور مسلمانون میں مذہبی رواداری کے پیدا کرنے مین کتنا عظیم الشان حصہ لیا، یہی وہ نظریہ تھا جس نے مسلمانون کو اپنے مذہبی عقائد و شریعت کی سخت پیروی کے باوجود دنیا کی دوسری قومون کیساتھ مشارکت اور میل جول کے لیئے آمادہ کیا، اور مجوسیون، صابئیوں، یہودیون، عیسائیون اور ہندؤون کے ساتھ مل کر مختلف ملکون میں اُن ملکون کے مناسب مختلف تمدنون کی بنیاد رکھنے کی اُن میں قوت پیدا کی،

وحدۃ الادیان

تمام رسولوں اور اُن کے صحیفون کی تصدیق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ کی تعلیم یہ ہو کہ آدم سے لیکر محمد علیہما السلام تک جتنے سچے مذہب خدا کی طرف سے آئے وہ سب ایک تھے، چنانچہ درحقیقت آپ کی یہی تعلیم تھی، اسلام اسی ایک مذہب کا نام ہے، جو آدم سے محمد علیہما السلام

تک باری باری پیغمبرون کے ذریعہ سے آتا رہا، اور انسانون کو اس کی تعلیم دی جاتی رہی،

صحیفۂ محمدیؐ نے ہمارے سامنے دو لفظ پیش کئے ہین ایک دین اور دوسرا شرعہ منسک ور منہاج. شرعۃ اور منہاج کے معنی راستہ کے ہیں اور منسک کے معنی طریق عبادت کے ہین، دنیا مین یہ راز سب سے پہلے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پاک پر منکشف ہوا کہ دین الٰہی ہمیشہ سے ایک تھا ایک رہا اور ایک رہے گا نور معرفت ایک ہے خواہ وہ کتنی ہی مختلف شکل و رنگ کی قندیلون مین روشن ہو اصل دین میں تمام پیغمبرون کی تعلیم یکسان تھی ایک ہی دین تھا جس کو لیکر اول سے آخر تک تمام انبیا آتے رہے اس مین زمان و مکان کے تغیر کو کوئی دخل نہ تھا، اور نہ قوم و ملک کے اختلاف سے اس مین کوئی اختلاف پیدا ہوا، وہ ہر زمانہ اور ہر مقام مین یکسان آیا، اور وہان کے پیغمبرون نے اس کی یکسان تعلیم دی

یہ دائمی حقیقت اور یکسان تعلیم کیا ہے؟ یہ مذہب کے اصل اصول ہین یعنی خدا کی ہستی اسکی توحید، اس کے صفات کاملہ، انبیاء اور مرسلینؑ کی بعثت، خدا کی خالص عبادت، حقوق انسانی اخلاق فاضلہ، اچھے اور برے اعمال کی بازپرس، اور جزاء و سزا، یہ تمام مذاہب کے وہ بنیادی امور ہین جن پر جملہ مذاہب حقہ کا اتفاق ہے، اگر ان میں کسی جہت سے کوئی اختلاف ہے تو طریقۂ تعبیر کی غلطی ہے اور یا باہر سے آکر اس تعلیم میں کوئی نقص شامل ہوگیا ہے،

دوسری چیز جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان نے شرعہ، منہاج، اور نسک کہا ہے وہ جزئیات احکام اور متفقہ مقصد کے حصول کے جدا جدا راستے ہیں جو ہر قوم و مذہب کی زمانی و مکانی خصوصیات کے سبب سے بدلتے رہتے ہین، مثلاً عبادت الٰہی، ہر مذہب کا جزء لازم ہے لیکن طریق عبادت میں تھوڑا تھوڑا اختلاف ہر مذہب مین موجود ہے عبادت کیلئے کوئی خاص سمت، ہر

مذہب نے مقرر کی ہے، مگر وہ سمت خاص خاص مصلحتوں کے لحاظ سے مختلف مقرر کی ہو اسی طرح اعمالِ قبیحہ کا انسداد تمام مذاہب کا متفقہ نصب العین ہے، مگر اس انسداد کے راستے اور طریقے جدا جدا ہیں، غرض یہ راستے اور طریقے مختلف پیغمبرون کے زمانے میں اگر اصلاح و تبدیل کے قابل پائے گئے تو بدلتے رہے، مگر اصل دین جو ازلی سچائی اور ابدی طاقت ہو نا قابلِ تبدیل اور نا قابلِ تغیر رہا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کا دنیا میں وقتاً فوقتاً ظہور اسی ضرورت سے ہوتا رہا کہ وہ اسی ازلی و ابدی صداقت کو ہمیشہ اہلِ دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں، اور دین کو اُس کے اصل مرکز پر ہمیشہ قائم رکھیں، اور ساتھ ہی اپنی اپنی قوم و ملک اور زمانہ کے حالات کے مطابق خاص احکام اور جزئیات جو قوم کے مناسب حال ہوں، وہ اس کو بتائیں اور سکھائیں؛

انبیاء کے سوانح پر نظر کرنے سے اس کی پوری تصدیق ہوتی ہو کہ ایک صاحبِ شریعت نبی کے بعد دوسرا صاحبِ شریعت نبی اسی وقت مبعوث ہوا ہو، جب کہ اگلا صحیفۂ وحی جو دین و شریعت کا محافظ تھا، کھو گیا، یا انسانی دست برد سے ایسا بدل گیا کہ اسکی اصلیت مشتبہ ہو گئی صحیفۂ ابراہیم کے گم ہو جانے کے بعد جس کا نہایت ناقص خلاصہ توراۃ کے سفرِ تکوین میں ہو صحیفۂ موسیٰ نازل ہوا، صحیفہ موسیٰ کے نو پیدا اختلاف کو دور کرنے کے لیے زبور وغیرہ مختلف صحیفے آتے رہے پھر انجیل آئی اور انجیل میں انسانی تصرفات کے راہ پانے کے بعد قرآن آیا، چونکہ قرآن دنیا کے آخر تک کے لیے آیا ہے، اس لیے ہر تحریف اور انسانی تصرف سے اس کی حفاظت کی گئی ہے، اور قیامت تک کی جائے گی، اسی لیے اس کے بعد کسی اور صحیفہ کی ضرورت نہیں ہو اور نہ کسی پیغمبر کی بعثت

کی حاجت ہی، البتہ اس کے معانی کی صحیح تشریح اور بدعات واحداثات کے انسداد کے لئے ائمہ، خلفاے مجددین، محدثین، اور علمائے راسخین پیدا ہوتے رہے ہیں، اور ہوتے رہیں گے، اور اُن کی اصلاح کی صداقت کی پہچان سنتِ محمدیؐ کا احیاء اور بدعات کا قلع قمع ہی،

اب ہم کو پھر اوپر سے چلنا ہے، اور اپنے ایک ایک دعوی کو وحی محمدی کی روشنی میں دیکھنا ہی، "وحدتِ دین" کی حقیقت کو وحیِ اسلامی کے آخری ترجمان نے ان الفاظ میں ادا کیا ہی:

شَرَعَ لَکُمْ مِنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی	اس نے دین میں میرے لئے وہی راہ مقرر
بِہٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ	کی جو نوحؑ سے کہی تھی، اور ہم نے تیرے پاس
وَمَا وَصَّیْنَا بِہٖٓ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی	جو حکم بھیجا اور جو کہدیا، ہم نے ابراہیمؑ سے اور
وَعِیْسٰٓی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا	موسیٰؑ سے اور عیسیٰؑ سے، یہ کہ دین کو قائم رکھو،
تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ط کَبُرَ عَلَی الْمُشْرِکِیْنَ	اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو، مشرکوں کو جدھر تو
مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَیْهِ ط اَللّٰهُ یَجْتَبِیْٓ	بلاتا ہی، وہ اُن پر گراں گذرتا ہی خدا اپنی طرف
اِلَیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْٓ اِلَیْهِ مَنْ	جس کو چاہتا ہی چن لیتا ہے، اور اپنی طرف
یُّنِیْبُ، وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْ بَعْدِ	اس کو راہ دیتا ہے جو (اسکی طرف) رجوع
مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْیًا ۢ بَیْنَهُمْ ط وَ	ہوتا ہی اور یہ تفرقے لوگوں نے وحی کا علم (حقیقی)
لَوْلَا کَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّکَ اِلٰٓی	ملنے کے بعد آپس کی ضد اور تعصب سے پیدا
اَجَلٍ مُّسَمًّی لَّقُضِیَ بَیْنَهُمْ ط وَاِنَّ	کیئے ہیں، اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک
الَّذِیْنَ اُوْرِثُوا الْکِتٰبَ مِنْ بَعْدِهِمْ	بات وقت مقررہ تک کیلئے نہ ہو چکی ہوتی

لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِیْبٍ، فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ ج وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ج وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ج وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَكُمْ ط اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ط لَا حُجَّةَ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ ط اَللّٰهُ یَجْمَعُ بَیْنَنَا ج وَاِلَیْهِ الْمَصِیْرُ ط

(شوریٰ - ۲)

تو (کشفِ حقیقت کر کے) اُن کے اختلافات کا فیصلہ کر دیا جاتا، اور جن کو اُن اگلون کے بعد کتاب وراثت میں ملی، وہ اس امرِ حق کی طرف سے ایسے شک میں ہیں، جو اُن کو چین نہیں لینے دیتا سو تو سب کو اسی حقیقت کی طرف بُلا، اور اسی پر استواری سے قائم رہ، جیسا کہ تجھکو حکم دیا گیا ہے اور ان تفرقہ اندازون کی غلط خواہشوں کی پیروی نہ کر، اور کہہ کہ میں ایمان لایا، ہر اس کتاب پر جو خدا نے اُتاری اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمھارے بیچ میں انصاف کرون، ہمارا رب اور تمھارا رب وہی ایک اللہ ہے ہم کو ہماری کامون کا بدلہ ملیگا اور تم کو تمھاری کاموں کا، ہم میں تم میں کچھ جھگڑا نہیں، اللہ سب کو اکٹھا کریگا، اور اسی کی طرف پھر جانا ہے۔

ان آیاتِ مبارکہ میں کس خوبی کے ساتھ اس حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہی ایک دین ہے جو نوح کو، ابراہیم کو، موسیٰ کو، اور تم کو اے محمد (صلوات اللہ علیہم) عطا کیا گیا ہے، اگلون کے بعد پچھلون نے جن کو یہ کتاب ملی، اپنے ذہنی تحریفات اور دستی تصرفات سے اس میں تفرقے پیدا کئے، اور آپس کی ضد اور تعصبات سے فرقہ واری کی الگ الگ راہیں نکالیں پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اس وحدتِ دین کی حقیقت کا یقین اہلِ کتاب کو نہیں ہے حالانکہ وہ شکوک و شبہات کے دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں، پھر حکم ہوتا ہے کہ اے محمد رسول اللہ! تم اس حقیقت کی طرف

لوگون کو بلاؤ، اور استواری کے ساتھ اپنی اس دعوت اور دعویٰ پر قائم رہو، اور یہ اعلان کردو کہ میرا مسلک یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو کتاب بھی دنیا مین آئی ہے میں اُس کی صداقت کو تسلیم کرتا ہون اور تم اے اہل کتاب جو مختلف فرقون اور مذہبون مین بٹ گئے ہو، تمھاری ساتھ انصاف کرون یعنی جس میں جو سچائی ہے اس کو قبول کرون۔ یا معاملات میں تمھاری ساتھ عدل وانصاف کرون پھر فرمایا ہمارا اور تمھارا خدا ایک ہی ہے، دو نہین، اگر اتحاد چاہو، تو اس نقطہ پر ہم تم متحد ہو سکتے ہیں، البتہ ہمارے اور تمھارے راستون مین جو اختلاف ہی اُس کے ذمہ دار ہم تم خود ہین، نہ تم ہمارے کاموں کے جوابدہ ہو اور نہ ہم تمھاری کاموں کے، اب ہماری تمھاری درمیان یہاں کوئی جھگڑا نہین،

اسی وحدت کی دعوت محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان حق نے ایک اور آیت میں دی ہے

یَا اَھْلَ الْکِتَابِ تَعَالَوْا اِلیٰ کَلِمَۃٍ	اے کتاب والو! آؤ، ہم تم ایک بات پر جو ہمارے
سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ	تمھارے درمیان یکسان ہے، متفق ہو جائین،
اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّ	وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کرین،
لَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ	اور نہ کسی کو اس کا شریک بنائین، اور نہ
اللّٰہِ ط فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْھَدُوْا	آپس میں ایک، ایک کو خدا کو چھوڑ کر رب بنائے
بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ،	اگر وہ اس کو قبول نہ کریں تو کہدے کہ تم گواہ
(آل عمران - ۷)	رہو کہ ہم حکم الٰہی کے تابع (مسلم) ہین،

یہود و نصاریٰ جنھون نے اپنی فرقہ واریون سے اصل دین میں تفریقین پیدا کر دی تھین، اُن کی طرف اشارہ کرکے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا،

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا	بیشک وہ جنھوں نے اپنے دین میں الگ الگ
شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ إِنَّمَا	راہیں نکالیں اور کئی فرقے ہوگئے تجھکو اُن سے
أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا	کوئی واسطہ نہیں، اُن کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے
كَانُوا يَفْعَلُونَ، (انعام - ۲۰)	وہی اُن کو جتادے گا جو کچھ وہ کرتے تھے،

پھر دونوں کو اس کے بعد ہی اصل "دین قیم" کی جو ابراہیم کا تھا دعوت دی گئی،

قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ	کہدے کہ میرے خدا نے اس سیدھی راہ کی طرف
مُّسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِّلَّةَ إِبْرَاهِيمَ	میری رہنمائی کی جو دین صحیح یعنی ابراہیم حنیف کا
حَنِيفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ، (انعام ۲۰)	مذہب اور وہ (ابراہیم) مشرکوں میں سے نہ تھا،

غرض اسلام وہ "دین قیم" ہی جو ہمیشہ انبیاء کا دین رہا، اور موجودہ دینِ اسلام یہود و نصاریٰ کی تحریفات و تصرفات اور فرقہ پرور دیون کو مٹاکر اسی ایک متحدہ دین کی پکار ہے جس کی طرف انبیاء اپنے اپنے زمانوں میں ہمیشہ لوگوں کو بلاتے رہے، اسی لیے اکثر انبیاء علیہم السلام کے ناموں کو گنانے کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی گئی،

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ	یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی
فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ (انعام - ۱۰)	سو تو انہی کی راہ چل،

بعض اسلامی حدود و شرائع کی تشریح کے بعد فرمایا گیا،

يُرِيدُ اللَّهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ	خدا چاہتا ہے کہ تمھارے واسطے بیان کرے
سُنَنَ الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ، (نساء - ۵)	اور تم کو اُن کے راستے دکھائے جو تم سے پہلے تھے

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام اپنے حدود و شرائع میں بھی اگلے پیغمبروں کی تعلیمات کیساتھ اتحاد رکھتا ہے اور یہ امر واقعہ ہے جو لوگ قرآن کا اسلئے انکار کرتے تھے کہ یہ کوئی الگ صحیفہ ہے ان سے کہا گیا

اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُولٰى	بے شبہہ یہ بات، اگلے صحیفوں میں تھی، یعنی
صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰى ، (اعلیٰ-۱)	ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں،

ایک اور آیت میں کہا گیا،

وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ ، (شعراء-۱۱)	اور یہی پہلے پیغمبروں کی کتابوں میں تھا،

ایک مقام پر یہ فرمایا گیا،

مَا یُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِیْلَ لِلرُّسُلِ	(اے محمد) تجھ سے (اس کتاب میں) وہی کہا
مِنْ قَبْلِكَ ؕ (حٰمٓ السجدہ-۵)	گیا ہے جو تجھ سے پہلے پیغمبروں سے کہا گیا،

اس اعلان میں یہ ظاہر کر دیا گیا کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے وہی کہا گیا جو اگلے پیغمبروں سے کہا جا چکا تھا، ان معنوں میں قرآن کوئی نئی دعوت لیکر نہیں آیا ہے بلکہ یہ اسی پرانی دعوت کی تکرار ہے جس کی آواز دنیا سے گم ہو چکی تھی، یا دب گئی تھی، اگر فرق ہے تو اجمال و تفصیل، یا نقص و تکمیل کا کہ اسلام گذشتہ اجمال کی تفصیل اور دینِ سابق کی تکمیل ہے،

اس لئے اسلام یہ ہے کہ اس پر یقین کیا جائے کہ وحی کے آغاز سے آخر تک ایک ہی پیغام تھا جو آتا رہا، ایک ہی دین تھا، جو سکھایا جاتا رہا، اور ایک ہی حقیقت تھی جو دہرائی جاتی رہی لیکن وہ بار بار انسانوں کے نسیان و تغافل اور تصرف و تحریف سے بدلتی رہی گم ہوتی رہی، اور آخری دفعہ دنیا کے کمالِ بلوغ کے زمانہ میں وہ پوری حفاظت کے وعدہ کیساتھ محمد رسول اللہ صلعم کے ذریعہ سے مفصل

اور کامل ہو کر نازل ہوئی، اور قیامت تک محفوظ و باقی رہے گی،

دوسری چیز جس کی مذہب میں ثانوی حیثیت ہے، اور جو اصل مقصد نہیں، ذریعہ ہو، وہ بدلتی رہتی ہے، اور عہد محمدیؐ تک برابر بدلتی رہی ہے، اُس کا نام شرعہ، منہاج اور منسک ہے، یہودیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض تھا کہ آپ یہودی شریعت کے جزئیات میں کیوں تبدیلی کرتے ہیں، قرآن نے اُس کے جواب میں یہی ہمیشہ کہا کہ یہ مقصود نہیں ذرائع ہیں، اصول نہیں فروع ہیں، ہر قوم کی مناسبت سے اُن میں تغیر ہوتا رہا ہے، اور ہوتا رہے گا، اس کی ایک مثال قبلہ ہے، کہ مقصود اصلی نماز ہے، اور سمت کا تعین ایک فرعی اور ثانوی چیز ہے، بنی اسرائیل کو اپنی آبائی مسجد (بیت المقدس) سے گرویدگی تھی، وہ ان کا قبلہ ہوئی، ابراہیمی عربوں کو اپنی مرکزی مسجد (کعبہ) سے وہی دلبستگی اور لگاؤ تھا، اس لیے یہ اُن کا قبلہ بنی، چنانچہ قرآن نے تعین قبلہ کے موقع پر کہا،

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ۚ (بقرہ ۱۸-۱۸)	اور ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے جدھر وہ منہ کرتا ہے سو تم نیکیوں کی طرف سبقت کرو،

یعنی سمتوں اور جہتوں کی تعین کو اہمیت کی چیز نہ سمجھو بلکہ نیکیوں کو اصلی اہمیت دو، اسلئے فرمایا

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ الآیہ (بقرہ ۲۲-۲۲)	نیکی یہی نہیں ہے کہ تم پورب یا پچھم کی طرف رُخ کرو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ جو ایمان لائے، (اور دوسرے نیک کام کرے)

اسی طرح خانۂ کعبہ کا حج یہودیوں میں نہ تھا، اسلام نے جب اس کو رائج کیا تو کہا ہر گروہ نے اپنے عام مذہبی اجتماع اور قومی عبادت کے لئے کوئی نہ کوئی طریقہ مقرر کیا ہے اور اسلام نے خانۂ کعبہ

کے حج کو اس لیئے تجویز کیا ہے،

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُسْتَقِيمٍ ۝ وَإِنْ جَادَلُوكَ فَقُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ، (حج - ۹)	ہر قوم کے لیئے ہم نے عبادت کا طریقہ بنایا جس کی اس قوم کے لوگ مذہبا پابندی کرتے ہیں، سو اس بات میں وہ تجھ سے جھگڑا نہ کریں تو اپنے رب کی طرف بلائے جا تو بیشک سوجھ کی سیدھی راہ پر ہی اور اگر وہ تجھ سے جھگڑنے لگیں تو کہدے کہ اللہ بہتر جانتا ہے جو تم کرتے ہو

سورہ مائدہ میں عدل وانصاف اور قانونی جزا وسزا کے طریقوں کے ضمن میں اُن یہودیوں اور عیسائیوں سے جنھوں نے اسلام قبول نہیں کیا، یہی کہا گیا کہ وہ اپنی اپنی کتابوں ہی کے احکام پر عمل کریں، جن کو وہ چھوڑ بیٹھے ہیں،

پہلے یہودیوں سے کہا،

إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ (مائدہ - ۷)	ہم نے توراۃ اتاری، اس میں ہدایت اور روشنی تھی، پیغمبر جو حکمبردار تھے وہ یہود کا فیصلہ کرتے، اور اُن کے عالم اور فقیہ کہ اللہ کی کتاب پر وہ نگہبان تھے اور وہ تھے اُس پر خبردار،

پھر عیسائی شریعت کی نسبت کہا:-

وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِمْ بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَآتَيْنَاهُ الْإِنْجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنْجِيلِ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فِيهِ ،	اور ہم نے ان پیغمبرون کے پیچھے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا، سچ بتاتا ہوا اس کو جو اُس کے پہلے تھا یعنی تورات اور ہم نے اس کو انجیل دی اس میں ہدایت اور روشنی رہے اور تصدیق کرتی ہوئی اپنے سے پہلے کی یعنی تورات کی، اور ہدایت اور نصیحت پرہیزگارون کیلئے اور چاہیے کہ انجیل والے اس کا حکم دین جو اس میں خدا نے اُتارا (مائدہ ۷-۱)

اس کے بعد آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو خطاب کر کے کہا :-

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ . (مائدہ ۷-۷)	اور ہم نے تیری طرف یہ کتاب سچائی کیساتھ اتاری، جو اپنے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی، اور امانت کیساتھ اس پر شامل ہو سو تو ان کے درمیان اُسکے مطابق فیصلہ کر جو خدا نے اُتارا، تیرے پاس جو سچائی آئی ہے اُس کو چھوڑ کر اُن کی (خواہشون کی پیروی مت کر)

دیکھو کس خوبی کیساتھ صحیفۂ محمدیؐ نے اگلی کتابون کی تصدیق اور مدح و تعریف کی اور اہلِ مذاہب کو جو اسلام پر ایمان نہیں لائے اپنی اپنی کتبِ منزلہ پر عمل کرنیکی دعوت دی، اور پھر یہ دعویٰ کیا کہ قرآن تمام گذشتہ کتابون پر امین و محافظ بنکر آیا ہے اور اس مین ان سب کتابون کی سچائیان یکجا ہیں لیکن ان لوگون نے اپنی اپنی کتابون کو چھوڑ کر اہوا (غلط خواہشون) کی پیروی شروع کردی

یہ ہوا کیا ہیں، کتاب الٰہی میں تحریف و تصرف کرکے آسانیاں پیدا کرنا اور احکام الٰہی کے مقابلہ میں انسانی اجتہادات کی آمیزش (فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْهِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ "افسوس ہو اُن پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب بناتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے،" (بقرہ - ۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ شریعت الٰہی کو چھوڑ کر اُن اہل کتاب کی اہوا کی پیروی نہ کریں، اس کے بعد حدود جزا و سزا میں ان خفیف اختلافات، "اور تبدیلیوں کو جو توراۃ، انجیل اور قرآن میں ہیں، غیر اہم بتایا گیا، فرمایا :-

لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَةً وَّ	ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک دستور
مِنْهَاجًا (مائدہ - ۷)	اور ایک راستہ بنا دیا،

انہی اختلافات کی بنا پر یہود اور نصاریٰ دونوں ایک دوسرے کو برسر باطل کہتے تھے،

وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ لَیْسَتِ النَّصٰرٰی	اور یہود نے کہا نصاریٰ کسی راہ پر نہیں، اور
عَلٰی شَیْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰی لَیْسَتِ	نصاریٰ نے کہا یہود کسی راہ پر نہیں، حالانکہ
الْیَهُوْدُ عَلٰی شَیْءٍ وَّهُمْ یَتْلُوْنَ الْکِتٰبَ (بقرہ ۱۴)	وہ دونوں خدا کی کتاب پڑھتے ہیں،

دونوں مل کر مسلمانوں سے کہتے تھے،

وَقَالُوْا کُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی	اور انھوں نے کہا کہ یہودی یا نصرانی بنجاؤ تو
تَهْتَدُوْا (بقرہ - ۱۴)	ہدایت پاؤ گے،

ارشاد ہوا کہ تم دونوں اپنے اپنے الگ راستوں کو چھوڑ کر آؤ اور اصل دین ابراہیمی پر متفق ہو جاؤ،

قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا وَ	کہ بلکہ ابراہیم کے دین کی پیروی کرو جو موحد

مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ج (بقرہ ۔ ۱۶)

تھا، مشرک نہ تھا، تم لوگ کہو کہ ہم خدا پر، اور جو کچھ ہماری طرف اترا، اور جو ابراہیم، اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور اس کی اولاد پر اتارا گیا، اور جو موسیٰ، اور عیسیٰ کو دیا گیا، اور جو سب نبیوں کو اُن کے خدا کی طرف سے دیا گیا، سب پر ایمان لائے، ہم ان رسولوں میں فرق نہیں کرتے، اور ہم اس ایک خدا کے تابع ہیں، تو اگر یہ بھی اسی طرح لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو انھوں نے ہدایت پائی،

یہود اور نصاریٰ کو یہ دعویٰ تھا،

لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى، (بقرہ ۔ ۱۳)

یہود اور نصاریٰ کے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا،

جواب دیا گیا،

تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ (بقرہ ۔ ۱۳)

یہ ان کی باطل آرزوئیں ہیں،

بلکہ

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ

ہاں جس نے بھی اپنے کو خدا کا مطیع بنایا اور وہ نیکو کار ہے، تو اس کی مزدوری اس کے

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (بقرہ ۱۳) — خدا کے پاس ہے نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ غم،

تمام اہل مذاہب کو یکساں خطاب کرکے فرمایا،

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا	بیشک جو ایمان لائے (یعنی مسلمان) جو یہودی
وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ	ہوئے اور نصاریٰ اور صابی، جو بھی خدا پر اور
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا	آخری دن پر ایمان لایا، اور نیک عمل کیا تو انکی
فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ	مزدوری اُن کے پروردگار کے پاس ہے، نہ اُن پر
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (بقرہ۔۸)	خوف ہوگا، نہ وہ غمگین ہوں گے،

اب جو ایمان لائے یعنی مسلمان، اور جو یہودی بنے، اور نصاریٰ اور صائبین اُن میں سے جو بھی اپنے اپنے دورِ نبوت میں خدا کی توحید پر، روزِ آخر کی صداقت پر ایمان لایا، اور اچھے عمل کئے، ان کو انکا پورا ثواب ملیگا یعنی جس نے بھی اپنے اپنے پیغمبر کی اصلی تعلیم اور سچی شریعت کے مطابق جو شرک وکفر اور بت پرستی سے یقیناً پاک تھی عمل کیا اسکو اس کا ثواب ملیگا، خدا کی توحید اور روزِ آخر کی صداقت پر ایمان لانا اور اچھے کام کرنا صرف عقل کی ہدایت سے نہیں ہو سکتا، بلکہ کسی رسول کی تعلیم ہی سے ہو سکتا ہے اور اس پر تمام اہلِ مذاہب کا اتفاق ہے اس لئے رسالت کی تصدیق بھی اُس کے ضمن میں داخل ہے کہ

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ	بیشک جو اللہ اور اُسکے رسولوں کا انکار کرتے ہیں
وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَ	اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں
رُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ	جدائی کریں اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانتے ہیں اور
بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ	کسی کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں کہ وہ اس میں

سَبِيْلاً، اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ	درمیان کا راستہ اختیار کریں، وہی حقیقی کافر
حَقًّا، وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا	ہیں، اور ہم نے کافروں کے لئے اہانت کرنیوالا
مُّهِيْنًا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ	عذاب تیار کیا ہے، اور جو لوگ اللہ اور اسکے
وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ	رسولوں پر ایمان لائے، اور اُن میں سے کسی کا
سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَكَانَ	بھی انکار نہیں کیا، یہ وہ ہیں جن کو انکی مزدوریاں
اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا، (نساء - ۲۱)	خدا دیگا، اور خدا بخشنے والا رحم کرنیوالا ہے،

دوسری آیت میں ہے،

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ	مومن وہی ہیں جو خدا اور اُس کے رسول پر
وَرَسُوْلِهٖ، (نور - ۹)	ایمان لائے،

اس بنا پر ان آیتوں سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ قبول عمل کے لئے ایمان شرط ہے، دوسری یہ کہ ایمان وعمل کے لئے نبی کی تصدیق ضروری ہے، اسی لئے اوپر جن چار فرقوں کا ذکر ہوا، وہ چاروں وہ ہیں جو کسی نہ کسی پیغمبر کے ماننے والے ہیں، اس بنا پر کامل اسلام یہ ہے کہ تمام رسولوں کو صادق مانا جائے، چنانچہ اس کی تفصیل سورۂ مائدہ میں ہے،

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ	کہدے اے کتاب والو! تم کچھ نہیں جبتک تم
حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَ	توراۃ اور انجیل کو اور جو کچھ تمہاری طرف اُتارا
مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ، وَلَيَزِيْدَنَّ	گیا، اس کو قائم نہ کرو، اور (اے پیغمبر) جو تیری طرف
كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ	اتارا ہے وہ اُن کی سرکشی اور انکار کو اور بڑھائے گا،

طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى	تو ان منکروں کا غم نہ کر، اس میں کوئی شبہ
الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	نہیں کہ جو مسلمان ہوئے اور جو یہودی ہوئے
وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰى	اور صابی اور عیسائی جو خدا پر اور روز قیامت
مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ	پر ایمان لایا، اور اچھے کام کئے تو ان پر کوئی
صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ	خوف نہیں، اور نہ وہ غمگین ہوں گے،
يَحْزَنُوْنَ (مائدہ - ۱۰)	

اس کے بعد ہی اس کا ذکر ہے کہ یہودیوں نے ہمیشہ رسولوں کا انکار کیا، اور نصاریٰ توحید کو چھوڑ کر تثلیث اور الوہیت مسیح میں مبتلا ہو گئے، اس لئے اصل اسلام سے یہ دونوں ہٹ گئے ہیں فرمایا

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ	بیشک ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا، اور انکی
وَاَرْسَلْنَاۤ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ	طرف کئی رسول بھیجے، جب کبھی ان کے پاس
رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا	کوئی رسول اُن کی نفسانی خواہشوں کے خلاف
كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ وَحَسِبُوْۤا اَلَّا	احکام لیکر آیا، تو انھوں نے کتنوں کو جھٹلایا
تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ	اور کتنوں کا خون کرنے لگے، اور خیال کیا کہ
تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا	اس سے کچھ خرابی نہ ہو گی، سو اندھے ہو گئے اور
كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا	بہرے، پھر خدا اُن پر رجوع ہوا، پھر اُن میں
يَعْمَلُوْنَ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ	بہتیرے اندھے اور بہرے ہو گئے، اور اللہ
اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَقَالَ	دیکھتا ہے، وہ جو کرتے ہیں، بے شبہ وہ کافر

اَلْمَسِيْحُ يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ	ہوئے جنھوں نے یہ کہا کہ مریم کا بیٹا مسیح ہی اللہ
رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ	ہے، مسیح نے تو یہ کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل اللہ
فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ	کو پوجو جو میرا اور تمھارا رب ہے، بیشک جو اللہ
النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ	کا شریک بنائیگا تو اللہ نے اُس پر جنّت حرام
لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ	کردی اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور گنہگاروں
ثَلٰثَةٍ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّاۤ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ	کی کوئی مدد کرنیوالا نہیں، بے شبہہ وہ کافر ہوئے
وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ	جنھوں نے کہا اللہ تین میں تیسرا ہے حالانکہ کوئی
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ	اللہ نہیں مگر وہی ایک، اگر وہ اپنے اس قول سے
(مائدہ ۔ ۱۰)	باز نہ آے تو اُن میں سے کافروں کو یقیناً دردناک

یہ تو اُن یہود و نصاریٰ کے "ایمان" کا حال تھا، اس کے بعد اسی رکوع میں اُن کے "حسن عمل" کا جائزہ لیا گیا ہے، اور اُسی کے بعد ہی اُن سے کہا گیا ہے،

وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ	اور اگر اللہ اور اُس نبی پر اور جو اس نبی پر اُترا
وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ	اُس پر یہ لوگ ایمان لے آتے تو اُن (مشرکوں) کو
وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (مائدہ)	وہ اپنا دوست نہ بناتے لیکن اُن میں اکثر نافرمان ہیں

اسلام یعنی تمام نبیوں اور رسولوں کے واحد اور مشترک دین کا اصل لاصول دو باتیں ہیں توحیدِ کامل اور رسالتِ عمومی یعنی اللہ تعالیٰ کو توحید کی تمام صفتوں میں کامل بلا شریک ماننا اور اُس کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں صادق اور راست باز تسلیم کرنا، چنانچہ فرمایا،

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَ لَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَاۤ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ؕ وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ،

(آلِ عمران - ۹)

کیا وہ دینِ الٰہی کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں حالانکہ جو بھی آسمانون میں اور زمین میں ہے، خوشی سے یا مجبوراً خدا کا مسلم یعنی فرمانبردار ہے اور اسی کی طرف سب لوٹائے جائیں گے (اے پیغمبر) کہدے کہ ہم اللہ پر اور جو اُس نے ہم پر اُتارا، اور جو ابراہیم پر اور اسمٰعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر اور اُن کی اولادون پر اُترا اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ اور سب پیغمبرون کو اُن کے رب کی طرف سے ملا، ہم سب کی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں، ہم اُن میں سے کسی میں کوئی فرق نہیں کرتے، اور ہم اُسی خدا کے مسلم یعنی فرمانبردار ہیں، اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہیگا، تو وہ اس سے قبول نہ کیا جائیگا، اور آخرت مین نقصان اٹھانے والون میں ہوگا،

اس آیت سے ظاہر ہے کہ خدا پر اور تمام رسولون پر ایمان لانا دین اللہ ہے، اور اسی کا نام اسلام ہے، جس نے اس اصول کو قبول نہیں کیا، وہ آخرت میں نقصان اٹھائیگا، آل عمران میں ہے کہ یہود و نصاریٰ تاویلاتِ باطلہ اور اتباعِ متشابہات کی وجہ سے گمراہ ہوگئے یعنی دینِ اسلام سے روگرداں ہوکر، اختلافات میں پڑ گئے، فرمایا،

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ

بیشک دین خدا کے نزدیک اسلام ہے،

وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا	جن کو کتاب دی گئی، انھوں نے علم آنے کے بعد
مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ	اُس میں آپس کی ضد کے سبب سے اختلاف کیا،
وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ	جو اللہ کی آیتوں کا انکار کریگا، تو اللہ جلد حساب
سَرِيْعُ الْحِسَابِ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ	لینے والا ہی، تو اگر (اے پیغمبر) یہ تجھ سے پھر کج بحثی
اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ،	کریں تو کہدے کہ میں نے اور میرے پیروؤں نے
(آلِ عمران - ۲)	تو اپنے کو خدا کا تابع فرمان (مسلم) کر دیا ہی،

اسی کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ یہود و نصاری سے سوال کریں کہ وہ اسلام کو قبول کرتے ہیں یا نہیں ؟

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ	اور اے پیغمبر، اُن سے جن کو کتاب دی گئی
الْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ، فَاِنْ اَسْلَمُوْا	اور عرب کے جاہلوں سے کہدی کہ کیا تم نے بھی
فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا	اسلام قبول کیا، اگر کیا تو انھوں نے سیدھی
عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ	راہ پائی، اور اگر انکار کیا تو تجھ پر صرف پہنچا
(آل عمران - ۲)	دینا ہی، اور اللہ بندوں کو دیکھتا ہی،

یہود و نصاری کو اس اسلام کے قبول کرنے پر ہدایت تامہ کے ملنے کی بشارت ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام "ہدایت تامہ" ہے، یہی وہ دین ہے جس کو یہود و نصاری اور تمام اہل مذاہب نے جو کسی گذشتہ پیغمبر کی اُمت ہوں کھو دیا تھا، اور اب جس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے دوبارہ دنیا میں پیش کیا گیا ہے، اس لئے جو ہدایت اُن قوموں کے پاس تھی وہ ناقص تھی، اور

اسلام جس کو لے کر آیا وہ کامل ہے، نیز یہ معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں یہ کہا گیا ہے کہ اب جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور نصرانی اور صابی جو بھی خدا اور یوم آخر پر ایمان لایا، اور اس نے نیک کام کیا، اس کو خوف وغم نہ ہوگا" ان میں خدا پر ایمان لانے سے مقصود توحید کامل ہے اور اس کا یہ منشا نہیں کہ یہود، نصاریٰ اور صابی وغیرہ اپنے موجودہ گمراہ عقیدوں کے باوجود نجات کے مستحق ہیں، یہود و نصاریٰ کیا مسلمان بھی اس توحید کامل کے بغیر نجات کے مستحق نہیں جب تک مسلمانوں کا ایمان اور عمل صالح ٹھیک اس تعلیم کے مطابق نہ ہو جو انکے رسول کے ذریعہ سے دنیا میں آئی ہے، یہ اصول ہر ایک کیلئے ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا یہودی، عیسائی ہو یا صابی، غرض کسی نبی کی پیروی کا مدعی ہو

نبوت محمدی کا یہ دعویٰ نہیں کہ وہی ایک ہدایت ہے، اور اسکے سوا سب ضلالت ہے بلکہ یہ دعویٰ ہے کہ وہی ایک کامل ہدایت ہے، اور بقیہ مذاہب سابقہ موجودہ حالت میں ناقص ہیں یعنی وہ ابدی کامل ہدایت جو اپنے اپنے وقتوں میں سب نبی لیکر آتے رہے چونکہ ان کے پیرو اپنے تاویلات تحریفات، تصرفات، اور اختلافات سے اس کو برباد کر چکے تھے اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کو لیکر آخری دفعہ تشریف لائے، اور اب وہ ہدایت ہمیشہ کامل رہیگی، کبھی ناقص نہ ہوگی، کیونکہ اس کا صحیفۂ ہدایت (قرآن) تحریف و اختلاف اور تصرف سے محفوظ و پاک رہیگا

یہی وجہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کو نبوت محمدی کی دعوت جہاں دی گئی ہے، ہدایت کی بشارت بھی سنائی گئی ہے، چنانچہ اسی آیت میں جو ابھی اوپر گذری، یہ ہے،

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اھْتَدَوْا (آل عمران)

اے پیغمبر! ان سے جن کو کتاب دی گئی اور عرب کے جاہلوں سے کہہ کیا تم اسلام لائے، اگر اسلام لائے تو انھوں نے سیدھی راہ پائی

سورۂ بقرہ میں ہے،

قُولُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا
وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓی اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ
وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ
اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَمَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ
مِنْ رَّبِّھِمْ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ
مِّنْھُمْ وَنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ فَاِنْ
اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِہٖ فَقَدِ اھْتَدَوْا
وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا ھُمْ فِیْ شِقَاقٍ
(بقرہ ۔ ۱۶)

(اے مسلمانو!) کہو کہ ہم اللہ پر اور جو ہماری
طرف اترا، اور جو ابراہیم پر اور اسمٰعیل پر اور اسحٰق
پر اور یعقوب پر اور اُن کی اولاد پر اترا، اور جو
موسٰی کو اور عیسٰی کو اور سب پیغمبروں کو اُن کے پروردگار
کی طرف سے دیا گیا، (سب پر) ایمان لائے ہم
اُن میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے، اور
ہم اُسی خدا کے مسلم یعنی فرمانبردار ہیں تو اگر
یہ بھی اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم نے مانا تو انھوں
نے سیدھی راہ پائی، اور اگر وہ اس سے باز رہیں

یہود و نصاریٰ اور اہلِ کتاب کو تعلیمِ محمدیؐ کی طرف دعوت اسی "ہدایت" کے پانے کے لئے ہے جو اسلام یعنی انبیاء کے دینِ ازلی سے عبارت ہے اور جس کو لیکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے اور اب فلاح و نجات اسی کے ماننے پر منحصر ہے

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ
وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ وَبِالْاٰخِرَۃِ
ھُمْ یُوْقِنُوْنَ اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی
مِّنْ رَّبِّھِمْ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

جو اس کو جو تیری طرف (اے پیغمبر!) اترا، اور
جو تجھ سے پہلے اترا، دونوں کو مانتے ہیں اور پچھلی
زندگی پر یقین رکھتے ہیں، وہی اپنے پروردگار کی
ہدایت پر ہیں، اور وہی کامیاب ہیں،

حضرت موسیٰؑ کے قصہ کے بعد فرمایا، کہ رحمتِ الٰہی گو عام ہے مگر یہ نعمت خاص طور سے اُن کا حصہ ہے جو تعلیمِ محمدی کو قبول کریں، اور وہی نجاتِ کامل کے مستحق ہیں،

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ	اور میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہے تو اس رحمت
فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ	کو میں اُن کے لئے لکھدوں گا، جو پرہیزگار ہیں اور
الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ	زکوٰۃ دیتے ہیں، اور جو ہمارے حکموں کو مانتے
الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ	ہیں، جو اس ان پڑھ، فرستادہ پیغمبر کی پیروی
الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا	کرتے ہیں جس کو وہ اپنے ہاں توراۃ اور انجیل
عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ	میں لکھا پاتے ہیں، جو اُن کو نیکی کا حکم دیتا ہے
يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ	اور بُرائی سے باز رکھتا ہے، اور اچھی چیزوں
عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ	کو اُن کے لئے حلال کرتا اور بُری چیزوں کو
وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ	حرام کرتا ہے، اور اُن کے بندھن کو اور اُن
إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ	زنجیروں کو جو اُن پر پڑی تھیں اتارتا ہے تو جنھوں
فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ	نے اس پیغمبر کو مانا اور اسکی تائید کی اور اسکی مدد
وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ	کی، اور اس روشنی کے پیچھے چلے جو اس کے ساتھ اتری
أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ○ قُلْ	وہی کامیاب ہیں، کہدے (اے پیغمبر) کہ اے
يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ	انسانو! میں تم سب کی طرف اُس خدا کا رسول
جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ	ہوں جس کی آسمانوں اور زمین کی شہنشاہی ہے

وَالْاَرْضِ ج لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَ	اُس کے سوا کوئی خدا نہیں، وہی جلاتا، اور وہی
يُمِيْتُ ص فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ	مارتا ہے، سو اللہ اور اس کے اِس اَن پڑھ پیغام
النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ	رسان رسول پر ایمان لاؤ، جو اللہ پر، اور
وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ	اس کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے، اور اس
(اعراف - ۱۹)	رسول کی پیروی کرو تاکہ تم سیدھی راہ پاؤ،

ان آیات مین صاف ظاہر کر دیا گیا کہ گذشتہ مذاہب کے پیرووں کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا اس لئے ضروری ہے کہ وہ دین خالص جو انسانی تصرفات اور آمیزشون سے مکدر ہو گیا تھا، وہ صحفِ الٰہی کی پیشینگوئیوں کے مطابق آپکے ذریعہ سے پھر نکھارا گیا ہے، اور جن اضافون اور جزئیاتِ احکام کی سختیوں کو انسانوں نے اس میں شامل کر دیا تھا، وہ آپکے ذریعہ سے دور کی گئین نیز آپ عالمگیر پیغمبر بنا کر مبعوث کئے گئے ہیں، اس لئے ہدایتِ تامہ، نبوتِ عمومی، اور نجاتِ کامل اور فلاحِ عام، اب صرف وحیِ محمدیؐ کے اندر محدود ہے۔

الغرض دینِ محمدیؐ کو قبول کرنا اس لئے تمام انسانوں پر ضروری ہے کہ وہ دینِ ازلی جو ہر مذہب کا جوہر تھا اور جو اُس کے پیرووں کی تحریف و تصرف سے برباد ہو گیا تھا اُسی کو صحیفۂ محمدیؐ لیکر آیا ہے، اب وہ ہمیشہ محفوظ رہے گا، کیونکہ اُس کا نبی خاتم النبیین، اس کا دین کامل دین، اور اُس کا صحیفہ، تمام صحفِ الٰہی پر مہیمن اور حاوی ہے، اور قیامت تک خدا کی طرف سے اُس کی پوری حفاظت اور بقا کا وعدہ کیا گیا ہے، یہ چاروں دعوے یعنی تکمیلِ دین، قرآن کا مہیمن ہونا، قیامت تک اس کا محفوظ و باقی رکھنا، اور ختمِ نبوت حسبِ ذیل دلائل سے ثابت ہیں،

تکمیلِ دین قرآن کے سوا کسی اور صحیفہ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مکمل ہے اور اس کے ذریعہ سے دینِ الٰہی اپنے تمام اصول وفروع (مناسک ومناہج وشرائع) کے لحاظ سے تکمیل کو پہنچ گیا، بلکہ گذشتہ مذاہب میں سے ہر ایک نے اپنے وقت میں یہی کہا کہ اُس کے بعد ایک اور نبوت آئیگی جو اُس کے کام کی تکمیل کرے گی، خدا نے حضرت موسیٰؑ سے فرمایا،

"میں اُن کے لیے اُن کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا، اور اپنا کلام اس کے منھ میں ڈالوں گا، اور جو کچھ میں اُسے فرماؤں گا وہ سب اُن سے کہیگا" (استثنا، ۱۸-۱۹)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد اُن کے مانند ایک اور نبی آنیوالا تھا، جس کے منھ میں اللہ تعالیٰ خود اپنا کلام ڈالے گا، اس سے ثابت ہوا کہ حضرت موسیٰؑ کی طرح ایک اور صاحبِ شریعت نبی خدا کے نئے کلام کیساتھ آئے گا، اسی طرح حضرت عیسیٰؑ نے بھی کہا

"لیکن وہ فارقلیط (احمد) پاکیزگی کی روح ہے، جسے باپ (خدا) میرے نام سے بھیجے گا وہی تمھیں سب چیزیں سکھائے گا، اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں تمھیں یاد دلائیگا" (یوحنا ۱۴، ۲۶)

اور وہ فارقلیط (احمد) آکر دنیا کو گناہ سے راستی اور عدالت سے قصوروار ٹھہرائیگا، گناہ اس لیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے، ...... میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تم سے کہوں پر اب تم اُن کی برداشت نہیں کرسکتے لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئے گی تو وہ تمھیں ساری سچائی کی راہ بتائے گی، اس لیے کہ وہ اپنی نہ کہے گی لیکن جو کچھ سنے گی، سو کہے گی، میری بزرگی کرے گی، (یوحنا ۱۶-۸)

حضرت عیسیٰؑ نے بھی اپنے کلام کو ہنوز ناتمام ہی فرمایا، اور ایک آیندہ آنیوالے کا پتہ دیا

جو اُس کی تکمیل کرے گا،

آخر وہ موعود الامم (صلی اللہ علیہ وسلم) آیا اور دعوی کیا کہ میں موسیٰ کے مانند بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے آیا ہوں، اور میرے منہ میں خدا نے اپنی بولی ڈالی ہے اور یہ دعویٰ کیا کہ میں ہی وہ سچائی کی روح ہوں جو مسیح کی اصلی بڑائی ظاہر کرنے، سچائی کی راہ بتانے، اور مسیح کی ادھوری بات کو کامل کرنے کے لیئے آئی ہے، میں اپنی نہیں کہتا بلکہ وہی کہتا ہوں جو اوپر سے سنتا ہوں، آخر زمانۂ نبوت کے ختم پر وحی الٰہی نے اسکی زبان سے یہ اعلانِ عام کیا،

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ	آج میں نے تمھارا دین کامل کر دیا، اور اپنی
اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ	نعمت تم پر تمام کردی، اور تمھارے لیئے اسلام
لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ه (مائدہ-۱)	کا دین پسند کیا،

اسی تکمیل کا یہ اثر تھا کہ اُس نے یہود کے بعض سخت فقہی احکام کو، جو اُن کی سخت گیری کے لیئے اُن پر عائد تھے، اور اصل دینِ ابراہیمی میں داخل نہ تھے[1] یا انسانوں کے اضافے اور تصرفات تھے، بدل کر ایسے مناسب اور آسان احکام عطا کیئے، جو ہر زمانہ کے لیئے موزون ہو سکتے ہیں، اسی لیئے اس نے کسی اپنے بعد میں آنے والے پیغمبر کی پیشینگوئی نہیں کی، نہ کسی نئے کلام کے نزول کی خبر دی، نہ کسی نئی شریعت کا منتظر کیا کہ تکمیل کے بعد اب کسی نئے آنیوالے کی، نئے کلام، اور کسی نئی شریعت کا موقع کہاں؟ اور اسی بنا پر قرآن نے ہر جگہ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نازل کیا گیا) پر ایمان لانے کی تاکید کی لیکن وَمَا اُنْزِلَ مِنْ بَعْدِكَ کے قبول کرنیکا کہیں اشارۃً تک نہیں کیا

[1] دیکھو آیہ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ الایہ (آل عمران-۱۰)

قرآن مہیمن کتب ہے | اس دین کامل کا صحیفہ تمام اگلی کتابوں کا مصدق ہے،

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (مائدہ - ۷) اپنے آگے کی کتابوں کی تصدیق کرنیوالا،

وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں پر مشتمل ہے اس لئے جو کوئی اس صحیفہ کو قبول کرتا ہے، وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں کو قبول کر لیتا ہے، یہ حیثیت قرآن کے سوا کسی دوسرے صحیفہ کو حاصل نہیں، فرمایا،

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (مائدہ - ۷)

اور ہم نے (اے محمد!) تیری طرف سچائی کیساتھ یہ کتاب اتاری، جو اپنے سے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے، اور اس پر شاہد وحاوی ہے،

لفظ مہیمن کی تفسیر اہل زبان مفسرین نے یہ کی ہے،

ابن عباس رض شاہد اور امین، قرآن اپنے پہلے کی ہر کتاب کا امین ہے،

قتادہ رض قرآن سے پہلے جو کتابیں تھیں اُن کا وہ امین اور شاہد ہے،

غرض قرآن اگلی کتابوں کی صداقتوں اور سچی تعلیموں کی امانت اپنے اندر رکھتا ہے،

قرآن محفوظ ہے اور رہیگا | پیغمبر کی تعلیم کی حفاظت اُس کے صحیفۂ الٰہی کی حفاظت پر موقوف ہے، قرآن سے پہلے کوئی کتاب الٰہی واقف اور ناواقف لفظی تحریفات اور تصرفات سے پورے طور پر بری نہیں رہی، لاکھوں پیغمبروں میں سے چند کے سوا کسی کا صحیفہ دنیا میں باقی نہیں، اور جو باقی ہے وہ فنا ہو ہو کر نئے نئے قالب میں بدلتا رہا ہے، توراۃ جل جل کر خاک ہوئی پھر ان سوختہ اوراق سے تحریر کی گئی اور ترجموں کی تحریفات سے اپنی اصل کھو بیٹھی انجیل میں تحریف و جعل تو اسی زمانہ میں شروع ہو چکا تھا

پھر مترجموں کی کثرت ہونے حقیقت بالکل مشتبہ کردی، زروشت کا صحیفہ سکندر کے نذر ہوا، اب صرف گاتھا کا ایک حصہ بچا کھچا رہ گیا ہے، ان کتابوں کا یہ حال اس لئے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دائمی اور آخری کتابیں بنا کر نہیں بھیجا تھا، اسی بنا پر اُن کی دائمی حفاظت کا وعدہ نہیں کیا گیا لیکن قرآن کی نسبت یہ وعدہ ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لئے باقی اور محفوظ رہے گا، اس کی بقا اور حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی، فرمایا، اور کس وثوق سے فرمایا،

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ، (حجر- ۱)	ہم نے اس نصیحت (کی کتاب) کو اتارا، اور بے شبہ ہم ہیں، اُس کی حفاظت کرنیوالے

یہ وعدۂ الٰہی ایک اور آیت میں ان الفاظ میں دہرایا گیا ہے،

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ، فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ، ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ، (قیامہ- ۱)	بیشک ہمارے ذمہ ہے اس (قرآن) کو سمیٹ کر رکھنا، اور اُس کا پڑھنا، پھر جب ہم پڑھیں تو تو اُس کے پڑھنے کیساتھ رہ پھر بے شبہ ہم پر ہے اس کو کھول کر بتانا،

اس آیت میں قرآن کی قرأت یعنی لفظ و عبارت اور بیان یعنی معنی دونوں کی ذمہ داری خدائے تعالیٰ نے خود اپنے اوپر لی ہے، تیسری آیت میں اس کی تصریح ہے کہ اس حق میں باطل کی آمیزش کبھی راہ نہ پاسکے گی، فرمایا،

وَ اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ، لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ	اور بیشک یہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو غالب ہے، باطل نہ اُس کے سامنے سے، اور نہ اس کے

تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ حَكِيۡمٍ حَمِيۡدٍ، پیچھے سے اُس کے پاس آئے گا، ایک حکمت والے

(حٰمٓ السجدۃ ۵ - ۵) اور خوبیوں والے کی طرف سے اترا،

اس کتاب کو غالب فرمایا گیا، یعنی جو اپنے ہر حریف کو اپنے دلائل کے زور سے پست کرے گی،
باطل نہ اُس کے سامنے سے اُس میں مل سکتا ہے، اور نہ پیچھے سے، یعنی نہ لفظ و عبارت کی طرف سے
اور نہ حقیقت و معنی کی جہت سے، کیونکہ وہ ایک حکمت والے کی طرف سے اُتری ہے، اس لیے
وہ اپنی حکمت و دانائی کی تعلیم سے غالب رہیگی، اور چونکہ وہ ایک سراسر خوبیون والے کی
جانب سے عطا ہوئی ہے، اس لیے ہر باطل کے عیب سے پاک رہے گی،

یہ قرآن کا اپنا دعوٰی ہے کہ ورساڑھے تیرہ سو برس کی تاریخ اُس کی صداقت پر گواہ ہے،

ختمِ نبوت مقدماتِ بالا کا نتیجہ گو خود یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے بعد کسی نبی کی، قرآن
کے بعد کسی صحیفہ کی، اور اسلام کے بعد کسی دین کی ضرورت نہ ہو، لیکن وحی محمدیؐ نے ہر شک کے ازالہ
کے لیے آگے بڑھکر یہ تصریح بھی کردی کہ اب نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہوگیا، اور آپؐ کے
بعد کسی نبی کی حاجت نہین کہ دین کامل اور صحیفۂ الٰہی محفوظ ہو چکا، اور ہدایتِ ربانی کے دروازہ
کے بند ہونے کا خطرہ دور ہو گیا، چنانچہ خود تاریخِ انسانی گواہ ہے کہ بعثتِ محمدیؐ کے بعد سے
دنیا کی حالت بدل گئی، متفرق قومیں پیوستہ ہوگئین، زمین کے کونے ایک دوسرے سے مل گئے،
اور توحید کامل کا غلغلہ عرش سے فرش تک بلند ہو گیا، اور خدا کے تمام رسولوں کو سچا اور صادق
ماننے کا ولولہ آہستہ آہستہ ترقی پانے لگا، یہان تک کہ اُن قومون نے بھی جو مسلمان نہیں ہوئین،
ان دونوں صداقتوں کو اصولاً تسلیم کرلیا،

وحدتِ ادیان
اور
دین اسلام

تفصیل بالا کے بعد یہ واضح ہوگیا کہ وحدتِ ادیان کا منشا کیا ہے یعنی یہ کہ اصل میں ایک ہی دین ہے جو تمام انبیاء کا مذہب رہا، لیکن وہ بعد کو اُن کے پیروؤں کے صحائف میں تحریف و تصرف کے سبب سے بگڑتا رہا، اسی دینِ ازلی کو لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے، اور اسی کا نام اسلام ہے، جو اپنے صحیفہ کی بقا و حفاظت اور دین کی تکمیل اور نبوت کے اتمام کے سبب سے ہمیشہ قائم و باقی رہے گا، اگر تمام مذاہبِ سابقہ اپنے اسی اصل دین پر آجائیں جس کی تعلیم اُن کے پیغمبروں نے دی تھی، تو وہ وہی دینِ ازلی ہوگا جس کا نام اسلام ہے، اور نوحیؑ ابراہیمیؑ موسویؑ عیسویؑ اور محمدیؐ میں سوائے اجمال و تفصیل کے کوئی فرق نہ رہے گا، اسی لئے فرمایا گیا،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ آمِنُوا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُم مِّن قَبْلِ أَن نَّطْمِسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا عَلَىٰ أَدْبَارِهَا أَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّا أَصْحَابَ السَّبْتِ
(نساء - ۷)

اے وہ لوگو جن کو پہلے کتاب دی گئی، اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو بگاڑ دیں، اور اُن کو پیٹھ کی طرف پھیر دیں، یا سبت کے گنہگاروں پر جس طرح لعنت کی تھی، ہم اُن پر لعنت کریں، اس وحی پر ایمان لاؤ، جو ہم نے اب اُتاری (قرآن) جو اُن تعلیمات کی جو تمہارے پاس ہیں تصدیق کرتی ہے،

مشرکینِ عرب سے زیادہ اہلِ کتاب کو اس حقیقت کے سمجھنے کا زیادہ استحقاق تھا، اس لئے انہی کو سب سے پہلے اس کا منکر نہ ہونا چاہئے،

وَآمِنُوا بِمَا أَنزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ ۖ (بقرہ - ۵)

اور جو کتاب ہم نے اب اُتاری جو تمہارے پاس والی کتاب کو سچا بتاتی ہے اس پر ایمان لاؤ، اور تم ہی پہلے

لیکن اُن کی حالت یہ ہوئی کہ

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ، وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ، (بقرہ - ۱۱)	اور جب اُن سے کہا گیا کہ خدا نے جو بھی اُتارا، اس پر ایمان لاؤ، تو جواب دیا کہ جو ہم پر اترا ہم اس کو مانتے ہیں، اور وہ اس کے سوا کا انکار کرتے ہیں حالانکہ یہی (قرآن) حق ہے، اور جو اس کے پاس ہے

اس کے برخلاف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دین کو پیش کیا اس کی بنیاد تمام اگلی نبوتوں اور کتابوں کی صداقت کے تسلیم کرنے پر رکھی گئی، یہی سبب ہے کہ اسلام نے کسی مسلمان کے ہونے کے لئے صرف یہی ضروری نہیں قرار دیا کہ وہ تنہا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لائے، بلکہ یہ بھی قرار دیا کہ وہ تمام نبوتوں اور صحیفوں پر ایمان لائے، چنانچہ خود قرآن کی شہادت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف اسی کی تکلیف نہ تھی کہ آپ کے ہموطن آپ کے صحیفہ کو نہیں مانتے تھے بلکہ اس کی بھی تھی کہ وہ اگلے صحیفوں کو بھی نہیں مانتے تھے، سورۂ سبا میں ہے،

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ (سبا - ۴)	اور منکروں نے کہا کہ ہم اس قرآن پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے، اور نہ اس سے اگلی کتاب پر (یعنی توراۃ پر)

اور اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح کے ساتھ فرمایا کہ جو میری عبودیت اور رسالت کے ساتھ عیسیٰ بن مریم کو بھی خدا کا بندہ اور اس کا رسول، اور کلمۂ خدا اور خدا کی طرف سے آئی ہوئی روح تسلیم کریگا وہ جنت میں جائیگا (بخاری کتاب الانبیاء ذکر عیسیٰ) الغرض وہ ازلی و ابدی دین صرف ایک ہی تھا

اور تمام انبیا علیہم السلام اسی ایک پیغام کو لیکر دنیا میں آئے تھے، یہی وحدت دین کی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن نے اپنے ان الفاظ میں ادا کیا ہے،

يَآيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ، وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا، كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۔ (مومنون-۴)	اے پیغمبرو! ستھری چیزیں کھاؤ، اور بھلا کام کرو، میں تمہاری کاموں سے آگاہ ہوں اور بیشک تم سب کی امت ایک امت ہے، اور میں تم سب کا (ایک) پروردگار ہوں، تو مجھ سے ڈرتے رہو، تو اُن کے پیروؤں نے اپنے مذہب کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، ہر فرقہ اپنے پاس؟

اسی حقیقت کی مزید تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ان الفاظ میں فرمائی ہے

اَلْاَنْبِيَاءُ اِخْوَةٌ لِعَلَّاتٍ اُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰى وَدِيْنُهُمْ وَاحِدٌ،	تمام انبیا ایسے بھائی ہیں جن کا باپ ایک ہے اور مائیں مختلف ہیں، اور ان کا دین ایک ہے

(بخاری کتاب الانبیاء ذکر عیسی)

پچھلے دن اور پچھلی زندگی پر ایمان

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ، (بقرہ ۲۲) وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ، (بقرہ ۱)

اسلام کے سلسلۂ ایمانیات کی آخری کڑی[1] ایک پچھلے دن اور پچھلی زندگی یا پچھلی دنیا پر یقین کرنا ہے۔ سورۂ بقرہ کے پہلے ہی رکوع میں ہدایت یاب اور کامیاب انسانوں کے ایمانیات کی آخری دفعہ یہ بیان کی گئی ہے،

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (بقرہ ۱) اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں،

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (" ۲۲) جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لایا،

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (توبہ) جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے ہیں،

"آخرۃ" کے لفظی معنی "پچھلی" کے ہیں، اور یہ لفظاً صفت ہے، عربی میں اوصاف کو موصوف کا قائم مقام کرکے اکثر موصوف کو حذف کردیتے ہیں، مثلاً "دنیا" کے لفظی معنی "قریب ترین" کے ہیں، اور یہ صفت ہے اس کا موصوف الحیاۃ (زندگی) یا الدّار (گھر) ہے اس لیے الدُّنیا کا مفہوم الحیاۃُ الدُّنیا (قریب ترین زندگی، یعنی اس عالم کی موجودہ زندگی)

[1] قرآن پاک میں جہاں جہاں ایمان کے تفصیلات ذکر کئے گئے ہیں، وہاں یوم آخرپر ایمان سب سے آخر میں بیان کیا گیا ہے،

یا الدار الدنیا (قریب ترین گھر یعنی موجودہ عالم) ہے، اسی طرح الآخر اور الآخرۃ کا مفہوم الیوم الآخر والحیوۃ الآخرۃ والدار الآخرۃ (پچھلا دن اور پچھلی زندگی، اور پچھلا آنیوالا گھر ہے) یعنی موجودہ زندگی کے بعد آنیوالی دوسری دنیا کی زندگی اور گھر، اور قرآن پاک مین یہ لفظ انہی معنون میں کیسو مقام پر آیا ہے اور ہر جگہ اس کا محذوف موصوف حیاۃ (زندگی) یا دار (گھر) ہے.

چنانچہ حسب ذیل آیتوں کے پڑھنے سے یہ حقیقت منکشف ہوگی،

وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ لَهِيَ الْحَيَوَانُ، (عنکبوت) اور بیشک آخری گھر اصلی زندگی ہے،

وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ ؕ (انعام-۴) اور بیشک آخری گھر بہتر ہے،

ان دونوں آیتوں میں دار یعنی گھر کا لفظ موجود ہے،

اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ (توبہ-۶) کیا پچھلی زندگی کو چھوڑ کر اس موجودہ زندگی پر تم راضی ہوگئے،

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ (مومنون-۳) جنھون نے انکار کیا، اور پچھلی (زندگی) کی ملاقات کو جھٹلایا، اور ہم نے موجودہ زندگی میں اُن کو نعمت دی،

ان آیتوں میں "الحیاۃ الدنیا" یعنی موجودہ دنیا کے تقابل سے ظاہر ہے کہ الآخرۃ سے مراد الحیاۃ الآخرۃ یعنی پچھلی زندگی ہے[1]، اور اس لفظ کے عموم مین وہ تمام منازل و مقامات داخل ہیں، جو ابتدائے موت سے لیکر حشر و نشر اور اس کے بعد پیش آتے ہیں یا آئین گے، چنانچہ احادیث صحیح

[1] دنیا اور آخرت کا یہ تقابل قرآن پاک کی بیشمار آیتون میں موجود و مذکور ہے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے،

سے ثابت ہے کہ اس آیت میں:

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ ۝ (ابراهيم-۶)	جو ایمان لائے اُن کو اللہ حیاتِ دنیا میں اور آخرت میں اس پکی بات (کلمۂ توحید) پر مضبوط رکھے گا،

اس آیت میں "آخرت" سے مراد "عالم برزخ" ہے، اور قرآن بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں کہ قیامت میں قولِ ثابت پر قائم رہنا کونسی بڑی بات ہوگی جبکہ ہر چیز اُس وقت واضح اور نمایاں ہوگی اسلئے اس آیت میں "آخرۃ" سے مراد عالم برزخ کے سوا کچھ اور مراد نہیں ہوسکتا، ایک

بقیہ حاشیہ ص ۶۳۳ وجیھا فی الدنیا والاخرۃ (آل عمران-۵) دنیا اور آخرت میں معزز

سلسلۂ دعا میں ہے۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً ۝ (بقرہ - ۲۵)	پروردگار ہم کو دنیا میں نیکی اور آخرت میں نیکی دے۔

کفار کے بطلانِ عمل کے ذکر میں ہے۔

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ، (بقرہ ۲۷)	اُن کے عمل دنیا اور آخرت میں گر گئے،
اِسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ، (نحل ۱۴)	انھوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی،
نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِی الْاٰخِرَةِ، (حٰمٓ السجدۃ-۴)	ہم ہیں تمھاری قریب کی زندگی اور پچھلی زندگی کے دوست،

اور کبھی "دنیا" کے بجائے "اولیٰ" (پہلی زندگی) کا لفظ اختیار کیا گیا ہے، فرمایا۔

فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَ الْاُوْلٰى، (نازعات-۱)	تو خدا نے اسکی پچھلی زندگی، اور پہلی زندگی کی سزا بنایا۔
وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى (لیل ۱)	اور ہمارے ہی لئے ہے پچھلی اور پہلی زندگی.

حدیث میں تصریحاً بیان ہے کہ "قبر (یعنی برزخ) آخرت کی منزلوں میں سب سے پہلی منزل ہے"۔[1]

یوم آخر اور حیاتِ آخرت پر ایمان، اسلام کی نہایت اہم تعلیم ہے اور قرآن پاک میں ایمان باللہ کے بعد اسی کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے کیونکہ موجودہ دنیا کے تمام اعمال، اور اُن کے نتائج کی اصلی اور دائمی بنیاد اسی آیندہ دنیا کے گھر کی بنیاد پر قائم ہے اگر یہ بنیاد متزلزل ہو جائے تو اعمالِ انسانی کے نتائج کا ریشہ ریشہ بیخ و بن سے اکھڑ جائے، اسی لئے تمام مذاہب نے کسی نہ کسی اصطلاح میں دوسری زندگی کو متفقاً تسلیم کیا جائے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس آیندہ زندگی کو دو دوروں میں منقسم کیا ہے ایک موت سے لیکر قیامت تک اور دوسرا قیامت سے لیکر ابد (ہمیشہ) تک جس میں پھر موت اور فنا نہیں، پہلے دور کا نام "برزخ" اور دوسرے کا نام "بعث" یا حشر و نشر اور قیامت ہے اور ان سب کے معنی جی اٹھنے اکھٹے کئے جانے، اور کھڑے ہونے کے ہیں لیکن ان سب سے مقصود ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور وہ موجودہ دنیا کے خاتمہ کے بعد دوسری دنیا کی زندگی ہے، اور اسی لئے اس دوسری زندگی یا اُس کے عالم کا نام قرآن میں اَلدَّارُ الْآخِرَةُ اور عقبی الدَّار وغیرہ ہیں جس کے معنی دوسرے یا پچھلے گھر کے ہیں،

توراۃ و انجیل میں برزخ و قیامت کی تفصیل نیز یہ کہ مرنے کے بعد اور قیامت سے پہلے انسان کی روح کس حالت اور کیفیت میں رہے گی، مذکور نہیں ہے لیکن اسلام میں یہاں بھی گنجلک اور ابہام نہیں، بلکہ اُس نے اس کی پوری تفصیل کی ہے، اور بتایا ہے کہ موجودہ عالم کے علاوہ عالم

---

[1] ابن ماجہ و حاکم بحوالہ کنز العمال جلد ۸ ص ۹۵ حیدر آباد دکن، ترمذی،

عالم برزخ اور میدانِ قیامت ہمارے سزا و جزا کے دو مقام ہیں، شخصی موت کے بعد ہر شخص عالم برزخ میں داخل ہو جاتا ہے اور وہاں اُس کے معاملات شروع ہو جاتے ہیں، پھر اپنے مقرر وقت پر جس کو خدا نے اپنی مصلحتوں اور حکمتوں کے لحاظ سے طے کر لیا ہے سلسلۂ خلق کے خاتمہ پر جب موجودہ دنیا پر عام موت اور فنا طاری ہوگی، دوسری زندگی کی دنیا شروع ہو جائے گی، جو تمام تر ہماری پہلی دنیا میں ہمارے اچھے یا بُرے اعمال کا سراپا عکس، اور ظل ہوگی، چنانچہ سورۂ توبہ کی حسب ذیل آیت میں ہمارے ان تینوں دور ہائے حیات کا ذکر ہے،

سَنُعَذِّبُهُمْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّونَ	ہم اُن کو دو مرتبہ عذاب دیں گے پھر وہ
إِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيمٍ، (توبہ-۱۳)	ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے،

عذاب کی یہ تین منزلیں دنیا، برزخ، اور قیامت ہیں،

ان تینوں عالموں میں جو فرق ہے، وہ یہ ہے کہ اس موجودہ دنیا میں جسم (مادہ) نمایاں اور روح پوشیدہ ہے اور روح کو جو کچھ مسرت و تکلیف یہاں پہونچتی ہے، وہ صرف اُس مادی جسم کے واسطے سے پہونچتی ہے، ورنہ درحقیقت اس کی براہ راست راحت و لذت کا اس مادی دنیا میں کوئی امکان نہیں، دوسرے عالم میں جس کو برزخ کہا گیا ہے، روح نمایاں ہوگی، اور جسم چھپ جائے گا، وہاں جو راحت و تکلیف پہونچے گی، وہ دراصل روح کو پہنچے گی، اور جسم اُس کی تبعیت میں ضمناً اُس سے متاثر ہوگا لیکن اس تیسرے عالم میں جہاں سے حقیقی اور غیر فانی زندگی شروع ہوتی ہے، روح اور جسم دونوں نمایاں ہوں گے۔ اور دونوں کی لذت و تکلیف کے مظاہر بالکل الگ الگ ہوں گے،

ا۔ برزخ

"برزخ" کا لفظ قرآن پاک میں تین جگہ استعمال ہوا ہے، اور ہر جگہ اس سے دو چیزوں کے درمیان کا پردہ، حاجب اور حائل مراد ہے، چنانچہ سورۂ رحمٰن میں دو دریاؤں کا ذکر ہے جن میں ایک میٹھا اور دوسرا کھاری ہے، اور ان کے بیچ میں ایک پردہ حائل ہے جو ان کو آپس میں ملنے نہیں دیتا،

بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ،	ان دونوں کے بیچ میں ایک پردہ ہے،
(رحمان-۱)	(جس سے) ایک دوسرے پر بڑھکر نہیں جاتا،

اسی عجیب غریب بحری منظر کا ذکر سورۂ فرقان میں ہے اور وہاں بھی یہی لفظ واقع ہے،

وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا	اور اسی نے دو دریاؤں کو ملا کے چلایا، یہ
عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ	میٹھا اور پیاس بجھاتا ہے، اور وہ کھاری
وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا	کڑوا ہے، اور ان کے بیچ میں ایک پردہ
(فرقان-۵)	اور روکی ہوئی اوٹ بنائی ہے،

اسی بنا پر موجودہ زندگی اور آیندہ زندگی کے درمیان جو مقام حائل اور حاجب ہے اس کا نام بَرْزَخ ہے سورہ مومنون میں نزع کے وقت کے بیان میں ہے کہ

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ	اور ان مرنیوالوں کے پیچھے ایک پردہ ہے

يُبْعَثُوْنَ ، (مُؤمِنُوْن - ۶) اس دن تک جبکہ وہ (قیامت میں) اٹھائے جائینگے ،

عربون بلکہ کل سامی قوموں کے رسم و رواج اور مشاہدات کی بنا پر اسی درمیانی منزل (برزخ) کا نام "قبر" ہے، خواہ وہ خاک کے اندر ہو یا قعرِ دریا مین، یا کسی درندہ یا پرند کے پیٹ میں اسی لئے فرمایا،

وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ (حج-۱) بے شبہ اللہ اُن کو جو قبروں میں ہیں اٹھائیگا،

اب ظاہر ہے کہ یہ "بعث" صرف انہی مردون کے لئے مخصوص نہین، جو تو وہ خاک کے اندر دفن ہون، بلکہ ہر میت کے لئے ہے، خواہ وہ کسی حالت اور کسی عالم مین ہو، اسی لئے قبر سے مقصود ہر وہ مقام ہے جہان مرنے کے بعد جسمِ خاکی نے جگہ حاصل کی،

موت وحیات کی منزلیں قرآن پاک میں دو موتوں اور دو حیاتوں کا ذکر ہے ایک جگہ دوزخیون کی زبان سے کہا گیا ہے،

رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ (مُؤمن - ۲)

ہمارے پروردگار تو نے ہم کو دو دفعہ مارا، اور دو دفعہ جلایا، ہم نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا، پھر کیا نکلنے کی کوئی راہ ہے،

ان دو موتوں اور دو حیاتوں کی تفصیل خود اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں فرمائی ہے،

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ، (بقرہ - ۳)

کیسے تم اللہ کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم پہلے مردہ تھے، پھر تم کو اس نے زندہ کیا، (انسان بنا کر پیدا کیا) پھر تم کو ماریگا، پھر تم کو جلائیگا پھر

(۱) [illegible]

پہلی موت تو ہر انسان کی خلقت سے پہلے کی ہے جب وہ مادہ یا عنصر کی صورت مین تھا پھر زندہ ہو کر اس دنیا میں پیدا ہوا، یہ اس کی پہلی زندگی ہے، پھر موت آئی، روح نے مفارقت کی، اور جسم اپنی اگلی مادی صورت مین منتقل ہو گیا، یہ دوسری موت ہوئی، پھر خدا اس کی روح کو جسم سے ملا کر زندہ کریگا، یہ اُس کی دوسری زندگی ہوئی جس کے بعد پھر موت نہیں، قرآن پاک مین خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا،

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ، ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ، (زمر-۳)	بیشک تو بھی مرنے والا ہی، اور وہ بھی مرنے والے ہیں، پھر قیامت کے دن اپنے پروردگار کے سامنے دعوی پیش کروگے،
ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ (مومنون-۱)	پھر تم اس کے بعد مرجانیوالے ہو پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤگے،

اب سوال یہ ہے کہ برزخ کے عالم مین کیا کیفیت ہو گی، اس کے سمجھنے کے لئے ایک مختصر سی تمہید کی ضرورت ہے،

نیند اور موت کی مشابہت | اللہ تعالیٰ نے اس مادی دنیا مین روحانی عالم کی باتوں کے سمجھنے کیلئے اپنی عجیب غریب قدرت سے ہم کو ایک چیز عنایت کی ہے جس کو ہم نیند کہتے ہین، روح کو اپنے جسم سے دو قسم کا تعلق ہے، ایک ادراک و احساس کا، اور دوسری تدبیر و تغذیہ کا، نیند وہ عالم ہی جس میں ہمارے تمام آلاتِ ادراک و احساس اس دنیا سے بے خبر ہو کر اپنے گرد و پیش کی مادی دنیا سے یکسر بیگانہ بن جاتے ہیں، تاہم ہمارے نفس یا روح کا تعلق ہمارے جسم سے باقی رہتا ہے اور

وہ اس حالت مین بھی جسم کی مادی زندگی، نشو ونما اور بقا کی تدبیرون اور دل و دماغ اور دیگر اعضاے رئیسہ کے غذا رسانی اور خون کے دوران مین مصروف رہتی ہے، اسی کا نام روح کا جسم سے تدبیری تعلق ہے، اب نیند اور موت مین فرق ہے تو یہ ہے کہ نیند کی حالت مین جسم سے نفس کا تدبیری تعلق قائم رکھتا ہے، اس لیے جسم باقی اور زندہ رہتا ہے، لیکن موت کی حالت مین جسم کا روح سے تدبیری تعلق بھی اکثر منقطع ہوجاتا ہے، اس لیے جسم کے اجزا، کچھ دنوں مین منتشر ہوجاتے ہین موت اور نیند کی یہی مشابہت ہے جس کی بناپر تمام انسانون کی زبانون میں موت کو نیند سے تشبیہ دیتے ہیں، اور دنیا بھر کی زبانون کا یہ توافق الہام طبعی کی خبر دیتا ہے، قرآن پاک مین اس حقیقت کو ان الفاظ مین اداکیا ہے،

وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفّٰكُمْ بِاللَّيْلِ وَ	اور وہی ہے جو تم کو رات میں مارتا ہے، اور
وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ	جانتا ہے، جو تم نے دن مین کمایا، پھر تم کو دن
فِيْهِ لِيُقْضٰى اَجَلٌ مُّسَمًّى (انعام-)	میں جلاتا ہے تاکہ مقررہ وقت پورا کیا جائے

اس سے زیادہ تفصیل سورۂ زمر میں ہے،

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا	وہ اللہ ہی ہے جو روحون کو انکی موت کے وقت وفات دیتا ہے
وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ	اور جو نہیں مری ہیں انکو انکی نیند میں (وفات دیتا
الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ	ہے) تو جس پر موت کا حکم اس نے جاری کیا اسکو روک لیتا
الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ فِيْ	ہے اور دوسری روح کو (جس پر موت کا حکم نہیں یعنی
ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (زمر-۵)	نیند والی کو) ایک مدت معینہ کیلئے چھوڑ دیتا ہے، بےشک

یہی وجہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی نے "برزخ" کی زندگی کو نیند کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، قرآن پاک میں ہے کہ قیامت میں جب لوگ دوسری زندگی پاکر قبروں سے اٹھیں گے، تو گنہگاروں کی زبانوں پر یہ فقرہ ہوگا،

يٰوَيْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (یٰسٓ - ۲)

اے ہماری خرابی، کس نے ہم کو ہماری نیند کی جگہ سے اٹھا دیا،

غزوۂ اُحد کے موقع پر ہے کہ جن کو مرنا تھا، اُن کی موت ٹل نہیں سکتی تھی اگر وہ میدانِ جنگ کے بجائے گھروں میں بھی ہوتے تو نکل نکل کر اپنے مقتل میں خود آجاتے، اس مفہوم کو قرآن نے یوں ادا کیا ہے،

قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ، (آل عمران - ۱۶)

کہدے کہ اگر وہ گھروں میں بھی ہوتے تو جن کے لئے مارا جانا لکھا گیا تھا، وہ خود نکل کر اپنی سونے کی جگہوں میں چلے آتے،

اسی لئے قرآنِ پاک میں دوسری زندگی کے لئے اکثر "بعث" کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی جگانے اور بیدار کرنے کے بھی ہیں[1]، جیسا کہ اوپر کی اس آیت میں ہے،

---

[1] صحیح بخاری (باب تہجد) میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے نماز تہجد کے لئے اس وقت تک بیدار نہ ہونے پر سوال فرمایا، تو حضرت ممدوح نے ان لفظوں میں معذرت پیش کی، یا رسول اللہ انفسنا بِيَدِ اللهِ فَاِذَا شَاءَ اَنْ يَّبْعَثَنَا بعثنا (ہماری روحیں خدا کے ہاتھ میں ہیں، وہ جب جگانا چاہتا ہے جگاتا ہے) اس حدیث میں بھی بعث جگانے کے معنوں میں آیا ہے،

وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰکُمْ بِاللَّیْلِ	اور وہی ہے جو تم کو رات میں موت دیتا ہے،
وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ	اور دن کو جو تم کرتے ہو اس کو جانتا ہے پھر
یَبْعَثُکُمْ فِیْهِ، (انعام - ۷)	تم کو دن میں جگاتا ہے،
وَاَنَّ اللّٰهَ یَبْعَثُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ،	اور بیشک اللہ اُن کو جو قبروں میں ہیں
(حج - ۱)	جگائے گا،

احادیث میں ہے کہ قبر میں سوال وجواب کے بعد نکو کاروں سے کہا جاتا ہے کہ نَمْ کَنَوْمَةِ الْعَرُوْسِ دلہن کی نیند سو جاؤ جس کو وہی جگاتا ہے جو اُس کو سب سے زیادہ محبوب ہے یہاں تک کہ خدا اُس کو اس خواب سے اٹھائے گا"[1]

ان شواہد سے ظاہر ہے کہ برزخ کی زندگی جس میں روح جسم سے الگ ہوتی ہے رُوح کی ایک طویل وعمیق نیند کے مشابہ ہے[2]،

خواب میں لذت والم انسان جب سوتا ہے تو اُس کے ادراک واحساس کے آلات اپنی مادی دنیا سے عارضی طور پر بے خبر ہو جاتے ہیں۔ مگر اس کے ادراک احساس کی تخیلی، تمثالی یا ذہنی دنیا اس کے سامنے بالکل اسی مادی دنیا کی طرح متشکل ہو جاتی ہے اس میں وہ خود اپنے جسم سے الگ الگ ہو بہو وہی جسم دیکھتا ہے جو آتا جاتا، چلتا پھرتا۔ اور دیکھتا سنتا سب کچھ ہے اس کے سامنے کھانے پینے اور لطف انگیزی کے سب سامان ہوتے ہیں نیز اُس میں درد ورنج اور تکلیف کی تمام وہی صورتیں

---

[1] جامع ترمذی کتاب الجنائز باب عذاب القبر ۱۰ احد یث حسنٌ غریبٌ [2] شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں فهذا المبتلی فی الرؤیا غیر انه رؤیا لا یقظة منها الی یوم القیمة (باب اختلاف احوال الناس فی البرزخ) یعنی یہ عذاب قبر کا گرفتار خواب میں ہے لیکن یہ کہ یہ ایسا خواب ہے جس سے قیامت تک جاگنا نہیں ہے،

ہوتی ہیں جو مادی دنیا میں ہیں اس کے خیالی جسم کو اگر اس عالم میں تکلیف ہوتی ہے تو وہ خود چیخ اٹھتا
ہے، اور اگر اس میں لذت ملتی ہے تو لطف اندوز ہوتا ہے اور ان دونوں کے اثرات اس کو اپنے مادی
جسم میں جاگنے کے بعد بھی نظر آتے ہیں، غرض عالم خواب کی خیالی دنیا اور اس کی شادی و رنج اور لذت
والم اور اس مادی دنیا کے جسمانی و مادی شادی و رنج، اور لذت والم میں کوئی فرق نہیں ہوتا اگر کچھ
فرق ہے تو یہ ہے کہ عالم خواب کی لذت و تکلیف بیداری کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور مادی دنیا کی لذت و
تکلیف احساس وادراک کے وجود تک قائم رہتی ہے، اور جس طرح مادی بیداری والی لذت و تکلیف
خواب میں معدوم ہو جاتی ہے اسی طرح خواب والی لذت و تکلیف بیداری میں رخصت ہو جاتی ہے
خواب والے لذائذ و آلام کے مختلف مناظر اور اُن کے حقائق اور اسباب و علل پر اگر فلسفیانہ
حیثیت سے غور کیا جائے، تو عجیب و غریب معاملات سامنے آتے ہیں، کبھی تو یہ ہوتا ہے، کہ وہ
تمام احساسات و معلومات جو کبھی بھی ذہن انسانی میں آئے ہوں، اور اُن کو بحالت بیداری
مادی دنیا کے مشاغل اور زمانہ کے امتداد کے سبب انسان کتنا ہی فراموش کر چکا ہو، وہ خواب
میں مادی گراں باری سے آزادی کے بعد سامنے مجسم شکلوں میں نمودار ہو جاتے ہیں اور بیچ کی کڑیوں
کے بھول جانے کی وجہ سے وہ اُس کو بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ انسان
جن چیزوں کو بھول جاتا ہے وہ اُس کے حافظہ سے حقیقت میں معدوم نہیں ہو جاتیں، بلکہ دماغی
حجرہ (ذہن) کے منتشر اسباب کے ذخیرہ (معلومات) میں چھپ کر گم ہو جاتی ہیں، اور پھر بعد
کو مل جاتی ہیں، اس لیئے وہ تمام اچھے اور بُرے اعمال جو انسان نے عمر بھر کئے ہیں خواہ
وہ اُن کو آج بھول گیا ہو، مگر اُن کی یاد ذہن کے گوشوں میں پڑی ہے معدوم و مفقود نہیں ہو گئی

خواب کی عجیب وغریب صورت وہ ہے جس کو تمثیلی کہتے ہیں، جیسے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے فرزند کے خدمت کعبہ پر وقف کرنے کو قربانی کی شکل میں، اور حضرت یوسفؑ نے والدین کو سورج اور چاند اور گیارہ بھائیوں کو گیارہ ستاروں کی صورت میں دیکھا، شاہ مصر کے سولی پانے والے مصاحب نے اپنے سولی پانے کو اس رنگ میں دیکھا کہ اُس کے سر پر خوان ہے اور بڑے بڑے پرندے اس میں چونچ مار مار کر کھاتے ہیں، شاہ مصر نے مصر کی ہفت سالہ قحط سالی کو سات دبلی گایوں کی صورت میں دیکھا[۱]، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کو اس شکل میں دیکھا کہ مسلمان سر منڈوائے اور بال ترشوائے حج کر رہے ہیں، مسیلمہ اور اسود عنسی دو کذابوں کو سونے کے دو کنگنوں کی صورت میں دیکھا، شہدائے اُحد کو موٹی گائے کی صورت میں ملاحظہ کیا، مدینہ کی وبا ایک پریشان مو کالی عورت کی صورت میں نظر آئی، خلافت کو ڈول کھینچنے کی اور حضرت عمرؓ کے علم کو دودھ کی اور اُن کی دینداری کو لمبی قمیص کی شکل میں[۲] دیکھا، ان کے علاوہ ہر شخص کے ذاتی تجربوں سے بھی اس کی بیشمار مثالیں فراہم کیجا سکتی ہیں،

اس سے بڑھ کر یہ کہ انسان کے جسم مین اگر کسی قسم کا مادہ بڑھ جاتا ہے تو خواب میں اس کے مناسب مجسم شکلیں نظر آتی ہیں، مثلاً اگر بلغم کی زیادتی ہو تو پانی، دریا اور سمندر نظر آئیں گے اگر سودا بڑھ جائے تو ہاتھی اور کالی کالی صورتین نظر آئیں گی، اسی طرح دوسرے تغیرات خلطی بھی اپنے مناسب جسمانی ہیئت میں خواب میں مجسم اور متشکل ہو کر دکھائی دیتے ہیں،[۳]

---

[۱] یہ کل تمثیلی خواب قرآن پاک میں مذکور ہین [۲] ان خوابون کو صحیح بخاری کتاب التعبیر میں دیکھو [۳] حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہ، ذکر برزخ،

اسی طرح اعمال جو جسم و مادّہ سے بالکل الگ ہیں، خواب مین اپنے مناسب قالب میں مجسم ہو جاتے ہین، اگر کسی بھائی کا حقِ واجب کسی نے ادا نہیں کیا تو خواب مین اس کو نظر آئیگا کہ وہ اس کا گلا کاٹ رہا ہے، اگر کسی کی غیبت کی ہے تو معلوم ہوگا کہ وہ مردار کھا رہا ہے، سونے چاندی کے خزانون کو جمع کرکے اگر بخل کا اژدہا اُن کی حفاظت میں بٹھایا ہے تو سانپ بن کر وہ اُس کی گردن میں لپٹتا اور کاٹتا ہے، ذلت اور خواری کتے کی، حماقت گدھے کی، اور شجاعت شیر کی شکل مین نمودار ہوتی ہے، شب معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فطرت دودھ کی اور غیر فطرت شراب کی شکل مین پیش ہوئی، اسی طرح کہن سال دنیا ایک بڑھیا کی شکل مین نظر آئی،

اسی قسم کی تمثیلات قرآن مجید میں بھی آئی ہین، مثلاً غیبت کی نسبت فرمایا،

وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ (حجرات - ۲)	اور پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو بُرا نہ کہے کیا تم میں سے کوئی پسند کرسکتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کی بوٹی نوچ نوچ کر کھائے، سو گھن آئی تم کو،

سود کھانے کو جنون اور پاگل پن کی شکل میں ظاہر کیا،

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ، (بقرہ ۵ - ۳۸)	جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں اٹھیں گے (یا نہیں اٹھتے) لیکن جیسے وہ اٹھتا ہے جس کے حواس شیطان نے چھو کر کھو دیئے ہون،

یتیموں کا مال ناجائز طریق سے کھانے کو پیٹ مین آگ بھرنا فرمایا،

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی	وہ لوگ جو یتیمون کا مال ظلم کرکے کھاتے ہین

ظُلۡمًا اِنَّمَا یَاۡكُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِهِمۡ | وہ اپنے پیٹوں میں آگ کھاتے ہیں
نَارًا وَسَیَصۡلَوۡنَ سَعِیۡرًا (نساء ۱) | اور آگے جہنم کی آگ میں داخل ہونگے،

وہ خود غرض لوگ جو بیکسوں کے کام نہیں آتے، قیامت میں اُن نے بھی کوئی کام نہ آئیگا، اور جو خود سیر ہو کر کھاتے ہیں، اور غریبوں کے درد گرسنگی سے بے خبر رہکر اپنے مال کا میل کچیل (زکوٰۃ) بھی اُن کے کھانے کو نہیں دیتے، دوزخ میں اُن کو زخموں کا دھوون کھانے کو ملیگا فرمایا

اِنَّهٗ كَانَ لَا یُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ الۡعَظِیۡمِ | بیشک وہ خدائے بزرگ پر ایمان نہیں رکھتا
وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡكِیۡنِ | تھا، اور مسکین کے کھانے پر آمادہ نہیں کرتا
فَلَیۡسَ لَهُ الۡیَوۡمَ هٰهُنَا حَمِیۡمٌ وَّ | تھا، تو آج اُس کا بھی یہاں کوئی دوست
لَا طَعَامٌ اِلَّا مِنۡ غِسۡلِیۡنٍ لَّا یَاۡكُلُهٗۤ | نہیں، اور نہ زخموں کے دھوون کے سوا کوئی
اِلَّا الۡخَاطِئُوۡنَ ، (حاقۃ - ۱) | کھانا جو اس کو وہی گنہگار کھائیں گے،

بے لوث مخلصانہ فیاضی کی تمثیل سرسبز و شاداب باغ سے دی،

وَمَثَلُ الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمُ | اور اُن کی مثال جو اپنی دولت خدا کی
ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ وَتَثۡبِیۡتًا | خوشنودی چاہنے اور اپنے دلوں کی مضبوطی
مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبۡوَةٍ | کے لئے خرچ کرتے ہیں، ایک باغ کی ہے
(بقرہ ۷ - ۳۶) | جو ایک ٹیلہ پر ہے،

خدا کی راہ میں جان دینے والوں، اور مرنیوالوں کو جانِ نو، اور حیاتِ جاودان کی خوشخبری دی گئی، فرمایا،

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ (بقرہ ۱۹)

جو خدا کی راہ میں مارا جائے، اُس کو مردہ نہ کہو، وہ لوگ زندہ ہیں،

اسی طرح یہ ہے کہ جو خدا کو قرض دیگا، خدا اُس کو بڑھا کر دے گا، جو دوسروں کو معاف کریگا خدا اُس کو معاف کریگا، جو دوسروں کی عیب پوشی کریگا خدا اس کی ستاری کرے گا، قرآن واحادیث اس قسم کی بالمعاوضہ جزا وسزا کے ذکر سے لبریز ہیں،

جو لوگ راہِ خدا میں اپنا مال نہیں دیتے اُن کی نسبت فرمایا،

سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ، (اٰلِ عمران - ۱۸)

جس مال کا بخل کیا تھا، قیامت میں اُس کا اُن کے گلے میں طوق پڑے گا،

يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ، (توبۃ - ۵)

جس دن اُس سونے اور چاندی کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائیگا، پھر اس سے اُن کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائینگی کہ یہ ہے جو تم نے اپنے لئے گاڑ رکھا تھا تو اب تم اس کا مزہ چکھو جس کو تم گاڑ کر رکھتے تھے،

دنیا میں اللہ کے نورِ بصیرت سے روگردانی آخرت میں ظاہری نابینائی کی صورت میں رونما ہوگی، اور اسی طرح جو خدا کو یہاں بھولیگا، خدا اُس کو وہاں بھلائے گا، چنانچہ حضرت آدمؑ سے جنت سے نکلتے وقت یہ فرمایا گیا تھا،

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ

اور جس نے میری یاد سے روگردانی کی تو اس کیلئے

مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	کے لئے ہو تنگ گزران، اور ہم قیامت کے دن اسکو
اَعْمٰى، قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى	اندھا اٹھائیں گے، وہ کہیگا، میرے پروردگار
وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا، قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ	تونے مجھے اندھا بناکر کیوں اٹھایا، میں تو دنیا
اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى	میں آنکھوں والا تھا، خدا کہے گا، اسی طرح تیرے
	پاس ہماری نشانیاں آتی رہیں، تو اُن کو تونے
(طٰہٰ - ۷)	بھلا دیا، اور اسی طرح آج تو بھلایا جائے گا،

یہی مفہوم اور زیادہ اختصار کے ساتھ اس آیت میں ہے،

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ	جو کوئی دنیا میں (دل کا) اندھا تھا، وہ
اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا، (اسرائیل - ۸)	آخرت میں اندھا ہوا اور راستہ سے بہت بھٹکا ہوا

اس باب میں سب سے زیادہ صریح وہ حدیث صحیح ہے، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو کہ بخیل کا مال سانپ کی صورت میں گلے کا ہار ہو کر نظر آئے گا، یعنی وہ مال سونے اور چاندی کے سانپ کی صورت میں ہو گا،

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کو اللہ
اٰتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَلَمْ يُؤَدِّ زَكَاتَهٗ	نے مال دیا اور اُس نے اُس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی،
مُثِّلَ لَهٗ مَالُهٗ شُجَاعًا اَقْرَعَ لَهٗ	تو اُسکا مال اسکو اجیل کرڈسنے والے سانپ کی
زَبِيْبَتَانِ يُطَوَّقُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ	صورت میں دکھایا جائے گا جس کا سر زہر کی
يَاْخُذُ بِلِهْزِمَتَيْهِ اَيْ شِدْقَيْهِ يَقُوْلُ اَنَا	شدت سے گنجا ہو گا، اُس کے منہ میں دو دانت ہونگے

مالك انا كنزك،	وہ اس کے گلے میں قیامت کے دن پڑا
(بخاری تفسیر آلِ عمرانؔ)	ہوگا، اور وہ اُس کے دونوں جبڑوں کو
(صفحہ ۵۵ جلد دوم)	کاٹیگا، اور کہے گا میں ہوں تیرا مال میں۔

اسی طرح وہ حدیثیں ہیں جن میں مختلف اعمال کا مختلف شکلوں میں آنا بیان کیا گیا ہے، مثلاً یہ کہ مرنے کے بعد قبر میں نماز روزہ وغیرہ اعمال عذاب سے بچنے کے لئے ڈھال بن کر دائیں بائیں سے نمودار ہوں گے، یہ بھی حدیث میں ہے کہ مرنے کے بعد جب ایک دفعہ فرشتۂ الٰہی مردہ کو بیدار کرتا ہے تو اُس کو آفتاب ڈوبتا ہوا دکھایا جاتا ہے، (مثلت الشمس عند غروبها) نیک مرد مسلمان اس تنگ وقت کو دیکھ کر نماز کی تیاری کرنا چاہتا ہے[۲] یہ ظاہر ہے کہ یہ دنیا والا آفتاب وہاں نہیں، بلکہ اُس کی تمثیل ہوتی ہے، جیسا کہ حدیث کے الفاظ میں ہے یعنی یہ کہ اُس مردہ کو ایسا نظر آتا ہے، اور وہ درحقیقت آفتاب نہیں، بلکہ آفتاب کی مثالی صورت ہوتی ہے۔

گناہوں کی تمثیلی سزائیں

اوپر کے بیانات سے ہویدا ہے کہ غیر مجسّم اعمال اور معانی اپنے جن تمثیلی پیکروں میں نظر آتے ہیں، وہ درحقیقت اُن اعمال و معانی سے تمثیلی مشابہت رکھتے ہیں، مثلاً ایک صحیح حدیث میں ہے کہ مشہور صحابی حضرت عثمان بن مظعونؓ کی وفات کے بعد ایک صحابی نے خواب میں دیکھا کہ اُن کے لئے ایک نہر بہہ رہی ہے اور جب اس کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپنے اُس کی تعبیر میں فرمایا،

ذلك عمله (بخاری کتاب التعبیر)	یہ نہر اُن کا (نیک) عمل ہے،

---

[۱] مسند ابن حنبل [۲] سنن ابن ماجہ ذکر القبر ص ۳۲۶،

اس تمہید کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس رویائے صادقہ پر غور کرو جو ظاہر ہے کہ قیامت کا نہیں کہ ابھی وہ آئی نہیں، بلکہ برزخ ہی کا مرقع پیش کرتا ہے، جواب بھی قائم ہے، آپ نے ایک صبح کو فرمایا کہ "رات میں نے دیکھا کہ دو آنے والے آئے، اور انھوں نے مجھے جگا دیا، میں اُن کے ساتھ چل کھڑا ہوا تو میں نے دیکھا کہ (۱) ایک آدمی لیٹا ہے، اور دوسرا اس کے سر پر ایک بڑا پتھر لئے کھڑا ہے، اور وہ اُس پتھر کو اُس کے سر پر اس طرح دے مارتا ہے، کہ اس کا سر کچلا چور ہو جاتا ہے اور پتھر لڑھکنے لگتا ہے، وہ اُس کے پیچھے جا کر اس کو اٹھا لاتا ہے، اور اتنی دیر میں اس کا سر درست ہو جاتا ہے پھر وہ مارتا ہے اور پھر وہی صورت پیش آتی ہے ہم آگے بڑھے تو دیکھا کہ (۲) ایک شخص اوندھا پڑا ہے اور دوسرا لوہے کا ایک آنکس لئے کھڑا ہے، اور وہ اُس سے اُس کے جبڑے کو، پھر نتھنے کو، اور پھر آنکھوں کو گدی تک چیر ڈالتا ہے، پہلے ایک طرف، بعد ازیں دوسری طرف، پھر آگے بڑھے تو دیکھا کہ (۳) تنور کی قسم کی ایک چیز دہک رہی ہے، اور کچھ مرد اور عورت اس میں ننگے پڑے ہیں، اور اس کے شعلے بھڑک کر اُن تک پہونچتے ہیں اور وہ چیختے ہیں، آگے بڑھے تو نظر آیا کہ (۴) ایک خون کی جیسی سرخ نہر بہ رہی ہے، اور ایک آدمی اس میں تیر رہا ہے، نہر کے کنارے ایک آدمی کھڑا ہے جس کے پاس بہت سے پتھر رکھے ہیں، وہ تیرنے والا آدمی تیر کر جب اس شخص کے قریب آتا ہے، تو ایک پتھر اُٹھا کر اس زور سے مارتا ہے کہ وہ پتھر اُس کے منھ میں جا کر پیٹ میں اتر جاتا ہے،

اُس کے بعد ہم آگے بڑھے تو ایک سرسبز و شاداب چمن نظر آیا جس میں بہار کی ہر کلی کھل رہی تھی، باغ کے سامنے ایک دراز قد آدمی کو دیکھا جس کا سر آسمان میں تھا، اور اُس کے چاروں طرف بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے تھے، آگے بڑھے تو ایک بہت بڑا باغ دیکھا جس سے زیادہ بڑا

اور خوبصورت باغ میں نے نہیں دیکھا تھا، یہاں پہنچ کر اپنے دونوں ہمراہیون کے کہنے سے اوپر چڑھا تو ایک شہر ملا جس کی دیواریں سونے کی ایک ایک چاندی کی ایک ایک اینٹ لگی تھی، ہم لوگ دروازہ کے پھاٹک پر پہونچے، دروازہ کھلوایا تو اس کے اندر گھسے تو اس مین کچھ لوگ ملے، جن کا آدھا دھڑ نہایت ہی خوبصورت اور آدھا بہت ہی بدصورت تھا، میرے ہمراہیون نے ان سے ایک نہر کی طرف جو بیچ مین نہایت صاف شفاف بہ رہی تھی، اشارہ کرکے کہا کہ اس میں جاکر غوطہ لگاؤ، وہ غوطہ لگا کر آئے، تو ان کی بدصورتی کا حصہ جاتا رہا، اور وہ پورے دھڑ سے خوبصورت ہوگئے، میرے ہمراہیوں نے مجھ سے کہا کہ "یہ جنتِ عدن" ہے، اور وہ آپ کا دولت خانہ ہے، میں نے نظر اٹھا کر دیکھا، سپید لکّہ ابر کی طرح ایک محل دکھائی دیا،

پھر میں نے ان ہمراہیوں سے کہا کہ آج تو میں نے عجیب عجیب چیزیں دیکھیں تو بتاؤ میں نے کیا کیا دیکھا، انھوں نے جواب دیا کہ پہلا شخص جس کا سر پتھر سے کچلا جارہا تھا، وہ ہے جو قرآن پڑھ کر اسکی تعمیل سے انکار کرتا ہے، اور صبح کی مفروضہ نماز سے غافل ہوکر سورہتا ہے، اور دوسرا شخص جس کے کلپھڑے اور نتھنے اور آنکھیں پھاڑی جاتی تھیں، وہ ہے جو جھوٹ بول کر تمام دنیا میں اس کو پھیلاتا ہے، اور تنور میں جو مرد اور عورتیں ننگی جل رہی تھیں، وہ بدکار مرد اور عورتیں ہیں اور جو شخص خون کی نہر میں تیر رہا تھا، اور منہ سے پتھر نگلتا تھا، وہ سودخوار ہے اور اس سدا بہار چمن میں جو دراز قد آدمی آپنے دیکھا، وہ ابراہیمؑ تھے، اور ان کے گرد جو بچے تھے وہ ننھے اور کمسن بچے تھے، جو فطرت پر مرتے تھے کسی صحابی نے پوچھا یا رسول اللہ! مشرکون کے بچے؟ فرمایا، اور مشرکون کے بچے بھی، وہ لوگ جن کا آدھا دھڑ خوبصورت، اور آدھا بدصورت تھا وہ ہیں جنھوں نے کچھ

اچھے کام بھی کئے تھے، تو خدا نے اُن کے گناہ دھو دیئے"[1]

برزخ کی ان تمام سزاؤں پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اُن کی نوعیت اور کیفیت اُن کے اعمال کے بالکل مناسب اور مشابہ قرار دی گئی ہے، نمازِ صبح سے غافل ہوکر، بالین راحت سے سر نہ اٹھانے والے کا سر کچلا جانا، جھوٹے کا گلپھڑا پھاڑا جانا، زانی اور زانیہ کا برہنہ تنور کی آگ میں جلنا، خون چوسنے والے سود خوار کا انسانوں کے خون کے دریا میں تیرنا، اپنا دو بالشت کا پیٹ بھرنے کے لیئے سارے غریبوں کی روزی چھین چھین کر جمع کرنے والے کا پتھر کے لقمے کھانا سراسر اُن کے دنیاوی اعمال کی تمثیل و تصویر ہے، اور آخر میں نصف حسن عمل سے آدھے دھڑ کی خوبصورتی، اور نصف سوء عمل سے آدھے دھڑ کی بدصورتی پوری مشابہ ہے، اور صاف و شفاف نہر کی صورت میں رحمت و مغفرتِ الٰہی کا ظہور بھی اسی قیاس پر ہے[2]،

ابھی تک دنیا نے جو کچھ ترقی کی ہے، وہ نفس سے باہر آفاقی (یعنی اپنے سے باہر کی بیرونی مادی) دنیا کی اشیا کے خواص و صفات کے جاننے میں کی ہے جن سے سائنس کی ایجادات و اختراعات کا تعلق ہے لیکن ابھی اس سے بھی زیادہ ایک وسیع دنیا اپنے اندر کی پڑی ہے جس کو قرآن نے "انفس" کہا ہے، ان انفس یا ارواح کے اوصاف و خصائص کا ابھی تک بہت کم علم ہوا ہے، ہماری سائیکالوجی (علم النفس) ابھی اپنی ابتدائی منزل میں ہے اور اس پر یچولزم (علم ارواح) ابھی طلسم فریب کے عجائبات میں اسی طرح گرفتار ہے جس طرح موجودہ عہد سے پہلے آج کے معمولی سائنٹفک تجربے سحر و جادو کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے بہرحال ابھی تک علم نفس و روح کے

[1] صحیح بخاری کتاب التعبیر مختصراً [2] حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ذکر واقعات حشر،

عجائبات پر پردے پڑے ہوئے ہیں، ایک یہی مسئلہ کہ شے کے یقین، اور اس کے خارجی وجود
مین کیا تعلق ہے؟ ایک معما ہے، بہت سے ہند و اہلِ فلسفہ اور بعض مسلمان صوفیون اور موجودہ
زمانہ کے مشہور فلاسفر برکلے کے نزدیک تو کسی شے کے یقین اور وجود، یا یون کہو کہ ذہنی اور
خارجی وجود مین بہت کم فرق ہے، بلکہ گویا نہیں ہے،

بہر حال نفسِ انسانی کے اندرونی قوی کا علم گو ابھی بہت کچھ محتاجِ تکمیل ہے تاہم اتنا
ثابت ہے کہ کسی شے کی تصوری یقین، اور خارجی وجود میں بہت ہی شدید تعلق ہے، مسمریزم
نے جو سراسر اسی اصول پر مبنی ہے، اس حقیقت کو کسی قدر واضح کر دیا ہے، اسی سے معلوم ہوگا
کہ مذاہب نے سب سے زیادہ ایمان پر جو یقین ہی کا دوسرا نام ہے، اس قدر زور بے سبب نہیں دیا ہے،
قرآن پاک نے یقین کی دو قسمیں کی ہیں، علم الیقین اور عین الیقین کسی شے کی دلیلون
کوشش کر یا بعض علامتون کو دیکھ کر اس کے وجود کا اقرار کر لو، تو یہ علم الیقین (یقین جاننا) ہے اور
اگر وہ شے خود تمہارے احساس اور مشاہدہ کے سامنے آجائے جس میں پھر شک و شبہہ کی
گنجائش نہیں ہوسکتی، تو وہ عین الیقین (خود یقین) ہے، قرآن پاک نے یقین کی ان دونون صورتون
کو سورہ تکاثر میں بیان کیا ہے،

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ	تم کو دولت ونعمت کی بہتات نے غفلت میں
الْمَقَابِرَ، كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ، ثُمَّ	مبتلا کر دیا، یہاں تک کہ تم نے قبرون کو جا
كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ	دیکھا، ابھی نہین تم آگے جان لوگے پھر ابھی
عِلْمَ الْيَقِيْنِ، لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ثُمَّ	نہیں تم آگے جان لوگے ہرگز نہیں، اگر تم یقین

لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ،	کا جاننا جانتے تو البتہ دوزخ کو دیکھ لیتے
(تکاثر - ۱)	پھر البتہ عین الیقین سے اس کو دیکھ لوگے،

بنا برین اگر انسان اپنے اندر علم یقین حاصل کرکے جو کمالِ ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے تو وہ اپنے باطن کی آنکھوں سے اپنی دوزخ یہیں دیکھ لے،

کَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ،	نہیں یہ بات نہیں اگر تم کو علم یقین ہوتو
لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ، (تکاثر)	دوزخ کو بے شبہہ دیکھ لوگے،

کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عذاب کے عینی مشاہدہ کا فوری مطالبہ کرتے تھے، وحی الٰہی نے اس کے جواب میں کہا،

يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ، وَاِنَّ	وہ تجھ سے جلد عذاب مانگتے ہیں، حالانکہ
جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكَافِرِيْنَ (عنکبوت)	دوزخ گھیر رہی ہے منکروں کو

ایک دوسری آیت میں ہے کہ منافقین بزعم خود آزمایش کے ڈر سے جہاد کی شرکت سے عذر کرتے ہیں، اُس کے جواب میں اُن سے فرمایا گیا کہ وہ تو ابھی آزمایش میں مبتلا ہیں، اور دوزخ اُن کو گھیرے ہوئے ہے،

وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَ	اور اُن میں کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ مجھ کو (جہاد میں
لَا تَفْتِنِّيْ، اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا، وَ	عدم شرکت کی) اجازت دیدیجئے، اور آزمایش
اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ	میں نہ ڈالئے، ہاں وہ تو آزمایش میں پڑ چکے
(توبہ - ۷)	اور دوزخ منکروں کو گھیر رہی ہے،

لیکن یہ علم الیقین جس کے حصول کا ذریعہ صرف ایمان ہے، ہر شخص اُس سے اس دنیا میں بہرہ ور نہیں ہوتا، بلکہ بہتیرے اُس کے منکر ہیں، اس لیے اُن کو یہ اپنے پاس کی دوزخ اس وقت نظر نہیں آتی لیکن موت جس کا آنا ایک دن یقینی ہے، جب وہ آئے گی تو مادہ کا یہ حجاب جو آنکھون پر پڑا ہوا اُٹھ جائیگا، اس وقت اس عالمِ غیب کے کچھ اسرار اُن پر منکشف ہوجائین گے، اور اعمال کے تمثیلی نتائج اور ثواب وعذاب اور جنت و دوزخ کے بعض مناظر اُن کے سامنے آجائین گے، اور اس وقت وقت وہ اپنے یقین کی آنکھون سے کسی قدر واقعات کا مشاہدہ کرلیں گے،

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ (تکاثر-۱) پھر تم دوزخ کو عین یقین سے دیکھ لوگے،

یہ موت کے بعد کا سمان ہوگا، جس کو برزخ کا عالم کہتے ہیں، اس کے بعد جب قیامت آئیگی تو ہر راز فاش ہوجائے گا، يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ (جس دن تمام بھید کھل جائیں گے) اور بہشت و دوزخ اپنی ظاہری صورتون میں اس طرح سامنے آجائین گی، کہ پھر شک وشبہ کا شائبہ بھی باقی نہ رہے گا، وہ علمِ حقیقی اور یقین تحقیقی کا دن ہوگا، قرآن مین قیامت کے موقع پر ہے؛

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ، ذَالِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ.... فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ الْحَدِيْدٌ (ق-۲)

اور نرسنگا پھونکا گیا، یہ ہے ڈر کا دن،... .... تو ہم نے تیرا پردہ تجھ سے کھول دیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے،

اس پردہ کے ہٹتے ہی اس دن انسان کے تمام اعمال ایک ایک کرکے اُس کے سامنے آجائین گے، اور دوزخ منظرِ عام پر آجائے گی، فرمایا،

فَاِذَا جَاءَتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرٰى جب وہ بڑا ہنگامہ آئے گا جس دن انسان

يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ۙ
وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى (نازعات ٢)

کو جو کچھ اس نے کیا ہے، یاد آجائیگا، اور دوزخ دیکھنے والے کے سامنے باہر لائی جائیگی۔

احوالِ برزخ کا عین الیقین | ایک ظرف شاعر (ابو العتاہیہ) نے حیرت کے عالم میں کیا خوب کہا ہے،

اَلْمَوْتُ بَابٌ وَكُلُّ النَّاسِ يَدْخُلُه
فَلَيْتَ شِعْرِىْ بَعْدَ الْبَابِ مَا الدَّارُ

موت ایک دروازہ ہے اور تمام انسان اس دروازہ میں داخل ہونگے، کاش مجھے معلوم ہوتا کہ اُس دروازہ کے بعد

یہ علم جس کی حسرت اس شاعر نے ظاہر کی ہے، اس زندگی میں صرف علم الیقین کے ذریعہ سے حاصل ہوسکتا ہے البتہ موت کے وقت جب وہ دوسرے عالم کے دروازہ پر کھڑا ہوگا تو اسکو پسِ پردہ کا نظارہ تھوڑا بہت ہوجائے گا، اور وہی برزخ کا عالم ہے فرمایا،

حَتّٰى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ
قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ، لَعَلِّىْٓ اَعْمَلُ
صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ط اِنَّهَا
كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ط وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ
بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ،

(مومنون - ٦)

جب ان گنہگاروں میں سے کسی ایک کو موت آتی ہے تو وہ (زندگی کے پسِ پردہ کے بعض مناظر کو دیکھ کر) کہتا ہے اے میرے پروردگار! مجھے ایک بار اور دنیا میں لوٹا دے تاکہ دنیا میں جو مال چھوڑ کر آیا ہوں، اس سے شاید کوئی نیک کام کروں، ہرگز نہیں، یہ بات ہی بات ہے جو وہ کہتا ہے اور (اب) ان گنہگاروں کے پیچھے اس دن تک ایک پردہ (برزخ) ہے جب وہ

ظاہر ہے کہ اگر موت کے وقت اور بعد کوئی غیبی کیفیت اس کے مشاہدہ میں نہیں آجاتی

تو اس کا شک وشبہ دفعۃً یقین سے کیسے بدل جاتا ہے، فرمایا،

وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۚ — اور موت کی بیہوشی "حقیقت" کو لیکر آگئی،

ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ (ق-۲) — یہی ہے، وہ جس سے تو ہٹا کرتا تھا،

اس سے معلوم ہوا کہ سکرات کے وقت "حقیقت" کا کوئی منظر سامنے ضرور آجاتا ہے

اہلِ تفسیر نے بھی اس آیت سے یہی سمجھا ہے، ابن جریر طبری لکھتے ہیں،

بالحق من امر الآخرۃ فتبینہ للانسان حتی تثبتہ وعرفہ[۱] — حق یعنی آخرت کا کچھ حال تو موت کی سکرات انسان پر کھول دیتی ہے، یہاں تک کہ انسان اس کو یقین کرلیتا ہے اور جان لیتا ہے

حافظ ابن کثیر محدث اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

یقول عزوجل وجاءت ایھا الانسان سکرۃ الموت بالحق ای کشفت لک عن الیقین الذی کنت تمتری فیہ[۲] — اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے انسان موت کی بیہوشی حق کو لے کر آگئی یعنی تیرے اس یقین کے پردہ کو کھول دیا، جس میں تو شک کرتا تھا،

قاضی شوکانی محدث کی تفسیر میں ہے،

ومعنی بالحق انہ عند الموت یتضح لہ الحق ویظھر لہ صدق ما جاءت — اور حق لے کر آنے کے معنی یہ ہیں کہ موت کے وقت حق بات کھل جاتی ہے، اور

[۱] تفسیر ابن جریر طبری جلد ۲۶ ص ۹۱ [۲] تفسیر ابن کثیر بر فتح البیان ج ۹ ص ۲۹۰،

بہ الرسل من الاخبار بالبعث و	پیغمبر جس قیامت اور جزا و سزا کی خبرین لیکر
الوعد والوعید (ج ۵ ص ۷۳)	آئے تھے، ان کی سچائی ہویدا ہو جاتی ہے،

مفتی آلوسی حنفی کی تفسیر کی عبارت یہ ہے (ج ۶ ص ۱۶۵۲)

والمعنی احضرت سکرۃ الموت	اس آیت کا مطلب یہ ہو کہ موت کی مدہوشی
حقیقۃ الامر الذی نطقت بہ	اس حقیقت امر کو سامنے کردیتی ہو جس کو اللہ کی
کتب اللہ تعالی ورسلہ علیہم السلام	کتابوں اور اس کے رسولوں نے بیان کیا ہے

زمخشری معتزلی (کشاف ج ۲ ص ۱۴۰۲ کلکتہ) اور ابو حیان اندلسی مالکی کی تفسیر میں بھی یہی ہے (بحر محیط ج ۸ ص ۱۲۴ مصر)

یہ مفسرین مختلف فرقون سے تعلق رکھتے ہین لیکن ان سب کی متفقہ تفسیر یہی ہے اس تفسیر کی صحت کی مزید دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد ہی قیامت کے ذکر مین ہے،

فکشفنا عنک غطاءک فبصرک الیوم	ہم نے آج تجھ سے تیرا پردہ کھول دیا، تو
حدید، (ق-۲)	آج تیری نظر تیز ہے،

اس سے معلوم ہوا کہ موت کے وقت کسی قدر انکشاف ہوتا ہو اور قیامت کے دن انکشاف تام ہو جاتا ہو، لیکن بہر حال موت کے وقت یقین کا پردہ بالکل کھل جاتا ہو،

موت کے بعد خدا کی طرف روح کی بازگشت

"موت" کے لئے قرآن میں اکثر خدا کی طرف بازگشت یعنی خدا کی طرف لوٹ جانے کی اصطلاح اختیار کی گئی ہے،

قل ان الموت الذی تفرون	بیشک وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو اس سے

مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى	ملنا ہی ہو پھر تم اس (خدا) کے پاس لوٹائے
عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ	جاؤگے، جو حاضر و غائب کا جاننے والا ہی تو
بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (جمعہ - ۱)	وہ تم کو تمھارے کرتوت بتائے گا،
اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ (بقرہ ۱۹)	ہم سب خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں،
اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا (مائدہ ۱۴۷)	تم سب کو خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے،

یہ طرزِ ادا بیسیوں آیتوں میں اختیار کیا گیا ہے، یہ بالکل بدیہی ہے کہ ہر رجوع و بازگشت کے مفہوم میں ورود اور آمد داخل ہی، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کہ تمام ارواحِ انسانی خدا کے یہاں سے اس جسم و قالب کی قید میں آئی ہیں، اور موت کے وقت اس عناصر کی چہار دیواری سے نکل کر پھر اُن کو وہیں واپس جانا ہی، جہاں سے آئی تھیں، اس بازگشت کے سفر میں انکا زادِ راہ صرف وہی ہوگا، جو اس دنیائے دار العمل میں انھوں نے کمایا ہی یعنی اُن کے اندرونی و بیرونی اعمال اور اس کے بعد جو اُن کی زندگی ہوگی، وہ اُن کے اُن ہی اعمال کی نوعیت پر منحصر ہوتی،

وَهُوَ الَّذِىْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ	اور وہی (خدا) ہے جو تمھیں رات کو موت
مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ	(نیند) دیتا ہے، اور دن کو جو کما چکے اُس کو
لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ	جانتا ہے پھر تم کو دن میں جگا اٹھاتا ہی تاکہ
مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ	مقررہ وقت (اصلی موت) پورا ہو، پھر اسی
تَعْمَلُوْنَ،	کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ تم کو
(انعام - ۷)	تمھارے اعمال جتائے گا،

ایک اور آیت میں ہے،

یَآ اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ	اے انسانو! تمھاری بغاوت کا نتیجہ تمھیں پر ہے
مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ	دنیا کی زندگی سے کچھ فائدہ اٹھانا، پھر ہماری
فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ،	ہی طرف لوٹ کر آنا ہے تو ہم تم کو تمھاری اعمال
(یونس - ۲۰)	جتائیں گے،

اس میں دنیا کی زندگی کے بعد ہی خدا نے اپنی طرف واپس آجانے کی اطلاع دی ہے، اہلِ تفسیر نے بھی اس رجوع الی اللہ سے موت ہی کے معنی سمجھے ہیں، (طبری ۱۱ - ص ۴۲ مصر)

اب ہم ایک ایسی آیت پیش کرتے ہیں جس میں موت کا پورا نقشہ ہے، اور اس کے بعد بیان ہے کہ اس دن مرنے کے بعد ہی خدا کے ہاں ہنکا کر لائے جاؤ گے، گویا جس طرح جانور ہنکا کر لائے جاتے ہیں، ویسے ہی گنہگاروں کی روحیں موت کے بعد نکال کر لائی جاتی ہیں، فرمایا

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ، وَقِيْلَ مَنْ	ہرگز نہیں، جب روح ہانس (ہنسلی) تک پہنچے
رَاقٍ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ وَالْتَفَّتِ	اور لوگ کہیں، اب کون ہے جھاڑ پھونک کر کے
السَّاقُ بِالسَّاقِ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ	بچانے والا، اور سمجھا کہ اب جدائی کا وقت
الْمَسَاقُ،	آگیا، اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ گئی، اس دن
(قیامہ - ۱)	تیرے پروردگار کی طرف ہے، ہنکا جانا،

لیکن سعید اور نیکوکار روحوں کو موت کے وقت یہ محبت بھری صدائے غیب سنائی دیتی ہے،

يَآ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ	اے مطمئن روح! تو اپنے مالک سے خوش

اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً (فجر) اور تیرا مالک تجھ سے خوش تو اپنے مالک کے پاس واپس چلی جا،

کیسی دلآویز صدا اور کیسی دلکش واپسی ہوگی،

اس وقت کا سماں | وہ لمحہ جب اس روح کی مہلت کا زمانہ اور عمل کی فرصت ختم ہوتی ہے کتنا دردناک ہے، اُس وقت اسکی زندگی صرف اُس کے گذشتہ اعمال کے قالب میں جلوہ گر ہوتی ہے، ہر عمل کی صورت اس کو سامنے کھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے، اور غیب کی کارکن صورتیں چلتی پھرتی دکھائی، اور بولتی چالتی سنائی دیتی ہیں،

وَلَوْ تَرٰیٓ اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ بَاسِطُوْٓا اَیْدِیْھِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَکُمْ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْھُوْنِ بِمَا کُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ غَیْرَ الْحَقِّ وَکُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِہٖ تَسْتَکْبِرُوْنَ، وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی کَمَا خَلَقْنٰکُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَّتَرَکْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰکُمْ وَرَآءَ ظُھُوْرِکُمْ ج (انعام - ۱۱)

اور کبھی تو دیکھے جس وقت گنہگار موت کی بیہوشی میں ہوں، اور فرشتے ہاتھ کھولے ہوں کہ نکالو (اپنے جسموں کے اندر سے) اپنی روحوں کو، آج تم کو اس بدذلت کی سزا ملیگی کہ تم خدا کی شان میں جھوٹ باتیں کہتے تھے، اور اس کے حکموں کے ماننے سے غرور کرتے تھے اور تم ایک ایک کرکے (تنہا) جیسے ہم نے پہلی بار تم کو پیدا کیا تھا ہمارے پاس آئے اور جو سامان و اسباب تم کو دیا تھا، (جس نے تم کو مغرور بنایا تھا) اسکو اپنے پیچھے

ان آیات سے ظاہر ہے کہ موت کے وقت کس طرح فرشتے سامنے آتے ہیں، اور روح جسم سے جس وقت الگ ہوتی ہے، اُس کے گناہوں کی سزا کا دو

شروع ہوجاتا ہو یہی بات ایک اور موقع پر مذکور ہے،

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا	اور کبھی تو دیکھے جس وقت فرشتے کافروں کی
الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ	جان لیتے ہیں اُن کے منہ پر اور پیچھے مارتے ہیں
وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ، ذَٰلِكَ بِمَا	(اور کہتے ہیں) جلنے کے عذاب کا مزہ چکھو، یہ تمہارے
قَدَّمَتْ أَيْدِيكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ	ہاتھوں کے پہلے کئے ہوئے کاموں کا بدلہ ہو اور
بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ (انفال ۔۷)	بندوں پر ظلم نہیں کرتا،

اس سے واضح ہے کہ یہ سزا، موت ہی کے عالم سے شروع ہوجاتی ہے اور اللہ تعالیٰ یہ سزا نعوذ باللہ کسی انتقام کے سبب سے نہیں دیتا، بلکہ وہ درحقیقت قانونِ عمل کے مطابق خود انسان کے کاموں کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے،

نکوکاروں کا نقشہ اس سے بالکل الگ ہے، اُن کو ہر طرف سے بشارتیں سنائی دیتی ہیں، اور ہر سمت خوشی و شادمانی کا سمان سامنے ہوتا ہے،

فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُومَ، وَأَنتُمْ	پھر کیوں نہیں جس وقت روح حلق تک پہنچ
حِينَئِذٍ تَنظُرُونَ، وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ	جاتی ہو اور تم اس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو، اور
مِنكُمْ وَلَٰكِن لَّا تُبْصِرُونَ، فَلَوْلَا	ہم اس سے تمہاری نسبت زیادہ تر نزدیک ہوتے
إِن كُنتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ، تَرْجِعُونَهَا	ہیں لیکن تم کو دکھائی نہیں دیتا تو اگر تم کسی اور کے
إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ، فَأَمَّا إِن كَانَ	حکم کے نیچے نہیں ہو تو کیوں نہیں اُس روح کو
مِنَ الْمُقَرَّبِينَ، فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ	پھر لٹا دیتے ہو اگر تم (اپنے انکار و تکذیب میں) سچے ہو

وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ، وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ، فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ، اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ،

(واقعہ - ۳)

تو اگر وہ (مرنے والا) مقرب بندوں میں سے ہوا تو خوشی و آرام اور نعمت کی بہشت ہی، اور اگر وہ داہنے سے کچھ کم درجہ) دہنے والوں میں ہوا تو تجھ پر سلامتی دہنے والوں میں سے ہا اور اگر وہ حق کو جھٹلانیوالے گمراہوں میں سے ہوا تو گرم پانی کی مہمانی، اور دوزخ میں بیٹھنا ہے، بے شبہ یہ بات کے یقین کے لائق ہے،

یہ تمام سمان موت کے بعد اور عالم برزخ ہی کے مناظر ہیں،

برزخ کا عذاب راحت

اوپر کی آیتوں سے پوری طرح ہویدا ہے کہ روح و جسم کی مفارقت کے بعد اچھی روحوں کے سامنے رحمت کے اور بری روحوں کے روبرو عذاب کے منظر گذرتے ہیں قرآن پاک میں کچھ اور آیتیں ہیں جن سے ثابت ہے کہ یہ منظر نہ صرف روح کے سامنے ہی سے گذرتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی وہ اپنے اعمال کے مدارج کے مطابق رحمت یا زحمت کے اندر بھی داخل کر دیجاتی ہے، منافقین کی نسبت قرآن میں ہے،

سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ، (توبہ - ۱۳)

ہم اُن کو دو دفعہ عذاب دیں گے، پھر وہ ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے،

عَذَابٍ عَظِيْمٍ سے ظاہر ہے کہ دوزخ کا عذاب مراد ہے، اب اس عذاب دوزخ سے پہلے عذاب کے دو دَور اُن پر اور گذر چکے ہوں گے، ایک تو یہ دنیا وی عذاب ہوا، دوسرا

موت کے بعد ہی کا ہو سکتا ہے، قرآن میں آلِ فرعون کے ذکر میں ہے،

وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ	اور فرعون والوں پر بری طرح کا عذاب
اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا	الٹ پڑا، آگ کہ اُس پر وہ صبح اور شام پیش
وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ قف اَدْخِلُوْٓا اٰلَ	کئے جاتے ہیں، اور جس دن قیامت کی گھڑی
فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ،	ہو گی، (ندا ہو گی کہ) فرعون والوں کو
(مومن - ۵)	(پہلے سے بھی) بڑھ کر عذاب میں ڈالو،

اس سے ظاہر ہوا کہ گنہگاروں کو قیامت سے پہلے برزخ کے عالم میں بھی عذاب کا کچھ نہ کچھ مزہ چکھایا جاتا ہے، ایسا ہی نیکوکاروں کو بہشت کے عیش و آرام کا منظر دکھایا جاتا ہے، اسی آیت پاک کی تشریح میں گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے" تم میں سے جب کوئی مرتا ہے تو اس پر صبح و شام اُس کا اصلی مقام پیش کیا جاتا ہے، اگر وہ اہلِ جنت میں سے ہوتا ہے تو جنت، اور اہلِ دوزخ سے ہوتا ہے تو دوزخ، پھر اس کو کہا جاتا ہے کہ یہ ہے تیرا مقام اُس وقت تک کیلئے کہ جب تو قیامت کے دن اٹھایا جائے"[۱] ایک اور صحیح حدیث میں ہے کہ جنتی مردہ کے سامنے جنت و دوزخ دونوں کے منظر سامنے کر کے کہتے ہیں کہ اگر تو اچھے عمل نہ کرتا تو تیرا یہ مقام نہ ہوتا، مگر تیرے نیک عمل کے سبب سے اب یہ جنت تیرا مقام ہے[۲]، اور اس دن تک کے لئے کہ لوگ اٹھائے جائیں، اس پر سرسبزی بھر دی جاتی ہے"[۳]

---

[۱] صحیح مسلم کتاب الجنۃ والنار باب عرض مقعد المیت جلد ۲ ص ۴۸۸ مصر و جامع ترمذی کتاب الجنائز باب عذاب القبر حدیث حسن صحیح و صحیح بخاری کتاب الجنائز باب عذاب القبر ص ۴۴۸ و سکرات الموت ص ۹۶۴ [۲] صحیح بخاری کتاب الجنائز ص ۱۸۴

[۳] صحیح مسلم باب عرض مقعد المیت ص ۴۹۰، مصر،

مشرکوں اور قیامت کے منکروں کا سوال تھا کہ اگر یہ پیغام الٰہی سچ ہے تو ہم کو فرشتے یا خدا نظر کیوں نہیں آتے جواب میں کہا گیا کہ فرشتے جس دن نظر آئینگے اس دن ایمان بالغیب کہاں؟ اور اور کی آیتوں سے معلوم ہو چکا ہے کہ فرشتے موت کے وقت نظر آتے ہیں، یا پھر قیامت میں نظر آئینگے اسلئے ارشاد ہے

يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا، وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا، اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا، وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا، اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ نِالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا، (فرقان ۳)

جس دن وہ فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن ان گنہگاروں کیلئے کوئی خوشخبری نہیں اور کہیں گے (کہ یہ ڈراونا منظر جو ہم کو نظر آرہا ہے) اب دٹ میں رکا جائے اور ہم خدا فرماتا ہے اُن کے کئے ہوئے کاموں کے پاس پہنچے اور انکو اڑتا غبار بنادیا (یعنی بیکار بے سود و معدوم) جنت والے لوگ (یعنی جنکو جنت ملنے والی ہے) اس دن انکیلئے خوب ٹھکانا، اور دوپہر کے سونے کا مقام ہوگا، اور جس دن آسمان بادل سے پھٹ جائیگا، اور فرشتے آہستہ آہستہ اُتارے جائینگے، اس دن راج سچے خدا کا ہوگا، اور

کھلی بات ہے کہ آسمان کا بادل سے پھٹنا، اور فرشتوں کا اترنا قیامت کا نقشہ ہے، اب اس سے پہلے فرشتوں کے دکھائی دینے کا وہ دن جس میں گنہگاروں کے لئے کوئی خوشخبری نہیں اور وہ کہیں گے کہ کاش یہ ڈراونا منظر ہماری نگاہوں کے سامنے نہ ہوتا، اور جنت کے مستحقین کو ایک اچھا مستقر (قرار گاہ) اور دوپہر کی دھوپ سے بچانے والی خوابگاہ ملی ہوگی، قیامت سے پہلے اور موت کے بعد ہی کی کیفیت ہے،

سورۂ محمد میں موت کے وقت کا حال بیان ہوتا ہے کہ جب فرشتے ان گنہگاروں کی روحوں کو قبض کرتے ہیں تو اُن کے چہروں پر اور پیٹھوں پر ضرب لگاتے ہیں، فرمایا،

فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ (محمد - ۳)

پھر کیا حال ہوگا جب فرشتے اُن کو وفات دینگے اُن کے چہروں اور اُن کی پیٹھوں پر مارتے ہوئے یہ اس لیے کہ انھوں نے اسکی پیروی کی جس نے خدا کو اُن سے ناخوش کر دیا، اور جنھوں نے خدا کی خوشنودی کو پسند نہ کیا تو خدا نے اُن کے کاموں

یعنی ضرب خواہ اسی مادی جسم پر پڑتی ہو یا اس کے مثالی جسم پر یا روح پر، جو بھی سکے، بہر حال اس سے یہ ثابت ہے کہ گنہگار مُردہ پر موت کے وقت ہی سے عذاب کا ایک رنگ شروع ہوتا ہے،

سورۂ انعام میں اس سے زیادہ ہے،

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ، (انعام - ۱۱)

اور اگر تو دیکھے جب گنہگار موت کی سکرات میں ہوں، اور فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوں کہ (اپنے جسم کے اندر سے) اپنی روحوں کو، آج تم کو ذلت کی سزا ملے گی،

اَلْيَوْمَ جس کے معنی آج کے ہیں، ظاہر ہے کہ اس سے وہی زمانہ مراد ہے جب وقت سے فرشتے بدن سے روح نکالتے ہیں، اس "آج" سے مقصود ہمارا دنیا وہی آج نہیں ہے جو ۲۴ گھنٹوں میں ختم ہو جاتا ہے، بلکہ برزخ کا پورا زمانہ ہے (دیکھو فتح القدیر شوکانی و تفسیر

ابو السعود و تفسیر روح المعانی آلوسی)

قوم نوح کے غرق ہونے کے بعد ہی دوزخ میں جانے کا ذکر ہے،

اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا فَلَمْ يَجِدُوْا	وہ ڈبو دیئے گئے، پھر وہ آگ میں داخل کئے
لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا،	گئے، تو انھوں نے خدا کے سوا مددگار
(نوح-۲)	نہیں پائے،

حضرت لوطؑ اور حضرت نوحؑ کی کافر بیویوں کی موت کے بعد ہی عذاب کا ذکر ہے،

وَقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ	اور کہا گیا کہ داخل ہونے والوں کے ساتھ
(تحریم-۲)	تم دونوں بھی آگ میں داخل ہو جاؤ،

یہ قیامت سے پہلے اور دنیا کے عذاب ہلاکت کے بعد کے واقعات ہیں، اور اسی وقفہ کا نام برزخ ہے،

سورۂ یٰسین میں ایک خیر خواہ قوم کا ذکر ہے جو عمر بھر اپنی قوم کو حق کی تبلیغ کرتا رہا اور پھر وہ غالباً اسی حق کی راہ میں شہید ہوا، مرنے کے بعد جب اس کو بہشت ملی، تو اس نے بڑی حسرت سے کہا کہ کاش میری قوم کو معلوم ہوتا کہ مرنے کے بعد خدا نے کس طرح مجھے معاف فرمایا اور عزت بخشی تاکہ وہ بھی ایمان سے میری طرح بہرہ ور ہو کر اس مغفرت اور عزت سے سرفراز ہوتی

قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۚ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ	کہا گیا جنت میں داخل ہو، اس نے کہا
يَعْلَمُوْنَ، بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ	اے کاش میری قوم کو یہ معلوم ہوتا کہ میرے
مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ، وَمَا اَنْزَلْنَا	پروردگار نے میری مغفرت کی اور مجھے عزت

عَلٰی قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ، (یٰسین - ۲)

والوں میں سے بنایا، اور ہم نے اُس کے مرنے کے بعد اُس کی قوم پر آسمان سے کوئی فوج نہیں اُتاری، اور نہ ہم اُتارا کرتے ہیں،

شہیدوں کی نسبت تو خاص طور پر ہے،

بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ (آل عمران - ۱۷)

بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس روزی پاتے ہیں،

اس سے معلوم ہوا کہ شہداء کو برزخ ہی میں کامل زندگی کے ساتھ جنّت کی روزی ملتی ہے، اور عام نیکوکاروں کا یہ حال ہے کہ اُن کو فرشتے اس وقت سلامتی اور جنّت کی خوشخبری سُناتے ہیں، فرمایا،

اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (نحل - ۴)

جن کو فرشتے (گناہوں سے) پاک صاف حالت میں وفات دیتے ہیں کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو اپنے کاموں کے بدلہ جنّت میں چلے جاؤ،

قبر کی اصطلاح سطور بالا میں عالمِ برزخ کے وہ مناظر دکھائے گئے ہیں جو قرآن کی آیتوں میں نظر آتے ہیں، اور احادیث صحیحہ میں اس عالم کے حالات کی جو تفصیلیں مذکور ہیں وہ عموماً[1] قبر کی

[1] بعض معتزلہ عذاب قبر کے قائل نہ تھے، اور اُن کی دلیل یہ تھی کہ قرآن میں اسکا ذکر نہیں، یہ غلط فہمی انکو اسلئے پیش آئی کہ قرآن میں لفظ قبر و قبور کیساتھ عذاب کا ذکر نہیں لیکن اگر وہ دیکھتے کہ قرآن میں بعد موت اور قبل قیامت ارواح انسانی کے عذاب و ثواب اور رحمت و لعنت کا ذکر موجود ہے تو اُن کو اس انکار کی جرأت نہ ہوتی اور قرآن میں اسی قسم کی متعدد آیتیں موجود ہیں،

اصطلاح کے ساتھ بیان ہوئی ہیں لیکن اس لفظ "قبر" سے درحقیقت مقصود وہ خاک کا تودہ نہیں جس کے نیچے کسی مردہ کی ہڈیاں پڑی رہتی ہیں، بلکہ وہ عالم ہے جس میں یہ مناظر پیش آتے ہیں، اور وہ ارواح ونفوس کی دنیا ہے، مادی عناصر کی نہیں، اسی لئے قرآن پاک نے اس عالم کے تعلق سے ہمیشہ نفس اور نفوس کو خطاب کیا ہے اور ان ہی کے عذاب و ثواب اور رحمت و لعنت کا ذکر ہے، اس عالم میں جو جسم نظر آتا ہے، وہ مرنے والے کے اعمال کا مثالی پیکر ہوتا ہے جو ہو بہو اُس کے خاکی جسم کا مثنیٰ ہوتا ہے، تم نیند میں ہو، اور تمہارا نیم مردہ بے حس جسم بستر پر دراز ہے، مگر تم خواب میں دیکھ رہے ہو کہ بعینہٖ تمہارا جسم آگ میں جل ..... رہا ہے یا باغ و بہار کی لذتوں میں مصروف ہے، اور تم کو اس سے وہی تکلیف اور راحت مل رہی ہے جو بیداری میں اپنے بستر پر پڑے ہوئے جسم کی تکلیف و راحت سے مل سکتی ہے، اس جواب میں جس طرح تمہارے مادی جسم کے علاوہ تم کو اپنا ایک خیالی جسم نظر آتا ہے جو ہو بہو تمہارا مادی جسم ہے اسی طرح موت کے خواب میں بھی تم کو اپنا ایک مثالی جسم نظر آئیگا، جو اکثر حالتوں میں ہو بہو تمہارے اس خاکی جسم کے مطابق ہوگا[1]، اور تمہاری روح اسی جسم مثالی کے عذاب و راحت سے متاثر ہوگی کہ اعمال کی اصل ذمہ دار روح انسانی ہے، جسم خاکی نہیں فرمایا کُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ (مدثر-۲) (یعنی ہر روح اور جان اپنے اعمال کے ہاتھوں گرو ہوگی" اس لئے اصل مکلف روح ہے، جسم نہیں جسم بمنزلہ آلہ کے ہے، دنیا میں اس کا ایک جسم خاکی تھا، برزخ میں اس کا ایک دوسرا جسم

---

[1] اس سے اس شبہہ کا ازالہ ہوتا ہے کہ ہم کو مردہ کا جسم سامنے پڑا نظر آتا ہے لیکن اس پر عذاب کا کوئی نشان نظر نہیں آتا، اور نیز اس شبہہ کا بھی ازالہ ہوتا ہے کہ قبر میں جب جسم سڑ گل جاتا ہے تو پھر عذاب و ثواب کا احساس اس کو کیسے ہوتا ہے۔

ہوگا، جو مادّہ و مادّیات سے پاک ہی ہوگا تاہم اس کو اپنے جسم خاکی سے ایک قسم کی نسبت حاصل ہوگی، اور اتنی ہی نسبت کی بنا پر قبر کی اصطلاح عام بول چال میں جاری ہے، کیونکہ ہم اپنی آنکھوں سے مسلمان مردوں کو اسی قبر میں جاتے دیکھتے ہیں، قرآن پاک کی یہ آیت اوپر گذر چکی ہے،

وَلَوْ تَرٰىٓ اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا	اور اگر تو دیکھے جب فرشتے کافروں کی
الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ	روح قبض کرتے ہیں، مارتے ہیں اُن کے منہ
اَدْبَارَهُمْ، وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ (انفال)	اور پیٹھ پر اور (کہتے ہیں) چکھو جلنے کا مزہ

اس آیت سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ گنہگاروں پر موت کے بعد ہی عذاب شروع ہوجاتا ہے، وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مار ان کے منہ اور پیٹھ پر پڑتی ہے، مگر یہ منہ اور یہ پیٹھ وہ نہیں ہے جو بے جان لاشہ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے، بلکہ اس آیت میں کافر کی روح کو جانور سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح جانور کو تیز ہنکاتے وقت کبھی آگے (منہ پر) اور کبھی پیچھے (پیٹھ پر) مارتے ہیں، اسی طرح گویا کافر روح کو زبردستی فرشتے مارتے ہوئے اور ہنکاتے ہوئے لے چلیں گے اور کہیں گے کہ چلو عذاب کا مزہ چکھو، یہی مفہوم صاف لفظوں میں اس آیت میں ہے،

اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِنِ الْمَسَاقُ،	اس دن تیرے پروردگار کی طرف ہے
(قیامہ - ۱)	ہنکایا جانا،

بعض ایسی سعید روحیں بھی ہوتی ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس برزخ میں جسم خاکی کی شکل و صورت کی قید سے آزاد کرکے کوئی دوسرا مناسب مثالی جسم عطا کرتا ہے جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ مومن کامل کی روح پرندوں کی شکل میں جنت میں اڑتی

پھرتی ہے[1] اور خصوصاً شہدا کے متعلق آیا ہے کہ وہ سبز پرندوں کی شکل میں ہونگے اور عرش الٰہی کی قندلیں اُن کا آشیانہ ہوں گی، اسی طرح دوزخ و بہشت کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو رویاے صادقہ پہلے گذرا ہے، اُس میں جن جسمانی قالبوں میں گنہگاروں کی سزا و تکلیف کی صورتیں دکھائی گئی ہیں، وہ تمامتر مثالی ہی ہیں، ظاہر ہے کہ مومن سعید اور شہدا کے وہ مثالی قالب اور گنہگاروں کے یہ مثالی اجسام اُن کے وہ قالب در جسم نہیں ہیں، جو اُن کی قبروں میں سڑ گل کر فنا ہو گئے، یا وہ آگ میں جل کر خاکستر ہوئے اور ذرّے ہوا میں اڑ کر منتشر ہو گئے، یا کسی جانور کے پیٹ میں جا کر اس کا جزو بدن بن گئے،

بعض حدیثوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن مٹی کی قبروں میں عذاب کے مشاہدات و مسموعات کا تذکرہ ہے، تو ظاہر ہے کہ مادّی زبان و منظر میں ان قوموں کے نزدیک جو مردوں کو گاڑتی ہیں، اُس میت کی یادگار اس دنیا میں اُس کے اس مٹی کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہے جسکی طرف اشارہ کیا جا سکے ایک صحیح حدیث میں اُس نیک مرد کا ذکر ہے جس نے خدا کے خوف سے یہ وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد اس کا جسم جلا کر راکھ ہوا میں اُڑا دیجائے تاکہ وہ خدا کے سامنے حاضر نہ کیا جا سکے، مگر قدرتِ الٰہی نے اس کو مجسّم کر کے کھڑا کر دیا، اور اُس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتوں سے نوازا[2]

سوال وجواب احادیثِ صحیحہ میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مرنے کے بعد قبر میں دو فرشتے آتے ہیں، اور وہ مردوں سے توحید و رسالت کی نسبت سوال کرتے ہیں،

اس کی تصدیق قرآنِ پاک کی ان آیتوں سے بھی ہوتی ہے،

---

[1] سنن ابن ماجہ کتاب الجنائز [2] صحیح بخاری جلد دوم ص ۹۵۹ کتاب الرقاق باب الخوف من اللہ،

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ
يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا
الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (نحل ۴)

جن کو فرشتے (گناہوں سے) پاک صاف حالت میں
وفات دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو، اپنے
کاموں کے بدلہ جنت میں چلے جاؤ،

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ
ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ
قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ
قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً
فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ
جَهَنَّمُ، (نساء - ۱۴)

بیشک فرشتوں نے جن کی روحوں کو اس حالت
میں قبض کیا کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے، وہ
اُن سے کہتے ہیں تم کس بات میں تھے وہ جواب
دیتے ہیں کہ ہم ملک میں بے یار و مددگار تھے،
فرشتے کہتے ہیں کہ کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی
کہ تم اپنا وطن چھوڑ کر باہر چلے جاتے،

ایک اور آیت ہے،

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ
قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا
عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ
قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ
قَبْلِكُمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ
(اعراف - ۴)

یہاں تک کہ جب ان جھٹلانے والوں کے پاس
ہمارے فرشتے اُن کی روحوں کو قبض کرنے آئیں گے
اور کہیں گے کہاں ہیں وہ جنکو تم خدا کے علاوہ پکارتے
تھے، (اسوقت وہ مشرک) کہیں گے کہ ہمارے وہ دیوتا ہم
سے کنارہ کش ہو گئے اور انھوں نے اپنے اوپر آپ گواہی دی
کہ وہ کافر تھے، تب خدا فرمائیگا کہ تم بھی اُن لوگوں
میں جا ملو، جو جن و انس میں سے تم سے پہلے

پہلی آیت میں عدم ہجرت کے گناہ کے مرتکب مسلمانون کا اور دوسری میں کافرون کا حال بیان کیا ہے کہ اُن سے اُن کی موت کے بعد ہی یہ سوال کیا جائے گا، بہرحال یہ تو خاص خاص گناہون کے مجرمون کا حال تھا، اب عام لوگون سے جو سوال ہوسکتا ہے وہ وہی ہے جس کا ذکر احادیث مین ہے یعنی توحید و رسالت کی معرفت کا اُن سے سوال ہوگا

قرآن پاک میں ایک جگہ کلمۂ طیبہ (اچھی بات یعنی کلمۂ توحید) اور کلمۂ خبیثہ (بری بات یعنی کلمۂ کفر) کی ایک ایک مثال ہے، کلمۂ طیبہ کی مثال اُس درخت کی ہے، جس کی جڑیں زمین مین مضبوط گڑی ہیں، اسی کی شاخیں آسمانوں تک پھیلی ہین، اور اس مین سدا بہار میوے لگے ہین، اور کلمۂ خبیثہ کی مثال اس درخت کی ہے، جس کی جڑ زمین سے اکھڑی پڑی ہے، وہ اب گرا اور تب گرا، اس کے بعد قرآن میں ہے،

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِالْقَوْلِ	اللہ ایمان والون کو پکی بات پر اس دنیا مین
الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ	مضبوط رکھے گا اور آخرت میں بھی، اور اللہ
وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ، (ابراھیم ۴)	ظالموں کو بچلاتا ہے،

اس کی تفسیر صحیح حدیثون میں یہ ہے کہ یہ برزخ کے اسی سوال وجواب سے متعلق ہے کہ صاحبِ ایمان جس طرح اپنی اس زندگی مین ایمان کی بات پر قائم تھا، اسی طرح برزخ میں بھی اس پر قائم رہے گا، اور جو کافر ومشرک یہان اس پر قائم نہ تھا، وہان وہ بھی قائم نہ رہے گا اور بہک جائے گا،

ہرچند کہ رسول پاک کی صحیح تفسیر کے ہوتے ہوئے کسی اور استدلال کی حاجت نہیں تاہم

تائیداً یہ عرض ہے کہ اس آیت میں اہلِ ایمان کے آخرت میں بھی "قولِ ثابت" پر ثابت قدم رکھے جانے کی بشارت ہے، ظاہر ہے کہ اس آخرت سے قیامت اور بہشت و دوزخ کا دن تو مراد نہیں ہو سکتا کہ وہ تو کشفِ راز کا دن ہے، اُس دن تو کافر بھی اس قولِ ثابت سے پلٹنے کی جرأت نہیں کر سکتا، پھر یہ اہل ایمان کے لیئے کوئی خاص بشارت نہ ہوگی، اور نہ یہ اس اظہارِ احسان کا مناسب وقت ہو سکتا ہے، البتہ اس بشارت اور احسان کا اعلان و اظہار آخرت کے اس حصہ میں موزوں ہو سکتا ہے جہاں ہنوز اسرارِ پس پردہ کی پوری نقاب کشائی نہیں ہوتی اور وہ برزخ کا عالم ہے،

اس آیتِ پاک کی اس تفسیر سے جو احادیثِ صحیحہ پر مبنی ہے، یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آخرت کی وسعتِ مفہوم میں برزخ کا میدان بھی داخل ہے،

حقیقت میں اس عالمِ برزخ کا سوال و جواب کوئی نیا واقعہ نہ ہوگا، بلکہ ہر روح کی پہلی زندگی کی ایمانی کیفیت اقرار و انکار کی مثال ہوگی، یا یوں کہو کہ آج کے آئینہ میں کل کا عکس نمایاں ہوگا، یعنی اقرار و انکار کی جس کیفیت پر زندگی کا خاتمہ ہوا ہوگا، وہی بعد کو سوال و جواب میں نمایاں ہوگی،

برزخ میں ارواح کا مسکن آخری سوال یہ ہے کہ موت اور قیامت کی اس بیچ کی منزل (برزخ) میں ارواحِ انسانی کا مسکن کہاں ہوگا؟ قرآن پاک میں اس کا جواب متعدد آیتوں میں ملتا ہے، سب سے پہلی آیت تو ان مذکورہ بالا آیات کے بعد ہے، جس میں ذکر ہے کہ فرشتے جب منکرین سے سوال و جواب کر چکیں گے تو خدا ان کی روحوں کو حکم دیگا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ عذاب کی آگ میں داخل ہو جائیں، اُس کے بعد ہے،

اِنَّ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَکْبَرُوْا　　بیشک جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا،

عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَاءِ	اور اُن کے ماننے سے غرور کیا اُن کیلئے آسمان
وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ	کے دروازے نہ کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت
فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ،	میں داخل ہون گے تاآنکہ اونٹ سوئی کے ناکے
(اعراف - ۵)	میں گھس جائے (یعنی کبھی نہیں)،

اس سے معلوم ہوا کہ آیاتِ الٰہی کے منکرون اور جھٹلانے والون کی روحیں مرنے کے بعد آسمانی بادشاہی کے حدود میں قدم نہ رکھ سکیں گی، اور وہ فضائے زمین میں آوارہ پھرین گی یا اپنے خاکی جسمون کے لگاؤ سے جہاں وہ سپردِ خاک ہوئے ہوں منڈلاتی رہیں گی، اور وہین سے دوزخ کا منظر دیکھیں گی، اور تکلیف اٹھائیں گی،

اس کے برخلاف ہمہ تن پاکباز مومن روح کا یہ حال ہوتا ہے کہ موت ہی کے وقت رحمت کا فرشتہ بلکہ خود زبانِ رحمت اُس کے کانون مین یہ صدا دیتی ہے،

يَاۤ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ	اے مطمئن روح! اپنے پروردگار کے پاس
اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِیْ	واپس چلی جا! تیرا پروردگار تجھ سے خوش نہ
فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ،	تو اپنے پروردگار سے خوش، تو میری بندوں میں
(فجر - ۱)	شامل اور میری بہشت میں داخل ہو جا،

اُن سے بڑھ کر وہ پاک باز روحیں ہیں جنھوں نے اپنے خاکی جسموں، فانی زندگیوں، مادی خوشیون اور زوال پذیر عشرتون کو خدا کی راہ مین قربان کیا، تو اُن کو خدا کی طرف سے ایک تمثالی جسم، غیر فانی زندگی، اور روحانی عیش و مسرت کی لازوال دولت اُسی وقت عنایت کیجاتی ہے فرمایا

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ	جو خدا کی راہ میں مارے جائیں، اُن کو مردہ نہ
بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (بقرہ۔۱۹)	کہو، وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں کرسکتے،

یہ پُرمسرت زندگی کیسی ہوگی اس کی تفصیل دوسری سورہ میں ہے،

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ	اور تو اُن کو جو خدا کی راہ میں مارے گئے امرؔ
اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ	نہ گمان کر، بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں،
يُرْزَقُوْنَ ۙ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ	اُن کو روزی دیجاتی ہے، خدا نے اپنی مہربانی سے
مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ	اُن کو جو دیا ہے، اس پر خوش ہیں، اور جو ابھی
لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ	اُن کے پیچھے سے اُن تک نہیں پہنچے ہیں،
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ يَسْتَبْشِرُوْنَ	اُن کی طرف سے بھی خوش ہیں، کہ اُن کو نہ کوئی
بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا	خوف ہوگا، اور نہ وہ غمگین ہوں گے، وہ اللہ
يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ،	کے مہر و کرم سے مسرور ہیں، اور اللہ ایمان والوں
(آل عمران - ۱۷)	کی مزدوری ضائع نہیں کرتا،

یہ پُرمسرت زندگی شہدا کو ملے گی، اس زندگی کا مقام خدا کے پاس بتایا گیا ہے، احادیث صحیحہ میں ہے کہ ان زندہ شہیدوں کی روحیں قفسِ عنصری سے پرواز کر کے جب اڑتی ہیں، تو وہ سبز پرندوں کی صورت میں جنت کی سیر کرتی ہیں، اور عرشِ الٰہی کی قندیلیں اُن کا نشیمن بنتی ہیں، اس کے بعد غالباً اتنا ہر ذی عقل تسلیم کرے گا کہ انبیاء علیہم السلام کے روحانی مدارج و مراتب شہدا سے بہرحال اعلیٰ اور برتر ہیں، اس لیئے ان کا مقام بھی اسی احاطۂ قدس کے اندر ہوگا، اسی لیئے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیرِ معراج اور اپنے رویاے صادقہ مین بعض بعض پیغمبرون کو آسمان اور بہشت کے مختلف مدارج میں دیکھا،

بعض وہ سعید روحیں ہیں جو یہان سے نکل کر فرشتون کی صف میں داخل ہوجاتی ہین جیساکہ حضرت جعفر طیار رضؓ کے متعلق احادیث صحیحہ مین آیا ہے، کہ وہ بہشت کے بعد اپنے دونوں بازوؤں سے فرشتون کے ساتھ عالمِ ملکوت میں اڑ رہے تھے، عالمِ برزخ کے یہ دو اڑنے والے بازو درحقیقت ان کے ان دونوں جسمانی بازوؤں کی مثال ہیں جو اس جنگ مین اُن کے جسم سے کٹ کر گر گئے تھے، اور وہ اس پر بھی اسلام کے علم کو اپنے بقیہ کٹے ہوئے بازو اور گردن کے سہارے سے پکڑے تھے، عجب نہیں کہ قرآن پاک کی یہ آیت ایسے ہی لوگون کی شان میں ہو،

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ	بیشک جن لوگون نے اقرار کیا کہ ہمارا پروردگار
اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ	اللہ ہے، پھر ثابت قدم رہے اُن پر فرشتے یہ
اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا	خوشخبری لیکر اُترتے ہیں، کہ خوف نہ کھاؤ
بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ	اور غمگین نہ ہو اور اس جنت کی بشارت سنو
اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي	جس کا تم سے وعدہ کیا تھا، ہم دنیا کی زندگی
الْاٰخِرَةِ ج (حٰمٓ السجدہ ۲-۴)	میں تمھارے رفیق ہیں، اور آخرت میں،

یہ آوازۂ بشارت اور فرشتون کی رفاقت، اسی برزخ کا دلکش سمان ہو سکتا ہے،

۲- آخرت کی دوسری اور حقیقی منزل

قیامت اور جزائے اعمال

موت تو افراد کا معاملہ ہے، ایک مرتا ہے، اور دوسرا اسکی جگہ پیدا ہوتا ہے قومیں بھی باری باری اس بازیگاہ کے تختہ پر آتی ہیں، اور ایک قوم اپنا کھیل ختم کرکے کسی دوسری کے لئے جگہ خالی کر جاتی ہے، یہ سلسلہ ازل سے قائم ہے۔ اور اب تک چل رہا ہے، کائنات جس نظام پر پیدا ہوئی تھی، وہ بعینہٖ قائم ہے، اور اس محفل کی جو رونق اول روز تھی، وہ اب تک اسی طرح باقی ہے، غرض

ع ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی است

لیکن کیا کوئی ایسا دن بھی آئے گا جب یہ ساری بساط ہستی الٹ جائے گی کائنات کی یہ مجلس درہم برہم ہو جائے گی، اور آسمان و زمین کے کرے ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گے، اور پھر وہ خلاق عالم اپنی صفتِ خلق و احسان و جزا کے نئے منظر دکھائے گا، اور نئی زمین اور نیا آسمان پیدا ہو کر ایک اور عالم کسی نئے نظام پر وجود پذیر ہوگا،

دنیا کے وہ تمام لوگ جو حال کو دیکھ کر مستقبل کا پتہ لگاتے ہیں، کسی نہ کسی طرح اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ جس طرح یہ افراد آتے اور فنا ہوتے ہیں، اسی طرح ایک دن آئے گا جب اس پوری دنیائے حیات پر موت طاری ہو گی اس سے زیادہ اس سوال کے جواب میں کرید بلکہ انکار کا حق فلسفہ اور سائنس کے محققوں (سائنٹسٹ) کو ہو سکتا ہے مگر

اہلِ فلسفہ کا بڑا گروہ اس امکان پر یقین رکھتا ہے، اور اہلِ سائنس بھی اس کو بہرحال محال نہیں سمجھتے بلکہ طبعیات وہیئتِ جدیدہ کے مختلف محققوں کے خیالات اس باب میں امکان سے آگے بڑھکر وقوع کی سرحد تک پہنچ چکے ہیں، وہ اس ہولناک دن کی آمد کے متعلق اپنے علم کے زور سے پیشین گوئیاں کرتے رہتے ہیں، اور اس عالمگیر موت کے مختلف اسباب ظاہر کرتے ہیں، کوئی کہتا ہے، کہ نظامِ عالم کی پوری گاڑی جس انجن سے چل رہی ہے، وہ گرم آفتاب ہے جس کی یہ گرمی روز بروز کم ہوتی جاتی ہے، آخر ایک دن آئے گا جب یہ انجن بالکل ٹھنڈا ہو جائے گا، اور ساری گاڑی ٹوٹ پھوٹ جائیگی، ایک سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ پورا نظامِ کائنات جذب وکشش کے ستون پر قائم ہے، اور فضائے ہستی کے یہ تمام سیارے روز بروز کھنچتے چلے آتے ہیں، تو ایک دن وہ بھی آئے گا، جب باہمی توازن باقی نہیں رہے گا، اس وقت تمام کرے ایک دوسرے سے قریب ہو کر ٹکرا جائیں گے، اور یہ تصادم اُن کو چور چور کر دے گا.

ایک اور خیال یہ ہے کہ اس فضا میں کروڑوں ستارے تیر رہے ہیں، اُن میں سے بہت کم کا علم ہم کو ہوا ہے، بہت ممکن ہو کہ کسی زمانہ میں ہماری زمین کسی نئے ستارہ سے ٹکرا کر چور چور ہو جائے اور اس کی ساری آبادی ہباءً منثوراً ہو کر رہ جائے،

بہرحال اسباب طبعی کچھ ہوں مگر ایسا ہونا اہلِ سائنس کے نزدیک بھی امکان، بلکہ وقوع کی امید سے خالی نہیں،

اہلِ مذاہب میں یہ عقیدہ کسی نہ کسی نوع سے ہر جگہ موجود ہے، اور اس کا مجمل تذکرہ تمام آسمانی کتابوں میں ہے، توراۃ میں اس کے اشارے پائے جاتے ہیں، زبور میں اس کی تصریحات ہیں

اور اس میں اس کو عدالت کا دن کہا گیا ہے[1] حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں یہود کے دو فرقے تھے، ایک صدوقی جو یونانیوں کے اثر سے آزاد خیال ہوگیا تھا، اور قیامت کا منکر تھا، مگر دوسرا فرقہ جو فریسی کہلاتا تھا، بدستور اپنے پرانے عقیدے[2] پر قائم تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی جو یہود تھے، وہ قیامت، حشر و نشر اور بہشت و دوزخ کے قائل تھے، اُن کا عقیدہ تھا کہ جب قیامت آئیگی، تو اللہ تعالیٰ ایک انگلی پر آسمانوں کو، دوسری پر زمینوں کو تیسری پر درختوں کو چوتھی پر پانی کو، اور اندر کی نم مٹی کو، اور پانچویں پر تمام مخلوقات کو رکھے گا، اور ندا دیگا کہ "میں ہوں بادشاہ"[3] انجیل میں یہ عقیدہ پوری تصریح کیساتھ مذکور ہے، حضرت عیسیٰ نے صدوقیوں کے مقابلہ میں تورات کی ایک آیت سے حیات اُخروی کا ثبوت پیش کیا ہے[4] اور مکاشفات یوحنا میں قیامت کے احوال کی پوری تفصیل و تشریح مذکور ہے، ہندو پرلے کے نام سے اس عقیدہ (فنائے عالم) پر یقین رکھتے ہیں لیکن اس حقیقت کی کامل تشریح خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے انجام کو پہنچی ہے،

قیامت کے نام

کسی شے کی حقیقت کی اولین گرہ کشائی، اس کے ناموں کی تشریح سے ہوتی ہے، قرآن پاک میں قیامت کو بیسیوں ناموں سے یاد کیا گیا ہے، اور اُن میں سے ہر ایک نام اس کے ایک خاص پہلو کو نمایاں اور ظاہر کرتا ہے، قرآن میں اس کا سب سے پہلا نام جو سب سے پہلی سورہ میں ہے وہ یوم الدین ہے یعنی جزا کا دن جس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ عمومی جزا اور ربانی عدالت کا دن ہوگا، اس کے علاوہ اس کے چند نام قرآن میں جابجا آئے ہیں،

---

[1] زبور ۹-۱۶-۱۷، ۲۲، ۱، ۲ دباب ۹ ہ د ۵، [2] انجیل مرقس ۱۲، ۲۳، و اعمال ۲۳، [3] صحیح بخاری تفسیر سورہ زمر،

[4] متی ۲۲، ۳۱، ۳۲، لوقا ۲۰، ۲۷، مرقس ۱۲، ۱۸،

اَلسَّاعَةُ،	وہ گھڑی، (وہ مقرر وقت)
یَوْمُ الْقِیَامَۃِ،	کھڑے ہونے کا دن (مُردوں کے کھڑے ہونے کا دن)
اَلْیَوْمُ الْحَقُّ،	سچا دن (نہ جس کے آنے میں کوئی شک ہے، اور نہ جس کے فیصلہ میں کوئی غلطی ہوگی)
یَوْمٌ مَّعْلُوْمٌ،	جانا ہوا دن، یا مقررہ دن،
اَلْوَقْتُ الْمَعْلُوْمُ،	جانا ہوا وقت یا مقررہ وقت
اَلْیَوْمُ الْمَوْعُوْدُ،	موعودہ دن،
اَلْیَوْمُ الْاٰخِرُ،	پچھلا دن،
یَوْمُ الْاٰزِفَۃِ،	قریب آنیوالی مصیبت کا دن،
یَوْمٌ عَسِیْرٌ،	ایک سخت دن،
یَوْمٌ عَظِیْمٌ،	ایک بڑا دن،
یَوْمٌ عَصِیْبٌ،	سخت دن،
یَوْمُ الْبَعْثِ،	جی اٹھنے کا دن،
یَوْمُ التَّغَابُنِ،	افسوس کا دن،
یَوْمُ التَّلَاقِ،	باہم ملنے کا دن،
یَوْمُ التَّنَادِ،	پکار کا دن،
یَوْمُ الْجَمْعِ،	اکھٹے ہونے کا دن،

يَوْمُ الْحِسَابِ،	حساب کا دن،
يَوْمُ الْحَسْرَةِ،	حسرت کا دن،
يَوْمُ الْخُرُوْجِ،	قبروں سے نکلنے کا دن،
يَوْمُ الْفَصْلِ،	فیصلہ کا دن
اَلْقَارِعَة،	کھڑکھڑانے والی
الْغَاشِيَة،	چھاجانے والی،
الطَّامَّةُ الْكُبْرٰى،	بڑی مصیبت،
النَّبَأُ الْعَظِيْمُ،	بڑی خبر،
اَلْحَاقَّةُ،	ضرور آنے والی گھڑی،
اَلْوَعْدُ،	وعدہ،
اَلْوَاقِعَةُ،	وقوع پذیر،
اَمْرُ اللّٰهِ،	خدا کی بات
الصَّاخَّة،	بہرا کرنے والی گھڑی،

قیامت کے اوصاف | یہ تو وہ نام ہیں، جو اسم مفرد یا اضافت، یا صفت کی صورت میں ہیں ان کے علاوہ فقروں اور جملوں کی ترکیبوں کے ساتھ اس کے بکثرت نام قرآن میں آئے ہیں، مثلاً،

يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ (انعام ونحل وطٰہ)	جس دن نرسنگھا پھونکا جائے گا،
يَوْمَ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ (مائدہ-۱۶)	جس دن سچوں کو انکی سچائی کام دیگی،

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ (شعراء ۵) — جس دن نہ مال کام آئے گا نہ اولاد،

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ (فرقان ۳) — جس دن گنہگار اپنے دونوں ہاتھ چبائیگا

وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ (" ") — اور جس دن آسمان پھٹے گا

وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ (مومن ۲) — جس دن گواہ کھڑے ہوں گے،

لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ (آل عمران ۱۰) — جس دن میں کوئی شک نہیں،

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا (نمل ۷) — جس دن ہم ہر قوم سے ایک گروہ کو اکٹھا کریں گے

يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (مطففین) — جس دن لوگ جہان کے پروردگار کیلئے کھڑے ہونگے

يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ (قمر ۱) — (جس دن) لوگ قبروں سے نکلیں گے،

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ وَاُمِّهٖ وَ — جس دن آدمی اپنے بھائی اور ماں اور باپ

اَبِيْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ (عبس ۱) — اور بیوی اور بیٹوں سے بھاگے گا،

يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا (بقرہ ۱۵) — جس دن کوئی کسی دوسرے کا بدلہ نہ ہوسکیگا

يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ (نور ۳) — جس دن ان کی زبانیں انکے خلاف گواہی دینگی

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا (انفطار) — جس دن کوئی دوسرے کیلئے کچھ نہ کرسکیگا،

يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْئًا (دخان ۲) — جس دن کوئی دوست کسی دوسرے دوست

الغرض یہ اور اسی قسم کے دوسرے اوصاف اس ہولناک دن کے بیان کئے گئے ہیں، جن سے اس عظیم الشان دن میں انسان کی بیکسی، عاجزی اور اپنے اعمال کے سوا کسی دوسری چیز کے کام آنے سے قطعی مایوسی ظاہر کی گئی ہے،

قیامت میں فسادِ نظام ہوگا،

قیامت کے متعلق بعض متکلمین کو یہ شبہ ہوا ہے کہ وہ مادہ کے فنائے محض یا عدم محض کا نام ہے حالانکہ یہ بات قرآنی تصریحات کے خلاف ہے، قرآن پاک کی بیسیوں آیتوں میں قیامت کی جو تصویر کھینچی گئی ہے، وہ تمامتر فنائے حیات اور آسمان و زمین کے نظام کی برہمی اور انکی تباہی کے خاکہ کے سوا کچھ اور نہیں ہے، چنانچہ حسب ذیل آیات پر غور کرنے سے یہ نتیجہ خود بخود سامنے آجائیگا۔

اَلْقَارِعَةُ مَا الْقَارِعَةُ وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ، يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ؛ (قارعة-۱)

متنبہ کرنے والی اور کیا چیز ہے متنبہ کرنیوالی، اور تم کو کس نے بتایا کہ کیا چیز ہے متنبہ کرنیوالی، یہ دن ہے جب لوگ پریشان پروانوں کی طرح اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح ہوں گے،

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا، وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا، يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا. (زلزال-۱)

جب زمین خوب ہلائی جائیگی، اور وہ اپنا بوجھ نکالے گی، اور انسان کہے گا: زمین کو کیا ہوا، اس دن وہ اپنی حالت بیان کرے گی،

اِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ، وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ، وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ، وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ (انشقاق-۱)

جب آسمان پھٹ جائیں گے اور وہ اپنے مالک کی فرمانبرداری کریں گے، اور وہ فرمانبرداری کے لائق ہیں جب زمین پھیلائی جائیگی، اور جو کچھ اس میں ہے اس کو ڈال دیگی، اور خالی ہو جائیگی

اِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ

جب آسمان پھٹ جائیں گے اور جب ستارے

انْتَثَرَتْ، وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ، وَ
إِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ، عَلِمَتْ نَفْسٌ
مَا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ،
(انفطار-۱)

بکھر جائیں گے اور جب سمندر چلائے جائیں گے،
اور جب قبر کے لوگ زندہ کئے جائیں گے، اُس
وقت روح نے جو کچھ پہلے او پیچھے بھیجا ہے، اسکو
جان لے گی،

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَإِذَا النُّجُومُ
انْكَدَرَتْ وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ، (تکویر-۱)

جب آفتاب اندھیرا کیا جائیگا جب ستارے
تاریک ہو جائیں گے جب پہاڑ چلائے جائیں گے،

إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَوَاقِعٌ، فَإِذَا النُّجُومُ
طُمِسَتْ، وَإِذَا السَّمَاءُ فُرِجَتْ، وَ
إِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ،
(مرسلات-۱)

جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ یقیناً ہونیوالا ہے،
جب ستارے ماند کر دیئے جائیں گے، اور جب
آسمان کھول دیا جائیگا، اور جب پہاڑ ریزہ
ریزہ کر دیئے جائیں گے،

فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَخَسَفَ الْقَمَرُ،
وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ،
(قیامہ-۱)

جب نگاہ ماند ہو جائے گی، جب ماہتاب
بے نور ہو جائے گا، اور آفتاب و ماہتاب اکٹھا
کر دیئے جائیں گے،

يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالْمُهْلِ وَتَكُونُ
الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ، (معارج-۱)

جب آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح اور جب
پہاڑ روئی کے گالوں کے مانند ہو جائیں گے،

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ نَفْخَةٌ وَاحِدَةٌ
وَحُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا

جب صور میں ایک پھونک پھونکی جائیگی، جب
زمین اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے اور دونوں

دَكَّةً وَّاحِدَةً فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ	ٹکڑے ہو جائیں گے، اُس دن ہونیوالی
الْوَاقِعَةُ، وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ	بات ہو جائیگی، اور آسمان پھٹ جائیگا،
يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ. (الحاقة - ١)	اور اس دن کمزور ہو جائے گا،
يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ	جب زمین اور پہاڑوں میں لرزہ ہوگا اور
وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا.....	پہاڑ پگھلا ہوا تانبا ہو جائیں گے، .....
......فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ	.... کیونکہ متقی ہو سکتے ہیں،
يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا السَّمَآءُ	جب اس دن کا انکار کرتے ہو، جو بچوں کو
مُنْفَطِرٌ بِهٖ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا	بوڑھا بنا دیگا، آسمان اس دن پھٹ جائیگا
(مزمل - ١)	اور خدا کا وعدہ پورا ہو جائے گا،
يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ	جب یہ زمین دوسری زمین سے بدل
(ابراهيم - ٧)	دیجائے گی،
فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً	جب آسمان پھٹ جائیں گے، اور سُرخ
كَالدِّهَانِ، (رحمٰن - ٢)	تلچھٹ کی طرح ہو جائیں گے،
وَاِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ لَيْسَ	جب ہونے والی بات ہو جائیگی، جس کے
لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝ خَافِضَةٌ	ہونے میں جھوٹ نہیں ہے، زیر و زبر کر دینے والی
رَّافِعَةٌ، اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ	جب زمین خوب ہلائے جائیگی، اور پہاڑ
رَجًّا وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا فَكَانَتْ	پراگندہ کئے جائیں گے، اس وقت وہ پریشان

هَبَآءً مُّنۢبَثًّا، (واقعہ-۱) ذرات کی طرح ہو جائیں گے،

وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا اور آسمان کھول دیئے جائیں گے، تو وہ دروازے

وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا دروازے ہو جائیں گے، اور پہاڑ چلائے جائینگے

(نبار-۱) تو وہ سراب ہو جائیں گے،

غرض اس قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ قیامت صرف نظام عالم کی درہمی، اور دنیا کی حیاتِ موجودہ کی تباہی کا نام ہے جس کے بعد ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان بنے گا۔ اور پچھلی دنیا کے نتائج پر اس دنیا کی حکومت کا قانون جاری ہوگا،

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل

وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ دیجائے گی، اور آسمان بھی بدل جائیں گے،

الْقَهَّارِ، اور سب لوگ اس ایک سب پر قابو رکھنے والے

(ابراھیم-۷) خدا کے سامنے نکل کر آئیں گے،

قیامت کی حقیقت اگرچہ قرآن پاک میں متفرق طور پر اس ہولناک دن کے احوال وکیفیات کا ذکر گوناگون طریقوں سے کیا گیا ہے، تاہم ایک خاص سورہ بھی اس نام سے اس میں موجود ہے جس میں نہایت اختصار و ایجاز کے باوجود انتہائی بلیغانہ وسعت ہے، چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑے سے بڑے اور اہم سے اہم مطالب کو اس طرح بیان کیا ہے، کہ عقل ساکت اور قلب مطمئن ہو جاتا ہے، اس سورہ کا آغاز ان آیتوں سے ہوتا ہے،

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ، وَلَآ میں قیامت کے دن کی اور ملامت کرنیوالے

(اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ، اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ لَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ﴿ بَلٰى قَادِرِيْنَ عَلٰى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ، بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ، يَسْئَلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَخَسَفَ الْقَمَرُ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ، كَلَّا لَا وَزَرَ ، اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ، بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ، وَلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ،

(قیامۃ - ۱)

نفس کی قسم کھاتا ہون کیا (انسان) سمجھتا ہے کہ ہم (اس کے مرنے کے بعد) اسکی ہڈیون کو اکٹھا نہین کرسکتے، کیون نہیں، ہم تو اس کے پورون کو درست کرسکتے ہیں، یہ نہین، بلکہ اصلی بات یہ ہے کہ انسان چاہتا ہے کہ خدا کے سامنے ڈھٹائی کرے، پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب ہے؟ تو جب نگاہ چوندھلانے لگے، اور چاند بے نور ہوجائے اور سورج اور چاند ایک جگہ کردیے جائین انسان اس دن کہیگا کہ اب کہان ہے بھاگنے کی جگہ، ہرگز نہین، کہین بچاؤ نہین، اس دن تیرے رب کے پاس ہے جا ٹھہرنا، اس دن انسان کو جو اُس نے آگے بھیجا (عمل) اور جو پیچھے چھوڑا (مال و دولت) وہ بتایا جائیگا بلکہ انسان اپنے حال کو آپ دیکھتا ہے اگرچہ وہ زبان سے بہانے تراشا کرے،

ان مین سے پہلی ہی آیت میں اللہ تعالیٰ نے روز قیامت، اور نفس لوامہ کی یکے بعد دیگری قسم کھائی ہے نفسِ لوامہ یعنی ملامت کرنے والے نفس سے مقصود انسان کے اندر کا ضمیر ہے جو

اس کے ہر برے کام کے وقت اندر سے غمگین و نادم ہوتا ہے اور اُس کو ایکے کے اس کام پر ملامت کرتا ہے، آخری آیت میں اسی کیفیت ضمیر کو ان لفظوں مین ادا فرمایا، بلکہ انسان اپنے حال کو آپ ہی خوب جانتا ہے اگرچہ وہ زبان سے اپنی برائیوں اور کوتاہیوں کے لئے سیکڑوں بہانے تراشا کرے" انسان کی اسی تابعی کیفیت کا نام نفس لوامہ ہے،

۱۔ اجتماعیات کے عالم اچھی طرح جانتے ہین، کہ فرد اور جماعت کے احوال مین ایک خاص قسم کی مناسبت ہی جس طرح شخص پیدا ہوتا ہی، بڑھتا ہے، بیمار ہوتا ہے، تندرست ہوتا ہی، گنہگار ہوتا ہے، نکوکار ہوتا ہے، پشیمان ہوتا ہے، محنت کرتا ہے، نکو نام ہوتا ہے، بدنام ہوتا ہی، خاص طبعی قوانین کی مطابقت سے وہ قوت حاصل کرتا ہے، اور اُن کی مخالفت سے وہ بیمار، اور کمزور ہوتا ہے، پھر ایک خاص عمر کو پہنچ کر رفتہ رفتہ اُس کے قواے عمل سرد پڑتے جاتے ہین، اور وہ مرجاتا ہے، بعینہ یہی تمام احوال جماعتون اور قومون کو بھی پیش آتے ہیں، وہ بھی پیدا ہوتی ہیں بڑھتی ہین، تندرست ہوتی ہین، کمزور ہوجاتی ہین، گناہگار ہوتی ہین، نکوکار بنتی ہین، اور ایک خاص وقت اور عمر کو پہنچ کر اُن کے عملی قویٰ کمزور و مضمحل ہوجاتے ہیں، اور وہ فنا ہوجاتی ہین،

دنیا مین اسی اصول پر ہزارون قومین پیدا ہو کر فنا ہوچکی ہین، جن کے نام بھی تاریخ کے صفحون پر آج تک موجود نہین ہین، تو جس اصول پر اشخاص اور اشخاص کا مجموعہ جماعتیں، اور جماعتوں کا مجموعہ اقوام پیدا ہوتی اور فنا ہوتی ہین، کیا اسی اصول پر تمام اقوام عالم کا مجموعہ جو پیدا ہوا بڑھتا، اور ترقی کرتا چلا جاتا ہے، کیا ایک دن فناے محض کے آغوش مین جا کر نہ سو جائیگا؟ یہی وجہ ہی کہ قرآن پاک نے قیامت کے ثبوت مین اکثر عاد و ثمود و آل فرعون وغیرہ قومون کی تباہی سے قیامت

کی عمومی تباہی پر استدلال کیا ہے، اس کی مزید تفصیل آگے آئے گی،

بہرحال اب جس طرح شخص کے اندر ایک نفسِ لوّامہ، یا ضمیر یا احساس ہے جو اس کو ہر برے فعل کے وقت اس کو ملامت کرتا، اور اُس کو گنہگار ٹھہراتا ہے، اور جب کبھی وہ اپنے تمام مجموعی کارناموں پر نگاہ ڈالتا ہے، تو اپنے کو قصور وار جانتا اور گنہگار سمجھتا ہے، اسی طرح قوموں کا ضمیر بھی، اپنے گناہوں پر پچھتاتا، اور اپنی تقصیروں پر نادم اور کوتاہیوں پر شرمندہ ہوتا ہے، اور ٹھیک اسی طرح یہ پوری انسانیت بھی ایک دن اپنے افراد کے مجموعی کارناموں پر نادم و پشیمان ہوگی، اور اس کا ضمیر و نفسِ لوّامہ بھی اُس کو ملامت کریگا، کائناتِ انسانی سے بڑھ کر خود کائناتِ ہستی بھی اُن جو اُس کے اندر کیا گیا، اپنے خالق کے سامنے اپنی پشیمانی و ندامت کا اظہار کرے گی اسی عمومی اعترافِ قصور اور کلی ندامت و پشیمانی کا نام قیامت ہے، اور اسی مناسبت سے سورۂ بالا میں نفسِ لوّامہ اور قیامت کو باہم ایک قسم یعنی شہادت میں یکجا کیا ہے، اب اس تفصیل کی روشنی میں سورۂ مذکور کی آیتوں کو دوبارہ پڑھیے [1]

۲- اس عالم کی ہر چیز پر اگر غور سے نگاہ ڈالیئے تو معلوم ہوگا کہ وہ متضاد عناصر و قویٰ کا مجموعہ ہے، اُس میں سردی و گرمی، بیماری و تندرستی، بقا و فنا، اور دیگر ہر قسم کی متضاد قوتیں ودیعت رکھی گئی ہیں، اُن متضاد قوتوں میں جب تک اعتدال قائم رہتا ہے، وہ چیز زندہ رہتی ہے، اور جس وقت یہ اعتدال جاتا رہتا ہے، اسی لمحہ وہ فنا ہو جاتی ہے، ایک درخت میں ایک پھول کھلا، سردی و گرمی اور موسم کی تاثیر نے اس پر عمل کیا، جب تک ان متضاد تاثیرات و استعدادات میں اعتدال

---

[1] مستفاد از تفسیر سورۂ قیامہ مولانا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ،

کی کیفیت رہی وہ پھول شگفتہ رہا جب آن کسی ایک قوت نے شکست کھائی، پھول کی ہستی معرضِ فنا
مین آگئی، یہی حال دنیا کی ہر چیز کا ہے، اور اسی اصول پر افراد، خاندان، جماعتین، قومین، بلکہ حیوانات
شجر، حجر، غرض دنیا کی ہر چیز چل رہی ہے۔

پوری کائناتِ ہستی کو لیجئے، اُس کو خلاقِ عالم نے ان ہی متضاد عناصر و اخلاط پر قائم فرمایا ہے
دن رات، روشنی، تاریکی، سردی، گرمی، پانی، آگ، بہار خزان، تندرستی، بیماری، دولت، افلاس
حیات، موت، آسمان، زمین، نیکی، بدی، خیر و شر، غرض جس کو بھی دیکھو یہی معلوم ہوگا کہ یہ اربع عناصر
کی چہار دیواری، متضاد قوی، اور حالات کی بنیاد دون پر قائم ہے، ان مین جب تک اعتدال
قائم ہے اس دنیا کی کل چل رہی ہے، جس دن اُن کے اعتدال مین فرق آیا وہی دن اسکی فنا کا دن ہوگا،

لیکن جس طرح افراد و اشخاص مین بیماری کے بعد تندرستی، اور تندرستی کے بعد بیماری کی
صلاحیت موجود ہے اسی طرح اس نظامِ کائنات مین بھی تندرستی کے بعد بیماری اور بیماری کے بعد
بعد تندرستی کی صلاحیتیں پائی جاتی ہین، کتنی دفعہ یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ دنیا ظلم و جور سے لبریز ہو گئی اور
کشت و خون کے سیلاب نے اُس کے امن و امان کو غرق کر دیا، کہ دفعۃً وہ پھر ابھری، اور اس کا غرق شدہ
امن و امان کشتیِ نوح بنکر کرۂ ارضی کو بچا لے گیا، بارہا اس باغِ ہستی مین خزان آئی، اور پھر بہار
کا موسم اس پر چھا گیا، اجرامِ سماوی کی باہمی مسابقت مین ہماری زمین کئی دفعہ ٹکرا جانے کے قریب
پہنچی، اور پھر بال بال بچ گئی، یہ کرے اپنی رفتار مین بسا اوقات گرنے کے قریب پہنچے کہ پھر سنبھل گئے،
مگر فساد و صلاح کا یہ نظام اسی وقت تک چل رہا ہے جب تک ان متضاد قوی، اور کائنات
کے استعدادات مین اعتدال قائم ہے، جس دن اعتدال فنا ہوگا، نظامِ ارضی کا پورا کارخانہ بھی

درہم برہم ہو جائے گا، اس وقت زمین اپنی عمر کی پوری تاریخ اور کارناموں کے ساتھ اپنے خالق کے سامنے کھڑی ہوگی اور اپنے اوپر کی ہر کوتاہی وقصور کی شہادت اپنی زبان سے دیگی،

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا	جس وقت پوری زمین ہلا دی جائیگی، اور جب وہ
وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا وَقَالَ	اپنے اندر کے بوجھوں کو اگل دیگی، اور انسان
الْاِنْسَانُ مَالَهَا، يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ	کہے گا کہ اس کو کیا ہوگیا ہے، اس دن وہ اپنی
اَخْبَارَهَا، بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا،	باتیں بیان کرے گی کہ اس کے پروردگار نے
يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا	اس کو حکم دیا ہے، اس دن لوگ لوٹیں گے کہ
لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ، فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ	اپنے عمل دیکھیں تو جس کسی نے ذرہ برابر نیکی کی
ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ، وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ	ہے، وہ اس کو دیکھ لیگا، اور جس نے ذرہ برابر بدی
ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ، (زلزال - ۱)	کی ہو وہ بھی اس کو دیکھ لیگا،

صور قیامت قرآن میں قیامت کے ذکر میں صور پھونکنے کا بار بار ذکر ہے، فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ، پھر جب صور پھونکا جائے گا، صور کے لفظی معنی نرسنگھا کے ہیں، اصل یہ ہے کہ قدیم الایام میں بابلیوں، کنعانیوں، آرامیوں، اور عبرانیوں وغیرہ تمام پرانی قوموں میں بادشاہی جلال وجلوس اور اعلانِ جنگ کے موقعوں پر نرسنگھا پھونکا جاتا تھا، اس لئے نرسنگھا پھونکنے کے معنی شاہی جلال کا اظہار یا غیر معمولی خطرہ کا اعلان ہے، چنانچہ توراۃ میں یہ محاورہ بکثرت استعمال کیا گیا ہے، قرآن میں ہے کہ اس دن ندا ہوگی، لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ، آج کس کی بادشاہی ہے، پھر اللہ تعالیٰ خود ہی جواب دیگا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ اس ایک سب پر دبانے والے کی، غرض وہ دن آسمان وزمین اور نظمِ کائنات کے شہنشاہِ مطلق کے

اظہارِ جلال اور شدید خطرۂ حساب کے اعلان کا ہوگا اس لئے نفخِ صور اور نرسنگھا پھونکنے کا قدیم محاورہ اس کے لئے استعمال کیا گیا، اور یہ بھی ممکن ہو کہ اللہ تعالیٰ واقعتہً اس دن اپنی شہنشاہی کا نرسنگھا پھونکنے کا حکم دے، اور اس کی تعمیل ہو، جیسا کہ صور کے لفظی معنی دلالت کرتے ہیں،

عربوں کا انکار | اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ قیامت اپنے اندر کتنی عظیم الشان حقیقت رکھتی ہے لیکن اہلِ عرب کو توحید کے بعد جس عقیدہ سے شدت کے ساتھ انکار تھا جس کے ماننے پر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے تھے، اور جو اُن کی عقل میں کسی طرح نہیں سماتا تھا، وہ یہی قیامت، ام حشر و نشر کا مسئلہ ہے، جاہلی عرب حیات بعد الموت، خدا کے آگے اپنے اعمال کے مواخذہ اور پرسش اور سزا و جزا سے قطعًا نا آشنا تھے، اسی لئے ان کو اعمال کے خیر و شر اور نیکی و بدی میں وہ تمیز نہ تھی جس پر اخلاق و معاملات کا تمام تر دارو مدار ہے، عرب کا شاعر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس تعلیم کو سنکر تعجب سے کہتا ہے کہ

اموت ثم بعث ثم حشر	حدیث خرافۃ یا ام عمرو
کیا موت ہے پھر جی اٹھنا ہے، پھر اکٹھا ہونا ہے	اے ام عمرو! (شاعر کی بیوی کا نام) یہ سب خرافات باتیں ہیں

قریش کا ایک اور شاعر[1] کہتا ہے،

یحدثنا النبی بان سنحیی	وکیف حیاۃ اصداء وھام
یہ نبی ہم سے کہتا ہے کہ ہم پھر زندہ کئے جائیں گے	حالانکہ صدی اور ہام ہو کر پھر زندگی کیسی؟

(انکا عقیدہ تھا کہ انسان مر کر پرندہ ہو جاتا ہے اور آواز دیتا پھرتا ہے اسی کا نام انکے ہاں صدا اور ہام تھا)

[1] صحیح بخاری جلد اول باب الہجرۃ ص ۵۵۵

قرآن مجید میں بھی ان کے یہ اقوال بکثرت نقل کئے گئے ہیں، مثلاً

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذَٰلِكَ رَجْعٌ	کیا جب ہم مرجائیں گے، اور مٹی ہوجائیں گے
بَعِيدٌ، (ق-۱)	یہ لوٹنا بہت دور ہے،
ءَاِنَّا لَمَرْدُودُونَ فِي الْحَافِرَةِ ءَاِذَا	کیا ہم دوبارہ الٹے پاؤں لوٹائے جائیں گے،
كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً (نزعت-۱)	کیا جب ہم سڑی ہوئی ہڈی ہوجائیں گے،
ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا	کیا جب ہم ہڈی اور چورا ہوجائیں گے تو ہم نئے
لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا، (اسرائیل)	بناکر پھر اٹھائے جانے والے ہیں،
مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ (یٰس)	ان سڑی گلی ہڈیوں کو کون جلائے گا،

ان میں بعضوں کا عقیدہ دہریوں کی طرح تھا کہ یہ دنیا اسی طرح قائم رہیگی، موت وحیات کا بھی سلسلہ اسی طرح برابر جاری رہے گا، اور اس دنیاوی زندگی کے علاوہ کوئی دوسری زندگی نہیں ہے،

وَقَالُوا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا	انھوں نے کہا کہ یہی ہماری موجودہ زندگی ہے
نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ	دوسری نہیں، مرتے ہیں، اور جیتے ہیں، اور
(جاثیہ-۳)	زمانہ ہی ہم کو مارتا ہے،
وَقَالُوا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا	اور انھوں نے کہا کہ یہی ہماری موجودہ
وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ، (انعام-۳)	زندگی ہے، ہم دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے،

انھیں اپنے اعمال کے حساب و مواخذہ کا بھی یقین نہ تھا،

إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا (نباء ۱)   وہ حساب کی امید نہیں رکھتے تھے،

خباب بن الارت نہایت قدیم مسلمانون مین ہین، یہ لوہاری کا پیشہ کرتے تھے، اُن کے کچھ دام قریش کے ایک رئیس عاص بن وائل پر واجب الادا تھے، وہ جب جاکر تقاضا کرتے تو عاص کہتا جب تک تم محمد کا انکار نہ کروگے مین تم کو کچھ نہ دونگا" انھون نے کہا، یہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک تم مرکر پھر جیو نہیں" اس نے کہا کیا مرکر مجھے پھر جینا بھی ہے، انھون نے کہا بیشک اس نے مذاق سے کہا تو اچھا پھر وہین میرا مال ودولت اور سروسامان ہوگا، وہین تم دام بھی لے لینا[۱] اس سے اندازہ ہوگا کہ اس بارہ میں اہل عرب کا کفر کتنا شدید تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے سامنے توحید کے بعد جس عقیدہ کو سب سے زیادہ زور کے ساتھ پیش کیا وہ یہی تھا قرآن مجید کی مکی سورتوں میں سب سے زیادہ اسی مضمون کو مختلف تعبیرون اور موثر طریقون سے روزمرہ کے عینی مشاہدات اور دلائل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، ان میں ہیبت الہٰی، ہنگامۂ قیامت اور حشر ونشر کے رستخیز کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ سننے والا سرتاپا اثر ہو جائے، انسان کے عجز، عقل کے قصور، خدا کی عظمت وقدرت اور کائنات کی حیرت انگیز خلقت کو اس طرح بیان کیا ہے، کہ سامع ہر قدم پر لرزہ براندام ہو جاتا ہے، پھر ایک طرف حیات ابدی، نعیم جنت، اور بہشت کی مسرتوں کا، اور دوسری طرف موت کی بے بسی، دنیا کی فنا، دوزخ کی دہشت، اور عذاب الہٰی کی تہدید کا ایسا ہولناک نقشہ کھینچا ہے، کہ نفس انسانی اپنے تاثر کو چھپانے پر قادر نہیں رہتا،

وحی الہٰی نے قیامت اور بہشت ودوزخ کے حالات ومناظر کو سب سے پہلے جن اسباب سے

[۱] صحیح بخاری تفسیر کہیعص، صفحہ ۶۹۱

پیش کیا ہے، اُن سے اہلِ نظر صحابہ نا واقف نہ تھے، حضرت عائشہ رضہ فرماتی ہیں "پہلے ایک بڑی سورت نازل ہوئی جس میں جنت و دوزخ کا بیان ہے، یہانتک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہو گئے تب حلال و حرام کے احکام نازل ہوئے، اور اگر پہلے ہی یہ حکم اترتا کہ شراب نہ پیو، بدکاری نہ کرو، تو لوگ نہ مانتے یہ آیت کہ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰی وَاَمَرُّ (بلکہ اُن کے وعدہ کا وقت قیامت کی گھڑی ہے، اور قیامت کی گھڑی نہایت مصیبت کی اور تلخ ہوگی) مکہ معظمہ میں اتری، اور میں اس وقت کمسن بچی تھی، کھیلتی تھی، بقرہ اور نساء کی سورتیں (جن میں احکام ہیں) اس وقت اتریں، جب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے لگی تھی"[1]

اس تشریح سے ثابت ہوتا ہے کہ تعلیم محمدی نے اس حقیقت کو ایمان کے اصول و اساس میں کیوں داخل کیا ہے، اگر یہ تعلیم عقائد میں داخل نہ ہوتی، تو دونوں میں اعمال کی جزاء و سزا کی ہیبت اور عظمت نہ بیٹھتی، اور نہ احکام الٰہی کی تعمیل کی طرف دلی رجحان اور میلان پیدا ہوتا، بلکہ یہود و نصاریٰ کی طرح جن کے صحیفوں میں زیادہ تر دنیاوی ہی جزاء و سزاء کا ذکر باقی رہ گیا ہے دوسرے اہل ایمان کے دل بھی سخت اور تاثر سے خالی ہو جاتے، چنانچہ اس فلسفہ کو خود قرآن مجید نے بیان کیا ہے

فَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ	تو جو لوگ آخرت کا یقین نہیں کرتے اُن کے
مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ (نحل ۳)	دل نہیں مانتے، اور وہ غرور میں مبتلا ہیں،

اسی لئے مسلمانوں کو حکم ہوا کہ نماز کی ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کی تلاوت کریں جس کا ایک ٹکڑا یہ بھی ہے مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ "روز جزا کا مالک" اسلام چاہتا ہے کہ یہ حقیقت اس کے پیروؤں

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم ص ۷۴۶، باب تالیف القرآن،

کے دون میں پوری طرح گھر کرلے.

قیامت پر قرآنی دلائل قرآن نے قیامت کی ضرورت پر تمام دوسری دلیلوں سے قطع نظر کرکے عموماً دو باتوں سے استدلال کیا ہے، اوّل یہ کہ انسان بے کار اور بے مقصد نہیں پیدا کیا گیا اگر اس کے اعمال کا مواخذہ اور جزا و سزا نہ ہو تو خیر و شر اور نیکی و بدی کا فطری امتیاز لغو، اور انسانی زندگی تمام تر بے مقصد اس کے تمام کام بے نتیجہ ہو جائیں،

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ، (مومنون-۶)

(اے لوگو!) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا، اور تم ہماری طرف لوٹائے نہ جاؤگے،

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى (قیامۃ) کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ دیا جائیگا،

دوسری بات جو اس روزِ جزا کی ضرورت کے ثبوت میں قرآن نے پیش کی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا عادل اور منصف ہونا ہے. اگر اچھے اور بُرے انسانوں کے اعمال کی جزا و سزا نہ ہو تو دونوں کا درجہ برابر ہو جائے. اور نیکی و بدی اور گناہ و ثواب کے کوئی معنی نہ رہیں، بلکہ نعوذ باللہ خدا ظالم اور غیر منصف قرار پائے، اس موجودہ مادی دنیا میں بھی انسانوں کو اپنے اعمال کی کچھ نہ کچھ جزا ملتی ہے تاہم یہ صاف نظر آتا ہے، کہ بہت سے گنہگار، سیہ کار اور ظالم یہاں آرام اور چین کی زندگی بسر کرتے ہیں، اور بہت سے نیکوکار، پرہیزگار اور اچھے لوگ مصیبتیں اور تکلیفیں جھیلتے ہیں، اس لیے یقیناً یہ موجودہ زندگی اعمال کی جزا و سزا کی اصلی جگہ نہیں ہو سکتی، اس بنا پر دوسری زندگی کا ماننا ضروری ہے جہان ہر شخص کو اُس کے اعمال کا پورا نتیجہ مل سکے، اس موجودہ دنیا میں دنیاوی حکام اپنے ناقص علم کے مطابق اچھوں اور بروں کو اُن کے اعمال کی جزا و سزا دیتے رہتے ہیں، پھر کتنا ضروری ہے

کہ پوری دنیا کا عالم الغیب حاکم اپنے صحیح علم کے مطابق لوگوں کو جزا و سزا دے کر اپنے عدل و انصاف کا ثبوت دے، سورۂ والتین میں اسی استدلال کی طرف اشارہ ہے،

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ، اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحَاکِمِیْنَ، (وَالتین - ۱)	لیکن جو ایمان لائے، اور جنھوں نے نیک کام کئے اُن کیلئے نہ ختم ہونے والا اجر ہے، پھر اس کے بعد تجھکو کیا چیز جزا پر یقین لانے نہیں دیتی کیا اللہ تمام حاکموں میں سب سے بڑا حاکم نہیں (تمام فیصلہ کرنیوالوں میں سب سے بہتر فیصلہ [2]

(ترجمہ آزاد)

اسی لئے قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ نیک و بد کا نتیجۂ عمل یکساں نہیں ہو سکتا، ایک جگہ خدا فرماتا ہے،

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ کَالْفُجَّارِ (ص [3])	کیا ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے انکی طرح کر دیں جو زمین میں فساد کرتے ہیں یا پرہیزگاروں کو بدکاروں کی طرح کر دیں،

دوسری جگہ ارشاد ہوا،

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَھُمْ کَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْیَاھُمْ وَمَمَاتُھُمْ سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ، (جاثیہ - ۲)	کیا انھوں نے جنھوں نے گناہ کمائے یہ خیال کیا ہے کہ ہم اُن کو اُن کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے، اور نیک کام کئے، ان دونوں کی زندگی اور موت برابر ہوگی، ؟ اُن کا یہ خیال بُرا ہے،

لوگوں کو روزِ جزا اور قیامت پر یقین کرنے سے جو وہم مانع تھا، وہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد پھر کوئی جیتا نہیں، تو قیامت کے دن کیونکر جلائے جائیں گے، یہ حقیقت میں استبعادی شبہہ ہے، یعنی چونکہ مرکر دوبارہ جینا اب تک انسان کے تجربہ مین نہیں آیا، اس لئے اس کو دوبارہ زندگی کا خیال مستبعد معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ اُس کے اَن ہونی اور محال ہونے پر کوئی عقلی دلیل نہین ہے، وحیِ محمدیؐ نے اس گتھی کو اس طرح سلجھایا کہ کفار کے استبعاد کے وہم کو حسبِ ذیل مختلف طریقون سے دور کر دیا،

۱- مر کر جینے کے بعد تاریخی مثالین پیش کیں، جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت عزیرؑ اور اصحابِ کہف کے قصّون مین مذکور ہیں، اور ان سے استدلال کیا کہ جب چند آدمی یا پرند مر کر جی سکتے ہیں، تو پوری دنیا بھی مر کر جی سکتی ہے،

۲- جس طرح زمین گرمیون میں خشک اور بے حیات ہو جاتی ہے، اور پھر دفعۃً بارش کے ایک چھینٹے سے اُس میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ سبزہ نکل آتا ہے کھیتیان لہلہا اُٹھتی ہین اسی طرح قدرتِ الٰہی کی ایک بارش زمین سے انسانی دفینون کو اگلوا دیگی، وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا (اور زمین اپنے اندر کے بوجھون کو باہر نکال دیگی) اور دوبارہ نئی زندگی پیدا کر دے گی،

۳- دوبارہ زندگی پر تعجب اور استبعاد اس لئے ہے کہ خدا کے دائرۂ قدرت کی پوری وسعت ہماری سمجھ مین نہین آئی، جس نے آسمان بنائے، زمین بنائی، آسمان سے پانی برسایا مردہ زمین سے زندہ کھیتیان، سبزہ اور درخت اُگائے، اور پانی کے ایک قطرہ سے انسان بنایا کیا وہ ان کی فنا کے بعد دوبارہ ان کی ایجاد پر قادر نہین؟

۴- حیات کا یہ تمام کارخانہ پہلے نیست و معدوم تھا، خدا نے اُس کو ہست و موجود کیا؛ پھر رفتہ رفتہ اُس کو معدوم کر دیا تو جس نے پہلے بغیر کسی سابق مثال کے اس کارخانہ کو پیدا کیا، وہ کیا دوبارہ اس کو پیدا نہیں کر سکتا؟ جس نے نقشِ اول بنایا کیا نقشِ ثانی کھینچنے پر اُس کو قدرت نہیں؟

۵- دنیا میں باری باری بہت سی قومیں وجود میں آئیں، اور قوانینِ الٰہی کے مطابق انھوں نے جسمانی زور و طاقت، مالی وسعت، اجتماعی اور تمدنی عظمت، اور سیاسی قوت حاصل کی، بڑی بڑی عمارتیں بنائیں، عظیم الشان تمدن کی بنیاد ڈالی، قوموں کو اپنا محکوم بنا کر حکومت و سلطنت قائم کی، پھر جب انھوں نے غرور و نخوت، ظلم و ستم اور دوسرے قوانینِ الٰہی کی جو قوموں کی ہستی، اور عظمت کی بقا کے لئے ضروری ہیں، مخالفت کی، تو وہ فنا کر دی گئیں، اور ان کا نام و نشان بھی صفحۂ ہستی سے ہٹ گیا، عربوں سے سوال کیا کہ تمہارے عاد و ثمود جو کبھی بنو سام کے ممالک عراق و شام و مصر و عرب پر چھائے ہوئے تھے، کیا ہوئے، ؟ سبا اور تبع کی عظیم الشان حکومتیں کیا ہوئیں؟ فرعون اور اسکی سلطنت کا کیا حال ہوا ؟ قوم لوط اور قوم مدین کو زمین کیونکر نگل گئی ؟

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا	کیا یہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ كَانُوا مِن	اُن سے پہلے کا کیسا انجام ہوا، جو اُن سے
قَبْلِهِمْ كَانُوا هُمْ أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً	قوت اور زمین میں یادگاروں کے لحاظ سے
وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ، (مومن-۳)	کہیں بڑھ کر تھے،
أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِينَ مِن	کیا نوح کی قوم، اور عاد و ثمود کی، اور جو اُن کے
قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ	بعد آئے جن کو خدا ہی جانتا ہے، اُن کی خبر

وَالَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَا یَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰہُ (ابراہیم ۲) تم کو معلوم نہین ہوئی ؟

یہ تو وہ قومیں ہیں جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ دنیا کی تاریخ میں کتنی قومون کے عروج و فنا کی داستانیں محفوظ ہیں، بابلی، اسیری، اکادی، اور مصری قومیں جو کبھی روے زمین پر کوس لمن الملک بجاتی تھیں، ہزارہا سال سے بے نشان ہیں، نارمن جیسے فاتح کیا ہوئے یونانی اور روم جو کبھی دنیا کے تنہا مالک بن گئے تھے، اب ان کا کہیں وجود ہے ؟ مجوس جو روم کے مقابل صدیوں تک برسرپیکار رہے، اب اُن کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں، امریکہ کے قدیم باشندے جو کبھی اس براعظم کے واحد مالک تھے، اب فنا کے قریب ہیں،

الغرض جس طرح افراد جی کر مر جاتے ہیں، جماعتیں وجود میں آکر مٹ جاتی ہیں، قومیں پیدا ہو کر فنا ہو جاتی ہیں، اسی طرح پوری دنیاے مخلوقات بھی ایک دن آئیگا، جب قانونِ الٰہی کے مطابق معدوم ہو جائے گی،

جس طرح عوام جو قومون کی تاریخ سے واقف نہیں، صرف افراد کو جیتے اور مرتے دیکھتے ہیں، وہ گو افراد کی فنا کا یقین رکھتے ہین، لیکن قوموں کی فنا کے مسئلہ کو نہین سمجھ سکتے، اور اس مین شک کرتے ہین، اسی طرح جن کی نظر دنیاے خلق کی تاریخ پر نہیں، وہ اس کے فناے کامل پر اپنی جہالت اور نادانی سے اعتبار نہیں کرتے، حالانکہ ایک وہ دن آئیگا، جب پوری دنیا اپنے وجود کی صلاحیت سے معرا ہو کر فنا ہو جائے گی، کائنات کا یہ نظام بدل جائے گا، اس موجودہ عالم کا قانون طبعی، ایک دوسرے قانونِ طبعی سے منسوخ ہو جائیگا، اور جیسا کہ سائنس کہتا ہے اور قرآن نے نقشہ کھینچا ہے، آفتاب و ماہتاب و ستارے، اور تمام اجرام فلکی ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گے، اور پوری دنیا کی عدالت قائم

ہو کر نئی زمین اور نیا آسمان بنے گا،

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ
وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ
الْقَهَّارِ (ابراهيم - ۷)

جس دن یہ زمین اور زمین سے بدل جائیگی
اور آسمان بھی، اور مخلوق اکیلے زبردست خدا
کے سامنے نکل کھڑی ہوگی،

سورۂ ق میں قیامت پر استدلال ان ہی دلیلوں سے کیا گیا ہے،

ق، وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ، بَلْ
عَجِبُوْا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ
فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ، هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ
ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ج ذٰلِكَ
رَجْعٌ بَعِيْدٌ، قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ
الْاَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ
بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ
فِيْ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ، اَفَلَمْ يَنْظُرُوْا اِلَى
السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَ
زَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ، وَالْاَرْضَ
مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَ
اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ

قسم ہے اُس بڑی شان والے قرآن کی (جو
مردہ دلوں کو زندہ کرتا ہی) ان کافروں کو عقلی
انکار نہیں ہی (بلکہ) ان کو اس پر تعجب ہی کہ انہی
میں ایک آدمی آکر ان کو (قیامت کا) ڈر سناتا ہی،
وہ کہتے ہیں کہ یہ تعجب کی بات ہی کیا جب ہم
مر جائیں گے، اور مٹی ہو جائیں گے (تو پھر زندہ
ہوں گے) یہ دوبارہ لوٹنا تو دور از عقل ہی،
(خدا کہتا ہے یہ تعجب کی کیا بات ہی) ہم کو
معلوم ہی کہ زمین اُن (مردہ جسموں) میں جو کمی کرتی
ہی، اور ہمارے پاس محفوظ کی کتاب ہے، بلکہ بات
یہ ہے کہ اُن کافروں نے سچائی جھٹلا دی
جب وہ اُن کے پاس آئی پس وہ الجھی

تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ،
وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا
بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ، وَالنَّخْلَ
بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ لا رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ
وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ط كَذٰلِكَ
الْخُرُوْجُ، كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ
وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ، وَثَمُوْدُ، وَعَادٌ
وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ
الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ط كُلٌّ كَذَّبَ
الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ، اَفَعَيِيْنَا
بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ
مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ،

(ق - ۱)

باتوں میں پڑ گئے، کیا انھوں نے اپنے اوپر کے
آسمانوں کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو کیسا بنایا
اور کس طرح اس کو سجایا، ہے اور آسمان کہیں سوراخ
نہیں، اور زمین کو پھیلایا ہے، اور اس میں پہاڑ
کے لنگر ڈالے اور اسمیں قسم قسم کی رونق کی چیزیں
اگائیں کہ ہر رجوع ہونے والے بندہ کو اس سے
سوجھ ہو، اور یاد آئے اور آسمان سے برکت کا
پانی برسایا، پھر اس سے باغ اور کٹنے کے کھیت
اناج اگائے اور کھجوروں کے لمبے درخت جن کے خوشے
اوپر تلے ہیں، یہ بندوں کو روزی پہنچانے کیلئے ہے
اور اس پانی سے مردہ آبادی کو ہم زندہ کرتے ہیں
اسی طرح (قبروں سے) نکلنا ہوگا، اور کافروں
سے پہلے نوح کی قوم، رس والوں اور ثمود اور
عاد اور فرعون اور لوط کے بھائیوں نے اور جنگل
والوں نے اور تبع کی قوم نے اسکو جھٹلایا، ان
میں سے ہر ایک نے پیغمبروں کو جھٹلایا تو میری
دھمکی پوری اتری، کیا ہم پہلے پیدا کرکے تھک گئے ہیں
ہو جو دوبارہ نہیں پیدا کر سکتے) بات یہ ہے کہ ان کافروں کو از سر نو پیدائش میں شک ہے،

سورۂ قیامت میں بھی اس کا بیان ہے اس کی آخری آیتیں یہ ہیں،

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَكَ سُدًى، اَلَمْ یَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰى، ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَیْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى اَلَیْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ یُّحْیِۦَ الْمَوْتٰى (قیمٰہ - ۲)	کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ یونہی بیکار چھوڑ دیا جائے گا، کیا وہ پانی کی ایک ٹپکی ہوئی بوند نہ تھا، پھر وہ بندھا ہوا خون ہوا، پھر خدا نے اس کو بنایا، اور اس کو ٹھیک کیا، پھر اسکو جوڑا کیا یعنی نر و مادہ کیا، کیا وہ خدا اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو دوبارہ جلائے؟
وَقَالُوْۤا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِیْدًا اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ (بنی اسرائیل - ۱۱)	اور وہ بولے کہ جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائینگے تو پھر نئے بنا کر اٹھائے جائیں گے؟ کیا یہ نہیں دیکھتے کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں کو اور زمین کو بنایا، وہ اُن لوگوں کے مثل کو دوبارہ بھی) بنا سکتا ہے،

ایک اور جگہ فرمایا،

وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ، (روم - ۳)	اور خدا ہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے پھر اس کو دوبارہ خلق کرے گا، اور یہ (دوبارہ خلق کرنا) اس کے لیے آسان ہے،
اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ	(لوگو!) اگر تم کو دوبارہ زندگی میں شک ہو تو

فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ؕ | ہم تو پہلے) تم کو (اسی مردہ) مٹی سے پیدا کر چکے ہیں،
(حج - ۱) | (پھر دوبارہ کیون نہین پیدا کر سکتے)

قیامت کے متعلق تمام دور دراز اور طول وطویل شکوک وشبہات کا کتنا مختصر جواب ہے،

قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ | وہ بولا کون ان سٹری کھوکھلی ہڈیون کو جلائیگا
قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ | کہہ دے وہی جس نے پہلی دفعہ اون کو
مَرَّةٍ ؕ (یٰسین - ۵) | بنایا،

غرض وحیِ محمدی نے ہر پہلو سے کفار کے اس استعجاب اور استبعاد کو دور کیا، اور اُن کو دوبارہ زندگی کا یقین دلایا،

حشر جسمانی | اس بحث پر لوگون نے قیامت برپا کر رکھی ہے کہ یہ دوبارہ زندگی اسی گوشت وپوست کے ساتھ ہوگی، یا صرف روحانی ہوگی، جہان جسم وجسمانیت کا مطلق گذر نہ ہوگا؟ گو قرآن پاک کی مختلف آیتیں مختلف پہلوؤں کو پیش کرتی ہیں، جن میں اشارۃً ہر قسم کی باتین آجاتی ہیں، تاہم قیامت کے متعلق اوپر کی آیتون مین سے ایک ایک آیت پر غور کرو، کفار کو تعجب ہے کہ کیا ہمارا یہ جسم مر کر پھر جئے گا، کیا ہماری ان سٹری گلی ہڈیون میں دوبارہ جان پڑے گی، اور ہم قبرون سے نکل کر پھر اُٹھ کے کھڑے ہون گے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جسمانی زندگی کے علاوہ، زندگی کا کوئی دوسرا مفہوم ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھا، مگر اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ "تم تعجب نہ کرو، اور انکار پر آمادہ نہ ہو کہ تمھارے یہ فناشدہ جسم نہیں اُٹھائے جائین گے، اور نہ تمھاری ان بوسیدہ ہڈیون میں روح پھونکی جائے گی، بلکہ وہ تو سراسر روحانی زندگی ہو گی، کیونکہ جب دوبارہ جسمانی زندگی

کا تخیل ان کے لیئے نا قابلِ فہم تھا، تو خالص روحانی زندگی کا تخیل تو اور بھی اُن کے فہم سے بالاتر تھا اور اب بھی ہے کہ ہم اس مادی دنیا کے جاننے والے سرتاپا روحانی زندگی کے تصور سے بالکل عاجز ہیں، اس لیئے مصلحتِ الٰہی اسی کی متقضی تھی، کہ وہ اصل واقعہ پر زور دے، کیسے اور کیوں سے تعرض نہ کرے، اور صاحبِ فہم کو اس کے فہم کے مطابق اس راز کو سمجھنے دے؛ چنانچہ قرآنِ پاک کے اس اسلوب بیان کو اگر سمجھنا ہے، تو ان آیتوں پر غور کرنا چاہیئے،

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ	اور انھوں نے کہا کہ کیا جب ہم زمین میں
ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ بَلْ هُمْ	کھو جائیں گے، کیا ہم نئی پیدایش میں پھر
بِلِقَاۗئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ،	ہوں گے (خدا فرماتا ہے یہ کچھ نہیں بلکہ)
(سجدہ ۔ ۱)	یہ اپنے پروردگار کی ملاقات کے منکر ہیں،

غور کرو کہ ان کی مادی معدومیت کے بعد مادی پیدایش کے پُرتعجب انکار پر اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا کہ یہ شکوک و شبہات اس لیئے اُن کو پیش آتے ہیں کہ مرنے کے بعد خدا کی ملاقات اور اس کے سامنے ہونے سے اُن کو انکار ہے، اور حواشی کو چھوڑ کر اصل مقصود یہی ہے کہ موت کے بعد اور آخرت میں خدا کے سامنے ہونے پر یقین رکھا جائے، اس سے ان کو کیا مطلب کہ وہ کس طرح ہوگا،؟ چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا،

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ	جواب میں کہدے کہ ملک الموت جو تم پر
الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ	متعین ہے وہ تم کو موت دیگا، پھر تم اپنے
تُرْجَعُوْنَ، (سجدہ ۔ ۱)	پروردگار کی طرف لوٹا دیے جاؤ گے،

یہی ملاقات اور رجوع الی اللہ، اس عقیدۂ حشر کی اصلی روح ہے،

بات یہ ہے کہ ہم اُن ہی باتوں کو سمجھ بوجھ سکتے ہیں جن کی مثالیں اور نظریں اس مادی دنیا میں ہماری نگاہوں سے گذرتی رہتی ہیں، اور وہ عالم جو نگاہوں سے مستور، بلکہ تصور سے بھی دور ہے اس کی باتوں کو اس طرح سمجھنا کہ ہر سوال اور تکرار سوال سے ہم بے نیاز ہوجائیں تقریبًا ناممکن ہی۔ اُن کے متعلق جو کچھ کہا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس دیدہ شہرستان جو یعنی دنیا کے قیاس پر اس نادیدہ شہرستانِ بقا یعنی آخرت کا ہر نقشہ درخاکہ بتایا اور سمجھایا جائے اور یہی محمد رسول اللہ صلعم کی تعلیم نے کیا ہے

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ہر قسم کی قدرت پر یقین رکھتے ہیں اُن سے تو کچھ کہنا ہی نہیں لیکن جو شخص جسمانی حشر کا تصور اس لیئے محال سمجھتا ہی کہ عام انسانوں نے کسی مردہ جسم کو زندہ ہوتے نہیں دیکھا تو اُس کے نزدیک تنہا روحانی زندگی کا تخیل تو اور بھی زیادہ محال ہونا چاہیے، کیونکہ کسی انسان نے اب تک کسی انسان کو روحانی وجود میں نہیں دیکھا ہی، بلکہ وہ اس کا تصور بھی نہیں کرسکا ہی وہ جب انسانی زندگی کا تصور کریگا تو جسم و شکل و اعضا کے ساتھ ہی کریگا، اُن سے مجرّد ہوکر نہیں کریگا

موت جسم سے روح کی مفارقت کا نام ہے، اس لیئے اگر یہ سچ ہے کہ قیامت مین نئی زندگی ملیگی، تو ظاہر ہی کہ موت کے بعد کی کیفیت اور صورت سے کوئی الگ صورت اور کیفیت ہوگی جس کا نام حیاتِ ثانیہ رکھا گیا ہی، اور وہ یہ ہے کہ روح کا دوبارہ تعلق جسم کیساتھ تسلیم کیا جائے ورنہ غیر جسمانی زندگی تو قیامت کے پہلے بھی تھی اب نئی بات کیا پڑ گئی جس کا نام حیاتِ ثانیہ رکھدیا گیا

گو روح انسانی جسم کے اندر ہر فعل کی فاعل ہے مگر فاعل کے فاعل بننے کے لیئے آلات اور اوزار کی بھی ضرورت ہوتی ہی جن کے بغیر وہ اپنے فعل کے بجالانے سے مجبور رہتا ہی، اسی طرح

روح اپنے فعلِ لذت والم کے انجام دینے کے لئے ... جسمانی آلات اور اوزار کی محتاج ہو کر لذت والم کا کوئی روحانی احساس جسمانیت کے شائبہ سے مبرا ہو کر ہو ہی نہیں سکتا، اس بنا پر روح محض کا جنت کی لذتوں سے متمتع یا دوزخ کی تکلیفوں سے متالم ہونا کسی جسمانی وساطت کے بغیر تصور میں نہیں آتا، خواب میں دیکھ کر روح کو جو لذت یا تکلیف پہنچتی ہے، اس میں بھی جسمانی پیکر و ہیکل کی صورت نمودار ہوتی ہے

جسم وجید | حشر جسمانی ماننے کے بعد یہ بحث بے سود ہے کہ آیا وہی جسم دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جا سکتا جس کے قالب میں وہ روح پہلے دنیا میں رہتی تھی، یا کسی دوسرے نئے جسمانی پیکر و ہیکل کی روح پھونکی جائیگی یا یہ کہ آئندہ جسم اپنی مادیت اور ترکیب میں اسی دنیاوی جسم کے مماثل ہوگا، جب کہ یہ حقیقت ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اعمال کی ذمہ داری روح پر ہے، جسم پر نہیں، اور اسی طرح جزا و سزا کی راحت و تکلیف کا اصلی مورد روح ہی ہے جسم نہیں، تو پھر اب وہ کسی قالب میں بھی ہو، اور کسی رنگ میں بھی ہو، روح پر مواخذہ، اور ثواب و عذاب کی لذت والم کا احساس یکساں ہوگا البتہ یہ ضروری ہے کہ جو جسم ہم کو دوسری دنیا میں ملے گا، اسکی خصوصیات و لوازم اس خاکی جسم کے خصوصیات و لوازم سے بالکل الگ ہوں گے، چنانچہ خود ہمارے تخیل اور تصور اور نیز خواب ورویا میں جو جسم ہم کو نظر آتا ہے وہ جسم ہو کر نظر آنے کے باوجود مادی جسمانیت سے سراسر پاک ہوتا ہے، اسلئے لفظِ جسم کے بولنے سے ان ہی خصوصیات کا جسم سمجھ لینا ضروری نہیں ہے، اور نہ اس جسم پر قیاس کر کے اُس جسم پر اشکالات وارد کئے جا سکتے ہیں؛

خلق جدید | چنانچہ جو جسم قیامت میں عنایت ہوگا، وہ نئی خلقت اور نئی آفرینش کا ممنون ہوگا اسی لئے قرآن نے منکروں کے جواب میں یہ کہا ہے کہ

بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ (ق ا)	بلکہ یہ لوگ نئی آفرینش سے شک میں ہیں،

منکرین کی زبان سے کہلوایا،

ءَ اِنَّا لَمَبْعُوثُوْنَ خَلْقًا جَدِيدًا (اسراءؑ)	کیا ہم درحقیقت نئی آفرینش کرکے اٹھائے جائینگے

ایک دوسری سورہ میں یہ تلقین ہے،

اِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ، (سبا-۱)	بیشک تم ایک نئی آفرینش میں ہونیوالے ہو

پھر تمثیل دیکر فرمایا،

كَمَا بَدَأْنَا اَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهٗ،	جس طرح ہم نے پہلی پیدایش کا آغاز کیا،
(انبیآء-۷)	اسی طرح ہم اس کو دوبارہ بنائیں گے،

اسی لئے اُس عالم کی اس نئی خلقت وپیدایش والے جسم کو بعینہٖ اسی جسم کے مطابق سمجھنا صحیح نہیں ہے، اور نہ اس خاکی جسم کے تمام خصوصیات کا بعینہٖ اس جسم میں ہونا ضروری ہے، اس کو اگر اس عالم کے لفظ "جسم" سے تعبیر کیا جاتا ہے، تو اس لئے کہ ہماری زبان میں روح کے علاقہ وقالب کے لئے جسم سے بہتر، قریب تر اور مشابہ تر کوئی دوسرا لفظ نہیں،

یہ بات کہ حشر میں بعینہٖ گذشتہ گوشت وپوست کا ہونا اس لئے ضروری سمجھا جائے کہ وہ بھی عذاب ثواب میں شریک ہوں، تصریح قرآنی پر اضافہ ہے، قرآن میں تو یہ تصریح ہے کہ

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ	بے شبہہ جو لوگ ہماری آیتوں کے منکر ہوئے
نُصْلِيْهِمْ نَارًا، كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ	ہم اُن کو آگ میں ڈالیں گے، جب جب
بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا	اُن کی کھالیں پک جائیں گی، ہم اُن کو اُور

الْعَذَابَ ط اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَزِیْزاً	کھالیں دینگے، جو پہلی کھالوں کی غیر ہونگی تاکہ ؤ
حَکِیْماً ۝ (نساء۔ ۸)	عذاب چکھیں بیشک اللہ غالب اور حکمت والا ہے؛

جب کھالیں یکے بعد دیگرے بدلتی جائیں گی، تو پہلا حصۂ جسم جو گناہ میں شریک تھا، کہاں باقی رہا؟ اسی طرح یہ تصریح ہے کہ انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھالیں اس کے اعمال پر شہادت دیں گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ اصلی مجرم جو ان اعمال کا ذمہ دار اور اس مقدمہ کا مدعا علیہ ہے، ان جسمانی اعضا کے علاوہ ہے، اور وہ روحِ انسانی ہے،

ذمہ داری روح پر ہے | یہی سبب ہے کہ موت و حیات، عذاب و ثواب اور اعمال کے مواخذہ کا اسلام نے جس سے تعلق بتایا ہے، وہ نفس یعنی روح ہے،

اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ یّٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا	تو (قیامت میں) کوئی نفس یہ کہنے لگے کہ ہے
فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْۢبِ اللّٰہِ (زمر۔ ۶)	افسوس اس پر کہ میں نے اللہ کے پہلو میں کمی کی؛
وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ،	اور چاہئے کہ ہر نفس دیکھے کہ اس نے کل (قیامت)
(حشر۔ ۳)	کے لئے کیا، آگے بھیجا،
عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ (تکویر۔ ۱)	(اس دن)، ہر نفس جان لیگا جو اس نے حاضر کیا
عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ	(اس دن) ہر نفس جان لیگا جو اس نے آگے
(انفطار۔ ۱)	بھیجا، اور پیچھے چھوڑا،
فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْئًا ۝ (انبیاء۔ ۴)	(تو اس دن) کسی نفس پر کوئی ظلم نہ ہوگا،

جنّت کی نسبت ہے،

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنۡ — کوئی نفس نہیں جانتا کہ ان کیلئے (جنت میں)

قُرَّةِ اَعْيُنٍ (سجدہ - ۲) — کیا آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے،

ان آیتوں میں دیکھو کہ عمل کی ذمہ داری اور اس کے اچھے اور برے نتیجوں کا بار جسم پر نہیں، بلکہ روح اور نفس پر ڈالا گیا ہے، اور اسی کو تکلیف و لذت سے آشنا کیا گیا ہے جنت میں داخلہ کی خوشخبری بھی اسی کو دی گئی ہے،

فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ — اے مطمئن روح! میرے بندوں میں شامل

(فجر - ۱) — اور میری جنت میں داخل ہوجا،

دنیا وہی جسم بدلتے رہنے پر بھی وہی جسم رہتا ہو

غرض اعمال اور اُن کے نتائج کی اصل ذمہ دار جنت و دوزخ کی لذت والم کی اصل احساس کرنے والی ہستی صرف روح ہو اور جسم کی حیثیت صرف ایک لباس وآلۂ احساس کی ہے، اس سے زیادہ اسکی کوئی حیثیت نہیں یہ جسم لاکھ بار بدلے، مگر روح اگر وہی ہے، تو وہ انسان وہی ہے اور اسی کو اپنی ذمہ داری کی جزا و سزا مل رہی ہے،

لوگ اپنی ظاہر بینی سے اصل زور جسم پر دیتے ہیں۔ حالانکہ اس مٹی کے ڈھیر میں اگر روح کا خزانہ چھپا نہ ہوتو پھر اس مشتِ خاک میں دھرا کیا ہے، دیکھو انسان بچپن سے لے کر بوڑھاپے تک وہی ایک شخص ہے جو پہلے تھا، حالانکہ اُس کی جسمانی ہیئت اور اُس کے جسم کا مادہ ہر آن اور ہر لمحہ فنا ہوکر، بدلتا ہے، بیماریوں میں وہ سوکھکر کانٹا ہوگیا، پھر تندرستی کے بعد نئے ذرات داخل ہوکر لہلہانے، ہم غلطی سے یہ سمجھتے ہو کہ ہر حال میں وہی جسم یکساں طور پر قائم ہو حالانکہ حکیم سے پوچھو

تو وہ بتائیگا کہ اس کے ذرے کیونکر آن بہ آن جھڑتے اور گھستے رہے اور جو خوراک وہ کھاتا رہا وہ خون ہو کر کیونکر بدل ما تحلیل بنی، اور اُن کی جگہ لیتی رہی، پھر کیا ایسے ہر آن فنا ہوتے رہنے والے اور چند سال کے بعد بالکل بدل جانے والے کو دائم الوجود اعمال کا ذمہ دار اور ان کے نیک و بد کی اصلی جزا یا سزا پانے کا مستحق ٹھہرایا جا سکتا ہے، لیکن جس طرح دنیا میں اگر کوئی مجرم آج بھاگ گیا، اور چند سال کے بعد پکڑ کر جب لایا گیا، تو وہ یہ عذر نہیں کر سکتا کہ چونکہ وہ ہاتھ جس سے اُس نے چوری کی تھی اور وہ پاؤں جن سے وہ مال لیکر بھاگا تھا، اس عرصہ دراز میں بدل گئے ہیں، اسلئے وہ لائق تعزیر نہیں کیونکہ وہ روح جس نے اپنے ارادہ و نیت سے اس کام کو اُسکے ہاتھوں اور پاؤں کے ذریعہ کرایا تھا جس طرح کل بھی بعینہٖ آج بھی ہے، اور جو تکلیف اُس کو اپنے پہلے جسم کے ذریعہ کل پہنچ سکتی تھی، بعینہٖ آج بھی پہنچ سکتی ہے اور اس جسمانی تغیر سے اسکی رُوحانی شخصیت میں اصلاً کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا، اسلئے پہلے ہی جسم کے ضروری ہونے پر زور دینا بے سود ہے، اسی سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ جسم اگر بدل بھی جائے تو اعضاء کی شہادت کا مسئلہ اپنی جگہ پر صحیح ہوگا، جسم کے اعضاء دنیا میں بدلتے جاتے ہیں، مگر جو بیماری اگلے اجزاء میں پیدا ہوگئی تھی وہ اُن کے فنا ہو جانے کے بعد بھی قائم رہتی ہے، مٹ نہیں جاتی، بلکہ وہی ان کے بعد کے آنے والے اجزاء میں برابر سرایت کرتی رہتی ہے،

اُخروی جسم کیسا ہوگا

روحوں کو آخرت میں جو جسم ملیں گے وہ حقیقت میں اُن کے اعمال ہی کے ظل و عکس ہوں گے، یعنی جیسے اعمال ہوں گے ویسے ہی اُن کو جسم عنایت ہوں گے، چنانچہ اس دنیا کے جسمانی رنگ کے لحاظ سے خواہ کوئی کالا ہو یا گورا، مگر اس دنیا میں اس کا یہ کالا پن اور گورا پن اعمال کی سیاہی و سپیدی کی صورت میں بدل جائے گا، خدا نے فرمایا :-

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ وَّوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ، تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ (عبس ۱)

کتنے چہرے اُس دن روشن ہنستے اور شاد ہونگے اور کتنے چہروں پر اُس دن کدورت ہوگی، اُن پر سیاہی چھائی ہوگی،

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ، وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (ال عمران ۱۱)

جس دن کتنے چہرے سپید ہوں گے اور کتنے کالے لیکن جن کے چہرے کالے ہوئے کیا تم وہ ہو جو ایمان کے بعد پھر کافر ہوگئے تھے تو اپنے کفر کرنے کے بدلہ عذاب کا مزہ چکھو، اور جن کے چہرے سپید ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، اسی میں سدا رہیں گے،

صحیح حدیثوں میں ہے کہ جنت میں سب لوگ جوان بن کر داخل ہونگے اور جسم پر کبھی بڑھاپا نہیں آئیگا، اُن کا قد حضرت آدمؑ کے اولین بہشتی قد کے مطابق ہوگا، دوزخیوں میں سے کسی کا سر پہاڑ کے برابر ہوگا کسی کا ایک پہلو مفلوج ہوگا کسی کے ہونٹ لٹکے ہونگے، دل کے اندھے آنکھوں کے اندھے بن کر اٹھیں گے، سزاؤں کے بعد جب اُن کے جسم چورچور ہو جائیں گے، تو پھر صحیح وسالم نئے جسم ہوا ہوں گے، اور پھر اُن کی وہی کیفیت ہوگی، یہ بھی آیا ہے کہ جو اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں، وہ چیونٹی بنکر قیامت میں اٹھیں گے ان تمام شواہد سے ہویدا ہے کہ اس دنیا کے جسمانی قالب ہمارے اس دنیاوی جسم کے مطابق نہیں، بلکہ ہمارے دنیاوی اعمال کے مطابق ہوں گے،

جزا او رسزا

"یوم آخر" یا "یوم دین" پر ایمان لانے سے اسلام کا حقیقی منشا، یہ ہے کہ لوگ اُس کا یقین کرین کہ اُن کے ہر عمل کا بدلہ ہے کچھ اس دنیا میں، اور پورا دوسری دنیا میں، اسی کا نام جزا وسزا ہے دنیا کے دوسرے مذاہب بھی اس مسئلہ مین اسلام کے ہمنوا ہین،

جزا وسزا دیگر مذاہب میں

درحقیقت مذاہب کا حقیقی تعلق اسی عقیدہ سے ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور اچھا یا بُرا جیسا کام اس سے صادر ہوتا ہے، اس کے مطابق اچھا یا بُرا معاوضہ اس کو دوسری دنیا میں ضرور ملیگا، اس عقیدہ کا نشان مصر و بابل جیسی دنیا کی قدیم قومون میں بھی ملتا ہے ہندوستان کے مذاہب مین اس دوسری دنیا کو دوسرے جنم سے تعبیر کیا گیا ہے اُن کا خیال یہ ہے کہ انسان جب مرتا ہے تو اس کے اچھے یا بُرے کامون کے مطابق اس کی روح کسی جانور یا گھاس پھوس یا درخت کے قالب مین جاکر اپنے عمل کا نتیجہ بھگتتی ہے، اور پھر انسانون کے قالب میں لائی جاتی ہے اور کام کرتی ہے اس کے بعد جس کے گناہ زیادہ ہوتے ہیں، اس کو یم لوک میں جانا پڑتا ہے، جہان نرک (دوزخ) ہیں، وہان وہ ہر قسم کی سزا بھگتتی ہے، بعدازین اپنے بعض اچھے کامون کی بدولت چندر لوک (چاند کی دنیا) میں جاتی ہے، جس روح کے کچھ کام اب بھی باقی ہین

وہ اس دنیا میں ہوا، بادل اور بارش کے ذریعہ سے دوبارہ آتی ہے۔ اور اپنے کام کے مطابق
حیوانات یا نباتات کے روپ میں سزا پاتی ہے، اور پھر چھوٹ کر انسان بنتی ہے۔ یہاں تک کہ
اُس کے کام اتنے اچھے ہو جائیں کہ وہ سزا کے قابل نہ رہ جائے، اس وقت وہ مادی قالبوں
کی قید سے نجات پاکر سورج لوک اور چندر لوک وغیرہ اجسام سماوی کی دنیاؤں میں جا کر
آرام کرتی ہے، اور پھر اپنے علم و عمل کی کسی کمی کے سبب بادل، ہوا، اناج یا کسی دوسری
مخلوقات کے قالب میں ہو کر اس کو اس دنیا میں پھر آنا پڑتا ہے، اور پھر وہی عمل شروع ہوتا ہے
یعنی وہ نئے نئے جنموں میں سزا بھگتتی ہے، اور اس وقت تک آمد و رفت اور آواگون کے چکر
میں پھنسی رہتی ہے جب تک اس سے اچھے یا بُرے کاموں کا صدور ہوتا رہتا ہے، اس لئے کامل
اور دائمی نجات کی صورت یہ ہے کہ انسان سے اچھا یا بُرا کوئی کام صادر ہی
ہو یعنی ترکِ عمل، روح کو مادہ کی قید سے آزاد کر کے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا (موکش) دلاتا ہے، یہاں تک
کہ موجودہ مادی دنیا پرلے (قیامت) کے بعد جب پھر نئے سرے سے بنے گی تو پھر وہی عمل اور
سزا یعنی آواگون کا چکر شروع ہو گا، اور پھر اسی طرح ہمیشہ چھٹکارا پائے گی، اور پھر دوسرے
پرلے کے بعد نیا دور اسی طرح شروع ہو گا، یہ چکر اسی طرح ہمیشہ رہے گا،

یہ وہ چکر ہے جس سے انسان کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہو گا، اِلّا یہ کہ ہمالہ کی چوٹی یا غار میں
بیٹھکر ترکِ عمل کے ذریعہ سے خود اپنے وجود سے ہاتھ دھو لیا جائے، لیکن اگر اس اصولِ نجات پر
دنیا عمل کرے تو یہ بہارستان دم کے دم میں خارستان بن جائے، ہر قسم کا کاروبار بند ہو کر دنیا آپ
سے آپ فنا کے قریب آجائے، بدی کے ساتھ نیکی کا وجود بھی صفحۂ ہستی سے مٹ جائے، اور یہ ایک ہم

دائمی وابدی نجات میسر نہ ہو، کیونکہ ہر یگ کے بعد نیا جنم، اور کرم اور آواگون پھر شروع ہوتا ہے،
لیکن دنیا کے دوسرے مذاہب نے اس چکر اور بے عملی سے انسان کو نجات دلائی ہے، انھوں نے
موجودہ دنیا کے بعد ایک ہی دنیا اور تسلیم کی ہے جس میں لوگوں کو اچھے اور بُرے اعمال کی پوری
پوری جزا ملے گی، مختلف زردشتی فرقوں نے آریہ نسل ہونے کے باوجود ہندوؤں کے تناسخ کے بجائے
مختلف سامی مذاہب کے خیالات کی نقالی کی ہے، اور خصوصًا بعد والوں نے اسلام کے عقائد کو "ارواک
ویراف" کے عجیب وغریب مشاہدات کا رنگ دیکر اور اس کی کتاب کو اسلام سے بھی پہلے کی قرار
دیکر تمام تر قبول کرلیا ہے[۱]،

صحیفۂ ابراہیم یعنی سفر تکوین میں دنیا کی محنت ومشقت اٹھانے کے بعد پھر جنت میں داخلہ
کا اشارہ ہے، (تکوین ۲-۱۹) علیٰ ہذا حضرت موسیٰؑ کے صحیفوں میں اخروی جزا وسزا کے اصول مذکور
ہیں نیکو کاروں کے لئے "ایک ستھری آبادی" کا ذکر ہے، جس میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں، بدکاروں
کے لئے ہلاکت، بربادی اور دردناک عذابوں کی خبر ہے، مگر مترجموں نے ہر جگہ اس کو دنیا دی
ثواب وعذاب بلکہ ارضِ موعودہ کی ظاہری سلطنت کے معنوں میں دکھایا ہے، حالانکہ بعض مقامات
میں یہ بے جوڑ سی بات ہو کر رہ گئی ہے، حضرت آدمؑ کی جنت عدن اور اس کے چار دریاؤں کا ذکر
تکوین کے دوسرے باب میں ہے، علاوہ ازیں تورات میں موت کے بعد کی زندگی کی تصریح ملتی ہے،
حضرت ابراہیمؑ (پیدائش ۲۵-۸) اور یعقوب علیہما السلام (پیدائش ۴۹-۳۳) کی موت کی

---

[۱] تناسخ کے رد میں الندوہ مئی وجون ۱۹۰۶ء میں ایک مضمون ہے، دبستان المذاہب کا مصنف جو زردشتی مذہب سے پوری واقفیت رکھتا تھا، اس نے اپنی کتاب میں اسکی پوری تفصیل درج کی ہے،

تعبیر ان لفظوں میں کی گئی ہے کہ "جان بحق ہوا، اور وہ اپنے لوگوں میں جا ملا" ساتھ ہی ہمیشہ کی بھلائی (استثنار ۶-۲۴) کا بھی تذکرہ ہے، اور "جہنم کی آگ" (استثنار ۳۲-۲۲) کا بھی بیان ہے اور ہرایک کو "اس کے عمل کا بدلہ" دیئیے جانے کی بھی تصریح ہے، (یرمیا، ۱-۱۱) روح کی بقا اور آسمان پر چڑھنے کی تعلیم بھی اُن صحیفوں میں موجود ہے، (واعظ ۳-۲۱) مرنے کے بعد روح کے خدا کے پاس واپس پھر جانے کا بھی تذکرہ ہے (واعظ ۱۲-۷) اور "انسان کے اپنے ابدی مکاں میں جانے" کی بھی تصریح ہے، آخر میں ہے "خدا سے ڈر اور اس کے حکموں کو مان کہ انسان کا فرض کلی یہی ہے، کیونکہ خدا ہر ایک فعل کو ہر ایک پوشیدہ چیز کے ساتھ خواہ بھلی ہو خواہ بری عدالت میں لائے گا" (واعظ ۱۲-۱۳-۱۴) زبور میں خدا کی عدالت کے دن کی تصریحات بار با ہیں، امثال سلیمانی میں ہے کہ "انسان کی راہیں خداوند کی آنکھوں کے سامنے ہیں اور وہ اسکی ساری روشوں کو جانچتا ہے، شریر کی بدکاریاں اُس کو پکڑلیں گی، اور وہ اپنے ہی گناہوں کی رسیوں سے جکڑا جائے گا، وہ بے تربیت پائے مرجائے گا، اور اپنی جہالت کی شدت میں بھٹکتا پھرے گا" (۵-۲۱) دانیال میں ہے کہ "اُس وقت بہتیرے جو زمین میں خاک پر سورہے ہیں، جاگ اٹھیں گے، بعضے حیات ابدی کے لئے اور بعضے رسوائی اور ذلت کے لئے" (۱۲-۲) حزقیال (۲۸) میں جنت کی طلائی، اور جواہرات کی بنی ہوئی عمارتوں کے اشارات ہیں،

حضرت مسیح سے پہلے یہودیوں میں صدوقی نام ایک فرقہ پیدا ہوا جس نے حکمران یونانیوں کا تقرب حاصل کرنے کے لئے ان کی بعض باتیں قبول کر کے یہودی تعلیم میں شامل کیں[1]، منجملہ اُن کے وہ

[1] برٹش انسائیکلوپیڈیا مضمون صدوقیین، (صدوکیز)

قیامت اور حیاتِ اُخروی کا بھی منکر ہوا، مگر اس کے مقابل کا دوسرا فرقہ جس نے اپنے کو فریسی (علیحدہ رہنے والا) کہا، اپنے پرانے عقیدوں پر قائم رہا۔ اور قیامت، حیاتِ اُخروی اور جنت و دوزخ کے عقائد کو بدستور مانتا رہا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں فریسی یہی اعتقاد رکھتے تھے کہ جنت مادی ہوگی، اور وہاں بہشتیوں کو اُن کی بیویاں واپس ملیں گی، (مرقس (۱۲-۲۴)) یہودیوں کی پچھلی کتابوں میں جزا و سزا کی تفصیل موجود ہے، چنانچہ اسلام کے زمانہ میں بھی عرب کے یہودی اس پر ایمان رکھتے تھے، اور کہتے تھے کہ یہود کیسے ہی گنہگار ہوں مگر چند روز سے زیادہ دوزخ میں نہیں رہیں گے، (بقرہ - ۸ و آل عمران - ۳) یہ چند روز باختلافِ روایت تین روز چالیس[1] روز یا گیارہ مہینے ہیں،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد میں یہودیوں کے ان دونوں فرقوں کے درمیان سخت اختلافات برپا تھے، اور دونوں ایک دوسرے کی تردید و ابطال میں مصروف تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آکر صدوقیوں کے اس عقیدہ کی تردید کی، اور قیامت اور جزا و سزا پر ایمان لانے کی تعلیم دی، حضرت عیسیٰؑ کے ایک حواری یوحنا نے اپنے مکاشفہ میں جنت اور دوزخ کی پوری تصویر کھینچی،

حضرت عیسیٰؑ کے اس جواب سے جو انھوں نے ایک صدوقی کے سوال کا دیا کہ "اس دنیا میں لوگ شادی اور بیاہ نہیں کریں گے، بلکہ فرشتوں کے مانند رہیں گے" ایسا سمجھا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے جنت کو صرف روحانی وجود بخشا ہے، مگر درحقیقت ایسا نہیں ہے، حضرت عیسیٰؑ

[1] کتب تفسیر میں ان آیتوں کی تفسیر دیکھو۔[2] سیل کا ترجمہ قرآن حاشیہ زیر ترجمہ آیت بقرہ رکوع ۸،

اپنی زندگی کی آخری شب میں اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھ کر جب انگور کا افشردہ پیتے ہیں تو کہتے ہیں!
"میں تم کہتا ہوں کہ انگور کے پھل کا رس پھر نہ پیوں گا، اس دن تک کہ تمھارے ساتھ اپنے
باپ کی بادشاہت میں نیا نہ پیوں" (متی ۲۶-۲۹)

وہ یہودی علماء کو خطاب کر کے فرماتے ہیں،

"اے سانپو! اور اے سانپوں کے بچو! تم جہنم کے عذاب سے کیونکر بھاگو گے" (متی ۲۳، ۳۳)

اپنے ایک وعظ میں دوزخ کا منظر دکھاتے ہیں، اور فرماتے ہیں:-

اس نے دوزخ کے درمیان عذاب میں ہو کے اپنی آنکھیں اٹھائیں اور ابرہام (حضرت ابراہیمؑ) کو دور سے دیکھا اور اس کی گود میں لعزر کو، اور اس نے پکار کے کہا کہ اے باپ برہام مجھ پر رحم کر اور لعزر کو بھیج کہ اپنی انگلی کا سرا پانی سے بھگو کے میری زبان ٹھنڈی کرے، کیونکہ میں اس لو میں تڑپتا ہوں" (لوقا ۱۶-۲۳)

مکاشفاتِ یوحنا میں دوزخ کو "آگ اور گندھک" کہا گیا ہے، (۱۴-۱۰) اور متی کی انجیل میں اس کے دروازے بھی بتائے گئے ہیں، (متی ۱۶-۱۸) اسی طرح جنت اور اس کی طلائی جواہراتی تعمیر اور نہرِ آبِ حیات کا ذکر مکاشفات کے اکیسویں باب میں ہے اور وہاں کے انگوری افشردہ کا بیان متی میں ہے، (۲۶-۱۹) وہاں کے آبِ سرد کا ذکر بھی انجیل میں آتا ہے (لوقا ۱۶-۲۳)

اسی طرح ہر ایک کے عمل کا حساب لیئے جانے اور عمل کے مطابق بدلہ ملنے کا ذکر بھی حواریوں کے خطوط میں موجود ہے،

"مبارک وہ مرد ہے جس کے گناہوں کا حساب خداوند نہ لیگا، (رومیوں ۴-۸)

تسو ہر ایک ہم میں سے خدا کو اپنا حساب آپ دیگا" (رومیوں ۱۴-۱۲)
"لیکن وے اس کو جو زندون اور مردوں کا انصاف کرنے پر تیار ہے حساب دینگے"
(اول پطرس ۴-۵)

اس باب میں اسلام کا تکمیلی پہلو یہ ہے کہ اُس نے اس عقیدہ کو نہ صرف پوری تفصیل کیساتھ بیان ہی کیا بلکہ اس کے تمام ضروری اجزار فراہم کئے، گذشتہ مذاہب کے تشنہ بیانات پر سیرحاصل بحثیں کیں، اُن کے نقائص کی تکمیل کی، اور سزا و جزا کے اصول اس صفائی سے بیان کئے کہ اس عقیدہ کا ہر پہلو شکوک وشبہات سے پاک ہوگیا،

آیندہ مباحث کے سمجھنے کے لئے پہلے چند اصول ذہن نشین کر لینے چاہئین،

عالم آخرت کا فہم وادراک | اُس عالم آخرین جو کچھ ہوگا وہ اگرچہ ہمارے اس زیر تجربہ زیر مشاہدہ مادی عالم سے بالکل الگ ہوگا، تاہم چونکہ انسانی فہم کی مجبوری کی وجہ سے وہ اسی زبان نہ محاورات مین ادا کیا گیا ہے، جو اس مادی عالم کے ساتھ مخصوص ہین، اس لئے یہ الفاظ جن مادی خصائص کو مستلزم ہیں، یا ہم اُن کے دیکھنے اور سننے کے اس دنیا میں عادی ہوگئے ہیں، ان لفظون کو سنکر بعینہٖ وہی سمجھنا چاہتے ہیں جو اس دنیا مین اُن لفظون سے سمجھتے رہے ہین، اسی سبب سے بعض کم فہم وہان کے وقائع واحوال کا بیان سُن کر اُن مین سے بعض کو محال اور ناممکن کہہ اٹھتے ہین، اور بعضے اُن کی تشریح وتاویل اس طرح کرتے ہیں کہ لفظ ومعنی میں ادنی اشتراک بھی باقی نہیں رہتا، یہ دونون راستے سخت خطرناک ہین، اسی لئے وحی محمدیؐ نے ان نازک ودقیق اسرار کے بیان مین انسانی فطرت کی کمزوریون کا پورا لحاظ کیا ہے، اس نے نہ تو یہودیوں کی طرح ان واقعات

کو سرتاپا مادی کہہ کر عالمِ آخرت کو بھی عالمِ آب و گل بنا دیا ہے، اور نہ عقل و خرد کے بعض نادان عیون کی طرح اُن کو مادہ سے اتنا بلند و برتر کر دیا ہے کہ اُن کا وجود ہی موہوم و فرضی ہو گیا ہے بلکہ انسانی عقلوں کے اختلافِ مراتب کا لحاظ کر کے بزم کے اہلِ نظر اور تماشائیوں دونوں کی تشفی اور تسکین کا سامان بہم پہونچایا ہے،

ان اخروی وقائع کے مختلف مفہوموں اور مصداقوں کا لحاظ کر کے وحیِ محمدی نے ایسے جچے تلے الفاظ اختیار کئے ہیں جن سے ایک فلسفی بھی بہرہ یاب ہو سکتا ہے، اور ایک عامی بھی، اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے ایمان کا لطف اٹھا سکتے ہیں، اور ایک ایسے مذہب کے لئے جو سارے انسانی طبقوں کو اپنا مخاطب بنانے کا دعوی کرتا ہے، ایسی ہی وسعت کی ضرورت تھی تاکہ وہ سب کے لئے اپنی اپنی جگہ پر تشفی کا باعث ہو سکے، ان تمام اُخروی واقعات کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے، وہ ظاہر ہے کہ طبعًا وہی الفاظ ہو سکتے ہیں، جن کے چاروں طرف اس دنیا کا مادی ماحول، مادی مفہوم و مصداق اور جسمانی تخیلات لپٹے ہوئے ہیں، ان لفظوں کے سننے کے ساتھ جو مفہوم ہمارے ذہن میں آتا ہے وہ سرتاپا انہی مادی قیود و لوازم کے ساتھ آتا ہے، ہم جب "آگ" کا لفظ سنتے ہیں، تو معًا اس دنیاوی آگ کا مفہوم ذہن میں آتا ہے، جس کو ہم یہاں دیکھتے ہیں، جو انسانوں، درختوں اور ہر اُس چیز کو جو اس کے اندر ہوتی ہے، بلاتمیز یکساں جلا دیتی ہے، مگر اخروی آگ ایسی نہ ہوگی، اس کے اندر بعض درخت ہوں گے جو نہیں جلیں گے، وہ صرف گنہگار انسانوں کو جلائیگی، کسی کے پاؤں کو چھوئیگی کسی کی کمر تک آئیگی کسی کے گلے تک پہنچے گی، اور وہ ایسی تیز و گرم ہوگی کہ یہ دنیاوی آگ اُس کے مقابلہ میں ٹھنڈک ہے، دنیا

کا لفظ سننے کیساتھ اس عالم میں تولنے کی ساری خصوصیتیں ہمارے سامنے آجاتی ہیں، ترازو، پاسنگ، پلے، ڈنڈی اور تولی جانے والی چیزوں میں جسمیت اور ثقل کا ہونا، اسی طرح نامۂ عمل کے لکھنے کا مفہوم جب ہم سمجھنا چاہیں، تو کاتب کی انگلیاں، قلم، دوات، سیاہی، کاغذ اور حروف کی ساری قیدیں ہمارے ذہن میں آئیں گی، اس بنا پر ان الفاظ کے لغوی معنوں اور اُن کے قریب الفہم مجازی معنوں کے سمجھنے میں اختلافِ آرا کی بڑی گنجائش ہے اس لئے حق تو یہ ہے کہ ان پر بلا مزید تشریح اس طرح ایمان لایا جائے کہ ہماری تشریح سے اُن کے الفاظ کے مفہوم کی وسعت تنگ نہ ہوجائے بااین ہمہ ان لوگوں کو بھی دائرہ سے خارج نہ کیا جائے، جو ان الفاظ سے وہ مفہوم سمجھ کر تسلی پانا چاہتے ہیں، جن کے وہ الفاظ متحمل ہو سکتے ہیں کہ اگر مرادِ الٰہی یہی تنگی ہوتی تو اللہ تعالیٰ انسانی عقلوں کے اختلافِ مراتب کا لحاظ کئے بغیر اپنے مفہوم کو اس وسعت کے بجائے تنگ سے تنگ الفاظ میں ظاہر فرما سکتا تھا، مگر ایسا نہیں کیا تاکہ اسلام مختلف العقول انسانوں کے لئے عالمگیر ثابت ہو سکے،

ایک دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ عالمِ آخرت کے وقائع اور حالات کے سمجھنے میں اشکالات واعتراضات اسلئے پیش آتے ہیں کہ ہم وجود اور اُس کے موجودہ تمام قوانینِ فطرت کو اس طرح لازم وملزوم سمجھتے ہیں کہ جب کسی شے کے وجود کا تذکرہ کیا جائے گا تو معاً اُس کے وہی خصوصیات ولوازم سامنے آئیں گے جن کے دیکھنے کے ہم اس دنیا میں عادی ہیں، حالانکہ اربابِ عقل نے یہ طے کر دیا ہے کہ اس موجودہ دنیا کے معلولات ومسببات اور اُن کے موجودہ علل واسباب میں جو لزوم ہے وہ محض عادی ہے یعنی اسلئے ایسا ہے کہ ہم ایسا دیکھتے ہیں، یہ نہیں کہ اسلئے ایسا ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہیے،

اس بنا پر اگر صرف اتنی سی بات ذہن نشین کر لیجائے کہ موجودہ مادی دنیا میں جو قوانین فطرت اور علل واسباب اور ان کے نتائج کارفرما ہیں وہ صرف اسی عالم اور موجودہ دنیا کے قوانین ہیں اگر خدا تعالیٰ کوئی نئی دنیا بنائے، یا نیا عالم خلق کرے تو ضروری نہیں کہ یہی موجودہ قوانین فطرت وہاں بھی کارفرما ہوں بلکہ بالکل ممکن ہو کہ اس نئے عالم میں نئے قوانین پر عمل ہو نئی خصوصیات کے جسم ہوں، نئی قسم کی زندگیاں ہوں، نئی قسم کی آگ ہو نئی قسم کے باغ اور اُن کے پھل ہوں نئی قسم کے موجودات ومخلوقات ہوں نئے علل واسباب ہوں اور نئے قوانین فطرت ہوں وحی محمدی نے اسی نئے عالم کے متعلق کہا ہے،

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ، (ابراهيم-۷) — جس دن یہ زمین نئی زمین سے بدل جائیگی اور آسمان، (نئے آسمانوں سے)

اب کون کہہ سکتا ہو کہ اس نئی زمین اور نئے آسمان میں بھی وہی مادی قانون جاری ہونگے جو اس موجودہ زمین وآسمان میں جاری ہیں، اس بنا پر جسمانیت ومادیت کے وہ تمام اعتراضات اور آیندہ حیات کے متعلق وہ تمام اشکالات جو اس دنیا اور اُس کے قوانین کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں بالکل بے بنیاد اور بے حقیقت ہیں،

اس ضروری تمہید کے بعد جزا وسزا کی اسلامی تشریحات کی جانب قدم اٹھایا جاتا ہے، وَهُوَ الهَادِي اِلَى الصَّوَاب،

اصول جزا اللہ تعالیٰ نے جس طرح موجودہ عالم کو اپنے خاص نظام اور قانون پر بنایا ہے جس کو اہل فلسفہ قانونِ قدرت اور اہل مذہب تقدیر اور اندازۂ الٰہی کہتے ہیں، اسی طرح اُس نے اپنے عالم کے لئے ایک نظام اور تقدیر قائم کی ہے جس کے مطابق اس عالم کا کاروبار انجام پاتا ہے

انسان غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ یہ اصولِ فطرت صرف مادیات تک محدود ہین، حالانکہ مادیات ہون، یا روحانیات، ذہنیات ہون یا عملیات، ہرایک میں یہ یکسان جاری وساری ہیں جس طرح یہ قانونِ فطرت ہے کہ زہر کھانے سے انسان کا جسم مرجاتا ہے، اسی طرح یہ بھی اصولِ فطرت ہے کہ گناہ سے اسکی روح مرجاتی ہے اور جس طرح اصولِ حفظانِ صحت کی عدم پیروی سے انسان بیمار ہوجاتا ہے اسی طرح اصولِ تزکیۂ قلب کی عدم متابعت سے بھی وہ مریض ہوجاتا ہے، پھر جس طرح دوا و اصولِ حفظانِ صحت کی پابندی سے وہ اپنی جسمانی بیماری کے آلام سے نجات پاتا ہے ایسا ہی روحانی تدابیر علاج کے ذریعہ بھی وہ شفایاب ہوتا ہے،

اعمال کے لوازم ونتائج غرض جس طرح دنیا مین ہر چیز کی ایک خاصیت ہے اور وہ جب یہان وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کیساتھ اس کے خواص وآثار بھی پیدا ہوتے ہیں اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات واعمال کے بھی کچھ آثار ولوازم ہیں، جو اس سے الگ نہیں ہوسکتے، غرور اور خاکساری بخل اور فیاضی انتقام اور عفو، شجاعت اور بزدلی، تقوی اور فسق، ایمان اور کفر ہرایک کا ایک نہ ایک اثر ونتیجہ ہے اور ہرایک کے کچھ نہ کچھ خصائص ولوازم ہین، جو اس سے اسی طرح الگ نہیں ہوسکتے، جس طرح سنکھیا سے سمیت، شکر سے مٹھاس، اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہوسکتی، اوران معنوی، روحانی، اور نفسیاتی چیزون مین علت ومعلول کا وہی لزوم ہے، جو جسمانی، مادی اور طبعیاتی اشیاء میں ہے،

اشخاص کی نیکوکاری وبدکاری، اور افراد کی سعادت وشقاوت کے جو اصول ہین وہی حکم عین ان اور قومون کی صلاح وفساد، اور سعادت وشقاوت پر بھی حاوی ہیں، جس طرح ایک سائنٹسٹ (حکیم) کا کام ان مادی فزیکل اصول کو جاننا اور بتانا ہے اور اسکی تعلیم کا نام ہماری اصطلاح میں حکمت (سائنس) ہے اسی طرح ان روحانی اسباب وعلل اور آثار ونتائج کو جاننا اور بتانا، انبیاء علیہم السلام

کا کام ہے اور اُن کی اس تعلیم کا نام شریعت ہے، انبیاءؑ کی اس تعلیم کے مطابق ہم کو اعمال کے روحانی آثار و نتائج کا وہی یقین ہونا چاہئے جو ایک حکیم کی تعلیم کے مطابق ہم کو جسمانی اشیاء کے خواص اور آثار کا ہوتا ہے، سائیکالوجی (علم النفس) اور سوشیالوجی (علم الاجتماع) کی وسعتِ تحقیق نے اس مفہوم کے سمجھنے مین اب بہت کچھ سہولت پیدا کر دی ہے،

عقاب و ثواب ردّ عمل ہے۔

الغرض یہ مادی و جسمانی دنیا علت و معلول اور عمل و ردِّ عمل کے جس اصول پر مبنی ہے اسکی وسعت کے دائرہ میں انسان کا ہر قول اور ہر عمل شامل اور داخل ہے یہی سبب ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام اسلام مین عقاب اور اعمالِ صالحہ کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب رکھا گیا ہے، قرآن نے انہی دونون اصطلاحون کو بار بار استعمال کیا ہے، عقاب کا لفظ عقب سے نکلا ہے، جس کے معنی پیچھے کے ہیں، اس لئے عقاب اُس اثر کا نام ہے جو کسی فعل کے کرنے کے بعد لازم آجاتا ہے، اور ثواب کا لفظ ثوب سے لیا گیا ہے، جس کے معنی لوٹنے کے ہیں، اس لئے یہ کسی اچھے کام کے لوٹنے والے نتیجہ اور جزاء کے معنی میں بولا گیا ہے،

اسی ایک مسئلہ کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو جزاء اور سزا کے شرعی اصول کے سمجھنے مین کوئی دقت نہ ہو، چنانچہ قرآن پاک میں یہ کئی دفعہ فرمایا گیا ہے،

اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (جاثیہ ۴) جو تم کرتے تھے وہی آج بدلہ پاؤگے،

اس سے معلوم ہوا کہ جزاء و سزا ہماری ہی اعمال کے ردِّ عمل (ری ایکشن) کا نام ہے ایک اور جگہ ہے

لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى (طٰہٰ ۱-) تاکہ ہر جان کو اس کا بدلہ دیا جائے جو وہ کرتی تھی

ان آیتون میں یہ صاف تصریح ہے کہ یہ جزاء اور سزا تمام تر ہمارے دنیاوی اعمال کے آثار و لوازم ہیں،

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (نحل ۴)

تو اُن کے بُرے کام اُن پر پڑے، اور ان کا ٹھٹھا کرنا اُن پر الٹ پڑا،

غرض جزا و سزا انہی اعمال کے نتائج کا دوسرا نام ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا اسی اصول کی تشریح میں یہ اشارہ فرمایا کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ فرمائیگا "اے میرے بندو! یہ تمھارے ہی اعمال ہیں جو میں تم کو لوٹا کر بیان دے رہا ہوں، تو جو کوئی جزائے خیر پاوے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جس کو برائی ملے وہ خود کو ملامت کرے[۵]"

حصول راحت کا اصول | یہ فطری قانون ہے کہ ہم کسی بڑی تکلیف سے اُسی وقت بچ سکتے ہیں جب اس کی خاطر ہم اس سے چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو برداشت، اور کسی بڑی خوشی کے حصول کے لئے ہم اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو قربان کرتے رہیں، **عاجلہ** یعنی موجودہ، اور **آخرۃ** یعنی آیندہ ان دونوں کا جب کبھی تقابل پیش آتا ہے تو دون ہمت اور پست خیال لوگ عموماً موجودہ (عاجلہ) راحت کو پسند کرکے آیندہ کی راحت کی فکر نہیں کرتے کہ اُن کی نگاہ میں موجودہ راحت گو چھوٹی ہے مگر نقد ہے اور آیندہ کی راحت گو بڑی اور خوش آیند ہو مگر وہ نسیہ ہے اور اُن کا اصول یہ ہے کہ نقد را بہ نسیہ مگذار" لیکن بلند ہمت اور عالی حوصلہ طبائع کا طریق عمل اس کے بالکل برخلاف ہے، فاتح اور کشور کشا آج اپنی جانیں جوکھم میں ڈالتے ہیں، تاکہ کل سلطنت انکے ہاتھ آئے تاجر اور سوداگر آج اپنے سرمایہ کو بازار کے سپرد کردیتے ہیں تاکہ دولتِ فردا سے بہرہ مند ہوں، ہر مہذب انسان اپنے بچہ کو بیس پچیس برس تک تعلیم و تربیت اور مشق و امتحان کی مصیبتوں کی آگ میں بے تامل جھونک دیتا ہے تاکہ اسکی

---

[۵] صحیح مسلم و ترمذی کتاب الزہد و مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۱۵۴، ۱۶۰ و ۱۶۵، و ادب المفرد بخاری باب الظلم،

آیندہ زندگی راحت و مسرت میں بسر ہو، لوگ اپنے سرمایۂ عزیز کو تکلیفیں اٹھا اٹھا کر جمع کرتے جاتے ہیں تاکہ کل اس سے زیادہ ضروری موقع پر اسکو کام مین لاسکین، اور تنگدستی کی بڑی تکلیف سے بچ سکین،

غرض اگر انسانون کی تمام کوششون پر ایک غائر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ کامیابی کے حصول کا یہی اصول انکے اندر جاری وساری ہے کہ تھوڑی سی تکلیف کو اس لئے برداشت کرلیا جائے کہ کسی بڑی تکلیف سے رہائی ملے، چھوٹی چھوٹی خوشیون کو اس لئے برباد کیا جائے کہ کوئی بڑی خوشی حاصل ہو، اور عارضی کامیابیون کو اس غرض سے قربان کیا جائے کہ کوئی پائدار اور دائمی کامیابی نصیب ہو، مگر یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ آیندہ کی خوشی و کامیابی کی فراوانی اور اس کے دوام و پائداری کا ہم کو یقین ہو، کیونکہ اگر ایسا یقین نہ ہو تو ہم کبھی اس ایثار و قربانی پر آمادہ نہ ہون، اسی کیلئے ایمان کی ضرورت ہے تاکہ ہمارے اندر یقین پیدا ہو جائے، اور ہم اس ایثار و قربانی کو خوشی خوشی گوارا کرلیں جن لوگون مین یہ یقین پیدا نہ ہوگا، ان سے یہ عظیم الشان قربانی بھی نہیں ہوسکتی، اسی لئے گنہگار انسانون کی یہ کیفیت قرآن نے بیان کی ہے،

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ	ہرگز نہیں، بات یہ ہے کہ تم موجودہ زندگی سے
الْآخِرَةَ ۝ (قیامت - ۱)	محبت رکھتے ہو اور آیندہ زندگی کو چھوڑتے ہو،

حالانکہ انسان اسی اصولِ کار کو اگر دنیا کی طرح آخرت کے معاملات مین بھی برتے تو اس کی کامیابی مین کوئی شک رہے آیندہ کا خیال کرکے موجودہ سے دست بردار ہو جانا یہی کامیابی کی کنجی ہے اور اسی اصول کے تحت میں دین و دنیا کی تمام نیکیون اور کامیابیون کا راز پوشیدہ ہے موجودہ عارضی لذت کو آیندہ کی دائمی لذت پر اور حال کی معمولی راحت کو مستقبل کی دیرپا راحت پر قربان

کردینا وہ سچائی ہے جس کے تسلیم کرنے سے کوئی انحراف نہیں کرسکتا، تم صبح خیزی کی معمولی تکلیف کو صحت کی دیرپا راحت کی خاطر قربان کرتے ہو، ورزش اور دوڑ دھوپ کی محنت کو اس لئے قبول کرتے ہو کہ کل کی پیری اور بیماری کی تکلیف سے تم کو وہ بچائے، غرض آج کی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو اٹھاؤ گے تو کل کی بڑی تکلیف سے تم کو نجات مل سکے گی، اور آج کی عارضی خوشیوں کو قربان کروگے تو کل کی دائمی خوشی نصیب ہوگی، یہی وہ فلسفہ ہے جس کو قرآن نے اس آیت میں ادا کیا ہے،

وَجَزَاهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا (دھر-۱)

اور خدا نے اُن کے صبر کرنے پر ان کو باغ اور ریشم کے کپڑے مزدوری دی،

یہ صبر کیا تھا؟ دنیا کی عارضی خوشیوں کی قربانی تاکہ آخرت کی بڑی خوشی حاصل ہو اور بہادائے نیکی اور احتراز جرم کی معمولی تکلیفوں کی برداشت تاکہ وہاں کی بڑی تکلیف سے نجات ملے، یہی سبب ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ یعنی جنت دنیاوی تکلیفوں سے، اور دوزخ دنیا کی معمولی خوشیوں سے گھری ہوئی ہے" نادان تقویٰ اور نیکی کی ان معمولی قیدوں سے گھبراتے اور گناہ کی عارضی وفانی لذتوں کے طلبگار ہوتے ہیں اس لئے آخرت کی بڑی تکلیف میں گرفتار ہوں گے اور وہاں کی ابدی لذت سے محروم رہیں گے اور جو دین و دنیا اور نیکی و تقویٰ کی ان معمولی تکلیفوں کو گوارا کریں گے اور گناہ کی عارضی لذتوں سے بچیں گے، وہ آخرت کی لاانتہا لذتوں سے شادکام ہوں گے یہی فلسفہ قرآن پاک کی اس آیت میں ادا ہوا ہے،

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ

لیکن جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو ناجائز لذتوں اور خوشیوں

هِيَ الْمَاْوٰى ، (نازعات - ۲) سے باز رکھا تو جنت اس کا ٹھکانا ہے،

نائہ عمل | ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جو چیز بھی ایک دفعہ پیدا ہو جاتی ہے، پھر وہ بے حکم خدا فنا نہیں ہوتی، اسی طرح افعال و اعمال بھی جو انسان سے ظہور پذیر ہوتے ہیں، وہ فنا نہیں ہوتے، موجودہ سائنس (جس نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ دنیا میں کوئی حرکت بھی پیدا ہو کر فنا نہیں ہوتی، یہانتک کہ فضا میں ہر آواز اور ہر صدا بھی جو کبھی بلند ہوئی ہو آج موجود ہے، اور ہمیشہ رہیگی اور ہم اس کو پکڑ پائیں تو سُن سکتے ہیں) وہ اعمال و افعال کے دوامِ وجود کے اسلامی عقیدہ کو قبول کرنے میں پس و پیش نہیں کر سکتی، دنیا کے ریکارڈ میں انسان کا ہر عمل و فعل ہمیشہ کے لئے گویا بھرا ہے

قرآنِ پاک نے اسی اصول کو اپنی ان آیتوں میں بیان کیا ہے،

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ، (یونس - ۳) اس وقت ہر جان جو اُس نے پہلے کیا اُس کو آزمالیگی،

كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ (طور) ہر آدمی اپنے عمل کے بدلہ گرو ہے،

كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ، (مدثر ۲) ہر جان اپنے عمل کے بدلہ گرو ہے،

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ، (زلزال) تو جو کوئی ایک چیونٹی بھر نیکی کریگا، وہ اسکو دیکھے گا، اور جو چیونٹی برابر بدی کرے گا، وہ اس کو بھی دیکھے گا،

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ (آل عمران ۳) جس دن ہر جان جو اُس نے اچھے کام کئے اُن کو موجود پائے گی، اور جو بُرے کام کئے وہ بھی

یہ بات کہ انسان کا ہر عمل فعل صحیفۂ عالم پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہوجاتا ہے، اس کو قرآن نے کئی طریقوں سے ادا کیا ہے،

ایک اس طرح کہ انسان کی زبان سے جب کبھی کوئی لفظ نکلتا ہے خواہ وہ کتنی ہی تنہائی میں بولا جائے خدائی شاہد اس کے سننے کو موجود رہتے ہیں، اور وہ اس کو سن کر محفوظ کرلیتے ہیں،

إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ، مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ، (ق - ۲)	جب دو لینے والے داہنے اور بائیں بیٹھے لیتے جاتے ہیں، کوئی بات وہ نہیں بولتا، مگر ایک نگران اس کے پاس حاضر رہتا ہے،

کبھی اس کو اعمال کی تحریر و کتابت کے الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے،

أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ بَلَى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ، (زخرف - ۷)	کیا یہ منکر سمجھتے ہیں کہ ہم اُن کے بھید اور انکی کانا پھوسی نہیں سنتے، کیوں نہیں، بلکہ ہمارے فرستادہ اُن کے پاس (اعمال کو) لکھتے ہیں
إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ، (یونس - ۳)	بیشک ہمارے فرستادہ تمہاری چالوں کو لکھتے رہتے ہیں،

کبھی اللہ تعالیٰ ہر عمل کے موقع پر خود اپنی حاضری اور ذاتی علم و شہادت کو ظاہر کرتا ہے،

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُو مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ (یونس)	اور تو کسی کام میں نہیں ہوتا اور نہ قرآن سے کچھ پڑھتا ہے، اور نہ تم لوگ کوئی کام کرتے ہو لیکن ہم موجود ہوتے ہیں جب تم اس میں ؟

کبھی یہ کہا ہے کہ ہر انسان کا نامۂ عمل اس کی گردن میں لٹکا ہے قیامت کے دن وہی فردِ عمل کی کی صورت میں انسان کے سامنے پھیلا دیا جائے گا کہ اپنا اعمال نامہ تم خود پڑھ لو،

فرمایا:-

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنَاهُ طٰۤئِرَهٗ فِيْ	اور ہم نے ہر انسان کا نتیجۂ عمل اسکی گردن مین
عُنُقِهٖ ؕ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا	چپکا دیا ہے، اور قیامت کے دن ہم دفتر کرکے
يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ، اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى	نکالیں گے جس کو وہ کھلا ہوا پائیگا کہ اپنا دفتر
بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (بنی اسرائیل)	پڑھ لے آج تیرا نفس خود ہی محاسب ہو تو کافی ہے'

اس آیت کا ایسا محل ہے کہ نامۂ عمل کو اگر کوئی واقعی کاغذ کا دفتر یا حساب وکتاب کا رجسٹر نہ سمجھے تو سمجھ سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ یہ تعبیر اس لیے اختیار کی گئی کہ جس طرح کاغذ اور رجسٹر میں قلمبند حساب کوئی بھول نہیں سکتا، اور ایک ایک چیز اس مین درج ہوتی ہے، اسی طرح یہ اعمالِ انسانی فراموش ہو نگے بلکہ لکھے ہوئے رجسٹر کی طرح محفوظ رہیں گے، فرمایا:

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ	اور نامۂ اعمال رکھا جائیگا، تو گنہگاروں کو تو
مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ	دیکھے اس میں جو کچھ لکھا، اس سے ڈر رہے ہونگے'
يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ	اور کہیں گے کہ ہائے افسوس کہ اس کاغذ کو
صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّاۤ اَحْصٰىهَا	کیا ہے کہ چھوٹی بڑی بات نہیں چھوڑتا لیکن
وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَلَا	اس کو شمار کر لیا، اور جو کچھ انھوں نے زندگی
يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا (کہف-٦)	میں کیا، اس کو سامنے پائیں گے، اور تیرا

بااین ہمہ اگر کوئی ٹھیٹ لفظوں کا پابند ہوکر نامۂ عمل کو واقعی کاغذوں کا دفتر سمجھتا ہی تو اس میں شک نہیں کہ الفاظ کے ظاہری معنی اس کی تائید کریں گے، مگر کون سمجھا سکتا ہی کہ یہ کیونکر ہوگا اسی لئے اس پر بحث فضول ہی کہ یہ کیونکر ہوگا، چاہے یہ ہو یا وہ، بہرحال ہمارے اعمال کا ایک ایک نقطہ محفوظ رہے گا، اور وہ خدا کے سامنے پیش ہوگا، اور یہی اس عقیدہ کا اصل مقصد ہی،

اعضاء کی شہادت

انسان کا ہر عمل اپنے پیچھے اپنے کرنے والے کے اندر اپنا اچھا یا بُرا اثر چھوڑ جاتا ہی، اگر دل کا آئینہ صاف ہو تو اسکو اپنے عمل کا چہرہ اس میں صاف دکھائی دے فرمایا،

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَۃٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ (قیامت)

بلکہ انسان کو اپنے نفس کا حال آپ دکھائی دیتا ہے اگرچہ وہ اپنے عذر تراشتا ہی،

یہی وہ آئینہ ہی جو گناہ کے میل سے زنگ آلود ہو جاتا ہے،

کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ (تطفیف)

نہیں بلکہ اُن کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہی،

گویا اسی آیت کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہی کہ جب انسان پہلے پہل گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے، اگر وہ توبہ وانابت کرتا ہی اور آیندہ اس سے باز رہتا ہی تو وہ مٹ جاتا ہے اور اگر اسی طرح گناہ کیے جاتا ہے تو اُس نقطہ کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے، یہانتک کہ ایک دن پورے دل پہ چھا جاتا ہے[1]،

اسی طرح وہ اپنے جن اعضاء سے جو بُرا کام کرتا ہی، اس کا اثر ان پر چھا جاتا ہے یہانتک کہ چہروں پر اس اثر کے نقوش ابھر آتے ہیں آنکھوں میں اسکی لکیریں پڑ جاتی ہیں اور ہاتھ پاؤں

---

[1] ترمذی،

پر اُس کے نشان نمایان ہو جاتے ہین، عالم غیب اور عالم غیب کو چھوڑو، اسی عالم ظاہر مین تاڑنیوالون کی نگاہین، انسانون کے چہرون، آنکھون اور ہاتھ پاؤن کے عنوانِ بیان سے انسان کے اندر کی تحریرین پڑھ لیتی ہیں، اسی طرح قیامت میں اُنکے اعمال کے آثار و نتائج اُن کے ایک ایک عضو سے نمایان ہونگے۔

يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمَاهُمْ (رحمان ۲)　　گنہگار اپنی نشانی سے پہچان لئے جائین گے،

ایسی حالت مین اس وقت جب انسان کی زبانِ قال پر خداوندِ عدالت کے رعبِ جلال سے مہرِ سکوت پڑ جائے گی، اگر انسان کے ہاتھ پاؤن اور کھال تک اُس کے اعمالِ بد پر گواہی دین تو تعجب کی کیا بات ہے؟ فرمایا،

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ .... اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (یٰسٓ - ۴)

اے گنہگارو! آج نیکوکارون سے الگ ہو کر پہچان میں آجاؤ ...... آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دین گے، اور اُن کے ہاتھ ہم سے بولینگے اور اُن کے پاؤن اُن کے کرتوتون کی گواہی

وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَاءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ، حَتّٰى اِذَا مَا جَاءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ، قَالُوْا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْ

اور جس دن خدا کے دشمن دوزخ کی طرف ہنکے جائینگے، اور وہ درجہ بدرجہ بانٹے جائین گے، یہانتک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچین تو اُن کے کان آنکھون اور اُن کی کھال نے اُن پر اُن کے کرتوتون کی گواہی دی، انھون نے کہا تم نے ہم پر کیون گواہی دی، کہا کہ جس خدا نے ہر چیز کو گویا کیا

اَنۡطَقَ کُلَّ شَیۡءٍ ، (حٰمٓ السجدۃ ۳) اُسی نے ہم کو بھی گویا کیا،

اس لئے ان اعضاء کی گویائی بھی اسی نوع کی ہوگی جس نوع کی گویائی دنیا کی ہر چیز کو حاصل ہے لیکن اس گویائی سے اگر کوئی حقیقی ہی زبان کی گویائی مراد لیکر تشفی پاتا ہے تو اس کو اس کا حق حاصل ہے،

میزان اکثر انسانوں کے اچھے یا بُرے دونوں قسم کے اعمال ہوتے ہیں ایک قسم کا عمل کم ہوگا اور دوسرا زیادہ یا دونوں برابر، دو مادی چیزوں کے درمیان تفاضل اور گھٹ بڑھ کا علم ہم کو تولنے یا گننے سے ہوتا ہے اس لئے وزن اور حساب سے عموماً عدل و انصاف، حق اور ٹھیک ٹھیک کا مفہوم ادا کیا جاتا ہے، اعمال انسانی کے متعلق خدا نے فرمایا ہے کہ انسان کو اس کے عمل کے مطابق پورا پورا بدلہ ملیگا، فرمایا،

جَزَاءً وِّفَاقًا ، (نبأ - ۱) پورا پورا بدلہ،

اس برابری اور کمالِ عدل و انصاف کے مفہوم کو ترازو کی ناپ اور عدالت کی میزان کے استعارہ سے ادا کیا، فرمایا،

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَیۡهِمۡ بِعِلۡمٍ وَّمَا کُنَّا غَآئِبِیۡنَ ، وَالۡوَزۡنُ یَوۡمَئِذِ ۨ الۡحَقُّ ۚ فَمَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِیۡنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ، وَمَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِیۡنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِیۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ (اعراف)

پھر ہم احوال سنائیں گے اور ہم کہیں غائب نہ تھے، اور وزن اس دن حق ہے پھر جس کی تولیں بھاری ہوئیں تو وہ ہیں جن کا بھلا ہوا اور جس کی تولیں ہلکی پڑیں سو وہی ہیں جو اپنی جانیں ہار بیٹھے،

فَاَمَّا مَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِیۡنُهٗ تو جس کی تول بھاری ہوئی تو وہ خوش

فَھُوَ فِی عِیْشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ ؕ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُہٗ ۙ فَاُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ (قارعہ) — عیش میں ہوگا اور جس کی تول ہلکی ہوئی تو اس کی ماں دوزخ ہے،

ان دونوں آیتوں میں تول کے بھاری اور ہلکے ہونے سے مقصود اعمال خیر کی کمی و بیشی ہے پہلی آیت میں اس کا اشارہ موجود ہے کہ وزن سے مراد حق و عدل ہے، اور یہ کہ انسان کا ہر عمل علم الٰہی میں موجود ہوگا، اور وہ کسی طرح بیش وکم نہ ہوگا،

اس مفہوم میں یہ استعارہ قرآن میں بکثرت مستعمل ہوا ہے ایک جگہ ہے،

اَللّٰہُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ وَ الْمِیْزَانَ ؕ (شوریٰ ۲) — وہ اللہ جس نے کتاب کو حق کیساتھ اتارا اور میزان کو،

یعنی کتاب الٰہی حقانیت کے ساتھ اتری ہے، اور اسی کے ساتھ میزان بھی جس سے مراد عدل ہے (طبری تفسیر آیت مذکورہ) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نظام کائنات کی ہر چیز میں جو عدل کامل رکھا ہے، اس کو بھی میزان ہی کے لفظ سے ادا فرمایا ہے،

وَوَضَعَ الْمِیْزَانَ ؕ (رحمان) — اور خدا نے ترازو رکھی ہے،

حساب کمی بیشی کے علم کا دوسرا طریقہ حساب ہے، دوسری آسمانی کتابوں کی طرح قرآن میں بھی استعارہ استعمال ہوا ہے، اور بار بار فرمایا ہے کہ ہم قیامت میں تمھارے عمل کا حساب لیں گے مگر اس حساب سے بھی وہی مقصود ہے جو وزن سے ہے چنانچہ سورۂ انبیاء میں یہ مفہوم مزید تصریح کیساتھ مذکور ہے اور جس سے میزان کی حقیقت بھی پوری طرح سمجھ میں آتی ہے، فرمایا،

وَنَضَعُ الْمَوَازِیْنَ الْقِسْطَ لِیَوْمِ الْقِیٰمَۃِ — اور ہم قیامت کے دن کے لئے ترازو ئیں یعنی

فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ	انصاف رکھیں گے پھر کسی پر کچھ ظلم نہ ہوگا اگر
مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا ط	رائی کے دانہ کے برابر بھی کچھ ہوگا تو ہم لے آئیں گے
وَكَفَىٰ بِنَا حَاسِبِينَ، (انبیاء-۴)	اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے،

اس آیت سے دو باتیں سمجھی جاسکتی ہیں، ایک تو یہ کہ وزن سے مقصود انصاف اور عدم ظلم ہے اور دوسری یہ کہ حساب سے مقصود یہ ہے کہ عمل انسانی کا کوئی ذرہ بھی معاوضہ میں چھوٹنے نہ پائیگا ورنہ وہ خدا کے علم سے غائب ہی لیکن بہرحال وزن وحساب کے مادی ہی مفہوم کو اگر کوئی صحیح باور کرتا ہو تو وہ بھی حق پر ہے،

جنت و دوزخ اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ ان اعمال کی تکلیف اور ذمہ داری سے مقصود الٰہی کیا ہے؟ حقیقت یہ ہو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا نشا یہ ہے کہ ارواح انسانی کو سعادت ابدی اور ترقیاتِ غیر متناہی عطا کیجائیں، مگر اس سعادت وترقی کی بنیاد خدا نے اعمالِ نیک کے حصول اور اعمالِ بد سے پرہیز پر رکھی ہے، اس لئے یہ کہنا صحیح ہو کہ خلقتِ انسانی کی غرض یہ ہے کہ وہ احکام الٰہی کی تعمیل کرے تاکہ وہ اپنی مقررہ سعادت اور موعودہ ترقی کو حاصل کرے اور اسی عالم کا نام جہاں یہ سعادتِ ابدی اور ترقیاتِ غیر متناہی ملتی ہیں "بہشت" ہے، اور اس عالم کا نام جہاں جاکر دنیاوی کمیوں کی تلافی اور گذشتہ حیاتِ فانی کے اعمالِ بد کے نتائج سے پاکی حاصل ہوگی دوزخ ہو اس لئے یہ کہنا صحیح ہو کہ جنت ہی انسان کا اصلی گھر ہے، مزید تفصیل آگے آتی ہے،

جنت انسان کی وراثت ہے حضرت آدمؑ کا قصہ جو توراۃ اور قرآن پاک میں مذکور ہو وہ آغاز خلقت کی محض تاریخ نہیں وہ حقیقتِ انسانی کی سچی اور حقیقی تفسیر ہے، عام طور سے سمجھا جاتا ہو کہ اللہ تعالیٰ

نے حضرت آدمؑ کو اپنے فضل سے جس جنت میں جگہ دی تھی، وہ پہلے اُن کو اور اُن کی نسل کو ہمیشہ کیلئے دیدیگئی تھی، مگر چونکہ اتفاقاً اُن سے گناہ سرزد ہوا، اس لئے وہاں سے نکال کر زمین میں بھیج دیئے گئے مگر ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ آدم علیہ السلام کا زمین میں آنا تو اُن کی پیدایش سے پہلے ہی مقدر ہو چکا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ اُن کی خلقت سے پہلے ہی فرشتوں پر یہ ظاہر کر چکا تھا کہ

إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (بقرہ ۴)	میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں،

حضرت آدمؑ کا زمین میں خلیفہ ہونا، اُن کے زمین میں سکونت پذیر ہونے کی پیشین گوئی ہے مگر زمین میں بھیجنے سے پہلے اُن کو جنت میں رکھنا پھر گناہ کے بعد وہاں سے اُن کو نکال کر زمین میں بھیجنا، یہ اشارہ رکھتا ہے کہ آدم اور اُن کی نسل کی اصلی جگہ یہی جنت ہے، مگر اس سے دوری اُنکے گناہ کی وجہ سے ہے اور اس کا حصول خدا کی اطاعت اور نیکوکاری کے ذریعہ ہوگا، چنانچہ اُن کے زمین میں اُترتے وقت اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرما دیا،

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۚ فَإِمَّا	ہم نے کہا کہ تم سب اس جنت سے اترو، پھر
يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ	کبھی تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت
هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ	پہنچے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی
يَحْزَنُونَ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا	تو اس کو نہ ڈر ہوگا نہ غم، اور جنھوں نے نہ مانا
بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ	اور ہمارے حکموں کو جھٹلایا تو وہی ہیں دوزخ
هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ، (بقرہ ۴)	والے، وہ اس میں رہا کریں گے،
قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ	خدا نے کہا کہ اس جنت سے تم دونوں

لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ج فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ
هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ
وَلَا يَشْقٰى وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ
فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى،
(طٰہٰ - ۷)

ایک ساتھ اترجاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو،
تو اگر تمھارے پاس میری طرف سے کوئی رہنمائی آئے
تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی کی تو وہ نہ گمراہ
ہوگا اور نہ بدبخت ہوگا، اور جس نے میری یاد سے
منھ پھیرا تو اس کے لئے تنگ معاش ہوگی،
اور قیامت میں ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے،

توراۃ میں ہے کہ جنت میں دو درخت تھے، ایک نیک و بد کی پہچان کا، اور دوسرا زندگی جاوید کا، توراۃ کے رو سے آدم کو اسی نیک و بد کی پہچان کے درخت کا پھل کھانے سے منع کیا گیا ہی لیکن آدم نے اس کو کھالیا، اور اس کی وجہ سے سب سے پہلے اُن کو اپنی برہنگی کا علم ہوا، آخر خدا نے اُن کو جنت سے نکال دیا کہ وہ زندگی کے درخت کا پھل کھاکر خدائی کا دعویٰ نہ کر بیٹھیں جب وہ جنت سے نکالے گئے، تو اُن سے کہا گیا (سفر تکوین - ۲)

"اور اُس درخت سے کھایا جس کی بابت میں نے تجھ سے حکم کیا کہ اس سے مت کھانا، زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی، اور تکلیف کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اُس سے کھائیگا، اور وہ تیرے لئے کانٹے اور اونٹکٹارے اُگائے گی، اور تو کھیت کی نباتات کھائے گا، اور تو اپنے منھ کے پسینہ کی روٹی کھائیگا جب تک کہ زمین میں پھر نہ جائے"

قرآن پاک میں اُس درخت کا نام جس کے پھل کھانے سے آدم کو روکا گیا تھا تصریحاً مذکور نہیں لیکن ایک آیت سے اشارۃً معلوم ہوتا ہی کہ وہ نیک و بد کی شناخت کا درخت تھا، "اور شیطان نے

یہ کہکر اُن کو کھلایا کہ یہ حیاتِ جاوید، اور ملکِ جاویدان کا درخت ہے" مگر اُس کے کھانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو برہنگی کا علم" ہو گیا، جو نیک و بد کی تمیز کا نتیجہ ہے، فرمایا،

فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَىٰ شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ، فَأَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا، (طٰہٰ - ۷)	شیطان نے آدم کو وسوسہ دیا کہا اے آدم کیا میں تجھے حیاتِ جاویدانی اور سلطنتِ غیر فانی کا درخت بتاؤں، تو (آدم اور حوا) دونوں نے اس درخت کا پھل کھایا تو انکی

اب سوال یہ ہے کہ "حیاتِ جاویدان غیر فانی بادشاہی" سے مقصود کیا ہے، ظاہر ہے کہ جنت ہی، شیطان کا مقصود یہ تھا کہ اس جنت میں جس میں تم اب ہو، بے درد سر ہمیشہ رہنے کا نسخہ تم کو بتاؤں؟ انسان نے خواہش کی تو اُس نے نیک و بد کی تمیز کے درخت کا پھل بتا دیا، یہ بھی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نیک و بد کی تمیز ہی پر انسان کی شرعی تکلیف اور مواخذہ کی بنیاد ہے، ہر وہ مخلوق بلکہ ہر وہ انسان جو اس ادراک سے خالی ہے، وہ شرعی تکلیف اور مواخذہ سے گرانبار نہیں، غرض اس خیر و شر کی معرفت کا لازمی نتیجہ شریعت کی تکلیف تھی، چنانچہ وہ اس کے سر ڈالی گئی، اور پھر نسلِ آدم میں یہ نیک و بد کی تمیز فطری الہام کے ذریعہ عنایت ہوئی فرمایا،

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوَّاهَا، فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا، (والشمس ۱)	اور نفس اور اس کی بناوٹ کی قسم، پھر نفس میں اس کی بدی اور اسکی نیکی کو الہام کیا،

عجب نہیں کہ قرآنِ پاک کی یہ آیتیں اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہوں،

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ	ہم نے اپنی امانت (تکلیف شرعی) آسمانوں

وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ	اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے
يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا	اُس کے اٹھانے سے انکار کیا، اور انسان نے
الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا	اُس کو اُٹھالیا کہ وہ ظالم اور نادان تھا تاکہ
لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ	اللہ نفاق والوں اور نفاق والیوں اور شرک
وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ	والوں اور شرک والیوں کو سزا دے اُور
اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ	ایمان والوں اور ایمان والیوں پر رجوع ہو
وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (احزاب ۹)	اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے،

انسان نے اپنی جہالت سے اس تکلیفِ شرعی کی امانت کو اٹھالیا، جو نیک و بد کی معرفت کا لازمی نتیجہ تھا، اور وہ اس تکلیفِ شرعی کالازمی نتیجہ جزا اور سزا تھی لیکن خدا کی رضامندی یہی تھی کہ اُس کے سب بندے اُس کی رحمت اور مغفرت کے مستحق ٹھہریں کہ اسکی رحمت و شفقت کا اقتضا یہی ہو کہ گنہگاروں کو معاف کرے اور نیکوکاروں پر اپنی خاص رحمت نازل کرے لیکن اگر کاشتکار اپنے کھیتوں کو ابرِ رحمت سے مستفید ہونے کے قابل نہ بنائے تو وہ اس کی برکت سے مستفید نہ ہوگا، اسی طرح جو بندہ شرک و نفاق میں مبتلا ہوجانے سے اپنے آپ کو اس کی رحمت کے قابل نہ بنائے تو وہ بھی اس کی رحمت کی بارش سے سیراب ہوسکے گا،

غرض اس طرح وہ مصلحتِ الٰہی جو انسان کی پیدایش سے تھی، پوری ہوئی، اور وہ حیاتِ جاوید اور غیر فانی بادشاہی جس کا حصول قضائے الٰہی نے انسان کی محنت، جدوجہد اور سعی و عمل پر موقوف رکھا تھا، اور جسے شیطان نے آدم کو بلاسعی و محنت محض بخت سے دلوانا چاہا تھا، بالآخر اس کا

ملنا تقدیر الٰہی، جد و جہد سعی و عمل، اور نظام ربانی کے مطابق شریعت کی پیروی کے ذریعے مقرر ہوا، جیسا کہ پہلے سے طے شدہ تھا، فرمان آیا،

اِهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ، (بقرہ-۴)

یہاں سے تم سب اترو، پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی رہنمائی آئے تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی کی، تو اُن کو نہ ڈر ہوگا، نہ غم،

اِهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا ۢ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَاىَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى، (طٰہٰ-۷)

تم دونوں یہاں سے نیچے اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے رہنمائی آئے تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی کی، تو وہ نہ گمراہ ہوگا، اور

جب انسان کا اصل مقام، وہی حیاتِ جاوید، اور مملکتِ ابدیہ تو اُسی کا حصول اس کی تمام کوششوں کا محور ہونا چاہیے، اور اسی حیاتِ فانی اور لازوال بادشاہی کی دولت کو اپنی اس فانی زندگی اور زوال پذیر بادشاہی کے تمام کاموں کے مزد و معاوضہ میں حاصل کرنا چاہیے، تاکہ وہ اپنے باپ کی اس آسمانی بادشاہی کو پالے جس کی صفت یہ ہے،

فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ۝ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (طٰہٰ)

تو شیطان تم کو جنت سے باہر نہ کر دے تو پھر تو مشقت میں پڑ جائے اور جنت میں تجھ کو یہ ملا ہے کہ اس میں تو نہ بھوکا ہوگا اور نہ ننگا نہ پیاسا ہوگا اور

آدم اس جنت سے نکلے تو اُن کو بھوک بھی لگی، ننگے بھی ہوئے، پیاس بھی معلوم ہوئی، اور دھوپ کی تپش کی تکلیف بھی ہوئی، اور زمین میں آکر اُن ہی چار چیزوں کی مشقت میں گرفتار ہوئے، کھانا، پینا، پہننا، رہنا، یہی انسان کی چار مختصر ضروریات ہیں، اُن ہی کو انسان نے اپنی ہوا و ہوس سے پھیلا کر ضروریات کا ایک عالم پیدا کر لیا، جس کے مہیا کرنے، ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے اور عمدہ بنانے میں اپنی موجودہ زندگی کی تمام تر توجہ کو مصروف کر کے اصل جنت کی طلب سے ہاتھ دھو بیٹھا، یہیں سے شریعت کی تکلیف عائد ہوئی، اور جائز اکل، جائز شرب، جائز لباس، اور جائز مسکن کے حصول کے طریقوں کی تعلیم اور ناجائز طریقوں سے احتراز کا حکم ہوا، اسی سے شریعت کے اصول، معاملات اور اخلاقِ انسانی کی ذمہ داریاں پیدا ہوئیں، اور پھر اس لئے تاکہ اس حیاتِ فانی میں پھنس کر حیاتِ غیر فانی کی طلب کو وہ بھول نہ جائے، عرفانِ الٰہی (عقائد صحیح) اور عبادتِ الٰہی و اطاعتِ الٰہی کی تلقین ہوئی، جو جنت کی اصلی غذا اور روزی ہے،

أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ الَّذِينَ	یہی وہ میراث لینے والے ہیں، جو سایہ دار
يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ	باغ کے وارث ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ
(مومنون - ۱)	رہنے والے ہیں،

لیکن یہ وراثت انسان کو اپنے اعمالِ خیر ہی کے ذریعہ ملے گی، چنانچہ اہلِ جنت کو جنت کے داخلہ کے وقت یہ بشارت ملے گی،

وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَ	اور اس جنت میں وہ کچھ ہے، جس کو دل چاہے،
تَلَذُّ الْأَعْيُنُ ج وَأَنْتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ	اور آنکھوں کو لطف ملے، اور تم کو اس میں ہمیشہ

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ج (زخرف-۷)

رہنا ہے، اور یہی وہ جنت ہے جس کے وارث اپنے کاموں کے بدلہ تم بنائے گئے،

اور اُن ہی کو منادیِ غیب یہ ندا دے گا،

وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ، (اعراف-۵)

اور اُن کو پکار کر کہا گیا کہ یہی وہ جنت ہے جس کے تم وارث اپنے ان کاموں کے بدلے

ملتِ توحید کے مُبلّغِ اعظم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کا ایک فقرہ یہ بھی تھا،

وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ،

اور مجھے باغ نعمت کے وارثوں سے بنا،

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ اسلام نے انسان کا اصلی مقام وہی قرار دیا ہے، جہاں نہ بھوک ہے، نہ پیاس، نہ برہنگی ہے، نہ دھوپ کی تکلیف، جہاں کی بادشاہی لازوال اور جہاں کی زندگی غیر فانی ہے لیکن اُس کے حصول کا ذریعہ صرف انسان کا نیک عمل اور صحیح عرفان ہے، جن کے مجموعہ کا نام "تقویٰ" ہے،

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا، (مریم-۴)

یہ وہ بہشت ہے جس کا وارث اپنے بندوں میں سے ہم اس کو بنائیں گے جو تقویٰ والا ہوگا،

انسانی جزا و سزا کے تین گھر

انسان کے تین گھر ہیں، ایک موجودہ فانی عالم جس کو دنیا کہتے ہیں، اور دوسرا درمیانی، عالمِ موت، یا عالمِ قبر جس کا نام برزخ ہے، اور تیسرا اُس غیر فانی زندگی کا گھر جس کو دارِ آخرت کہتے ہیں، یہودیوں کے یہاں اصلی زور اسی دنیا کی جزاء و سزا پر ہے اُن کے ہاں تیسرے کا ذکر بہت کم، اور دوسرے کا مطلق نہیں، اور عیسائیوں میں پورا

زور تیسری منزل کی سزا وجزا پر ہے، اور پہلی اور دوسری منزلوں کے ذکر سے خاموشی ہے لیکن وحی محمدیؐ کی تکمیل نے ان تینوں گھروں کو انسانی سزا وجزا کا مقام قرار دیا، انسان کو اپنے اعمال کی پہلی جزا وسزا تو اسی دنیا میں کامیابی وناکامی کی صورت میں ملتی ہے، گو اس کامیابی وناکامی کے سمجھنے کا معیار مختلف ہو، اس کے بعد جب انسانی روح دوسری منزل میں قدم رکھتی ہے، تو یہاں بھی وہ اپنے اعمال کی تھوڑی بہت جزا وسزا کا منظر دیکھ لیتی ہے، اس کے بعد جب موجودہ دنیا کے پورے کاروبار کا خاتمہ ہو کر اس فانی کائنات کا ہر نقش ونگار مٹ جائے گا، اور پھر نئی زمین اور نیا آسمان بنے گا، تو فانی انسانوں کو دائمی زندگی کیلئے بیدار کیا جائے گا، اور اُس وقت وہ اپنے اعمال کی پوری جزا، وسزا پائیں گے،

انسان کا پہلا دار الجزاء

غرض انسان کا پہلا دار الجزاء یہی دنیا ہے، گو اُس کے ہر نیک وبد فعل کی پوری جزا تو دوسری دنیا کی زندگی میں ملتی ہے، لیکن اُس کے نیک وبد فعل کے مماثل اس موجودہ دنیا کی زندگی میں ابھی اس کو کچھ نہ کچھ جزا ملا کرتی ہے، انسان کی عزت، شہرت، ناموری، ہر لعزیزی محبوبیت تسکین، اطمینان، سرور، فارغ البالی، حکومت، یہ سب اس زندگی کے اعمال خیر کے نتائج ہیں، اُن کے برخلاف ذلت، رسوائی، بے عزتی کس مپرسی، پریشان حالی، بے اطمینانی، غم، خوف محکومیت، اُس کے اعمالِ بد کے اثرات ہیں،

یہودیوں کی توراۃ میں اعمال کے نتائج میں زیادہ اہمیت اسی دنیاوی دار الجزاء کو دیگئی ہے بلکہ توراۃ میں یہی خیال سب سے زیادہ نمایاں ہے کہ خدا کی فرمانبرداری اور نافرمانی کی جزا اسی دنیا کے رنج وراحت کی صورت میں اسی زندگی میں ملتی ہے مثلاً خدا کے حکموں پر عمل کروگے تو ان کا

نتیجہ یہ ہوگا کہ تمھاری کھیتیاں سرسبز ہون گی، اولادیں برومند ہوں گی، جانور جئین گے، درخت پھل دیں گے، اور دشمن مغلوب ہون گے، اور اگر خدا کی نافرمانی کروگے، تو تیر و بائیں آئین گی، قحط پڑیں گے، اولادیں جیتی نہ رہیں گی، جانور مرجائین گے، شہر تباہ ہوجائین گے، باغ پھل نہ دیں گے، اور دشمن تم پر چھاجائیں گے، عیسائیت نے اس کے بالمقابل سارا زور زمین کی مملکت پر نہیں بلکہ آسمان کی بادشاہت پر دیا ہے، اور اس ظاہری زندگی کے فوز و فلاح کو اپنے مقصد سے خارج قرار دیا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس دعوت کو لے کر آئے، وہ یہودیت و عیسائیت کی اس افراط و تفریط دونوں سے پاک ہے، اُس نے ایمان اور عمل صالح کا نتیجہ اس دنیا کی بادشاہی بھی قرار دی، اور اُس دنیا کی بھی، زمین کی حکومت بھی، اور آسمان کی جنت بھی، یہان کی سرسبزی و شادابی بھی، اور وہان کا باغ و بہار بھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نکوکار مسلمانون کے ذکر میں فرمایا،

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَ	تو خدا نے اُن کو دنیا کا بدلہ بھی دیا، اور آخرت
حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ	کے ثواب کی خوبی بھی، اور اللہ نیکی کرنیوالون
يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ، (آل عمران - ۱۵)	کو پیار کرتا ہے،

ایمان اور عمل صالح والون سے یہ وعدہ تھا کہ

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا	خدا نے اُن سے جو ایمان لائے، اور اچھے
الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا	کام کئے، گناہوں کی بخشش اور بڑی
عَظِيْمًا، (فتح - ۴)	مزدوری کا وعدہ کیا،

اور یہ بھی اُن ہی سے وعدہ ہے،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ	خدا نے اُن سے جو تم میں سے ایمان لائے،
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ	اور اچھے کام کئے، وعدہ کیا ہے کہ وہ اُن
فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ	کو ملک میں حاکم بنائے گا، جس طرح اُن سے
مِنْ قَبْلِهِمْ (نور - ۷)	اگلوں کو حاکم بنایا تھا،

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جس طرح اس دنیا کی فانی زندگی سے اُس دنیا کی باقی زندگی زیادہ پائدار ہے، اسی طرح اُس دنیا کے ثواب سے اُس دنیا کے ثواب کی قدر و قیمت بھی زیادہ ہے اور اسی دنیا کے حُسنِ عمل کی کوشش سے اس دنیا کی بہتری بھی ملتی ہے، فرمایا،

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا	جنھوں نے نیک کام کئے، اس دنیا میں اُن
حَسَنَةٌ ط وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ط	کے لئے بھلائی ہے اور بے شبہ آخرت کا گھر بہتر ہے
لَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ، (نحل - ۴)	اور پرہیزگاروں کا گھر کیا اچھا ہے،

اسی طرح بدکاروں کی جزا جہاں اُس دنیا کی دوزخ اور آگ کے عذاب کو فرمایا، اسی طرح اس دنیا کی ذلت و خواری اور رسوائی کو بھی فرمایا،

خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ، (حج - ۲)	اُس نے دنیا اور آخرت کا نقصان اٹھایا
لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي	انکے لئے دنیا میں رسوائی ہے، اور آخرت میں
الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (بقرہ ۱۴)	بڑی مار ہے،
حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (بقرہ ۲)	اُن کے کام دنیا اور آخرت میں برباد ہوئے

یہ بھی فرمایا:

فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ، (اٰلِ عمران - ۶) — تو میں اُن کو دنیا اور آخرت میں سخت سزا دوں گا ،

تنگی اور بدحالی کی سزا بھی یہیں ملتی ہے ،

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ، (طٰہٰ - ۷) — اور جس نے میری نصیحت سے منہ پھیرا تو اس کے لیے تنگ گذران ہے اور قیامت میں اس کو اندھا اٹھاؤنگا کہ دنیا میں وہ دل کا اندھا

انتہا یہ ہے کہ خود صحابہ کو جنگِ احد میں جو فتح نہیں ملی ، اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی اُن کی بعض کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کا ثمرہ بتایا ،

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ج (اٰل عمران ۱۶) — تم میں سے جو لوگ اس دن جب دونوں فوجیں بھڑیں پیچھے ہٹے ، اُن کے بعض کاموں کی وجہ سے شیطان نے ان کو پھسلا دیا ،

ایک اور مقام پر عام طور سے فرمایا گیا ،

وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ، (شوریٰ - ۴) — جو مصیبت تم کو پہونچی ، وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوتوں کے باعث ، اور وہ بہت سی باتوں سے درگذرتا ہے ،

یہود کے ذکر میں قرآن نے اس مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا ہے ، عذاب کے موقع پر فرمایا :-

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا — ان پر ذلت ماری گئی ، جہاں پائے گئے لیکن

ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ
مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ
اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ
اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ
ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ

(آل عمران - ۱۲)

(جہاں عزت حاصل ہی) وہ خدا کے ذریعہ
لوگوں کے سہارے اور اللہ کا غصہ کما لائے
اور ان پر (قومی) محتاجی ماری گئی، یہ اس لئے
کہ وہ خدا کے حکموں کا انکار کرتے تھے اور
پیغمبروں کو مار ڈالتے تھے، یہ اس لئے کہ وہ
نافرمان ہیں، اور حدود الٰہی سے آگے
بڑھتے ہیں،

اس کے بالمقابل عام اہل کتاب سے کہا گیا:-

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ
الْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ
رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ
مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ،

(مائدہ - ۹)

اور اگر یہ توراۃ اور انجیل کو اور جو انکی طرف
اُن کے پروردگار کی طرف سے (اب) اتارا
گیا، اس کو قائم رکھتے تو وہ اپنے اوپر (برکات
آسمانی) سے کھاتے اور اپنے پاؤں کے نیچے
(ارضی خیر و برکت) سے کھاتے،

ایک اور موقع پر اشارہ ہے،

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَ
اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ
السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا

اور ان آبادیوں کے رہنے والے ایمان لاتے
اور پرہیزگاری کے کام کرتے، تو ہم ان پر
آسمان اور زمین سے برکتوں کو کھول دیتے لیکن

فَاَخَذْنٰھُمْ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ، (اعراف ۱۲۰)

انھوں نے خدا کے احکام کو جھٹلایا، تو ہم نے اُن کے اعمال کی پاداش میں اُن کو پکڑ لیا،

مگر یہ دارالجزا فانی ہے | لیکن یہاں ایک لغزش گاہ بھی ہے جس سے اہل ہوش کو باخبر رہنا چاہیے

اس دنیا میں گو انسان کو اعمال کی جزا و سزا کسی نہ کسی رنگ میں ضرور ملتی ہے، مگر کیا شخصی زندگی اور کیا جماعتی حیات کے لحاظ سے یہ دارالجزا جس کا نام دنیا ہے، عارضی اور فانی ہے، یہاں کا غم بھی فانی اور یہاں کی خوشی بھی عارضی ہے، اس لئے صرف اسی دنیا کی کامیابی کو اپنی زندگی کا اصل مطلوب و مقصود اور غایت و منتہا نہیں بنانا چاہیے، بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ اس سے بھی زیادہ ایک اور وسیع آسمانی مملکت، اور لازوال ربانی سلطنت ہے، جو فنا و زوال کے ہر عیب اور ہر نقص سے پاک ہے، اُس جہاں کی نعمتیں اس دنیا کی نعمتوں سے کہیں زیادہ بہتر اور غیر فانی ہیں، اس لئے اس فانی دنیا کی لذتوں میں پڑ کر اس کو بھول نہیں جانا چاہیے، اُس مسافر کی عقل سلیم کو داد کون دے گا جو راستہ کی عارضی خوش منظریوں اور سفر کی فانی دلچسپیوں میں پڑ کر اپنے خوش سواد اور سدا بہار وطن کو فراموش کر بیٹھے،

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا ۔ وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی (اعلیٰ ۔)

بلکہ تم دنیاوی زندگی کو بڑھ کر چاہتے ہو، حالانکہ آخرت کی زندگی اس سے بہتر اور باقی

وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَۃِ خَیْرٌ، (یوسف ۔)

اور بیشک آخرت کی مزدوری (یہاں کی مزدوری سے) بہتر ہے،

اس طرح گنہگاروں کے لئے یہاں کی ذلت و رسوائی سے بڑھ کر ایک اور ذلت و رسوائی کا مقام ہے،

فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ	تو خدا نے اُن کو اس دنیاوی زندگی میں
الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ مـ	رسوائی کا مزہ چکھایا، اور شبہ نہیں کہ آخرت کا
لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ، (زمر - ۳)	عذاب اس سے بھی بڑا ہے، اگر وہ جانتے،

اس دنیا کی ذلت ورسوائی تو شاید سہ بھی لیجائے مگر وہاں کے عذاب کی سختی کو کون سہ سکتا ہے کہ

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ،	اور آخرت کا عذاب البتہ زیادہ سخت اور دیرپا ہے،
(طٰہٰ - ۷)	

اس لئے اس فانی دنیا میں انسان کو اپنے حسن عمل کے بدولت جو زور وقوت، جاہ وجلال، نعمت ومال، اور حکومت وسروری ملے، اُن کو بھی آخرت کی لازوال نعمتوں اور وہاں کی غیر فانی بادشاہی کے حصول میں صرف کرنا چاہئے کہ اس سے خود ان دنیاوی نعمتوں کو بھی بقا اور پائداری حاصل ہوگی، اسی فلسفہ کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی حقیقت طراز نے قارون کی نصیحت کے ضمن میں ان لفظوں میں ادا کیا ہے،

وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ	اور خدا نے جو تجھکو دیا ہے اُس سے آخرت
وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَ	کا گھر تلاش کر، اور دنیا سے اپنا حصہ نہ
اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ	بھول، اور جس طرح خدا نے تجھ پر احسان
الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ،	کیا ہے، تو بھی (خدا کے بندوں پر) احسان
(قصص - ۸)	کر اور (اس دولت سے) زمین میں خرابی نہ چاہ،

چنانچہ ناخلف یہود پر تباہی اسی لئے آئی کہ وہ دنیاوی زندگی کی دولت جائداد کی محبت میں

ایسے پھنسے کہ اُن کو اپنے کاروبار میں آخرت کے سودا کا خیال بھول کر بھی نہ آیا،

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا	تو اُن کے بعد کچھ ناخلف کتاب کے وارث ہوئے
الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى	جو اس دنیا کے سامان واسباب کو لیتے ہیں
وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ	اور کہتے ہیں کہ ہم کو معاف ہوگا اور اگر ویسا
عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ۭ اَلَمْ يُؤْخَذْ	ہی سامان واسباب پھر آئے تو پھر لیں، کیا اُن
عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا	سے کتاب کے حق میں یہ عہد نہیں لیا گیا کہ وہ خدا
عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ، وَدَرَسُوْا مَا	پر حق کے سوا کچھ اور نہ بولیں، حالانکہ جو
فِيْهِ ۭ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ	اس میں ہے، وہ اس کو پڑھ چکے ہیں، اور
يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ،	آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے لئے بہتر ہے
(اعراف - ۲۱)	کیا تم سمجھتے نہیں،

یہ دارالجزاء دارالاصلاح بھی ہے

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت وشفقت سے انسان کو پیدا کیا، اور اس ہمیشہ کی زندگی کا مقام بھی دکھایا، اور بتادیا کہ اس مقام کا دائمی و ابدی استحقاق خود تمہارے عمل سے تم کو حاصل ہوسکتا ہے، اور یہ دنیاوی زندگی اسی لئے اس کو دی گئی کہ وہ اس زمانہ میں اُس سدابہار سرزمین کی ملکیت کو اپنے عمل کی قیمت سے خرید سکے، پھر چونکہ انسان دوسری مصلحتوں کے لحاظ سے طبعاً کمزور، زود فراموش، اور بھولنے والا بھی پیدا ہو، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی اسی مستعار زندگی میں بار بار اپنے سنبھلنے، سدھرنے اور کامیاب بننے کے موقع عنایت کئے، رسولوں کی بعثت، ملکوں کی آمد، شریعت کی تعلیم، پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

کا سلسلہ گناہوں پر جسمانی سزا وتعزیر، عمل خیر پر روحانی لذت اور عمل شر پر روحانی غبار وکدورت کے لوازم اسی لئے مقرر ہوئے کہ اُس کو ہر قدم پر اپنے اعمال پر تنبیہ اور اپنی غلط روی کا احساس ہو اور ان سب کے علاوہ اُس نے اپنی غایتِ رحمت سے انسانوں کی تنبیہ اور اصلاح کے لئے حسب ذیل مراتب مقرر کئے،

۱- **نیکی سے برائی کا کفارہ**، چونکہ انسان کتنی ہی کوشش کرے، اپنی فطری کمزوریوں کی حد سے باہر نہیں نکل سکتا، اس لئے جس طرح اس دنیا میں اُس نے انسانوں کے دلوں میں یہ فطری اصول ودیعت کردیا ہے کہ جس کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہو، اُس کی معمولی بُرائیوں سے چشم پوشی کیجاتی ہے، یا یہ کہ آخر میں اُس کا کوئی ایک نیک کام اتنا زبردست ہوجاتا ہے کہ اس سے اُس کی تمام اگلی بُرائیوں کی فرد دھل جاتی ہے، اسی کا نام "کفارۂ عمل" ہے، چنانچہ وحیِ محمدی نے اصولی طور پر یہ حقیقت ان الفاظ میں تلقین کی کہ

إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ، (هود) بےشبہ نیکیاں، برائیوں کو دور کردیتی ہیں

اس آیت کا یہ بھی منشا ہے کہ نیکیوں کی تدریجی ترقی بالآخر بُرائیوں کو کم کرتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ پورا نیکوکار انسان بن جاتا ہے، اور یہ بھی خوشخبری اس میں پوشیدہ ہے کہ یہی نیکیاں اُس کی پہلی بُرائیوں کے نتیجہ کو بھی انشاء اللہ مٹادیں گی، اس معنی کی اور آیتیں بھی قرآن پاک میں ہیں،

إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُدْخَلًا كَرِيمًا، (نساء- ۵)

تم کو جن باتوں سے منع کیا گیا ہے، اگر اُن میں کی بڑی باتوں سے تم بچتے رہوگے تو ہم تمہاری تقصیریں تم سے اتار دیں گے اور تم کو عزت کے مقام میں داخل

لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ	البتہ اگر تم نماز کھڑی کرو، اور زکوٰۃ دو،
وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَ	میرے پیغمبروں پر ایمان لاؤ، اور اُن کی مدد کرو گے
اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ	اور اللہ کو اچھی طرح کا قرض دو گے تو میں
عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ	تمہاری گناہوں کو اُتار دوں گا، اور تم کو ان
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (مائدہ ۳)	جنتوں میں داخل کرونگا جن کے نیچے نہریں۔
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ	یہ وہ ہیں جن کے اچھے عمل کو ہم قبول
اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ	اور اُن کی برائیوں سے درگذر کریں گے
فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ (احقاف-۲)	

۲- توبہ کفارہ ہے: انسان کے تمام کاروبار میں اصل شے اُس کا دل ہے، اسی سے وہ پاک ہوتا ہے اور اسی سے ناپاک بنتا ہے، انسان کا دل اگر خلوص کے ساتھ کسی وقت خدا کی طرف رجوع کرے، اور اپنی تقصیروں اور فروگذاشتوں پر اُس کی بارگاہ میں نادم و شرمسار ہو کر اپنی پچھلی زندگی سے بیزار ہو کر آیندہ کے لئے نکوکاری کا خدا سے مستحکم وعدہ کرلے تو اس کا نام توبہ ہے، یہ توبہ گنہگار سے گنہگار انسان کو بھی خدا کی آغوشِ محبت میں لاکر ڈال دیتی ہے، آدم علیہ السلام کا قصور اور پھر اُن کی توبہ اور رحمتِ الٰہی کا رجوع، واقعہ کے علاوہ اس بات کی ایک مثالی صورت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آغوشِ رحمت کس طرح گنہگار انسان کو واپس لینے کے لئے ہمیشہ وا رہتی ہے، رحمتِ الٰہی کے اس پُرجوش نظارہ کی جو کیفیت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفۂ وحی اور پیام نبوت میں نظر آتی ہے، اُس سے ہندوستان کا برہمنت اور دھرم قطعاً محروم، تورات خاموش، زبور کی سُریلی

آواز مدھم، اور انجیل کی خوشخبری مبہم ہے، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیام ربانی میں اُسکی کیفیات اور اصول و شرائط کو جس شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا، وہ گویا ربّ العالمین کی طرف سے رحمۃ للعالمین کا خاص حصہ تھا، فرمایا،

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحاً	مگر جس نے توبہ کی، اور ایمان لایا، اور نیک
فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا	کام کئے، تو وہ جنت میں داخل ہونگے، اور
يُظْلَمُوْنَ شَيْئًا، لا (مریم-۴)	اُن پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا،

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ ایک توبہ کی بھلائی، اس کے گناہوں کے سارے دفتر دھو کر اُنکی جگہ آپ لے لیگی۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلاً صٰلِحًا	مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا، اور اچھے کام
فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ	کئے تو یہ وہ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں
حَسَنٰتٍ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (فرقان)	میں بدل دیگا، اور اللہ بخشنے والا رحم والا ہے،

اور یہی اس کی شانِ رحمت کا اقتضا ہے، یہانتک کہ چور اور ڈاکو بھی اپنے گناہوں سے توبہ کریں تو ان کو بھی بشارت ہے،

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ	تو جس نے اپنے پر ظلم کرنے کے بعد توبہ کی، اور اپنے
فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ	کو سدھارا تو بیشک اللہ اس پر رجوع ہوگا،
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ	اللہ بخشنے والا مہربان ہے، کیا تجھے نہیں معلوم کہ
لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يُعَذِّبُ	آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے

مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ، (مائدہ-۶)

جس کو چاہے سزا دے اور جس کو چاہے معاف کرے، اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے،

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ قطعی اصول ظاہر فرما دیا کہ

وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی (طٰہٰ-۴)

اور بیشک میں اُس کو بخشنے والا ہوں جس نے توبہ کی، اور ایمان لایا، اور نیک کام کئے، اور

لیکن توبہ کس کے لئے ہے اور کس شرط کے ساتھ ہے،

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ، وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَھُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَھُمْ كُفَّارٌ ، (نساء-۳)

اللہ کو اُن کی توبہ قبول کرنی ضرور ہے جو نادانی سے برا کام کرتے ہیں، پھر جلد توبہ کرتے ہیں تو یہی وہ ہیں جن کو اللہ معاف کرتا ہے، اور اللہ سب جانتا ہے اور حکمت والا ہے اور اُن کی توبہ نہیں ہے، جو برے کام کرتے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب اُن میں سے کسی کو موت آئی تو اُس نے کہا اب میں نے توبہ کی، اور نہ اُن کی توبہ ہے جو کافر ہو کر مریں،

مقصود یہ ہے کہ توبہ کے بعد اُس بندہ کے دل میں آیندہ تلافی اور تدارک کا احساس بھی موجود ہو اور ظاہر ہے کہ موت کے وقت یہ احساس ممکن ہی نہیں، ہاں اگر وہ توبہ اپنے احساس کے اثر سے کرے، اور اُس کے بعد اتفاقاً موت آجائے تو یقیناً رحمتِ الٰہی اُسکے قبول کرنے

میں تامل نہ کرے گی،

وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا	اور جنھوں نے بُرے کام کئے پھر اس کے بعد باز آئے
مِنْ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ	(توبہ کی) اور یقین کیا تو بیشک تیرا پروردگار اسکے
مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (اعراف ۱۹)	بعد بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے،
وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ	اور جو کوئی بُرا کام کرے یا اپنے آپ پر ظلم کرے پھر
ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا	اللہ سے اپنے گناہ کی معافی چاہے تو وہ اللہ کو
رَّحِيْمًا، (نساء - ۱۶)	بخشش والا اور رحم کرنیوالا پائے گا،

۳ - مصائب کی تنبیہ اور کفارہ، دنیا میں انسان کو مصائب سے زیادہ بری اور تکلیف دہ چیز کوئی دوسری نہیں معلوم ہوتی، لیکن یہ حقیقت بھلانے کے لائق نہیں کہ افراد، بلکہ جماعتیں اور قومیں بھی مصائب ہی کی تنبیہ اور سرزنش سے تنبہ اور ہشیار ہوکر آمادۂ اصلاح ہوتی ہیں، چنانچہ اکثر اخلاقی محاسن کے جوہر کو مصیبتوں ہی کی آگ نکھار کر کندن بناتی ہی، صبر، استقلال، تواضع، شکر، محبت اور رحم ان تمام اخلاقی فضائل کی تربیت ان ہی مصائب کے زیر سایہ ہوتی ہے، مغرور سے مغرور انسان بھی جب کسی اتفاقی مصیبت کی ٹھوکر کھاتا ہی، تو سنبھل جاتا ہی، اس لئے غافل انسانوں اور خود فراموش سرمستوں کو ہوش میں لانے کے لئے کبھی کبھی کی مصیبتوں سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز نہیں کہ ان کی بدولت ملحد سے ملحد انسان بھی ایک دفعہ بے قرار ہوکر خدا کا نام لے ہی لیتا ہی،

دولت و نعمت اور کامیابی و مسرت وہ شراب ہے جس کے نشہ کا اُتار اتفاقی مصائب ہی کی ترشی سے ہو سکتا ہے، انسان خدا کو کتنا ہی بھولا ہو اور اپنی دولت و ثروت پر کتنا ہی نازاں ہو،

لیکن جب وہ کسی افتادسے دوچار ہوتا ہے تو دفعۃً اُس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، بیماری تنگ دستی عزیزوں کی موت آرزوؤں کی ناکامی اُن میں سے ہر چیز وہ ٹھوکر ہے جس کو کھا کر سرمست سے سرمست انسان بھی ایک دفعہ چونک کر ہشیار ہوجاتا ہے اور اس کو اپنے راستہ کی غلطی معلوم ہوجاتی ہے، اس لیے اِن مصائب میں انسانوں کے اعمال بد اور گناہوں کا کفارہ بننے کی صلاحیت پوری طرح موجود ہے کہ اس تھوڑی سی تکلیف سے بندہ میں جو احساس پیدا ہوتا ہے، وہ بڑی بیش قیمت چیز ہے،

قرآن پاک نے اس نکتہ کو جا بجا بیان کیا ہے، اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہگاروں کو اس سے پہلے کہ اُن کو ہلاک کرے، مصائب کی آزمائشوں میں ڈالتا ہے تاکہ شاید وہ اپنے بھولے ہوئے مالک کو یاد کریں، اور اپنی غلط روی پر متنبہ ہوکر اپنی ہدایت و اصلاح کی فکر کریں، فرمایا،

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ	اور بیشک ہم نے فرعون والوں کو قحطوں
وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ	اور پھلوں کی کمی کی مصیبت میں گرفتار کیا
(اعراف - ۱۶)	تاکہ وہ نصیحت پکڑیں،

بنی اسرائیل کے متعلق ہے،

وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ	اور ہم نے اُن کو نعمتوں اور مصیبتوں کے
لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ، (اعراف ۲۱)	ساتھ آزمایا تاکہ وہ شاید باز آئیں،

اسی سورہ میں ایک اور جگہ اس اصول کو ایک کلیہ کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے،

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ	اور ہم نے کسی آبادی میں کوئی نبی نہیں بھیجا،
اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ	لیکن وہاں کے رہنے والوں کو سختیوں اور

لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ، (اعراف - ۱۲)	مصیبتوں میں گرفتار کیا تاکہ وہ شاید گڑگڑائیں

مسلمانوں سے فرمایا گیا،

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ	اور البتہ ہم تم کو تھوڑے خوف، بھوک اور دولت
الْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ	کی اور جانوں کی اور پھلوں کی کمی سے آزمائیں گے،
وَالثَّمَرٰتِ ۗ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ	اور ان صابروں کو خوشخبری سنا کہ جن کو جب
اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا	کوئی مصیبت ستاتی ہے تو کہتے ہیں ہم خدا کے
لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۗ اُولٰٓئِكَ	ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے
عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ	ہیں، یہ وہ ہیں جن پر اللہ کی برکتیں اور رحمتیں
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (بقرہ ۱۹)	ہونگی، اور یہی سیدھی راہ پائے ہوئے ہیں،

اس اصول کے تحت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعدد جزئیات بیان فرمائے ہیں، حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت اتری مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ (نساء ۱۸) (جو کوئی برائی کرے گا اس کا بدلہ اسکو دیا جائیگا) تو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا مطلب پوچھا، فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ سے عتاب ہے، اس کا بدلہ دنیا میں بندہ کی ہر تکلیف سے پورا ہو جاتا ہے جیسے اس کو بخار آجائے یا وہ کسی اور مصیبت سے دوچار ہو جائے یہانتک کہ جیب میں کوئی چیز رکھ کر بھول جائے اور اس سے جو تکلیف اس کو پہونچے، وہ تکلیف بھی کفارہ بن جاتی ہے یہانتک کہ بندہ گناہوں سے اس طرح صاف ستھرا ہو کر نکلتا ہے جیسے بھٹی سے سونا، دوسری حدیثوں

سلہ یہ اور اسکی ہم معنی حدیثیں اکثر کتب حدیث میں ہیں مثلاً ترمذی تفسیر اواخر النساء سنن ابی داؤد اوائل کتاب الجنائز،

میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "مسلمان کو کوئی مصیبت پیش نہیں آتی ہے لیکن یہ کہ اللہ تعالیٰ اُس کو اُس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے، یہاں تک کہ اگر اس کے کوئی کانٹا چبھ جائے تو وہ بھی کفارہ بن جاتا ہے" تیسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مسلمان کو کوئی تکلیف یا بیماری، یا غم، یا اذیت نہیں پہونچتی لیکن یہ کہ وہ اُس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ اگر اُس کے کوئی کانٹا چبھ جائے، تو وہ بھی" چوتھی روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ کسی مسلمان کو کوئی تکلیف کانٹا چبھنے سے لے کر اوپر تک جتنی بھی پہونچے، اللہ تعالیٰ اس سے اُس کے گناہوں کو اس طرح جھاڑ دیتا ہے، جیسے درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں[۱]" پانچویں روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "دنیا میں جو مسلمان کسی جرم کا مرتکب ہوا، اور اُس کی سزا اُس کو یہیں مل گئی، تو وہ اُس کے لئے کفارہ اور اس کو اس گناہ سے پاک وصاف بنانے والی ہے[۲]"

سطورِ بالا سے ہویدا ہے کہ کوئی انسان جو اقرارِ توحید کے بعد گناہ سے ملوث ہو گیا ہو، دنیا میں توبہ، اعمالِ نیک اور مصائب پر صبر وشکر کے ذریعہ سے نجات پا سکتا ہے، اور اس دنیا سے اسی طرح پاک وصاف ہو کر نکل سکتا ہے کہ موت کے بعد اس کو کسی نئے کفارۂ گناہ کی ضرورت پیش نہ آئے،

اسی لئے قرآن پاک میں ہے،

وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ	اور ہم البتہ اُن کو بڑے عذاب کے پہلے ادنیٰ عذاب
دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (سجدہ ۲)	کا کچھ مزہ چکھائیں گے تاکہ وہ اب بھی باز آئیں،

---

[۱] صحیح بخاری اوائل کتاب المرضی میں یہ تینوں روایتیں ہیں [۲] صحیح بخاری کتاب الرد علی الجہمیہ،

اس آیتِ پاک سے معلوم ہوا کہ عذابِ الٰہی کا مقصد انتقام اور نفس سزا اور عقوبت نہیں،
بلکہ شریر نفس کو راہِ راست پر لانا ہے، اسی لئے ایک اور آیت میں فرمایا،

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ۔ (نساء - ۲۱)	اللہ تعالیٰ تم کو عذاب دیکر کیا کریگا، اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ کہ خدا (نیکیوں کا) قبول کرنیوالا (تمھاری ہر عمل کو) جاننے والا ہے،

الغرض یہ عذاب اس دنیا میں آیندہ گناہوں سے بچانے اور گذشتہ گناہوں سے پاک کرنے کے لئے ہوتا ہے، اور عالمِ برزخ اور عالمِ بعث چونکہ نئے عمل کے محل نہیں اسلئے ان دونوں مقاموں میں آیندہ کا کوئی سوال نہیں پیدا ہو سکتا، صرف گذشتہ بداعمالیوں کی سزا بھگت کر اُن کے نتائج سے نجات مل سکتی ہے، اور یہی عالمِ برزخ اور عالمِ بعث کے عذابوں کا مقصد ہے، اِلّا یہ کہ پروردگارِ عالم خود اپنی رحمت سے نوازے اور معاف فرمائے،

عذابِ برزخ بھی کفارہ ہے | لیکن اگر کسی انسان کے اندر گناہوں کی ناپاکیاں اتنی زیادہ ہیں کہ اس کی دنیاوی زندگی کے تمام کفارے بھی اسکو دھوکر پاک وصاف نہ بنا سکے تو اُس کو اپنے مرنے کے بعد بھی برزخ کے عالم میں اپنے اعمالِ بد کی مناسب سزاؤں کی صورتوں میں تکلیفیں اٹھاکر پاک وصاف بننا پڑے گا، یہی عالمِ برزخ کا عذاب ہے، اس سے ظاہر ہوگا کہ عالمِ برزخ کی یہ سزائیں اس لئے ہیں کہ ہم نے دنیا میں اپنی ناپاک خواہشوں اور ناپاک کاموں سے احتراز کرنے کی جو زحمت نہیں اُٹھائی اور اچھے کاموں کے کرنے میں جو تھوڑی سی تکلیف پیش آتی ہے، اسکو برداشت کرکے اچھے کام جو نہیں کئے ان دونوں کے معاوضہ میں عالمِ برزخ میں آکر عذاب

کی تکلیفین اٹھائین تاکہ حیاتِ ثانی کے دروازہ پر پہونچ کر بھی اگر ہم ان سزاؤن کے ذریعہ پاک وصاف ہو سکین تو پاک وصاف ہو کر اپنی موروثی بہشت کے قابل بن سکین جو صرف پاکون، اور بے گناہون کی جگہ ہے یعنی اُن کی ہے، جو یا سرے سے کسی گناہ کے مرتکب نہ ہوئے ہون یا یہ کہ گناہ کے مرتکب ہوئے، مگر اعمالِ نیک، توبہ، اور مصائب میں صبر و شکر کرکے یا برزخ میں سزا پاکر وہ گناہون کے داغ سے نجات پا گئے،

یہ بات کہ عذابِ دوزخ بھی ہمارے گناہون کا کفارہ ہے، اسلام کے اس اصول سے مترشح ہے کہ ایک مسلمان کی ہر تکلیف اس کے کسی نہ کسی گناہ کا کفارہ ہے، اس بنا پر عذابِ برزخ بھی اُس کے گناہ کا کفارہ ہوگا، قرآن پاک کی بعض آیتون سے یہ بات بھی کنایۃً نکلتی ہی، گنہگار حشر کے دن کہین گے،

وَبَلَغْنَا اَجَلَنَا الَّذِیْ اَجَّلْتَ لَنَا، (انعام - ۱۵)	اور ہم مقرر وقت جس کو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا تھا، پہونچ چکے،

اس سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ وہ حشر سے پہلے عذاب کے ایک دورے کو ختم کر چکے، بعض حدیثون مین بھی اس کنایہ کی تصریح ملتی ہے کنز العمال میں ایک حدیث ہے،

عَنْ ابْنِ عُمَرؓ، طُوْلُ مَقَامِ اُمَّتِیْ فِیْ قُبُوْرِهِمْ تَمْحِیْصٌ لِذُنُوْبِهِمْ (کنز العمال باب عذاب القبر جلد ۸ ص ۹۹)	ابن عمرؓ سے روایت ہی کہ آپ نے فرمایا کہ میری اُمّت کے لوگون کا اپنی قبروں میں طولِ قیام اُن کو گناہوں سے خالص کرتا ہے،

اسی لئے ایک اور حدیث میں آیا ہے،

اَكْثَرُ عَذَابِ اُمَّتِيْ فِيْ قُبُوْرِهِمْ، — میری امت کے لوگوں کو زیادہ تر عذاب انکی قبروں میں ہوگا،

اس حدیث کا (اگر وہ ثابت ہو تو) منشا یہ ہے کہ اُمتِ محمدیہ کے اکثر افراد اسی برزخ کے محدود زمانہ عذاب میں نکھر کر اور پاک و صاف ہو کر جنت کے قابل ہو جائیں گے اور عذاب دوزخ کی ضرورت اُن کو پیش نہ آئے گی، حافظ ابن قیم ایک موقع پر لکھتے ہیں:

فَاِنْ وفت بالخلاص منها فی هذهٖ	اگر ان بیماریوں کا علاج اس دنیا میں نجات
الدّار والّا ففی البرزخ، فَاِنْ وَفٰى	کے لئے پورا ہو گیا تو خیر، ورنہ برزخ کی سزا سے علاج
بالخلاص والّا ففی موقف القیامة	کیا جائیگا تو اگر یہ نجات کیلئے کافی ہوگیا، تو خیر ورنہ پھر
وهو ایضا ما یخلصهم من تلک البقیة [2]	قیامت کا مقام اور اسکی ہولناکیاں باقی بیماریوں

دنیائے برزخ کی حدیث میں جو پہلے مفصل گذر چکی ہے وہ منظر دکھایا گیا ہے جس میں گنہگار عذاب کے دور سے نکل کر، اور نہرِ حیات میں نئی زندگی پاکر بہشت کے مستحق قرار پائے ہیں [3]، غالباً انہی نجات پانے والے مومنوں کو دیکھ کر مشرکین بھی قیامت میں یہ کہیں گے،

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ	اور جس دن وہ اُن سب کو اکٹھا کریگا، اے گروہ
قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ وَقَالَ	جن! تم نے بہت سے انسانوں کو اپنا بنا لیا، اور
اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ	اُن کے دوست انسان کہیں گے کہ ہمارے پروردگار!
بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ	ہم میں سے ایک نے دوسرے سے کام نکالا،

[1] اس حدیث کو شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ، باب وقائع الحشر میں نقل کیا ہے لیکن مجھے اس کا ماخذ معلوم نہ ہو سکا [2] شفاء العلیل لابن القیم مطبوعہ حسینیہ مصر ص ۲۵۴، [3] صحیح بخاری کتاب التعبیر

اَجَّلْتَ لَنَا ط	اور ہم مقررہ وقت کو جس کو تو نے ہمارے
(انعام - ۱۵)	لئے ٹھہرایا تھا۔ پہنچ چکے۔

یہ الفاظ کہ "ہم اپنے مقررہ وقت کو جس کو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا تھا پہنچ چکے" یہ معنی رکھتے ہیں کہ عالم برزخ کا مقررہ دورۂ عذاب ہم ختم کر چکے، اور اب حشر و نشر کے عذاب کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے اس لئے بعض دوسرے نیک بختوں کی طرح ہم کو بھی اب چھٹکارا ملے جواب ملیگا

قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ	فرمائیگا، آتشِ دوزخ تمھارا ٹھکانا ہوا،
اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ط اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ	اس میں سدا رہوگے لیکن یہ کہ جو اللہ چاہے
عَلِيْمٌ ○ (انعام - ۱۵)	بیشک تیرا رب حکمت اور علم والا ہے

اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تمھارا دورۂ عذاب ختم نہیں ہوا ہے اور تمھاری پاکیزگی ابھی کامل نہیں ہوئی، اس لئے ابھی اس دوسرے عالم کا عذاب بھی تم کو سہنا ہے، پھر جب خدا چاہے گا، تم کو اس سے نجات دیگا، اس کا ہر کام علم و حکمت پر مبنی ہے، اس کے علم و حکمت اور مصلحت کا جب تقاضا ہوگا، تم کو نجات ملے گی،

عذابِ دوزخ کفارۂ گناہ ہے: ابھی یہ آیت اوپر گذر چکی ہے،

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ	خدا کو تمھارے عذاب سے کیا کام، اگر تم
شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ط وَكَانَ اللّٰهُ	شکر کرو، اور ایمان لاؤ کہ خدا تمھاری شکر گذاری
شَاكِرًا عَلِيْمًا ۔ (نساء - ۲۱)	کو قبول کرنیوالا اور (تمھاری دلوں کے حال کو)

(ترجمان، ۲۷۱)

[1] حسب تفسیر ابن عباسؓ، ابن جریر طبری ج ۸ ص ۲۴ مصر،

اس سے ابھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو گنہگاروں کے عذاب سے کوئی خوشی نہیں حاصل ہوتی
نہ وہ چاہتا ہے کہ اس کے گنہگار بندے اس عذاب میں مبتلا ہوں، لیکن ازل سے اس نے اپنے جو قانون
مقرر کر دیئے ہیں، وہ اُن کو توڑتا بھی نہیں، جس وقت آدم کو جنت کی سرزمین سے نکال کر اس
دنیا میں اس لئے بھیجا گیا کہ وہ اپنے عمل کے استحقاق سے اس جنت کو دوبارہ ہمیشہ کے لیے حاصل
کریں اسی وقت یہ قانون بھی اُن کو سُنا دیا گیا تھا،

اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ	یہاں سے تم سب اُترو، تو اگر تمھارے پاس
مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا	میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جس نے
خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ	میری ہدایت کی پیروی کی، تو اُن پر نہ کوئی خوف
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ	ہے، اور نہ وہ غمگین ہوں گے، اور جنھوں نے
اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا	ناشکری کی، اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا
خٰلِدُوْنَ ، (بقرہ - ۴)	تو وہی دوزخ والے ہوں گے، وہ اس میں

اس آیت میں مستحقِ دوزخ ہونے کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں، ایک کفران، اور
دوسری تکذیب، دیکھو کہ اوپر کی نساء والی آیت میں عذابِ دوزخ سے نجات پانے کی دو
شرطیں شکر اور ایمان، اُن کے بالکل بالمقابل ہیں، اس سے ظاہر ہوا کہ شکر اور ایمان استحقاقِ جنت
کی شرطیں اور کفران اور تکذیب استحقاقِ دوزخ کے اسباب ہیں بقیہ تمام نیکیاں شکر اور ایمان کے فروغ
اور تمام بُرائیاں کفر اور تکذیب کی شاخیں ہیں،

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس لئے نہیں بنایا کہ وہ انکو پیدا کر کے دوزخ کا ایندھن بنائے

بلکہ اُس نے تو اُن کو اپنی رحمت کے ظہور کے لیئے پیدا کیا، غیظ و غضب کے اظہار کے لیئے نہیں فرمایا،

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۙ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ، (احزاب - ۹)

ہم نے یہ امانت آسمانوں پر، زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی، تو اُن سب نے اُس کے اُٹھانے سے انکار کیا، اور ڈرے، اور انسان نے اُس کو اُٹھالیا، کہ وہ ظالم اور ناداں تھا تاکہ اللہ نفاق کرنے والوں اور نفاق کرنے والیوں اور شرک کرنے والوں اور شرک کرنیوالیوں کو سزا دے، اور ایمان والوں اور ایمان والیوں پر وہ اپنی رحمت کے ساتھ رجوع ہو، اور اللہ تو بخشنے والا اور رحمت والا ہے،

اس آیتِ پاک سے صاف ہویدا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اصلی صفت یہی ہے کہ وہ غفور رحیم ہے یعنی بخشش و رحمت اس کی صفتِ ذاتی ہے، اب اگر کوئی اپنے آپ پر ظلم کر کے گناہ کرتا ہے، اور اس لیئے وہ اپنے کو رحمتِ الٰہی سے دور کر لیتا ہے، تو یہ خود انسان کا فعل ہے،

فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ، (توبہ - ۹)

اللہ نہ تھا کہ اُن پر ظلم کرتا لیکن وہ اپنی جانوں پر آپ ظلم کرتے ہیں،

وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ (مومن)

اور اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا،

غرض جو کچھ ہے وہ اپنے اعمال کا نتیجہ ہے،

لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى (طٰہٰ - ۱) کہ ہر جان کو اپنے ہی کئے کا بدلہ دیا جائیگا،

اس لئے بہشت یا دوزخ جو کچھ ہے انسان کے اپنے ہی عمل کا لازمی نیتجہ ہے جس طرح دنیا کے ہر عمل کا کوئی نہ کوئی لازمی نیتجہ ہے۔ مثلاً کھانے کا نیتجہ شکم سیری پینے کا سیرابی بھوک کا تکلیف، بیماری کا بے آرامی، گرنے کا چوٹ، زہر کا موت شہد کا مٹھاس، غرض ہر اچھے یا برے فعل کا ایک لازمی جسمانی نیتجہ ہے، جو دنیا میں ہمارے عمل کے بعد ہم کو ملتا رہتا ہے اسی طرح ہم کو اپنے اعمال کا ایک روحانی نیتجہ بھی لازمی ملنے والا ہے۔ جو ہم کو اُس دوسرے عالم میں ملیگا جس طرح زہر کھا کر مرنے کی ذمہ داری خود ہم پر عائد ہوتی ہے، اور ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم زہر کھا کر مر کیوں گئے یا گرنے سے ہم کو چوٹ کیوں آئی، اسی طرح ہم یہ سوال بھی نہیں کر سکتے کہ ہم کو اُن کے اعمال کے بعد دوزخ کی سزا کیوں ملی کہ دونوں ہمارے اعمال کے یکساں لازمی نیتجے ہیں،

اللہ تعالیٰ نے اپنی غایتِ رحمت سے ہم کو اعمال کے نیتجوں سے قبل از وقت مطلع فرما دیا، ہم کو اُس کے نیک و بد کی تمیز کا احساس بخشا، عقل عنایت کی، ضمیر عطا کیا، پھر نبی اور رسول بھیجے شریعت دی، کتاب مرحمت فرمائی، اس پر بھی اگر ہم باز نہ آئے، اور ان اعمال کا ارتکاب کیا تو اب ہم کو اُن اعمال کے نتائج سے کون بچا سکتا ہے،

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ (نساء - ۲۳)

یہ رسول بھیجے، نیکوں کو خوشخبری سنانیوالے اور بدکاروں کو ہشیار کرنے والے تاکہ خدا پر انسان کی حجت باقی نہ رہے،

پھر اپنی رحمت سے سب سے آخر میں اپنی رحمت کے کامل مظہر کو دنیا میں بھیجا،

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ ہم نے تجھ کو (اے پیغمبر) ساری دنیا کیلئے

(انبیاء - ۷) رحمت بنا کر بھیجا،

لیکن ظالم و نادان انسانوں نے اس رحمت کے قبول سے انکار کیا، اور طرح طرح کی بدعقیدگیوں اور بداعمالیوں سے اپنے کو برباد کیا، اور جس غرض سے خدا نے اُن کو پیدا کیا تھا، اس سے اعراض کیا، اور اپنے کو خود اپنے ہاتھوں سے ہلاکت و بربادی میں مبتلا کیا،

وَمَا کَانَ رَبُّکَ لِیُھْلِکَ الْقُرٰی بِظُلْمٍ وَّ اَھْلُھَا مُصْلِحُوْنَ وَلَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّلَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّکَ وَلِذٰلِکَ خَلَقَھُمْ

(ھود - ۱۰)

اور نہ تھا تیرا رب جو آبادیوں کو ظلم سے ہلاک و برباد کرتا، درآنحالیکہ اُن کے رہنے والے نکوکار ہوتے، اور اگر تیرا رب چاہتا تو سب لوگوں کو (زبردستی) ایک راہ پر کر دیتا لیکن وہ ایسی زبردستی نہیں کرتا) اور وہ یونہی ہمیشہ اختلافات میں رہتے ہیں، مگر جن پر تیرے رب

[illegible]

اس آیت سے واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو رحمت کے لئے بنایا ہے عذاب کیلئے نہیں لیکن انسان خود اپنے عمل سے خدا کی رحمت کے بجائے اُس کے عذاب کا سزاوار اپنے کو ٹھہرا لیتا ہے، اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں،

لِلرَّحْمَۃِ خَلَقَھُمْ وَلَمْ یَخْلُقْھُمْ لِلْعَذَابِ، (طبری جلد ۱۲ ص ۸۶ مصر)

خدا نے انسانوں کو رحمت کے لئے پیدا کیا عذاب کے لئے نہیں،

لیکن اگر ظالم و نادان انسان نے خدا کی ان پے درپے رحمتوں کے باوجود اپنے کو اُس کی

رحمت کا مستحق نہ بنایا تو کیا وہ خدائے رحمان ورحیم جس کا یہ اعلان ہے،

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ، (انعام-۲)	اُس خدا نے (مخلوقات) پر رحمت کو اپنے اوپر واجب کرلیا ہے،
سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (انعام-۲)	تم پر سلامتی ہو، تمھارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر فرض ٹھہرالیا ہے،
وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف)	اور میری رحمت نے ہر چیز کو سمالیا ہے،
وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ (کہف)	اور تیرا پروردگار بخشنے والا رحمت والا ہے،
وَرَحْمَتِيْ سَبَقَتْ غَضَبِيْ ، (صحیح بخاری)	اور میری رحمت میرے غضب پر سبقت لیگئی،

وہ اپنے گنہگار روسیہ کار بندوں سے ہمیشہ کے لئے اپنا منھ موڑلے گا، حالانکہ اُس کی رحمت کسی غرض سے نہیں، بلکہ بے غرض ہے، فرمایا،

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ (انعام-۱۶)	اور تیرا رب بے نیاز رحمت والا ہے،

اور تسلی دی ہے،

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ط اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ، (زمر-۶)	اے میرے وہ بندو! جنھوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا ہے، خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو، خدا سب گناہوں کو معاف کرتا ہے، بیشک وہی بخشنے والا رحمت والا ہے،

اُس کی رحمت کا ظہور جس طرح اس دنیا میں ہوا ہے، اُس دنیا میں بھی ہوگا، اور وہاں

اُس کی رحمت کا سب سے بڑا منظر اُس کے مقامِ لعنت (دوزخ) سے دوری، اور اُس کے مقامِ رحمت (بہشت) سے قرب ہی فرمایا:

مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ	جس سے خدا کا عذاب ہٹایا گیا وہی ہے'
رَحِمَهٗ ط وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ،	جس پر اُس نے رحمت کی، اور اُس کی رحمت
(انعام - ۲)	کا یہ حصول ہی کھلی کامیابی ہے،

اللہ تعالیٰ کی اِن پے بہ پے رحمتون کا یہ تقاضا ہے کہ وہ گنہگارون کو زیادہ سے زیادہ یہ کہ اُن کے نتائجِ عمل کے بھگت لینے کے بعد آخر کار اپنی رحمت کے سایہ مین لے لے، اور وہ اُن کو اپنی بخششون سے سرفراز فرمائے،

دوزخ قیدخانہ نہیں شفاخانہ ہے

انسان جب عدم حفظِ صحت کی غلط کاریون کے سبب سے بیمار ہو جاتا ہے تو اکثر یہی سمجھا جاتا ہے کہ فطرت نے اس کو اُن کے معاوضہ مین بیماری کی تکالیف کی سزائین دی ہیں، مگر واقعہ یہ نہین ہے، واقعہ یہ ہے کہ ان غلط کاریون کے جو بُرے نتائج انسان کے جسم کے اندر پیدا ہو گئے ہیں، اُن کو دور کرنے کے لئے جسم جدوجہد کرتا ہے، اس لڑائی کا نام بیماری اور اس لڑائی کی کشمکش کا نام بیماری کی تکالیف و آلام ہے جن کو ہم دردِ سر، دردِ شکم، اعضا شکنی، اور بیخوابی وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، یہی روحانی بیماریون کا حال ہے جنکو ہم اصطلاح شرعی میں "گناہ" اور جن کے نتائجِ بد کو "عذاب" کہتے ہیں، یہ نتائج آتشِ دوزخ اور اس کے شدائد و آلام کی صورت میں ظاہر ہوں گے، اور جن کا منشا یہ ہوگا کہ روحِ انسانی اپنی غلط کاریوں کے نتائجِ بد کو دور کرنے کے لئے جدوجہد میں مصروف ہوگی، اور جونہی وہ اُن سے عہدہ برآ ہوگی خدا کی

رحمت سے سرفرازی پاکے اس عذاب سے نکل کر اپنی موروثی بہشت میں داخل ہوگی،

اس تمہید سے یہ ظاہر ہے کہ دوزخ کی مثال یہ نہین ہے کہ وہ مجرمون کے لئے قید خانہ ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ بیمارون کے لئے شفاخانہ ہے، بیمار کو شفاخانہ کے اندر بھی ہر قسم کی تکلیفیں محسوس ہوتی ہین، درد، اعضاشکنی، شدت تشنگی، سوزش جسم، وہان اُس کو کڑوی سے کڑوی غذا پلائی جاتی ہے، بدمزہ سے بدمزہ کھانا کھلایا جاتا ہے، ضرورت ہوتی ہے، تو اُس کو نشتر دیا جاتا ہے اس کا کوئی عضو کاٹا جاتا ہے، کوئی داغا جاتا ہے، اور ان سب کی تکلیفین اُس کو اٹھانی پڑتی ہین مگر یہ ساری ایذارسانی کبھی انتقام اور تکلیف دہی کی غرض سے نہیں ہوتی، بلکہ عدم صحت کی غلط کاریون کے بُرے نتائج سے اس کے جسم کو محفوظ رکھنے کی غرض سے کیجاتی ہے اُس کو جو تکلیفین وہان محسوس ہوتی ہیں، وہ گو شفاخانہ کے اندرہی محسوس ہوتی ہیں مگر ان سب کا سبب شفاخانہ نہیں بلکہ خود اس بیمار کا اصول صحت سے دانستہ یا نادانستہ انحراف کرنا اور اسکی وجہ سے ان بیماریون میں مبتلا ہونا

یہ اصول اُن آیتون اور صحیح حدیثون سے پوری طرح سمجھ مین آتا ہے، جن میں بالآخر عذاب دوزخ سے نجات پانے کی کیفیت بیان کی گئی ہے، دنیاوی آلام وتکالیف کی نسبت قرآن نے یہ اصول پیش کیا ہے،

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ، (آل عمران - ۱۴)	اور تاکہ خدا ایمان والوں کو پاک وخالص کرے، اور کافروں کو مٹائے،

یہی اصول عذاب اُخروی پر صادق آتا ہے کہ اس سے بھی مقصود گنہگار اہل ایمان کی پاکی و صفائی ہے: چنانچہ حدیث صحیح مین ہے کہ حقوق عباد کے بعد

حَتّٰی اِذَا هُذِّبُوْا وَنُقُّوْا اُذِنَ لَهُمْ	یہاں تک کہ جب گنہگار چھٹ جائیں گے، اور
فِیْ دُخُوْلِ الْجَنَّةِ (صحیح بخاری باب	پاک و صاف ہو جائیں گے، تب اُن کو جنت
القصاص یوم القیامۃ صفحہ ۹۶۶)	میں داخل ہونے کی اجازت ملے گی،

اس حدیث میں یہ دو لفظ هُذِّبُوْا وَنُقُّوْا ذرا تشریح طلب ہیں، هذبوا کا مصدر تہذیب ہی، تہذیب کے لغوی معنی یہ ہیں کہ درختوں کی خراب شاخیں اس لئے چھانٹ دیجائین، تاکہ اُن میں سرسبزی و شادابی پیدا ہو، اور ترقی کی نئی زندگی اُن کو مل جائے، اور نقوا کا مصدر تنقیہ ہے تنقیہ کے اصلی معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے اندر سے خراب و فاسد مادہ کو الگ کر دیا جائے تاکہ وہ پوری طرح نکھر جائے، اس تشریح سے صاف کھل گیا کہ گنہگاروں کو جنت کے داخلہ کے لئے کیا درکار ہے، اسی لئے قرآن پاک میں ہے کہ اہل جنت جب جنت کے قریب پہنچیں گے تو ندا آئیگی؛

طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِیْنَ،	تم پاک و صاف ہو چکے تو جنت میں سدا
(زمر - ۸)	کے لئے آجاؤ،

الغرض جب اُس طیب و پاکیزگی کا دور آئے گا تو گنہگاروں کو بھی نجات ملیگی، اسی لئے ہر گنہگار کے لئے دوزخ سے نکلنے کی مدت خواہ کتنی ہی طویل ہو، مگر بہرحال اسکی انتہا ہے فرمایا؛

لٰبِثِیْنَ فِیْهَا اَحْقَابًا (نبا)	دوزخ میں وہ صدہا سال تک پڑے رہیں گے؛

لیکن بالآخران صدہا سال کا بھی ایک دن خاتمہ ہوگا، اور خدا نے چاہا تو اُن کو نجات ملیگی؛ حدیث رویائے برزخ میں ہے کہ "آپ نے دوزخ میں کچھ ایسے لوگوں کو بھی دیکھا، جنھوں نے کچھ اچھے اور کچھ بُرے کام کئے تھے، اُن کا آدھا دھڑ تو نہایت خوبصورت اور آدھا سخت بدصورت

تھا جب اُن کی سزا کی مدت ختم ہوئی تو فرشتوں نے اُن سے کہا کہ جاؤ اور اس نہر میں جا کر پڑ جاؤ سامنے وہ نہر تھی جس میں خالص سپید پانی بہ رہا تھا، وہ اس مین جا کر پڑ گئے، پھر نکل کر آئے، تو اُن کی وُہ بدصورتی جاتی رہی اور نہایت خوبصورت ہو گئے" اس سے ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت کیونکر گنہگارون کو سرفراز فرمائے گی،

گویا دوزخ بھی ایک نعمت ہے | اس تفصیل کے بعد اگر یہ کہا جائے کہ قیامت اور دوزخ کی ہولناکیان اور سزائین بھی گنہگارون کے لئے اللہ تعالیٰ کی اسی طرح نعمت ہیں جس طرح اس دنیا میں شفاخانون کا وجود بیمارون کے لئے نعمت ہے، اگر دوزخ نہ ہوتی تو گنہگارون کی پاکیزگی اور پاکون کی جنت مین اُن کے داخل ہونے کی کوئی صورت نہ تھی اس رحمان ورحیم کی رحمت وکرم نے گوارا نہ کیا کہ ان بدبختون کو اُن کی نافرمانیون کے باوجود ہمیشہ کے لئے محروم رکھا جائے، اس لئے اُن کی صفائی کے لئے پہلے برزخ کا حمام مقرر کیا، اور جو اس سے بھی پاک نہ ہو سکیں، اُن کے لئے دوزخ کی آگ مقرر کی کہ وہ اپنی ہر قسم کی بداعمالیون کے میل کچیل کو جلا کر نکھر کر پاک ہو جائیں، اور کندن بن کر بالآخر اپنی آبائی اور فطری وراثت (جنت) پائین، اس نظریہ کو پیش نظر رکھ کر قرآن پاک کی ان آیتون کو پڑھئے جن میں قیامت اور دوزخ کی ہولناکیون اور مصیبتون کو بھی نعمت سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا،

يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّ	تم پر آگ کے صاف اور دھوان ملے شعلے
نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرَانِ ج فَبِاَيِّ	چھوٹین گے، پھر کوئی تمھاری مدد نہ کر سکے گا تو

لہ صحیح بخاری کتاب التعبیر،

اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ، فَاِذَا انْشَقَّتِ	اپنے پروردگار کی کن نعمتون کو تم جھٹلاؤ گے،
السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ	پھر جب آسمان پھٹ کر تلچھٹ کی طرح گلابی
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ،	ہو جائے گا تو اپنے پروردگار کی کن نعمتون کو
فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ	تم جھٹلاؤ گے، پھر اس دن کسی انس وجن سے
اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ج فَبِاَيِّ اٰلَآءِ	اُس کے گناہ کی نسبت پوچھا نہ جائیگا، تو تم
رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ، يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ	اپنے پروردگار کی کن نعمتون کو جھٹلاؤ گے،
بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَ	گنہگار اپنی نشانیون سے پہچان لیے جائینگے،
الْاَقْدَامِ ج فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا	پھر وہ اپنی پیشانیون کے بال اور پاؤن سے
تُكَذِّبٰنِ، هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ	پکڑے جائین گے، تو اپنے پروردگار کی کن
يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ، يَطُوْفُوْنَ	نعمتوں کو تم جھٹلاؤ گے، یہ وہ دوزخ ہے جس کو
بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ج فَبِاَيِّ	گنہگار جھٹلاتے تھے، وہ اس دوزخ اور گرم
اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ،	پانی کے بیچ میں گشت کرین گے، تو تم اپنے
(رحمٰن ۔۲)	پروردگار کی کن نعمتون کو جھٹلاؤ گے،

ان آیتون کی تفسیر کسی پہلو سے بھی کیجئے، یہ بات بہر حال ماننی پڑے گی کہ قیامت اور دوزخ کے ہولناک احوال، مجرمون کے حق میں نعمت ہیں، اس لئے بھی کہ دنیا میں وہ اُن کے ڈر سے برائیون کو چھوڑ کر راہِ راست پر آتے ہیں، اور اس لئے بھی کہ آخرت مین وہ ان ہی کے ذریعہ سے اپنے گناہون کے نتائج بد سے بری ہو کر بہشتِ ربانی کے لائق بن سکین گے،

دوزخ میں رحمتِ الٰہی کا ظہور اور نجات

انسان اور وہ بھی اللہ کی توحید کا قائل اور رسولوں کی صداقت کا معترف خواہ کسی قدر گمراہ اور گنہگار رہو تاہم اس کے نامۂ اعمال میں کچھ نہ کچھ نیکیاں ضرور ہوں گی، قیامت گو اللہ تعالیٰ کے عتاب جلال کا روز ہوگا جس میں ہر گنہگار کو اپنی گنہگاری کا ملزم ہونا پڑے گا، مگر بالآخر اس رحمان ورحیم کی شانِ رحیمی کا ظہور ہوگا، اور رَحْمَتِي سَبَقَتْ غَضَبِي (اور میرے غصہ سے میری رحمت سبقت لے گئی ہے) کے اعلان کا مصداق شفاعت کی صورت میں جلوہ گر ہوگا، اور گنہگاروں کو اس کی بدولت گناہوں کے داغ سے پاک وصاف ہو کر پاکوں کی بہشت میں داخلہ کی اجازت ملے گی، فرمایا:

وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا	اور جو اللہ پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے،
يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ	اس سے اس کی برائیاں جھاڑ دے گا، اور
(تغابن - ۱)	اس کو جنت میں داخل کرے گا،
وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا	اور دوسرے لوگ جنھوں نے اپنے گناہوں
عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللّٰهُ	کا اقرار کیا، اور ملایا، ایک کام نیک اور دوسرا
اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ	بد، شاید اللہ ان کو معاف کرے، بیشک اللہ
رَّحِيْمٌ، (توبہ - ۱۳)	بخشنے والا رحم والا ہے،

اس معافی کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ وہ بالکلیہ یعنی عذاب کے بغیر ہی معاف کردے دوسری یہ کہ وہ دوزخ میں کچھ دن جا کر خدا کی معافی سے سرفراز ہو کر اس سے نکلیں، فرمایا،

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ	اور تم میں کوئی نہیں جو جہنم میں وارد نہ ہو تیرے

عَلٰی رَبِّكَ حَتۡمًا مَّقۡضِیًّا، ثُمَّ نُنَجِّی — رب کا یہ ضروری فیصلہ ہی، پھر ہم اُن کو جو

الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِیۡنَ — خدا سے ڈرے نجات دین گے، اور مشرکوں اور

فِیۡهَا جِثِیًّا، (مریم - ۵) — کافروں کو ہم اس میں گھٹنے کے بل گرے ہوئے

احادیث صحیحہ مین اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حسب ذیل تصریحات مذکور ہین،

۱- حضرت جابرؓ سے روایت ہی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شفاعت کے ذریعہ لوگ دوزخ سے چھوٹی گگڑیون کے مانند نکلیں گے ؎ (صحیح بخاری، کتاب الشفاعۃ)

۲- حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "دوزخ سے کچھ لوگ اسکی جھلس کھا کر نکلین گے اور جنت میں داخل ہون گے"، (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

۳- حضرت ابوسعیدؓ خدری سے روایت ہی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جنت والے جنت مین اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہوچکین گے تو خدا فرمائیگا کہ جس کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان ہو، اس کو دوزخ سے نکالو، تو وہ کوئلے ہوکر نکلین گے، پھر وہ نہر حیات میں ڈال دئیے جائیں گے، تو وہ اس طرح اگین گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ مین جنگلی دانہ اگتا ہی" (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

۴- حضرت انس بنؓ مالک سے روایت ہی کہ آپنے قیامت کے حالات بیان کرتے ہوئے فرمایا "پھر مین سجدہ میں گر پڑون گا اور پڑا رہون گا، تو آواز آئیگی کہ اے محمد! سر اٹھا مانگ دیا جائیگا، تو میں سر اٹھاؤن گا اور اس حمد سے جو خدا مجھے سکھائے گا اسکی حمد کرون گا، اور سفارش کرون گا تو خدا ایک حد مقرر فرمائیگا تو مین اُن کو دوزخ سے نکالوں گا اور جنت میں داخل کرون گا، پھر لوٹ کر آؤنگا اور سجدہ مین گر پڑوں گا، پھر وہ کچھ لوگون کو بخش دیگا، اسی طرح تیسری، پھر چوتھی بار کرونگا یہانتک کہ

دوزخ میں پھر وہی رہجائیگا جس کو قرآن نے روک رکھا ہے" (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

۵۔ حضرت عمران بن حصین سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "محمد کی شفاعت سے کچھ ایسے لوگ دوزخ سے نکلیں گے اور جنت مین داخل ہون گے جن کا نام جہنم والے ہوگا" (ر)

۶۔ حضرت ابوہریرہؓ کے سوال پر آپنے فرمایا کہ "میری سفارش سے سرفراز ہونیکی خوش قسمتی اس کو حاصل ہوگی جس نے خلوص قلب سے اللہ کی توحید کا اقرار کیا ہو"۔ (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

۷۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ "جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے فیصلہ سے فراغت پا ئیگا اور چاہیگا کہ اُن کو جنھون نے اس کی توحید کی گواہی دی تھی، دوزخ سے نکالے تو فرشتون کو اُن کے نکالنے کا حکم دیگا، فرشتے ان توحید والون کو اس علامت سے پہچانین گے کہ اُن کی پیشانیون مین سجدہ کے نشان ہوں گے کہ خدانے آدم کے بیٹے کی پیشانی کے نشانِ سجدہ کو دوزخ کی آگ پر حرام کردیاہے تو وہ ان کو جلا نہ سکے گی، فرشتے جب ان کو نکالین گے تو وہ جلے جھلسے ہون گے پھر اُن پر آبِ حیات چھڑکا جائیگا، تو وہ اس طرح اوگیں گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ مین جنگلی دانہ اُگتا ہے" (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

۸۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے، آپنے فرمایا کہ "جنت والے جنت اور دوزخ والے دوزخ مین داخل ہوچکین گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا، دیکھو جس کے دل میں ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکالو، تو وہ جل کر کوئلہ ہوکر نکلیں گے پھر وہ نہرِ حیات میں ڈال دیئے جائین گے تو اس طرح وہ اُگین گے جس طرح سیلِ آب کے کنارے جنگلی دانہ اُگتا ہے" (صحیح بخاری کتاب الایمان)

۹۔ حضرت ابوسعید خدری رضؓ سے روایت ہے، آپ نے فرمایا کہ "اہلِ دوزخ جو دوزخ مین ہمیشہ رہین گے، وہ اس میں نہ مریں گے، نہ جئیں گے لیکن وہ لوگ جن کو دوزخ کی آگ بعض گناہون کی وجہ سے چھوئے گی، تو وہ اس میں کچھ دیر کے لئے مرجائین گے، یہان تک کہ وہ جل جائینگے پھر اُن کے حق میں شفاعت کی اجازت ہوگی، تو وہ تھوڑے تھوڑے کرکے آئین گے، اور جنت کی نہرون مین پھیل جائین گے، اور اہلِ جنت سے کہا جائیگا کہ اُن پہ پانی بہاؤ تو وہ اس طرح اوگین گے، جیسے سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانے" (صحیح بخاری کتاب الایمان)

۱۰۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ "آپنے فرمایا کہ سب سے آخر مین جو شخص دوزخ سے نجات پاکر نکلے گا، وہ گھسٹتا ہوا نکلے گا، اور اُس کو جنت بھری معلوم ہوگی"......(")

۱۱۔ حضرت ابوسعید خدری رضؓ سے صحیحین مین روایت ہے کہ خدا فرمائے گا کہ "ملائکہ نے سفارش کی اور پیغمبرون نے سفارش کی، اور اہلِ ایمان نے سفارش کی، اور اب صرف وہ رہ گیا جو تمام رحم کرنے والون مین سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے یعنی خود وہ رحمان ورحیم، تو وہ دوزخ سے مٹھی بھر کر اُن لوگون کو نکالیگا جنھون نے کبھی کوئی بھلائی نہین کی" (صحیحین)

۱۲۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ حکم ہوگا کہ جس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا ہو اور اُس کے دل میں جو برابر بھی نیکی ہو، اُس کو دوزخ سے باہر کرو جس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا ہو اور گیہون کے دانہ کے برابر بھی اُس کے دل مین نیکی ہو، اور جس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا ہو اور جو کے دانہ کے برابر بھی اس کے دل مین نیکی ہو، اُس کو دوزخ سے الگ کرو" (ترمذی صفۃ النار حدیث حسن صحیح)

احادیث کی کتابون مین اس قسم کی اور بہت سی حدیثین ہیں جن کا استقصا یہان مقصود نہین، ان تمام حدیثون مین قرآن پاک کی اس اہم آیت کا جلوہ موجود ہے،

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ، (نساء - ۱۸)	بیشک اللہ اس کو معاف نہ کریگا کہ اس کیساتھ شرک کیا جائے، اور اس کے سوا جو گناہ ہو وہ اُس کو جس کے لئے چاہے گا معاف کردیگا،

اس آیت میں تصریح ہے کہ شرک کے علاوہ ہر گناہ کے نتیجہ سے برأت کیجاسکتی ہے مگر شرک وہ بیماری ہے جس کے نتائج سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں، اس لئے اُن کے نتائج بد بھگتے بغیر نجات کا تصور بھی خدا کے قانونِ ابدی کے خلاف ہے،

شرک و کفر کی بخشایش نہیں

احکامِ الٰہی اور شریعتِ ربانی کی کھلی ہوئی دو قسمیں ہیں، ایک کا تعلق دل اور قلب سے ہے اور جو بمنزلۂ اصل کے ہے، اس کو مذہب کی زبان مین ایمان، فلسفہ کی اصطلاح مین علم، اور تصوف کی بولی میں عرفان کہتے ہین، اور دوسری قسم وہ ہے جو اس عقیدۂ اول کی فرع اور نتیجہ ہے، اور جس کا تعلق اعضا، اور جوارح سے ہے، اُس کو ہم مختصراً عمل اور تفصیلاً عبادات معاملات اور اخلاق کہتے ہیں، شرک و کفر کے گناہ کا تعلق قسم اول سے ہے اور دوسرے گناہون کا تعلق قسم دوم سے ہے، دلون مین ایمان وعلم وعرفان کی اگر ایک کرن بھی ہو، تو اس ظلمتکدہ کی روشنی کی امید کسی طرح کیجاسکتی ہے، مگر جس کا شانۂ دل میں اس نور کا ایک ذرہ بھی نہ ہو اُس کی روشنی سے ہمیشہ کے لئے ناامیدی ہے، اسی لئے ایمان کے بغیر اعمال بھی کالعدم ہوجاتے ہیں، اور جہان ایمان کچھ بھی موجود ہے، اعمالِ خیر کا کچھ نہ کچھ وجود ضروری ہے، البتہ اعمالِ شر کا بھی ساتھ ساتھ وجود ہے

جن کی تلافی عذابِ دوزخ کے بعد یا خدا کی رحمت سے ہو سکتی ہے، اور نجات مل سکتی ہے، ایمان وعلم و
عرفان جس کی حقیقت "ایمان بالغیب" ہے، اُس کا حصول موت کے بعد جب حقائق خود بخود ہمارے
سامنے آجاتے ہیں، ہماری وسعت کا نتیجہ نہیں، بلکہ خود اُن حقائق کے ظہور کا نتیجہ ہوگا، اس بنا
پر شرک وکفر کے گناہ کی مغفرت کی امید قانونِ الٰہی کے مطابق ناممکن ہے، البتہ عمل کی کمی کی
تلافی جو دوسری قسم کا گناہ ہے، خدا کی رحمت سے بعید نہیں ہے،

سمجھنے کے لئے ان دونوں کی کھلی ہوئی مثال یہ ہے کہ دنیا میں تعلیمی امتحان کے لئے ۳۳ نمبر
کم از کم فرض کیا گیا ہے، اب اگر کسی کا پرچہ بالکل سادہ ہے، اور اس لئے اس کا نمبر صفر محض ہے تو رحم دل
سے رحمدل ممتحن کے لئے بھی یہ ناممکن ہے کہ اُس کو ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں بھی کامیاب کرسکے،
لیکن جس نے کچھ جوابات لکھے ہیں، اور کچھ چھوڑ دیئے ہیں، اور کچھ غلط لکھے ہیں، تو اگر وہ ۲۹ و ۳۰
کے قریب بھی پہنچ گیا ہے، تو رحمدل ممتحن ۳۳ تک اس کو پہنچا کر ادنیٰ درجہ میں کامیاب بنا سکتا ہے

الغرض ایمان وعلم وعرفان کے مجرم جن کا نام مشرک وکافر ہے، اپنے ناقابلِ تلافی نتیجہ
کے بھگتے بغیر عذابِ دوزخ سے رہائی کا تصور بھی نہیں کرسکتے کہ اُن کی دنیاوی زندگی کا عرفانی
فقدان رحمتِ الٰہی کو اپنی طرف جذب کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا، مگر کیا شرک وکفر کے گنہگاروں
کے لئے شرک وکفر کے دورۂ عذاب کے طے کر لینے کے بعد بھی رہائی کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ اس کا
جواب آیندہ سطروں میں ملے گا،

کیا دوزخ کی انتہا ہے؟ | دوزخ جو عقابِ الٰہی کا گھر ہے، کیا ہمیشہ آباد رہیگا؟ اللہ تعالیٰ کی رحمت
عمومی کے قائلوں کے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے، اُن کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مقررہ مدت دراز

کے بعد ایک دن جب جہنم کی آگ رحمتِ الٰہی کے چھینٹون سے بالآخر سرد ہو جائے گی حدیث صحیح مین ہو کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہو کہ جنت میری رحمت، اور دوزخ میرا عذاب ہو ۵۱ اسی کے ساتھ حدیث صحیح مین وارد ہو کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کا فیصلہ کیا، اسی وقت اُس نے اپنے عرش کے اوپر یہ لکھدیا کہ

رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ ۵۲ میری رحمت میرے غضب سے سبقت لیگئی ہو،

(حاشیہ صفحہ ۷۷۹) ۵۰ ابتدائی اسلامی فرقون مین جہنم کی ابدیت اور غیر ابدیت پر بہت سے مناظرے ہو چکے ہین جنکی تفصیل ملل ونحل کی کتابون میں موجود ہو، ایک دو کو چھوڑ کر اس پر تو بے شبہہ قطعیت کے ساتھ سب کا اتفاق ہو کہ جنت کا وجود دائمی اور ابدی ہو، لیکن جہنم کے دوام اور ابدیت میں کسی قدر اختلاف ہو، عام اہل سنت کا عقیدہ یہ ہو کہ جہنم اور جنت دونون کا وجود دائمی ہو گنہگار مومن اپنے گناہ کے بقدر عذاب اٹھا کر یا خدا کی رحمت سے معاف ہو کر بالآخر جنت میں داخل کئے جائینگے لیکن مشرک و کافر کے گناہ کبھی معاف نہ ہون گے، اور وہ ہمیشہ دوزخ میں جلیں گے، فقہا اور محدثین کا ایک گروہ جو مرجیہ کہلاتا ہے اس بات کا قائل ہو جو مومن ہوگا وہ گنہگار بھی ہوگا، تو بھی دوزخ مین نہ جائیگا، بلکہ معافی سے سرفراز ہو کر شروع ہی سے جنت مین داخل ہوگا، اس کے برخلاف خوارج اور معتزلہ کا یہ عقیدہ ہو کہ مومن بھی اگر گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا تو وہ بھی کفار کی طرح ہمیشہ دوزخ ہی میں رہیگا، اور بھی اس بارہ میں لوگون کی مختلف رائین ہین اہل سنت کے ایک مختصر گروہ کا جس میں صحابۂ کرام اور تابعین کے نام بھی ہیں، اور متاخرین میں جس کے پرجوش حامی حافظ ابن قیم ہیں، یہ خیال ہے کہ جب گنہگار اپنے اپنے گناہون کے بقدر عذاب پا چکیں گے، تو جہنم فنا کر دیجائے گی، حافظ ابن قیم نے اپنی دو کتابون (شفاء العلیل اور حادی الارواح (دونون مطبوعہ ہین حادی الارواح اعلام الموقعین کے ساتھ چھپی ہے) میں قرآن، احادیث، آثار صحابہ اور عقل کی پچیس دلیلون سے اپنے مسلک کو مبرہن کیا ہے، (دیکھو شفاء العلیل از ص ۲۵۲ تا ص ۲۶۲ حسینیہ مصر، اور حادی الارواح از ص ۱۶۷ تا ۲۳۵، جلد دوم مطبعہ جدیدہ مصر) علامہ ابن تیمیہ نے بھی اس نظریہ کو سلف اہل سنت کے ایک فریق کا خیال تسلیم کیا ہے، (حادی الارواح ابن قیم جلد دوم ص ۱۶۷) ایک زیدی یمنی عالم شیخ مقبلی نے بھی اس کو قبول کیا ہو، (العلم الشامخ فی ایثار الحق علی الآباء والمشائخ (ص ۱۲۲) صوفیہ میں شیخ محی الدین ابن عربی اور ان کے متبعین یہ فرماتے ہین کہ کافر و مشرک جن پر خلود نار کا حکم ہے، وہ بالآخر دوزخ میں رہتے رہتے ایسے ہو جائین گے کہ ان کو اسی دوزخ میں راحت و لذت معلوم ہونے لگے گی، جیسے بعض کیڑے غلاظتون ہی کو پسند کرتے ہین، اور ان ہی مین لطف اٹھاتے ہین، میں نے اس باب کو بہت ڈرتے ڈرتے لکھا ہے، کہ اس مین اجمال الٰہی کی تصریح کا جرم عائد ہوتا ہو اگر یہ اختیار کردہ پہلو حق نہ ہو، تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے، اور توبہ کی توفیق بخشے اور اپنی مراد کا دروازہ مجھ پر کھولے،

۵۱ صحیح بخاری باب رحمۃ اللہ جلد دوم ص ۱۱۱۰ و صحیح مسلم ۵۲ صحیح بخاری باب ولقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین جلد دوم صفحہ ۱۱۱۰ و صحیح مسلم باب سعۃ رحمۃ اللہ،

اب اگر دوزخ جو اس کے غضب کا مظہر ہے، اُس کی جنّت ہی کی طرح دائمی وابدی ہو تو اس کا غضب اس کی رحمت پر سبقت لئے جاتا ہے، یا برابر ہوا جاتا ہے، اور اُس کا تخیل بھی اس رحمان ورحیم کی نسبت نہیں ہو سکتا، اسی طرح حدیث مین آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصّوں مین سے صرف ایک حصّہ دنیا میں اُتارا اور ننانوے حصّے قیامت کے دن کے لئے رکھے ہیں[۵]، اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ ایک دن آئیگا جب اُس کے غضب پر اسکی رحمت غالب آئیگی، اور اُس کی رحمت کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا، اور یہ وہ دن ہوگا جب گنہگار اپنے گناہون کی ناپاکیون اور نجاستون سے اپنے مقررہ وقت پر پاک ہوکر اُس کی رحمت کی سرفرازی کے قابل بنیں گے،

اسلام کی روسے سب سے بڑے مجرم مشرک وکافر ہیں، جو اس وقت تک نجات نہ پاسکین گے جب تک دوزخ کے تنور مین ایک گرم کوئلہ بھی باقی ہے تاہم اُن کے عذاب کی مدت کی نسبت بھی قرآن میں حسب ذیل تین تصریحات ہیں،

۱- لَابِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا (نبا-۱) — وہ دوزخ میں صدہزار سال ٹھہریں گے،

صدہا ہزار سال کی مدت کسی قدر بڑی ہو، پھر بھی ایک دن اُس کا خاتمہ ہوگا، دوسری آیت جو صریحًا کفار ومشرکین کے حق میں ہے، یہ ہے،

۲- اَلنَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ، (انعام-۱۵) — دوزخ ہے تمھارا ٹھکانا اس میں تم سدا رہنے والے ہو لیکن یہ کہ اللہ جو چاہے، بیشک تیرا رب حکیم وعلیم ہے،

---

[۵] صحیح مسلم باب سعۃ رحمۃ اللہ،

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ شرک و کفر کی سزا تو اصل میں قانوناً یہی ہے کہ دوزخ مین دائمی سزا دیجاتی رہے، مگر اسکی رحمت کا اقتضا کچھ اور ہے لیکن وہ حکیم و علیم ہے، اس لئے وہ اپنا ہر کام اپنی حکمت و مصلحت اور علم کے مطابق کرتا ہے، اور وہی جانتا ہے کہ کس کے حق میں کیا کرنا چاہیے، اور کب کرنا چاہیے،

تیسری آیت مین ہی،

۳- خَالِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ	وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، جب تک آسمان
وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ	و زمین قائم ہیں، لیکن یہ کہ جو تیرا رب چاہے بیشک
رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (ھود-۹)	تیرا رب جو چاہتا ہے، وہ کرتا ہے،

دوسری اور تیسری آیتون مین اللہ تعالیٰ نے اُن کے حق میں اپنی مشیئت کو عذاب کی انتہا بتایا ہے، اور اپنے کو "رب" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جس سے اشارہ نکلتا ہے کہ اس کی مشیئت سے بالآخر اس عذاب کا ختم ہو جانا اُس کی "ربوبیت" کا اقتضا ہے۔

قرآن پاک میں کوئی ایسی صاف و صریح آیت موجود نہین ہے جس سے دوزخ کی بقائے دوام، عدم انتہا، اور تسلسل وجود پر بتصریح استدلال کیا جا سکے، حالانکہ اس کے برخلاف بہشت کی ہمیشگی و بقاء و عدم انقطاع و عدم فنا کی بیسیون آیتین قرآن پاک مین موجود ہیں، چنانچہ ان دونون کے فرق کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے اس اوپر والی آیت کو ہم تمام و کمال یہان نقل کرتے ہیں، فرمایا،

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ	تو لیکن جو بدبخت ہوئے وہ دوزخ میں ہونگے
فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ۙ خٰلِدِيْنَ	اس مین اُن کو گدہون کی طرح چلانا

فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ	اور رینکنا ہے، جب تک آسمان اور زمین ہیں،
اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ	وہ اس دوزخ میں رہیں گے، مگر جو چاہے تیرا
لِّمَا يُرِيْدُ ، وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا	رب، بیشک تیرا رب جو چاہے کر ڈالتا ہے، اور
فَفِى الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيهَا مَا دَامَتِ	لیکن وہ جو خوش قسمت ہوئے، تو وہ جنت
السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ	میں ہوں گے، ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک
رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ -	آسمان وزمین قائم رہیں، مگر جو چاہے تیرا رب
(ھود - ۹)	یہ غیر منقطع بخشش ہوگی،

دیکھو کہ اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ دونوں کے لئے خلود و دوام فرمایا، پھر ان دونوں میں اس کے بعد اپنی مشیئت سے استثنا فرمایا، مگر اہلِ دوزخ کے دوام کے ذکر میں فرمایا کہ "مگر جو چاہے تیرا رب، بیشک تیرا رب جو چاہے، کر ڈالتا ہے" اس سے معلوم ہوا کہ وہ چاہے، تو دوزخ کے عذاب کو ختم کردے، اور چاہے تو قائم رکھے لیکن اہل جنت کے دوام کے ذکر میں بتصریح فرمایا "مگر جو چاہے تیرا رب، یہ غیر منقطع بخشش ہوگی" اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ جنت کے حق میں اسکی مشیئت یہی ہوگی کہ وہ بے انقطاع اور غیر منتہی دوام و تسلسل کے ساتھ ہمیشہ قائم و باقی رہے، اس آیت کی تفسیر میں متعدد ائمہ سلف مثلاً ابن زید اور شعبی وغیرہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کے بارہ میں تو اپنی مشیئت ظاہر فرمادی کہ وہ مسلسل اور غیر منقطع ہے لیکن اہلِ دوزخ کی نسبت اپنی مشیئت کو کسی مصلحت سے مخفی رکھا ہے[1]،

---

[1] تفسیر طبری و در منثور سیوطی، تفسیر آیات ہود رکوع ۹ و انعام رکوع ۱۵،

ایک مقام پر خاص طور پر کفار و مشرکین کا نام لیکر اسطرح فرمایا گیا ہے،

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ	بیشک اہل کتاب اور مشرکون میں سے جنھوں نے
وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا	کفر کیا، وہ جہنم کی آگ میں (خالد) پڑے رہیں،
اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ، اِنَّ الَّذِيْنَ	یہ بدترین لوگ ہیں، بیشک جو ایمان لائے، اور اچھے
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ، اُولٰٓئِكَ هُمْ	کام کئے وہ بہترین لوگ ہیں، اُن کی جزا اُن کے
خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ط جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ	پروردگار کے نزدیک بسنے کے باغ ہیں، جن
جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ	میں نہریں بہتی ہوں، وہ اس میں ہمیشہ
خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا، (بینہ)	(خالد) رہیں گے،

غور سے دیکھو کہ اس مین اہل دوزخ کے مقابلہ مین اہل جنت کے دوام کی نسبت کتنی تاکید پر تاکید ہے، پہلے "عدن" فرمایا جس کے معنی "قیام" اور "بسنے" کے ہیں، پھر "خالدین" کہا کہ وہ اس مین رہا کرین گے" بعد ازین "ابداً" فرمایا کہ وہ جنت میں ابدی طور سے قیام کرین گے،

اسی طرح ایک اور سورہ میں ہے،

وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ	اور اس کو اُن باغون میں داخل کرے گا،
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا	جن کے نیچے سے نہرین بہتی ہوں گی جن میں وہ
ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ، وَالَّذِيْنَ	ہمیشہ رہا کریں گے، اور وہی بڑی کامیابی ہے،
كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ	اور جنھون نے انکار کیا، اور ہماری باتوں
اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ط	کو جھٹلایا وہی دوزخ والے ہیں وہ اس مین

وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۔ (تغابن ۔ ۱) رہا کریں گے ، اور وہ بری جگہ ہے ،

دیکھو کہ تقابلاً دونوں میں خالدین (رہا کریں گے) اور خالدین فیہا ابداً (ہمیشہ رہا کریں گے) کا فرق کتنا نمایاں ہے کہیں یہ کیا گیا ہے کہ کفار کے عذاب میں مدت کی تعیین سے سرے خاموشی برتی گئی ہے ، اور جنت میں خلود کی تصریح فرما دی گئی ہے ، مثلاً

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوهٌ	جس دن کچھ منہ سپید ہوں گے اور کچھ سیاہ
فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ	تو جو سیاہ ہوئے ، تو کیا ایمان کے بعد کافر
اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا	ہو گئے تھے ، تو اپنے کفر کی پاداش میں عذاب
الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ وَاَمَّا	کا مزہ چکھو ، اور جن کے منہ سپید ہوئے تو وہ
الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ	اللہ کی رحمت میں ہوں گے ، اور اس رحمت
اللّٰهِ ط هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (آل عمران)	میں سدا رہیں گے ،

آیت بالا میں عذاب کے ذکر میں مدت کی تصریح سے سراسر خاموشی ہے ، اور رحمت کے ذکر میں خلود کی تصریح تام ہے ،

ان ہی آیتوں کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض صحابۂ کرام سے روایتیں ہیں کہ ایک دن آئے گا ، جب دوزخ کے میدان میں ہو کا عالم ہوگا ، اور کوئی ایک متنفس بھی وہاں نظر نہیں آئیگا ، چنانچہ :

۱ ۔ طبرانی میں حضرت ابو امامہ صحابیؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جہنم پر ایک دن ایسا آئے گا جب خزاں رسیدہ پتے کے مانند ہو جائیگا ، اور اس کے دروازے

کھل جائیں گے۔"

۲۔ حضرت جابرؓ یا کسی اور صحابیؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "جہنم پر ایک دن ایسا آئیگا جس میں اُس کے دروازے کھل جائیں گے، اور اُس میں کوئی نہ ہوگا"

۳۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں جو کہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ "جہنم پر ایک دن آئے گا جب اس میں کوئی نہ ہوگا۔"

۴۔ تفسیر عبد بن حمید میں حضرت عمرؓ سے روایت کی گئی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ "اگر اہلِ دوزخ ریگستانِ عالج کے ذرات کے بقدر شمار بھی دوزخ میں رہیں، پھر بھی ایک دن آئے گا جب وہ اُس سے نکلیں گے۔"

۵۔ عبداللہ بن عمروؓ بن العاص سے روایت ہے کہ "جہنم پر ایک دن آئے گا جب اس کے خالی دروازے بھڑ بھڑائیں گے، اور اس میں کوئی نہ ہوگا، اور یہ اُس وقت ہوگا جب لوگ اس میں صدہا ہزار سال (احقاب) کی مدت پوری کریں گے۔"

۶۔ عبدالرزاق، ابن منذر، طبرانی اور بیہقی کی کتاب الاسماء والصفات میں ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہؓ صحابی یا ابوسعید خدریؓ صحابی یا کسی اور صحابی نے فرمایا کہ "اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ کا استثناء پورے قرآن پر حاوی ہے یعنی جہاں جہاں قرآن میں خَالِدِيْنَ فِيْهَا (سدا اس میں رہیں گے) ہے وہاں یہ مشیت الٰہی کا استثناء قائم ہے۔"

۷۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ "دوزخ پر ایک زمانہ آئے گا جب اس کے خالی دروازے کھڑکھڑائے جائیں گے۔"

دفعِ شبہ

قرآن پاک میں ایسی بھی چند آیتیں ہیں جن سے لوگوں کو دوزخ کے دوام کا خیال ہوا ہے، مثلاً وہ تین آیتیں جن میں کفار کو خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا ہمیشہ کے عذاب کی دھمکی دی گئی ہو،

۱۔ اِنَّ اللّٰہَ لَعَنَ الْکٰفِرِیْنَ وَاَعَدَّ لَھُمْ سَعِیْرًا ۙ، لا خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا ج (احزاب ۔ ۸)

۱۔ بیشک خدا نے کافروں پر لعنت کی، اور اُن کے لئے وہ آگ مہیا کی جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے،

۲۔ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَاِنَّ لَہٗ نَارَ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا، ((جن ۔ ۲)

۲۔ اور جو اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو اس کے لئے جہنم کی وہ آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں،

۳۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ وَلَا لِیَھْدِیَھُمْ طَرِیْقًا لا اِلَّا طَرِیْقَ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا ط (نساء ۔ ۲۲)

۳۔ بیشک جنھوں نے کفر کیا اور حد سے آگے بڑھے، نہیں ہو کہ اللہ اُن کو بخشے اور نہ یہ کہ اُن کو راہ دکھائے لیکن جہنم کی راہ جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں،

اِن تینوں آیتوں میں خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا (دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے) کا مطلب

لہ (حاشیہ ص ۷۸۶) حافظ ابن قیم نے شفاء العلیل (ص ۲۵۰) میں ان روایات کو غیر مطبوعہ کتب سیر و حدیث سے نقل کیا ہے، اُن میں سے بعض ابن جریر طبری میں بھی آیاتِ مذکور کی تفسیر میں خصوصاً تفسیر سورۂ ہود جلد ۱۲ ص ۶۶ میں مذکور ہیں، اور حافظ جلال الدین سیوطی نے بھی تفسیر دُرِّ منثور، تفسیر سورۂ ہود، جلد ثالث ص ۳۵۰ میں زیر آیتِ مذکورۂ ہود ذکر کیا ہی اور کتاب الاسماء والصفات بیہقی (ص ۱۲۳) مطبوعہ الٰہ آباد میں چھپی روایت ہے،

یہ ہے کہ ایسے لوگ جن کے حق میں یہ آیتیں آئی ہیں، وہ اُس وقت تک دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، جب تک حسبِ مشیتِ الٰہی دوزخ کے خاتمہ کا دور نہیں آئے گا،

باقی چند آیتوں میں اَبَدًا (ہمیشہ) کے بغیر صرف خَالِدٌ ہے، جیسے

هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ، وہ اس میں "خالد" رہیں گے،

یا ایک جگہ ہے،

وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (سجدہ ۲) اور "خلود" کے عذاب کا مزہ چکھو،

تو یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہیے کہ خلود کے دو معنی ہیں، ایک حقیقی دوام اور دوسرے قیامِ طویل، ان دو میں سے کسی ایک معنی کی تخصیص قرینہ سے ہوگی، اسی دوسرے معنی کے اعتبار سے عربی اشعار میں پہاڑوں اور بدویانہ چولھوں کے پتھروں کے لئے خَوَالِد، اور خالدات کے لفظ صفت میں آتے ہیں، کیونکہ وہ تادیر اور زمانۂ دراز تک باقی رہنے والے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ تنہا "خٰلِدِيْنَ" کا لفظ ابدیت کے مفہوم میں صریح نہیں، جب تک اُس کے ساتھ کوئی اور قرینہ قائم نہ ہو، جو دوام کے معنی کی تخصیص کر دے جیسا کہ قرینہ اُن آیتوں میں ہے جہاں اہلِ جنّت کو خٰلِدِيْنَ کہا گیا ہے کہ تقریباً بیس آیتوں میں اس خلود کے معنی دوام اور عدمِ انقطاع کے بتائے گئے ہیں، اس لئے جنّت کے سلسلہ میں جہاں صرف خٰلِدِيْنَ بھی ہے، وہاں ہمیشگی اور دوام ہی کے معنی لئے جائیں گے، برخلاف اس کے جہاں دوزخ کے ساتھ خٰلِدِيْنَ کا لفظ ہے، وہاں دوام کے مفہوم کے لئے کوئی قرینہ موجود نہیں، اس لئے دوزخ والی آیتوں میں خلود سے مقصود یہ ہے کہ گنہگار

زمانۂ دراز تک دوزخ میں رہیں گے، غالباً یہی وجہ ہو کہ گنہگار اہلِ ایمان کی سزا میں کبھی خٰلِدِیْنَ کے ساتھ اَبَدًا استعمال نہیں کیا گیا ہے، گنہگار اہلِ ایمان میں سب سے بڑی دھمکی اس کو دی گئی ہو جس نے کسی مسلمان کا خون بے سبب بہایا ہو، مگر اس کے لئے بھی خالِدِیْنَ کے ساتھ اَبَدًا استعمال نہیں کیا گیا، فرمایا:

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا	اور جو کوئی کسی باایمان کو قصداً قتل کریگا
فَجَزَاۤؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا	تو اس کا بدلہ دوزخ ہے جس میں وُہ خالداً
(نساء-۱۳)	(یعنی مدت دراز تک پڑا) رہیگا،

یہی سبب ہے کہ معتزلہ اور خوارج کے سوا تمام اہلِ اسلام اس بے گناہ مسلمان مقتول کے قاتل کی بالآخر بخشایش کے قائل ہیں،

اس سے معلوم ہوا کہ ان آیتوں میں "خُلود" سے مراد "ہمیشگی" نہیں ہو، بلکہ زمانۂ دراز ہے کہ اہلِ توحید کی بالآخر نجات قرآن و حدیث کی متفقہ تعلیم ہے، اور اس لئے مومن کے لئے اس کے کسی جرم کی سزا میں ہمیشگی کا مفہوم داخل ہی نہیں ہوسکتا، بنا بریں ان آیتوں میں "خلود" کے معنی منطقی دوام نہیں بلکہ عرفی دوام، یعنی مدت دراز کے ہیں، ہم عام طور سے مجرم کے لئے "حبسِ دوام" کی قانونی اصطلاح بولتے ہیں جس سے مراد ابد تک کیا، قیامت تک کا زمانہ بھی نہیں ہوسکتا، بلکہ عمر بھر بھی نہیں، ایک طرف اس سے قانونی قید کی درازترین مدت مراد ہے جس کا قانونی اندازہ بیس سال کیا گیا ہے، کتنے مجرم ہیں جو اس مدت کو کاٹ کر آزادی حاصل کرتے ہیں، اور ایسے بھی ہیں جو کسی شاہی عفو عام کے سلسلہ میں قبل از مدت رہائی پاجاتے ہیں،

دو چار آیتیں ایسی بھی ہیں، جن میں مذکور ہے کہ یہ گنہگار دوزخ سے الگ نہ ہوں گے،
چنانچہ وہ آیتیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ ج یَّصْلَوْنَهَا
یَوْمَ الدِّیْنِ، وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِیْنَ
(انفطار)

۱۔ بیشک گنہگار دوزخ میں ہیں وہ انصاف
کے دن اس میں داخل ہوں گے اور وہ
اس سے چھپے نہیں رہ سکتے؛

۲۔ وَقَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ
لَنَا کَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ کَمَا تَبَرَّءُوْا
مِنَّا ط کَذٰلِکَ یُرِیْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ
حَسَرٰتٍ عَلَیْهِمْ ط وَمَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ
مِنَ النَّارِ (بقرۃ ۔ ۲۰)

۲۔ اور کہیں گے کہ کاش ہم کو دوبارہ دنیا کی
زندگی ملتی تو ہم اپنے پیشواؤں سے بھی الگ ہوجاتے
جیسے وہ ہم سے یہاں الگ ہوگئے، اللہ اُن کے
کاموں کو ایسے ہی حسرتیں بنا کر اُن کو دکھائیگا،
اور وہ دوزخ سے نکلنے والے نہیں،

۳۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ
مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ
لِیَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ
مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ج وَلَهُمْ عَذَابٌ
اَلِیْمٌ، یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنَ
النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنْهَا
وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ (مائدہ ۔ ۶)

۳۔ بیشک جنھوں نے کفر کیا، اگر اُنکی ملکیت
میں کل روئے زمین ہو، اور اتنا ہی اور ہوتا کہ
اسکو فدیہ دیکر قیامت کے عذاب سے رہائی
پائیں تو وہ اُن کی طرف سے قبول نہ ہو، اور ان
کے لیے دردناک عذاب ہے، وہ چاہیں گے کہ دوزخ
سے نکل جائیں، لیکن وہ اس سے نکلنے والے
نہیں، اور اُن کے لئے قائم عذاب ہے،

۴۔ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ، (حج - ۲)	۴۔ جب وہ چاہیں کہ اس دوزخ سے غم کی وجہ سے نکل پڑیں، وہ اس میں لوٹا دیئے جائیں گے اور (کہا جائیگا کہ) جلنے کی سزا چکھو،
۵۔ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ط كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ، (سجدہ ۲۷)	۵۔ اور لیکن جنھوں نے نافرمانی کی، تو اُن کا ٹھکانا دوزخ ہی، جب وہ چاہیں گے کہ وہ اس سے نکل جائیں، اس میں لوٹا دیئے جائیں گے، اور کہا جائے گا کہ دوزخ کی اس مار کا مزہ چکھو جس کو تم جھٹلاتے تھے،

یہ وہ پانچ آیتیں ہیں جن سے بعضوں کو عذاب دوزخ کے دوام اور غیر منقطع بقا کا خیال پیدا ہوا ہے، مگر ان میں سے ایک ایک آیت پر غور کرو تو اُن کے خیال کی غلطی فوراً معلوم ہوجائیگی، پہلی آیت کا منشا اسی قدر ہے کہ کوئی گنہگار اگر یہ سمجھے کہ وہ کسی جگہ چھپکر دوزخ کے عذاب سے بچ جائے گا تو یہ محال ہے کہ عذاب سے چھپ کر بچ جانا کسی طرح ممکن نہیں، دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ دوزخی کہیں گے کہ ہم کو دوزخ سے نکل کر دوبارہ دنیا میں جانے دیا جائے، تو اب کی ہم نیکی کا کام کریں گے، اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اب یہاں سے نکل کر دنیا میں دوبارہ جانا نہیں، تیسری آیت میں ہے کہ پورے روے زمین کی دولت دے کر بھی آخرت میں نجات خریدی نہیں جاسکتی، اور نہ وہاں سے کوئی نکل کر بھاگ سکتا ہے، چوتھی اور پانچویں آیت کا صریح مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی دوزخی دوزخ کے عذاب سے گھبرا کر اُس سے

نکل بھاگنا چاہے گا تو وہ پکڑ کر پھر اسی میں ڈال دیا جائے گا، ان آیتوں سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ گنہگار از خود دوزخ سے نکل نہ سکیں گے، اور نہ مدتِ عذاب کے اندر وہ خلاصی پا سکتے ہیں، مگر اس سے خدا تعالیٰ کے حکم و اجازت سے بالآخر اس سے نجات پانے کی نفی نہیں نکلتی، اور اس کی کہ بقدرِ گناہ عذاب کی مدت بسر کرنے کے بعد بھی نجات نہیں مل سکتی، اور نہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بہشت کی طرح دوزخ کو بھی غیر متناہی دوام بخشا گیا ہے،

یہی وہ آیتیں ہیں جن سے گنہگاروں کے لئے دوامِ عذاب کا مفہوم نکالا جا سکتا ہے مگر ایک ایک آیت کو غور سے پڑھو کہ اُن میں سے کسی میں بھی دوزخ کے دوام بقا اور عدمِ فنا یا اس کے عذاب کے عدم انتہا کی تصریح ہے، ؟ حالانکہ اس کے بالمقابل جنت کی بقاء دوام اور عدم انقطاع کی تصریح بار بار اور بتکرار ہے۔

ایک اور نکتہ لحاظ کے قابل ہے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ خدا نے گنہگاروں کو عذاب دوزخ کی ابدیت اور دوام کی دھمکی دی ہے، تاہم اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہئے کہ نیکی کا بدلہ نہ دینا یقیناً بُرائی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی قدوسیت کا دامن تمام تر پاک ہے کہ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ (آل عمران - ۲۰) تو وہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا، اِنَّہٗ کَانَ وَعْدُہٗ مَاْتِیًّا (مریم - ۶۱) اس کا وعدۂ جنت پورا ہی ہو گا" لیکن اگر بُرائی کا بدلہ حسبِ تہدید سابق بُرائی کے ساتھ نہ دیا جائے تو حقیقت میں خلاف وعدگی نہیں جو قابلِ ملامت ہو بلکہ اس کا نام مغفرت کرم، عطا اور عفو ہے جس کا اہل اس رحمان و رحیم اور عفو و غفور سے بڑھکر کوئی دوسرا نہیں اس لئے گنہگاروں کیساتھ جیسا کہ اس نے فرمایا ہے اپنی حکمت و مصلحت کی بنا پر وہ جو چاہے کر سکتا ہے،

چنانچہ مسند ابویعلیٰ میں حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ خدا نے کسی نیک کام پر جس ثواب کا وعدہ فرمایا ہے، وہ اُس کو ضرور ہی پورا کریگا لیکن جس کسی کو اُس کے کسی کام پر عذاب کی دھمکی دی ہے تو اُس کو اختیار حاصل ہے۔[۱]

کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر بالآخر گناہوں کی مغفرت اور خدا کی رحمت میں یہ وسعت اور عموم ہے کہ بڑے سے بڑے گنہگار بھی دوزخ کی آگ میں جل کر بالآخر پاک صاف اور جنت میں داخل ہونے کے قابل ہو جائیں گے، تو اشارات وکنایات کے بجائے، اُن کی معافی کی صریح تصریح کیوں نہیں کر دی گئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایسا کیا جاتا تو یہ اُن مجرموں اور گنہگاروں کے حق میں اچھا نہ ہوتا، کیونکہ اس سے اُن میں ندامت اور توبہ کے رجحان کے بجائے خودسری گستاخی اور شوخی پیدا ہوتی اور ان میں آیندہ کے نتائجِ بد سے نڈرپن اور بے خوفی آجاتی اور ایسا ہونا تنبیہ و اصلاح و تدارک کی مصلحتوں کے سراسر منافی ہوتا، اس لئے اُن کی قانونی سزا تو اللہ تعالیٰ نے دائمی عقاب مقرر فرمائی لیکن آخر کار اُن کی نجات کو اپنی مشیت اور علم و مصلحت کے سپرد فرما کر، اُن کو یک گونہ اپنے سے ناامید بھی نہیں ہونے دیا، اور امید و بیم کی حالت میں رکھ کر اپنے سامنے جھکنے اور محبت کرنے کا جذبہ بھی پیدا کر دیا، اور یہ اس باب میں وہ عظیم الشان اصلاح ہے، جس کو ایک طرف عیسائیوں نے کفارہ کی اور دوسری طرف ہندو مذاہب نے کرم کی تعلیم دیکر غارت کر دیا تھا،

عیسائیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کے مصلوب ہو کر جی اٹھنے پر ایمان لانے سے

[۱] بحوالہ شفاء العلیل ابن قیم ص ۲۲۲، مصر،

تمام گناہ دفعتًہ معاف ہوجاتے ہیں، اس تعلیم نے اعمال کو غیر ضروری چیز ٹھرادیا تھا، اس کے برخلاف ہندو مذاہب نے خدا کو اتنا بے اختیار ٹھرایا کہ اعمال بد کے نتائج جن کو کرم کہتے ہیں خدا چاہے بھی تو معاف نہیں ہوسکتے، اسلام نے آکر ترازو کے ان دونوں پلّوں کو برابر کردیا، ایک طرف فرمایا کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ "ہر نفس اپنے عمل کے ہاتھ میں گرو ہے" (مدثر-۳) اور دوسری طرف فرمایا يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ خدا جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے (مائدہ) یعنی قانونًا ہر انسان اپنے عمل کے نتائج کا یقینًا پابند ہے مگر خدا تعالیٰ کی قدرت اور رحمت اس قانون کے باوجود جو چاہے کرسکتی ہے جس طرح اس دنیا کا حال ہے کہ گو خدا کے بنائے ہوئے قانون یہاں جاری ہیں جن کو آپ قانونِ فطرت کہتے ہیں مگر باایں ہمہ اس کا حکم اور اس کی خواہش اور مصلحت ان پر بھی حاکم ہے، اور وہ جو چاہے کرسکتا ہے اس تعلیم نے ایک طرف اعمال کو غیر ضروری ہونے سے بچالیا، اور دوسری طرف خدا کی قدرتِ تام اور رحمتِ عام کا دروازہ بھی کھلا رکھا۔

عذابِ طویل کا سبب بعض کم فہم یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انسان کا گناہ تو ایک لمحہ کا کام ہے پھر اس کا عقاب اتنا طویل کیوں رکھا گیا، سال دو سال یا عمر بھر کے گناہ کی سزا صدہا اور ہزارہا سال کے عقاب سے دنیا مناسب نہیں، حالانکہ یہ لوگ اگر دنیا وی ہی واقعات پر غور کرتے تو وہ اُن کی تسکین کے لئے کافی ہوتے، دنیا کا ہر بڑے سے بڑا قانونی گناہ ایک لمحہ میں انجام پاجاتا ہے، چوری، عمل خلافِ قانون، یا کسی کو قتل کرتے کتنی دیر لگتی ہے؟ مگر اس کے معاوضہ میں سالہا سال کی قید ہم خود اپنی انسانی عدالت گاہوں میں تجویز کرتے ہیں اور اسکو خلافِ عقل نہیں کہتے،

دوسری صحیح تر مثال یہ ہو کہ انسان کو دیکھو کہ ذراسی جسمانی بد پرہیزی اور اصول صحت کی معمولی سی غلطی کی پاداش میں وہ کبھی ہفتوں، مہینوں، بلکہ سالہا سال بیمار رہتا ہو اور ایک مدت دراز میں جاکر کہیں اُن چند لمحوں کی غلطی کی تلافی کر پاتا ہے، اور کبھی اس معمولی غلطی کی بدولت عمر بھر اُس کے روگ میں مبتلا رہتا ہے، اور آخر میں جان دیدیتا ہو، اس سے معلوم ہوا کہ گناہ اور اسکی تلافی کی مدت میں یکسانی نہیں ہوتی، بلکہ ہمیشہ غلطی کی مدت کے مقابلہ میں اسکی تلافی کی مدت صدہا اور ہزارہا گنا زیادہ ہوتی ہو، کیونکہ طبیعت پر جو اثر پڑجاتا ہو اسکی تلافی کی مدت، غلطی کی نوعیت، طبیعت کی صلاحیت، اور خلّاقِ عالم کی مصلحت کی بناء پر مختلف ہوتی ہو، اسی لئے عقابِ طویل سے رہائی یا شفایابی کی مدت بھی ہر گنہگار کے لئے یکساں نہیں ہوسکتی، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِحَقِیْقَةِ الْحَال۔

شرک وکافر کا انجام | گر یہ صحیح ہے کہ بالآخر ایک دن جہنم کی آگ سرد ہوجائیگی تو کیا اہلِ کفر و شرک بھی اپنے گناہوں سے پاک ہوکر رحم و کرم کے سزاوار ہوجائیں گے؟ جواب یہ ہو کہ

قرآنِ پاک میں اسکی تصریح موجود ہے کہ شرک و کفر کا گناہ معاف نہ ہوگا یعنی اُس کے اُخروی نتائج کی پاداش ضروری ہے اور یہ بھی معلوم ہوچکا ہو کہ شرک و کفر کی جزا دوام عذاب اور خلودِ نار (خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا) ہی یعنی جب تک دوزخ قائم ہے، اُس سے اُن کو نجات نہیں مل سکتی، مگر جب حسب مشیئتِ الٰہی وہ دن آئے کہ دوزخ کی مدتِ حیات ختم ہوجائے تو اس وقت عجب نہیں کہ اُن کو بھی اس سے رہائی مل سکے،

چنانچہ مشرکین و کافرین کے ذکر میں خدا فرماتا ہے،

قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ — فرمائیگا، دوزخ کی آگ تمھارا ٹھکانا ہو اس میں

اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ اِنَّ رَبَّكَ حَکِیۡمٌ	ہمیشہ رہوگے، مگر یہ کہ جو چاہے اللہ بیشک
عَلِیۡمٌ ۝ (انعام - ۱۵)	تیرا پروردگار حکمت اور علم والا ہے،

اس آیت کا آخری ٹکڑا خاص طور سے غور کے قابل ہے، فرمایا "تیرا رب حکمت اور علم والا ہے"
اس موقع پر خدا کے لئے خاص طور سے رَبّ کا لفظ لانا، یہ معنی رکھتا ہے کہ اسکی شانِ ربوبیت اگر چاہے گی، اور اُس کے غیر محدود علم و حکمت کا اقتضا ہوگا تو دوزخ کے خاتمہ پر اُن کو رہائی مل سکیگی؛
لیکن اس میں شک ہے کہ آیا اس کے بعد بھی وہ جنت میں داخل ہوسکیں گے، کیونکہ حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے قرآن میں یہ تصریحِ الٰہی ہے،

اِنَّهٗ مَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَقَدۡ حَرَّمَ	یہ کہ بے شبہہ اللہ کا جو شریک بنائے گا تو
اللّٰهُ عَلَيۡهِ الۡجَـنَّةَ وَمَاۡوٰىهُ النَّارُ‌ؕ	اللہ نے اُس پر جنت حرام کردی ہے، اور
(مائدہ - ۱۰)	اُس کا ٹھکانا دوزخ ہے،

نیز ایک اور آیت میں ہے،

اِنَّ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَاسۡتَكۡبَرُوۡا	بیشک جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا
عَنۡهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمۡ اَبۡوَابُ السَّمَآءِ وَ	اور اُن کے ماننے سے غرور کیا تو اُن کیلئے
لَا يَدۡخُلُوۡنَ الۡجَـنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الۡجَمَلُ	آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے
فِىۡ سَمِّ الۡخِيَاطِ‌ ؕ	اور وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے تاآنکہ
(اعراف - ۵)	اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہو جائے

الغرض خدا کے اعلان کردہ قانونِ جزا کا اقتضا تو یہی ہے کہ گو دوزخ کے عذاب کا خاتمہ

ہو جانے پر بھی جنت کے احاطہ میں ان کا گذر نہ ہو لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کا دائرہ بہت وسیع ہے، جیسا کہ خود اُس نے اہلِ دوزخ کی نسبت کہا ہے کہ

اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ	وہ سدا دوزخ میں رہیں گے لیکن تیرا رب
فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ، (ھود - ۹)	جو چاہے، بیشک تیرا رب جو چاہے کر گذرتا ہے،

اس دائرہ کی وسعت کو کون کم کر سکتا ہے، کیونکہ اپنی رحمت کی وسعت کی نسبت اسکا اعلان ہے،

رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف ۱۹)	اور میری رحمت ہر شے کو اپنی گنجایش میں لئے ہے۔

اس رحمتِ عام کی وسعت سے آسمان و زمین کا کون گوشہ محروم ہے؟ اس سے بڑھکر یہ کہ پیغمبر کے جھٹلانے والوں کی نسبت خدا فرماتا ہے،

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ	تو (اے پیغمبر) اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو کہدے کہ
رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ج وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهٗ	تمھارا پروردگار وسیع رحمت والا ہے، اور اس کا
عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ (انعام - ۱۰)	عذاب گنہگاروں سے لوٹایا نہیں جا سکتا،

یعنی کسی دوسرے میں یہ طاقت نہیں کہ اُس کے بھیجے ہوئے عذاب کو گنہگاروں کے سر سے ٹال دے لیکن خود اس کی رحمت بڑی وسیع ہے، وہ چاہے تو اُن کو دنیا ہی میں ہدایت دیکر جنت نصیب کرے، یا آخرت میں عذاب دینے کے بعد درگذر کر دے، اور اس کی اصلی رحمت کا محل وہی ہے جہاں کسی دوسری رحمت کا وجود نہ ہوگا، فرمایا،

مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ	جس سے اُس دن عذاب ہٹا یا گیا تو خدا نے
فَقَدْ رَحِمَهٗ ؕ (انعام - ۲)	اس پر رحم کیا،

صحیح بخاری و مسلم و ترمذی میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اگر مومن کو معلوم ہو کہ خدا کے پاس کتنا عقاب ہے تو وہ جنت سے مایوس ہو جائے اور اگر کافر کو یہ معلوم ہو کہ اس کی رحمت کتنی وسیع ہے تو وہ بھی جنت سے ناامید نہ ہو۔" مصلح الدین سعدی نے غالباً اسی حقیقت کو اپنے ان دو شعروں میں ادا کیا ہے،

بہ تہدید اگر برکشد تیغِ حکم	بمانند کر" و بیاں صم و بکم
وگر در دہد یک صلائے کرم	عزازیل گوید نصیبے برم

خود اس رحمان و رحیم کا جس کی بادشاہی آسمان و زمین کو محیط ہے، یہ ارشاد ہے کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے،

يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ	جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے، اور جس کو
يَّشَآءُ ۚ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ	چاہے عذاب دیتا ہے اور آسمانوں کی اور
وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَاِلَيْهِ	زمین کی اور ان کے بیچ کی بادشاہی اللہ
الْمَصِيْرُ، (مائدہ ۷-۳)	کے لیے ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے،

لیکن اس کی یہ مشیت جیسا کہ اس نے (انعام رکوع ۱۵) میں فرمایا ہے، اسکی وسیع حکمت و مصلحت پر مبنی ہے، وہ جو چاہے کر سکتا ہے، مگر کرتا وہی ہے جو اسکی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے،

اس سے زیادہ اس باب میں کچھ اور کہنا حد سے آگے بڑھنا ہے کہ جس کی تصریح خود خدا تعالیٰ نے فرمائی، اس کی تصریح کا حق کسی کو کیا ہے، اس لئے مشرک و کافر کے آخر انجام کے سوال کا جواب صرف مشیت الٰہی" ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے،

النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ، (انعام - ۱۵)

دوزخ تمہارا ٹھکانا ہے، اس میں سدا رہو گے، لیکن جو چاہے اللہ، بے شک تیرا پروردگار حکمت والا، اور علم والا ہے،

جمہور کا مسلک

یہ جو کچھ کہا گیا وہ اُس جماعت کا خیال ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عمومی کی معتقد ہے، جمہور کا مسلک اس سے کچھ مختلف ہے اُس کے نزدیک بہشت کی طرح دوزخ بھی ہمیشہ باقی رہیگا، اور ان لوگوں کو جو شرک و کفر کے مرتکب ہوں گے کبھی دوزخ سے نجات نہیں ملیگی،

اس عقیدہ کے مطابق گنہگاروں کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو گو گنہگار تھے، مگر دل میں ایمان رکھتے تھے، ایسے لوگ عذاب کے بغیر ہی یا عذاب کے بعد اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم سے سرفراز ہو کر بالآخر جنت میں داخل ہوں گے، دوسرے وہ جو ہمیشہ شرک و کفر میں مبتلا رہے اور اس سے توبہ کئے اور ایمان لائے بغیر مر گئے، ایسے لوگوں کی بخشایش کبھی نہ ہوگی، اور وہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں داخل کر دیئے جائیں گے، ان کی گنہگاری اس درجہ ہوگی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو اپنی طرف کسی طرح جذب نہ کر سکیں گے، یہ وہ زمین شور ہوں گے جس میں اس رحمتِ عام کی بارش بھی کوئی روئیدگی پیدا نہ کر سکے گی،

رحمتِ عمومی کے معتقدین گذشتہ آیتوں سے جو معنی نکالتے ہیں، وہ جمہور کے نزدیک صحیح نہیں، وہ اُن کے بیان کردہ مطالب کو تاویلات کا درجہ دیتے، اور اس کی پیش کردہ روایات کو صحت اور قوت سے خالی جانتے، اور قرآن مجید کی حسبِ ذیل آیتوں سے اپنے دعوی پر استدلال کرتے ہیں۔

۱۔ اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا (احزاب)

۱۔ بیشک خدا نے کافروں پر لعنت کی اور ان کے لئے وہ آگ تیار کی جسمیں وہ ہمیشہ سدا

۲۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا، (جن ۔ ۲)

۲۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کریگا تو اس کے لئے جہنم کی آگ، ہے اس میں وہ ہمیشہ سدا پڑے ہیں،

۳۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا، (نساء ۔ ۲۳)

۳۔ بیشک جنھوں نے کفر کیا، اور حد سے آگے بڑھے ہنیں ہو کہ اللہ اُن کو بخشے اور نہ یہ کہ اُن کو راہ دکھائے لیکن جہنم کی راہ اس میں وہ ہمیشہ سدا پڑے رہیں،

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ اون پر ہمیشہ عذاب ہوگا، اور جب عذاب ہمیشہ ہوگا تو عذاب کی جگہ یعنی دوزخ بھی ہمیشہ قائم رہے گی،

ان آیتوں کے علاوہ اور بھی دوسری آیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہی کہ دوزخ کا عذاب کفار سے کبھی دور نہ ہوگا،

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ

۱۔ بیشک جن لوگوں نے کفر کیا، بالفرض انکے پاس ساری زمین کا خزانہ ہو اور اتنا ہی اس کے ساتھ اور، تاکہ وہ اس کو فدیہ دیکر قیامت کے دن کے عذاب سے چھٹ جائیں،

أَلِيمٌ يُرِيدُونَ أَنْ يَخْرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ، (مائدہ - ۶)	تو اُن سے یہ فدیہ قبول نہ کیا جائیگا اور اُن کیلئے دردناک عذاب ہے، چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں اور وہ اس سے نہیں نکل سکیں گے، اور ان کیلئے قائم
۲- وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ (بقرہ ۲۰)	۲- وہ دوزخ سے نکل نہیں سکیں گے،

قیامت کے منکروں کی نسبت فرمایا،

۳- فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُونَ مِنْهَا وَلَا يُسْتَعْتَبُونَ، (جاثیہ - ۱۴)	۳- تو آج اُس (دوزخ) سے وہ نہیں نکالے جائیں گے، اور نہ اُن کا عذر سنا جائیگا،
۴- أَلَا إِنَّ الظَّٰلِمِينَ فِي عَذَابٍ مُّقِيمٍ، (شوریٰ - ۵)	۴- ہاں کافر اور مشرک قائم رہنے والے عذاب میں ہوں گے،

ظلم کا اطلاق قرآن میں شرک پر کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ شرک کا عذاب قائم رہیگا،

۵- إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَٰئِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ خَٰلِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ (بقرہ ۱۹)	۵- بیشک جنھوں نے کفر کیا، اور اسی کفر کی حالت میں مر گئے اُن پر اللہ کی، فرشتوں کی اور آدمیوں کی سب کی لعنت ہے، اس میں وہ سدا رہیں گے اُن کے عذاب میں کمی نہیں کیجائیگی، اور نہ اُن کو مہلت دیجائیگی،
۶- وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ لَا يُقْضَىٰ عَلَيْهِمْ فَيَمُوتُوا وَلَا يُخَفَّفُ	۶- اور اُن کے لئے جنھوں نے کفر کیا جہنم کی آگ ہے، نہ تو اُن کا فیصلہ کیا جائیگا کہ وہ مر جائیں اور

عَنْهُمْ مِنْ عَذَابِهَا (فاطر-۴) نہ سزا میں کچھ کمی کی جائے گی،

شرک وکفر والوں کی مغفرت کسی حال میں نہ ہوگی، فرمایا،

۷- اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ (نساء) ۷- بیشک اللہ اسکو معاف نہ کریگا کہ اسکے ساتھ شرک کیا جائے

۸- اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ، (محمد-۴) ۸- بے شبہہ جنھوں نے کفر کیا، اور خدا کے راستے روکا اور اسی کفر کی حالت میں وہ مر گئے تو اُن کو ہرگز معاف نہ کیا جائے گا،

ان کے لئے جنت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہے،

۹- اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ (مائدہ-۱۰) ۹- یقیناً جو خدا کے ساتھ شرک کریگا تو اللہ نے اوس پر جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے

۱۰- اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ، (اعراف-۴) ۱۰- بیشک جنھوں نے ہماری حکموں کو جھٹلایا اور اُن کے ماننے سے سرکشی کی، اُن کے لئے آسمان کے دروازے کھولے نہ جائیں گے اور نہ جنت میں وہ داخل ہوں گے تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں

۱۱- وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (آل عمران) ۱۱- اور (اے پیغمبر) تجھے وہ لوگ جو کفر میں جلدی کرتے ہیں غم میں نہ ڈالیں، وہ ہرگز خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، خدا چاہتا ہے کہ اُن کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہ بنائے، اور اُن کے لئے بڑا عذاب ہے

اس قسم کی اور بھی بہت سی آیتیں ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ مرتے دم تک شرک وکفر میں مبتلا رہے اور توبہ نہیں کی، اُن کا گناہ بخشا نہ جائیگا اور وہ جنت میں کبھی داخل نہ ہو سکیں گے بلکہ ہمیشہ دوزخ کے عذاب میں پڑے رہیں گے، جہاں نہ اُن کے عذاب میں کبھی تخفیف ہوگی اور نہ اُن کو موت آئے گی۔

تصویر کے دونوں رُخ آپکے سامنے آگئے،

ع بیا کایں داوریہا را بہ پیشِ داور اندازیم

بہشت و دوزخ کی جزا و سزا بھی تمثیلی ہے

اوپر عالم برزخ کے ذکر میں ہم تفصیل بتا چکے ہیں کہ آخرت میں جزا و سزا تمام تر تمثیلی ہوگی، اس تمثیلی کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ جیسا عمل ہوگا اُسی کے مناسب مشابہ اس کی جزا یا سزا ہوگی، مثلاً قرآن میں ہے کہ جو زکوٰۃ یعنی اپنے مال کا میل[1] کچیل مستحقین کو کھانے کے لئے نہ دیگا تو اُس کو دوزخ میں زخموں کا دھوون کھانے کو ملیگا، یا یہ کہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان دیگا مرنے کے بعد اُسکو جانِ تازہ اور حیاتِ نو بخشی جائے گی، وہ دولتمند جس کو دھوپ کی تپش سے بچنے کیلئے قصر و محل اور پینے کے لئے ٹھنڈے سے ٹھنڈا پانی اور عزت کی جگہ عنایت کی گئی تھی اگر اس نے دنیا میں ان نعمتوں کے ملنے کا حق اس دنیا میں ادا نہ کیا تو دوسری دنیا میں اُسکو یہ سامان ملیگا

فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ لا وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ	وہ لو اور کھولتے پانی میں، دھوئیں کے سایہ میں
لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ	نہ ٹھنڈا، نہ باعزت، بے شک وہ پہلے از
ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ج صلے (واقعہ-۲)	نعمت میں تھے،

[1] حدیث میں ہے کہ زکوٰۃ مسلمانوں کی دولت کا میل ہے۔

دنیا یا برزخ کی حدیث میں ہے کہ آپ نے کچھ ایسے لوگوں کو دیکھا جن کا آدھا دھڑ خوبصورت اور آدھا بدصورت تھا، یہ وہ تھے جن کے کچھ کام اچھے اور برے تھے، اس لئے بداعمالی بدصورتی اور نیکی خوبصورتی کے رنگ میں نمایاں ہوئی، صریح طور سے یہ اصول ان حدیثوں سے مستنبط ہوتا ہے

۱۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ جو مومن خود بھوکا رہ کر کسی دوسرے بھوکے مومن کو کھلائے گا تو خدا اس کو جنت کے پھل کھلائیگا، اور جو پیاسا ہو کر کسی دوسرے پیاسے کو پلائیگا تو خدا اس کو جنت میں شراب طہور پلائیگا، اور جو کوئی کپڑوں کا حاجتمند ہو کر ننگے کو پہنائیگا تو خدا اس کو جنت کے سبز جوڑے پہنائیگا۔" (ترمذی کتاب الزہد والرقاق ص ۴۰۴)

۲۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کسی کو دور کریگا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسکی تکلیف دور فرمائیگا، اور جو کوئی کسی نادار کو یہاں کسی مصیبت میں پھنسائیگا تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اسکو مصیبت میں مبتلا فرمائیگا اور کسی مسلمان کی سترپوشی کریگا تو خدا دنیا و آخرت میں اسکی سترپوشی کریگا اور جو کوئی اپنے بھائی کی مدد میں جبتک رہیگا خدا اس وقت تک اسکی مدد میں رہیگا۔" (ترمذی ص ۲۲۳)

۳۔ "جو انسانوں پر رحم کریگا خدا اس پر رحم فرمائیگا۔" (ترمذی)

تمثیل کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ جو امور معنوی اور غیر مجسم ہیں، وہ اپنی مناسب مثالی شکل و صورت میں ظاہر ہوں گے، مثلاً

۱۔ قرآن میں ہے کہ جو اس دنیا میں حقیقت بینی سے اندھا ہوگا، وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔" دیکھو کہ دنیا کی معنوی قلبی نابینائی، دوسرے عالم میں ظاہری جسمانی نابینائی کی شکل میں ظاہر ہوگی،

۲۔ حدیث میں ہے کہ اہلِ تکبر قیامت کے دن چیونٹیاں بنا کر اٹھائے جائیں گے، جن پر ہر طرف سے ذلت و خواری چھائی پھرے گی[۱]" دیکھو کہ تکبر کی جزاء ذلت و خواری سے ملے گی، اور چونٹیوں سے زیادہ حقیر و ذلیل کوئی ہستی نہیں، اس لئے اُن کی بڑائی اور تکبر کا معاوضہ یہ ہوگا کہ وہ چیونٹی بن کر اٹھیں۔

۳۔ اسی طرح آپنے فرمایا کہ "جو بخل کریگا، قیامت میں اُس کا مال سانپ بن کر اُس کو ڈسیگا[۲]" صفتِ بخل اس کے حق میں اسی سانپ کی صورت اختیار کر کے اسکی تکلیف کا باعث ہوگی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ "جو شخص بلا وجہ بھیک مانگ کر اپنی آبرو ریزی کرتا ہے، قیامت میں وہ اٹھے گا تو اُس کے منہ پر گوشت نہ ہوگا[۳]" دیکھو کہ دنیا کی بے شرمی و بیحیائی بے گوشت چہرہ کی صورت میں ظاہر ہوگی، اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ "دو بیبیوں کا وہ شوہر جو ایک کا حق ادا کرتا اور دوسری سے غفلت برتتا تھا، قیامت میں اسی طرح آئیگا کہ اس کا ایک پہلو (گویا مفلوج ہو کر) جھک گیا ہوگا[۴]" ایک پہلو کا عدم ادائی حق اپنی تمثیلی صورت میں ایک پہلو کی مفلوجی کیفیت میں نمودار ہوگا، یہ چند حوالے ذکر کئے گئے ہیں، ان ہی پر جزاء و سزا کے اور دوسرے جزئیات کو قیاس کرنا چاہئے، اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے حسب ذیل آیتوں پر غور کرنا چاہئے۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ	جس نے میری یاد سے منہ پھیرا تو اسکو تنگ
مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	گذران ملتی ہے، اور قیامت کے دن ہم اُس کو
اَعْمٰى، قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِىْٓ	اندھا اٹھائیں گے، وہ کہیگا اے میرے پروردگار!
اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا، قَالَ	تو نے مجھے اندھا کیوں اُٹھایا میں تو دیکھتا تھا

[۱] ترمذی کتاب الزہد والرقاق ص ۱۲۴ [۲] صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں مثل لہ مالہ شجاعاً اقرع [۳] ترمذی [۴] ایضاً

كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَ كَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ، (طٰهٰ ـ ۷)

فرمائے گا، اسی طرح میری آیتیں تیرے پاس آئیں تو تونے اُن کو بھلا دیا، ایسے ہی آج تو بھلا یا جائے گا،

دیکھو کہ دل کی نابینائی، قیامت میں ظاہری نابینائی، اور یہاں خدا کو بھولنا، اور اُس کے احکام کو یاد نہ کرنا، وہاں رحمتِ الٰہی کی یاد سے بھول کی شکل میں نمودار ہوگا،

دوزخ کی جسمانی سزائیں

دوزخ میں جسمانی اور روحانی دونوں سزائیں ملیں گی، قرآن پاک میں جن جسمانی سزاؤں کا ذکر ہے وہ حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ آتشِ دوزخ اور اُس کی سوزش کا ذکر بار بار آیا ہے، بلکہ اَلنَّارُ یعنی آگ گویا دوزخ کا دوسرا نام ہے، ان ہی معنوں میں اَلسَّعِيْرُ یعنی جلتی آگ بھی بارہا مستعمل ہوا ہے اور عَذَابَ الْحَرِيْقِ (جلن کا عذاب) بھی دو چار جگہ کہا گیا ہے، اور ایک جگہ یہ بھی ہے کہ

تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كَالِحُوْنَ ، (مومنون ـ ۶)

ان کے چہروں کو دوزخ کی آگ جھلس دیگی اور اُن کی صورتیں اس میں بگڑ جائیں گی،

دوزخ کا ایک اور نام سقر ہے، جس کے متعلق یہ ہے کہ

وَمَا اَدْرٰكَ مَا سَقَرُ ، لَا تُبْقِيْ وَ لَا تَذَرُ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ (مدثر ـ ۱)

اور تمہیں کیا معلوم سقر کیا ہے، نہ وہ رحم کھائیگی نہ چھوڑیگی، چہروں کی جھلس دینے والی ۔

كَلَّا ط اِنَّهَا لَظٰى لا نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ، (معارج ـ ۱)

ہرگز نہیں وہ شعلہ والی آگ ہے، منھ کی کھال ادھیڑنے والی،

إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ۚ كَأَنَّهُ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ۭ (مرسلات-۱) — دوزخ محل کے برابر اونچی چنگاریاں اتنی بڑی پھینکے گی جیسے زرد رنگ کے اونٹ،

۲- وہاں سایہ نہ ہوگا بلکہ یہ حکم ہوگا،

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۙ لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ (مرسلات-۱) — چلو ایک چھاؤں کی طرف جس کی تین پھانکیں ہوں گی، نہ گھن کی چھاؤں اور نہ تپش میں کام

۳- وہاں ٹھنڈک نہ ہوگی

لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا (نبا-۱) — اس میں وہ نہ ٹھنڈک کا مزہ چکھیں گے اور نہ کسی پینے کی چیز کا،

۴- دوزخ میں نہ موت آئے گی کہ چین آجائے، اور نہ ایسی زندگی ہی ہوگی جس میں کوئی مسرت ہو، دو جگہ فرمایا،

لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰي (طٰہٰ و اعلیٰ) — وہاں وہ نہ مرے گا نہ جیئے گا،

۵- پینے کو گرم پانی ملیگا، جس سے آنتیں نکل پڑیں گی،

وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ (محمد-۲) — اور وہ گرم پانی پلائے جائیں گے تو وہ پانی اُن کی آنتوں کو ٹکڑے کر دیگا،

۶- اور پیپ پئیں گے،

اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا، (نبا-۱) — لیکن کھولتا پانی اور پیپ،

۷- اُن کے اوپر سے گرم پانی چھوڑ جائے گا۔

يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوسِهِمُ الْحَمِيْمُ (حج)	ان کے سروں کے اوپر گرم پانی ڈالا جائیگا،

۸۔ کھانے کو سینڈھے کا پھل ملے گا،

اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ............	یا سینڈھے کا پھل ....
اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْ اَصْلِ الْجَحِيْمِ	.... وہ ایک درخت
طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ،	ہے دوزخ کی جڑ میں اُس کے شگوفے
فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِئُوْنَ	جیسے شیطانوں کے سر، تو وہ کھائیں گے
مِنْهَا الْبُطُوْنَ، ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا	اور اس سے پیٹ بھریں گے، پھر اس
لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ج (والصّٰفّٰت-۲)	پر گرم پانی کی ملونی ہوگی،
اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ لا طَعَامُ الْاَثِيْمِ	سینڈھے کا درخت گنہگار کی غذا ہے جیسے پگھلا
كَالْمُهْلِ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ (دخان)	تانبا، وہ پیٹوں میں کھولتا ہے جیسے کھولتا پانی

۹۔ خاردار جھاڑی کی خوراک ہوگی جس سے بدن کو کوئی فائدہ نہ ہوگا،

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ	اور اُن کے لئے کوئی کھانا نہ ہوگا، لیکن
لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ط	خاردار جھاڑی جو نہ موٹا کرے گی، اور
(غاشیہ-۱)	نہ بھوک سے بے پروا کرے گی،

۱۰۔ زخموں کے دھوون کی خوراک ملے گی،

وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ (حاقہ-۲)	اور نہ کوئی کھانا، مگر زخموں کا دھوون،

۱۱۔ کھانا نگلا نہ جائے گا،

وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ (مزمل-۱) | اور گلے میں اٹکنے والا کھانا،

۱۲- آگ کے کپڑوں کا لباس ہوگا،

فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ، (حج-۲) | کافروں کے لئے آگ کے کپڑے قطع ہوں گے،

۱۳- لوہے کے ہتھوڑے پڑیں گے،

وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ (حج-۲) | اور ان کے لئے لوہے کے ہتھوڑے ہیں،

۱۴- گلے میں طوق اور زنجیریں،

اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ يُسْحَبُوْنَ (مومن-۸) | جب اُن کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی، وہ کھینچے جائیں گے،

اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَاۡ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا، (دھر-۱) | ہم (خدا) نے کافروں کے لئے زنجیریں اور طوق اور آگ تیار رکھی ہے،

مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ (ابراھیم-۷) | وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے،

دوزخ میں روحانی سزائیں ان جسمانی سزاؤں کے ساتھ روحانی سزائیں بھی ہوں گی، جو اہلِ نظر کی نگاہوں میں اُن سے بھی بڑھ کر ہیں، چنانچہ دوزخ کی وہ آگ جس کی گرمی اور سوزش کا حال اوپر گذر چکا، وہ دل کو جا کر جھانکے گی، فرمایا،

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ، (ھمزہ-۱) | سلگائی ہوئی اللہ کی آگ، جو دلوں کو جھانکے گی،

وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ	اور جب عذاب کو دیکھیں گے تو اپنی
(یونس -۶)	پشیمانی کو چھپائیں گے،
یٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْبِ	اے حسرت اس پر کہ میں نے خدا کے
اللّٰہِ، (زمر، ۶)	پہلو میں کمی کی،
کُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْھَا	وہ جب جب دوزخ سے غم کی وجہ سے
مِنْ غَمٍّ، (حج - ۲)	نکلنا چاہیں،

ذلّت کا عذاب،

فَالْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْھُوْنِ	تو آج ذلّت کے عذاب کا بدلہ دیئے
(احقاف -۲)	جاؤ گے،

اس افسوس وحسرت ندامت سے بڑھکر یہ کہ اُن کو معذرت پیش کرنے کی بھی اجازت نہ ہوگی،

لَا تَعْتَذِرُوا الْیَوْمَ (تحریم۲)	آج معذرت نہ پیش کرو،

اللہ عزّوجل سے مکالمہ کا شرف اُن کو نہ ملیگا، جب وہ بات کرنا چاہیں گے تو وہ فرمائیگا،

اِخْسَئُوْا فِیْھَا وَلَا تُکَلِّمُوْنِ،	ذلیل ہو اس دوزخ میں، اور مجھ سے
(مومنون -۶)	بات نہ کرو،

سب سے بڑھکر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے جلوہ سے محروم رہیں گے،

کَلَّآ اِنَّھُمْ عَنْ رَّبِّھِمْ یَوْمَئِذٍ	ہرگز نہیں، وہ اس دن اپنے رب سے پردہ
لَّمَحْجُوْبُوْنَ، (تطفیف)	میں ہوں گے،

اُن میں سے جنھوں نے اس دنیا میں اپنے پروردگار کو بھلا دیا تھا، اُس دن وہ بھی اُن کو اپنی رحمت و شفقت کی یاد سے بھلا دے گا، فرمایا

کَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیْتَهَا وَ کَذٰلِكَ الْیَوْمَ تُنْسٰی ، (طٰه - ۷)

اسی طرح ہماری آیتیں تیرے پاس آئیں تو تونے اُن کو بھلا دیا، ایسے ہی آج تو بھی

ایسے دوزخی بھی ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی نگاہِ کرم سے بھی محروم رہیں گے، وہ انکی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا، نہ اُن سے کچھ بات کرے گا، اور نہ اُن کی اصلاحِ حال کی کوئی فکر کرے گا، یہ حقیقت میں شفیق و مہربان رب کی انتہائی ناراضی کی تصویر ہے، اس درد کے احساس کو وہی کچھ سمجھ سکتے ہیں جو عشق و محبت کے زخم خوردہ ہیں، فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَلَا یُکَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا یُزَکِّیْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۔ (اٰلِ عمران - ۸)

جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی (جھوٹی) قسموں کے ذریعہ سے تھوڑی سی دولت خریدا کرتے ہیں آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں، نہ قیامت میں خدا ان سے بات کرے گا، نہ اُن کی طرف دیکھے گا نہ اُن کو سنوارے گا، اور اُن کے لئے دردناک عذاب ہے،

جنّت

جنت کے نام اُس مقام کا نام جو نیکوکار انسانوں کا دائمی گھر ہوگا، قرآن پاک میں عموماً اَلْجَنَّۃُ (باغ) بتایا گیا ہے، اور کبھی کبھی اس کو مناسب اضافتوں کے ساتھ بھی ادا کیا گیا ہے مثلاً جَنَّۃ النَّعِیْمِ (نعمت کا باغ) جَنَّۃُ الْخُلْدِ (بقائے دوام کا باغ) جَنّٰتُ عَدْنٍ (دائمی سکونت کے باغ) جَنَّۃُ المأویٰ (پناہ کا باغ) ان کے علاوہ اور دوسرے لفظوں سے بھی اس کی تعبیر کی گئی ہے مثلاً فِرْدَوْسٌ (باغ) رَوْضَۃٌ (چمن) دَارُ الْخُلْدِ (ہمیشگی کا گھر) دَارُ الْمُقَامَۃِ (قیام کا گھر) دَارُ السَّلَامِ (امن وسلامتی کا گھر)

جنت کا دوام اس موجودہ دنیا میں بھی گو لذّتیں اور مسرتیں ہیں، مگر جو چیز یہاں نہیں ہے وہ بقائے دوام ہے، یہاں کی ہر لذت عارضی، اور ہر مسرت آنی ہے یہاں خوشی کا کوئی ایسا ترانہ نہیں جس کے بعد غم و ماتم کا نالہ نہ ہو، یہاں ہر پھول کیساتھ کانٹے، ہر روشنی کیساتھ تاریکی، ہر وجود کیساتھ فنا، ہر سیری کے بعد بھوک، ہر سیرابی کے بعد پیاس اور ہر غنا کے بعد محتاجی ہے، انسان ہزاروں مشکلیں اٹھانے اور ہزاروں صدمے سہنے کے بعد ایک مسرت کا پیام سنتا اور خوشی کا منظر دیکھتا ہے، مگر ابھی اس سے سیر ہونے کی بھی نوبت نہیں آتی کہ اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے، غرض اس موجودہ عالم فانی کی ہر شے آنی جانی ہے، اور یہی یہاں کی سب سے بڑی کمی ہے،

لیکن جنت اُس مملکت کا نام ہے، جہاں کی لذتیں جاودانی، اور جہاں کی مسرتیں غیر فانی ہیں، جہاں حیات ہے مگر موت نہیں، راحت ہی مگر تکلیف نہیں، لذت ہے مگر الم نہیں، مسرت ہے مگر غم نہیں، جہاں وہ سکون ہے جس کے ساتھ اضطراب نہیں، اور وہ شادمانی ہی جس کے بعد حزن واندوہ نہیں، شیطان نے حضرت آدمؑ کے سامنے جنت کا جو نقشہ کھینچا تھا، وہ بالکل صحیح تھا، اس نے کہا، اے آدم!

هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ	کیا میں تجھے سدا جینے کا درخت اور وہ
مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى، (طٰه - ۷)	بادشاہی بتاؤں جس کو فنا نہیں،

مگر جنت کا یہ وصف سُنا کر اُن کو جدھر کا راستہ بتایا، وہ موت کے درخت اور فنا کے ملک کی طرف کا تھا، اور یہی وہ فریب تھا جس میں آدم گرفتار ہوئے، چنانچہ اسی جنتی زندگی کی تلاش میں وہ چیز کھالی جو اُن کے حق میں زہر تھی، یعنی گناہ کا پھل، نتیجہ یہ ہوا کہ جنۃ الخلد اور غیر فانی ملک سے نکل کر اُن کو اس فنا کے ملک میں آنا پڑا، اور پھر اس جنۃ الخلد اور غیر فانی ملک کا استحقاق اُن کے اور اُن کی نسل کے اعمالِ صالحہ کا صلہ قرار پایا، چنانچہ فرمایا:

اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِىْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ	یا ہمیشگی کا باغ جس کا وعدہ پرہیزگاروں
كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّمَصِيْرًا،	سے کیا گیا جو اُن کا صلہ ہوگا، اور واپسی
(فرقان - ۲)	کی جگہ،

یہ ہمیشگی کا باغ وہ غیر فانی مملکت ہی، جہاں کا آرام دائم اور جہاں کی سلامتی ابدی جہاں کی لذت بے انتہا جہاں کی زندگی غیر منقطع، جہاں کا سرور غیر مختتم، اور جہاں کا عیش جاوداں ہی،

چنانچہ اس کی تصریح قرآن پاک کی سولہ آیتوں میں مختلف طریقوں سے کی گئی ہے، فرمایا،

۱۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ، (نساء ۱۸)

۱۔ اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے ہم اُن کو باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اُن میں ہمیشہ کے لئے رہ پڑیں گے، اللہ کا وعدہ سچا ہے، اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی،

اس تاکید پر تاکید، اور پر زور طریقۂ تعبیر پر نظر ڈالئے کہ صرف "خلود" پر اکتفا نہیں کی، بلکہ ساتھ ہی اَبَدًا فرما کر اس خلود کو غیر فانی اور قیام کو ابدی ظاہر فرمایا، اس پر بھی بس نہ کی بلکہ یہ بھی اضافہ کیا کہ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے" پھر مزید تاکید کا اضافہ کیا کہ "اور اللہ سے زیادہ سچی بات کس کی ہو سکتی ہے"؟ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خلود جنت اور بقاے غیر فانی کی قطعیت کتنی ہے،

۲۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا (نساء - ۸)

۲۔ اور جو ایمان لائے، اور اچھے عمل کئے ہم اُن کو اُن باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے،

۳۔ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا (مائدہ ۱۶)

۳۔ ان کے لئے وہ باغ ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہا کریں گے،

۴۔ وَجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۙ

۴۔ اور (اللہ ان کو خوشخبری دیتا ہے) کہ ان کے

خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ؕ (توبہ-۳)

لیئے وہ باغ ہیں جن میں ہمیشہ کا آرام ہے، اور جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے،

۵- وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ؕ (توبہ-۱۳)

۵- اور اُن کے لئے وہ باغ مہیا کئے ہیں جن کے نیچے نہریں رواں ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہا کریں گے،

۶- وَیُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا (تغابن-۱)

۶- اس کو ان باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اُن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے،

۷- وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَیَعْمَلْ صَالِحًا یُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا، (طلاق-۲)

۷- اور جو اللہ پر ایمان لائے، اور نیک کام کریں اُس کو وہ اُن باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے، اللہ نے اس کو روزی خوب دی،

۸- جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ؕ (بینہ-۱)

۸- اُن کی مزدوری اُن کے رب کے حضور میں بسنے کے وہ باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے،

یہ آیتیں وہ ہیں جن میں اہلِ جنت کو جنت میں خلود ابدی کی قطعی بشارت سنائی گئی ہے

ان کے علاوہ وہ آیتیں ہیں جن میں جنت کی راحتوں اور لذتوں کی ابدیت اور دوام کی خبر دی گئی ہے فرمایا:

۹ - وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا حَسَنًا ۝ مَاكِثِينَ فِيهِ أَبَدًا ۝ (کہف - ۱)	۹ - اور اُن مومنوں کو بشارت دیگا جو نیک اچھے کام کئے کہ اُن کے لئے اچھی مزدوری ہے جس میں وہ ہمیشہ قیام پذیر رہیں گے،

سورۂ ص میں جنت کی اکثر نعمتوں کے بیان کے بعد ہے،

۱۰ - هَٰذَا مَا تُوعَدُونَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ۝ إِنَّ هَٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهُ مِنْ نَفَادٍ ج ۝ (ص - ۴)	۱۰ - یہ وہ ہے جس کا حساب کے دن تم کو دینے کا وعدہ کیا جاتا ہے بے شبہ یہ ہماری روزی ہوگی جس کو ختم ہونا نہیں ہے،
۱۱ - وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۖ عَطَاءً غَيْرَ مَجْذُوذٍ ۝ (هود - ۹)	۱۱ - اور لیکن جو خوش قسمت ہوئے تو وہ جنت میں رہا کریں گے جبتک آسمان اور زمین ہیں لیکن جو تیرا رب چاہے وہ بخشش ہوگی جو منقطع نہ ہوگی،

یعنی خدا کی مشیت کے سوا ان کو اس جنت سے کوئی الگ نہ کرسکے گا لیکن اس کی مشیت یہی ہوگی کہ اُن کے لئے اُس کی یہ بخشش دائمی اور غیر منقطع طریقہ سے ہمیشہ قائم رہے پھر جس کے متعلق اُس کی مشیت کا یہ اعلان ہے، وہ فنا کیونکر ہوسکے گی،

۱۲ - وَجَنَّاتٍ لَهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُقِيمٌ ۝ (توبہ - ۳)	۱۲ - اور وہ باغ جن میں ان کے لئے قائم رہنے والی نعمت ہوگی،

۱۳- اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا (الرعد ۵)	۱۳- جنت کا میوہ اور اس کا سایہ دائمی ہے
۱۴- وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ (واقعہ-۱)	۱۴- اور بہت سے میوے جن کا نہ انقطاع ہوگا، اور نہ جن کی روک ہوگی،
۱۵- اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (تین)	۱۵- لیکن جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے اُن کے لئے وہ مزدوری ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا،

فنائے راحت اور انقطاعِ مسرت کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ راحت و مسرت کے اسباب کا خاتمہ ہوجائے، اور دوسرے یہ کہ خود لذّت اٹھانے والے کی زندگی کا خاتمہ ہوجائے، پہلی صورت کی نفی تو گذشتہ آیتوں میں کردی گئی کہ راحت و مسرت کے اسباب کا وہاں خاتمہ نہ ہوگا، اب رہ گئی دوسری صورت تو گو خَالِدِيْنَ اَبَدًا کہکر اس کی نفی بار بار کی جاچکی ہے، مگر ایک جگہ بتصریح یہ کہدیا گیا ہے کہ اس احاطہ میں موت کا گذر نہ ہوگا فرمایا

۱۶- لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ج (دخان ۳)	۱۶- جنت میں جانیوالے پہلی موت کے سوا پھر موت کا مزہ نہیں چکھیں گے،

لیکن ایک تیسری صورت یہ بھی ممکن تھی کہ مسرت کے اسباب بھی قائم رہیں، اور اہلِ جنّت کی زندگی بھی دائم ہو، مگر کچھ دنوں کے بعد ان کو وہاں سے نکال کر الگ کردیا جائے تو اس کی تصریح بھی فرمادی کہ یہ بھی ممکن نہ ہوگا کہ کوئی اہلِ جنت کو اُن کے عیش و راحت کی منزل گاہوں سے باہر نکال سکے، فرمایا،

لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ﴿ (حجر - ۴) — وہاں ان کو کوئی غم نہ چھوئے گا، اور نہ وہ اس میں سے نکالے جائیں گے،

یہ بھی ممکن ہے کہ خود اہلِ جنت اس سے گھبرا کر نکل آئیں تو فرمایا کہ اُن کی جبلت و فطرت ایسی ہوگی کہ وہ خود بھی اس مہمان خانۂ الٰہی سے نکلنا پسند نہیں کریں گے، فرمایا،

خَالِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ، (کہف - ۱۲) — سدا رہیں گے اس میں، اس سے منتقل ہونا نہ چاہیں گے،

دوام و بقار اور تسلسل و عدم انقطاع کی اس توبرتو تاکید اور اصرار سے اندازہ ہوگا کہ اسبابِ مسرت کی بقار، راحت کا دوام اور زندگی کا تسلسل جنت کی اصلی خصوصیت ہوگی، یہی وہ حقیقت ہے جس کی لالچ شیطان نے

وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ، (طٰہٰ - ۷) — اور غیر فانی سلطنت،

کہکر آدم کو دلائی تھی، اور اس بہانہ سے اس عالمِ بقا سے اُن کو اس عالمِ فنا میں بھجوادیا، آخر وہ زمانہ آئے گا، جب آدم کی اولاد کو ان کے نیک اعمال کی بدولت اس غیر فانی بادشاہی کی وراثت ہمیشہ کے لئے حاصل ہوگی،

غیر فانی بادشاہی دنیا میں شخصی راحت و آلام کا بلند سے بلند تخیل، ایک لفظ "بادشاہی" کے ادا بخوبی ادا ہوسکتا ہے، اگر انسان کو اس کی انتہائی آرزوؤں کے برآنے کی خوشخبری دینے کے لئے کوئی لفظ ہوسکتا ہے تو یہی ہے، گویا بادشاہی اس کیفیت کا نام ہے جس میں انسان کی کوئی آرزو کامیابی سے محروم نہ رہے، سامانِ راحت اور اسبابِ شادمانی کی فراوانی سے اسکی مسرت

یں کسی غم کا شائبہ نہ ہوا اونچے اونچے محل، ہرے بھرے باغ، بہتی نہریں، سرسبز و شاداب تختے، سونے چاندی کے اسباب، زر و جواہر کے برتن، زریں کمر غلام و خدام، ریشمی لباس، طلائی تخت، موتیوں کے ہار، سونے کے کنگن، شراب کے زمرّدیں اور بلوریں پیالے، حسین و مہ جبیں بیگمات، غرض ایک لفظ بادشاہی کے یہ تمام ضروری لوازمے ہیں،

جنّت کی مختصر ترین لیکن سچّی تعریفیں آدمؑ کے دشمن نے آدمؑ کے سامنے کی تھی،

وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى (طٰہٰ - ۷) اور غیر فانی بادشاہی،

آنے والی زندگی کے اس غیر فانی عیش و مسرت کے لئے مختلف پیغمبروں نے مختلف لفظ استعمال کئے ہیں، چنانچہ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے اس کیلئے آسمانی بادشاہی کی اصطلاح قائم فرمائی، اور اپنی گفتگو کے تمام استعاروں میں اس مفہوم کو اسی لفظ سے ادا کیا۔ مگر جیسا کہ بار بار کہا گیا ہے کہ انسانی لغت کے الفاظ سے جو مادیت کی گودوں میں پلے، اور مادیت کے ماحول میں پھولے پھلے ہیں کسی روحانی مفہوم کی تعبیر ناممکن ہے کہ اس کے ہر لفظ کے مفہوم کو ان ہی لوازم اور خیالات کے ساتھ انسان سمجھنے پر مجبور رہے، جو ہمیشہ سے اس لفظ کے ساتھ وابستہ چلے آتے ہیں، آپ بادشاہی کو آسمانی کہکر کسی قدر مادہ سے بلند کریں مگر بادشاہی کے مفہوم کے ساتھ جو موروثی خیالات و لوازم وابستہ ہیں، وہ دور نہیں ہو سکتے، چنانچہ خود حضرت عیسٰیؑ اپنی زندگی کی آخری شب میں شاگردوں کو جب شراب کا پیالہ بھر کر دیتے ہیں، تو آسمانی بادشاہی" کے مادی لطف و مسرت کا ذکر ان لفظوں میں کرتے ہیں،

"میں پھر تمھیں کہتا ہوں کہ انگور کا شیرہ پھر نہ پیونگا اس دن تک کہ تمھارے ساتھ اپنے

باپ کی بادشاہی میں اُسے نیا نہ پیوں"۔ (متی ۲۶ - ۲۹)

آپنے دیکھا کہ "باپ" کی "آسمانی بادشاہی" میں بھی انگور ہی کا شیرہ پینے کو ملے گا،

اور یوحنا حواری نے جب اس آسمانی بادشاہی کا خواب دیکھا تو وہ ان کو اسی سونے چاندی کے محل، آبِ حیات کی نہر، اور جواہرات کی دیواروں میں نظر آئی، (مکاشفاتِ یوحنا باب ۲۱ و ۲۲) اور پھر

"وہاں رات نہ ہوگی، اور وے چراغ اور سورج کی روشنی کے محتاج نہیں کیونکہ خداوند ان کو روشن کرتا ہے، اور وے ابدالآباد بادشاہی کریں گے"۔ (۲۲ - ۵)

لیکن یہ "بادشاہی" عیسوی پیغام میں ہنوز تفسیر کی محتاج ہے، نبوت کے آخری پیغام نے اس اجمال کی تفصیل ان لفظوں میں کی ہے:

فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰهُمْ	تو اللہ نے اہل جنت کو اس دن کی تکلیف سے
نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا۔ وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا	بچا لیا، اور اُن کو تروتازگی اور شادکامی سے ملایا،
جَنَّةً وَّحَرِيْرًا۔ مُّتَّكِئِيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ	اور اُن کے صبر کے بدلہ میں اُن کو رہنے کیلئے باغ
لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا۔	اور (پہننے کے لئے) ریشمی کپڑے دیئے، وہ ان
وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ	باغوں میں تختوں پر تکیے لگائے ہونگے ان میں دھوپ
قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا۔ وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ	ہوگی نہ ٹھنڈ، اور اُن کے سایے اُن پر جھکے ہوں گے، اُن
بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ	کے خوشے پست ہو کر لٹکے ہونگے، چاندی کے برتن
قَوَارِيْرَا۔ قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا	اور نقرئی شیشوں کے آبخورے جو ناپ کر

تَفْجِیْرًا، وَیُسْقَوْنَ فِیْھَا کَاْسًا کَانَ	بنائے گئے ہیں، اُن کو لوگ اُن کے پاس
مِزَاجُھَا زَنْجَبِیْلًا ج عَیْنًا فِیْھَا تُسَمّٰی	لئے پھریں گے! اور اُن کو وہاں وہ پیالا پلایا جائیگا
سَلْسَبِیْلًا، وَیَطُوْفُ عَلَیْھِمْ وِلْدَانٌ	جس میں سونٹھ ملی ہوگی، اُس میں ایک چشمہ کا
مُّخَلَّدُوْنَ ج اِذَا رَاَیْتَھُمْ حَسِبْتَھُمْ	نام سلسبیل ہے، اور سدا رہنے والے کمسن غلام
لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا، وَاِذَا رَاَیْتَ ثَمَّ	اُن کی خدمت میں گھوم رہے ہوں گے اور
رَاَیْتَ نَعِیْمًا وَّمُلْکًا کَبِیْرًا، عٰلِیَھُمْ	تو انھیں دیکھے تو سمجھے کہ موتی بکھرے ہیں؛
ثِیَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ	اور جب تو یہ سب دیکھے تو وہاں نعمت و
وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ج وَّ	عیش اور بڑی بادشاہی دیکھے، اُنکی پوشاک
سَقٰھُمْ رَبُّھُمْ شَرَابًا طَھُوْرًا،	سبز نرم ریشم اور دبیز ریشم ہو، اور اُن کو نقرئی
اِنَّ ھٰذَا کَانَ لَکُمْ جَزَآءً وَّکَانَ	کنگن پہنائے جائیں گے اور اُن کا پروردگار
سَعْیُکُمْ مَّشْکُوْرًا،	اُن کو پاک شراب پلائیگا، یہ تمھاری مزدوری
(دھر-۱)	ہوگی، اور تمھاری محنت کی قدر کی جائیگی؛

یہ پورا نقشہ اُس عیش و مسرت کا ہے جو اس دنیا کے شاہانہ محلوں کے متعلق تخیل میں آتا ہے۔
اس بیان کی تائید و تصدیق اس صحیح حدیث سے ہوگی جو جامع ترمذی میں حضرت مغیرہؓ صحابی سے
مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "موسیٰؑ نے اپنے پروردگار سے پوچھا کہ اے پروردگار!
جنت والوں میں سے سب سے کم رتبہ کون ہوگا، فرمایا وہ شخص جو جنت والوں کے جنت میں داخل
ہوچکنے کے بعد آخر میں آئے گا، تو اس سے کہا جائیگا کہ جنت میں داخل ہوجاؤ، وہ کہیگا کہ اب میں

کہاں جاؤں کہ لوگ اپنے اپنے مقام پر جاچکے، اور ربانی نوازشوں پر قابض ہو چکے" اُس سے کہا جائیگا کہ "کیا تو اس پر راضی ہو کہ تجھے وہ ملے جو دنیا کے بادشاہوں میں سے کسی کے پاس نہ تھا" عرض کریگا "خداوندا میں راضی ہوں"۔ فرمائیگا "تیرے لئے اتنا، اور اس سے دونا، اور اس سے گنا اور چوگنا ہے" کہیگا "خداوندا میں راضی ہوگیا" خدا فرمائیگا "تیرے لئے وہ اور اس کا دوگنا ہو" عرض کریگا "میں راضی ہوگیا" فرمائیگا اس کے ساتھ یہ بھی کہ جو تیرا دل آرزو کرے، اور جو تیری آنکھ کو لذت بخشے"[1]

باغ کا استعارہ آخرت کے خانۂ عیش وراحت کے لئے قرآن پاک نے عموماً جنت اور کہیں روضہ کے لفظ کا استعمال کیا ہو نادان اسکی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ عرب کے شور وبے حاصل اور خشک صحرا کے بسنے والوں کی انتہائی آرزو چونکہ سرسبز وشاداب باغوں ہی کی ہوسکتی ہی، اس لئے اُن کے لئے یہ لفظ اُس مقام آخرت کے لئے قرآن نے استعمال کیا ہو مگر یہ سمجھنا چاہئے کہ قرآن کا مخاطب صرف عرب نہیں بلکہ دنیا کا گوشہ گوشہ ہے، اسلئے عرب کی تخصیص بے معنی ہے، کیا دنیا کے سرسبز وشاداب ملکوں کے بسنے والوں کے تخیل میں باغ وراغ اور رنگ وگل کی بہار پسندیدہ نہیں ہو؟ اصل یہ ہے کہ یہاں بیابان وگلستان کی تخصیص نہیں، یہ فطرتِ انسانی کی تصویر ہے انسان کسی خطۂ ارضی میں آباد ہو مگر وہ سرسبز وشاداب قطعات، باغ وبہار اور کنارِ آبِ نہر کو عیش ومسرت کا مقام سمجھتا ہے اور اُن کو دیکھ کر اندر سے اُس کی روح وجد کرتی ہے،

اس استعارہ کے استعمال کا ایک اور نکتہ بھی توجہ کے قابل ہی، انسان کا گھر وہ عیش خانہ ہوتا ہی جس میں حزن وغم کی آمیزش بھی شامل ہوتی ہے، اہل وعیال اور دولت ومال کے متعلق ہر قسم

---

[1] جامع ترمذی تفسیر سورۂ سجدہ (حدیث حسن صحیح)

کی فکریں اُس کے دل کے دامن سے لپٹی ہوتی ہیں، مگر جب انسان سیر و تفریح کے لئے باغ و چمن کا رُخ کرتا ہی، تھوڑی دیر کے لئے وہ ہر غم کو بھول جاتا، اور ہر تعلق کو دل سے نکال دیتا ہی اور ایسا شاداں و فرحاں بن جاتا ہے کہ غم و الم اُس کے ہر گوشۂ خاطر سے دور ہو جاتے ہیں وحیِ محمدی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ وَالسّلام نے اس لفظ کو اسی لئے استعمال کیا ہی تاکہ اس سے اُخروی عیش و مسرت، شادی و خوشی، اور فراغِ خاطر کی پوری تصویر کھنچ جائے،

سامانِ جنت کے دنیاوی نام

یہ حقیقت بار بار دہرائی گئی ہے کہ عالمِ آخرت کی اشیا، کو جن دنیاوی الفاظ سے ادا کیا گیا ہے، اُن سے مقصود بالکل وہی نہیں ہیں جو ان لفظوں سے سمجھنے کے ہم عادی ہیں بلکہ اُن اُخروی اشیا، کو ان دنیاوی الفاظ سے اس لئے ادا کیا گیا ہے کہ وہ اُن سے خاص مناسبت رکھتی ہیں، ورنہ از روے حقیقت ان الفاظ کے لغوی مفہوم و معنی سے اُن کی اُخروی حقیقتیں بدرجہا بلند و اتم ہوں گی، چنانچہ قرآن مجید کی ان آیتوں میں

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	اور اُن کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے
اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا	یہ خوشخبری سُنا کہ اُن کے لئے وہ باغ ہیں
الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ	جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، وہ جب
رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا	جب ان باغوں سے کوئی پھل دیئے جائیں گے
مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَ	کہیں گے کہ یہ وہی ہے جو اس سے پہلے ہم
لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّ	کو دیا گیا تھا، اور وہ اُن کو ایک دوسرے
هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ	کے مشابہ دیا جائیگا، اور اُن باغوں میں انکی

لَا يَسْتَحْيِيٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا	صاف ستھری بیویاں ہونگی اوران باغوں میں ہا
بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ط	کریں گے، بے شبہ خدا اس سے شرمندہ نہیں کہ وہ یک
(البقرہ ع - ۳)	مچھر کی یا اس سے بھی کم رتبہ چیز کی مثال بیان کرے!

ان آیتوں کے سباق وسیاق اور نظم وترتیب پر لحاظ کرکے میرے ذہن میں یہی معنی آتے ہیں کہ ان میں دنیاوی الفاظ اور ان کے اُخروی مفہوم کے درمیان تشابہ کا بیان ہے ورنہ حقیقت کے رو سے ان الفاظ کے دنیاوی لغوی معانی اور اُخروی معنوں میں وہی نسبت ہے جو مچھر اور کسی عظیم الجثہ شے کے درمیان ہو سکتی ہے، یہی سبب ہے کہ جنت کی لذتوں اور نعمتوں کی نسبت قرآن نے یہ بھی کہا ہے،

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ	تو کسی نفس کو معلوم نہیں کہ اُن کے لئے اُن کے
قُرَّةِ اَعْيُنٍ ج جَزَآءً بِمَا كَانُوْا	(اچھے) اعمال کے بدلہ میں آنکھوں کی جو
يَعْمَلُوْنَ ، (سجدہ ع - ۲)	ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے،

اس "آنکھوں کی ٹھنڈک" یعنی لذت وراحت کی کیفیت دنیاوی تخیل سے چونکہ بہت بلند ہے، اس لئے یہ فرمایا گیا کہ جنت کی راحت ولذت کی حقیقت علم وفہم سے پوشیدہ اور مخفی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی مفہوم کو اپنے ان مبارک الفاظ سے واضح فرمادیا ہے،

قال اللہ اعددت لعبادی	خدا فرماتا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے
الصّٰلحین مالا عین رأت ولا	لئے وہ مہیا کیا ہے جس کو نہ کسی آنکھ نے
اذن سمعت ولا خطر علی قلب	دیکھا، نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان

بشر[۱]، کے دل میں اس کا خیال آیا،

اگر جنت کے باغوں، نہروں، میووں، غلاموں، شرابوں، ریشمی کپڑوں اور طلائی زیوروں کی وہی اُخروی حقیقت ہی، جو ان لفظوں سے لغوی طور پر ہم اس دنیا میں سمجھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بہشت کی لذتوں اور مسرتوں کو ایک "مخفی حقیقت" نہ فرماتا، اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسکی توضیح میں اس درجہ بلندی کرتے کہ وہ ایسی چیزیں ہیں جن کو آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا، اور نہ وہ کسی انسان کے خیال میں گذریں، مزید تاکید روایت کے دوسرے الفاظ میں ہے،

بلہ ما اطلعتم علیہ (صحیح بخاری تفسیر سورۂ سجدہ) جو تم جانتے ہو اُس کو چھوڑ دو،

صحیح مسلم[۲] کی روایت میں یہ الفاظ ہیں، بلہ ما اطلعکم اللّٰہ علیہ، اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ "بلکہ خدا نے تم کو اس پر مطلع بھی نہیں کیا ہے"۔ دوسرے یہ کہ "خدا نے اس کا جو حال بتایا ہے، اس سے بھی درگذر کرو"۔

غرض ان لفظوں سے جو بھی تم سمجھ سکتے ہو، اس کو چھوڑ کر آگے بڑھو، اصحاب تفسیر نے حضرت ابن عباسؓ سے بسند نقل کیا ہے،

وقال السفیان الثوری عن	سفیان ثوری، اعمش سے اور وہ ابو ظبیان سے،
الاعمش عن ابی ظبیان عن ابن	اور وہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے
عباس، لایشبہ شیٔ مما فی الجنۃ	ہیں کہ جنت میں جو کچھ ہو وہ دنیا کی چیزوں سے
ما فی الدنیا الا فی الاسماء،	ناموں کے سوا اور کسی بات میں مشابہ نہیں،

[۱] صحیح بخاری، باب کلام الرب وتفسیر سورۂ سجدہ، صحیح مسلم کتاب الجنۃ وترمذی تفسیر سجدہ [۲] صحیح مسلم کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمہا

دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں،

لَیْسَ فِی الدُّنْیَا مِمَّا فِی الْجَنَّۃِ اِلَّا الْاَسْمَاءُ، — جنت میں جو کچھ ہے، وہ ناموں کے سوا دنیا میں نہیں،

غرض ان الفاظ سے ان ہی دنیاوی مشاہدات کی چیزوں کو سمجھنا ضروری نہیں بلکہ ان سے بدرجہا بلند لذائذ اور مسرتیں مراد ہیں، جن کی تعبیر کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ کسی وجہ مناسبت کے سبب سے اُن کو ان دنیاوی لفظوں سے ادا کیا جائے، اور اس پر بھی مفہوم ادا نہ ہوسکنے میں اشکال نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ کی عدم قدرت کلام کے سبب سے نہیں ہے، بلکہ عاجز انسانوں کی ذہنی درماندگی کے سبب سے ہے کہ نادیدہ وناشنیدہ اور دور دل ناخلیدہ مفاہیم کے لئے اُن کی زبان ولغت میں کوئی لفظ ہی نہیں،

جنت کی مسرتیں اعمال کی تمثیل ہیں | یہ اصول بار بار بیان میں آچکا ہے کہ دوزخ کی تکلیفیں ہوں، یا جنت کی مسرتیں، دونوں اعمالِ انسانی کی تمثیلیں ہیں، اسی لئے قرآن پاک نے بتصریح تمام یہ کہا ہے:

اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (طور۔۱) وہی بدلہ پاؤ گے جو تم کرتے تھے،

حدیث میں آتا ہے کہ قیامت میں خدا فرمائے گا "اے میرے بندو، یہ تمہارے ہی عمل ہیں جو تم کو واپس مل رہے ہیں تو جو نیکی پائے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جو برائی پائے وہ اپنے آپ کو ملامت کرے"[1]

مثلاً وہ نکوکار جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے خوف سے ہمیشہ ترساں ولرزاں رہتے تھے اُن کو جنت

[1] تفسیر ابن جریر طبری، آیت مذکورہ وبیہقی فی البعث کما فی الدر المنثور للسیوطی، تفسیر آیت مذکورہ۔

میں امن وسلامتی کے ساتھ وہاں کی تمام راحتیں ملیں گی تو

قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ	کہیں گے ہم اس سے پہلے اپنے گھر والوں میں
فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ	ڈرتے تھے تو خدا نے ہم پر مہربانی فرمائی اور
السَّمُوْمِ (طور - ۱)	ہم کو دوزخ کی لُو کے عذاب سے بچالیا،

اس آیت سے صاف نمایاں ہے کہ جو لوگ دنیا میں خدا کے قہر وغضب سے ڈرتے تھے، وہ قیامت میں گرم لُو (سموم) کے عذاب سے بچائے جائیں گے، قہر وغضب کی تمثیل شعلہ آتش، لو وغیرہ گرم چیزوں سے ہے، تو جو لوگ دنیا میں خدا کے قہر وغضب سے ترساں تھے دیکھو کہ قیامت میں ان کو سموم یا گرم ہوا کی لو سے بچائے جانے کی بشارت ملی،

دولت مند وقوی دست منکرین اور غریب مسلمانوں کو دیکھ کر دنیا میں ان پر تحقیراً ہنستے تھے، قیامت میں اس کا الٹا ہوگا کہ یہ اُن پر ہنسیں گے، فرمایا،

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ	بیشک گنہگار، ایمان والوں پر ہنستے تھے
اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ	....
فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ	.... تو آج ایمان والے
يَضْحَكُوْنَ، (تطفیف)	کافروں پر ہنسیں گے،

نکوکاروں کے دنیا کے آنسو یہاں تبسم اور خندۂ مسرت میں بدل گئے اور گنہگاروں کی وہاں کی ہنسی یہاں آنسوؤں کا تار بن کر ظاہر ہوئی،

گنہگار جو دنیا میں اپنی دولت وقوت کے نشہ میں چور اور اپنے اہل وعیال کیساتھ خوش

اور مسرور رہتے تھے، وہ یہاں غمگین ہوں گے، اور جو وہاں غمگین تھے وہ یہاں خوش اور مسرور ہوں گے،

فَسَوْفَ يَدْعُوا ثُبُورًا ۙ وَيَصْلٰى	تو وہ موت کو پکاریگا، اور دوزخ میں داخل
سَعِيْرًا ؕ اِنَّهٗ كَانَ فِيْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا	ہوگا، کیونکہ وہ اپنے اہل و عیال میں
(انشقاق - ۱۱)	(مغرورانہ) خوش تھا،

اور جو نکو کار وہاں اہل و عیال میں بیٹھکر بھی مسرت سے نا آشنا تھا، اس کا یہ حال ہوگا کہ

فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۙ	تو اس سے آسان حساب لیا جائیگا اور وہ
وَّيَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ؕ (انشقاق)	خوش خوش اپنے لوگوں کے پاس لوٹیگا،

قرآن پاک میں بارہا یہ آیتیں یا بعینہ ان ہی معنوں کی آیتیں آئی ہیں،

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے ان
اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا	کو باغوں کی خوشخبری سنا جن کے نیچے
الْاَنْهٰرُ ، (بقرہ - ۳)	نہریں بہتی ہیں،

ان آیتوں میں ایمان، اور عمل صالح کے بالمقابل باغ اور اسکی نہروں کا ذکر پابندی کے ساتھ آتا ہے، اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی خاص تمثیلی تعلق ہے، یہ ظاہر ہے کہ درخت اصلی چیزیں ہیں جن کی ترقی اور نشو و نما پانی سے ہوتی ہے، بعینہ اسی طرح ایمان اصل ہے جس کی جڑوں کی سیرابی اعمال صالحہ کی آبیاری ہی سے ہوتی ہے، اگر ایمان ہو اور اعمال صالحہ نہ ہوں تو وہ ایک ایسا درخت ہوگا جس کی ترقی اور نشو و نما کی امید نہیں، اور اگر صرف عمل صالح ہے اور ایمان نہیں تو ریگ میں پانی کی روانی ہے جس کا وجود و عدم یکساں ہے، اس تمثیل کے ذہن

میں آنے کے ساتھ قرآنِ پاک کی یہ آیت سامنے آتی ہے،

وَاُدْخِلَ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ
تَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ، اَلَمْ تَرَ کَیْفَ
ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا کَلِمَةً طَیِّبَةً
کَشَجَرَةٍ طَیِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ
فَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ، تُؤْتِیْٓ اُکُلَهَا
کُلَّ حِیْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا، وَیَضْرِبُ
اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ
یَتَذَکَّرُوْنَ، (ابراھیم-۴)

اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہ
اُن باغون میں داخل کئے گئے جن کے نیچے
نہریں بہتی ہیں، وہ اپنے پروردگار کے حکم سے
ان میں سدا رہیں گے، وہاں سلامتی کی مبارکباد
ہی، کیا تونے نہیں دیکھا کہ خدا نے کیسی ایک
مثال بیان کی، نیک بات ایک ستھرے
درخت کی طرح ہے، جس کی جڑ مضبوط ہو
اور ٹہنی آسمان میں ہو، اپنے پروردگار کے
حکم سے وہ ہمہ وقت پھل لایا کرتا ہے اور
خدا مثالیں بیان کرتا ہی کہ لوگ شاید سوچیں،

اس آیت میں جنّت اور کلمۂ طیّبہ کے درخت کی پوری تمثیل ہی، یہاں تک تقابل ہی کہ پہلے میں جب یہ کہا گیا کہ "اپنے پروردگار کے حکم سے وہ ان باغوں میں سدا رہیں گے" تو دوسرے میں ہی کہ "وہ درخت اپنے پروردگار کے حکم سے سدا پھل دیتا رہیگا" کلمۂ طیّبہ سے یہاں مراد ایمان ہی[1] جس کی جڑ مضبوط و مستحکم، اور اس کی شاخیں آسمان میں اور اسکے پھل سدا بہلنے والے ہیں،

صحیح بخاری میں ہی کہ حضرت عثمانؓ بن مظعون صحابی کی وفات کے بعد اُن کی ایک ہمسائی

[1] تفسیر ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکورہ،

صحابیہؓ نے خواب میں دیکھا کہ ایک نہر بہ رہی ہے اور جب یہ معلوم ہوا کہ یہ حضرت عثمانؓ بن مظعون کی ہے انھوں نے آکر یہ خواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا، آپ نے اسکی تعبیر میں فرمایا ذاک عَمَلُہٗ یَجْرِیْ لَہٗ" یعنی یہ نہر ان کا عمل ہے جو ان کے لئے بہ رہی ہے" (بخاری کتاب التعبیر)

ان دونوں سابقہ حوالوں سے یہ ہویدا ہوتا ہے کہ ایمان کی تمثیل سدا بہار درخت سے، اور عمل کی تمثیل نہر رواں سے ہے، اس بنا پر اہل جنت کے لئے بار بار جس باغ اور نہر جاری کی بشارت دی گئی ہے، وہ حقیقت میں اُن کے ایمان اور عملِ صالح کی تمثیلی شکلیں ہوں گی، ان کا ایمان جو خوشنما اور سدا بہار باغ، اور اُن کے اعمالِ صالحہ صاف و شفاف نہر کی صورت میں نمایاں ہونگے، اور وہ ان سے لطف و لذت اٹھائیں گے،

اسی قیاس پر جنت کی دوسری لذتوں اور مسرتوں کی حقیقت کی تشریح کیجا سکتی ہے، علومِ نبوی کے ایک بڑے واقفکار اور اسرار شریعت کے ایک بڑے دانائے راز شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں،

واکثر الوقائع الحشریۃ من ھذا	حشر کے واقعات از قبیل تمثیل ہیں.....
القبیل	.... حاصل یہ
وبالجملۃ فتشبحات وتمثلات	یہ تمام امورِ معانی کا جسمانی قالبوں میں اور
لما عندھا .... وتتشبح	مثالی صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے......
النعمۃ بمطعم ھنیٔ ومشرب	.... اللہ تعالیٰ کی عنایت
مریئ ومنکح شھی وملبس بھی	وہر بانی خوش مزہ کھانے، خوشگوار پینے

ومسکن بھی، کی چیزوں، رغبت انگیز لذت نکاح، دلپسند
لباس اور عمدہ مسکن کی صورتوں میں نمایاں ہوگی،
(ص ۳۰ ۔ ھند)

ہم نے آیات واحادیث کے حوالوں سے پہلے کئی دفعہ یہ دکھایا ہے کہ اس تمثیل و تشبیح کے کیا معنی ہیں اور کیونکر غیر مجسم معانی، اپنے مناسب قالبوں میں مجسم ہوکر وجود پذیر ہوتے ہیں، دنیا کے تمام اعمال صالحہ کی اگر تحلیل کیجائے تو ان کی اولاً دو قسمیں نکلیں گی، خدا پر ایمان اور خلوص دل سے اسکی طاعت جس کو "حقوق اللہ" کہتے ہیں، اور دوسری بندگان الٰہی کیساتھ حسن سلوک، بندگان الٰہی کیساتھ جو نیک سلوک کیا جاسکتا ہے وہ یہی ہے کہ انکی عزت آبرو کا پاس کیا جائے جس کو عفت وعصمت کہتے ہیں، اور ان کے ضروریات زندگی کے مہیا کرنے میں امداد کی جائے، اور ضروریات زندگی یہی کھانا پینا، پہننا، اور رہنا ہیں، ان ہی کی نسبت ہم ان کے ساتھ حسن سلوک کرسکتے ہیں، اب یہ پانچ قسمیں ہوئیں، جنت کی نعمتیں ان ہی پانچ قسموں میں منحصر ہیں، ایمان واخلاص طاعت کی جزا، وہ خود تبارک وتعالیٰ ہے، وہ اپنے قرب اور اپنے دیدار سے نوازیگا، عفت وعصمت کی جزا حسین ومہ جبیں بیویوں کی صورت میں نمایاں ہوگی، دوسروں کے کھلانے کی جزا جنت کے باغ اور پھل اور قسم قسم کے الوان طعام ہیں، دوسروں کو پلانے کی جزا خوش مزہ خوشبو دار پینے کی مختلف چیزوں کی فراوانی ہے، پہنانے کی جزا، ریشم وحریر ودیبا واطلس اور بہتر سے بہتر خوشنما لباس ہے، اور رہنے اور رکھنے میں حسن سلوک کی جزا، خوش منظر مکان وتماشگاہ ہے،

ایک اور پہلو سے دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی بہشت کی صفت یہ بیان فرمائی ہے،

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى — بے شک تیرے لئے اس بہشت میں :

وَاَنَّکَ لَا تَظْمَؤُا فِیْهَا وَلَا تَضْحٰی، بھوکا ہونا، نہ ننگا ہونا، اور نہ پیاسا ہونا،

(طٰہٰ - ۷) نہ دھوپ میں رہنا،

یہی چار مختصر انسانی ضرورتیں ہیں، جو پھیل کر ایک دنیا ہو گئی ہیں، جب آدم کی اولاد کو اپنے اعمالِ صالحہ کی بدولت نجات ملے گی تو پھر اُن کے لئے وہی بہشت ہے جس میں نہ بھوکا ہونا ہے نہ پیاسا ہونا، نہ ننگا ہونا، نہ گرمی اور نہ دھوپ کی تکلیف میں گرفتار ہونا، اس حقیقت کی تعبیر ۲ دو طرح سے کیجا سکتی ہے، یا تو یہ کہ بہشت میں اہلِ بہشت کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ان تمام انسانی ضرورتوں سے یکسر پاک و بے نیاز ہو جاتے ہیں، اس لئے وہاں نہ کوئی بھوکا ہوگا نہ پیاسا، نہ ننگا ہوگا، اور نہ دھوپ اور لو کی محنت میں گرفتار، دوسرے یہ کہ بہشت میں اہلِ بہشت کو کھانے کے لئے ایسے الوانِ نعمت ملیں گے جن کو کھا کر انسان پھر بھوکا نہ ہوگا، اور پینے کے لئے شراب و شربت کی وہ نہریں بہیں گی جن کو پی کر پھر پیاسا نہ ہوگا، اور پہننے کو وہ کپڑے ملیں گے جو پھر نہ میلے ہونگے اور نہ بوسیدہ ہو کر پھٹیں گے، اور رہنے کے لئے ایسے گھنے باغ اور بلند مکانات ملیں گے جہاں دھوپ کا گذر نہ ہوگا،

یہ اصول پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ دنیا میں انسان کے لئے جو لطف و لذت ہے وہ تھوڑی سی تکلیف کا نتیجہ ہے، انسانی اصول یہ ہے کہ بڑی لذت کے حصول کے لئے تھوڑی تکلیف گوارا کرتا ہے، اور بڑی مسرت پر چھوٹی چھوٹی مسرتوں کو قربان کرتا ہے، اسی اصول پر اس کے تمام اعمال کی کامیابی و ناکامیابی کی بنا ہے، اعمالِ صالحہ کے بجالانے میں انسان کو اس دنیا میں چھوٹی چھوٹی تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں، اور اپنی عارضی خوشیوں اور

لذتوں کو اُن پر قربان کرنا ہوتا ہے صبح کے نمازی کو خوابِ سحر کی لذت کو خیرباد کہنا، اور دوپہر کی جلتی دھوپ میں ظہر کے لئے مسجد جانا پڑتا ہے خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلانا پڑتا ہے اور اپنی بہت سی ناجائز مگر بظاہر دلچسپ خوشیوں کا ایثار کرنا پڑتا ہے، اس طرح پاکیزہ زندگی گذارنے پر اُس کو آخرت کی غیر فانی دولت اور ابدی سعادت میسر آتی ہے،

انسان کو دنیا میں ان اعمالِ صالحہ کی خاطر جن چیزوں کو قربان کرنا پڑتا ہے اُن میں پہلی چیز تو خود اس کی زندگی ہے، پھر انسانی زندگی کی وہ چار قسمیں ہیں جن کا نام کھانا پینا، پہننا اور رہنا ہے، اس لئے آخرت میں ان قربانیوں کی جزا میں ان ہی کے مناسب مماثل جو چیزیں ملیں گی، وہ غیر فانی زندگی، الوانِ طعام، اقسامِ شراب وشربت، انواعِ لباس اور بہترین مسکن ہیں، قرآنِ پاک میں ہے،

فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۙ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۙ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ، وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ، فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى	پس جس نے خدا سے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی (کے ناجائز لطف، آرام) کو ترجیح دی تو دوزخ اس کا ٹھکانا ہے لیکن جو خدا کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو ناجائز خواہشوں سے روکا تو اس کا ٹھکانا (جنت ہے)
(نازعات - ۲)	

گو اس کی جزئی نیکیوں کی جزا، تو وقتاً فوقتاً اس دنیا میں تھوڑی تھوڑی کر کے شہرت، تعریف، ہردلعزیزی، اور دولت کی صورت میں ملتی رہتی ہے، مگر پوری زندگی کی مجموعی جزا دوسری زندگی ہی میں اس کو ملے گی،

وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ (آلِ عمران - ۱۹)

اور تمہاری مزدوری قیامت کے دن پوری ادا کیجائے گی،

لطف و مسرت کا تصور

مسرت ایک نفسی کیفیت کا نام ہے جو انسان کو اپنی کسی خواہش کے پورے ہوتے وقت حاصل ہوتی ہے، اس بنا پر مسرت کے وجود کے لیئے کسی خواہش کی تکمیل ضروری ہے، اب انسانی خواہشوں کی تحلیل کرو تو بالآخر اُن کی انتہا اُنہی باتوں پر ہوگی جن کی طلب اس کی فطرت کے اندر ودیعت کردی گئی ہے، اب غور کرو کہ وہ کیا چیزیں ہیں، یا کیا چیزیں اس کے فہم میں آسکتی ہیں، وہ یہی ہیں، باغ و بہار، لباس و طعام، حور و قصور، خدم و حشم، سامان و اسباب اور زر و جواہر مسرت اور راحت کا جب کبھی تخیل آئیگا، اور جب کبھی ہم اُن کو سمجھنا چاہیں گے، اور کہنا چاہیں گے تو ہم کو ان ہی چیزوں کا نقشہ کھینچنا پڑیگا، اور ہماری انسانی فطرت انہی مسرتوں اور خوشیوں کو ڈھونڈھنے کی عادی ہے، اور ان ہی کے حصول کی خاطر دنیا میں ہر طرح کی سیہ کاری اور گنہگاری کی مرتکب ہوتی ہے، اس لئے اُن سے احتراز کرنے پر جو چیزیں ہم کو وہاں ملیں گی وہ ہمارے ان ہی عادی و مانوس اسبابِ مسرت کی صورتوں میں ہمارے سامنے پیش ہوں گی، اور ہم اُن سے لطف اندوز ہوں گے،

لطف و مسرت کا اعلیٰ ترین تخیل

اس دنیا کے کون و فساد میں ہم ایک عجیب قسم کی مصیبت میں مبتلا ہیں، ہم کو تخیل کے لحاظ سے اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کو وسیع اور غیر محدود دنیا بخشی گئی ہے، لیکن عملاً اپنی اپنی خواہشوں اور تمناؤں کے مطابق اپنی دنیا بنا لینے پر قدرت نہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اگر ہم نے صبر و شکر کا دامن نہیں پکڑا ہے تو ہم سے زیادہ اس دنیا میں تصور د

تخیل کی تکلیف میں کوئی اور گرفتار نہیں، جنّت آخرت کی اُس دنیا کا نام ہے جو ہمارے اعلیٰ ترین تخیل اور ہماری تمناؤں اور آرزوؤں کے مطابق ہوگی،

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ	رہنے کے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اُن
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا	کے لئے اُن باغوں میں وہ ہے جو وہ چاہیں
يَشَآءُوْنَ ؕ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ	اللہ اسی طرح پرہیزگاروں کو بدلہ دیگا،
الْمُتَّقِيْنَ ۙ (نحل -۴)	....
وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ	اور تمہارے لئے جنّت میں وہ ہے جو تمہارے
وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ (حٰمٓ السجدہ)	دل چاہیں، اور تمہارے لیے اس میں وہ ہے جو
لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا	اُن کے لئے جنّت میں وہ ہے جو وہ چاہیں، اور
مَزِيْدٌ ، (ق -۳)	ہمارے پاس اس سے بھی بڑھ کر ہے،
وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَ	اور جنّت میں وہ ہے جس کی دل خواہش
تَلَذُّ الْاَعْيُنُ ، (زخرف -۷)	کریں، اور جو آنکھوں کو لذت دے،
لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ؕ كَانَ	اُن کے لئے جنّت میں وہ ہے جو وہ چاہا
عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُوْلًا (فرقان ۲)	کریں گے، یہ وعدہ ہے تیرے رب کے ذمہ،
لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ،	ان کے لئے اُن کے پروردگار کے پاس
(زمر -۴)	وہ ہے جو وہ چاہیں گے،

الغرض جنّت وہ مقام ہے جہاں ہم کو وہ کچھ ملیگا جہاں تک ہمارا مرغِ خیال اُڑکر پہنچ سکتا ہے،

لطف و مسرت کا وہ بلند سے بلند تخیل جو تصور میں آسکتا ہے وہاں ہماری لئے مہیا ہوگا صحابہ میں ہر قسم کے لوگ تھے، جنت کے سامانِ مسرت کے متعلق وہ اپنی اپنی پسند اور آرزو کے مطابق آپ سے پوچھتے رہتے تھے، اور آپ جواب دیتے تھے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہو کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ "جنت میں جو سب سے کم رتبہ ہوگا اُس کی کیفیت بھی یہ ہوگی کہ خدائے تعالیٰ اس سے فرمائیگا کہ تو اپنی انتہائی آرزو دل میں خیال کر، وہ کریگا تو خدا فرمائیگا کہ تجھ کو وہ سب پاگیا جس کی تو نے آرزو کی تھی اور اُس کے برابر اور[۱] یہاں تک کہ بازار کا شوق ہوگا تو بازار بھی لگیگا لیکن وہ حقیقی خرید فروخت نہ ہوگی کہ وہاں کمی کس چیز کی ہوگی، بلکہ وہ مثالی صورتوں میں ہوگی (الا الصور من الرجال[۲])

کسی کو جنت میں کھیتی کا شوق ہوگا تو دانہ، سبزہ، غلہ اور پھر تیاری، یہ سب کام منٹوں میں انجام پا جائیگا،[۳] ایک بدوی نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں گھوڑے بھی ہوں گے، فرمایا کہ اگر تم کو جنت ملی تو اگر تم یہ بھی چاہو گے کہ سرخ یاقوت کا گھوڑا ہو جو تم کو جہاں چاہو بہشت میں لیئے پھرے تو وہ بھی ہوگا، دوسرے نے پوچھا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اونٹ بھی ہوگا، فرمایا اگر تم جنت میں گئے تو تمھارے لئے وہ سب کچھ ہوگا جو تمھارا دل چاہیگا، اور تمھاری آنکھیں[۴] پسند کریں گی"

جنت میں اہلِ جنت کے مختلف رتبے ہوں گے، اس لئے اعلیٰ کے لباس و سامان کو دیکھ کر ادنیٰ کو اپنی کمی کا خیال ہوگا، تو اس کے تصور میں یہ پیدا کر دیا جائیگا (حتی یتخیل الیہ) کہ خود اس کا لباس و سامان اس سے بہتر ہے اور یہ اس لئے ہوگا کہ جنت میں کسی کو غم ہونا ممکن نہیں[۵]"

---

۱ صحیح مسلم ۲ ترمذی، دیکھو مشکوٰۃ صفۃ الجنۃ ۳ صحیح بخاری ۴ ترمذی ۵ ترمذی، یہ کل حدیثیں مشکوٰۃ صفۃ الجنۃ سے لی گئی ہیں،

جنت جہاں کوئی جسمانی و روحانی آزار نہیں

کسی صاحبِ دل نے جنت کی یہ تعریف خوب کی ہے، ع

بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد

دنیا میں کوئی بڑی سے بڑی مسرور زندگی بھی ایسی نہیں مل سکتی جس کے پہلو میں مسرت کے پھول کے ساتھ غم کا کوئی کانٹا نہ چبھ رہا ہو، یا تو موجودہ مسرت کے آئندہ ختم ہوجانے کا خوف ہے اور یا گذشتہ ناکامی کا افسوس ہے اس بنا پر یہاں کی کوئی خوشی بھی کامل نہیں، مگر جنت وہ مقام ہوگا جہاں نہ ماضی وحال کا غم ہوگا اور نہ مستقبل کا خوف ہوگا چنانچہ اہلِ جنت کے متعلق بار بار ارشاد ہوا،

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ، نہ اُن کو خوف ہوگا اور نہ غمگین ہوں گے،

اور یہی بہشت کی سب سے بڑی نعمت ہوگی، اس میں جسمانی و روحانی ہر قسم کی نعمتیں داخل ہیں،

دنیا میں کوئی انسان اس وقت تک کوئی لقمہ گلے سے نہیں اُتار سکتا، اور نہ کوئی چیتھڑا بدن پر رکھ سکتا ہے جب تک اُس کے سر کا پسینہ پاؤں تک نہ آئے، دنیا کی تمام فانی مسرتیں ہماری فانی کوششوں کا فانی نتیجہ ہیں، مگر جنت کی خوشیاں بے غم و تکلیف ہماری گذشتہ فانی نیکیوں کا غیر فانی نتیجہ ہیں، اور یہ محض اللہ تعالیٰ کا رحم وکرم ہے کہ وہاں ہم کو ہماری آسایش کا تمام سامان اس قسم کی ادنیٰ زحمت و مشقت اٹھائے بغیر میسر آئیگا جس کے بغیر دنیا میں کوئی انسان زندہ ہی نہیں رہ سکتا، اور جس کی کشمکش سے یہ دنیا ہر انسان کے لئے دوزخ بنی ہے، چنانچہ اہل جنت جنت میں داخل ہو کر اور شاہانہ تزک و احتشام اور لباس و زیور سے آراستہ ہو کر خدا کی حمد و تعریف کا ترانہ ان لفظوں میں گائیں گے،

جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا رہنے کے باغ جن میں وہ داخل ہوں گے،

يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا ۖ وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ۝ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۖ إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُورٌ شَكُورٌ ۝ الَّذِي أَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِن فَضْلِهِ لَا يَمَسُّنَا فِيهَا نَصَبٌ وَلَا يَمَسُّنَا فِيهَا لُغُوبٌ ، (فاطر-۴)	اُن میں وہ سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے! اور ان کی پوشاک ان میں ریشم ہوگی، اور وہ کہیں گے پاک ہے وہ جس نے ہم سے غم دور کردیا، بیشک ہمارا پروردگار گناہوں کا معاف کرنے والا ہے، اور نیکیوں کی قدر کرنے والا ہے، اور جس نے ہم کو اپنی مہربانی سے رہنے کے گھر میں اتارا اور ہم کو وہاں نہ مشقت پہونچی اور نہ اس میں
لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُم مِّنْهَا بِمُخْرَجِينَ ، (حجر-۴)	اس میں اُن کو کوئی آزار نہ ہوگا، اور نہ وہاں سے نکالے جائیں گے ،

جنت جہاں رشک و حسد نہیں

موجودہ دنیا خیر و شر کے متضاد عناصر سے بنی ہے یہاں ثواب کے ساتھ گناہ، رحم کے ساتھ سنگدلی، محبت کیساتھ کینہ ہے، یہ گناہ و کینہ اور بغض و حسد وہ آگ ہے جس نے یہاں کے قلبی امن و امان کے خرمن میں آگ لگا رکھی ہے، ہر شخص یہاں دوسروں کی اچھی حالت کو دیکھ کر جلتا ہے اور دوسروں پر غصہ کے جوش و خروش سے اُبلتا ہے جنت وہ عالم ہے جہاں اس آگ اور سیلاب کا وجود نہ ہوگا ہر قسم کے گناہ، سنگدلی، عداوت اور بغض و حسد کا خاتمہ ہوگا اور خالص محبت و الفت کے دریا موجزن ہوں گے، فرمایا:-

لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا إِلَّا سَلَامًا (مریم-۴) ایمیں امن وسلامتی کے سوا کوئی بیہودہ بات نہیں سنیں گے

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ	اور ہم نے اُن کے سینوں سے کینہ کو کھینچ لیا،
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ (اعراف ۵)	ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں،
وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ	اور ہم نے اُن کے سینوں سے کینہ کو کھینچ لیا،
اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ (حجر ۴)	بھائی بھائی بنکر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہونگے

اسی کی تفسیر میں حدیث صحیح میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ وہاں نہ دلوں کا اختلاف ہوگا، نہ باہم بغض اور کینہ، سب کے دل ایک دل کی طرح متحد ہوں گے[1]۔"

وہاں کی جسمانی زندگی کیسی ہوگی؟ بہشت میں زندگی کی جو لذتیں ہوں گی، اُن کی تعبیر الوانِ نعمت اور انواعِ شربت و شراب، اور دوسرے مادی لذائذ سے ہو سکتی ہے، مگر وہ حظ و مسرت اور طمینان و سکینت کے علاوہ کسی معنی میں بھی مادی خصوصیات سے آلودہ نہ ہوں گی، یہاں ہر کھانے پینے کے ساتھ بول و براز، پسینہ اور سوءِ ہضم کی علت لگی ہوئی ہے، اور بغیر اس کے انسان یہاں زندہ نہیں رہ سکتا، مگر وہاں یہ کچھ نہ ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جنت کھائیں گے اور پئیں گے لیکن نہ تھوکیں گے، نہ وہاں بول و براز کی حاجت ہوگی، نہ وہاں ناک سے رطوبت نکلے گی، نہ بلغم اور کھنکھار جیسی گھنونی چیزیں ہوں گی، کھانا ایک ڈکار میں ہضم ہوگا، وہاں کے پسینہ میں مشک کی خوشبو ہوگی، جو بہشت میں داخل ہوگا، اُس کو وہ نعمت ملیگی کہ پھر کبھی تکلیف نہ ہوگی، نہ اُن کے کپڑے بوسیدہ ہونگے اور نہ اُنکی جوانی زائل ہوگی، وہاں منادیِ غیب یہ پکار کر کہدیگا، یہاں وہ تندرستی ہے کہ بیمار نہ پڑو گے، وہ زندگی ہے کہ پھر موت نہ آئے گی، وہ جوانی ہے کہ پھر بوڑھے نہ ہو گے اور وہ

---

[1] صحیح مسلم صفۃ الجنۃ،

آرام ہے کہ پھر تکلیف نہ پاؤ گے، لوگوں کے چہرے اپنے اپنے اعمال کے مطابق چمکیں گے، کوئی ستارہ کی طرح، کوئی چودھویں کے چاند کی طرح[1]"

غور کرو کہ وہ جسمانی زندگی، ہماری موجودہ جسمانی زندگی سے کتنی مختلف ہوگی اس پر تعجب نہ کرنا چاہئے، انسان کبھی شکم مادر میں ایک بچہ کی صورت میں زندہ تھا، مگر وہاں اسکی زندگی، اس کی غذا، اس کی سانس اور دوسرے لوازم حیات، بیرونِ شکم کے دنیاوی اصولِ حیات و قوانینِ زندگی سے بالکل مختلف تھے، اور جس طرح شکمِ مادر میں بچہ کا اس بیرونی زندگی کے حکایات کو تعجب کے ساتھ سُن کر آمادۂ انکار ہونا دانشمندی نہ ہوگی، ایسے ہی اس مادی زندگی کے خوگر اور اس عالمِ آب گل کے باشندے اس دوسری زندگی کے اصولِ حیات، طرزِ غذا، اور دوسرے لوازمِ حیات کو سُن کر آمادۂ انکار ہوں تو اُن کا یہ فعل بھی دانشمندی کے خلاف ہوگا،

جنت ارتقاے روحانی ہے | مادی وجسمانی خلقت فطرت کی لاکھوں برس کی تاریخ کے مطالعہ اور تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے کہ مادہ نے لاکھوں برس کے تغیرات کے بعد انسانی جسمانیت تک ترقی کی ہے، وہ پہلے جماد بنا، پھر نبات کی شکل میں آیا، پھر حیوان کا قالب اختیار کیا، پھر جسم انسانی کی صورت میں نمودار ہوا، اور یہ مادیت کی معراجِ ترقی ہے، جمادیت منکر نباتیت پیدا ہوئی، اور نباتیت فنا ہو کر حیوانیت نمودار ہوئی، پھر حیوانیت معدوم ہو کر انسانیت ظہور پذیر ہوئی اور ارتقاے انسانی کا جسمانی پہلو تکمیل کو پہنچ گیا لیکن انسانیت کا دوسرا رخ جو روحانیت سے عبارت ہے ہنوز اپنے آغازِ طفولیت میں ہے کیا اس پر بھی اسی ارتقائی دور کے مدارج نہیں آئیں گے،

---

[1] یہ ساری حدیثیں صحیح مسلم صفۃ الجنۃ میں ہیں،

ایک مادہ پرست صرف بامِ ارتقا تک زینہ بزینہ چڑھ کر ٹھہر جاتا ہے لیکن مذہب اس سے بھی آگے لے چلتا ہے اور یہاں سے وہ اڑ کر سقفِ آسمان تک پہنچتا ہے، اور ملکوتیت کی سرحد کی ترقی شروع کرتا ہے، قرآن پاک کی ان آیتوں پر غور کرنے سے اس نظریہ کے اشارات نکلتے ہیں،

اَلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ، وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَۃٍ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰہُ نُطْفَۃً فِیْ قَرَارٍ مَّکِیْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَۃَ عَلَقَۃً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَۃَ مُضْغَۃً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَۃَ عِظٰمًا فَکَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ق ثُمَّ اَنْشَاْنٰہُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ ؕ

(مومنون - ۱)

جو فردوس کی وراثت پائیں گے، اور وہ اس میں سدا رہیں گے اور ہم (خدا) نے انسان کو مٹی کی کشید سے بنایا، پھر اس کو (رحم نسوانی کے) ایک ٹھہراؤ کی جگہ میں ایک بوند بنایا، پھر اس بوند کو بندھا ہوا خون بنایا، پھر اس خون کو لوتھڑا بنایا، پھر اس لوتھڑے کو ہڈیاں بنایا، پھر ہڈیوں کو گوشت پہنایا، پھر اس کو ایک نئی صورت میں اٹھا کر کھڑا کیا، تو برکت والا ہے سب سے بہتر بنانے والا (خدا)

لیکن یہ ترقی یہیں تک پہنچ کر رک نہیں جائے گی، بلکہ آگے بھی ہوگی، اس لئے جس طرح ماں کے پیٹ کی تنگ وتاریک دنیا میں زیست وحیات کے کچھ قواعد تھے، پھر عالم کی اس سے بھی وسیع تر دنیا میں اس نے قدم رکھا، جہاں ترقی وحیات کے دوسرے ہی اصول ہیں، اسی طرح اس دنیائے مادی سے نکل کر اس وسیع تر دنیا میں قدم رکھے گا، جہاں ترقی اور سعادت کے اور دوسرے اصول ہوں گے، چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا،

ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ (مومنون) پھر بیشک تم اس کے بعد مرنے والے ہو، اور پھر قیامت کے دن اٹھائے جاؤگے،

جس طرح انسانیت سے پہلے لاکھوں برس میں ایک نوع کی کیفیت مٹ کر دوسری نوع کی کیفیت پیدا ہوتے ہوتے انسانیت تک نوبت پہونچی، موت کے معنی یہ ہیں کہ اب نوعِ انسانی کی تمام کیفیتیں مٹ کر ایک بلند تر نوع کی کیفیتوں کی تیاری شروع ہوئی، صدہا ہزار سال کے بعد قیامت سے دوسری نوعِ ملکوتی کا ظہور ہوگا،

یہاں مسئلۂ ارتقاء کا دوسرا اصول سامنے آتا ہے، جس کو بقاے اصلح کہتے ہیں، ان مدارجِ ترقی کے اثنا میں ہزاروں وہ نوعیں فنا ہوتی رہتی ہیں جنہیں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، اور وہی باقی رہجاتی ہیں جنہیں آیندہ بقا کی پوری استعداد ہوتی ہے جس طرح پچھلی استعداد سے آیندہ کی استعداد پیدا ہوتی ہے، اسی طرح اُس دوسری ملکوتی نوع کی استعداد ان ہی کو ملتی ہے جن کے اندر اپنی پچھلی مادی وجسمانی زندگی میں اسکی استعداد پیدا ہوچکی تھی، دوزخ کے درجے اُن لوگوں کے مقامات ہیں جو گویا ہنوز، جمادی، نباتی وحیوانی منزلوں میں ہیں اور ممکن ہے کہ وہ اس دارالامتحان میں اپنی کمیِ استعداد کے بقدر رہ کر آگے کی استعداد پیدا کرلیں، اور ملکوتیت کی ترقی حاصل کرسکیں،

بہشت کے مختلف مدارج اُن کی استعدادوں کے مقامات ہیں جو اپنی پہلی ہی زندگی میں اس ترقی کی استعداد پیدا کرچکے تھے لیکن یہاں پہنچکر بھی اُن کی روحانی ترقی کا دروازہ بند نہ ہوگا، بلکہ وہ بقدرِ استعداد تکمیل کے مدارج طے کرتے چلے جائیں گے، شاید اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ؕ (تین - ۱) — ان (بہشتیوں) کے لئے نہ ختم ہونیوالی مزدوری ہے،

ایک دوسری آیت میں ہے کہ نشاۃ ثانیہ میں اہلِ ایمان کے آگے پیچھے داہنے بائیں نور ہوگا، پھر بھی دعا کریں گے،

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (تحریم - ۲) — اُن کا نور اُن کے سامنے اور داہنے دوڑیگا اور وہ کہیں گے، اے ہمارے پروردگار! ہمارے نور کو کامل اور ہم کو معاف کر، تو ہر بات کر سکتا ہے،

مومنوں کے لبوں پر اللہ کے بخشے ہوئے نور کی مزید تکمیل اور اتمام کی دعا، ادھر اشارہ کر رہی ہو کہ اُن کے مدارج میں ترقی ہوتی رہے جس کا اقتضار خدا کی ربوبیت کا منشا ہے۔

امن و سلامتی کا گھر

انسان امن و سلامتی کا بھوکا ہے لیکن وہ اس امن و سلامتی کو اسباب و راحت کے انبار میں تلاش کرتا ہے، اور نہیں پاتا، وہ دنیا میں امن کا گوشہ ڈھونڈھتا ہے اور وہ اس کو نہیں ملتا لیکن یہاں آکر اس کو نہ صرف امن کا گوشہ، بلکہ امن و سلامتی کی ایک دنیا ملے گی، وہ پرند جو عمر بھر چار عناصر کے قفس میں گرفتار رہا، یہاں وہ سدرۃ المنتہیٰ کی شاخ پر آزادانہ پرواز کریگا جنت کے جہاں وحیِ محمدیؐ نے اور بہت سے نام بتائے ہیں، وہاں اس کا ایک نام دَارُ السَّلَام بھی بتایا ہے جس کے معنی امن و سلامتی کے گھر کے ہیں،

اہلِ جنت کی نسبت ارشاد ہے،

لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ، | ان کے لئے اُن کے پروردگار کے پاس
(انعام۔ ۱۵) | سلامتی کا گھر ہے،

اللہ تعالیٰ نے جس شریعت کو دیکر اپنے پیغمبر علیہ السلام کو مبعوث فرمایا ہے، وہ حقیقت میں اسی امن و سلامتی کی نوید و بشارت ہے، اسی لئے فرمایا۔

وَاللّٰهُ يَدْعُوْا إِلٰى دَارِ السَّلٰمِ (یونس) | اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو سب سے پہلے اس امن و سلامتی کے گھر کی دعوت پیش فرمائی۔ عبداللہ بن سلام ایک یہودی عالم تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جس صدائے نبوت نے سب سے پہلے اُن کے دل میں گھر کیا وہ یہ تھی "لوگو! سلامتی پھیلاؤ، بھوکوں کو کھلاؤ، جب دنیا غفلت کی نیند سوئے تو تم اٹھکر خدا کی عبادت کرو، امن و سلامتی کے گھر میں رہنا تمکو نصیب ہوگا۔"

جنت کے ذکر میں اس امن و سلامتی کا تذکرہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے در و دیوار سے امن و سلامتی کے ترانے سنائی دیں گے،

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ | اور فرشتے ہر دروازہ سے اُن کے سامنے
كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ | یہ کہتے ہوئے آئیں گے کہ تم پر سلامتی ہو کہ
فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (رعد۔ ۳) | تم نے صبر کیا تھا، تو کیسا اچھا پچھلا گھر ہے،

وہاں امن و سلامتی کے سوا کچھ اور سنائی نہ دے گا،

إِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (واقعۃ ۱) | لیکن سلامتی سلامتی کی پکار،

فرشتے اہل جنت کو یوں کہیں گے،

بِاَدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ	اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو،
الْخُلُوْدِ ، (ق - ۳)	یہ زندگی جاوید کا دن ہے،
لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا	اس میں سلامتی کے سوا کوئی اور بیہودہ
(مریم - ۴)	بات نہ سنیں گے،

جنت کا ایک اور نام قرآن میں "مقام امین" امن والا مقام بتایا گیا ہے، فرمایا،

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ۙ	بے شک پرہیزگار لوگ امن والے
(دخان - ۳)	مقام میں ہوں گے،

مقام رحمت خدا کی رحمت کب نہیں؟ اور کہاں نہیں؟ مگر دنیا کے فطری قوانین کے بموجب اس دنیا میں ایسے واقعات اور حادثے بھی پیش آجاتے ہیں جن کو ہم رحمت کے بجائے قہر الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں، پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ خود ہم کو ہمارے اعمال کی بدولت خداوند تعالیٰ کے قہر غضب میں مبتلا ہونا پڑتا ہے لیکن ایک عالم وہ ہے جہاں اس کی رحمت کے سوا اس کے قہر غضب کا نام ونشان نہ ہوگا، وہاں ہر طرف اس کی رحمت اور فیض وکرم کی بارش ہوگی، اور اس کی رحمت کے سوا وہاں کوئی اور منظر کہیں اور کبھی دکھائی نہ دیگا،

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ	ان کا پروردگار اُن کو اپنی رحمت خوشنودی
رِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ	اور ان باغوں کی خوشخبری دیتا ہے جن میں
مُّقِيْمٌ ۙ (توبہ - ۳)	اُن کے لیے ہمیشہ کا آرام ہے،

اہل جنت کو جن کے چہرے خوشی سے دمکتے ہوں گے، یہ آواز سنائی دے گی،

وَاَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِیْ رَحْمَةِ اللّٰهِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (آل عمران)

لیکن جن کے چہرے روشن ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، اس میں وہ سدا رہیں گے،

مقام نور

جنّت نور کا وہ مقام ہے جہاں ظلمت و تاریکی کا نام و نشان نہ ہوگا، جنتیوں کے چہرے روشن ہوں گے، کوئی ستاروں کی طرح چمکے گا، اور کوئی چاند کی طرح، ہر طرف اُن کے انوار کی بارش ہوگی، آگے پیچھے، داہنے بائیں ہر سمت سے نور درخشاں ہوگا، فرمایا،

نُوْرُهُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ بِاَیْمَانِهِمْ، (تحریم-۲)

اُن کا نور اُن کے سامنے اور اُن کے داہنے دوڑے گا،

اس دن اہلِ ایمان کے نورِ ایمان کی بجلیاں ہر طرف کوندیں گی،

یَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ یَسْعٰی نُوْرُهُمْ بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَبِاَیْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْیَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ج (حدید-۲)

جس دن تو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھے گا کہ ان کا نور اُن کے سامنے اور اُنکے داہنے چمکے گا، آج تم کو خوشخبری ہو، وہ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہا کروگے، یہی بڑی کامیابی ہے،

اُس دن اہلِ نفاق اہلِ ایمان سے آرزو کریں گے کہ ذرا ٹھہر جائیے کہ ہماری ظلمت کدہ میں بھی ایک دم کے لئے روشنی ہو جائے،

یَوْمَ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ

جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں اہلِ ایمان سے کہیں گی کہ ذرا ٹھہرو کہ ہم بھی تمہارے

مِنْ نُوْرِكُمْ (حدید - ۲) نور سے روشنی لیں،

مقامِ رضوان | جنّت کے انعامات کی فہرست میں سب سے آخری چیز مقامِ رضوان ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ سے راضی اور خوش ہونا کہ اُس کے بعد نہ کبھی وہ اپنے اس بندہ پر عتاب فرمائے گا نہ اُس سے ناراض ہوگا، بلکہ اس کو اپنی رضامندی اور خوشنودی کی لازوال دولت عطا فرمائیگا، متقیوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں رکھی ہیں، ان میں جنت، نہریں، پاک بیویاں، اور ان سب کے بعد روح کی مسرت رکھی ہے، لیکن ان سب کے بعد بھی اپنی سب سے آخری نعمت اپنی اسی رضامندی کو ظاہر فرماتا ہے، چنانچہ سورۂ توبہ میں رحمت اور رضوان کے بعد جنت کے ذکر کو جگہ دی گئی ہے،

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ۔ (توبہ - ۳)

ان کا پروردگار انکو اپنی رحمت اور خوشنودی (رضوان)، کی خوشخبری دیتا ہے، اور ان باغوں کی جن میں نعمتِ الٰہی قائم رہیگی،

سورۂ حدید میں بھی اسی طرح مغفرت اور رضائے الٰہی کے بعد بطور تکملہ کے جنت کا ذکر آتا ہے، فرمایا،

وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَّ مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۚ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۔

اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور خدا کی بخشش اور رضامندی بھی ہے، اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑو

وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ، ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ، وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ، (حدید -۳)

جس کا پھیلاؤ آسمان اور زمین کے پھیلاؤ کے برابر ہے، یہ اُن کے لیئے بنائی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر یقین رکھتے ہیں، یہ اللہ کی مہربانی ہے جس کو چاہتا ہے، دیتا ہے، اور اللہ بڑی مہربانی والا ہے،

سورۂ آلِ عمران میں جنّت کی تمام نعمتوں کو گنا کر ان کا خاتمہ رضوان کی عظیم الشان بشارت پر کیا گیا ہے، فرمایا،

لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ، (آلِ عمران -۲)

جنھوں نے پرہیزگاری کی، اُن کے لئے پروردگار کے پاس ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اُن میں وہ سدا رہیں گے اور ان کی بیویاں اور اللہ کی خوشنودی،

سورۂ توبہ میں جنّت کی تمام نعمتوں سے بڑھکر نعمت **رضوانِ الٰہی** کو قرار دیا ہے،

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (توبہ-۹)

اللہ نے باایمان مردوں اور عورتوں سے اُن باغوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں سدا رہیں گے، اور رہنے کے ستھرے گھر، اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑی ہے، یہی بڑی کامیابی ہے،

بہشت کی مطمئن روحوں کو یہ نوید مسرت سنائی جاتی ہے،

یَا اَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً (فجر-۱)

اے اطمینان والی روح! تو اپنے رب کے پاس اسی طرح واپس جا کہ تو اس سے راضی ہوا اور وہ تجھ سے راضی ہو،

اہلِ جنت کی یہ صفت آئی ہے،

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ (مائدہ-۱۶) خدا ان سے خوش اور وہ خدا سے خوش

ان ہی آیتوں کی تفسیر میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ بشارت سنائی ہے کہ خداوند تعالیٰ اہلِ جنت کو آواز دیگا کہ اے جنت والو! وہ جواب دیں گے کہ اے خداوند ہم حاضر ہیں، سب بھلائیاں تیرے پاس ہیں، فرمائیگا (جنت کی نعمتیں پاکر) اب تم خوش ہوئے؟ عرض کریں گے پروردگار کیوں خوش نہ ہوں کہ تو نے ہم کو وہ کچھ دیا جو کسی کو نہیں دیا فرمائیگا کہ میں ان تمام گذشتہ نعمتوں سے بڑھ کر جو چیز ہے وہ تم کو دوں؟ کہیں گے اے پروردگار! ان سے بہتر کیا ہے فرمائیگا "یہ کہ اپنی رضامندی و خوشی تم پر اتاروں پھر اس کے بعد میں کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا"۱

مقامِ طیب و طاہر موجودہ دنیا کی ہر چیز آلودگیوں اور نجاستوں سے بھری ہے لیکن بہشت وہ مقام ہے جو پاکی، ستھرائی، لطافت اور طہارت کا مظہر ہے اس میں وہی داخل ہوں گے، جو گناہوں سے پاک ہو چکے ہوں، فرمایا،

طِبْتُمْ فَادْخُلُوْھَا خٰلِدِیْنَ (زمر-۸) تم پاک ہو چکے تو جنت میں ہمیشہ کیلئے داخل ہو جاؤ،

---

۱ صحیح بخاری و مسلم صفۃ الجنۃ۔

جو زندگی وہاں ملے گی، وہ بھی پاک وصاف اور ستھری اور ہر جسمانی و رُوحانی آلائش سے بری ہوگی، فرمایا،

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ، (نحل ۱۳)

مرد ہو یا عورت جس نے مومن بن کر اچھے کام کئے ہم اُس کو ایک پاک زندگی دیکر جلائیں گے، اور اُن کو ہم اُن کے سب سے بہتر عمل کے مطابق بدلہ دیں گے،

جو گھر وہاں ملیں گے وہ بھی پاک وصاف اور ستھرے ہوں گے،

وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً ، (صف-۲) اور پاک گھر،

جو بیویاں ملیں گی وہ بھی پاک ہوں گی،

وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ (آل عمران۲) اور پاک بیویاں،

وہاں کی جو باتیں ہوں گی وہ بھی پاک،

وَهُدُوْا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ (حج - ۳)

اور اہلِ جنّت کو پاکیزہ گفتگو کی طرف رہنمائی کی جائے گی،

ان کو پینے کی جو چیز ملے گی وہ بھی پاک ہوگی،

شَرَابًا طَهُوْرًا ، (دھر-۱) پینے کی پاک چیز،

غرض کہ ہر چیز وہاں پاک صاف طیّب طاہر اور تمام روحانی جسمانی آلودگیوں سے مبرّا ہوگی

مقامِ تسبیح وتہلیل اس آرام ولطف کے بعد اہلِ جنّت کی روحانی لذت اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور تسبیح و تسبیح و

تہلیل ہوگی، یہ اُن کی روحانی غذا ہوگی، وہ عالم جہاں ہر طرف انوارِ الٰہی برسیں گے، جہاں صفائی اور ستھرائی کے سوا کوئی اور منظر نہ ہوگا، جہاں قدس و نزاہت کی ہر طرف صورتیں نظر آئیں گی، وہاں حمد و ثنا کے روح افزا ترانے بھی ہر طرف سے بلند ہوں گے،

دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (یونس - ۱)	جنت میں اُن کی ندا یہ ہوگی کہ اے میرے اللہ! تیری پاکی، اور اُن کی آپس کی دعا، سلامتی ہوگی، اور اُن کی آخری پکار یہ ہوگی کہ دنیا کے پروردگار اللہ (تعالیٰ) کی حمد ہو،

جنت کی تمام شاہانہ نعمتوں کے بعد بڑی نعمت یہ ہوگی کہ خدا کی تسبیح و تہلیل کی نئی نئی پرلطف راہیں وہاں اُن پر کھلیں گی، فرمایا،

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ۞ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ۞ (حج - ۳)	بیشک اللہ اُن کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے اُن باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اُن میں اُن کو سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے، اور اُن کی پوشاک اُن میں ریشم کی ہوگی، اور وہ راہ دکھائے جائیں گے، اچھی بات کی اور وہ دکھائے جائیں گے، اُس سراپا حمد

وہ اپنے ہر سرور اور نعمت کے شکریہ میں فرشتوں کیساتھ ملکر حمدِ الٰہی کا سرود و سرمدی گائینگے

اور یہ وقت ہوگا جب عالمِ وجود کے ہر گوشہ سے اس کی حمد کا ترانہ بلند ہوگا فرمایا،

وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ	جنت کے نگہبان اُن سے کہیں گے تم پر سلامتی
طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ وَقَالُوا	ہو تم پاک ہو چکے تو جنت میں چلے جاؤ، اہلِ جنت
الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ	کہیں گے اُس اللہ کی حمد ہو جس نے اپنا وعدہ
وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ	سچا کیا، اور ہم کو اُس سرزمین کا مالک کیا
حَيْثُ نَشَاءُ فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ وَ	کہ جنت میں جہاں چاہیں رہیں تو کام کرنے
تَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِّينَ مِنْ حَوْلِ	والوں کی کیسی اچھی مزدوری ہے، اور
الْعَرْشِ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ	دیکھے گا کہ فرشتے عرشِ الٰہی کو گھیرے اپنے
وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيلَ الْحَمْدُ	پروردگار کی حمد کی تسبیح کر رہے ہوں گے
لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ،	اور سب لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا جائیگا،
(زمر - ۸)	اور کہا جائیگا کہ حمد ہو سارے عالم کے پروردگار کی،

اہلِ جنت کے متعلق قرآن پاک میں ایک جگہ ہے،

لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا إِلَّا سَلَامًا	وہ نہ سنیں گے وہاں بیکار بات، مگر سلام
وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا	اور اُن کی روزی اس میں صبح اور شام
(مریم - ۴)	ہوگی،

اس صبح و شام کی روزی سے مقصود کیا جنت کے کھانے کے الوان نعمت ہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو صبح و شام کی تخصیص کیا تھی، وہ تو ہر وقت سامنے ہونگے، میرا گمان یہ ہے کہ یہ روزی

سے خدا کی تسبیح و تہلیل کی روحانی روزی اور ربانی غذا مراد ہے، اور حدیث کے ان لفظوں کو اُسی کی تفسیر جانتا ہوں، صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے جنت کی نعمتوں کے سلسلہ میں فرمایا،

يُسَبِّحُوْنَ اللّٰهَ بُكْرَةً وَّعَشِيًّا، (صفة الجنة) — وہ صبح اور شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کریں گے،

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اہلِ جنت کو خدا کی تسبیح و تقدیس کا الہام ہوگا، اور شاید قرآن پاک کی اس آیت کے یہی معنی ہوں،

وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ — اور اچھی بات کی طرف اُن کی رہنمائی کی

وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ (حج۔۳) — جائیگی اور اس سراپا حمد کا راستہ انکو بتایا جائیگا،

مقامِ قرب اہلِ جنت کو جو کچھ نصیب ہوگا اُن کے سوا سب سے اعلیٰ مرتبہ، قربِ خاص کا مقام ہوگا بندے اپنے پروردگار کی حضوری کا شرف پائیں گے، قرآن پاک میں جابجا اُن کے لیے یہ آتا ہے جَزَاۤءُ هُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اُن کی جزا اُن کے پروردگار کے پاس"، یہ قربِ خاص کے اشارے ہیں، اور ایک جگہ یہ اشارہ اس تصریح سے بدل جاتا ہے،

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ — بے شک پرہیزگار باغوں میں اور نہروں

فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ — میں، سچائی کی نشستگاہ میں، اُس بادشاہ

مُّقْتَدِرٍ، (قمر۔۳) — کے حضور جس کا سب پر قبضہ ہے،

دیدار جنت کی سب سے آخری لیکن بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کی تجلی کا نظارہ ہے، کون ہے جو اس مطلعِ انوار کے دیدار کی تاب لا سکے، تاہم یا تو یہ آنکھیں کچھ اور ہوں گی، یا وہ نورِ مطلق

کسی خاص شان میں نمایاں ہوگا، اس وقت یہ عالم ہوگا کہ وہ نور کا مرکز بن کر نمودار ہوگا اور جنت کی مشتاق آنکھیں اُس کی طرف اٹھی ہوں گی،

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (قیامہ-۱) — کتنے چہرے اُس دن تروتازہ اور اپنے پروردگار کی سمت دیکھ رہے ہوں گے،

اسی آیت کی تفسیر میں حضرت جریر بن عبد اللہؓ صحابی روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ "تم اپنے پروردگار کو بالمشاہدہ دیکھو گے"، دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جیسے چاند کو تم دیکھ رہے ہو ایسے ہی تم اپنے پروردگار کو دیکھو گے، اس دیدار و رویت میں کوئی ایک دوسرے کا مزاحم نہ ہوگا، اس تمثیل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو مقصود ہیں، ایک تو شدت یقین کا اظہار کہ جس طرح تم اس روشن چاند کو بے شک وشبہہ دیکھ رہے ہو، اسی طرح بے شک وشبہہ اپنے پروردگار کو دیکھو گے، دوسرا مقصد یہ ہے کہ جس طرح لاکھوں کا مجمع بھی ہو تو سب لوگ ایک چاند کو یکساں حیثیت سے باطمینان اس طرح دیکھ سکتے ہیں کہ ایک کا دیکھنا دوسرے کے دیکھنے میں عائق نہیں ہوتا، اسی طرح دیدار الٰہی میں کروڑوں کا ہجوم خدا کے دیدار سے ایک دوسرے کا مانع نہ ہوگا، اتنا ہی نہیں، بلکہ جس دن جنتی اپنے پروردگار کے حضور میں پیش ہوں گے، اُن کی زبان پر سلامتی کی دعا ہوگی،

تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ (احزاب-۶) — اُن کی دعا جب وہ اپنے پروردگار سے ملیں گے، سلامتی ہوگی،

۱؎ صحیح بخاری جلد ثانی ص ۱۱۰۵۔

بلکہ اس سے بھی بڑھکر یہ کہ وہ سراپا رحمت پروردگار خود اپنے بندوں کو اپنی زبان سے سلامتی کا پیام دیگا

سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ (یٰسٓ - ۱۴) رحمت والے پروردگار کی طرف سے پیام سلامتی ہوگا،

بخاری میں ہے کہ آپنے فرمایا "خداوند تعالیٰ اپنے بندہ سے ترجمان کے بغیر خود کلام فرمائیگا[1]" یہ رویت کیونکر ہوگی؟ اہل روایت لفظ کے قائل ہیں اہل عقل زیادتِ ایمان کی تاویل کرتے ہیں اہلِ حقیقت اُسکو اسمار وصفات کی ناقابلِ بیان جلوہ انگیزی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن فیصلہ یہ ہے:

ع بیا کین داوری ہارا بہ پیشِ داور اندازیم

ان تعلیمات کا عملی اثر | اوپر کے صفحوں میں قیامت، حشر و نشر اور جنت و دوزخ کے پورے مناظر گذر چکے، یہ ایمان بالغیب مذہب کی حقیقت کا اصلی جوہر ہے اور اسی کے تقین میں مذہب کی اصلی طاقت پوشیدہ ہے معلوم ہوچکا ہے کہ اہلِ عرب کو ان حقائق کی تسلیم سے کس قدر انکار تھا بلکہ مرکر جی اٹھنا اور اس موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا اُن کے نزدیک کس قدر مستبعد تھا، قرآنِ پاک کا بڑا حصہ شرک کے ابطال اور توحید کے اثبات کے بعد اسی حیاتِ بعد الموت کی تلقین اور اس پر ایمان کی دعوت پر مشتمل ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اکثر خطبوں میں اس کا حال بیان کرتے تھے اور جمعہ کے خطبوں میں خصوصیت کے ساتھ سورۂ ق تلاوت فرماتے تھے جس میں قیامت کے حالات ہیں، مگر دیکھو کہ ۲۳ برس کی مسلسل تعلیم، قرآنِ پاک کی تاثیر اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ ہدایت سے نہ صرف اُن کا انکار اقرار سے بدل گیا، بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ مناظر اُن کے دل و دماغ کی لوح میں منقوش ہوگئے تھے

[1] صحیح بخاری جلد ثانی باب کلام الرب،

یاد ہوگا کہ اسلام کے آغاز میں ایک عرب شاعر نے طنزاً کہا تھا،

اموت ثُمَّ بعث ثُمَّ حشر	حدیث خرافۃ یا ام عمرو
کیا مرنا ہے، پھر جینا، اور پھر اکٹھا ہونا	اے عمر کی ماں، یہ خرافات باتیں ہیں

لیکن چند ہی سال کے بعد یہ طنز انکار، رمز یقین سے بدل گیا، اور اس وقت عرب کا شاعر یہ کہنے لگا "ہم آسمان تک پہنچ گئے، اور خدا سے امید ہے کہ ہم اس سے بھی اونچے جائیں گے"[۱]

وَاِنَّا لَنَرجُو فوقَ ذٰلِكَ مظهرًا،	اور ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ اس سے بھی بلند مقام میں ظہور کریں،

آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ علیہِ وسلَّم استفسار فرماتے ہیں کہ آسمان سے بھی بلند مقام اور کیا ہے؟ عرض کرتا ہے کہ جنت یا رسول اللہ؟ آپ فرماتے ہیں انشاء اللہ" دیکھو کہ جن کی نظریں زمین سے اونچی نہیں جا پاتی تھیں اُن کا تخیل آسمان سے بھی اونچا جانے لگا جن کو مر کر پھر جینا دور از عقل معلوم ہوتا تھا جنکو آخرت کے مواخذہ کا کوئی ڈر نہ تھا جن کو اپنے اعمال کی جوابدہی کی پروانہ تھی جو سزا وجزا کے مفہوم سے بیگانہ تھے جو جنت و دوزخ کے تخیل سے نا آشنا تھے، وہ اس ہولناک منظر سے ڈرنے لگے، دوسری زندگی پر اُن کو اسی طرح یقین آگیا جس طرح آج کی زندگی پر تھا، آخرت کے مواخذہ سے وہ بید کی طرح کانپنے لگے، اعمال کی جوابدہی سے ترساں و لرزاں رہنے لگے، سزا وجزا کے خوف سے وہ اپنے ہر عمل کی بازپرس خود کرنے لگے، جنت کا اشتیاق اُن کو بڑی سی بڑی قربانی پر آمادہ کر دیتا تھا، دوزخ کا ڈر اُن کے دل کے اندر کے بیزار کو چھیڑا کرتا تھا، اُن کی آنکھوں کو اشکبار رکھتا تھا فرائض و ذمہ داری

---

[۱] اصابہ اور استیعاب ذکر نابغہ جعدی،

کو دیانتداری کے ساتھ ادا کرنے پر ہر لحظہ اُن کو آمادہ کرتا رہتا تھا، راحت کے خواب و آرام کے بستر سے اُن کو چونکا کر عمل کے میدان میں تنہا لے آتا تھا، اور ہر نیک کام اور عمدہ عمل کیلئے انکو ہمہ تن سرگرم اور سرتاپا مصروفِ جد وجہد بنا دیتا تھا، تنہائی اور تاریکی میں اُن کے دل اور بدن کو برائیوں اور بداعمالیوں سے پاک رکھتا تھا، اُنکے ضمیر اور دل کے صفحوں کو ہر وقت خدا کی آنکھوں کے سامنے کھلا رکھتا تھا،

ایک دفعہ کسی حقیقت کے متعلق دو صحابیوں میں جھگڑا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فریقین کی باتیں سُن کر ایک کے حق میں فیصلہ دیدیا، پھر فرمایا "میں بھی ایک آدمی ہوں، مدعی اور مدعا علیہ میں سے ممکن ہو کہ کوئی زیادہ اچھا بولنے والا ہو جو اپنے دعویٰ کو خوبی کیساتھ بیان کرے اور میں اُس کے موافق اُس کا فیصلہ دوں لیکن درحقیقت وہ چیز اُس کی نہ ہو تو گویا میں اُس کے گلے میں آگ کا ایک طوق پہنا رہا ہوں" یہ سنکر فریقین پر یہ اثر ہوا کہ دونوں رونے لگے اور ہر ایک اپنا حصہ دوسرے کو دینے لگا، [1]

حضرت عمرؓ خدا کے مطیع و فرمانبردار تھے، رسول کے عاشق و شیدا تھے، نیکیوں سے مالا مال تھے، جنّت کی بشارت سے سرفراز تھے، تاہم آخرت کے مواخذہ اور جوابدہی سے اس قدر خوفزدہ تھے کہ ایک دفعہ انھوں نے کہا کہ "اگر وصالِ نبویؐ کے بعد میرے اچھے اور بُرے اعمال برابر برابر رہیں تو بھی میں خوش ہوں، اگر جنت نہ ملے تو پروا نہیں مگر الٰہی دوزخ نہ ملے [2] وہ نزع کی حالت میں بہت بے چین تھے، بعض صحابہ اُن کے اچھے اعمال گنا کر اُن کو تسلی دینے لگے تو جواب میں کہا خدا کی قسم اگر کل زمین میرے لئے سونا ہو جاتی کہ اُس کو دیکر عذابِ الٰہی سے بچ سکتا تو میں دیدیتا" اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ کہتی تھیں "اے کاش میں جنگل کی گھاس ہوتی، اے کاش میں کچھ نہ ہوتی، [3]"

---

[1] سنن ابی داؤد کتاب الاقضیہ [2] صحیح بخاری باب الہجرة، جلد اول ص ۵۵۰ [3] صحیح بخاری فضائل حضرت عمرؓ جلد

قیامت کے متعلق قرآن پاک کی یہ عجیب موثر آیت :

یَآاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ اِنَّ زَلْزَلَۃَ	لوگو! اپنے رب سے ڈرو، قیامت کا بھونچال
السَّاعَۃِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ یَوْمَ تَرَوْنَھَا	ایک بڑی چیز ہی جس دن اس کو دیکھوگے ہر دودھ
تَذْھَلُ کُلُّ مُرْضِعَۃٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ	پلانے والی عورت اپنے دودھ پیتے بچہ کو بھول
وَتَضَعُ کُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَھَا وَتَرَی	جائیگی، اور پیٹ والی اپنا پیٹ ڈال دے گی اور
النَّاسَ سُکٰرٰی وَمَا ھُمْ بِسُکٰرٰی	لوگوں کو نشہ میں دیکھوگے لیکن وہ نشہ میں نہ
وَلٰکِنَّ عَذَابَ اللہِ شَدِیْدٌ (حج ۱)	ہوں گے، بلکہ خدا کا عذاب سخت ہوگا،

جب اُتری اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو سنایا، اور اسکی تفسیر کی تو انکے چہروں کا رنگ بدل گیا، اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے[۱] ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کا ذکر کیا، اور موت کے بعد کے عذاب کا حال بیان کیا تو صحابہ چیخیں مار مار کر رونے لگے[۲]، حضرت ابوہریرہؓ کو ایک بار قیامت کے ایک منظر کے بیان کرنے کی ضرورت پیش آئی تو اثنائے روایت میں وہ تین دفعہ بیہوش ہو کر گرے اور جب امیر معاویہؓ کے سامنے یہ آیت دہرائی گئی تو ان پر بھی گریہ طاری ہو گیا،[۳] اس یقین و ایمان کا دوسرا سماں یہ ہو کہ بدر کا میدان جنگ ہے، مشرکین کی ایک ہزار لوہے میں ڈوبی ہوئی فوج کا سیلاب امڈا آرہا ہے، ادھر تین سو تیرہ نہتے مسلمان صف باندھے کھڑے

(بقیہ حاشیہ ص ۸۵۷) اول صفحہ ۲۱ ۵ ؎۲ ابن سعد جزء النساء ص ۵۱ ؎۵ صحیح بخاری مناقب عائشہؓ و تفسیر سورۂ نور و مستدرک حاکم ترجمہ عائشہؓ و ابن حنبل مسند عائشہؓ ؎۱ صحیح بخاری تفسیر سورۂ حج جلد دوم ص ۶۹۳ ؎۲ جامع ترمذی تفسیر سورۂ حج ؎۲ سنن نسائی کتاب الجنائز باب التعوذ من القبر ؎۳ جامع ترمذی ابواب الزہد،

ہیں کہ آپ صحابہ کی طرف خطاب کرکے فرماتے ہیں لو اس جنت کا موقع سامنے ہے جس کی وسعت آسمان و زمین کے برابر ہے" ایک انصاری حیرت سے پوچھتے ہیں کہ کیا آسمان و زمین کے برابر؟ آپ فرماتے ہیں" ہاں"! وہ خوشی سے واہ واہ کہہ اٹھتے ہیں آپ دریافت فرماتے ہیں کہ تم نے واہ واہ کیوں کہا عرض کی، اس امید سے کہ شاید میں بھی اس میں ہوں فرمایا تم اس میں ہو، یہ سنکر وہ کھجوریں نکال کر جلدی جلدی کھانے لگے، بالآخر جنت کے جانے میں اتنا توقف بھی شاق گذرا، بولے اتنی دیر بھی کیوں کیجائے، یہ کہکر کھجوریں پھینک دیں اور تلوار کھینچ کر آگے بڑھے، اور شہید ہوئے،

غزوہ احد میں بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا، احد کے میدان میں دار و گیر کا شور برپا تھا، لاشوں پر لاشیں گر رہی تھیں کہ ایک صحابی نے آگے بڑھ کر پوچھا یا رسول اللہ! اگر خدا کی راہ میں مارا گیا تو کہاں ہونگا فرمایا جنت میں، وہ کھجور کھا رہے تھے ہاتھ کی کھجوریں پھینک دیں اور لڑ کر جان دیدی قیس ایک صحابی تھے، وہ ایک جہاد میں شریک تھے انھوں نے اسلامی فوج کے سپاہیوں کے سامنے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "جنت کے دروازے تلواروں کے سایہ کے نیچے ہیں" ایک معمولی سا مسلمان پاس کھڑا تھا، اس نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ کیا آپنے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا ہے، انھوں نے کہا "ہاں" یہ سن کر وہ اپنے دوستوں کے پاس آیا، اور سلام کرکے رخصت ہوا، میان توڑ کر پھینکدی اور تلوار لیکر دشمن کی صف پر جا پڑا اور شہادت حاصل کی،

ان حیرت انگیز واقعات میں سے ہر ایک واقعہ پر غور کرو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے منکر اور کافر عربوں کے دل و دماغ اور ذہن و اعتقاد کو کس طرح آن کی آن میں بدل دیا، اور دم کے دم میں ان کے عقائد و اخلاق کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا،

قضا و قدر

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (قمر۳)

اگرچہ قرآن پاک میں ایمان کے سلسلہ میں اس کا ذکر کہیں نہیں آیا، مگر اس کا اعادہ بار بار قرآن میں اتنی دفعہ ہوا ہے کہ اس کی اہمیت اسکی مقتضی ہے کہ اسکو بھی ایمانیات کے پہلو میں جگہ دیجائے چنانچہ بعض صحیح حدیثوں میں یہ ایمانیات کی آخری کڑی قرار بھی دیگئی ہے[1] اور سلسلۂ توحید میں اسلام نے اللہ تعالیٰ کی وسعتِ قدرت اور مشیّتِ مطلقہ کا جو نقشہ کھینچا ہے اُسکا لازمی نتیجہ بھی یہی ہونا چاہیے

اس عقیدہ کا ماحصل یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ اب تک ہوا، جو کچھ اب ہو رہا ہے، اور جو کچھ آیندہ ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کے علمِ سابق اور فیصلۂ ازلی کے مطابق ہوا ہے، ہوتا ہے اور ہوگا، جس طرح مہندس اور انجینیر مکان بنانے سے پہلے مکان کی تمام جزئیات پر غور کرکے پہلے ہی نقشہ تیار کر لیتے ہیں، اور اسی مجوّزہ نقشہ کے مطابق معمار اور مزدور اس تعمیر کو مکمل کرتے ہیں، اسی طرح اس مہندسِ ازل خالقِ کائنات نے کائنات کی پیدائش سے پہلے اسکے تمام اصول و قواعد اور دوسری اہم جزئیات طے کرکے ہر چیز کی نسبت فیصلہ کر دیا تھا، اب اُسی فیصلہ کے مطابق یہ کائنات اور اس کے تمام حوادث

---

[1] صحیح مسلم بروایت ابن عمرؓ و ابو ہریرہؓ باب الایمان،

دو اقعات انجام پارہے ہیں، موت و حیات، فقر و غنار، کامیابی و ناکامی، تکلیف و راحت ہر چیز پہلے سے طے شدہ ہے اور اسی کے مطابق وہ ظہور پذیر ہوتی ہے۔

نفس یہ عقیدہ بھی اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں، جو کچھ مخصوص ہے وہ اسکی تکمیلی تعلیم ہے، توراۃ میں حضرت آدمؑ و شیطان اور ہابیل و قابیل کے قصوں میں اس عقیدہ کے اشارات پائے جاتے ہیں، حضرت یوسفؑ کا خواب اسی حقیقت کی تعبیر ہے مگر ان اشارات سے گذر کر زبور میں اس کی کھلی کھلی تعلیم بھی ملتی ہے، زبور ۱۳۸-۱۴ میں ہے،

"تیرے کام حیرت افزا ہیں، اس کا میرے جی کو بڑا یقین ہے جب کہ میں پردے میں بنایا جاتا تھا، اور زمین کے اسفل میں منقوش ہوتا تھا، تو میرے جسم کی صورت تجھ سے چھپی نہ تھی، تیری آنکھوں نے میرے بے ترتیب مادہ کو دیکھا اور تیرے دفتر میں یہ سب چیزیں تحریر کی گئیں، اور اُن کے دلوں کا حال بھی کہ کب بنیں گی جب ہنوز اُن میں سے کوئی بھی نہ تھی،"

اس کے بعد زبور ۱۴۸ کا ترانۂ حمد اسی لَے میں شروع ہوتا ہے،

"........ خداوند کے نام کی ستایش کریں کہ اُس (خدا) نے حکم دیا، اور وہ (مخلوقات) موجود ہوگئے، اُس نے انکو پایداری بخشی، اُس نے ایک تقدیر مقرر کی جو ٹل نہیں سکتی"

انجیل میں اسکی تعلیم "خدا کی مرضی" کے عنوان سے ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندگی کی آخری شب کی دعا میں فرماتے ہیں "میری مرضی نہیں، تیری مرضی پوری ہو" (متی ۲۶-۳۹) اور اسی مرضی کا ذکر یوحنا (۵-۳۰ و ۶-۳۸) اور خطوط (فلپیون ۲-۱۳) میں ہے اور رومیوں کے نویں باب میں اسکی

پوری تفصیل ہی مگر خاتم النبین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم نے اول یہ کیا کہ اس مسئلہ کی مجمل حقیقت کی توضیح اور اسکی حکمت و مصلحت کی تشریح کی اور پھر یہ کیا کہ گذشتہ مذاہب کی طرح اپنے دفتر کے کسی ایک گوشہ میں بطور ایک حقیقتِ ثابتہ کے اُس کو کہکر خاموشی اختیار نہیں کرلی، بلکہ بار بار اتنی دفعہ دہرایا کہ سننے والوں کے دلوں میں اسکی عقیدت نے گھر کرلیا، اور یہ تلقین یقین کی صورت میں اُن کی رگ و ریشہ میں پیوست ہوگئی، اور ایسا اُس نے اسلئے کیا کہ صبر و شکر کی اخلاقی تعلیم صرف نظریہ کی صورت میں نہ رہجائے، بلکہ عملی حیثیت میں اسکے پیرووں کے اندر استقلال و ثبات کی روح اور دنیا کے مصائب حوادث میں تسلی و تشفی کی قوت پیدا کرے، اور اس طرح یہ عقیدہ پہلے کی طرح صرف ایک مذہبی تلقین یا فلسفیانہ نظریہ کی حیثیت میں نہ رہے بلکہ ایک مفید عملی تعلیم کی شکل اختیار کرلے۔

وحیِ محمدیؐ نے اس اصطلاح کے لئے دو لفظ اختیار کئے ہیں، ایک قدر ہے جس کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں، اور دوسرا قضا جس کے معنی فیصلہ کرنے کے ہیں،

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ (قمر-۳)	ہم نے ہر چیز کو اندازہ سے پیدا کیا،
هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن طِينٍ ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلًا (انعام-۱)	وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے بنایا پھر ایک وقت کا فیصلہ کیا،

یہ دونوں لفظ بجائے خود اس عقیدہ کی اسلامی حقیقت کو پوری طرح واضح کردیتے ہیں، مقصود یہ ہے کہ کائنات کی پیدائش سے پہلے کائنات کی ہر چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے اندازہ اور تقدیر سے ہر ایک کا فیصلہ فرمادیا ہے اور متعین کردیا ہے، اسی کے مطابق یہ کائنات چل رہی ہے، اس میں خدا کے حکم کے بغیر ایک ذرہ بھی تغیر نہیں کرسکتا، آسمان کو جس طرح بنایا، آفتاب کو جس طرح روشن کیا،

چاند کے متعلق جو اصول مقرر فرمایا، ستاروں کے نکلنے اور ڈوبنے کے جو احکام دیدیئے موت و حیات، فنا و بقا، اور عروج و زوال غرض کائنات کی ہر شئ اور پہلو کے متعلق جو اصول متعین فرمادیئے انہی پر وہ چل رہی ہے، قرآن پاک میں کائنات کے بہت سے حالات کے بیان کرنے کے بعد ہے،

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا	اور سورج اپنے ٹھہراؤ پر چل رہا ہے یہ غالب
ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ، وَالْقَمَرَ	اور علم والے کی تقدیر (اندازہ) اور چاند کو ہم
قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ	نے تقدیر (اندازہ) کردی ہیں منزلیں
الْقَدِيْمِ، لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ	یہانتک کہ وہ پرانی ٹہنی کی طرح (خمیدہ ہو کر)
تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ	لوٹتا ہے نہ تو سورج کی قدرت میں ہے کہ چاند کو
وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (یٰسٓ ۳)	پاکے اور نہ رات دن سے آگے بڑھے ہر ایک اپنے

یہ تو آسمان کی بات تھی، زمین کے متعلق ارشاد ہوا،

وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا (حٰمٓ سجدہ ۲) اور زمین میں اسکی روزیاں اندازہ کردیں

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ دنیا کی ہر چیز میں اُس نے ایک اندازہ مقرر کردیا،

قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (طلاق ۳) اللہ نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ بنایا ہے

موت وحیات بھی اسی اندازہ کے مطابق ہے، فرمایا،

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ، (واقعہ ۲) ہم نے تمہارے درمیان موت کو اندازہ کردیا،

ہر شے میں اللہ تعالیٰ نے جو اندازہ لگایا ہے وہ وہی چیز ہے جس کو لوگ قانون قدرت کہتے ہیں اور جس پر دنیا چل رہی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کائنات کے ہر حصہ اور ہر پہلو کے

متعلق اپنے احکام معین فرما دیئے ہیں جن کی اطاعت اُس پر واجب ہی، علیٰ ہذا انسانوں کی ترقی وزوال، موت وحیات، بیماری وصحت، دولت و افلاس، آرام وتکلیف، سعادت وشقاوت ہر ایک کے اصول وقواعد مقرر فرما دیئے ہیں، غرض اُنکو آرام وتکلیف جو کچھ بھی پیش آتی ہی خدا کے علم اور اجازت سے پیش آتی ہے،

مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (تغابن ۲) نہیں پہنچی تم کو کوئی مصیبت لیکن اللہ کے حکم سے

اور چونکہ تقدیر سے کوئی چیز ہٹ نہیں سکتی اسلئے مقدرات کو نوشتۂ الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں کہ جس طرح لکھی ہوئی بات قائم رہتی ہی مٹتی اور بھولتی نہیں، ایسے ہی یہ باتیں بھی مٹتیں اور بدلتیں نہین،

وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ	اور کوئی عورت حمل میں نہیں رکھتی، اور نہ جنتی ہی،
وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ	لیکن خدا کے علم سے، اور نہ کسی دراز عمر کو عمر کی
اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ، اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ	درازی ملتی ہی یا اسکی عمر کم کیجاتی ہی لیکن وہ کتاب
(فاطر-۲)	میں ہے، بے شک یہ اللہ پر احسان ہی،

اس آیت پاک میں دو ٹکڑے ہیں، ایک یہ کہ جو عورت بھی اپنے پیٹ میں بچہ رکھتی ہی یا بچہ جنتی ہی، وہ خدائے پاک کے علم سے ہی، دوسرا یہ ہی کہ جس کو چھوٹی بڑی جو عمر بھی ملتی ہی وہ کتاب الٰہی میں پہلے سے لکھی ہوتی ہی ان دونوں ٹکڑون کے ملانے سے معلوم ہوگا کہ کتاب الٰہی میں ہونا اور علم الٰہی میں ہونا دونون ہم معنی ہیں،

قرآن پاک نے اس کو بھی ظاہر کیا ہے کہ قضا وقدر کے عقیدہ کی فلسفیانہ حقیقت سے زیادہ اس کی نظر اس عقیدہ کی اخلاقی اہمیت پر ہے، انسان کا یہ حال ہی کہ وہ اپنی ناچیز کوشش کی ذرا سی

کامیابی پر فخر وغرور کے نشہ میں چور ہو جاتا ہے، اور ذراسی ناکامی پر وہ دل شکستہ ہو کر ہمت ہار بیٹھتا ہے، یہ دونوں مختلف اخلاقی بیماریاں اس لئے اُس کو لاحق ہوتی ہیں کہ وہ اپنے کام کے اچھے یا بُرے نتیجے کو خود اپنے کام کا لازمی نتیجہ جانتا ہے اس لئے وہ کبھی اپنے کئے پر مغرور اور کبھی ملول ہوتا ہے اور یہ دونوں کیفیتیں افراد اور اقوام کی متانت، استقلال اور صبر و ثبات کے جوہر کو برباد کرتی ہیں اسلئے ایک ایسے عقیدہ کی ضرورت تھی جو کامیابی کے فخر و مسرت اور ناکامی کے افسوس وحسرت دونوں موقعوں پر عاجز انسانوں کی دست گیری کرے، اور وہ یہی عقیدۂ قضا و قدر ہے

اس عقیدہ کا منشا یہ ہے کہ ہم کو جو کامیابی ہوتی ہے وہ ہماری کوشش کا براہ راست نتیجہ نہیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا نتیجہ ہے، اس لئے اس پر ہمارا فخر وغرور کرنا بیجا ہے اسی طرح ہم کو جو ناکامی پیش آتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی کسی حکمت و مصلحت کا نتیجہ ہے اور ہمارے کام سے پہلے ہی ہمارے کاموں کے نتیجے اُس علام الغیوب کے علم میں مقرر ہو چکے تھے، اسلئے ہم کو دل شکستہ اور مایوس نہ ہونا چاہیئے، بلکہ اُسی جوش وخروش اور سرگرمی سے پھر از سر نو جد وجہد میں مصروف ہو جانا چاہیئے،

اس مسئلہ کی یہ پوری توضیح سورۂ حدید میں ان لفظوں میں مذکور ہے،

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ	کوئی مصیبت نہیں آتی ملک میں اور نہ خود
وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ	تم (اس ملک کے بسنے والوں) میں لیکن یہ کہ وہ
قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى	ایک کتاب (الٰہی) میں اپنی پیدائش سے پہلے
اللّٰهِ يَسِيْرٌ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى	درج ہوتی ہے، یہ کہ اللہ پر آسان ہے، ایسا اسلئے

مَا فَاتَكُمْ، وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ	کیا گیا تا کہ تم اُس پر جو تم سے جاتا رہا غم نہ کھایا
وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ	کرو، اور جو تم کو (اللہ) دے اس پر اترایا نہ
(حدید۔۳)	کرو، اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے بڑائی مارنے
	والے کو پیار نہیں کرتا،

اس آیتِ کریمہ نے مسئلۂ قضا و قدر کے فلسفہ کو اس خوبی سے واضح کیا ہے کہ اس کی تائید کے لئے کسی مزید تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی، یہ اسی عقیدہ کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرامؓ کی گردنیں عین کامیابی و فتوحات کی حالت میں خداوندِ قادرِ مطلق کے آگے جھک جاتی تھیں اور ناکامی کی حالت میں ان کے دل یاس و نا امیدی سے دوچار نہیں ہوتے تھے اور اُن کی عملی زندگی کا جو نتیجہ بھی پیش آتا تھا، وہ اُس کو اپنی طرف سے نہیں، بلکہ خداوندِ عالم کی طرف سے سمجھ کر خاموش رہتے تھے تا بیماری، مصیبت، عزیزوں کی مفارقت، لڑائیوں کی ناکامی کسی موقع پر وہ رحمتِ الٰہی سے مایوس ہونا نہیں جانتے تھے، اور ہر خطرناک سے خطرناک کام کے لئے وہ قدم اٹھا بیٹھتے تھے کہ اُن کا یقین تھا کہ موت اپنے وقت پر آئے گی، اور جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہیگا، اسی لئے اُن کے دلوں میں وہ عزم ہوتا تھا کہ نہ اُس کو پہاڑ روک سکتے تھے، نہ سمندر بہائے جا سکتے تھے، نہ حوادث کا طوفان اسکو اُکھاڑ سکتا تھا اور نہ بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے اُس کو جلا سکتے تھے،

وَمَا کَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا	کسی کے اختیار میں نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے
بِاِذْنِ اللّٰہِ کِتٰبًا مُّؤَجَّلًا، وَمَنْ	بغیر مر سکے، یہ لکھا ہوا مقرر ہے جو کوئی دنیا کا
یُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْیَا نُؤْتِہٖ مِنْھَا وَ	معاوضہ چاہیگا تو ہم اس کو اسمیں سے کچھ دینگے،

مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ، وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ، فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۔

(آلِ عمران ۔ ۱۵)

اور جو آخرت کا معاوضہ چاہیگا، اُس میں کچھ (یہاں) دیں گے اور پورا معاوضہ شکر کرنے والوں کو آیندہ (وہاں) دیں گے، کتنے پیغمبر تھے جو لڑے ہیں، اُن کے ساتھ بہت خدا کے طالب تھے، تو خدا کی راہ میں اُن کو جو مصیبت پیش آئی اسکی وجہ سے نہ دل ہار کر سست ہوئے اور نہ دب گئے، اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں [کو پسند کرتا ہے]

ان آیتوں نے یہ واضح کر دیا کہ قضا و قدر کے عقیدہ کا نتیجہ پستی سستی اور دوں ہمتی نہیں، بلکہ بلندی، استقلال اور صبر و ثبات ہے، اور یہی وہ چیز ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے کارناموں میں ہر دیکھنے والے کو صاف نظر آتی ہے، اُن کو صاحب وحی کی یہ تعلیم تھی کہ وہ دشمنوں سے کہدیں کہ ہمیں ڈر نہیں کیونکہ

لَنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰىنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ، (توبہ ۔ ۷)

ہم پر کوئی آفت نہیں آ سکتی لیکن جو خدا نے ہمارے لئے لکھ دیا ہے، وہ ہمارا آقا ہے اور اللہ ہی پر چاہیے کہ ایمان والے بھروسہ کریں۔

خطرات اور مشکلات کی اُن کو پروا نہیں کہ جن کے لئے موت لکھی ہے وہ میدان جنگ میں بھی مریں گے اور بستر راحت پر بھی، اور جن کی موت کا مقررہ وقت نہیں آیا وہ تلواروں کی دھاروں اور سمندروں کے طوفانوں سے بھی سلامت بچ کر نکل آئیں گے،

يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ
مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا، قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ
بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ
الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ (آلِ عمران ۱۶)

منافق کہتے ہیں کہ اگر ہماری بات مان لی جاتی
تو ہم یہاں مارے نہ جاتے، کہدو کہ اگر تم اپنے
گھروں میں بھی ہوتے تو جن پر یہاں مرنا
لکھا جا چکا تھا، وہ از خود اپنے مقتل میں نکل کر

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ
وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ (نسا ۱۱)

تم جہاں بھی رہو تم کو موت آکر پالے گی اگرچہ
تم مضبوط اور مستحکم قلعوں میں ہو،

یہی وہ عقیدہ ہے جو مسلمان کی ناقابلِ ہزیمت جرأت اور غیر شکست پذیر عزیمت اور بے خوف بہادری کا راز ہے، کچھ لوگوں نے اپنی غلط فہمی سے یہ سمجھا ہے کہ مسئلہ تقدیر کے ماننے سے انسان کا مجبورِ محض ہونا لازم آتا ہے، اور اس سے یہ تعلیم نکلتی ہے کہ انسان اپنی تقدیر پر صابر و شاکر ہو کر سُست و غافل بن کر بیٹھ رہے، حالانکہ اگر یہ صحیح ہوتا تو نہ رسولوں کی بعثت کی ضرورت تھی، نہ ربانی کتابوں کے اُترنے کی حاجت ہوتی، نہ تبلیغ و ارشاد کی تاکید ہوتی، نہ اصلاح و ہدایت کا حکم ہوتا اور خدا کی مخلوق اپنے حال پر چھوڑ دی جاتی، مگر ایسا نہیں کیا گیا، لاکھوں پیغمبر بھیجے گئے، کتنی کتابیں اتریں، کروروں مبلّغ اور مرشد بنا کر پھیلائے گئے، ہدایت و ارشاد کی تاکید پر تاکید آئی، لوگوں کی دعوت و اصلاح ہر مسلمان کا فرض ٹھرایا گیا، کوشش و محنت، سعی و تلاش اور جد و جہد کی ہر مسلمان کو تاکید کی گئی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جد و جہاد سے معمور زندگی ہمارے لئے نمونہ ٹھرائی گئی، اور خلفائے راشدین اور عام صحابہؓ نے اپنے کارناموں سے اس نمونہ کی کامیابی کی تصدیق کی،

اب کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقین اور آپ کا عمل دو متضاد چیزیں تھیں؟ نہیں یہ دونوں

ایک دوسرے کی مؤید تھیں، اور اس طرح یہ ایک دوسرے کی تصدیق کرتی تھیں کہ اعملوا فکل میسر لما خلق (بخاری) لوگو! اپنے اپنے کام کئے جاؤ کہ تم میں سے ہر شخص سے وہی کام صادر ہوں گے جن کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے، کام کرنا انسان کا فرض ہے اور اس کے نتیجہ کے مطابق جزا دینا خدا کا کام ہے، اور یہ تقدیر ہے فرمایا،

اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰی فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی	بے شبہ تمہاری کوششیں مختلف رُخ کی ہیں
وَاتَّقٰی وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُہٗ	تو جس نے دیا، اور پرہیز گاری کی، اور نیکی کو
لِلْیُسْرٰی، وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَ	سچ کر دکھایا تو ہم اس کو آہستہ آہستہ آسانی
اسْتَغْنٰی وَکَذَّبَ بِالْحُسْنٰی	کی طرف لے چلیں گے اور جس نے نہ دیا، اور
فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْعُسْرٰی وَمَا یُغْنِیْ	بے پروائی برتی، اور نیکی کو جھٹلایا، تو ہم اسکو
عَنْہُ مَالُہٗۤ اِذَا تَرَدّٰی اِنَّ	آہستہ آہستہ سختی کی طرف لے چلیں گے اور اس
عَلَیْنَا لَلْھُدٰی، وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَۃَ	کی دولتمندی اس کو گڑھے میں گرنے سے نہیں
وَالْاُوْلٰی،	بچا سکتی ہے، بیشک راہ سوجھانا ہمارا فرض
(لیل - ۱)	ہے، اور آخر اور اول ہمارے لئے ہے'

یہ ہے قضا و قدر اور سعی و عمل کی باہمی تطبیق جس کی ژولیدگی نے اسلام سے پہلے ایک عالم کو گمراہ کر رکھا تھا، کام کرنا اور عمل کر دکھانا انسان کا فرض ہے اور اُس کے مطابق اُسکی جزا کا دینا جو اس کام کے لئے پہلے سے مقدر ہو چکی ہے، خدا کا کام ہے نیکیوں کو آہستہ آہستہ نیکی کے مزید راستے دکھانے کا نام توفیق وہدایت ہے، اور بدوں کو خدا کی طرف سے اس توفیق وہدایت کے

نہ ملنے کا نام عدم توفیق وضلالت ہے، اور ان دونوں میں سے ایک کا ملنا انسان کی ابتدائی کوشش سے ہے، خدا فرماتا ہے،

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ	اور جو ہماری بات میں کوشش کرتے ہیں،
سُبُلَنَا، (عنکبوت-۷)	البتہ ہم اُن کو اپنا راستہ سوجھاتے ہیں،

خدا کی طرف سے توفیق وضلالت کا ملنا، خود انسان کے اچھے یا بُرے عمل کا لازمی نتیجہ ہے،

وَمَا یُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ۙ	اور ہم اس سے گمراہ نہیں بناتے لیکن انہی
(بقرہ-۳)	کو جو ہمارا حکم نہیں مانتے،

غرض پہلے فسق عدم اطاعت اور نافرمانی ہوتی ہے تب اس کے نتیجہ کے طور پر خدا کی طرف سے ضلالت کا ظہور ہوتا ہے

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی	اور انسان کے لئے نہیں لیکن وہی جس کی
وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی ،	اس نے کوشش کی، اور بیشک اُس کی کوشش
(نجم-۳)	(خدا کے حضور) دیکھی جائے گی،

اس کی مثال بالکل بچہ کی سی ہے، بچہ چلنا یا بولنا کیونکر سیکھتا ہے، وہ پہلے چلنے اور بولنے کی خود کوشش کرتا ہے تو اُس کے والدین اُس کو چلنا اور بولنا سکھاتے ہیں، بچہ پاؤں اٹھاتا ہے اور والدین اُس کے ہاتھ پکڑ کر اس کو دو چار قدم چلاتے ہیں، اور اس طرح رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ چلنا سیکھتا ہے، وہ پہلے زبان ہلاتا ہے اور مبہم آوازیں نکالتا ہے تو والدین اُس کو بامعنی الفاظ کی تلقین کرتے ہیں، اور اس طرح دونوں کی کوششیں مل کر بارآور ہوتی ہیں، اسی طرح تقدیر الٰہی اور

عملِ انسانی باہم مل کر انسانوں کی عملی تاریخ تیار کرتے ہیں،

جبر و قدر | عموماً لوگ اسی موقع پر جبر و قدر کے مسئلہ کو چھیڑتے ہیں یعنی یہ کہ انسان اپنے عمل میں مجبور ہے، یا مختار؟ حالانکہ یہ سررشتۂ کائنات کا وہ عقدہ ہے جس کا حل نہ صرف یہ کہ مذہب کے ناخن سے نہیں ہوتا، بلکہ عقل کے ناخن سے بھی نہیں ہو سکتا، جس طرح اہلِ مذہب ارادۂ الٰہی اور ارادۂ انسانی کی باہمی تطبیق میں حیران ہیں، اسی طرح فلسفۂ الٰہیات کے معلم علمِ الٰہی اور انسان کی عملی آزادی کے درمیان اور فلسفۂ اخلاق والے انسان کی آزادیِ عمل اور اُس کے موروثی اثرات فطری جذبات اور ماحول کی تاثیرات کی مجبوریوں کے درمیان جو تصادم ہے اسکو بمشکل بچا سکتے ہیں،

دنیا کے عام مذاہب کا بھی یہی حال تھا، ہر وہاں گے میں یہ گرہ اُسی طرح پڑی ہوئی تھی، اور اس کے حل کی صورتیں دو ہی انھوں نے نکالی تھیں یا تو سرے سے اس سے خاموشی برتی جائے اور دبے پاؤں اُس راستہ سے گذر جایا جائے یا بحث چھیڑی تو جبر ہی کی طرف اُن کا میلان نمایاں تھا، چنانچہ یہی جبر ہند و مذاہب میں تناسخ، آواگون اور کرم کی صورت میں ہے عیسائیوں میں حضرت آدمؑ کے گناہ، اور "خدا کی مرضی"[1] کے پیرایہ میں ہے اور یہودیوں کے مجموعۂ تورات میں حضرت ایوبؑ کا صحیفہ ادھر ہی رہبری کرتا ہے دوسری طرف مجوسی تھے جنھوں نے انسانی اختیار و آزادی کو یہاں تک بڑھا دیا تھا کہ خود خدا بھی اُس کے آگے مجبور تھا، خدا کو نہ صرف

---

[1] انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنی گرفتاری کی رات کو دعا میں فرمایا "اے خدا اگر تو اس پیالہ کو ہٹا سکتا ہے تو ہٹا دے لیکن میری نہیں، بلکہ تیری مرضی پوری ہو" عیسائیوں کے جبری و قدری فرقوں کی معرکہ آرائی کا حال فرنچ فاضل موسیو دی کاسٹ کی کتاب الاسلام (ترجمۂ عربی) ص۲۲ سے کسی قدر معلوم ہو سکتا ہے،

انسانوں کے بلکہ فرشتوں کے کاموں پر کوئی قابو حاصل نہ تھا[1]، غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے مذاہب کی یہی دو نوعیتیں تھیں، یعنی یا تو ان کو اس مشکل کی خبر ہی نہیں تھی، یا تھی تو خدا کی قدرتِ مطلقہ اور مشیتِ عامہ کی اس طرح تعبیر کرتے تھے کہ انسان بالکل بے بس اور مجبور نظر آتا تھا، یا یہ کہ تناسخ کے چکر میں اس کو پھنسا کر اس کی زندگی کو اس کے پچھلے جنم کے کرموں کے ہاتھوں گرو کر دیتے تھے، یا پھر اس سے بچے تو انسان کو کامل خود مختار بنا کر خود خدا کو مجبور بنا دیا۔

تمام انبیا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شخصیت وہ نمایاں شخصیت ہے جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس دیرینہ راز کے چہرہ سے پردہ ہٹایا، حقیقت یہ ہے کہ یہ دو صداقتیں ہیں، اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام دنیا اور اس کے ذرہ ذرہ پر قدرتِ مطلقہ رکھتا ہے، آسمان و زمین اور بر و بحر میں کوئی چیز نہیں جو اس کے ارادہ اور مشیت کے بغیر حرکت بھی کر سکے، اس طرح انسان اور اس کے تمام اعمال بھی اسی کی قدرت اور مشیت کے ماتحت ہیں، یہ عقیدہ ہی جوہر مذہب کی، اور خصوصاً اسلام کی جان ہے، اگر یہ نہ ہو تو مذہب کی قوت بے اثر ہو کر رہ جائے، اور ایک ایسا خدا ماننا لازم آجائے جس کے اختیارات محدود، جس کی قدرتیں ناقص، اور جس کی شاہنشاہی ناتمام ہو۔

۲۔ دوسری طرف یہ بھی صداقت ہے کہ دوسری مخلوقات کو نہ سہی، مگر انسان کو اپنے اعمال کے کرنے نہ کرنے کا کسی نہ کسی طرح اختیار ضرور بخشا گیا ہے، کہ اگر یہ اختیار نہ تسلیم کیا جائے، اور انسان کو اسی طرح سراپا مجبور فرض کیا جائے جس طرح دوسری مخلوقات ہیں تو پھر انسان

---

[1] شفاء العلیل فی القضاء والقدر والتعلیل حافظ ابن قیم،

کے لئے خیر و شر کا امتیاز، جزا، وسزا، شریعت، کتاب تعلیم، اور انبیار کی بعثت یہ تمام چیزیں بیکار محض ہو جائیں ظلم وانصاف دنیا میں کوئی چیز باقی نہ رہے انسان کا اپنے کسی فعل پر قابلِ مدح یا قابلِ ملامت ہونا بے معنی ہو جائے، کسی اچھے کام پر خدا کا اُس کو انعام اور بُری کام پر عذاب دینا سراسر ظلم بنجائے بلکہ اس دنیا کی عدالت میں بھی وہ اپنے کسی فعل کا ذمّہ دار نہ ٹھہرے،

الغرض یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں، ایک یہ کہ خدا کو اپنی مخلوقات پر قدرتِ تامہ حاصل ہو، اور اُس کی مشیئت وارادہ ہر جزو وکل پر حاوی ہو اور دوسری یہ کہ انسان کو بھی اپنے عمل پر کوئی نہ کوئی ایسا اختیار حاصل ہو جس کی وجہ سے وہ اپنے اُس عمل کا ذمّہ دار بنتا ہے نیکی کے کاموں کے کرنے پر وہ تعریف کا، اور بدی کے کاموں پر ملامت کا سزاوار ٹھہرتا ہو اور اسی کی بنا پر وہ اپنی دوسری زندگی میں اپنے فعل کی جزار وسزار پانے کا مستحق ٹھہرے گا، اسی پر وہ فطرت کے سامنے دنیا کی عدالت میں، اور آخرت میں بھی مواخذہ اور بازپرس کی ذمّہ داری میں گرفتار ہے، اور اسی کے لئے خدا کی طرف سے اُس کے پاس ہدایت کی کتاب اور راستہ دکھانے والے رسول اور نبی آتے ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیفۂ ربانی پہلی اور آخری آسمانی کتاب ہو جس نے ان دونوں صداقتوں کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ساتھ اپنی اپنی جگہ پر تسلیم کیا ہو اور اُن کی تبلیغ کی ہو ایک طرف وہ کہتا ہو کہ "خدا کی اجازت کے بغیر درخت کا ایک پتہ بھی گر نہیں سکتا" اور دوسری طرف وہ کہتا ہے ہر جان اپنے کاموں کے ہاتھوں گرو ہو یعنی خدا کی ہمہ گیر قدرت، وسیع اختیار اور ناقابلِ ردّ مشیت کے باوجود اُس نے خود اپنے اختیار، خود اپنی مشیت اور خود اپنی حکمت

سے انسان کو ارادہ، اور ارادہ کے مطابق اپنے کام کرنے والے اعضا کو ہلانے کی مشروط طاقت بخشی ہی ارادہ اور اعضاء کو اُس کے مطابق حرکت دینے کی محدود قدرت اسکی ذمہ داری تکلیف باز پرس اور مواخذہ کی بنیاد ہی، اور اسی پر اُس کے اعمال اخلاق اور معاملات کی پوری عمارت کھڑی ہی، اس لئے انسان پر اُس کے کسی ایسے عمل کی ذمہ داری قانوناً اور شرعاً نہیں جو اُس کے ارادہ اور نیت سے صادر نہ ہوئی ہو، بلکہ اس کے کرنے یا نہ کرنے میں وہ مجبور و بے اختیار رہا ہو (اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّات) اس تطبیق سے نہ تو خدائے پاک کی قدرت و اختیار کی وسعت میں فرق آتا ہی، اور نہ انسان کا تمام تر مجبور ہونا لازم آتا ہی، خدا جب چاہے انسان سے اپنے دیئے ہوئے اختیار اور بخشی ہوئی قدرت کو چھین لے، مگر ایک وقتِ مقرر تک اپنے بنائے ہوئے قانون اور فرمائے ہوئے وعدہ کے مطابق وہ اس کو اس اختیار اور قدرت سے محروم نہیں کرتا فرمایا

فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَمَنْ شَآءَ	تو جو چاہے مومن بنجائے، اور جو چاہے
فَلْیَکْفُرْ، (کہف - ۴)	کافر ہو جائے،

اس لیے ہر انسان اپنی جنت آپ بناتا، اور اپنی دوزخ آپ مہیا کرتا ہے،

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ	جس نے نیک کام کیا، تو اپنے لئے کیا
اَسَآءَ فَعَلَیْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ	اور بُرا کام کیا تو اپنے لئے کیا، تیرا پروردگار
لِّلْعَبِیْدِ (فصلت - ۶)	بندوں پر ظلم نہیں کرتا،

کہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ ظلم ہو جس سے اللہ تعالیٰ کی جناب پاک و برتر ہے، چنانچہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ارشاد ہی،

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ط اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ، مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ، اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ	اے پیغمبر! ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمہاری طرف کان لگاتے ہیں، تو کیا تم بہروں کو سناؤگے، اور اگرچہ وہ سمجھتے نہ ہوں، اور اُن میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمہاری طرف دیکھتے ہیں تو کیا تم اندھوں کو سوجھاؤگے، اور اگرچہ وہ نہ دیکھیں، بیشک اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ ہیں جو اپنے اوپر آپ ظلم کرتے ہیں،
(یونس - ۵)	

وہ انسان جو اندھا اور بہرا بنتا ہے اور حق کا پیغام نہ سنتا ہے، اور نہ اُس پر عمل کرتا ہے خدا اس کو اندھا اور بہرا بنا کر پھر اُس کو دیکھنے اور سننے کی تکلیف نہیں دیتا کہ اگر وہ ایسا کرتا تو یہ اس کا ظلم ہوتا، اور ظلم کے ہر شائبہ سے اس کا ہر حکم اور ہر کام بری ہے، لوگوں کو قرآن کی ہدایت وضلالت کے الفاظ سے بھی دھوکا ہوا ہے، حالانکہ ہدایت اور ضلالت خدا کا وہ فیضان ہے جو انسان کے اچھے یا بُرے کام کے جواب میں خدا کی طرف سے ہوتا ہے ضلالت کی نسبت فرمایا

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ	بیشک جنھوں نے (اسلام کی تعلیمات کے قبول) سے انکار کیا، اُن کو تمہارا تنبیہ کرنا یا نہ کرنا دونوں برابر ہے وہ ایمان نہ لائیں گے خدا نے اُن کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کردی

غِشَاوَۃٌ ، (بقرہ ۱-۱) اور آنکھون پر پردہ ہے ،

دیکھو جب انسان سے کفر کا صدور پہلے ہو چکا، تب خدا کی طرف سے ضلالت کا فیضان ہوا، اور اس کو تشبیہاً یوں ادا کیا، کہ اُن کے دلون پر مہر پڑ گئی کہ سمجھتے نہیں، کانون پر مہر پڑ گئی کہ سنتے نہیں، اور آنکھوں پر پردہ پڑا ہے کہ دیکھتے نہیں' دوسری جگہ فرمایا،

بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ ، بلکہ خدا نے اُن کے کفر کے سبب سے اُن کے

(نسآء - ۲۲) دلون پر مہر کر دی ،

یہان بھی اُن کا کفر خدا کی مہر پر مقدم ہے، مقصد یہ ہے کہ جب کفر کا صدور ہوتا رہتا ہے، تو دلوں سے صداقت شناسی اور اثر پذیری کا جوہر سلب ہو جاتا ہے اور یہی خدا کی مہر ہے[1] برخلاف اُس کے اگر لوگ کانوں سے پیغام حق کے سننے اور آنکھوں سے دیکھنے، اور دل سے سمجھنے کی کوشش کریں تو اللہ تعالیٰ اپنی توفیق و ہدایت سے سرفراز فرمائے' ارشاد فرمایا،

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ بیشک جو ایمان لائے اور نیک کام کئے ،

يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ ، اُن کو اُن کا پروردگار اُن کے ایمان کے

(یونس - ۱) سبب ہدایت دیگا ،

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ اور جنھون نے ہدایت قبول کی اُن کو

هُدًى ، (محمد - ۲) ہدایت میں اور بڑھایا ،

---

[1] قرآن پاک میں جہان جہان خدا کی اس مہر کا یا کسی کو ہدایت نہ دیے جانے کا ذکر ہے، وہان اُس کے کفر و فسق کی علت ہمیشہ پہلے ذکر کر دی گئی ہے، اس لئے ان آیتون سے جبر پر استدلال صحیح نہین ؛

ایرانی فلسفۂ خیر و شر کی آمیزش نے اس مسئلہ کو اور زیادہ الجھا دیا ہے، حالانکہ عربی الفاظ خیر و شر کو اعمال کے خیر و شر سے بحث نہیں، عربی میں مطلق "خیر" کے معنی دولت و نعمت و آرام کے اور "شر" کے معنی غربت، تکلیف اور مصیبت کے ہیں، قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ ان ہی معنوں میں آئے ہیں، البتہ جب اُن کے ساتھ لفظ عمل شریک ہوگا تو عملِ خیر اور عملِ شر کے معنوں میں استعمال ہوگا، جیسے

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (زلزال-۱)	جو کوئی چیونٹی برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھے گا، اور جو برائی کرے گا، وہ بھی دیکھے گا،

اس لئے حدیثوں کے ان الفاظ میں

وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰی۔	اور اس پر ایمان کہ خیر اور شر کی تقدیر خدا کی طرف سے ہے،

کا یہ مطلب نہیں کہ انسانوں کے اچھے اور بُرے کام سب خدا کی طرف سے ہیں، بلکہ یہ معنی ہیں کہ انسانوں کو راحت و رنج، مسرت و تکلیف، دولت و افلاس اور صحت و مرض وغیرہ اچھائی اور بُرائی سب خدا کی طرف سے پہنچتی ہے، اور اُس کے تسلیم کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے؟

بعض لوگوں کو صحیح مفہوم کے سمجھنے میں اُن آیتوں سے بھی شبہہ ہوتا ہے جن میں یہ ذکر ہے کہ "اگر خدا چاہتا تو اُن کو ہدایت دے دیتا" اس سے وہ غلطی سے یہ سمجھے ہیں کہ وہ خود خدا وند تعالیٰ ہی جو ان کافروں کو ہدایت سے جبراً روکے ہوئے ہے، حالانکہ ان آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ

یہ لوگ از خود اسلام قبول نہیں کر سکتے، الا یہ کہ خود خدا زبردستی ان کو مسلمان بنا دینا چاہے، مگر ویسے زبردستی سے مسلمان یا کافر، اور نیک یا بد بنا دینا اللہ تعالیٰ کے جاری قانون کے خلاف ہے، چنانچہ ان آیتوں کا یہی مطلب ہے،

وَمَا تَشَاؤُنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (دھر-۲) — تم نہیں چاہو گے، الا یہ کہ خود خدا چاہے، اور (تم کو زبردستی مسلمان بنا دے)

مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ، (انعام-۱۴) — وہ نہیں ہیں کہ ایمان لے آئیں، الا یہ کہ خدا چاہے،

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى، (انعام-۴) — اور اگر خدا چاہتا تو اُن کو ہدایت پر متفق کر دیتا،

فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ، (انعام-۱۸) — تو اگر وہ (خدا) چاہتا تو البتہ ان سب کو وہ خود ہدایت دے دیتا،

وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ، (نحل-۱) — اور اگر وہ خدا چاہتا، البتہ اُن سب کو ہدایت دے دیتا،

مگر اس کی عادت نہیں کہ وہ بندے کے ارادہ اور کوشش کے بغیر از خود کسی کو ہدایت دے اس لئے اس مشیتِ الٰہی کے ساتھ قرآن پاک کی وہ آیتیں مطابق ہوں گی جن میں بندوں کی مشیت کا بھی اعتبار کیا گیا ہے، فرمایا،

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (کہف) تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے،

فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِيْلًا، (دهر، و مزمل ۱) — تو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ قبول کرے،

فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ مَاٰبًا (نبا ۲) — تو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف بازگشت کرے،

اِلَّا مَنْ شَاءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِيْلًا، (فرقان - ۵) — لیکن جو اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرنا چاہے،

اللہ تعالیٰ کی طرف سے گمراہی بھی اترتی ہے مگر کن کے لئے، بتصریح فرمایا،

۱- وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ، (بقرہ ۳) — اور اللہ اس سے گمراہ نہیں کرتا مگر نافرمانوں کو،

۲- فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (صف ۱) — جب وہ کج ہوئے تو اللہ نے اُن کے دلوں کو کج کر دیا اور اللہ بے حکم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا،

۳- بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ، (تطفیف ۱) — بلکہ اُن کے کام اُن کے دلوں پر زنگ بن گئے،

۴- بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (نساء ۲۲) — بلکہ اُن کے کفر کے سبب سے اللہ نے اُن پر مہر کر دی،

۵- انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ، (توبہ ۱۶) — وہ پھر گئے اللہ نے اُن کے دلوں کو اس لئے پھیر دیا کہ وہ لوگ سمجھتے نہ تھے،

۶- كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ (اعراف ۱۳) — اسی طرح اللہ کافروں کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے،

۷- فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا، (بقرہ ۲) — اُن کے دلوں میں (پہلے سے) (نفاق کی) بیماری تھی، تو خدا نے بیماری بڑھا دی،

ان آیتوں میں سے ہر ایک پر غور کرو، ہر ایک سے یہ صاف و صریح معلوم ہوگا کہ انسان کی بداعمالی مقدم ہے اور اللہ تعالیٰ کا اُس کے جوابی اثر کو اپنی طرف سے ضلالت، گمراہی، زنگ، مہر اور بیماری فرمانا مؤخر ہے، اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضلالت، زنگ، مہر اور بیماری کا اُترنا علت اور انسانوں کا کفر و گناہ و نفاق معلول نہیں ہے، بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے، یعنی انسان کا فسق و فجور، کجی، زنگ، کفر، انصراف (پھر جانا) نادانی اور قلب کی بیماری پہلے ہوتی ہے، اور خدا کی طرف سے اُس کے جواب میں ضلالت و گمراہی اور دل پر مہر بعد کو ہوتی ہے اور یہی طبعی اصول بھی ہے، انسان جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے اور غمگین ہوتا ہے تب آنسو کے قطرے ٹپکتے ہیں، اگر کوئی اُس کو اُلٹ کر بیان کرے تو یہ کیسی سخت نادانی ہوگی،

بہرحال اس مسئلہ میں مہبطِ وحی و رسالت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عجب مصلحت بینی یہ ہے کہ آپ نے اپنی اُمت کو اس پر جس شدت سے ایمان لانے کی تلقین فرمائی اُسی شدت سے اُس میں بحث و مناقشہ سے منع فرمایا،[1] اور درحقیقت اس نظریہ سے اسی طرح فائدہ اٹھانے میں راز ہے، یہ کلی جہاں چٹکی کہ خوشبو اُڑ گئی،

اس عقیدہ کے تمام وسیع اطراف اور گوشوں کو چھوڑ کر جن کو متکلمین کی مجادلانہ کاوشوں نے پیدا کیا ہے، قرآنِ حکیم کی صرف اس آیت کو سمجھ لینا کافی ہے:

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَ — اور خدا کی سلطنت میں اُس کا کوئی شریک نہیں اور

خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا (فرقان) — اُسی نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کا ایک اندازہ (تقدیر)

---

[1] مشکوٰۃ کتاب الایمان بالقدر،

ایمان کے نتائج

گذشتہ صفحوں میں ایمان کی حقیقت اور اس کی چھ شاخوں خدا، فرشتے، رسول، کتاب، یوم آخر اور قدر کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، اور دکھایا گیا ہے کہ اُن میں سے ہر عقیدہ کی حقیقت کیا ہے، اس کی صداقت کی دلیلیں کیا ہیں؟ اور اس کی تعلیم میں شارع ؑ نے کیا مصلحتیں رکھی ہیں، اور شروع میں یہ بحث بھی کی جاچکی ہے کہ ہر مذہب میں اور خصوصاً مذہب اسلام میں ایمان کو اولین اہمیت کیوں دی گئی ہے؟ وہ بحثیں اصول کی تھیں، یہاں خاتمہ میں نتائج کی حیثیت سے پھر اسی دعویٰ کی تکرار کیجاتی ہے، یعنی یہ کہ درحقیقت ایمانیات اسی لائق ہیں کہ اُن کو مذہب میں یہی اولین درجہ دیا جائے کیونکہ مذہب جن نتائج تک پہنچنا چاہتا ہے، وہاں ایمان کی روشنی کے بغیر پہنچنا ممکن ہی نہیں،

اس سے پہلے کہ ہم کسی دستور پر عمل کریں، یہ ضروری ہے کہ ہم اس دستور کی خوبی اور سچائی کا یقین کریں کہ اگر ایسا نہ ہو تو ہم اُس پر پایداری کے ساتھ نہ تو عمل کرسکتے ہیں، اور نہ ہمارے نفس وضمیر پر اس کا اثر ہوسکتا ہے، یہ حقیقت ہر دلیل سے ثابت ہے کہ ہمارے تمام اعمال ہمارے دل کے تابع ہیں، اس لئے جب تک دل نہ بدلیگا ہمارے اعمال میں تغیر نہیں ہوسکتا، یعنی ہمارے اعمال کی اصلاح تمام تر ہمارے دل کی اصلاح کے زیر اثر ہے، اور ایمان کا مقصد دل کی اصلاح ہے کہ اگر یہ درست ہوگیا تو سب کچھ درست ہوگیا،

یہاں ایک خاص نکتہ ہے جس کو سمجھے بغیر آگے نہیں بڑھنا چاہیے، یہودیوں نے سب سے زیادہ اہمیت عملی رسم ورواج کو دی تھی اور عیسائیوں نے اس کے برخلاف صرف ایمان پر نجات وفلاح کا دار ومدار رکھا، چنانچہ حواریوں کے خطوط وملفوظات میں اس تعلیم کو بہت کچھ نمایاں کیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ عمل نہیں بلکہ صرف ایمان نجات کا ذریعہ ہے، اسلام کی پہلی تکمیلی شان اس بارہ میں یہ ہے کہ وہ دونوں کی اصلاح کر کے اُن دونوں کو جمع کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ نجات نہ تنہا ایمان، اور نہ تنہا عمل پر، بلکہ ایمان صحیح اور عملِ صالح کی جامعیت پر موقوف ہے، اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے) دوسری بات یہ ہے کہ وہ ایمان کو محض ایمان کی بنا پر اہمیت نہیں دیتا، بلکہ اس لئے اہمیت دیتا ہے کہ وہ عملِ صالح کی علت وسبب ہے، یعنی وہ عملِ صالح کے لئے راستہ بناتا، اور تخم ریزی کے لئے زمین درست کرتا ہے،

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اس لئے نخل ایمان کی شناخت بھی اُس کے پھل ہی سے ہو سکتی ہے، اب اگر ایسا کوئی شخص تم کو نظر آتا ہے کہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر اُس کے اعمال میں اس ایمان کے مطابق کوئی بہتر تغیر نظر نہیں آتا تو یہی سمجھنا چاہیئے کہ ایمان نے اس کی زبان سے اتر کر اس کے دل کی گہرائیوں میں برگ وبار پیدا نہیں کیا ہے، یہی سبب ہے کہ قرآن پاک ہر نیکی اور خوبی کو ایمان کا خاصہ، اور مومنوں کا وصفِ لازم بتاتا ہے، ہر اہم موقع پر اُس نے مسلمانوں کو

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، اے وہ لوگو! جو ایمان لائے،

کی ندا سے خطاب کیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام پر وہی عمل کر سکتے ہیں جو ایمان سے متصف ہیں، بہت سے موقعوں پر ہے،

اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ، — اگر تم ایمان والے ہو،

اس سے معلوم ہوا کہ یہ بات ایمان والوں ہی کے لئے خاص ہے اور وہی اس کے اہل و سزاوار ہیں، فرمایا

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ، (بقرہ ع۔۲۰) — ایمان والے سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں،

اس سے معلوم ہوا کہ محبتِ الٰہی ایمان کی بہت بڑی علامت ہے ایک اور سورہ میں ہے

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا، وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (نور۔۷) — ایمان والوں کی بات یہ ہے کہ جب اُن کو فیصلہ کرنے کے لئے اللہ و رسول کی طرف بلایا جائے تو کہیں کہ ہم نے سُنا اور ہم نے مانا، اور ان ہی لوگوں کا بھلا ہے،

اس سے ظاہر ہوا کہ ایمان کا ایک نتیجہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور ان کے فیصلہ کے آگے سر جھکانا ہے، دوسری آیت میں ہے،

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (حجرات ۱) — ایمان والے تو آپس میں بھائی ہیں

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں میں باہمی محبت اور شفقت ہونا بھی ایمان کی نشانی ہے، ایک اور آیت میں ہے،

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (آل عمران ۱۷) اور خدا ہی پر چاہیئے کہ ایمان والے بھروسہ کریں

معلوم ہوا کہ خدا پر بھروسہ اور توکل اہل ایمان کی شان ہے سورۂ مومنون میں اہل ایمان کے اوصاف یہ بتائے گئے ہیں،

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ	بے شبہہ اہل ایمان نے بھلائی پائی جو اپنی
فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ وَالَّذِيْنَ	نماز میں ادب سے جھکے رہتے ہیں، اور جو
هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ وَالَّذِيْنَ	نکمی بات پر دھیان نہیں دیتے، اور جو
هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ، وَالَّذِيْنَ	زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور جو اپنی شرمگاہوں
هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ......	کی حفاظت کرتے ہیں ....
......وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ	..........اور جو اپنی امانتوں
وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ، وَالَّذِيْنَ هُمْ	اور وعدوں کی نگرانی رکھتے ہیں، اور
عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (مومنون ۱)	جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں،

ان آیتوں سے اہل ایمان کے ضروری اوصاف یہ معلوم ہوئے، نماز میں خشوع و خضوع، بے کار باتوں سے احتراز، زکوٰۃ و خیرات دینا عفت و پاکدامنی، امانت، ایفائے عہد، نمازوں کی پابندی، ان آیتوں میں ایک عجیب رمز ہے، دیکھو کہ اہل ایمان کے اوصاف کا آغاز بھی نماز سے کیا گیا، اور انجام بھی نماز پر رکھا گیا، اس سے اشارہ نکلا کہ نماز ایمان کی اولین و آخرین نشانی ہے اور اسی لئے ایمان کے بعد سب سے زیادہ اس پر زور دیا گیا ہے

ہم نے یہ چند آیتیں یہاں مثالاً نقل کی ہیں ورنہ اگر کوئی استقصا کرے تو قرآن میں

ایمان کے اثرات ونتائج اور بہت سے ملیں گے، احادیث میں بھی اس مضمون کی کمی نہیں، صحیح حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ایمان کی کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں" حافظ بیہقی نے اپنی کتاب شعب الایمان میں مختلف حدیثوں سے ایمان کی ان ستر شاخوں کو ایک ایک کر کے گنایا ہے، اس کتاب کا خلاصہ مختصر شعب الایمان کے نام سے چھپ بھی گیا ہے

ایک حدیث میں ایمان کی شناخت، اخلاق کی پاکیزگی کو بتایا گیا ہے، آپ نے فرمایا،

اَکْمَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُھُمْ خلقا (سنن ابی داؤد-کتاب السنۃ)	مومنوں میں اس کا ایمان سب سے زیادہ کامل ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں،

حسن اخلاق کا اساسی مرکز محبّت ہے، یہ محبت سب سے پہلے تو اسی ہستی سے ہونی چاہیے جو تمام محبتوں کا مرجع و مرکز ہے یعنی اللہ تعالیٰ، اور اس کے بعد اسی محبتِ الٰہی کے ضمن اور تبعیت میں اُس ہستی سے بھی محبت کرنا جس کی ہدایت اور تعلیم کے وسیلہ سے یہ جوہر ایمانی ہم کو ہاتھ آیا، اس محبت کے سامنے دوسری تمام دنیاوی محبتیں اور قرابت اور رشتہ داری کے علائق ہیچ ہیں، فرمایا،

لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من ولدہ ووالدہ والناس اجمعین، (مسلم و بخاری کتاب الایمان)	تم میں سے کوئی اُس وقت تک ایمان میں کامل نہیں، جب تک اس کے دل میں میری محبت اس کی اولاد، والدین، اور تمام لوگوں سے زیادہ نہ ہو،

ایمان کا تیسرا اثر یہ ہے کہ اس کو اپنی ہم جنس برادری اور پڑوسی سے بھی اسی طرح محبت،

پیار اور اخلاص ہو جس طرح خود اپنے آپ سے، فرمایا:

والذی نفسی بیدہ لا یومن احدکم حتی یحب لاخیہ او لجارہ ما یحب لنفسہ، (بخاری ومسلم کتاب الایمان)	قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم میں سے کسی کا ایمان اُس وقت تک کامل نہیں جبتک وہ اپنے بھائی یا پڑوسی (راوی کو شک ہے) کے لئے وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لئے چاہتا ہے۔

آپ نے ایک دفعہ صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا جب تک تم مومن نہ ہو گے جنت میں داخل نہ ہو سکو گے، اور مومن نہ ہو گے جب تک تم آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو گے میں بتائیں بتاؤں کہ تم میں آپس میں محبت کیونکر ہو سکتی ہے، آپس میں اسلام پھیلاؤ (مسلم کتاب الایمان)

یہ محبت کسی نمایش، ریا، یا ذاتی نفع ونقصان کے لیئے نہ ہو، بلکہ خدا اور صرف خدا کیلئے ہو فرمایا "تین باتیں جس میں ہیں اُس نے ایمان کا مزہ پالیا، اوّل یہ کہ اُس نے دل میں خدا اور رسول سے بڑھ کر کسی اور کی محبت نہ ہو، دوسری یہ کہ بندگانِ خدا سے صرف خدا کے لئے محبت کرتا ہو، تیسری یہ کہ کفر سے نجات پانے کے بعد پھر اُس میں آلودہ ہونا اُس کے لئے اتنا ہی تکلیف دہ ہو جتنا آگ میں ڈالا جانا" ایک صحابیؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ کامل اسلام کس مسلمان میں ہے؟ فرمایا اُس مسلمان میں جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے" فرمایا کہ "ایمان کی ستّر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں جن میں سے ایک شرم وحیا ہے" یہ بھی تعلیم فرمادی کہ "جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اُس چاہیے کہ زبان سے بات نکالے تو اچھی، ورنہ چپ رہے، جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کو دکھ نہ پہنچائے، جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو

اُس کو چاہیئے کہ مہمان کی عزت کرے" ایک صحابیؓ آپؐ کے اس ارشاد کو نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا "تم میں سے کوئی اگر کوئی برائی دیکھے تو اس کو ہاتھ سے مٹا دے، یہ نہ ہو سکے تو زبان سے روک دے یہ بھی نہ ہو سکے تو اپنے دل میں اس کو بُرا سمجھے اور یہ ایمان کا آخری درجہ ہے[1]"

اس کے بالمقابل آپؐ نے متنبہ فرمایا "کہ نفاق کی چار نشانیاں ہیں جس میں اُن میں سے ایک بھی پائے جائے اُس میں اتنا نفاق کا عنصر موجود ہے، اگرچہ وہ نماز گذار اور روزہ دار ہی کیوں نہ ہو، اور اپنے کو وہ مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو، ایک یہ کہ گفتگو کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو توڑ دے، امانت سپرد کیجائے تو خیانت کرے، غصہ آئے تو گالی بکے[2]"

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ تمام نیکیاں، اور ہر قسم کی بھلائیاں اور خوبیاں جس ایک جڑ کی شاخیں ہیں وہ **ایمان** ہے، اور اسی لئے وہ مذہب کا اصل الاصول ہے وہ نہ ہو تو انسانی نیکیوں کی ساری عمارت بے بنیاد ہے، اس تقریر سے کسی کو یہ شبہہ نہ ہو کہ ایمان کے بعد عمل کی ضرورت نہیں، اسلام نے اسی نکتہ کو بار بار ادا کیا ہے کہ نجات کا مدار ایمان اور عمل صالح دونوں پر ہے، اسی لئے اٰمَنُوْا کے ساتھ ساتھ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ پر بھی اُس نے ہمیشہ زور دیا ہے بلکہ اوپر جو کچھ کہا گیا ہے، اس کا منشا یہ ہے کہ ان دونوں میں ایمان اصل اور عمل اس کی فرع ہے ایمان ملزوم اور اعمال حسنہ اس کے خصوصیات اور لوازم ہیں، یعنی ان دونوں میں اصل و فرع اور لازم و ملزوم کا تعلق ہے جو ایک دوسرے سے الگ اور جدا نہیں ہو سکتے اس لئے جس طرح ایمان کے بغیر عمل سرسبز نہیں رہ سکتا، اسی طرح عمل کے بغیر ایمان ایک

[1] یہ تمام روایتیں صحیحین کتاب الایمان میں ہیں [2] صحیح بخاری کتاب الایمان، بیشتر نظر مسلم ہے،

بے برگ و بار درخت ہے جس کا فائدہ کے لحاظ سے عدم و وجود برابر ہے، اس بنا پر جہاں ایمان کے اُس کے عملی نتائج و آثار کا وجود بھی ضروری ہے،

کاغذ کے نو سَو چھ صفحے سیاہ ہو چکے، ناظرین کے ہاتھ ان اوراق کی گرانباری سے، اور آنکھیں ان سطور کی کم سوادی سے تھک چکی ہوں گی، اس لئے بہتر ہے کہ رہرو قلم کے ساتھ قافلۂ نظر کے دوسرے رفقا بھی کچھ دیر آرام کریں ہرچند کہ

رہروان را خستگیِ راہ نیست
عشق ہم راہ است و ہم خود منزل است

سلیمان ندوی

دار المصنفین　　　رمضان ۱۳۵۰ھ